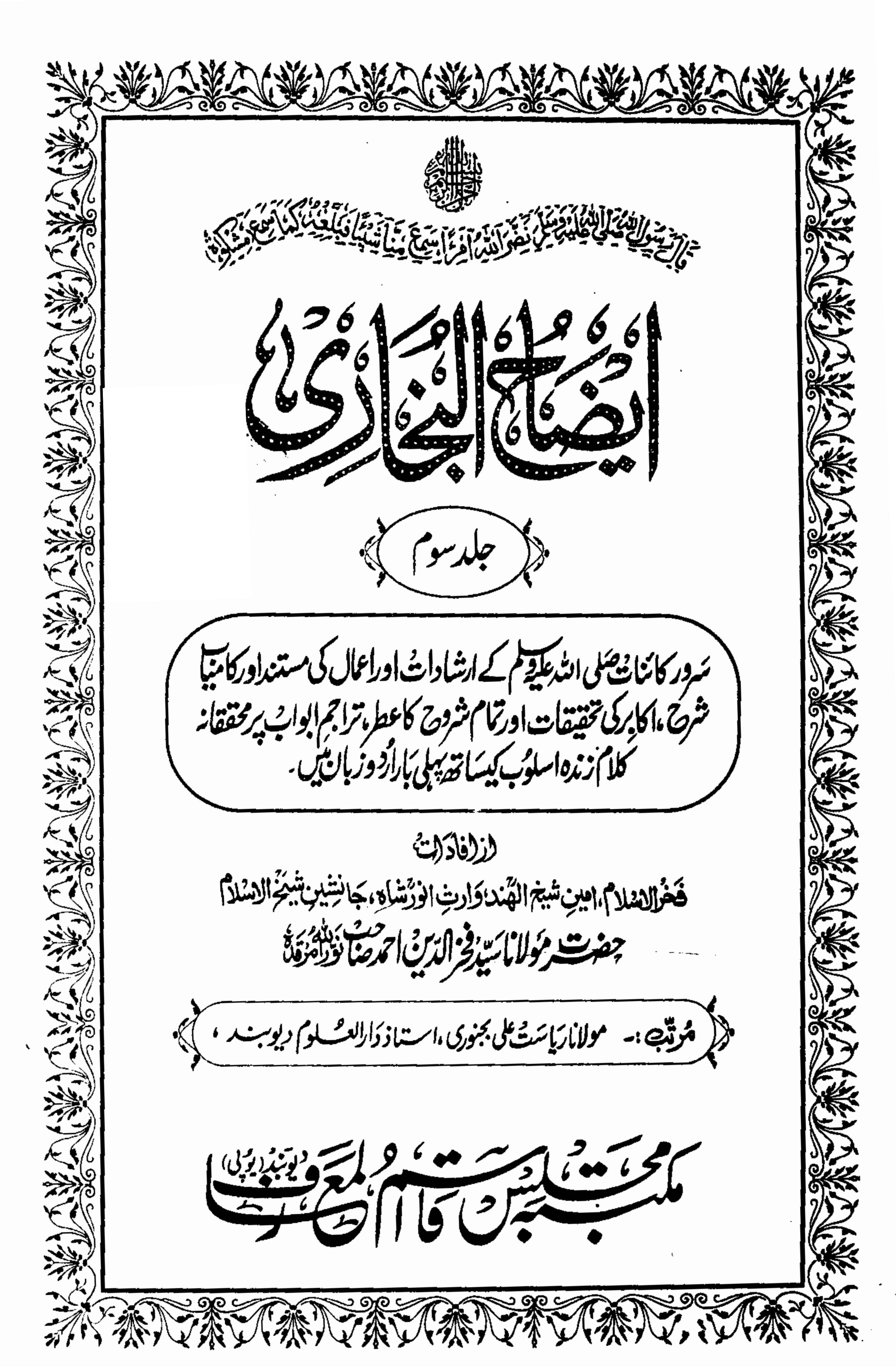


بسم اللہ الرحمن الرحیم

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نضر اللہ امرأ سمع منا شیئا فبلغہ کما سمع (مشکوٰۃ)

# ایضاح البخاری

## جلد سوم

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اعمال کی مستند اور کامیاب شرح، اکابر کی تحقیقات اور تمام شروح کا عطر، تراجم ابواب پر محققانہ کلام زندہ اسلوب کیساتھ پہلی بار اردو زبان میں۔


از افادات

فخر الاسلام، امین شیخ الہند، وارث انور شاہ، جانشین شیخ الاسلام

حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحب نور اللہ مرقدہ

مرتب:- مولانا ریاست علی بجنوری، استاذ دار العلوم دیوبند،



مکتبہ مجلس قاسم المعارف دیوبند (یوپی)

# تفصیلات


| | | |
|---|---|---|
| نام کتاب | ............ | ایضاح البخاری جلد سوم |
| افادات | ............ | فخر المحدثین حضرت مولانا سید فخر الدین احمد صاحبؒ سابق صدر المدرسین وشیخ الحدیث دار العلوم دیوبند وصدر جمعیۃ علماء ہند |
| طبع سوم | ............ | ۱۴۳۰ھ مطابق ۲۰۰۹ء |
| ترتیب | ............ | ریاست علی بجنوری |
| کمپوزنگ | ............ | محمد امجد الاعظمی مئوی |
| قیمت مجلد | ............ | ۳۵۰/-ء |
| صفحات | ............ | پانچ سو دس (۵۱۰) |
| تعداد | ............ | ایک ہزار |

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# ﴿عرض ناشر﴾

الحمد للہ و کفیٰ و سلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ ! قارئین کرام کو معلوم ہے کہ ایضاح البخاری ابتدا میں قسط وار طبع ہوتی تھی، پھر دس سال پہلے اس کو جلدوں کی صورت میں آفسیٹ پر طبع کیا گیا، اور اب الحمد للہ ان جلدوں کو مندرجہ ذیل خوبیوں کے ساتھ طبع کیا جا رہا ہے۔

۱- اس ایڈیشن کی کتابت کمپیوٹر کے ذریعہ کرائی گئی ہے کہ اب اس کو پسند کیا جا رہا ہے۔

۲- کتاب کا سائز $\frac{۲۰ \times ۲۶}{۸}$ کے بجائے $\frac{۲۰ \times ۳۰}{۸}$ کر دیا گیا ہے کہ اس سائز کا ہر طرح کا کاغذ بازار میں ہمہ وقت دستیاب ہے۔

۳- صحیح بخاری کی تمام عربی شروح میں فؤاد عبد الباقی مرحوم کی ترقیم کے مطابق احادیث پر نمبرات ڈالے جا رہے ہیں، ایضاح البخاری میں بھی احادیث پر وہی نمبر ڈال دئے گئے ہیں، اس سے مطالعہ کرنے والوں کو انشاء اللہ سہولت ہوگی۔

۴- ہر حدیث کے بارے میں اس نشاندہی کا اہتمام کیا گیا ہے کہ یہ حدیث جزوی یا کلی طور پر صحیح بخاری میں کہاں کہاں آئی ہے، اگر وہ حدیث گذر گئی ہے تو (گذشتہ:) لکھ کر حدیث نمبر ذکر کیا گیا ہے، اور اگر آئندہ آ رہی ہے تو (آئندہ:) لکھ کر نمبرات دئے گئے ہیں، یہ کام صحیح بخاری کے جدید مصری ایڈیشنوں میں ہو چکا ہے، مطالعہ کرنے والوں کی سہولت کے لیے اس کو ایضاح البخاری میں دے دیا گیا ہے۔

۵- تمام جلدوں کے صفحات برابر کر دئے گئے ہیں اور ہر جلد تقریباً پانچ سو صفحات کی ہے، اس لیے سابقہ مطبوعہ چار جلدوں کے صفحات میں ضروری رد و بدل کیا گیا ہے، اور جلد پنجم ترتیب کے بعد پہلی بار طبع ہو رہی ہے۔

۶- کتاب کو تا بمقدور بہتر سے بہتر بنانے کی سعی کی گئی ہے، تصحیح کا پورا اہتمام کیا گیا ہے، کاغذ، طباعت اور جلدوں میں بہتر معیار کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

جن احباب نے ان امور کی تکمیل میں تعاون فرمایا، ہم ان کے شکر گذار ہیں، اور بارگاہ خداوندی میں دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان سب کرم فرماؤں، مرتب اور ناشر کو اجر جزیل عطا کرے۔ آمین

# فہرست مضامین ایضاح البخاری جلد سوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# ﴿بَقِيَّةُ كِتَابِ الْحَيْضِ﴾

## [ ١٤ ] بَابُ غُسْلِ الْمَحِيْضِ

(۳۱۵) حَدَّثَنَا مُسْلِمٌ قَالَ حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ قَالَ حَدَّثَنَا مَنْصُوْرٌ عَنْ أُمِّهِ عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ امْرَأَةً مِّنَ الْأَنْصَارِ قَالَتْ لِلنَّبِيِّ ﷺ كَيْفَ اَغْتَسِلُ مِنَ الْمَحِيْضِ قَالَ خُذِي فِرْصَةً مُّمَسَّكَةً وَتَوَضَّئِي ثَلَاثاً ثُمَّ إِنَّ النَّبِيَّ ﷺ اِسْتَحْيٰى فَاَعْرَضَ بِوَجْهِهِ اَوْقَالَ تَوَضَّئِي بِهَا فَاَخَذْتُهَا فَجَذَبْتُهَا فَاَخْبَرْتُهَا بِمَا يُرِيْدُ النَّبِيُّ ﷺ. (گذشتہ: ۳۱۴)

**ترجمہ** باب، غسل حیض کا بیان۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ قبیلہ انصار کی ایک عورت نے نبی اکرم ﷺ سے عرض کیا، میں حیض کا غسل کس طرح کروں؟ آپ نے فرمایا کہ مشک کا ایک ٹکڑا لو اور اس سے پاکی حاصل کرو، یہ آپ نے تین بار ارشاد فرمایا، پھر نبی اکرم ﷺ کو حیا دامن گیر ہوئی اور آپ نے چہرۂ مبارک اس طرف سے پھیرلیا، یا پھر "توضیٔ بها" کہ پاکی حاصل کر فرمایا، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے اس عورت کو اپنی طرف کھینچ لیا اور اس کو نبی اکرم ﷺ کی مراد سے باخبر کردیا۔

**مقصد ترجمہ** محیض سے جسم کا وہ مخصوص حصہ بھی مراد ہوسکتا ہے جس سے خون حیض کا تعلق ہے اور حیض بھی مراد ہوسکتا ہے، اس صورت میں "غسل المحیض" میں اضافت لامیہ ہوگی کہ اس غسل کا بیان جو حیض کے ساتھ خاص ہے، اس صورت میں غسل مخصوص کی کیفیت سے اصل غسل کا ثبوت خود بخود ہوجائے گا۔

روایت گزر چکی ہے، یہاں آپ نے "توضّئی" فرمایا ہے، اس کا ترجمہ وضو کرنا نہیں ہے، بلکہ یہاں **"توضّئی بمعنی تطهری"** کے ہے، یعنی معنی لغوی مراد ہیں "ماخوذ من الوضاءة" جس کے معنی روشن کرنا ہیں، یعنی اس سے صفائی حاصل کرو، یہ بات تین بار فرمائی "او قال توضئی بها" اس موقعہ پر شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں یہ تردد لفظ "بها" یا "ثلثا" سے متعلق ہے، یعنی صرف "توضئی" فرمایا، یا اس کے ساتھ "بها" کا بھی اضافہ فرمایا، یا "ثلثا" بھی فرمایا، یا صرف "توضئی بها" فرمایا، پچھلی روایت میں تھا کہ آپ نے تین بار سمجھا کر حیا کے سبب سے منہ پھیر لیا تھا، بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ نے منہ پر کپڑا ڈال لیا تھا، منہ پر کپڑا ڈالنے سے اس طرف بھی کنایہ ہوسکتا ہے کہ اس کو پردہ کی جگہ استعمال کرو۔

## [۱۵] بَابُ اِمْتِشَاطِ الْمَرْأَةِ عِنْدَ غُسْلِهَا مِنَ الْمَحِيْضِ

(۳۱۶) حَدَّثَنَا مُوْسَى بْنُ اِسْمَاعِيْلَ قَالَ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ اَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ اَهْلَلْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ فَكُنْتُ مِمَّنْ تَمَتَّعَ وَلَمْ يَسُقِ الْهَدْيَ فَزَعَمَتْ اَنَّهَا حَاضَتْ وَلَمْ تَطْهُرْ حَتّٰى دَخَلَتْ لَيْلَةُ عَرَفَةَ فَقَالَتْ يَارَسُوْلَ اللهِ! هٰذِهٖ لَيْلَةُ يَوْمِ عَرَفَةَ وَاِنَّمَا كُنْتُ تَمَتَّعْتُ بِعُمْرَةٍ فَقَالَ لَهَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اُنْقُضِيْ رَاْسَكِ وَامْتَشِطِيْ وَاَمْسِكِيْ عَنْ عُمْرَتِكِ فَفَعَلْتُ فَلَمَّا قَضَيْتُ الْحَجَّ، اَمَرَ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ لَيْلَةَ الْحَصْبَةِ فَاَعْمَرَنِيْ مِنَ التَّنْعِيْمِ مَكَانَ عُمْرَتِي الَّتِيْ نَسَكْتُ. (گذشتہ: ۲۹۴)

**ترجمہ** باب، غسل حیض کے وقت عورت کا بالوں میں کنگھی کرنا۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے حجۃ الوداع میں نبی اکرم ﷺ کے ساتھ احرام باندھا تو میں ان لوگوں میں تھی، جنھوں نے تمتع کی نیت کی اور قربانی کا جانور اپنے ساتھ نہیں لیا، پھر حضرت عائشہؓ نے کہا کہ انھیں حیض شروع ہو گیا اور حیض سے پاکی حاصل نہ ہو سکی، یہاں تک کہ عرفہ کی رات آ گئی، تو انھوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! یہ عرفہ کی رات ہے اور میں نے عمرہ کا احرام باندھ کر تمتع کا ارادہ کیا تھا، رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، تم اپنا سر کھول ڈالو اور کنگھی کر لو اور عمرہ سے رکی رہو، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، پس جب میں حج سے فارغ ہو گئی تو آپ نے حصبہ کی رات میں عبدالرحمانؓ کو حکم دیا، انھوں نے مجھے اس عمرے کی قضا میں جس کا میں نے احرام باندھا تھا، تنعیم سے عمرہ کرایا۔

**مقصد ترجمہ** ترجمہ یہ ہے کہ غسل حیض کے وقت عورت بالوں میں کنگھا کرے، گویا پہلے بال کھولے جائیں اور پھر ان میں کنگھے کا استعمال کیا جائے، دوسرا باب لا رہے ہیں "نقض المرأة شعرها عند غسل المحیض" یعنی غسل حیض کے وقت عورت اپنے بالوں کو کھولے، دونوں ابوابؔ کے ملانے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو عورتوں کے معاملہ میں تخفیفی حکم دیا گیا ہے کہ غسل میں بالوں کی جڑوں کا تر کر دینا کافی ہے، بالوں کی جڑوں کو تر کر دینے کے بعد ضروری نہیں کہ ان کے کھولنے کی تکلیف بھی گوارہ کی جائے، یہ تخفیفی حکم غسل جنابت میں ہے، غسل حیض میں نہیں ہے، غسل حیض میں بال کھولنے ہوں گے اور کنگھا کرنا ہوگا، ہو سکتا ہے کہ بخاریؒ کا یہ فیصلہ ہو، جمہور اس کو مستحب کہتے ہیں، البتہ بعض تابعین اور ایک روایت میں امام احمدؒ نے اس کے وجوب کا قول کیا ہے، لیکن جمہور فقہاء کا مسلک یہی ہے کہ غسل جنابت اور غسل حیض میں کوئی فرق نہیں، بالوں کی جڑوں تک پانی پہنچانا ضروری ہے، اگر بالوں کو کھولے بغیر یہ کام ہو جائے تو بالوں کو کھولنے کی ضرورت نہیں اور اگر اس طرح سے کام نہ چلتا ہو تو کھولنا فرض ہوگا۔

**تشریح حدیث** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ میں نے حجۃ الوداع میں تمتع کا احرام باندھا اور خیال تھا کہ عمرہ کے بعد آٹھویں تاریخ کو حج کا احرام باندھ لیں گے، تو فرماتی ہیں کہ میں متمتع تھی اور اس کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ متمتع ہے، جو ساتھ قربانی کا جانور لے جائے، اس کو متمتع بسوق الھدی کہتے ہیں اور دوسرے وہ جو قربانی کا جانور ساتھ نہ لے جائے، اس کو متمتع بغیر سوق الھدی کہا جائے گا، ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ جو متمتع ہدی ساتھ لے کر چلتا ہے، وہ درمیان میں احرام سے حلال نہیں ہوسکتا اور جس کے ساتھ قربانی کا جانور نہ ہو، وہ عمرہ کے بعد احرام کھول سکتا ہے اور اس کے لیے وہ چیزیں حلال ہو جائیں گی جو احرام سے پہلے حلال تھیں "فزعمت" اب حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ راستے میں حیض شروع ہو گیا اور پھر یہ سلسلہ اس قدر ممتد ہوا کہ عرفہ کی رات آ گئی اور پاکی حاصل نہ ہوئی، اس لیے سرکار رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ کل عرفہ کا دن ہے، یعنی حج کا اور میں اب تک پاک نہیں ہوسکی ہوں، میں کیا کروں؟ سفر اکارت ہو گیا، نہ عمرہ ہوسکا نہ حج ہوسکے گا اور میں نے تمتع کا احرام باندھا تھا، آپ نے ارشاد فرمایا "انقضی راسك" سر کے بال توڑ دو، یعنی چوٹی وغیرہ کھول ڈالو اور کنگھا کرلو اور عمرہ کے خیال کو چھوڑ دو، یہاں اتنے ہی الفاظ ہیں، دوسری روایت میں یہ تصریح ہے کہ غسل کرو، سر کھول ڈالو، کنگھا کرو اور عمرہ سے رک جاؤ، چنانچہ ایسا ہی کیا، جب میں حج سے فارغ ہوگئی تو آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے بھائی حضرت عبدالرحمان رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جاؤ اپنی بہن کو تنعیم سے عمرہ کرادو، تنعیم سب سے قریب کا میقات ہے، تین میل کے فاصلہ پر واقع ہے، چنانچہ میرا عمرہ کرادیا گیا اور یہ عمرہ اس عمرے کے قائم مقام تھا، جس کا میں نے احرام باندھا تھا اور مجبوری کے سبب اس کی ادائیگی سے محرومی رہی تھی اور احرام کھولنا پڑا تھا۔

**حضرت عائشہؓ متمتعہ تھیں یا قارنہ یا مفردہ؟** یہ ایک روایت ہے، لیکن اس سے ایک بڑے اختلافی مسئلہ کا تعلق ہے، اس لیے اس پر احناف اور شوافع دونوں کی جانب سے توجہ دی گئی ہے، اس پر تو اتفاق ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ابتداءً متمتعہ تھیں، جیسا کہ "کنت تمتعت" سے صاف ظاہر ہے، آگے چل کر بحث ہوتی ہے کہ وہ قارنہ بن گئیں، یا منفردہ رہ گئیں، یعنی اس عمرے کے احرام پر انھوں نے حج کا احرام باندھ لیا، یا عمرے کے احرام کو ختم کر کے احرام حج کے لیے باندھا، شوافع کے یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو قارنہ تسلیم کیا گیا ہے اور احناف نے افراد کا قول کیا ہے۔ شوافع اس سے ایک فائدہ یہ سوچتے ہیں کہ ان کے یہاں قارن کے لیے ایک طواف اور ایک ہی سعی کافی ہے اور احناف کے یہاں قران میں دو طواف ہیں اور دو سعی، اگر اس واقعہ میں حضرت عائشہؓ کا قارنہ ہونا ثابت ہو جائے تو شوافع سمجھتے ہیں کہ قارن کے لیے ایک طواف اور ایک سعی کی ضرورت کا ثبوت ہو جائے گا، کیوں کہ حضرت عائشہؓ کی شکایت کے جواب میں سرکار رسالت مآب ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے، ابوداؤد میں ہے: "طوافك بالبيت وبين الصفا والمروة يكفيك لحجتك وعمرتك"

تمہارا طواف بیت اور سعی بین الصفا والمروہ حج اور عمرہ دونوں کے لیے کافی ہے۔

معلوم ہوا کہ حضرت عائشہؓ قارنہ تھیں اور قارنہ کے لیے ایک طواف اور ایک سعی کافی ہے۔ یہ شوافع کی ترجمانی ہے لیکن پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ جناب دو چیزیں ہیں، ایک تو یہ کہ پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قارنہ ہونا ثابت کیا جائے، دوسرے یہ کہ قارن کے لیے ایک طواف اور ایک سعی کی کفایت ثابت کی جائے، اسی ایک روایت سے قارن ہونے پر استدلال ہے اور اسی ایک روایت سے ایک طواف اور ایک سعی کی کفایت پر اور دونوں استدلال اس طرح کہ ایک مدعا کا ثبوت دوسرے مدعا کے ثبوت پر موقوف ہے۔

ہم یہ کیسے مان لیں کہ حضرت عائشہؓ متمتعہ سے قارنہ ہوگئیں؟ قارنہ تو اس وقت ہو سکتی ہیں جب کہ عمرہ کا احرام کھلوایا نہ گیا ہو، بلکہ صرف اسی احرام کے ساتھ دونوں نیتیں متعلق ہوگئی ہوں، ظاہر ہے کہ اگر اسی احرام کو باقی رکھتے ہوئے حج کے احرام کو بھی اسی کے ساتھ شامل کرنا منظور ہوتا، تو سر کھولنے اور کنگھا کرنے کی کیا ضرورت تھی، جب کہ احرام میں کنگھا کرنا جنایت ہے، کیوں کہ اس سے سر کے بال ٹوٹتے ہیں، اس پر یہ کہنا کہ کنگھا اس طرح کرو کہ سر کے بال نہ ٹوٹیں، یہ محض دھاندلی ہے اور اپنے خیال کی پیروی ہے، ورنہ معنی تو ظاہر ہیں۔

اس لیے یقینی طور پر ''انقضی راسك و امتشطی'' کو احرام عمرہ کے ختم کرنے سے کنایہ ماننا پڑے گا، کیوں کہ احرام کی حالت میں نہ سر کھولا جاتا ہے، نہ کنگھا کیا جاتا ہے، اس تقدیر پر سرکار رسالت مآب ﷺ کے ارشاد کا مطلب یہ ہوگا کہ عمرہ کا تو وقت نکل گیا ہے، اس لیے اس کے احرام کو تو ختم کر دو اور حج کا احرام باندھ لو اور احرام اس طرح بندھوایا کہ پہلے غسل کا حکم دیا جیسا کہ ابوداؤد کی روایت میں ہے، کیوں کہ احرام میں غسل مسنون ہے، سر کے بال کھولنے اور کنگھا کرنے کا حکم دیا وغیرہ وغیرہ، یہ سب احکام کیوں دیئے جا رہے ہیں، اس لیے کہ احرام ختم کرانا منظور ہے، اگر اسی احرام کو باقی رکھنا منظور تھا تو سر کھولنے اور کنگھا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ایسی صورت تو نہیں تھی کہ اس چادر پر دوسری چادر باندھنا پڑتی ہو، بلکہ صرف نیت بدلنے کی ضرورت تھی، پھر جب آپ نے عمرہ کا احرام ختم کرا دیا، تو صاف سی بات ہے کہ حضرت عائشہؓ قارنہ نہ ہوئیں، بلکہ مفردہ ہوگئیں، سمجھ میں نہیں آتا کہ شوافع کس طرح عمرہ کے احرام پر حج کے احرام کی بنا مانتے ہیں، جب کہ رسول اکرم ﷺ کے ارشاد میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ آپ نے عمرے سے باز رہنے کی ہدایت کی ہے، دیکھئے مختلف الفاظ ہیں: ''ارفضی عمرتك'' عمرے کو توڑ دو۔ ''اترکی عمرتك'' عمرہ کو چھوڑ دو'' امسکی عن عمرتك'' عمرے سے باز رہو وغیرہ وغیرہ، یہ مختلف الفاظ ہیں مذہب کی حمایت میں ان کی تاویلات کی جا رہی ہیں، قسطلانیؒ کہتے ہیں کہ عمرے کو چھوڑنے کا مفہوم یہ ہے کہ افعال عمرہ کو چھوڑ دو، لیکن یہ تاویل ہے، حقیقت نہیں ''امسکی عن عمرتك'' کے متعلق تاویل کی گئی کہ احرام بدستور رہے، افعال کو مؤخر کر دو، سوال کیا جا سکتا ہے کہ عمرہ کیا چیز ہے؟ کہیں گے کہ طواف اور سعی، پھر طواف اور سعی تو حج کے ساتھ ادا ہو گئے، اب تاخیر کاہے کی ہے پھر جب حج کے

ساتھ عمرہ کے فرائض بھی ادا ہو گئے، تو عمرہ ہو گیا اور اسی بنا پر آپ کے مذہب کے مطابق ان کو قارنہ قرار دیا گیا، اب الگ سے عمرہ کرا کر، اس کو سابق عمرے کا بدل قرار دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ جب مبدل منہ موجود ہے، تو بدل کیسا؟ شوافع کہتے ہیں کہ عمرہ تو ہو گیا تھا، مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اطمینان نہ تھا، ان کے اطمینان کی خاطر دوبارہ عمرہ کرا دیا، عرض یہ ہے کہ اگر صورت یہی ہے تو "مکان عمرتی التی نسکت" کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ کیسی تاویلیں کی جارہی ہے، اگر آپ کے بقول حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اس طرح قارنہ مان لیا جائے اور ایک طواف اور ایک سعی کی کفایت بھی مان لی جائے تو یہاں بلا ارادہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا عمل پیغمبر علیہ السلام کے موافق ہو گیا اور اس سے زیادہ مسرت کی بات ان کے نزدیک اور کیا ہو سکتی تھی، پہلے تو حضرت عائشہؓ متمتعہ تھیں، اب قدرت نے بلا ارادہ قارنہ بنا دیا، ان کو خوشی ہونی چاہئے تھی۔ اور حیرت کی بات یہ ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام ان کی دلداری کی خاطر دوسرا عمرہ تو کرا دیتے ہیں، مگر یہ نہیں فرماتے کہ ہم نے بھی تو ایک ہی طواف اور ایک ہی سعی کی ہے اور حج کے ساتھ کی ہے، یہ تو بڑے اطمینان کی بات تھی، بحث طویل ہے، انشاء اللہ تعالیٰ اپنے موقعہ پر آئے گی۔ یہاں تو اسی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

**ترجمہ کا ثبوت** ترجمہ ہے حائضہ کا غسل حیض کے وقت کنگھا کرنا، حدیث میں غسل کا ذکر نہیں ہے، بخاریؒ کا ترجمہ میں غسل کی قید لگانا اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک " انقضی راسك وامتشطی" غسل سے کنایہ ہے، یا پھر انھوں نے دوسری روایات پر اعتماد کیا ہے، راوی نے اختصار سے کام لیا، غسل کو مان لینے کے بعد اب دو صورتیں ہیں: یا تو اس غسل کو حیض ہی سے متعلق قرار دیا جائے، اگر چہ اس صورت میں بھی غسل، نجاست کی تخفیف و تقلیل کی غرض سے ہوگا، کیوں کہ ابھی تک حیض کا سلسلہ ختم نہ ہوا تھا، یا پھر غسل احرام کی سنت مانا جائے، پہلی صورت میں حدیث سے ترجمہ کا ثبوت ظاہر ہے۔ اور اگر غسل کو احرام کی سنت قرار دیں تو مقصد اس طرح حاصل ہوگا کہ حدیث میں بال کھولنے اور کنگھا کرنے کا حکم احرام ہی سے متعلق ہے، مگر صفائی اور پاکیزگی کا مقصد دونوں جگہ موجود ہے، بلکہ غسل حیض کو جو اہمیت حاصل ہے وہ غسل احرام کو نہیں ہے، کیوں کہ غسل حیض تو فرض ہے اور غسل احرام سنت، غسل حیض میں نجاست کا ازالہ ہوتا ہے اور غسل احرام میں صرف جسم کی صفائی ستھرائی پیش نظر ہوتی ہے، اس لیے اگر غسل احرام میں بال کھولنے اور کنگھا کرنے کی ضرورت ہو تو غسل حیض میں بدرجۂ اولی اس ضرورت کو تسلیم کرنا پڑے گا "لیلۃ الحصبہ" یہ حصبہ مکہ معظمہ اور منی کے مابین ایک مقام ہے، جہاں اہل مدینہ طواف وداع سے فراغت کے بعد قافلہ بندی کی خاطر اوائل شب میں اتر پڑتے ہیں، پھر وہاں سے جمع ہو کر آخر شب میں مدینہ کی طرف کوچ کرتے ہیں۔

## [۱۶] بَابُ نَقْضِ الْمَرْأَةِ شَعْرَهَا عِنْدَ غُسْلِ الْمَحِيْضِ

(۳۱۷) حَدَّثَنَا عُبَيْدُ بْنُ اِسْمَاعِيْلَ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ اُسَامَةَ عَنْ هِشَامٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ

خَرَجْنَا مُوَافِيْنَ لِهِلَالِ ذِیْ الْحِجَّةِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُّهِلَّ بِعُمْرَةٍ فَلْيُهْلِلْ فَاِنِّیْ لَوْلَا اَنِّیْ اَهْدَيْتُ لَاَهْلَلْتُ بِعُمْرَةٍ فَاَهَلَّ بَعْضُهُمْ بِعُمْرَةٍ وَاَهَلَّ بَعْضُهُمْ بِحَجٍّ وَكُنْتُ اَنَا مِمَّنْ اَهَلَّ بِعُمْرَةٍ فَاَدْرَكَنِیْ يَوْمُ عَرَفَةَ وَاَنَا حَائِضٌ فَشَكَوْتُ اِلَى النَّبِیِّ ﷺ فَقَالَ دَعِیْ عُمْرَتَكِ وَانْقُضِیْ رَاْسَكِ وَامْتَشِطِیْ وَاَهِلِّیْ بِحَجٍّ فَفَعَلْتُ حَتّٰى اِذَا كَانَ لَيْلَةُ الْحَصْبَةِ اَرْسَلَ مَعِیْ اَخِیْ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ اَبِیْ بَكْرٍ فَخَرَجْتُ اِلَى التَّنْعِيْمِ فَاَهْلَلْتُ بِعُمْرَةٍ مَكَانَ عُمْرَتِیْ. قَالَ هِشَامٌ وَلَمْ يَكُنْ فِیْ شَیْءٍ مِنْ ذٰلِكَ هَدْیٌ وَلَا صَوْمٌ وَلَا صَدَقَةٌ ۔ (گذشتہ:۲۹۴)

**ترجمہ** باب، غسل حیض کے وقت عورت کا اپنے بالوں کو کھولنا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم ہلال ذی الحجہ کے قریب رسول اکرم ﷺ کے ساتھ نکلے، رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، جو شخص عمرے کا احرام باندھنا چاہے وہ عمرے کا احرام باندھ لے، اگر میں قربانی کی ہدی ساتھ لے کر نہ آتا تو میں بھی عمرہ کے بعد احرام سے حلال ہو جاتا، چنانچہ بعض لوگوں نے عمرہ کا احرام باندھا اور بعض لوگوں نے حج کا۔ اور میں ان لوگوں میں تھی جنھوں نے عمرہ کا احرام باندھا تھا، مجھے عرفہ کا دن ہو گیا، اس حال میں کہ میں حائضہ تھی، چنانچہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا، آپ نے فرمایا کہ عمرہ ترک کر دو، سر کے بال کھول دو، کنگھا کرلو اور حج کا احرام باندھ لو، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، یہاں تک کہ حصبہ میں جب نزول کی رات آئی تو آپ نے میرے ساتھ میرے بھائی عبدالرحمان بن ابوبکر کو بھیجا، چنانچہ میں تنعیم تک گئی اور وہاں سے فوت شدہ عمرہ کی جگہ دوسرا احرام باندھا۔ ہشامؒ کہتے ہیں کہ ان سب باتوں میں نہ ہدی تھی، نہ روزے، نہ صدقہ۔

**مقصد ترجمہ اور تشریح** گذشتہ باب میں مقصد ترجمہ اور ترجمہ وحدیث کے درمیان مطابقت کے سلسلے میں عرض کیا جا چکا ہے اور وہ اس باب میں بھی کافی ہے کہ غسل حیض کے وقت سر کھولنا پڑے گا، تخفیف صرف جنابت کے ساتھ تھی، کیوں کہ جنابت کثرت سے پیش آتی ہے اور حیض مہینے میں صرف ایک بار آتا ہے اور عورتیں خود بھی غسل حیض کے سلسلہ میں کافی اہتمام کرتی ہیں، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ذی الحجہ کے چاند کے قریب مدینہ سے نکلے، ذوالحجہ کے صرف چار دن باقی تھے، ذوالحلیفہ پر جا کر رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا جس کا جی چاہے، عمرہ کا احرام باندھے اور جس کا جی چاہے حج کا، کیوں کہ مدینہ سے نکلتے وقت عام لوگوں کا خیال یہی تھا کہ محض حج کرنا ہے، کیوں کہ زمانہ جاہلیت میں اشہر حج میں جو شخص حج کرنا چاہتا تھا، اس کیلئے عمرہ کرنا، افجر فجور اور بدترین جرم تھا، کیوں کہ یہ وقت ان کے نزدیک حج کے ساتھ مخصوص تھا، یہ خیال جاہلیت کا تھا، اگرچہ پیغمبر علیہ السلام نے اس خیال کو تین بار ذی قعدہ میں جو اشہر حج میں شامل ہے عمرہ کر کے باطل بھی فرما دیا تھا، مگر ان تینوں عمروں میں حج ساتھ نہ تھا، اب جب کہ پیغمبر علیہ السلام حج کے لیے تشریف لے جا رہے تھے، آپ نے اعلان فرما دیا، جس کا جی چاہے عمرے کا احرام

باندھے اور جس کا جی چاہے حج کا، آپ نے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ تم میری حالت پر نہ جاؤ، میں بھی عمرہ کا احرام باندھتا، مگر مجبوری یہ ہے کہ میرے ساتھ ہدی ہے اور ہدی لانے والا عمرے کا احرام باندھے تب بھی درمیان میں حلال نہیں ہوسکتا، اس لیے میں افضل صورت کو ہی اختیار کیوں نہ کروں؟ افضل صورت یعنی قران، اس کی بحث کتاب الحج میں تفصیل سے آجائے گی کہ سرکار رسالت مآب ﷺ قارن تھے یا مفرد؟ چنانچہ آپ کے اس ارشاد پر بعض حضرات نے عمرے کا احرام باندھا اور بعض نے حج کا۔

"قال هشام الخ" یہاں ایک اور اشکال آ گیا، ہشام کہتے ہیں کہ اس واقعہ میں نہ ہدی تھی اور نہ روزے تھے، نہ صدقہ، اشکال یہ ہے کہ حضرت عائشہ قارنہ ہوں یا متمتعہ، دونوں صورتوں میں ہدی لازمی ہوگی، قران کی صورت میں وہ ہدی احناف کے نزدیک ہدی شکر ہوگی اور شوافع کے نزدیک ہدی جبر۔ اور اگر حضرت عائشہ متمتعہ تھیں اور بعد میں مفردہ ہوگئیں، جیسا کہ احناف کا خیال ہے، تب بھی ہدی لازم ہوگی، مگر اس وقت یہ ہدی جنایت کی ہدی ہوگی اور اگر ہدی نہ لے تو روزے کا معاملہ ہے کہ تین تو ایام حج میں اور سات روزے گھر لوٹنے کے بعد، جیسا کہ قرآن کریم میں موجود ہے، شوافع بھی اس کو مانتے ہیں، اب ہشام کا یہ کہنا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس پورے واقعہ میں نہ ہدی ہے، نہ روزہ، نہ صدقہ، شوافع نے ان کے اس قول کے یہ معنی بیان کئے کہ ہدی نہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ہدی جنایت نہ تھی، لیکن احناف کے یہاں بھی ہدی نہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ ہدی شکر نہ تھی، اس لیے اس قسم کی تاویلات درست نہیں، اچھا یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہہ دیا جائے کہ ہشام کو خبر نہیں، ورنہ روایت میں ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ازواج مطہرات کی طرف سے بقر ذبح کیا۔ اب بحث یہ چلی کہ ازواج مطہرات نو ہیں اور بقر ایک جس میں سات سے زیادہ حصے نہیں ہوسکتے، تو جواب یہ ہے کہ ایک بقر کی تفصیل کہاں ہے؟ یہ بحث گزر چکی ہے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ ہدی نہ ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ مدینہ سے ہدی لے کر ساتھ نہ چلی تھیں اور ہدی کا اطلاق عرفاً اس جانور پر ہوتا ہے کہ جس کو حاجی ساتھ لے کر جائے۔

## [۱۷] بَابُ قَوْلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ مُخَلَّقَةٍ وَغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ (حج:۵)

(۳۱۸) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادٌ عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ اَبِىْ بَكْرٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اِنَّ اللهَ عَزَّوَجَلَّ وَكَّلَ بِالرَّحِمِ مَلَكاً يَقُوْلُ يَارَبِّ نُطْفَةٌ يَارَبِّ عَلَقَةٌ يَارَبِّ مُضْغَةٌ فَاِذَا اَرَادَ اللهُ اَنْ يَقْضِىَ خَلْقَهُ قَالَ اَذَكَرٌ اَمْ اُنْثٰى شَقِىٌّ اَمْ سَعِيْدٌ فَمَا الرِّزْقُ وَمَا الْاَجَلُ قَالَ فَيُكْتَبُ فِىْ بَطْنِ اُمِّهٖ.　(آئندہ: ۳۳۳۳، ۶۵۹۵)

**ترجمہ** | باب مخلقہ اور غیر مخلقہ کے بیان میں۔ حضرت انس بن مالکؓ رسول اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے رحم پر ایک فرشتے کو مقرر فرمایا ہے جو کہتا ہے، اے پروردگار تو نے رحم میں نطفے کو پیدا کیا، اے

پروردگار تو نے خون بستہ کو پیدا کیا، اے پروردگار تو نے گوشت کے لوتھڑے کو پیدا کیا، پس جب باری تعالیٰ یہ ارادہ فرماتے ہیں کہ اس کی تخلیق کو مکمل کر دیں، تو فرشتہ کہتا ہے مرد ہے یا عورت، بد بخت ہے یا نیک بخت، پھر اس کا رزق اور اس کی عمر کیا ہے؟ چنانچہ یہ سب اس کی ماں کے پیٹ ہی میں مقرر کر دیا جاتا ہے۔

**مقصد ترجمہ** بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ بخاری اس آیت کی تفسیر کرنا چاہتے ہیں جیسا کہ حافظ ابن حجر نے کہا ہے، رہا یہ کہ تفسیر کا مقام تو کتاب التفسیر ہے، کتاب الحیض سے اس کا کیا ربط ہوگا؟ تو ربط بھی ظاہر ہے، کیوں کہ جب نطفہ رحم میں جائے گا، تو اس کی دو ہی صورتیں ہوں گی، یا تو اس میں تخلیقی کیفیت پیدا کی جائے گی، یا نہیں؟ اور ظاہر ہے کہ تخلیقی کیفیت اسی رحم میں پیدا کی جا سکتی ہے جس میں حیض کی صلاحیت ہو، حیض کے بغیر نطفے میں تخلیقی تغیر پیدا کرنا عادت اللہ کے خلاف ہے۔

کتاب الحیض سے یہ ربط تو ہو گیا، لیکن بخاری کا مقصد صرف اتنی بات ہے یا وہ اس سے آگے بھی کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ ابن بطالؒ نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ در اصل بخاریؒ کا مقصد ایک اختلافی مسئلہ کا فیصلہ کرنا ہے، مسئلہ یہ ہے کہ اگر حالت حمل میں عورت کو خون آئے تو اس خون کو حیض قرار دیا جائے گا، یا استحاضہ؟ احناف، حنابلہ اور اکثر حضرات کا مذہب یہ ہے کہ خون بیماری کا ہے، حیض سے اس کا کوئی تعلق نہیں، امام شافعیؒ کا قول جدید یہ ہے کہ ایام حمل میں بھی حیض آ سکتا ہے۔ امام بخاریؒ اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہؒ اور امام احمد کے ساتھ ہیں کہ ایام حمل میں آنے والا خون حیض نہیں ہو سکتا، اسی مقصد کے لیے بخاریؒ نے مخلقہ و غیر مخلقہ کا عنوان اختیار کیا ہے اور جو روایت بخاریؒ نے ترجمہ کے تحت پیش کی ہے، وہ اسی طرف مشیر ہے۔

**تشریح حدیث** ارشاد ہے کہ خداوند قدوس نے رحم کے اوپر ایک فرشتہ مقرر فرما دیا ہے، جو رحم میں نطفہ گرنے کے بعد دریافت کرتا ہے کہ اے رب اس کو نطفہ رکھا جائے گا، یا آگے بڑھایا جائے گا؟ اگر نطفہ سے کام لینا ہوتا ہے تو فرشتہ کو ہدایت کر دی جاتی ہے کہ رحم کا منہ بند کر دے، جب اجازت مل جاتی ہے، تو تربیت کر کے اس کو علقہ بنا دیتا ہے، اب جو وہ نطفہ سفید تھا، وہ دم بستہ ہو گیا، علقہ کے بعد پھر دریافت کرتا ہے کہ ختم کیا جائے گا، یا آگے بڑھائیں گے؟ اجازت کے بعد دم بستہ گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں تبدیل کرتا ہے، پھر آگے پوچھتا ہے اور اجازت کے بعد برابر منازل تربیت طے کراتا رہتا ہے، حتی کہ انسانی شکل میں آنے کے بعد نفخ روح کا مرحلہ آ جاتا ہے، پھر باری تعالیٰ اس کی خلقت کو پورا فرما دینا چاہتا ہے، تو فرشتہ پوچھتا ہے مذکر یا مونث؟ جیسا حکم ہوتا ہے، اسی قسم کے تصرفات فرشتہ کرتا رہتا ہے، پوچھتا ہے، نیک بخت ہوگا یا بد بخت؟ یعنی وہ ظاہری شکل تھی، باطن کیسا ہو؟ اس کے اعضاء فکر و عمل میں کیا صلاحیت رکھی جائے اور اس کا رزق کتنا ہے؟ عمر کتنی ہے؟ جیسا حکم ہوتا ہے وہی لکھ دیا جاتا ہے۔ یہ سوالات ایک وقت سے متعلق نہیں ہیں، بلکہ ہر دو سوالوں کی درمیانی مدت بروئے احادیث چالیس چالیس یوم مذکور ہے، جیسے بڑے کارخانے

والے اپنی مصنوعات کی عمر کی ضمانت دیتے ہیں، لیکن چوں کہ یہ ضمانت دینے والے انسان ہوتے ہیں جن کے احکام کا مدار اپنے ناقص تجربات ہوتے ہیں، اس لئے ضروری نہیں کہ ان کی دی ہوئی ضمانت پوری بھی ہو، لیکن یہاں رزق اور عمر کی حدیں مقرر کرنے والا عالم الغیب والشہادۃ ہے، اس کے علم میں تخلف وتاخر ناممکن ہے، اس لیے یہاں ہر کام اپنی میعاد اور مقررہ صورت کے مطابق ہوتا ہے۔

ابن بطالؒ کا بیان کردہ مقصد اس روایت سے اس طرح ثابت ہورہا ہے کہ حمل ٹھہرنے کے بعد رحم کا منھ بند کردیا جاتا ہے اور اس حیض کے خون سے قدرت بچہ کی غذا کا کام لیتی ہے، طبیعت مدبرہ للبدن اس خون کو صاف کرتی رہتی ہے، اور جو تلچھٹ سے لگی رہتی ہے، اس کی وساطت سے یہ خون بچہ کی غذا میں کام آتا رہتا ہے، اب حمل قرار پانے کے بعد دو ہی صورتیں ہیں: یا تو یہ بچہ مخلقہ ہوگا، یا غیر مخلقہ؟ یعنی یا تو اسے تام الخلقۃ بنانا منظور ہوگا، یا پورا بنانا نہ ہوگا، دوسری صورت میں یہ سقط بن کر گر جائے گا، مگر جب تک گرا نہیں ہے اس وقت تک رحم کا منھ بند ہے، جب وقت آئے گا، رحم کا منھ کھول کر گرا دیا جائے گا، اس لیے استقرار حمل کی صورت میں جو خون آرہا ہے، وہ حیض کا یقیناً اس لیے نہیں ہوسکتا کہ وہ رحم کی تہہ سے نہیں آرہا ہے، اس کا منھ بند ہے اور دم حیض رحم کی گہرائی سے آتا ہے۔ ابن بطالؒ کے بیان کردہ مقصد ترجمہ کے پیش نظر اس باب کا کتاب الحیض سے اچھا ربط نکل آیا اور معلوم ہوگیا کہ اس مسئلہ میں بخاریؒ کا کیا فیصلہ ہے؟ بڑی دلیل یہ ہے کہ رحم کی صفائی معلوم کرنے کے لیے حیض کی آمد کو علامت قرار دیا گیا ہے، اگر حمل کی حالت میں بھی حیض آسکتا ہو تو پھر اس سے استبراء رحم کا فیصلہ کس طرح ہوسکے گا؟ ابن بطال مالکی ہیں حنفی نہیں، حافظ ابن حجر کو یہاں بہت سے اشکالات پیش آئے ہیں، جو اپنی جگہ دیکھے جاسکتے ہیں۔

## [۱۸] بَابٌ كَيْفَ تُهِلُّ الْحَائِضُ بِالْحَجِّ وَالْعُمْرَةِ

(۳۱۹) حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِيْ حَجَّةِ الْوَدَاعِ فَمِنَّا مَنْ اَهَلَّ بِعُمْرَةٍ وَمِنَّا مَنْ اَهَلَّ بِحَجٍّ فَقَدِمْنَا مَكَّةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ مَنْ اَحْرَمَ بِعُمْرَةٍ وَلَمْ يُهْدِ فَلْيُحْلِلْ وَمَنْ اَحْرَمَ بِعُمْرَةٍ وَاَهْدٰى فَلَا يُحِلُّ حَتّٰى يَحِلَّ بِنَحْرِ هَدْيِهِ وَمَنْ اَهَلَّ بِحَجٍّ فَلْيُتِمَّ حَجَّهُ قَالَتْ فَحِضْتُ فَلَمْ اَزَلْ حَائِضًا حَتّٰى كَانَ يَوْمُ عَرَفَةَ وَلَمْ اُهْلِلْ اِلَّا بِعُمْرَةٍ فَاَمَرَنِيَ النَّبِيُّ ﷺ اَنْ اَنْقُضَ رَاسِيْ وَاَمْتَشِطَ وَاُهِلَّ بِالْحَجِّ وَاَتْرُكَ الْعُمْرَةَ فَفَعَلْتُ ذٰلِكَ حَتّٰى قَضَيْتُ حَجَّتِيْ فَبَعَثَ مَعِيَ عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنَ اَبِيْ بَكْرٍ فَاَمَرَنِيْ اَنْ اَعْتَمِرَ مَكَانَ عُمْرَتِيْ مِنَ التَّنْعِيْمِ. (گذشتہ: ۲۹۴)

**ترجمہ** | باب، حائضہ حج اور عمرے کا احرام کس طرح باندھے؟ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ہم رسول اکرم ﷺ کے ساتھ حجۃ الوداع میں نکلے، پس ہم میں سے بعض حضرات نے عمرے کا احرام باندھا اور بعض

حضرات نے حج کا احرام باندھا، رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے عمرے کا احرام باندھا ہے اور ہدی ساتھ نہیں لی ہے، تو حلال ہو جائے اور جس شخص نے عمرے کا احرام باندھا ہے اور ہدی ساتھ لی ہے، وہ حلال نہ ہو، حتی کہ وہ اپنی ہدی کو ذبح کرنے کے بعد حلال ہو اور جس شخص نے حج کا احرام باندھا ہے، وہ اپنا حج پورا کرلے۔ عائشہؓ فرماتی ہیں کہ مجھے حیض شروع ہو گیا اور میں حائضہ رہی، حتی کہ عرفہ کا دن آ گیا اور میں نے عمرے کا احرام باندھا تھا، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے حکم دیا کہ میں اپنا سر کھول لوں اور کنگھی کرلوں اور حج کا احرام باندھ لوں اور عمرہ ترک کردوں، چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا، حتی کہ میں نے ارکان حج ادا کرلئے، پھر رسول اللہ ﷺ نے میرے ساتھ عبدالرحمان بن ابوبکرؓ کو بھیجا اور مجھے حکم دیا کہ میں ترک کردہ عمرہ کی جگہ تنعیم سے عمرہ کرلوں۔

**مقصد ترجمہ** حافظ ابن حجرؒ اور دوسرے شارحین بخاری نے مقصد ترجمہ کے سلسلہ میں یہ کہا ہے کہ آیا حائضہ کے لیے حج یا عمرہ کا احرام باندھنا صحیح ہے؟ پھر روایت سے اس کا جواز اور اس کی صحت ثابت کی ہے، یہ معنی گو درست اور صحیح ہیں، لیکن اس میں "کیف" کے لفظ کی رعایت نہیں ہے "کیف" حالت سے سوال کے لیے ہوتا ہے، اس لئے ظاہری اور صاف معنی یہ ہوئے کہ حائضہ کس حالت و کیفیت اور صفت کے ساتھ احرام باندھے؟ یعنی غسل کرکے احرام باندھے یا بغیر غسل کے ہی احرام باندھ لے۔

روایت میں آیا ہے کہ سرکار رسالت مآب ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو حیض کی حالت میں یہ حکم دیا کہ سر کے بال کھول ڈالو اور کنگھی کرلو، یہ الفاظ غسل سے کنایہ ہیں، جیسا کہ اسی روایت کے دوسرے طریق میں "اغتسلی" کی تصریح ہے۔ اس ترجمہ کو لانے کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ حالت حیض میں غسل کرنے سے پاکی تو حاصل ہو گی نہیں، اس لیے اگر حائضہ احرام کے لیے غسل کرے تو یہ عمل بے سود تو نہیں ہے، روایت میں آ گیا کہ بے سود نہیں، کیوں کہ یہ غسل احرام کی سنت ہے، وہ حاصل ہو جائے گی، حائضہ کو حالت حیض میں اس سنت پر عمل کرنا چاہیے۔

## [۱۹] بَابُ إِقْبَالِ الْمَحِيْضِ وَإِدْبَارِهِ

وَكُنَّ نِسَآءٌ يَبْعَثْنَ اِلٰى عَائِشَةَ بِالدُّرَجَةِ فِيْهَا الْكُرْسُفُ فِيْهِ الصُّفْرَةُ فَتَقُوْلُ لَا تَعْجَلْنَ حَتّٰى تَرَيْنَ الْقَصَّةَ الْبَيْضَآءَ تُرِيْدُ بِذٰلِكَ الطُّهْرَ مِنَ الْحَيْضَةِ. وَبَلَغَ ابْنَةَ زَيْدِ بْنِ ثَابِتٍ اَنَّ نِسَآءً يَدْعُوْنَ بِالْمَصَابِيْحِ مِنْ جَوْفِ اللَّيْلِ يَنْظُرْنَ اِلَى الطُّهْرِ، فَقَالَتْ مَاكَانَ النِّسَاءُ يَصْنَعْنَ هٰذَا وَعَابَتْ عَلَيْهِنَّ.

(۳۲۰) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنْ هِشَامٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ اَبِیْ حُبَيْشٍ كَانَتْ تُسْتَحَاضُ فَسَاَلَتِ النَّبِیَّ ﷺ فَقَالَ ذٰلِكَ عِرْقٌ وَلَيْسَتْ بِالْحَيْضَةِ فَاِذَا اَقْبَلَتِ الْحَيْضَةُ فَدَعِی الصَّلٰوةَ وَاِذَا اَدْبَرَتْ فَاغْتَسِلِیْ وَصَلِّیْ.

**ترجمہ** باب، حیض کی آمد اوراس کی بازگشت کا بیان۔عورتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس ڈبیہ میں کرسف کر کے بھیجتیں جس میں زردی ہوتی، تو حضرت عائشہؓ فرماتیں، جلدی نہ کرو، یہاں تک کہ چونے کی طرح سفیدی نہ دیکھو، وہ اس سے حیض سے پاک ہونے کا ارادہ فرماتی تھیں اورزید بن ثابت کی بیٹی کو یہ بات معلوم ہوئی کہ عورتیں درمیانی شب میں چراغ منگاتی ہیں اور طہر کے بارے میں دیکھتی ہیں، توانھوں نے فرمایا کہ پہلے عورتیں ایسانہ کرتی تھیں اورانھوں نے اس کو معیوب جانا۔حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیشؓ کو استحاضہ کا عارضہ تھا، توانھوں نے رسول اکرم ﷺ سے دریافت کیا، آپ نے فرمایا کہ یہ رگ کا خون ہے، حیض نہیں ہے، پس جب حیض کی آمد ہوتو نماز چھوڑ دواور جب حیض ختم ہوجائے، توغسل کرواور نماز ادا کرو۔

**مقصد ترجمہ** حیض کی آمد اوراس کی بازگشت کیسے معلوم کی جائے؟ آیا اس سلسلے میں رنگوں کا اعتبار ہے کہ سیاہ او رسرخ رنگ کو تو حیض شمار کریں اور دوسرے مٹیالے سبز اور زرد رنگوں کو حیض نہ مانیں، یاصورت یہ ہے کہ ایام حیض میں ہر قسم کی رنگین رطوبت کو حیض کہاجائے گا اور عادت کا اعتبار ہوگا؟ بخاری نے اس سلسلہ میں جوعنوان اختیار کیاہے، اس میں کسی چیز کی صراحت نہیں ہے، البتہ ترجمہ کے ذیل میں جو آثار نقل فرمائے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بخاری اس مسئلہ میں امام اعظمؒ کے ساتھ ہیں۔

دیکھئے پہلا اثر نقل فرمایا ہے، اس میں یہ ہے کہ عورتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں ڈبیہ کے اندر کرسف بند کر کے تحقیق حال کی غرض سے بھیجا کرتی تھیں، تاکہ یہ معلوم کرسکیں کہ حیض ختم ہوگیا یانہیں؟ حضرت عائشہؓ اسے دیکھ کرفرماتیں، جلدی نہ کرو "حتی ترین القصة البیضاء" یہاں تک کہ بالکل چونے جیسی سفید گدی نہ دیکھ لو، اس کے دو معنی ہوسکتے ہیں: ایک تو گدی کا سفید نکلنا، اس کے سوکھا نکلنے سے کنایہ ہو، یعنی وہ کرسف یا گدی جس طرح رکھی گئی تھی، اسی طرح سوکھی پاکھی نکل آئے، تو یہ علامت ہوگی کہ اب کوئی رطوبت باقی نہیں ہے، اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ عورتیں جلدی نہ کریں، حتی کہ وہ اس کرسف کے اوپر ایسی سفید رطوبت نہ دیکھیں جس کے اندر کسی قسم کا ہلکے سے ہلکا رنگ بھی شامل نہ ہو، بالکل چونے کے رنگ کی رطوبت ہو، سفید رطوبت حیض کے اختتام کی علامت ہے، اس اثر سے معلوم ہوا کہ حیض کے معاملہ میں الوان کا اعتبار نہیں، کیوں کہ حضرت عائشہؓ نے یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ تمام الوان حیض شمار ہوں گے، خواہ کتنا ہی ہلکے سے ہلکا رنگ ہواور ظاہر ہے کہ یہ معاملہ ایسا نہیں ہے، جسے حضرت عائشہؓ اپنی رائے سے فیصل کرسکیں، بلکہ یقیناً حضرت عائشہؓ نے یہ فیصلہ سرکار رسالت مآب ﷺ سے سننے کے بعد ارشاد فرمایا ہوگا، اس لیے یہ اگر چہ حضرت عائشہؓ کا قول ہے، مگر حکماً مرفوع ہے۔

دوسرا اثر یہ ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ کی صاحبزادی کو یہ بات پہونچی کہ عورتیں رات کو چراغ منگا کر کرسف دیکھتی ہیں، توانھوں نے اس فعل کو اچھا نہیں سمجھا، بلکہ معیوب قرار دیا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ معیوب قرار دینے کی دو وجہ

ہوسکتی ہیں، ایک تو یہ کہ چراغ کی روشنی میں رات کے وقت ہلکے رنگ اور سفیدی میں امتیاز ہونہیں پاتا، عورت سمجھے گی کہ میں پاک ہوں، اس لیے غسل کر کے عشاء کی نماز پڑھے گی، حالاں کہ وہ ابھی پاک نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسا کرنا تعمق ہے، شریعت نے انسان کو جس چیز کا مکلّف نہیں قرار دیا ہے، انسان کو چاہئے کہ اس سلسلہ میں اپنے اوپر خواہ مخواہ پابندیاں عائد نہ کرے، عورتیں رات کے وقت چراغ کی روشنی میں کرسف اسی غرض سے دیکھتی تھیں کہ اگر حیض منقطع ہوگیا تو غسل کر کے عشاء کی نماز پڑھیں، ورنہ اگر صبح کو گدی سفید دیکھی تو اس کا مطلب ہوگا کہ حیض رات کے کسی حصہ میں ختم ہوگیا تھا، اس لیے اب غسل کر کے عشاء کی نماز قضا کرنا پڑے گی، مگر شریعت نے عورتوں کو اس سلسلے میں مجبور نہیں کیا، بلکہ اس کی گنجائش رکھی ہے کہ رات کے وقت جو کرسف رکھو، اسے دیکھ لو، رنگین ہے، تو سلسلہ باقی ہے اور سفید ہے، تو سلسلہ ختم ہوگیا، غسل کرو اور عشاء کی نماز قضا کرلو، عشاء کی نماز قضا ہونے پر کوئی مواخذہ نہیں ہے، کیوں کہ مواخذہ اختیاری قضا پر ہوتا ہے، حضرت زید بن ثابتؓ کی صاحب زادی نے خواہ مخواہ تعمق فی الدین کے سبب عورتوں کے اس عمل کو معیوب قرار دیا، پھر رات کے وقت ہلکے رنگ اور سفیدی کے درمیان امتیاز مشکل ہے، اس لیے بھی یہ طریقہ درست نہیں۔

ان دونوں آثار سے معلوم ہوگیا کہ اقبال اور ادبار کے سلسلے میں بخاریؒ کا رجحان کیا ہے؟ اقبال کی کیفیت یہ ہوگی کہ اپنے وقت پر رنگین رطوبت آئے اور یہ رطوبت ختم ہو تو یہ ادبار ہے، الوان کا اعتبار نہیں ہے کہ سیاہ اور سرخ رنگ ہی کا اعتبار کریں، جیسا کہ شوافع کا مسلک ہے، ان کا مستدل ابوداؤد کی روایت "**فانہ دم اسود یعرف فاذا کان ذلك فامسكي عن الصلوة**" وغیرہ ہیں، یعنی حیض کا خون خاص قسم کا سیاہ ہوتا ہے، جو پہچان لیا جاتا ہے، احناف رنگوں کے درمیان اس امتیاز کے قائل نہیں، وہ کہتے ہیں کہ "**دم اسود یعرف**" کلیہ ہے، یا جزئیہ؟ کلیت ہمیں تسلیم نہیں اور جزئیت تسلیم ہے، مگر ہمارے لیے مضر نہیں، کلیت تسلیم نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر عورت کا خون سیاہ ہو، ایسا نہیں ہے، اگر عورت کا مزاج معتدل ہو، غذا بھی معتدل ہو اور آب و ہوا بھی معتدل ہو تو تجربہ شاہد ہے کہ حیض کی رنگت سرخ ہوگی اور اگر گرم غذائیں، گرم آب و ہوا، یا مزاج کی خرابی سے احتراقی کیفیت پیدا ہوگئی ہے، تو خون سیاہی مائل ہوگا۔ اور جن بلاد میں سردی بہت زیادہ پڑتی ہے، وہاں خون کی رنگت کا بالکل سرخ ہونا بھی ضروری نہیں یا فرض کیجئے کہ عورت سبزی بہت زیادہ استعمال کرتی ہے اور معدہ کی قوت کمزور ہے، تو جس طریقے سے براز میں مختلف رنگ ظاہر ہوتے ہیں، اسی طرح اجزاء غذائیہ خون میں بھی شامل ہوجائیں گے اور طرح طرح کے رنگ ظاہر ہوں گے، اس لیے احناف کے یہاں رنگوں پر حیض کا مدار نہیں رکھا گیا، البتہ کسی عورت کو عادت کے موافق یہ بات معلوم ہو کہ اس کے حیض کی رنگت سیاہ ہوتی ہے یا سرخ تو چونکہ اصل چیز عادت ہے تو ایسی صورت میں الوان کو معرف قرار دیا جاسکتا ہے، مدار علیہ نہیں کہا جاسکتا "**فانہ دم اسود یعرف**" کا یہی مطلب ہے کہ یہ ایک جزئیہ ہے، بعض حالات میں معرف کے درجہ میں اس کا بھی اعتبار ہے، بہر کیف بخاریؒ نے اس مسئلہ میں حنفیہ کا ساتھ دیا ہے۔

## [۲۰] بَابٌ لا تَقْضِیْ الْحَائِضُ الصَّلٰوۃَ

وَقَالَ جَابِرٌ وَّ اَبُوْسَعِیْدٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ تَدَعُ الصَّلٰوۃَ

(۳۲۱) حَدَّثَنَا مُوْسٰی بْنُ اِسْمَاعِیْلَ قَالَ ثَنَا هَمَّامٌ قَالَ ثنا قَتَادَۃُ قَالَ حَدَّثَتْنِیْ مُعَاذَۃُ اَنَّ امْرَاَۃً قَالَتْ لِعَائِشَۃَ اَتُجْزِیْٔ اِحْدَانَا صَلٰوتَهَا اِذَا طَهُرَتْ فَقَالَتْ اَحَرُوْرِیَّۃٌ اَنْتِ؟ قَدْ كُنَّا نَحِیْضُ مَعَ النَّبِیِّ ﷺ فَلَا یَاْمُرُنَا بِهٖ اَوْ قَالَتْ فَلَا نَفْعَلُهٗ۔

**ترجمہ** باب، حائضہ نماز کی قضا نہ کرے گی اور جابر اور ابوسعید رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ حائضہ نماز چھوڑ دے گی۔ معاذہ حدیث بیان کرتی ہیں کہ ایک عورت نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ سے عرض کیا، کیا جب ہم میں سے کوئی عورت حیض سے پاک ہو تو وہ نماز کی قضا کرے؟ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ کیا تو حروریہ ہے؟ ہم کو رسول اکرم ﷺ کے زمانہ میں حیض آتا تھا اور آپ ہم کو نماز کا حکم نہ فرماتے تھے، یا یہ فرمایا کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ حائضہ نہ ایام حیض میں نماز پڑھے گی، نہ طہارت کے بعد نماز قضا کرے گی، یہ دونوں عمل اس کے لیے قطعاً حرام ہیں، اس مقصد پر استدلال کے لئے شارحین نے یہ تقریر کی ہے کہ روزے کے سلسلے میں حدیث میں "تترك" آیا ہے اور نماز کے سلسلے میں "لا تقضی"۔ "تترك" کا مفہوم یہ ہے کہ ایام حیض میں ترک ہوگا اور طہارت کے بعد قضا لازم ہوگی۔ اور "لاتقضی" کا مطلب یہ ہے کہ ایام حیض اور طہارت دونوں حالتوں میں ایام حیض کی نمازیں چھوڑنا لازم ہیں، لیکن ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ ترجمہ دو جز سے مرکب ہے، ایک تو یہ کہ نماز چھوڑ دی جائے گی، دوسرے یہ کہ قضاء نہیں کی جائے گی، پہلے جز کے اثبات میں امام بخاریؒ نے حضرت جابر اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ کا اثر پیش کیا ہے، تدع الصلوٰۃ نماز چھوڑ دے، رہا دوسرا جز کہ طہارت کے بعد قضا بھی نہ کرے، تو اس کے لیے حضرت عائشہؓ کی روایت پیش کی ہے، جس میں یہ آیا ہے کہ ایک عورت نے حضرت عائشہؓ سے معلوم کیا کہ کیا حیض کے بعد ایام حیض کی نمازوں کی قضا کرنا ہوگی؟ جواب دیا کہ تم حروریہ ہو؟ "حروراء" ایک جگہ کا نام ہے، کوفہ سے دو میل کے فاصلے پر واقع ہے، خوارج کا فتنہ سب سے پہلے یہیں سے پھوٹا اور یہاں خوارج کی تعداد بھی زیادہ تھی، خوارج کے یہاں ایام حیض کی نمازوں کی قضا واجب ہے، تو حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ کیا تم حروریہ ہو، جو ایام حیض کی نمازوں کی قضا واجب کہتے ہیں؟ عورت نے عرض کیا کہ ایسا نہیں ہے، بلکہ تحقیق مسئلہ کی غرض سے معلوم کر رہی ہوں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ہم پیغمبر علیہ السلام کے زمانہ میں آپ کے ساتھ حیض میں مبتلا ہوتے تھے اور نمازیں نہیں پڑھی جاتی تھیں اور آپ نے قضا کا حکم نہیں فرمایا، دوسروں کا ذکر نہیں، بلکہ خود اپنے بارے میں فرماتی ہیں کہ ہم جو آپ کے ساتھ رہتے تھے، ہمارا یہ حال تھا

کہ ہم ایام حیض میں نمازیں نہیں پڑھتے تھے اور آپ نے قضا کا حکم نہیں دیا، معلوم ہوا کہ ایام حیض کی نمازوں کی قضا نہیں ہے اگر قضا ضروری ہوتی تو آپ ضرور اس کا حکم فرماتے، ترجمہ کا دوسرا جز روایت سے ثابت ہو گیا۔

## [۲۱] بَابُ النَّوْمِ مَعَ الْحَائِضِ وَهِيَ فِيْ ثِيَابِهَا

(۳۲۲) حَدَّثَنَا سَعْدُ بْنُ حَفْصٍ قَالَ حَدَّثَنَا شَيْبَانُ عَنْ يَحْيٰى عَنْ اَبِىْ سَلَمَةَ عَنْ زَيْنَبَ ابْنَةِ اَبِىْ سَلَمَةَ حَدَّثَتْهُ اَنَّ اُمَّ سَلَمَةَ قَالَتْ حِضْتُ وَاَنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِيْ الْخَمِيْلَةِ فَانسَلَلْتُ فَخَرَجْتُ مِنْهَا فَاَخَذْتُ ثِيَابَ حَيْضَتِيْ فَلَبِسْتُهَا فَقَالَ لِيْ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَنُفِسْتِ؟ قُلْتُ نَعَمْ فَدَعَانِيْ فَاَدْخَلَنِيْ مَعَهُ فِيْ الْخَمِيْلَةِ قَالَتْ وَحَدَّثَتْنِيْ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ يُقَبِّلُهَا وَهُوَ صَائِمٌ وَكُنْتُ اَغْتَسِلُ اَنَا وَالنَّبِيُّ ﷺ مِنْ اِنَاءٍ وَاحِدٍ مِنَ الْجَنَابَةِ. (گذشتہ:۲۹۸)

**ترجمہ** باب، عورت کے ساتھ سونا، جب کہ وہ حیض کے کپڑوں میں ہو۔ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے فرمایا کہ مجھے حیض شروع ہو گیا اور میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چھوردار چادر میں تھی، میں آہستہ سے اٹھی اور اس چادر سے نکل گئی، پھر میں نے اپنے حیض کے کپڑے لئے اور ان کو پہنا، تو مجھ سے آپ نے فرمایا، کیا حیض شروع ہو گیا؟ عرض کیا کہ جی ہاں، پھر آپ نے مجھ کو بلایا اور اپنے ساتھ چادر میں لے لیا، ام سلمہؓ نے یہ بھی بیان کیا کہ آپ روزے کی حالت میں تقبیل فرماتے تھے اور میں اور نبی اکرم ﷺ ایک ہی برتن سے غسل جنابت کرتے تھے۔

**مقصد ترجمہ اور تشریح** یعنی حائضہ حیض کے زمانہ میں خاوند کے ساتھ سو سکتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ کپڑے پہنے ہو، تاکہ مرد کا بدن عورت کے اس حصہ سے مس نہ ہو سکے، جس کا چھونا اس حالت میں جائز نہیں، کپڑے پہن کر لیٹے گی تو کپڑے سے کپڑے کا اتصال ہوگا، بدن کا بدن سے مس نہ ہوگا۔

حدیث گزر چکی ہے، یہاں " خمیلة " کا لفظ استعمال ہوا ہے اور دونوں جگہ معرفہ ہے اور جب ایک بیان میں کسی معرفہ کو دوبارہ معرفہ کی شکل میں دہراتے ہیں تو ثانی سے مراد عین اول ہی ہوتا ہے، اس لیے معنی یہ ہوں گے کہ جس چادر میں آں حضور ﷺ آرام فرما رہے تھے، اسی میں پھر بلا لیا، بخاریؒ کا مقصد ثابت ہو گیا کہ خاوند کے ساتھ ایام حیض میں عورت کے لیے سونا اور لیٹنا درست ہے۔

## [۲۲] بَابُ مَنِ اتَّخَذَ ثِيَابَ الْحَيْضِ سِوٰى ثِيَابِ الطُّهْرِ

(۳۲۳) حَدَّثَنَا مُعَاذُ بْنُ فَضَالَةَ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ يَحْيٰى عَنْ اَبِىْ سَلَمَةَ عَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ اَبِىْ سَلَمَةَ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ بَيْنَا اَنَا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ مُضْطَجِعَةً فِيْ خَمِيْلَةٍ حِضْتُ

فَانْسَلَلْتُ فَاَخَذْتُ ثِيَابَ حَيْضَتِيْ فَقَالَ اَنُفِسْتِ فَقُلْتُ نَعَمْ فَدَعَانِيْ فَاضْطَجَعْتُ مَعَهُ فِي الْخَمِيْلَةِ. (گذشتہ:۲۹۸)

**ترجمہ** باب، جس نے حیض کے کپڑے پاکی کے کپڑوں سے علیحدہ بنائے۔ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ اس درمیان میں کہ میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ چادر میں لیٹی تھی، حیض شروع ہوگیا، میں آہستہ سے اٹھی اور میں نے حیض کے کپڑے لیے، آپ نے فرمایا، کیا حیض شروع ہوگیا؟ عرض کیا جی ہاں! پھر آپ نے مجھے بلایا اور میں آپ کے ساتھ چادر میں لیٹ گئی۔

**مقصد ترجمہ** دو معنی ہوسکتے ہیں: ایک تو یہ کہ حالت حیض کے کپڑے طہر سے الگ ہوں یعنی کوئی عورت اگر ایسا انتظام رکھے کہ حیض کے زمانے کے کپڑے مخصوص کرلے تو یہ عمل قابل اعتراض نہیں ہے، یہ نہ اسراف ہے اور نہ شرعاً ناپسندیدہ، بلکہ بشرط گنجائش ایسا انتظام اولیٰ اور بہتر ہے، غالباً ترجمہ رکھنے کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ عہد نبوی میں عام طور پر عورتوں کا ایک ہی لباس ہوتا تھا، اندیشہ تھا کہ اس عمل کو اسراف میں داخل نہ سمجھ لیا جائے، اس لیے بخاریؒ نے ترجمہ رکھ دیا۔ دوسرے معنی یہ ہوسکتے ہیں کہ ''ثیاب الحیض'' سے مراد گدی اور لنگوٹ وغیرہ لیا جائے، یعنی کرتہ، پائجامہ اور دوپٹہ تو عورت کا لباس ہے ہی، ایام حیض میں حیض کی گندگی سے حفاظت کے لیے اگر کچھ اور اضافہ کرلیا جائے تو ظاہر ہے کہ اس کے جواز اور پسندیدہ ہونے میں کسی کو کیا تامل ہوسکتا ہے؟ روایت گزر چکی ہے۔

## [۲۳] بَابُ شُهُوْدِ الْحَائِضِ الْعِيْدَيْنِ وَدَعْوَةَ الْمُسْلِمِيْنَ وَيَعْتَزِلْنَ الْمُصَلّٰى

(۳۲۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ عَنْ اَيُّوْبَ عَنْ حَفْصَةَ قَالَتْ كُنَّا نَمْنَعُ عَوَاتِقَنَا اَنْ يَّخْرُجْنَ فِي الْعِيْدَيْنِ فَقَدِمَتْ اِمْرَأَةٌ فَنَزَلَتْ قَصْرَ بَنِيْ خَلَفٍ فَحَدَّثَتْ عَنْ اُخْتِهَا وَكَانَ زَوْجُ اُخْتِهَا غَزَامَعَ النَّبِيِّ ﷺ ثِنْتَيْ عَشْرَةَ غَزْوَةً وَكَانَتْ اُخْتِيْ مَعَهُ فِيْ سِتٍّ قَالَتْ فَكُنَّا نُدَاوِي الْكَلْمٰى وَنَقُوْمُ عَلَى الْمَرْضٰى فَسَأَلَتْ اُخْتِي النَّبِيَّ ﷺ اَعَلٰى اِحْدَانَا بَاْسٌ اِذَا لَمْ يَكُنْ لَهَا جِلْبَابٌ اَنْ لَا تَخْرُجَ قَالَ لِتُلْبِسْهَا صَاحِبَتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا وَلْتَشْهَدِ الْخَيْرَ وَدَعْوَةَ الْمُسْلِمِيْنَ فَلَمَّا قَدِمَتْ اُمُّ عَطِيَّةَ سَاَلْتُهَا اَسَمِعْتِ النَّبِيَّ ﷺ قَالَتْ بِاَبِيْ نَعَمْ وَكَانَتْ لَا تَذْكُرُهُ اِلَّا قَالَتْ بِاَبِيْ سَمِعْتُهُ يَقُوْلُ يَخْرُجُ الْعَوَاتِقُ وَذَوَاتُ الْخُدُوْرِ وَالْحُيَّضُ وَلْيَشْهَدْنَ الْخَيْرَ وَدَعْوَةَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَتَعْتَزِلُ الْحُيَّضُ الْمُصَلّٰى قَالَتْ حَفْصَةُ فَقُلْتُ الْحُيَّضُ فَقَالَتْ اَلَيْسَ تَشْهَدُ عَرَفَةَ وَكَذَا وَكَذَا. (آئندہ:۳۵۱، ۹۷۱، ۹۷۴، ۹۸۰، ۹۸۱، ۱۶۵۲)

**ترجمہ** باب، حائضہ کا عیدین اور مسلمانوں کی دعاؤں میں شریک ہونا اور یہ کہ وہ عیدگاہ سے الگ رہیں۔ حضرت حفصہؓ سے روایت ہے کہ ہم جوان لڑکیوں کو عیدین میں نکلنے سے منع کیا کرتے تھے، ایک عورت آئی اور

قصر بنی خلف میں اتری، اس نے اپنی بہن کے واسطے سے یہ حدیث سنائی اور اس کی بہن کے شوہر نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ بارہ غزوات میں شرکت کی تھی اور میری بہن اپنے شوہر کے ساتھ چھ غزوات میں شریک تھی۔ اس نے بتلایا کہ ہم زخمیوں کی دوا کیا کرتے تھے اور مریضوں کی تیمارداری کرتے تھے، میری بہن نے نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا، کیا ہم میں سے کسی عورت پر کچھ حرج ہے جب کہ اس کے پاس چادر نہ ہو، یہ کہ وہ گھر سے نہ نکلے؟ فرمایا اس کی بہن اس کو چادر پہنا دے اور مجالس خیر میں اور مسلمانوں کی دعاؤں میں شریک ہو، پس جب ام عطیہؓ آئیں تو میں نے ان سے دریافت کیا، کیا تم نے نبی اکرم ﷺ سے ایسا سنا ہے، انھوں نے فرمایا، میرے باپ آپ پر فدا ہوں اور ام عطیہ آپ کا ذکر نہ کرتی تھیں، مگر "بابی" (میرے باپ آپ پر فدا ہوں) کہتی تھیں کہ ہاں میں نے آپ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جوان لڑکیاں اور پردہ نشین عورتیں اور حیض والی عورتیں نکلیں، خیر کی مجلسوں اور مسلمانوں کی دعاؤں میں شریک ہوں اور حائضہ عورتیں عیدگاہ سے الگ رہیں، حفصہؓ کہتی ہیں کہ میں نے ام عطیہ سے پوچھا کیا حائضہ بھی شریک ہوسکتی ہیں؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ کیا حائضہ عرفہ میں حاضر نہیں ہوتی اور کیا ایسا اور ایسا نہیں ہے؟

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ حائضہ کے لیے عیدین میں شرکت کرنا اور خیر و برکت، وعظ و ارشاد کی مجلسوں میں شرکت کرنا سب جائز اور درست ہے، مگر اتنی بات ہے کہ حائضہ عورتیں عیدگاہ سے الگ رہیں، اس لیے نہیں کہ عیدگاہ کا حکم مسجد کا ہے، بلکہ اس لیے کہ جب وہ نماز نہیں پڑھتی ہیں، تو نمازیوں کے ساتھ گھلنے ملنے اور اس کے پاس بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے؟ لیکن اب عیدگاہ کا حکم بدل گیا ہے، پہلے عیدگاہ مسجد کی شکل میں نہ ہوتی تھی، اس لیے حائضہ اور جنبی کو بھی اندر جانے کی اجازت تھی، اب عیدگاہیں مکمل مسجد کی صورت میں ہوتی ہیں، اس لیے ان کا حکم بعینہ مسجد کا ہے، اسی طرح دور حاضر میں عورتوں کو عیدگاہ کی نماز میں شرکت سے بھی روکا گیا ہے، صدر اول میں اول تو اتنا اندیشۂ فتنہ و فساد نہیں تھا، دوسرے یہ کہ اسلام کی شان و شوکت ظاہر کرنے کے لئے ضروری تھا کہ مرد عورت سب مل کر عید کی نماز میں شرکت کریں، اب فتنہ کا بھی زیادہ اندیشہ ہے اور اظہار شان و شوکت کی بھی ضرورت نہیں اس لیے روکا جائے گا۔

متاخرین کا فیصلہ یہی ہے کہ جب عورت کو محلّہ کی مسجد میں بھی جانے کی اجازت نہیں ہے اور گھر میں صحن سے دالان اور دالان سے کمرے اور کمرے میں بھی کونے کی جگہ بہتر ہے، تو عیدین میں شرکت کی اجازت کیسے دی جائے گی؟ مسئلہ کتاب العیدین میں آئے گا۔

**تشریح حدیث** حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم جوان لڑکیوں کو عیدین میں شریک ہونے سے روکتے تھے، کہ ایک عورت باہر سے آئیں اور قصر[1] بنی خلف میں فروکش ہوئیں، انھوں نے یہ حدیث سنائی کہ میری بہن جن کے خاوند آں حضور ﷺ کے ساتھ بارہ غزوات میں اور وہ خود اپنے شوہر کے ساتھ چھ غزوات میں

[1] بصرہ میں ایک عمارت تھی، خلف بن طلحہ کی طرف منسوب کرتے ہوئے اس کا نام قصر بنی خلف تھا۔ ۱۲

شریک رہیں، انھوں نے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام سے دریافت کیا کہ اگر کسی عورت کے پاس چادر نہ ہو اور گھر ہی میں رہے تو کیا مضائقہ ہے؟ ارشاد ہوا کہ اپنی بہن سے چادر مستعار لے کر جائے، یا ایک بڑی چادر میں دو عورتیں چلی جائیں، حاصل یہ ہے کہ عیدگاہ میں تو جانے کا اہتمام ہو، مگر بے پردگی کی اجازت نہیں ہے، پھر عیدگاہ کی کوئی خصوصیت نہیں، بلکہ خیر کے ہر موقعہ پر مجلس وعظ وارشاد، نماز استسقا یا دعا کی کوئی بھی اجتماعی صورت ہو، ہر موقعہ پر شرکت درست ہے، انھوں نے جب یہ حدیث سنائی تو معلوم ہوا کہ ہمارا لڑکیوں کو روکنے کا عمل درست نہ تھا۔

اب یہ عورت کون ہیں؟ روایت میں آیا ہے کہ جب ام عطیہؓ آئیں تو ہم نے ان سے معلوم کیا، معلوم ہوا کہ وہ عورت ام عطیہ کی بہن تھیں، جب ام عطیہ آئیں تو براہ راست معلوم کیا گیا، انھوں نے بتلایا کہ جی ہاں! میں نے نبی اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ (ان کی یہ عادت تھی کہ جب بھی نبی کریم ﷺ کا ذکر فرماتیں، تو ''بابی'' سے اس ذکر کو شروع فرماتیں، یعنی میرے باپ ماں آپ پر قربان ہوں) آپ نے ایسا فرمایا، غرض انھوں نے صاف طور پر یہ فرمایا کہ آپ نے (عواتق یہ عاتقہ کی جمع ہے، یعنی جو بلوغ کے قریب ہیں اور عنقریب ماں باپ کی قید سے آزاد ہونے والی ہیں) اور پردہ نشین اور حیض والی سب نکلیں، حیرت سے معلوم کیا کہ حائضہ اور مجالس خیر میں شرکت کرے؟ فرمایا کیوں نہیں؟ کیا عرفات، منی، مزدلفہ وغیرہ میں شرکت نہیں کرتی؟ بظاہر یہ روایت ایک مجہول عورت کے واسطے سے منقول ہے اور اس سے لحاظ بخاری میں اس کا ذکر بے معنی ہی نہیں، بلکہ صحیح بھی نہیں، لیکن جب یہ معلوم ہو گیا کہ امراۃ مجہولہ کی بہن ام عطیہؓ ہیں اور ام عطیہؓ کی آمد پر حفصہؓ نے براہ راست ان سے یہ تمام باتیں معلوم کرلیں، تو اب درمیان سے مجہولہ کا واسطہ ختم ہو گیا، خوب سمجھ لیں۔

## [ ٢٤ ] بَابٌ اِذَا حَاضَتْ فِيْ شَهْرٍ ثَلٰثَ حِيَضٍ

وَمَا يُصَدَّقُ النِّسَآءُ فِي الْحَيْضِ وَالْحَمَلِ فِيْمَا يُمْكِنُ مِنَ الْحَيْضِ لِقَوْلِ اللهِ تَعَالٰى وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَاخَلَقَ اللهُ فِيْ اَرْحَامِهِنَّ. وَيُذْكَرُ عَنْ عَلِيٍّ وَّشُرَيْحٍ اِنْ جَاءَ تْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ بِطَانَةِ اَهْلِهَا مِمَّنْ يُرْضٰى دِيْنُهٗ اَنَّهَا حَاضَتْ ثَلٰثاً فِيْ شَهْرٍ صُدِّقَتْ. وَقَالَ عَطَآءٌ اَقْرَاءُ هَامَا كَانَتْ وَبِهٖ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ. وَقَالَ عَطَاءٌ الْحَيْضُ يَوْمٌ اِلٰى خَمْسَةَ عَشَرَ. وَقَالَ مُعْتَمِرٌ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ سَاَلْتُ ابْنَ سِيْرِيْنَ عَنِ الْمَرْاَةِ تَرَى الدَّمَ بَعْدَ قُرْئِهَا بِخَمْسَةِ اَيَّامٍ قَالَ النِّسَآءُ اَعْلَمُ بِذَالِكَ .

(۳۲۵) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ اَبِيْ رَجَاءٍ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْاُسَامَةَ قَالَ سَمِعْتُ هِشَامَ بْنَ عُرْوَةَ قَالَ اَخْبَرَنِيْ اَبِيْ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ اَبِيْ حُبَيْشٍ سَاَلَتِ النَّبِيَّ ﷺ قَالَتْ اِنِّيْ اُسْتَحَاضُ فَلَا اَطْهُرُ اَفَادَعُ الصَّلٰوةَ؟ فَقَالَ لَا اِنَّ ذٰلِكِ عِرْقٌ وَّلٰكِنْ دَعِي الصَّلٰوةَ قَدْرَ

الْأَيَّامِ الَّتِي كُنْتِ تَحِيضِينَ فِيهَا ثُمَّ اغْتَسِلِي وَصَلِّي .

**ترجمہ** باب، جب عورت کو ایک مہینہ میں تین حیض ہو جائیں اور یہ کہ عورتوں کی تصدیق حیض اور حمل کے بارے میں ان چیزوں میں کی جائے گی، جو حیض کے سلسلے میں ممکن ہوں، باری تعالی کا ارشاد ہے: اور ان عورتوں کے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ وہ اس چیز کو چھپائیں جو اللہ تعالی نے ان کے رحم میں پیدا کی ہے۔ حضرت علیؓ اور حضرت شریح سے منقول ہے کہ اگر عورت اپنے گھر کے مخصوص افراد میں سے کوئی گواہ لے آئے کہ اس کو ایک ماہ میں تین بار حیض ہوا ہے تو اس کی تصدیق کی جائے گی۔ عطاء نے کہا کہ اس کے حیض کی وہی صورت ہوگی جو پہلے سے تھی اور یہی ابراہیم نے کہا اور عطاء نے کہا کہ حیض ایک دن سے پندرہ دن تک ہے، معتمر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے ابن سیرین سے اس عورت کے بارے میں دریافت کیا جو حیض سے فارغ ہونے کے پانچ دن بعد پھر خون دیکھے، انھوں نے کہا کہ عورتیں اس معاملہ میں زیادہ جاننے والی ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ حضرت فاطمہؓ بنت ابی حبیش نے رسول اکرم ﷺ سے پوچھا کہ مجھے استحاضہ ہوتا ہے اور میں پاک نہیں ہوتی، کیا میں نماز چھوڑ دوں؟ آپ نے فرمایا نہیں، یہ رگ کا خون ہے، لیکن نماز اتنے دنوں کی مقدار میں چھوڑ دو جن میں تمہیں پہلے حیض آتا تھا، پھر غسل کرو اور نماز پڑھو۔

**مقصد ترجمہ** یعنی اگر عورت یہ دعوی کرے کہ اس کو ایک ماہ میں تین حیض آ گئے ہیں تو اس کی تصدیق کی جائے گی یا نہیں؟ اس دعوے کا فائدہ یہ ہوگا کہ مثلاً یہ عورت مطلقہ تھی تو اس کا ایک ماہ میں تین حیض گزر جانے کا دعوی کرنا یہ مفہوم رکھتا ہے کہ اس کی عدت ختم ہوگئی، اب اس کو دوسرے نکاح کی آزادی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ایسی صورت میں اس عورت کا قول قاضی کے یہاں قبول ہوگا یا نہیں؟ امام بخاری فرماتے ہیں ”ومایصدق النساء فی ذلك“ یعنی حیض کے معاملہ میں اور اسی طرح حمل کے معاملے میں عورت کی بات معتبر ہوگی یعنی اگر عورت قسم کے ساتھ یہ بیان دے کہ اس کو دو یا تین حیض ہو گئے ہیں، یا یہ کہے کہ یہ زمانہ بھی حیض ہی کا ہے، تو قسم لے کر اس کی بات کا اعتبار کریں گے، اسی طرح حمل کے معاملہ میں بھی قسم لے کر اس کی بات کا اعتبار کیا جائے گا، مگر شرط لگاتے ہیں ” فیمایمکن“ یعنی اگر یہ تین حیض کا دعوی ایسی مدت میں ہے کہ تین حیض کا امکان ہے تو صحیح ہے، ورنہ اگر امکانی مدت سے کم میں یہ دعوی ہے تو اس کا اعتبار نہیں، حاصل یہ ہے کہ حیض وحمل کے بارے میں اعتبار تو عورت کے قول کا ہے مگر دیکھا جائے گا کہ یہ دعوی امکانی حد کے اندر ہے کہ قبول کر لیا جائے یا امکانی حد کے اندر نہیں ہے کہ رد کر دیا جائے۔ دلیل میں بخاری لاتے ہیں ” وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللهُ فِي اَرْحَامِهِنَّ الاية“ اس ارشاد ربانی کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالی نے عورتوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ اپنی اندرونی حالت کو نہ چھپائیں، اگر حیض موجود ہے تو اس کو ظاہر کریں اور اگر حمل کی صورت ہے تو اس کو بھی نہ چھپائیں، کیوں کہ آئندہ کے معاملات کا تعلق اسی کے حلفیہ بیان پر موقوف ہے، عدت ختم ہوگئی اور اسے عقد ثانی کا حق حاصل ہوگیا، زوج اول اب نہ رجوع کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کو دوسرے نکاح سے روک سکتا ہے، یا عدت ختم نہیں ہوئی

کہ حاملہ ہے اور اس کی عدت وضع حمل ہے یا حیض والی ہے اور ابھی تین حیض پورے نہیں ہوئے ہیں تو نہ زوج کا حق رجعت ختم ہوا اور نہ عورت کے لیے نکاح ثانی کا جواز ثابت ہوا، اس لئے شریعت تاکید کے ساتھ حکم دیتی ہے کہ عورت کے لیے یہ حلال نہ ہوگا کہ وہ رحمی حالت کو خواہ اس میں حیض ہو یا حمل اس کو چھپائے۔ اس آیت کریمہ سے استدلال اس طرح ہے کہ یہاں عورت کو رحمی حالت کے اظہار کی تاکید کی جارہی ہے، معلوم ہوا کہ اس بارے میں عورت کے بیان کا اعتبار ہے، کیوں کہ اگر اس کا بیان معتبر نہ ہو تو اس کو اندرونی حالت کے اظہار پر مجبور کرنا بے معنی ہوگا، اندرونی حالت کے اظہار پر مجبور کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس بارے میں عورت کا بیان معتبر ہے۔ یہ یاد رہے کہ بیان کے معتبر ہونے کے معنی بیان حلفی کے معتبر ہونے کے ہوا کرتے ہیں۔

## حضرت علیؓ اور قاضی شریح کا فیصلہ

ویذکر عن علی وشریح الخ حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور قاضی شریح کا فیصلہ نقل کرتے ہیں، ایک عورت حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوئی، یہ عورت مطلقہ تھی اور اپنے شوہر سے عدت گزر جانے کے بارے میں نزاع رکھتی تھی، عورت کا یہ دعوی تھا کہ ایک ماہ میں اس کے تین حیض گزر چکے ہیں، حضرت علی نے قاضی شریح کو حکم دیا کہ ان کے درمیان فیصلہ کردو، قاضی شریح نے عرض کیا آپ کی موجودگی میں؟ فرمایا ہاں! اس پر قاضی شریح نے جو فیصلہ فرمایا اور جس کی تحسین حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے بھی فرمائی، وہ یہ تھا کہ اگر وہ عورت اپنے گھر کے مخصوص معتبر اور متدین افراد میں سے گواہ پیش کردے، جو اس کی حالت سے باخبر بھی ہوں اور دیندار بھی ہوں کہ واقعی اس کی عدت تین حیض کے ساتھ گزر گئی اور اس نے غسل کے بعد نماز پڑھی ہے، تو عدالت اس کے بیان کا اعتبار کرے گی اور اس کے دعوے کو سچا قرار دے گی ورنہ نہیں۔

## قاضی شریح اور ائمہ فقہاء

قاضی شریح نے ایک فیصلہ فرمایا اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے "قالون[1]" کہہ کر ان کے فیصلہ کی تحسین فرمائی، لیکن سوال یہ ہے کہ ائمہ فقہاء کے مذاہب میں قاضی شریح کے فیصلہ کی گنجائش یا ان کے اس حکم کی کوئی تاویل ہے یا نہیں؟

حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ کے مسلک کے مطابق تو کوئی اشکال کی بات نہیں، ان کے یہاں حیض اور طہر دونوں میں سے کسی کے لیے بھی اقل مدت کی کوئی تحدید و تعیین نہیں ہے، جیسے عورتیں بیان کردیں وہی صحیح ہے، اس لیے ان کے نزدیک ایک ماہ میں تین حیض اور تین طہر گزر سکتے ہیں، عدت ختم ہوسکتی ہے، اسی طرح امام احمد کے نزدیک یہ دعوی قابل قبول ہوسکتا ہے، بلکہ ان کے مختار مسلک کی بنا پر تو اٹھائیس یوم اور چار لحظات میں عدت ختم ہوسکتی ہے، کیونکہ مشہور قول تو اقل مدت میں یوم ولیلۃ ہے، لیکن دوسرے قول میں ان کے نزدیک حیض خون کا ایک چھینٹا بھی ہوسکتا ہے اور اقل مدت طہر ۱۳ دن ہے، لہذا آخر طہر میں طلاق دینے سے یہ مدت ۲۸ یوم میں بآسانی منقضی ہوجائے گی، لیکن جن

[1] رومی زبان میں قالون کا مطلب ہے احسنت: تم نے اچھا کیا۔۱۲

لوگوں کے نزدیک طہر کی مدت کم از کم پندرہ دن اور حیض کی مدت کم از کم ایک دن ہے، یا تین دن ہے، ان کے مسلک کی رو سے صرف ایک ماہ میں عدت گزر جانے کا مسئلہ درست نہیں ہوسکتا اور حضرت علی اور قاضی شریح کا فیصلہ ان کے مسلک کے اعتبار سے محل نظر ہے، مثلاً شوافع کے نزدیک طہر کی کم سے کم مدت پندرہ دن اور حیض کی مدت کم سے کم ایک دن ہے اور ان کے یہاں عدت میں طہر کا اعتبار ہے، ان کے یہاں انقضاء عدت کی کم از کم مدت ۳۲ یوم اور دو ساعات ہوسکتی ہے، فرض کیجئے آخر طہر میں طلاق دی گئی، جب کہ حیض کی آمد میں صرف ایک ساعت باقی تھی، وہ ایک ساعت ایک طہر شمار ہوگی، اب حیض شروع ہوا اور ایک دن رہا، اس کے بعد پھر کم سے کم مدت کے اعتبار سے پندرہ دن طہر رہا، سولہ دن ہوگئے، پھر ایک دن دوسرے حیض کا لیجئے سترہ دن ہوئے، پھر پندرہ دن طہر کے لگائیے ۳۲ دن ہوگئے۔

اس طرح شوافع کے نزدیک کم سے کم مدت عدت بتیس ۳۲ دن اور دو لحظے ہوئے، اسی طرح سے احناف کا معاملہ ہے، ان کے یہاں تو اس دعوے کی صحت کے لیے کم سے کم انتالیس ۳۹ دن درکار ہیں اور یہ ہی صاحبین کے نزدیک بھی ہے، ورنہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک تو کم از کم دو ماہ کی ضرورت ہے، کیوں کہ احناف کے یہاں عدت کے معاملہ میں اعتبار حیض کا ہے، ان کے مسلک کے مطابق کم سے کم مدت میں عدت گزر جانے کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ فرض کیجئے عورت کو آخر طہر میں طلاق دی گئی جب کہ حیض کی آمد میں ایک ساعت باقی تھی، اب حیض آیا جس کی اقل مدت احناف کے یہاں تین دن ہے، اس کے بعد طہر شروع ہوا اس کی کم سے کم مدت پندرہ دن ہے، پھر تین دن حیض کے شمار کیجئے اور پھر پندرہ طہر کے، اس کے بعد پھر تین دن حیض کے، کل حساب اس طرح ہوا:

۳+۱۵+۳+۱۵+۳=۳۹، اس طرح کل انتالیس دن اور ایک ساعت میں عدت ختم ہوسکتی ہے، قاضی شریح کا یہ فتوی کہ اگر خاندان کی معتبر اور دیندار عورتیں شہادت دیں تو ایک ماہ میں عدت کو ختم مان لیں گے، نہ احناف کے مسلک کے مطابق درست ہوتا ہے اور نہ شوافع ہی کے مسلک کی رو سے صحیح قرار پاتا ہے۔

**علماء امت کی مساعی** اب ایک طرف قاضی شریح کا فتوی ہے اور دوسری طرف شوافع و احناف کا اصولی مسلک ہے، علمائے کرام نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق ان دونوں کے درمیان تطبیق کی راہیں نکالی ہیں، جن میں کچھ آراء قابل پذیرائی اور لائق ذکر ہیں۔

**سرخسی کی تاویل** سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے لطیفہ کی بات ارشاد فرمائی، وہ کہتے ہیں کہ دراصل قاضی شریح کا یہ فتوی تعلیق بالمحال کے درجہ کی چیز ہے۔ اور دلیل یہ ہے کہ یہاں ''ان'' استعمال کیا گیا ہے اور ''ان'' وہ حرف شرط ہے جو کہ تعلیق بالمحال کے موقعہ پر استعمال کیا جاتا ہے، گویا قاضی شریح کے فتوے کا حاصل یہ ہوا کہ اگر عورت اپنے اہل خانہ میں سے چند افراد کی گواہی لے آئے تو اس کا قول معتبر ہے، مگر صرف ایک ماہ کی قلیل مدت میں معتبر حضرات کا ایسی گواہی دینا محال ہے، اس لیے ایک ماہ میں عدت گزر جانے کی تصدیق کا سوال ہی نہیں۔

قاضی شریح کا اپنے دور میں اس کو تعلیق بالمحال سمجھنا یوں بھی درست ہے کہ وہ زمانہ خیر و سعادت کا زمانہ ہے، اس زمانہ میں کسی ایسے کام کے لیے گواہ مہیا کر لینا جو عقلاً ناممکن نظر آ رہا ہو ناممکن ہے، مگر سرخسی کی یہ تاویل جس درجہ کی ہے، سب پر عیاں ہے۔

**حافظ ابن حجر کی کوشش** قاضی شریح کا فتوی جس کے ساتھ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی تحسین بھی شامل ہے، شوافع کے لیے بھی دشواری کا باعث بنا ہوا ہے، چنانچہ ابن حجر نے اپنے مذہب کی رعایت میں ایک نئی صورت اختیار کی جس سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شوافع کی مشکل تو حل ہو گئی مگر احناف کے لیے بدستور اشکال باقی ہے، وہ کہتے ہیں کہ شوافع کے نزدیک لفظ ''قرء'' سے مراد طہر ہے، جس کی کم سے کم مدت پندرہ دن ہے اور حیض کی کم سے کم مدت ایک دن اور ایک رات ہے، اس لیے اگر آخر طہر میں طلاق دی تو ترتیب ایام اس طرح ہوگی: ۱+۱۵+۱+۱۵=۳۲ یعنی بتیس دن اور ایک ساعت میں عدت ختم ہو گئی، اس کے بعد کہتے ہیں کہ امام شافعی کا یہ ارشاد قاضی شریح اور حضرت علی کے فتوی کے مطابق ہے، کیوں کہ کسر کو حذف کر دینا کوئی اہم بات نہیں ہے، بتیس دن نہ کہا ایک ماہ کہہ دیا، اس کی تائید کے لیے حافظ ابن حجر نے ہشیم کی اسماعیل سے روایت نقل کی ہے، اس میں ہے: "**حاضت في شهر او خمسة وثلاثين يوماً**" ایک ماہ یا پینتیس دن میں۔

حافظ نے یہ ارشاد فرمایا اور سمجھ لیا کہ گویا ان کے مسلک میں اس کی گنجائش نکل آئی، مگر حنفیہ کے لئے اس سلسلہ میں کوئی گنجائش نہیں ہے، کیوں کہ ایک دو کسر تو حذف کی جا سکتی ہے، مگر اکٹھی نو کی کسر سے صرف نظر کر لینا ناممکن ہے، لیکن خود حافظ ابن حجر ہی نے ابراہیم کے قول کے تحت دارمی کے حوالہ سے ابراہیم نخعی سے یہ روایت بھی صحیح سند کے ساتھ نقل کی ہے: ''**اذا حاضت في شهر او اربعين ليلة**'' ایک ماہ یا چالیس راتوں میں اگر تین حیض گزر جائیں، معلوم ہوا کہ کسر کے حذف و ذکر کا کوئی اصول نہیں ہے۔

**احناف کی تحقیقات** قاضی شریح کا فیصلہ اور اس کے ساتھ حضرت علی کی تحسین بظاہر احناف کے مسلک کے مخالف ہے، لیکن اصول کلی کے طور پر یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ جب ہمارا مسلک اپنی جگہ دلائل سے مضبوط اور ثابت ہے تو پھر وہ ایک اصول کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے خلاف جو کچھ پیش کیا جا رہا ہے، وہ جزئی درجہ کی چیز ہے، اگر یہ جزئی کسی صورت سے اس اصول کے تحت آ سکتی ہے تو اس کو لایا جائے گا، ورنہ تو زبردستی کی بات نہیں اصل چیز اصول کی رعایت ہے کہ اسی پر احکام کا مدار ہوتا ہے اور اسی سے سیکڑوں فروعات کا سلسلہ چلتا ہے، جب کہ روایات کی کثیر تعداد، صحابۂ کرام کی آراء اور نصوص کے اشارات ہمارے مسلک کی تائید میں ہیں، ایسی صورت میں حضرت علیؓ کے فتوی پر مدار کے کوئی معنی نہیں۔

اس گزارش کے بعد اب دیکھنا یہ ہے کہ اگر کوئی عورت ایک ماہ میں عدت گزر جانے کا دعوے کرتی ہے، تو اس کی

دو حیثیتیں ہیں، اس دعوے کا ایک تعلق تو عورت کی اپنی ذات سے ہے اور دوسرا خاوند کے حقوق سے، عورت کا حق تو یہ ہے کہ جب اس کو طلاق دے دی گئی ہے تو اب عورت کی طبعی خواہش یہ ہوگی کہ جلد از جلد عدت ختم ہو، تو اس کی ذات سے اس شوہر کے حقوق بالکل متعلق نہ رہیں، جس نے جھگڑے کی بنا پر اس کو طلاق دی ہے، تاکہ عدت گزرنے کے بعد دوسرا شریک حیات تلاش کر سکے۔ اور خاوند کا حق یہ ہے کہ اگر طلاق رجعی ہے تو پوری عدت کے دوران اس کو رجوع کا حق ہے، اس لیے دوسرے مسائل کی طرح سے اس مسئلہ کی بھی دو حیثیتیں ہوگئیں: ایک تو دیانت کا مسئلہ ہے اور دوسرا قضاء کا۔ دیانۃً تو عورت کی تصدیق ہر اس مدت میں کی جاسکتی ہے، جس میں عدت کے گزرنے کا امکان ہو، لیکن قضاء وفیصلہ کے اعتبار سے چوں کہ اب اس دعوی کے ساتھ خاوند کا حق بھی متعلق ہے، اس لیے جب تک پورا یقین نہ ہو جائے، اس وقت تک اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی۔

دیانت اور قضاء کا یہ فرق اور مسئلہ کو دو صورتوں پر محمول کرنا حضرت شاہ صاحبؒ کا مختار ہے چنانچہ قاضی خاں میں جو قول نقل کیا گیا ہے کہ دو ماہ سے کم میں اس کی تصدیق نہیں کی جائے گی، وہ اسی سے متعلق ہے۔

قاضی شریح کے فیصلہ میں بھی قدر ممکن کی رعایت ہے، چنانچہ تنہا عورت کے بیان پر فیصلہ نہیں دیا جا رہا ہے، بلکہ متدین اور باخبر گھریلو عورتوں کی گواہی شرط قرار دی گئی ہے، پھر قاضی شریح کے فیصلہ میں ''شہر'' کا لفظ ہے، جس طرح سے اس کے معنی عام نقطۂ نگاہ سے صرف ایک ماہ یعنی تیس دن کے لیے گئے ہیں، اسی طرح زبان عرب کی رعایت کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ شہر تیس دن کے معنی میں نہیں ہے بلکہ یہ شہر، شہرین کے مقابلہ میں ہے، یعنی عورت نے عدت ختم ہونے کا یہ دعوی دو ماہ سے کم مدت میں کیا اور ایسا مراد لینا بعید از قیاس بھی نہیں ہے، اب اس لفظ شہر میں خود بخود کافی گنجائش نکل آئی اور اب اس کا مطلب یہ نہیں رہا کہ ایک ماہ سے ایک دن بھی زائد نہ ہو، بلکہ ہر وہ مدت جو دو ماہ سے کم ہے اس پر اس کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔

لیکن یہ سب باتیں اس لیے ہیں کہ قاضی شریح کا فتوی اصول کلی کے تحت آ جائے، لیکن اگر ان تمام توجیہات کے بعد بھی کسی کی طبیعت قبول نہیں کرتی، تو ہمیں ان توجیہات پر اصرار نہیں ہے اور نہ قاضی شریح کے فیصلہ پر ہمارے مسلک کا انحصار ہے، بلکہ وہ مسلک اپنی جگہ مضبوط دلائل سے ثابت ہے، ایک جزئی واقعہ سے اس پر اثر نہیں پڑتا۔

**حضرت عطاء کا بیان** | وقال عطاء الخ عطاء ابن ابی رباح نے فرمایا کہ اگر مطلقہ عورت ایک ماہ میں تین حیض گزر جانے کا دعوی کرتی ہے تو یہ دیکھا جائے گا کہ طلاق سے قبل اس کی کیا عادت تھی؟ اس کی عدت کا زمانہ اسی حساب سے معین کیا جائے گا، جو طلاق سے پہلے اس کی عادت کے مطابق حساب میں آئے یعنی دیکھا جائے گا کہ طلاق سے قبل اس کو ایک ماہ میں کتنی بار حیض آتا تھا، ایک بار آتا تھا یا دو بار یا تین بار؟ اگر اس کی سابقہ حالت اس کے حالیہ بیان کے مطابق ہو تو اس کے بیان کی تصدیق کر دی جائے گی اور اگر ایسی صورت نہیں ہے، بلکہ اس کا

بیان سابقہ حالت کے خلاف ہے، تو کہا جائے گا کہ یہ خاوند سے پیچھا چھڑانے کے لیے ایسا دعوی کر رہی ہے۔ ابراہیم کا بھی یہی قول ہے۔ اس کے بعد عطاء نے ایک اور بات فرمائی کہ حیض کی مدت ایک دن سے لے کر پندرہ دن تک ہے، اب حساب خود لگا لیجیے، ان کے نزدیک بھی صرف ایک ماہ کی قلیل مدت میں عدت کے ختم ہو جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

**ابن سیرین کا قول** قال معتمر الخ، کہتے ہیں کہ محمد بن سیرین سے ایک مسئلہ پوچھا گیا کہ ایک عورت کو "قرء" کے ایام کے بعد پانچ دن تک خون آتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ کرمانی کہتے ہیں کہ قرء کے لفظ سے مراد پاکی کے ایام ہیں، کیوں کہ اس سے پہلے دم خون کا لفظ آ چکا ہے، لیکن یہاں قرء کے لفظ سے ایام طہر مراد لینا درست نہیں ہے، کیوں کہ اس صورت میں مسئلہ از خود اتنا واضح اور صاف ہو جاتا ہے کہ ابن سیرین کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی، بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ معتاد ایام حیض کے بعد مزید پانچ دن عورت کو خون آتا ہے، اس صورت میں کیا حکم ہے؟ چنانچہ ابن سیرین نے فرمایا" النساء اعلم بذالك " عورتیں اس بارے میں زیادہ باخبر ہیں۔

احناف کا مسلک تو یہ ہے کہ عادت بھی بدل سکتی ہے، اس لیے اگر معتاد ایام سے پانچ دن کی یہ زیادتی دس دن کے اندر اندر ختم ہو جاتی ہے، تو وہ حیض ہے۔ اور اگر یہ زیادتی دس دن سے بھی زائد ہو جاتی ہے، تو اس صورت میں استحاضہ ہے۔ شوافع اس قانون کو دس کے بجائے پندرہ دن تک بڑھائیں گے۔ امام مالک کے یہاں یہ قول استظہار کے نام سے مشہور ہے، ان کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ عورت معتاد ایام کے بعد تین دن تک انتظار کرے گی، اگر تین دن کے اندر اندر خون آ گیا تو اس کے پچھلے خون کا ایک حصہ شمار کرتے ہوئے حیض میں شمار کریں گے اور اگر خون تین دن کے بعد آیا ہے تو استحاضہ ہے۔

**ترجمۃ الباب اور حدیث عائشہؓ** ترجمۃ الباب میں بخاریؒ نے اپنا یہ رجحان ظاہر کیا ہے کہ حیض و حمل کے بارے میں عورت کا بیان معتبر ہے، اس کے ذیل میں انھوں نے متعدد آثار پیش کیے، اب ایک حدیث لائے ہیں، حدیث میں ہے کہ فاطمہ بنت ابی حبیش نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ مجھے استحاضہ کا عارضہ ہے، کیا مجھے نماز چھوڑنی پڑے گی؟ ارشاد ہوا کہ یہ خون ایک رگ سے آتا ہے، یہ عذر کی حالت ہے، اس میں نماز نہیں چھوڑی جاتی، بلکہ جن دنوں میں حیض کی آمد ہوتی تھی ان ہی دنوں میں نماز چھوڑ دو، اس کے بعد غسل کر لو اور نمازیں ادا کرو۔ ترجمۂ بخاری کا تعلق حدیث کے صرف اس حصہ سے ہے، جس میں فرمایا گیا ہے" قدر الایام التی کنت تحیضین فیھا" یعنی جن دنوں میں تمہیں ایام ہوتے تھے، ان میں نماز چھوڑ دو، معلوم ہوا کہ اس معاملہ میں عورت کی رائے معتبر ہے، کیوں کہ معتاد ایام کے شمار کو اس کی عادت پر محمول کر دیا گیا ہے، اس روایت سے بخاری صرف اتنا ہی استدلال چاہتے ہیں۔

**امام رازی کا لطیف استدلال** امام رازی رحمہ اللہ نے اس روایت سے حنفیہ کے مسلک کے لیے ایک لطیف استدلال فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ حنفیہ کا یہ مسلک کہ حیض کی کم سے کم مدت تین دن ہے اور زیادہ سے زیادہ مدت دس دن ہے، اس روایت سے ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ یہاں حیض کے سلسلے میں ایام

کی تعبیر اختیار کی گئی ہے اور از روئے لغت ایام کا اطلاق نہ تین دن سے کم پر ہو سکتا ہے، نہ دس دن سے زیادہ پر[1]، تین سے کم بھی اگر مراد میں داخل ہوتے تو "یوم" اور "یومین" کا لفظ استعمال کیا جاتا، اسی طرح اگر دس سے زیادہ دن مراد میں داخل ہوتے تو "احد عشر یا اثنا عشر یوما" وغیرہ تعبیر ہوتی۔ "قدر الایام" کی تعبیر بتلا رہی ہے کہ تین دن سے لے کر دس دن تک ہی مراد میں داخل تھے، اس لیے حیض کی اقل مدت تین دن ہوئی اور اکثر مدت دس دن۔

قسطلانی نے اس استدلال کو نقل کر کے خاموشی اختیار کی ہے اور حافظ ابن حجرؒ نے بھی "باب الاستحاضہ" کے تحت اس روایت سے امام رازی کا یہ استدلال نقل کرنے کے بعد لکھا ہے "وفی الاستدلال بذالك نظر" اس سے استدلال کرنا محل نظر ہے، لیکن کوئی وجہ بیان نہیں کی۔

حضرت علامہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے مواقع کے لیے ایک نصیحت فرمائی ہے کہ "کالائے خویش را بگفتۂ غیر بباد مدہ" اپنی متاع کو دوسروں کے کہنے پر برباد نہ سمجھو، صرف "فی الاستدلال بذلك نظر" سے کام نہیں چلتا، آپ دلیل لائیے، امام رازی تو محاورات عرب سے استدلال کر رہے ہیں اور آپ کہہ رہے ہیں کہ کمزور ہے، خالی از اشکال نہیں ہے، اس طرح کہنے سے کام نہیں چلتا۔ یہ ایک لطیفہ تھا جو یاد آ گیا۔

## [۲۵] بَابُ الصُّفْرَةُ وَالْكُدْرَةُ فِيْ غَيْرِ اَيَّامِ الْحَيْضِ

(۳۲۶) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ عَنْ اَيُّوْبَ عَنْ مُحَمَّدٍ عَنْ اُمِّ عَطِيَّةَ قَالَتْ كُنَّا لَا نَعُدُّ الْكُدْرَةَ وَالصُّفْرَةَ شَيْئاً۔

**ترجمہ** باب، ایام حیض کے علاوہ آنے والی زرد اور مٹیالی رطوبت کا حکم۔ حضرت ام عطیہؓ سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ ہم مٹیالی اور زرد رطوبت کو کوئی چیز شمار نہیں کرتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** اس مسئلہ میں اختلاف ہوا ہے کہ ایام حیض میں کس قسم کی رنگین رطوبت حیض میں شمار ہوگی اور کس قسم کی رطوبت حیض سے خارج شمار کی جائے گی؟ احناف کے نزدیک ایام حیض میں ہر رنگ کی رطوبت حیض ہی شمار کی جائے گی، رنگوں کا اعتبار نہیں ہے، شوافع صرف سرخ اور سیاہ رنگ کی رطوبت کو حیض مانتے ہیں اور بعض حضرات کے نزدیک زرد رنگ بھی معتبر ہے کہ یہ بھی خون کا ہلکا رنگ ہے۔

---

[1] جب حضرت الاستاذ قدس سرہ نے امام رازی کا یہ استدلال نقل فرمایا تو ایک شریک درس مولوی منیر الزماں کمرلائی نے عرض کیا کہ حضرت پھر "كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْئًا بِمَا اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ" میں کیا ہوگا، کہ ایام کا لفظ ہے اور یقیناً دس سے زائد دن مراد میں داخل ہیں؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ اگر اور تمام قرائن سے بھی صرف نظر کر لو تو قرآن کہتا ہے "اِنَّ يَوْماً عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِمَّا تَعُدُّوْنَ" خدا کے یہاں کا ایک دن تمہارے یہاں کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ مرتب عرض کرتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک تقریباً آٹھ ہزار سال گزر چکے ہیں اگر ایام خالیہ سے دس دن مراد لیے جائیں تو وہ "الف سنہ" کے حساب سے دس ہزار سال ہوتے ہیں اس طرح دنیا کی زندگی دو ہزار سال اور ہو سکتی ہے اور معلوم ہے کہ دنیا اب قیامت کے دہانے پر ہے، لطیفہ کے درجہ کی یہ بات فائدہ سے خالی نہیں۔ (مرتب)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا قول گزر چکا ہے کہ عورتیں کرسف کو ڈبیہ میں بند کر کے تحقیق حال کی غرض سے بھیجتیں تو حضرت عائشہؓ فرماتی تھیں "لاحتی ترین القصة البیضاء" ابھی نہیں جب تک کرسف بالکل سفید نہ نکلے، گویا ان کے نزدیک ہر رنگین رطوبت حیض میں داخل ہے، خواہ رنگ زرد ہو یا مٹیالہ۔ دوسری طرف حضرت ام عطیہ ارشاد فرماتی ہیں کہ "کنا لانعد الکدرة والصفرة شیئاً" کہ مٹیالی اور زرد رطوبت کو ہم کچھ نہ سمجھتے تھے، یعنی یہ رنگ حیض کے رنگ نہیں ہیں، گویا حیض کے رنگ صرف سرخ اور سیاہ ہیں، اب یہ دونوں بیان ہو گئے، بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس ترجمہ میں ان دونوں بیانات میں تطبیق کی راہ نکالی ہے اور بخاری کا یہ رجحان معلوم ہو چکا ہے کہ حیض کے بارے میں ان کے یہاں رنگوں کا اعتبار نہیں ہے، حضرت ام عطیہ کی روایت بظاہر بخاری کی اس رجحان کے خلاف تھی، اس لیے بخاری نے ترجمہ میں ایک قید لگا دی " فی غیر ایام الحیض" اس طرح حضرت عائشہؓ کی روایت کا مفہوم تو یہ ہوا کہ ایام حیض میں ہر رنگ کی رطوبت حیض شمار کی جائے گی، اور ام عطیہؓ کی روایت کا مفہوم یہ نکلا کہ ایام حیض کے علاوہ دوسرے ایام میں اگر زرد اور مٹیالے رنگ کی رطوبت آئے تو وہ حیض نہیں ہے، اس طرح بخاری نے ان دونوں روایتوں کا تعارض ختم فرمایا۔

**رفع تعارض کی دلیل** لیکن سوال یہ ہے کہ اس قید سے تعارض تو رفع ہو گیا، مگر خود حضرت ام عطیہؓ کی روایت میں قید نہیں ہے، آپ کس دلیل سے اس مطلق حکم کو مقید فرما رہے ہیں؟ اس سوال کی جواب دہی میں امام بخاری کی طرف سے اور بھی کئی باتیں ہیں جو کہی جا سکتی ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت ام عطیہؓ کی روایت " کنا لا نعد الکدرة والصفرة شیئاً" میں دو معنی کا احتمال ہے، حنفیہ کے نزدیک اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمارے نزدیک رنگوں کے درمیان تمیز کا مسئلہ ہی نہ تھا، بلکہ ہم ہر رنگ کی رطوبت کو حیض ہی شمار کرتے تھے۔ شوافع کہتے ہیں کہ ام عطیہ کی روایت کا مفہوم یہ ہے کہ ہم رنگوں کے درمیان تمیز کرتے تھے، سرخی اور سیاہی حیض میں شمار ہوتی تھی اور زرد اور مٹیالی رطوبت کا اعتبار نہ تھا۔ بخاری نے ان دونوں کے درمیان کی راہ نکالی کہ ام عطیہ کی روایت گو مطلق ہے، مگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فتوے کی رو سے کہ وہ بھی حکماً اور معنیً مرفوع ہے، اس کو غیر ایام حیض کے ساتھ مقید کرنا ہوگا، اب مطلب یہ ہوگا کہ غیر ایام حیض میں زرد اور مٹیالی رطوبت نا قابل اعتبار ہے، لیکن ایام حیض میں ہر رنگ کی رطوبت حیض ہی میں شمار کی جائے گی۔

دوسرے یہ کہ ابوداؤد میں حضرت ام عطیہ کی روایت میں خود یہ شرط موجود ہے، ابوداؤد کے الفاظ ہیں "کنا لانعد الکدرة والصفرة بعد الطهر شیئاً" طہر کے بعد ہم مٹیالی اور زرد رطوبت کا اعتبار نہ کرتے تھے، گویا طہر سے پہلے ایام کے دوران ان رطوبتوں کو بھی حیض ہی شمار کیا جاتا تھا، گویا امام بخاریؒ نے ترجمہ میں جو قید بڑھائی ہے، یا تو اس کی بنیاد حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، یا خود حضرت ام عطیہ ہی کی روایت میں یہ قید موجود ہے، جیسا کہ ابوداؤد سے ایک روایت نقل کر دی گئی ہے۔ واللہ اعلم

## [۲۶] بَابُ عِرْقِ الْاِسْتِحَاضَةِ

(۳۲۷) حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ الْمُنْذِرِ الْحِزَامِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا مَعْنٌ قَالَ حَدَّثَنِيْ ابْنُ اَبِيْ ذِئْبٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ وَعَنْ عَمْرَةَ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّ اُمَّ حَبِيْبَةَ اسْتُحِيْضَتْ سَبْعَ سِنِيْنَ فَسَأَلَتْ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ عَنْ ذٰلِكَ فَاَمَرَهَا اَنْ تَغْتَسِلَ فَقَالَ هٰذَا عِرْقٌ فَكَانَتْ تَغْتَسِلُ لِكُلِّ صَلٰوةٍ .

**ترجمہ** باب، استحاضہ کی رگ کا بیان۔ حضرت عائشہؓ حرم نبی اکرم ﷺ سے روایت ہے کہ حضرت ام حبیبہ کو سات سال تک استحاضہ کا عارضہ رہا، تو انھوں نے نبی اکرم ﷺ سے اس کے بارے میں دریافت کیا، تو آپ نے ان کو غسل کرنے کا حکم دیا، چنانچہ وہ ہر نماز کے لیے غسل کیا کرتی تھیں۔

**مقصد ترجمہ** ارشاد ہے کہ استحاضہ کا خون رحم سے نہیں آتا، بلکہ رحم کے منہ کے قریب ایک رگ ہے، اس کا نام عاذل ہے، استحاضہ کے خون کا تعلق اسی رگ سے ہے، فاسد مواد کی زیادتی یا جوش کے سبب اس رگ کا منہ کھل جاتا ہے، تو استحاضہ کا عارضہ ہو جاتا ہے، صورت تقریباً حیض اور استحاضہ کی ایک ہی ہے، کیوں کہ خون کے جاری ہونے کی راہ بھی ایک ہی ہے، مگر چونکہ علت اور سبب الگ الگ ہے، اس لیے حکم بھی الگ الگ ہے، اس روایت میں آیا ہے کہ حضرت ام حبیبہ ہر نماز کے لیے غسل کیا کرتی تھیں، یہ غسل وجوبی نہ تھا، بلکہ اس کو بعض حضرات نے بطور علاج قرار دیا ہے، اور بعض نے استحباب و نظافت پر محمول فرمایا ہے۔

ہمارا مسلک بھی یہی ہے کہ استحاضہ کی صورت میں غسل نہیں ہے، البتہ اگر ایسی صورت ہو جائے کہ حیض کے ایام یاد نہ ہوں، یا مقرر نہ ہوں اور حیض و استحاضہ میں کوئی فرق نہ کیا جا سکتا ہو، تو ایسی عورت کو متحیرہ کہتے ہیں کہ اور اس پر ہر نماز کے لیے غسل ضروری ہے، یہ بحث ایضاح البخاری کی جلد دوم کے آخر میں باب الاستحاضہ کے تحت قدرے تفصیل سے آچکی ہے۔

## [۲۷] بَابُ الْمَرْأَةِ تَحِيْضُ بَعْدَ الْاِفَاضَةِ

(۳۲۸) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ اَبِيْ بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِو بْنِ حَزْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَمْرَةَ بِنْتِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهَا قَالَتْ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ يَا رَسُوْلَ اللهِ! اِنَّ صَفِيَّةَ بِنْتَ حُيَيٍّ قَدْ حَاضَتْ، قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَعَلَّهَا تَحْبِسُنَا اَلَمْ تَكُنْ طَافَتْ مَعَكُنَّ؟ قَالُوْا بَلٰى قَالَ فَاخْرُجِيْ . (گذشتہ:۲۹۴)

**ترجمہ** باب، طواف افاضہ کے بعد حیض آنے کا بیان۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا یا رسول اللہ! صفیہ بنت حی کو حیض شروع ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا شاید وہ ہمیں جانے

سے باز رکھیں گی، کیا انھوں نے تمہارے ساتھ طواف زیارت کرلیا تھا؟ عرض کیا جی ہاں! ارشاد ہوا کہ پھر وہ مکہ سے چل دیں۔

**مقصد ترجمہ** یہ مسئلہ اجماعی ہے کہ اگر عورت کو طواف افاضہ سے فراغت کے بعد حیض شروع ہوا ہے، تو طواف وداع کی ادائیگی کے لیے طہر کے انتظار میں ٹھہرے رہنا ضروری نہیں، طواف افاضہ جس کو طواف زیارت بھی کہتے ہیں حج کے لیے فرض ہے، یہ طواف منی سے واپسی کے بعد نحر کے دن کیا جاتا ہے، اگر کوئی عورت طواف افاضہ سے پہلے عذر حیض میں مبتلا ہوگئی تو اس کو طواف افاضہ کی ادائیگی کے لیے طہر کا انتظار کرنا پڑے گا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سرکار رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت صفیہ کو عذر حیض شروع ہوگیا، ارشاد ہوا، کیا رکنا پڑے گا؟ مگر یہ تو بتاؤ کہ وہ طواف زیارت کر چکی ہیں یا نہیں؟ عرض کیا کہ جی ہاں! طواف زیارت سے فارغ ہو چکی ہیں، ارشاد ہوا کہ پھر رکنے کی ضرورت نہیں ہے، ان سے کہہ دو کہ چلیں۔

(۳۲۹) حَدَّثَنَا مُعَلَّى بْنُ اَسَدٍ قَالَ حَدَّثَنَا وُهَيْبٌ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ طَاؤسٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَبَّاسٍ ﷺ قَالَ رُخِّصَ لِلْحَائِضِ اَنْ تَنْفِرَ اِذَا حَاضَتْ. (آئندہ: ۱۷۵۵، ۱۷۶۰)

(۳۳۰) وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَقُوْلُ فِيْ اَوَّلِ اَمْرِهٖ اِنَّهَا لَا تَنْفِرُ، ثُمَّ سَمِعْتُهٗ يَقُوْلُ تَنْفِرُ، اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ رَخَّصَ لَهُنَّ. (آئندہ: ۱۷۶۱)

**ترجمہ** حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ اگر حائضہ کو عذر حیض شروع ہو جائے، تو وہ طواف وداع کے بغیر مکہ سے واپس ہو سکتی ہے۔ حضرت ابن عمر شروع میں مکہ سے آنے کی اجازت نہیں دیتے تھے، حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ پھر میں نے انھیں یہ ارشاد فرماتے سنا کہ بغیر طواف وداع جا سکتی ہے، کیوں کہ رسول اکرم ﷺ نے انہیں اس کی اجازت دی ہے۔

**تشریح حدیث** ابتداء میں اس مسئلہ میں قدرے اختلاف تھا کہ اگر عورت کو حیض شروع ہو جائے، جب کہ وہ ارکان حج سے فارغ ہو چکی ہے، صرف طواف وداع ہی باقی رہ گیا، تو کیا ایسی صورت میں عورت کو عذر کے ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا، یا وہ طواف وداع کے بغیر بھی مکہ سے واپس ہو سکتی ہے؟ حضرت ابن عمر ابتداء میں یہ فرماتے تھے کہ ایسی صورت میں عورت کو حیض کے ختم ہونے کا انتظار کرنا پڑے گا، بغیر طواف وداع کئے ہوئے واپس نہ ہو سکے گی، لیکن جب انھیں یہ معلوم ہوگیا کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں حکم دیا تھا کہ وہ واپس ہو سکتی ہیں، تو انھوں نے اپنا فیصلہ بدل دیا، اب یہ مسئلہ متفق علیہ ہے۔

## [۲۸] بَابُ اِذَا رَاَتِ الْمُسْتَحَاضَةُ الطُّهْرَ

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ تَغْتَسِلُ وَتُصَلِّيْ وَلَوْ سَاعَةً مِّنْ نَهَارٍ وَّيَاتِيْهَا زَوْجُهَا اِذَا صَلَّتْ، اَلصَّلٰوةُ اَعْظَمُ

(۳۳۱) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ يُوْنُسَ قَالَ حَدَّثَنَا زُهَيْرٌ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا اَقْبَلَتِ الْحَيْضَةُ فَدَعِي الصَّلٰوةَ وَاِذَا اَدْبَرَتْ فَاغْسِلِي عَنْكِ الدَّمَ وَصَلِّيْ .

**ترجمہ** باب، جب مستحاضہ طہر دیکھے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ غسل کرے اور نماز ادا کرے، اگرچہ یہ پاکی دن کی ایک گھڑی ہی کے لیے ہو اور جب وہ نماز پڑھ سکتی ہے تو اس کا شوہر بدرجۂ اولیٰ اس کے پاس آ سکتا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب حیض کے ایام آئیں، تو نماز چھوڑ دو اور جب حیض کے ایام گزر جائیں، تو خون کو دھوڈالو اور نماز ادا کرو۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ وہ عورت جسے استحاضہ کا عارضہ ہے، جس وقت یہ دیکھے کہ طہر شروع ہو گیا ہے، یعنی خون بند ہو گیا ہے تو فوراً غسل کر کے نماز پڑھ لے، یہ وہم کرنا کہ کہیں دوبارہ وہی کیفیت پیدا نہ ہو جائے اور اس وہم کی بناء پر نماز کے معاملہ میں توقف کرنا جائز نہیں ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں طہر کا لفظ استعمال کیا ہے کہ جب مستحاضہ طہر دیکھے، اس کا صاف اور حقیقی مطلب تو یہ ہے کہ خون بند ہو جائے اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ طہر سے مراد مطلق خون کا بند ہونا نہ لیا جائے، بلکہ طہر کو خون حیض کے بند ہونے کے معنی میں لیا جائے، الفاظ میں اگرچہ اس کی بھی گنجائش ہے، مگر ایسا مراد لینا بے ضرورت حقیقت کو چھوڑ کر مجاز کی طرف جانا ہے، اس لیے یہاں طہر کی تفسیر مطلق خون بند ہونے سے کی جائی گی اور خون حیض کی تعیین نہ کی جائے گی، اس لیے امام بخاریؒ رحمۃ اللہ علیہ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب عورت یہ دیکھے کہ خون بند ہو گیا ہے تو فوراً غسل کر کے نماز پڑھ لے، مزید وقت گزرنے کا انتظار نہ کرے۔

علامہ سندھی نے ترجمہ کا مقصد یہ قرار دیا ہے کہ جب مستحاضہ یہ دیکھے کہ اس کا دم حیض منقطع ہو گیا اور اس کا علم خواہ تمیز الوان کی بنا پر ہو یا عادت کی بنا پر، تو اس کو چاہیے کہ فوراً غسل کر کے نماز پڑھ لے، مزید انتظار نہ کرے، کیوں کہ سوال اس عورت سے متعلق ہے جس کا دم استحاضہ جاری ہے، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن عباس دربارۂ طہر، تحدید مدت کے قائل نہیں ہیں، اس لیے کہ "ولو ساعة من نهار" فرما رہے ہیں۔

**ترجمہ کا ثبوت** ترجمہ کے ثبوت میں امام بخاریؒ نے دو چیزیں پیش کی ہیں، ایک حضرت ابن عباس کا اثر اور دوسرے حضرت فاطمہ بنت ابی حبیش کی روایت، حضرت ابن عباس نے ارشاد فرمایا کہ ایسی صورت میں فوراً غسل کر کے نماز پڑھنی چاہیے، چاہے یہ طہر ایک ہی گھڑی کے لیے ہو اور جب نماز جیسے عظیم الشان فریضہ کی ادائیگی ضروری قرار دی گئی تو جماع کی بدرجہ اولی گنجائش ہوگی۔ اس کے بعد امام بخاری رحمہ اللہ نے حضرت فاطمہ کی روایت پیش کی ہے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حیض کے ایام آئیں تو نمازیں چھوڑ دو اور جب یہ ایام

گزرجائیں تو خون کو دھوڈالو اور نماز ادا کرو، اس روایت میں ’’ واذا ادبرت فاغسلی عنك الدم و صلی ‘‘ کو بخاری نے بطور دلیل پیش کیا ہے، یعنی بمجرد اد بار دم غسل کرنا ہوگا، کیوں کہ ’فاء‘ ’’تعقیب مع الوصل کے لیے آتی ہے، عندالاحناف اگر انقطاع اکثر مدت پر ہوا ہے تو فوراً غسل کرے اور نماز ادا کرے اور اگر کم مدت میں انقطاع دم ہوا ہو تو اس کو اتنا انتظار کرنا ہوگا کہ بقدر ایک نماز کے وقت گزر جائے، تب غسل کرے اور نماز پڑھے، رہا قربان زوج کا معاملہ تو بخاریؒ نے اس کو یوں سمجھایا کہ نماز جیسا فریضۂ خداوندی ادا کیا جاسکتا ہے، تو پھر قربان زوج کہ وہ بمقابلہ صلوۃ بہت ادنی اور اخف ہے کیوں نہ جائز ہوگا؟ بات معقول ہے اور سلف میں اس مسئلہ میں اختلاف رہا ہے، حضرت عائشہؓ، حکم، زہری، نخعی اور شعبی اجازت نہیں دیتے، امام احمد نے مجبوری کی حالت میں قربان کی اجازت دی ہے۔

## [۲۹] بَابُ الصَّلٰوةُ عَلَى النُّفَسَآءِ وَسُنَّتِهَا

(۳۳۲) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ اَبِیْ سُرَیْجٍ قَالَ اَخْبَرَنَا شَبَابَةُ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنْ حُسَیْنِ الْمُعَلِّمِ عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ بُرَیْدَةَ عَنْ سَمُرَةَ بْنِ جُنْدُبٍ اَنَّ امْرَاَةً مَاتَتْ فِیْ بَطْنٍ فَصَلّٰی عَلَیْهَا النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم فَقَامَ وَسَطَهَا. (آئندہ: ۱۳۳۱، ۱۳۳۲)

**ترجمہ** باب، ایام نفاس میں وفات پانے والی عورت پر نماز جنازہ کا بیان اور اس کا مسنون طریقہ۔ حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک عورت کا پیٹ کی تکلیف کی وجہ سے زچگی کے ایام میں انتقال ہوگیا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی نماز جنازہ ادا فرمائی اور نماز کے لیے آپ وسط (بیچ) میں کھڑے ہوئے۔

**مقصد ترجمہ** اس ترجمہ میں امام بخاریؒ دو باتیں بتلانا چاہتے ہیں: ایک تو یہ کہ نفساء کی نماز جنازہ ہوگی یا نہیں؟ اور دوسرے یہ کہ ایسی عورت کی نماز جنازہ کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ اس مسئلہ کے اثبات کی ضرورت یوں محسوس ہوئی کہ نماز میں جنازہ کی حیثیت امام کی ہوتی ہے، اس کے لیے طہارت ضروری ہے اور یہاں صورت حال یہ ہے کہ نفاس کی حالت نجاست کی حالت ہے اور اسی حالت میں موت واقع ہوئی، تو موت علی حال النجاست ہوئی اور بظاہر موت سے وہ نجاست مستقر ہوگئی، اب سوال یہ ہے کہ نفاس کی حالت نجاست جب موت سے برقرار ہوگئی تو کیا اس پر نماز جنازہ کی اجازت ہوگی؟

دوسری وجہ یہ ہے کہ روایات میں آتا ہے کہ جو عورت نفاس میں مرے وہ شہید ہے اور شہید کی نماز میں اختلاف رہا ہے، اس لیے ایسی عورت کی نماز میں تو اختلاف نہیں ہے؟

امام بخاریؒ نے یہ ترجمہ رکھ کر بتلا دیا کہ نفاس کے ایام میں اگر عورت کا انتقال ہو جائے، تو اس کی نماز پڑھی جائے گی، پیغمبر علیہ السلام کے عمل سے ثابت ہے، لہٰذا شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

**حدیث باب** | اس مقصد کے ثبوت کے لیے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سمرہ بن جندبؓ کی روایت پیش کی ہے کہ جب حضرت ام کعب کا انتقال پیٹ کے عارضہ میں ہوا تو نبی اکرم ﷺ نے ان کے جنازہ کی نماز ادا فرمائی، اس روایت سے ثابت ہوگیا کہ نفاس کے ایام میں وفات پانے والی عورت کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی، یہ خیال کرنا کہ وہ تو پہلے ہی ناپاک تھی، اب موت نے اور ناپاکی بڑھادی تو نماز کا کیا موقعہ رہا؟ بالکل غلط ہے، وہ معنوی ناپاکی تو موت سے ختم ہوگئی اور حسی ناپاکی غسل سے دھل گئی، اب تو وہ پاک ہی پاک ہے، مومنہ ہے، ایمانی طہارت ہے، نجاست تو کفر میں ہے، جو موت سے اور زیادہ نمایاں ہوجاتی ہے۔

ترجمہ کا دوسرا جز "وسنتها" ہے یعنی ایسی عورت کی نماز جنازہ کا مسنون طریقہ کیا ہے؟ تو اس کے لیے حدیث باب میں آیا کہ رسول اکرم ﷺ نے اس کی نماز جنازہ ادا فرمائی اور آپ وسط میں کھڑے ہوئے۔ احناف اور شوافع کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے، شوافع کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ امام مرد کی نماز جنازہ میں (صدر) سینہ کے محاذ میں کھڑا ہو گا اور عورت کی نماز جنازہ میں حصۂ مستور کے محاذ میں کھڑا ہوگا۔ احناف کے یہاں مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں ہے، بلکہ ہر صورت میں سینہ کے محاذ میں ہی کھڑا ہونا مسنون ہے، روایت میں لفظ "وسط" آیا ہے، جو بفتح سین اور بسکون سین دونوں طرح پڑھا گیا ہے، فتح کی صورت میں تو جسم کا بالکل بیچ کا حصہ مراد ہوگا، پھر اگر اطراف کو الگ رکھا جائے تو وہ وسط سینہ کا حصہ ہوسکتا ہے اور اطراف یعنی ہاتھ اور پیروں کو ساتھ لے کر دیکھا جائے، تب اس لحاظ سے کہ سینہ سے اوپر سر اور ہاتھ ہیں اور سینہ سے نیچے پیٹ اور ٹانگیں ہیں، تو صدر وسط ہوگیا۔ اور سکون کی صورت میں تو سر اور پیر کا درمیان سب ہی وسط ہے، چنانچہ "الساكن متحرك اور المتحرك ساكن" کا مشہور مقولہ اسی کا مقتضی ہے۔　　واللہ اعلم

## [۳۰] بَابٌ

(۳۳۳) حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ مُدْرِكٍ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ حَمَّادٍ قَالَ اَخْبَرَنَا اَبُوْعَوَانَةَ مِنْ كِتَابِهِ قَالَ اَخْبَرَنَا سُلَيْمَانُ الشَّيْبَانِيُّ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَدَّادٍ قَالَ سَمِعْتُ خَالَتِيْ مَيْمُوْنَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهَا كَانَتْ تَكُوْنُ حَائِضاً لَاتُصَلِّيْ وَهِيَ مُفْتَرِشَةٌ بِحِذَاءِ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ يُصَلِّيْ عَلٰى خُمْرَتِهِ اِذَا سَجَدَ اَصَابَنِيْ بَعْضُ ثَوْبِهِ. (آئندہ: ۳۷۹، ۳۸۱، ۵۱۸)

**ترجمہ** | باب، حضرت عبداللہ بن شدادؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی خالہ حضرت میمونہ حرم سرکار دوعالم ﷺ سے سنا کہ وہ یہ فرماتی ہیں کہ میں حالت حیض میں ہونے کے باعث نماز نہیں پڑھ سکتی تھی اور میں اس وقت رسول اکرم ﷺ کی سجدہ گاہ کے برابر لیٹی ہوتی اور رسول اکرم ﷺ اپنی چھوٹی چٹائی پر نماز پڑھتے رہتے اور سجدہ کی حالت میں آپ کے کپڑے کا کچھ حصہ میرے جسم سے لگ جاتا تھا۔

**باب بلا ترجمہ** بخاری نے حدیث بیان کی، ترجمہ نہیں رکھا۔ اور یہ لفظ باب بھی صرف ابوذر کے نسخہ میں ہے، اصیلی وغیرہ کے نسخوں میں یہ بھی نہیں ہے، اگر لفظ باب نہ ہوتو یہ روایت بھی پچھلے ترجمہ کے ساتھ ہی متعلق مانی جائے گی اور اگر ابوذر کے نسخہ کی رعایت کریں تو کہا جائے گا کہ امام بخاری نے حسب عادت تشحیذ أللاذہان باب کا ترجمہ ذکر نہیں کیا۔

حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ ابوذرؓ کی روایت میں لفظ باب موجود ہے اور ایسی صورت میں یہ حدیث ''کالفصل من الباب السابق'' باب سابق کے لیے فصل کے درجہ میں ہے اور مناسبت یہ ہے کہ حائضہ اور نفساء کا جسم پاک ہے، اس کو یوں سمجھنا چاہئے کہ نماز کی حالت میں سرکار دوعالم ﷺ کا کپڑا حضرت میمونہ کے جسم سے لگ جاتا اور نماز میں کوئی خلل نہ پڑتا۔

ہمارے نزدیک بھی بات یہی ہے، پچھلے باب میں بخاری نے ثابت کیا تھا کہ نفاس کی حالت میں وفات پانے والی عورت کی نماز جنازہ ادا کی جائے گی، ظاہر ہے کہ نفساء کا جنازہ امام کے آگے سامنے کی جہت میں ہوگا، اور امام سے کچھ فاصلہ پر ہوگا، چوں کہ اس معاملہ میں حائضہ اور نفساء کا ایک ہی حکم ہے، لہذا حائضہ کے جنازہ کی نماز بھی بلا تردد صحیح ہوگی۔ اب اس حدیث میں بخاری زندہ عورت کا مسئلہ لا رہے ہیں، چنانچہ بخاری نے حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے ثابت کر دیا کہ اگر عورت مصلی کے سامنے ہو اور حالت حیض میں ہو اور مصلی کا کپڑا عورت کے بدن سے مس کرتا رہے، تو اس میں مضائقہ نہیں ہے اور جب یہاں تک گنجائش ہے تو نفساء کی نماز جنازہ میں کیا اشکال ہوسکتا ہے؟ ایک تو یہ کہ اس کو غسل دے دیا گیا، دوسرے یہ کہ امام سے اتنے فاصلہ پر ہے کہ کپڑا مس نہیں کرتا، گویا بخاری نے یہ حدیث لا کر باب سابق کے مسئلہ کو اور اچھی طرح ثابت کر دیا، اب ترجمہ لگالو، مثلاً ''باب اذا مس ثوب المصلی بدن الحائض فلاضیر فیہ'' یا ''باب طهارة عين الحائض'' یا '' باب الصلوة بقرب الحائض وغیرہ'' اب ایک بات سمجھ لیجئے کہ پہلے باب میں ابن عباس کے قول کے مطابق مستحاضہ دم حیض کے انقطاع پر فوراً غسل کرکے نماز پڑھ لے، استحاضہ کا خون نماز سے مانع نہیں ہے، ہاں حیض کا خون ہوتو نماز نہیں پڑھ سکتی، اب سوال پیدا ہوا کہ اگر بزمانہ حیض انتقال ہو جائے کہ ناپاکی پر انتقال ہوا تو کیا اس کی صلوۃ جنازہ پڑھی جائے؟ جب کہ حالت حیض کا غسل مطہر نہیں ہے اور نماز کے لیے طہارت شرط ہے، لہذا بخاری نے ''صلوة على النفساء'' کا باب رکھ کر بتا دیا کہ نفساء ہو یا حائضہ اصل سے دونوں کا بدن پاک ہے، پھر غسل سے وہ ظاہری لوث (یعنی آلودگی) بھی ختم ہوگئی، موت نے ایمان کو مستحکم کر دیا جو کہ عین طہارت ہے، پھر اس پر نماز پڑھنے میں کیا تردد رہا؟ اور چونکہ دربارۂ صلوۃ علی الحائضہ علی شرط البخاری کوئی روایت نہ تھی، لہذا باب بلا ترجمہ رکھ کر حضرت میمونہ والی روایت سے بطور اشارہ اس کے جواز پر تنبیہ فرمادی کہ حائضہ کا بدن ناپاک نہیں، عاقل کے لیے یہ اشارہ کافی ہے۔

'' هذا اخر ما استقر عليه رأيي وهو مختار شيخ الحديث في لامعه ادام الله فيوضه وقد كنت اشرتُ اليه في القول الفصيح من غير افصاح، هذا. والله اعلم ''.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# [۷] ﴿كتابُ التيمم﴾

وَقولُ اللهِ عَزَّوَجَلَّ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فتيَمَّمُوْا صعِيْداً طَيِّباً فَامْسَحُوا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُم مِنْهُ (مائدہ:٦)[۱]

(۳۳۴) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمانِ بْنِ الْقَاسِمِ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم قَالَتْ خَرَجْنَا مَعَ رَسُولِ اللهِ صلى الله عليه وسلم فِيْ بَعْضِ اَسْفَارِهٖ حَتّٰى اِذَا كُنَّا بِالْبَيْدَآءِ اَوْبِذَاتِ الْجَيْشِ انْقَطَعَ عِقْدٌ لِيْ فَاَ قَامَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم عَلَى الْتِمَاسِهٖ وَاَقَامَ النَّاسُ مَعَهٗ وَلَيْسُوْا عَلٰى مَآءٍ فَاَتَى النَّاسُ اِلٰى اَبِىْ بَكْرِ الصِّدِّيْقِ رضي الله عنه فَقَالُوْا اَلا تَرٰى مَاصَنَعَتْ عَآئِشَةُ اَقَامَتْ بِرَسُوْلِ اللهِ صلى الله عليه وسلم وَالنَّاسِ وَلَيْسَ مَعَهُمْ مَآءٌ وَلَيْسُوْا عَلٰى مَآءٍ فَجآءَ اَبُوْبَكْرٍ وَرَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم وَاضِعٌ رَاسَهٗ عَلٰى فَخِذِىْ قَدْنَامَ فَقَالَ حَبَسْتِ رَسُوْلَ اللهِ صلى الله عليه وسلم وَالنَّاسَ وَلَيْسُوْا عَلٰى مَآءٍ وَلَيْسَ مَعَهُمْ مَاءٌ فَقَالَتْ عَاتَبَنِىْ اَبُوْبَكْرٍ وَقَالَ مَاشَاءَ اللّٰهُ اَنْ يَّقُوْلَ وَجَعَلَ يَطْعَنُنِىْ بِيَدِهٖ فِىْ خَاصِرَتِىْ فَلَا يَمْنَعُنِىْ مِنَ التَّحَرُّكِ اِلَّا مَكَانُ رَسُوْلِ اللهِ صلى الله عليه وسلم عَلٰى فَخِذِىْ فَقَامَ رَسُوْلُ اللهِ صلى الله عليه وسلم حِيْنَ اَصْبَحَ عَلٰى غَيْرِ مَآءٍ فَاَنْزَلَ اللهُ اٰيَةَ التَّيَمُّمِ فَتَيَمَّمُوْا فَقَالَ اُسَيْدُ بْنُ الْحُضَيْرِ مَاهِىَ بِاَوَّلِ بَرَكَتِكُمْ يَاآلَ اَبِىْ بَكْرٍ قَالَتْ فَبَعَثْنَا الْبَعِيْرَ الَّذِىْ كُنْتُ عَلَيْهِ فَاَصَبْنَا الْعِقْدَ تَحْتَهٗ.

(آئندہ:۳۳۶، ۳۶۷۲، ۳۷۷۳، ۴۵۸۳، ۴۶۰۷، ۴۶۰۸، ۵۱۶۴، ۵۲۵۰، ۵۸۸۲، ۶۸۴۴، ۶۸۴۵)

**ترجمہ** کتاب التیمم، اور باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ پس اگر تم پانی نہ پاؤ تو پاک زمین کا قصد کرو اور اپنے چہروں اور ہاتھوں پر اس مٹی سے مسح کرلو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سرکار دوعالم ﷺ کی حرم محترم سے روایت ہے، فرماتی ہیں کہ ہم سفر میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ گئے، یہاں تک کہ جب ہم مقام ''بیداء'' یا مقام ''ذات الجیش'' میں پہنچے تو میرے گلے کا ہار ٹوٹ کر گر پڑا، تو رسول اکرم ﷺ اس کی تلاش کے لیے ٹھہرے اور باقی حضرات بھی وہیں ٹھہر گئے اور صورت یہ تھی کہ وہاں وہ لوگ پانی پر نہ تھے، چنانچہ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے پاس پہنچے اور انؓ سے کہا: آپ کو معلوم ہے کہ عائشہ نے کیا کیا؟ رسول اکرم ﷺ اور لوگوں کو ٹھہرالیا اور صورت حال یہ ہے کہ لوگوں کے ساتھ پانی نہیں ہے اور نہ

---

[۱] یہاں مصری نسخہ میں باب ہے۔

پانی ان کے آس پاس ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر میرے پاس تشریف لائے، جب کہ رسول اکرم ﷺ اپنا سر مبارک میری ران پر رکھ کر سو چکے تھے، حضرت ابوبکر نے کہا کہ تو نے رسول اکرم ﷺ اور لوگوں کو روک لیا ہے اور نہ پانی ان لوگوں کے آس پاس ہے اور نہ ان کے ساتھ ہے، حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ حضرت ابوبکر مجھ پر عتاب فرماتے رہے، جو کچھ باری تعالی کی مشیت تھی، انھوں نے مجھے کہا اور میری کوک میں اپنے ہاتھ سے کچوکے مارنے لگے اور مجھے حرکت سے صرف یہ چیز مانع تھی کہ رسول اکرم ﷺ میری ران پر سو رہے تھے، چنانچہ رسول اکرم ﷺ صبح کو بیدار ہوئے تو وہاں پانی نہ تھا، اس وقت تیمم کی آیت نازل ہوئی اور لوگوں نے تیمّم کیا۔ اسید بن حضیر فرماتے ہیں کہ اے آل ابوبکر! یہ تمہاری پہلی ہی برکت نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ جب ہم نے اس اونٹ کو اٹھایا جس پر میں سوار تھی تو ہار اس کے نیچے سے ملا۔

**سابق سے ربط** سابق سے ربط بالکل ظاہر ہے، سابق میں وضو کے ابواب ذکر کئے جا رہے تھے اور اب تیمّم کے احکام ذکر کئے جا رہے ہیں اور معلوم ہے کہ پانی سے وضو کرنا طہارت کے سلسلے میں اصل ہے اور پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمّم کرنا وضو کا قائم مقام ہے اور ظاہر ہے کہ اصل کا ذکر پہلے کیا جاتا ہے، قائم مقام کا بعد میں، اس لیے امام بخاری نے پہلے وضو کے احکام ذکر کئے اور اب تیمّم کے ابواب لا رہے ہیں۔

**تیمّم کی تعریف اور اس کی ضرورت** تیمّم "اَمَّ" سے باب تفعل ہے، از روئے لغت اس کے معنی قصد اور ارادہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح شریعت میں بغرض طہارت ہاتھ اور چہرے کے مسح کے لیے پاک مٹی کا قصد کرنا تیمّم کہلاتا ہے، اس اعتبار سے تیمّم کی شرعی اصطلاح میں حقیقت لغوی بھی معتبر ہے، چنانچہ تمام ائمہ کا اتفاق ہے کہ تیمّم بغیر نیت کے درست نہیں ہوتا، جب کہ وضو کے سلسلے میں نیت کی شرط پر تمام ائمہ کا اتفاق نہیں ہے، کیونکہ وضو کی تعریف میں ایسی کوئی چیز شامل نہیں ہے، جس کی بنا پر نیت ضروری قرار پائے۔

اور بات یہ ہے کہ نماز ایسا فریضہ ہے جس کی ادائیگی ۲۴ گھنٹے میں پانچ بار ضرور کرنی ہے اور اس کے لیے طہارت کی شرط ہے، طہارت کی بات یہ ہے کہ اگر پانی موجود ہے تو انسان بہ آسانی اس کے استعمال سے پاکی حاصل کر سکتا ہے، لیکن پانی میسر نہ آئے، یا پانی بھی موجود ہو، لیکن کسی عذر کے سبب اس کے استعمال کی قدرت نہ ہو، تو پاکی اور طہارت حاصل کرنے کی کیا صورت ہو؟ کیوں کہ نماز تو بغیر طہارت کے ادا نہیں ہوسکتی، ایسی صورت میں دو ہی کام کئے جا سکتے تھے: یا تو یہ کہ نماز ترک کر دیں، یا بغیر وضو نماز کی ادائیگی کی اجازت دیں، لیکن دونوں صورتیں نادرست تھیں، نہ تو نماز کسی حال میں ترک کی جاسکتی ہے اور نہ بغیر وضو ہی ادائیگی کی اجازت دی جاسکتی ہے "لاخير في دين ليس فيه ركوع" اس دین میں کوئی بھلائی نہیں، جس میں نماز نہ ہو، تو ایسی صورت میں ضروری قرار پایا کہ وضو تو بغیر پانی کے نہیں کیا جاسکتا لیکن کوئی صورت ایسی ضرور ہونی چاہئے، جو مجبوری کی حالت میں وضو کے قائم مقام ہوسکے، چنانچہ "تیمّم" کو وضو کا قائم مقام کر دیا گیا، البتہ فرق یہ رہا کہ چونکہ پانی تو طہارت اور پاکیزگی حاصل کرنے کے لئے موضوع ہی ہے، اس لیے اس

میں نیت کی ضرورت نہیں، البتہ مٹی اس کام کے لیے موضوع نہیں ہوئی ہے، بلکہ اس کو تو اس امت کے حق میں خاص طور پر "طہور" بنایا گیا ہے، جیسا کہ لفظ "**جعلت لی الارض مسجد او طهورا**" سے ظاہر ہے، اس لیے مٹی سے پاکی حاصل کرنے کے لیے نیت کا ہونا ضروری ہے۔

**حدیث باب** حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں کسی سفر میں آں حضور ﷺ کے ساتھ تھی، مقام "ذات الجیش" یا مقام "بیداء" میں پہونچ کر میرے گلے کا ہار ٹوٹ کر گر پڑا، جس کی تلاش کے لیے وہاں قیام کرنا پڑ گیا، رات کی تاریکی میں ہار کی تلاش دشوار تھی، اس لیے انتظار کیا گیا کہ صبح کی روشنی ظاہر ہو تو تلاش کیا جائے۔ اور جب خود سرکار دو عالم ﷺ نے قیام کیا تو صحابۂ کرامؓ کو بھی ٹھہرنا پڑا، لیکن یہ مقام ایسا تھا جہاں پانی موجود نہ تھا اور صحابۂ کرام کے پاس بھی پانی نہ تھا، صبح ہوئی تو لوگوں کو پریشانی ہوئی کہ نماز کا وقت ہو گیا اور پانی کا کوئی انتظام نہیں ہے، نہ تو حضرات صحابہ ہی کے پاس پانی ہے، نہ قریب ہی میں کہیں پانی ہے، اگرچہ جس مقام پر قیام تھا وہ مدینہ سے زیادہ فاصلہ پر نہیں ہے اور ارد گرد کے بعض حصوں میں پانی ہو سکتا تھا، لیکن پانی سے اتنے قریب نہیں تھے کہ نماز کے وقت کے اندر اندر پانی حاصل کر سکیں، اس لیے حضرات صحابہ کو پریشانی ہوئی کہ نماز کی ادائیگی کی کیا صورت ہو؟ چنانچہ اس پریشانی میں حضرت صدیق اکبر کے پاس پہنچے اور شکایت کی، کیا آپ کو معلوم ہے کہ عائشہؓ کی وجہ سے کیا ہوا؟ ایسی جگہ رکنا پڑ گیا جہاں پر پانی نہیں ہے، حضرت صدیق اکبرؓ کو اس شکایت سے تکلیف ہوئی اور وہ پیغمبر علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے، شکایت مقصود ہو یا پانی کے انتظام کے بارے میں پوچھنا ہو، وہاں صورت یہ تھی کہ سرکار دو عالم ﷺ حضرت عائشہؓ کی ران پر سر رکھ کر آرام فرما رہے تھے، حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عائشہؓ کو ملامت شروع کر دی کہ تمہاری بے احتیاطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس لق دق میدان میں لوگوں کی نمازیں قضا ہونے والی ہیں، زبان سے بھی ملامت کی اور ہاتھ سے بھی چوکے لگائے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ چوکے لگانے کے باوجود میں حرکت اس لیے نہیں کر سکتی تھی کہ میری حرکت سے سرکار دو عالم ﷺ کی نیند میں خلل پڑ سکتا تھا، اس لیے میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ اور چونکہ معاملہ ایسا تھا جیسے کوئی اجنبی کسی کی غلطی پر تنبیہ کر رہا ہو، شفقت اور ابوت کے یہ بات خلاف تھی، زبان سے بھی ملامت ہے اور ہاتھ سے بھی طعن ہے، اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے "**عاتبنی ابی**" نہیں فرمایا، بلکہ فرماتی ہیں "**عاتبنی ابو بکر**" "ابوبکر مجھ پر عتاب فرمانے لگے، پھر جب صبح کے وقت سرکار دو عالم ﷺ کی آنکھ کھلی تو پانی نہیں تھا، اس وقت اللہ تعالیٰ نے تیمم کی آیت نازل فرمائی، چنانچہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے تیمم کر کے نماز ادا کی۔ حضرت اسید بن حضیرؓ جن کو ہار کی تلاش کے لیے مامور کیا گیا تھا فرماتے ہیں کہ خانوادۂ صدیق سے برکت کا یہ ظہور کوئی نئی بات نہیں ہے، اس خاندان سے ہمیشہ برکتیں ظاہر ہوتی رہی ہیں، برکت ظاہر ہے کہ سخت پریشانی کی صورت تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس ایک مرتبہ کی پریشانی کو دور کرنے کے لیے مستقل دستور نازل فرما دیا کہ ایسی صورت میں کسی طرح کی کوئی پریشانی ہی نہ ہو۔ اس واقعہ سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ

پانی نہ ہونے کی صورت میں تیمّم کی اجازت ہے، خواہ سفر کے موقعہ پر یہ صورت پیش آئے یا حضر میں۔

سوال یہ ہے کہ یہ واقعہ کس سفر سے متعلق ہے؟ ہار گم ہونے کا واقعہ صرف ایک بار ہی پیش آیا یا دو بار؟ اور حضرت عائشہؓ کے قول ''فانزل اللہ اٰیۃ التیمم'' سے کونسی آیت مراد ہے، آیت سورۂ نساء یا آیت سورۂ مائدہ؟ ان سب چیزوں پر مفصل کلام دیکھئے۔

## آیت تیمّم کس سفر سے متعلق ہے؟

اس روایت سے صرف اس قدر معلوم ہوا کہ ہار گم ہو جانے کے بعد سفر میں تیمّم کا حکم نازل ہوا، دوسری روایت سے اتنی بات طے ہے کہ حضرت عائشہؓ کا ہار دو بار گم ہوا ہے، اب یہ بات ایک سفر میں دو بار ہار گم ہوا ہو، قیاس سے بعید ہے، اس لیے ماننا ہوگا کہ ہار دو بار گم ہوا اور دو سفر میں ہوا؛ کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مختلف روایات جو منقول ہوئی ہیں، ان سے یہ بات پورے طور پر معلوم ہو رہی ہے کہ واقعات الگ الگ دو ہیں ''غزوہ بنی المصطلق'' میں بھی حضرت عائشہؓ کے پاس ہار تھا، فرماتی ہیں کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اعلان فرمایا کہ لشکر کوچ کرے، ادھر مجھے قضاء حاجت کا تقاضہ تھا، چنانچہ میں لشکر سے باہر چلی گئی، فارغ ہو کر آئی، اتفاق سے ہاتھ جو سینہ پر پہنچا تو خیال آیا کہ اسماء کا مستعار ہار جو میرے پاس تھا، نہیں ہے، اسی فکر میں نکل گئی، ہار تو تلاش کر کے لے آئی، لیکن جب پہونچی ہوں تو لشکر روانہ ہو چکا تھا، ایک واقعہ تو یہ ہے۔ یہ واقعہ راجح قول کے مطابق مریسیع یعنی غزوۂ بنی المصطلق کا ہے۔

دوسرا واقعہ جو اس روایت میں ہے، اس کے برعکس ہے، اس واقعہ میں موجود ہے کہ ہار گم ہوا تو حضرت عائشہؓ تلاش کے لیے نہیں گئیں، بلکہ نبی اکرم ﷺ نے ہار کی تلاش کے لیے قیام فرمایا اور ہار کی تلاش کی گئی، دونوں واقعات مختلف ہیں، وہاں خود حضرت عائشہ نے ہار تلاش کیا، یہاں خود سرکار دو عالم ﷺ نے ہار تلاش کروایا، وہاں لشکر کوچ کر گیا تھا، حضرت عائشہؓ تنہا رہ گئی تھیں، یہاں سب لوگوں کو ہار کی تلاش کے سبب رکنا پڑا، اس لیے یہ کہنا کہ واقعہ ایک ہے، روایات کے خلاف ہے، خود طبرانی میں یہ روایت عباد بن عبداللہ بن زبیر، حضرت عائشہؓ سے روایت موجود ہے:

| | |
|---|---|
| قالت لما کان من امر عقدی ما کان وقال اهل الافك ماقالوا خرجت مع رسول اللہ ﷺ فی غزوۃ اخری فسقط ایضا عقدی حتی حبس الناس علی التهامة فقال لی ابو بکر یابنیة! فی کل سفرة تکونین عناءً وبلاءً علی | حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب میرے ہار گم ہو جانے کا واقعہ پیش آیا اور بہتان لگانے والوں نے جو چاہا کہا، پھر اس کے بعد میں دوبارہ دوسرے غزوہ میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ گئی اور پھر دوبارہ میرا ہار گم ہو گیا اور لوگوں کو اس کی تلاش کے لیے رکنا پڑا، اس موقعہ پر حضرت ابو بکر نے فرمایا کہ اے بیٹی! تو ہر سفر میں لوگوں کے لیے مصیبت اور مشقت |

الناس فانزل اللّٰہ عزوجل الرخصة فی التیمم فقال ابو بکر انك لمبارکة ثلاثا

کا سبب بن جاتی ہے، تب باری تعالی نے تیمّم کی رخصت نازل فرمائی، تو حضرت ابو بکر نے تین بار فرمایا تو بڑی بابرکت ہے۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ ہار دوبار گم ہوا اور تیمّم کی یہ آیت ہار گم ہونے کے دوسرے واقعہ سے متعلق ہے، جو افک کے واقعہ کے بعد کا ہے، اسی لیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بیٹی تم تو ہر سفر میں مسلمانوں کے لیے مشکلات اور مشقت کا سبب بن جاتی ہو، اب سوال یہ ہے کہ افک کا واقعہ غزوہ بنی المصطلق سے متعلق ہے، یہ دوسرا واقعہ جو افک کے بعد پیش آیا ہے، کون سے سفر سے متعلق ہوگا؟

ابن حبیب اور بعض دوسرے مورخین کے نزدیک اس واقعہ کا تعلق ''غزوۂ ذات الرقاع'' سے ہے اور دلیل یہ ہے کہ غزوۂ بنی المصطلق کی آخری تاریخ شعبان ۶ھ ہے، اس سے آگے کی تاریخ کسی بھی مورخ نے بیان نہیں کی، اس کے ساتھ یہ بھی دیکھئے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مصنف بن ابی شیبہ میں روایت ہے کہ جب آیت تیمم نازل ہوئی تو ''لم ادر کیف اصنع'' میں نہیں جانتا تھا کہ تیمّم کا عمل کس طرح کیا جائے؟ معلوم ہوا کہ آیت تیمّم کے نزول کے واقعہ میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ شریک تھے اور ظاہر ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ خیبر میں حاضر ہوئے ہیں، جس کا شمار ۷ھ کے غزوات میں ہے، پھر جب حضرت ابوہریرہؓ شریک ہیں اور غزوۂ بنی المصطلق کی آخری تاریخ شعبان ۶ھ سے متجاوز نہیں ہے، تو اس میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی شرکت کیسے ہوسکتی ہے؟ حضرت ابوہریرہؓ کی شرکت اور حضرت عائشہؓ کی روایت ''خرجت مع رسولِ اللّٰہ ﷺ فی غزوة اخری'' کہ میں دوسرے سفر میں سرکار رسالت مآب ﷺ کے ساتھ گئی، ان دونوں باتوں سے یہ بات راجح معلوم ہوتی ہے کہ یہ واقعہ ''غزوۂ ذات الرقاع'' کا ہے، نیز حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کی ''ذات الرقاع'' میں شرکت سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔

**آیت تیمّم سے کیا مراد ہے؟** حدیث میں آیا ہے: فانزل اللّٰہ آیة التیمم اللہ تعالی نے آیت تیمم نازل فرمائی، تیمّم کے سلسلے میں قرآن کریم میں دو آیتیں ہیں: ایک آیت سورۂ نساء کی ہے، اور دوسری آیت سورۂ مائدہ میں ہے، سوال یہ ہے کہ اس موقعہ پر کونسی آیت نازل ہوئی؟ امام بخاری نے فیصلہ کردیا کہ اس موقعہ پر سورۂ مائدہ والی آیت نازل ہوئی، کیوں کہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کے جو الفاظ نقل فرمائے ہیں ان میں ''منہ'' ہے اور ''منہ'' مائدہ میں ہے، نساء والی میں نہیں ہے۔

چنانچہ خود بخاریؒ نے سورۂ مائدہ کی تفسیر میں عمرو بن الحارث کے طریق سے اسی مائدہ والی آیت کو نقل کیا ہے، اور مسند حمیدی میں حضرت عائشہؓ کی روایت اسی طرح منقول ہوئی ہے، لہٰذا امام بخاری کا فیصلہ نزول آیت تیمم کے متعلق

صحیح ہے اور اکثر مفسرین نے بھی اس سے اتفاق کیا ہے، اگر چہ واحدی، بغوی اور ابن کثیر وغیرہ کی رائے اس سے مختلف ہے۔ بظاہر یہی راجح ہے کہ اس واقعہ سے متعلق جو آیت نازل ہوئی ہے، وہ سورۂ مائدہ کی آیت ہے، سورۂ نساء کی نہیں۔

لیکن ابن عربی کہتے ہیں کہ دونوں آیتوں میں سے کونسی آیت اس موقعہ پر نازل ہوئی ؟ اس کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، یہ ایک ایسی مشکل ہے کہ جس کا کوئی علاج نہیں ہے، مشکل کا مفہوم شاید یہ ہے کہ اگر اس واقعہ میں سورۂ مائدہ والی آیت نازل ہوئی ہے، جیسا کہ امام بخاری نے فیصلہ کیا ہے، تو سوال یہ ہے کہ سورۂ نساء والی آیت اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی یا نہیں؟ اگر نازل ہو چکی تھی تو اشکال یہ ہے کہ جب تیمم کا حکم پہلے سے معلوم ہو چکا تھا، تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کو پریشانی لاحق کیوں ہوئی ؟ اور اگر معاملہ ایسا نہیں ہے، بلکہ سورۂ نساء کی آیت مائدہ سے پہلے نازل نہیں ہوئی تھی، تو اشکال یہ ہے کہ جب اس موقعہ پر سورۂ مائدہ کی آیت سے تیمم کا حکم اور اس کی تفصیلات معلوم ہو گئیں، تو پھر دوبارہ سورہ نساء کی آیت کی ضرورت کیا تھی ؟ خصوصاً جب کہ دونوں کا سیاق بھی یکساں ہے، دونوں آیتوں میں الفاظ کا بھی کوئی فرق نہیں ہے، صرف ایک لفظ "منہ" ہے، جو سورۂ نساء میں نہیں ہے اور سورۂ مائدہ میں ہے۔ اس اشکال کو لاینحل قرار دیا گیا ہے، ابن عربی نے اس کو ایسا معمہ قرار دیا ہے، جس کا کوئی حل نہیں، مگر دونوں صورتوں میں جواب دہی کی گنجائش ہے، خواہ یہ مان لیں کہ سورہ نساء کی آیت پہلے بھی آچکی تھی اور اس واقعہ میں سورۂ مائدہ کی آیت نازل ہوئی اور خواہ یہ مان لیں کہ سورۂ نساء کی آیت اس واقعہ کے بعد نازل ہوئی، اگر سورۂ نساء کی آیت پہلے تسلیم کر لیں، تو حضرات صحابہ کی پریشانی کا باعث یہ بات ہو سکتی ہے کہ سورہ نساء کی آیت میں جنابت کا مسئلہ صراحت کے ساتھ نہیں ہے۔

آیت میں ارشاد فرمایا گیا ہے: "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَأَنْتُمْ سُكَارٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُباً إِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضٰى أَوْعَلٰى سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْلَا مَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيْداً طَيِّباً" اس آیت مبارکہ میں تصریح نہیں ہے کہ جنابت کی صورت میں بھی تیمّم کیا جاسکتا ہے، بلکہ ایک درجہ میں وہم یہی پیدا ہوتا ہے کہ جنبی کو بہر صورت غسل ہی کی ضرورت ہے۔ "وَلَا جُنُباً إِلَّا عَابِرِيْ سَبِيْلٍ حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا" اس سے یہ شبہ ہوتا ہے کہ مسافر کے علاوہ جنابت کی صورت میں غسل کے بغیر نماز کے قریب جانے کی اجازت نہیں ہے "حَتّٰى تَغْتَسِلُوْا" سے معلوم ہوتا ہے کہ اغتسال ضروری ہے، صرف مسافر مستثنی ہے، چنانچہ ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ حضرت عمار اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کسی سفر میں ساتھ ہو گئے، روایت میں تصریح ہے کہ دونوں کو غسل کی ضرورت ہو گئی، سوال یہ پیدا ہوا کہ پانی نہیں ہے، تو نماز کی ادائیگی کی کیا صورت ہو؟ حضرت عمار نے تو تیمم جنابت کو تیمم حدث پر قیاس کیا اور زمین پر لوٹ کر نماز پڑھ لی اور حضرت عمرؓ نے نماز کو مؤخر فرمادیا۔ اس روایت سے معلوم ہوا کہ تیمّم کے سلسلے میں آیت نساء ان حضرات کے سامنے تھی، لیکن چونکہ اس میں جنابت کے بارے میں کوئی تصریح نہیں تھی، اس لیے ان حضرات کو دشواری ہوئی، حضرت عمارؓ نے قیاس سے کام لیا کہ تیمم کے معاملہ سے یہ بات معلوم ہوئی کہ پانی کے نہ ملنے کی صورت میں مٹی سے پانی کا کام لیا جاسکتا ہے۔ اس لیے تیمّم

جنابت میں بھی وہی ہوگا جو غسل جنابت میں ہوتا ہے، وہاں سارے بدن پر پانی پہنچانا ضروری ہے، یہاں سارے بدن پر مٹی پہنچائی جائے گی۔ پھر اس کے بعد سورہ مائدہ کی آیت نازل ہوئی، جس میں فرمایا گیا "وَاِنْ کُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا" اگر تم جنبی ہو تو طہارت حاصل کرو، پھر آگے طہارت کی مکمل تفصیل کی گئی ہے کہ اگر تم مریض ہو یا مسافر ہو یا کوئی شخص قضاء حاجت سے فارغ ہو کر آیا ہے، یا عورتوں کے پاس گئے ہو اور ایسی صورتوں میں پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے تیمّم کرلو، اس آیت سے یہ معلوم ہوگیا کہ جنابت کی صورت میں بھی تیمّم کی اجازت ہے اور طریقہ تیمّم بھی وہی ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ سورہ مائدہ کی آیت کو نزول کے اعتبار سے مقدم مانیں، اس صورت میں اشکال یہ تھا کہ جب سورۂ مائدہ میں تیمّم کے حکم کی پوری تفصیلات آگئیں تو سورۂ نساء میں دوبارہ اس آیت کے نزول کی کیا ضرورت تھی؟

اس کا حل یہ ہے کہ واقعۂ تیمّم اور اس کی تفصیلات تو سورہ مائدہ میں آگئیں، لیکن جب سورۂ نساء میں دوسرا سیاق شروع ہوا "یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ وَلَا جُنُبًا اِلَّا عَابِرِیْ سَبِیْلٍ حَتّٰی تَغْتَسِلُوْا" (اے ایمان والو! سکر کی حالت میں نماز کے قریب مت جاؤ، یہاں تک کہ تم اپنے قول کو جان سکو اور نہ جنابت کی حالت میں، یہاں تک کہ غسل کرلو، الّا یہ کہ تم مسافر ہو) تو اس آیت میں اگر "حتی تغتسلوا" ہی پر آیت کو ختم کر دیا جائے تو شبہ گزر سکتا تھا کہ شاید سورۂ مائدہ میں بیان کیا گیا تیمّم کا حکم منسوخ ہوگیا ہے، کیوں کہ یہاں جنابت کے بعد صرف "تغتسلوا" لایا گیا ہے کہ غسل کیے بغیر نماز کے قریب نہ جاؤ، اس شبہ کے ازالہ کے لیے تیمّم کی آیت دوبارہ پھر تاکید کے لیے نازل کردی گئی کہ جنابت سے پاکی کا طریقہ غسل ہے، لیکن اگر پانی میسر نہ ہو، یا پانی میسر ہو، لیکن استعمال پر قدرت نہ ہو، مثلاً یہ کہ تم مریض ہو تو اس صورت میں تیمّم سے پاکی حاصل کی جاسکتی ہے۔

سورۂ مائدہ کی آیت میں اگرچہ طہارت کی تمام صورتوں کو جمع کر دیا گیا ہے، مگر جو بات اس سلسلہ میں نئی بتلائی گئی ہے وہ مسئلہ تیمّم ہے، اسی مناسبت سے اس کا نام آیت تیمّم ہوا، برخلاف سورۂ نساء والی آیت کے کہ وہاں غیر طہارت کی حالت میں نماز کے قریب جانے سے بھی روک دیا گیا یعنی مسئلہ طہارت از جملہ شرائط صلوۃ ہے، بدون طہارت نماز صحیح نہ ہوگی، گویا وہاں طہارت کی مشروعیت پر تنبیہ تھی، تو نساء میں اس کی ضرورت اور شرطیت پر زور دیا گیا ہے۔ اور پھر نساء والی آیت کا تعلق مسئلہ جنابت سے ہے، جیسا کہ اس کی شان نزول سے ظاہر ہوتا ہے اور آیت مائدہ میں معاملہ تیمّم محدث بحدث اصغر سے متعلق ہے، چنانچہ واقعہ کی تفصیل جو روایات میں موجود ہے اس کا بین ثبوت ہے، اس سے ابن عربی کے لاینحل اشکال کا جواب بھی ہوگیا اور اس بارے میں تکرار آیت کی ضرورت بھی واضح ہوگئی۔ واللہ اعلم بالصواب[1]

---

[1] بیداء اور ذات الجیش یہ دونوں مقام مکہ کے راستہ میں ہیں، طائف سے ان کا تعلق نہیں، جیسا کہ امام نووی کو دھوکا ہوا، یطعننی، طعن، یطعن از باب نصر ینصر، اس کے معنی ہیں، حسی طعن کے یعنی چوکا لگانا اور بفتح العین، از باب فتح یفتح اس کے معنی ہیں معنوی طعن کے یعنی ملامت اور عزت پر حملہ۔۱۲

(۳۳۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ هُوَ الْعَوَقِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ ح قَالَ (حَدَّثَنِي سَعِيْدُ بْنُ النَّضْرِ قَالَ حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ قَالَ اَخْبَرَنَا سَيَّارٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَزِيْدُ الْفَقِيْرُ قَالَ اَخْبَرَنَا جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ اَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اُعْطِيْتُ خَمْسًا لَمْ يُعْطَهُنَّ اَحَدٌ قَبْلِيْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُوْرًا وَّاَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ اُمَّتِيْ اَدْرَكَتْهُ الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ وَاُحِلَّتْ لِيَ الْمَغَانِمُ وَلَمْ تَحِلَّ لِاَحَدٍ قَبْلِيْ وَاُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ اِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ اِلَى النَّاسِ عَامَّةً. (آئندہ: ۴۳۸، ۳۱۲۲)

**ترجمہ** حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے پانچ ایسی چیزیں دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئی تھیں، دشمنوں کے مقابلہ پر ایک ماہ کی مسافت تک میرا رعب ڈال کر میری مدد کی جاتی ہے، تمام روئے زمین میرے لیے سجدہ گاہ اور پاکی حاصل کرنے کے لائق بنادی گئی، میری امت میں سے جو شخص بھی جس جگہ نماز کا وقت پائے وہیں نماز ادا کرے، میرے لئے مال غنیمت حلال کر دیا گیا، جب کہ مجھ سے پہلے کسی کے لیے مال غنیمت حلال نہیں تھا، مجھے شفاعت کبریٰ دی گئی اور مجھ سے پہلے نبی کو خاص اس قوم میں بھیجا جاتا تھا، مجھے تمام انسانوں کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔

**تشریح حدیث** سرکار دوعالم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مجھ کو پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی نبی کو نہیں دی گئی تھیں، ایک تو رعب جس کا تعلق جہاد سے ہے، پہلے انبیاء کرام میں بعض کے یہاں تو سرے سے جہاد ہی نہیں ہے اور یہاں جہاد ہے تو اس کے ساتھ خاص بات یہ ہے کہ آپ کا رعب ایک ایک ماہ کی مسافت تک دشمنوں پر چھا جاتا تھا، حالاں کہ آپ کے پاس اس قسم کے اسباب وسامان بھی نہیں ہوتے تھے کہ جو بڑے بڑے حکمرانوں کو مرعوب اور خوف زدہ کرنے کے لیے ضروری سمجھے جاتے تھے۔

"مسافة شهر" ایک ماہ کی مسافت فرمایا گیا ہے، اس میں اس سے زیادہ مسافت پر رعب پڑنے کی نفی نہیں ہے، عموماً آپ کے دشمن آپ سے اتنی ہی مسافت پر تھے، اس لیے اسی مسافت کا ذکر کیا گیا ورنہ آپ کا رعب تو اس سے کہیں زیادہ تھا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رعب ایک ماہ آگے اور ایک ماہ پیچھے تک پڑتا تھا۔

اور فرماتے ہیں "جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُوْرًا" ترجمہ کا تعلق اسی حصہ سے ہے کہ میرے لئے اللہ تعالیٰ نے تمام زمین کو مسجد بھی بنایا اور طہور بھی بنایا ہے یعنی زمین اصل کے اعتبار سے مسجد بھی ہے، اگر عوارض کی وجہ سے کسی زمین کے حصہ پر نماز یا تیمم کی اجازت نہ ہو تو وہ اس کے منافی نہیں ہے "جُعِلَتْ" کا لفظ بتلا رہا ہے کہ زمین میں جو شان طہور (پاک کرنے کی خصوصیت) آئی ہے، یہ زمین کی اصل سے نہیں آئی ہے، بلکہ صرف میری امت کے لیے خصوصیت ہے کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کرکے نماز پڑھی جائے، آگے فرماتے ہیں "وَاَيُّمَا رَجُلٍ اَدْرَكَتْهُ

الصَّلوٰةُ فَلْیُصَلِّ " میری امت میں جس شخص کو جس جگہ بھی نماز کا وقت ہو جائے وہ وہیں نماز ادا کر سکتا ہے، نماز کے لیے مسجد کی قید نہیں ہے، عام طور پر امم سابقہ میں قانون یہ تھا کہ نماز خاص جگہوں پر ہی پڑھ سکتے تھے، ہر جگہ نماز نہیں ہو سکتی تھی، کلیسا یا بیعہ میں ہی ہوتی تھی۔ اور اگر سفر کی صورت پیش آجاتی تو مصلّے کنیسہ یا بیعہ کی شکل کا ہونا ضروری تھا، لیکن ہمارے لیے آزادی ہے، مسجد میں پڑھیں یا سفر میں کہیں ہوں تو کسی بھی جگہ نماز پڑھ سکتے ہیں، خالی زمین پر بھی نماز پڑھ سکتے ہیں، گویا پچھلی امتیں امکنہ (جگہوں) کی پابند تھیں اور ہم امکنہ کے نہیں (ازمنہ) اوقات کے پابند ہیں اور اوقات کا تعین آفتاب کے طلوع وغروب سے ہے، اس لیے اس امت محمدیہ کے بارے میں کتب سابقہ میں آیا ہے: " اَنَا جِیْلُھُمْ فِیْ صُدُوْرِھِمْ **یُرَاقِبُوْنَ الشَّمْسَ** " ان کی انجیلیں یعنی کتاب ان کے سینوں میں محفوظ ہوں گی اور وہ آفتاب کی نگہداشت کریں گے۔

تیسری چیز ہے " اُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِمُ " امم سابقہ کے لیے مالِ غنیمت حلال نہ تھا، لیکن اس امت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے لیے مال غنیمت کو پاکیزہ قرار دیا گیا ہے، پہلی امتیں مال غنیمت کے سلسلے میں اس کی پابند تھیں کہ وہ تمام مالِ غنیمت ایک میدان میں لاکر جمع کر دیں اور آسمان سے سفید رنگ کی آگ کا انتظار کریں، اگر آگ نے اس کو جلا کر خاکستر کر دیا تو یہ مال غنیمت مقبول ہو گیا اور آگ کا نہ آنا اس بات کی علامت ہوتا تھا کہ اس مال میں خیانت کی گئی ہے، اس لیے مقبول نہیں ہوا، لیکن پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی برکت سے اس امت کے لیے مال غنیمت کو حلال کر دیا گیا۔

" وَاُوْتِیْتُ الشَّفَاعَةَ " چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ مجھے شفاعتِ کبری کا منصب ملا، اس میں کوئی شریک نہیں ہے، یعنی جب سب لوگ قیامت کے دن پریشان ہوں گے تو نبی اکرم ﷺ شفاعت کے لیے کھڑے ہوں گے کہ اے رب العالمین! اب معاملہ یک طرف ہو جانا چاہئے، آپ کی یہ شفاعت تمام امتوں کے لیے ہوگی، اس کا نام شفاعت کبری ہے اور یہ آپ ہی کی خصوصیت ہے۔ اور بھی بعض شفاعتیں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مخصوص ہیں، مثلاً ستر ہزار کی جماعت کا بے حساب جنت میں داخل ہونا، جب کہ ہر نفس کے ساتھ ایک ایک ہزار آدمی اور بھی ہوں گے، اس طرح ایک بہت بڑی جماعت بے حساب داخل جنت ہو جائے گی، گویا آپ کی شفاعت سے ایک بڑی جماعت سے حساب وکتاب اٹھ جائے گا، یا مثلاً جنت میں پہنچنے والوں کے درجات معین ہوں گے، مگر آپ کی شفاعت سے ان کو استحقاق سے بلند درجہ مل جائے گا، اسی طرح کچھ لوگ ایسے ہوں گے، جو اپنی بدعملی کی وجہ سے جنت کے نہیں بلکہ جہنم کے مستحق ہو گئے ہوں گے، مگر آپ کی شفاعت سے وہ سیدھے جنت میں پہنچا دیے جائیں گے، یا جہنم میں پہنچنے والے آپ کی شفاعت پر معمولی یا غیر معمولی سزا کے بعد قبل اتمام مدت جہنم سے نکال کر جنت میں داخل ہوں گے، یہ سب شفاعتیں آپ کے ساتھ مخصوص ہیں؛ باقی تمام شفاعتیں مشترک ہیں۔

" وَکَانَ النَّبِیُّ " پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ مجھے خداوند کریم نے تمام دنیا کی طرف مبعوث کیا ہے، یعنی اس وقت کے موجودہ لوگ بھی میری نبوت کی تصدیق کے مکلّف ہیں اور آنے والی نسلوں پر بھی میری نبوت پر ایمان لانا

ضروری ہوگا، تصدیق نہ کرنے والوں کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی راہ نجات نہیں ہے، اسی طرح پہلے انبیاء کرام کا حلقۂ بعثت الگ الگ ہوتا تھا، بڑے شہروں میں محلہ کی تقسیم کے تحت نبوت ملتی تھی، لیکن آپ ﷺ کی خصوصیت یہ ہے کہ اسود واحمر (کالے گورے) سب کی طرف بھیجے گئے ہیں، گو بعض انبیاء سابقین کی بعثت عام معلوم ہوتی ہے، لیکن وہ عموم وقتی تھا، جوان کی وفات یا دوسرے پیغمبر کے آنے کے بعد ختم ہوگیا، لیکن آپ کی شریعت آخری شریعت ہے، آپ کے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اس لیے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت عام معلوم ہوتی ہے، کیوں کہ انھوں نے صدیوں تک سب لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچایا اور جب یہ معلوم ہوگیا کہ ان لوگوں پر کوئی اثر نہیں ہوتا اور ان میں قطعاً صلاحیت نہیں ہے، تو اس وقت حضرت نوح علیہ السلام نے ایک عام بددعا کی ''رَبِّ لَاتَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكَافِرِيْنَ دَيَّارًا'' اے اللہ! اس روئے زمین پر کافروں میں سے ایک بھی بسنے والا نہ بچے، چنانچہ ایسا ہی ہوا، طوفان آیا اور سب کو بہالے گیا۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ بعثت عام تھی، عموم عذاب سے یہ بات یوں سمجھ میں آتی ہے کہ دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے ''مَاكُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا'' رسول کی بعثت کے بغیر ہم کسی قوم کو عذاب نہیں دیتے، اس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت عام معلوم ہوتی ہے، مگر عموم کے ساتھ وقتی تھی، جوان کے بعد ختم ہوگئی، اگر چہ ممکن یہ بھی ہے کہ اس وقت صرف حضرت نوح علیہ السلام کی قوم ہی دنیا میں موجود ہو اور اگر دوسری قوموں کا وجود بھی مان لیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو ہے حلقۂ بعثت، جس پر مع التزام شریعت تصدیق واجب ہے، دوسرے وہ لوگ ہیں جو حلقۂ بعثت میں نہیں ہیں، مگر توحید کا پیغام انھیں پہنچا سکتے ہیں، کیوں کہ توحید عام ہے، اس لیے حضرت نوح علیہ السلام نے توحید کا پیغام پہنچایا اور جب یہ نہ مانا گیا، تو عام بددعا فرمادی: رَبِّ لَا تَذَرْ الآية ۔

عینی فرماتے ہیں کہ میرے پاس ایک اور عمدہ جواب ہے اور وہ ان شاء اللہ کافی ہے، وہ یہ ہے کہ طوفان عام نہیں آیا کہ اس سے عموم بعثت پر استدلال ہو سکے بلکہ طوفان صرف قوم نوح پر آیا، لیکن اس کی دلیل عینی نے کوئی ذکر نہیں کی، بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ طوفان عام تھا، دنیا کی تمام قوموں کو تباہ کر دیا گیا، سوائے اہل کشتی کے اور اہل کشتی بھی نکلنے کے بعد وفات پاگئے، دنیا کی نسل محض ان کے بیٹوں حام، سام، یافث، سے چلی ہے، اسی لیے انہیں آدم ثانی کہا جاتا ہے، اگر طوفان عام نہ تھا اور دوسری قومیں بچ گئیں تو حضرت نوح علیہ السلام کو آدم ثانی کیسے کہا جا سکے گا؟ واللہ اعلم

## [۲] بَابٌ اِذَا لَمْ يَجِدْ مَاءً وَلَا تُرَابًا

(۳۳۶) حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا بْنُ يَحْيٰى قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ نُمَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا اسْتَعَارَتْ مِنْ اَسْمَاءَ قِلَادَةً فَهَلَكَتْ فَبَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَجُلًا فَوَجَدَهَا فَاَدْرَكَتْهُمُ الصَّلٰوةُ وَلَيْسَ مَعَهُمْ مَآءٌ فَصَلَّوْا فَشَكَوْا ذٰلِكَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ

فَأَنْزَلَ اللّٰهُ آيَةَ التَّيَمُّمِ فَقَالَ أُسَيْدُ بْنُ حُضَيْرٍ لِعَائِشَةَ جَزَاكِ اللّٰهُ خَيْراً فَوَاللّٰهِ مَا نَزَلَ بِكِ أَمْرٌ تَكْرَهِينَهُ إِلَّا جَعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ لَكِ وَلِلْمُسْلِمِينَ فِيهِ خَيْراً.　(گذشتہ: ۳۳۴)

**ترجمہ** باب، جب نہ پانی میسر آئے اور نہ مٹی ملے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک ہار حضرت اسماءؓ سے مستعار لیا اور وہ گم ہوگیا، پس رسول اکرم ﷺ نے ایک شخص کو اس کی تلاش کے لیے بھیجا اور وہ ہار انھیں مل گیا اور ان لوگوں کو نماز کا وقت ایسی حالت میں ہوگیا کہ ان کے پاس پانی نہیں تھا تو ان لوگوں نے بغیر وضو کے نماز ادا کرلی، پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں شکایت کی تو اللہ تعالیٰ نے تیمّم کی آیت نازل فرمادی۔ حضرت اسید بن حضیر نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ اللہ تمھیں جزائے خیر دے، قسم ہے، خداوندقدوس کی تمہارے ساتھ کوئی ایسی بات پیش نہیں آئی جس کو تم ناگوار گردانتی ہو، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس میں تمہارے لئے اور مسلمانوں کے لیے خیر و برکت عطا فرمادی۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ اگر کسی شخص کو نہ پاک مٹی میسر آئے نہ پانی ہی کا کوئی انتظام ہو، مثلاً کوئی شخص کسی ایسے قید خانے میں محبوس ہے، جس کی زمین اور درودیوار پاک نہیں ہیں اور پانی بھی نہیں ہے، یا کوئی شخص ایسی کشتی پر سوار ہے کہ دریا یا سمندر سے پانی نہیں لیا جاسکتا تو سوال یہ ہے کہ یہ شخص نماز کی ادائیگی کی کیا صورت اختیار کرے؟ ایسے شخص کو اصطلاح میں ''فاقد الطہورین'' کہتے ہیں، ائمۂ فقہ فاقد الطہورین کے مسئلہ میں باہم اختلاف کررہے ہیں کہ اگر کسی بھی طرح طہارت کا کوئی انتظام نہیں اور طہارت نماز میں شرط ہے، تو سوال یہ ہے کہ نماز کو موخر کیا جائے گا، یا ایسی ہی حالت میں نماز پڑھی جائے گی، یا اور کوئی صورت ہوگی؟ اس بارے میں امام شافعیؒ سے کئی روایتیں ہیں، مگر راجح اور مشہور قول یہی ہے کہ ایسی حالت میں نماز ادا کرے اور اس کے بعد قضا بھی لازم ہے، امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک نہ اس وقت نماز پڑھے اور نہ اس پر قضاء لازم ہے، وہ اس کو حائضہ پر قیاس کرتے ہیں، امام احمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک راجح قول یہ ہے کہ اسی حال میں نماز پڑھے، اس کی وہی صحیح مانی جائے گی، قضاء لازم نہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے ''إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ فَافْعَلُوا مَا اسْتَطَعْتُمْ بِهِ أَوْ كَمَا قَالَ'' یعنی جب میں تمھیں کسی چیز کا حکم دوں تو حسب استطاعت اس پر عمل کرو، گویا تکلیف بقدر طاقت ہے اور ایسا شخص کہ جس کو نماز تو ادا کرنی ہے، لیکن پانی یا مٹی، جس سے طہارت حاصل کرسکے میسر نہیں ہے، تو فاقد الطہورین اپنی استطاعت کے مطابق یہی صورت نکال سکتا ہے کہ نماز پڑھے اور توبہ کرے، امام شافعیؒ نے یہ فرمایا کہ چونکہ طہارت شرط ہے، جو یہاں مفقود ہے، اس لیے بعد میں قضاء کرلے۔

**احناف کا مسلک** ہمارا مسلک امام ابوحنیفہؒ کے راجح قول کے مطابق یہ ہے کہ فاقد الطہورین نماز نہیں پڑھ سکتا، البتہ صورت نمازیوں کی سی بنائے گا، یعنی وہ عمل کرے گا، جو نمازی کیا کرتا ہے، یعنی رکوع، سجدہ، قیام سب کچھ کرے گا، لیکن قراءت نہیں کرے گا اور اس کے بعد اس پر قضاء لازم ہوگی اور یہ اس لیے کہ ایسے شخص کی

قدرت میں صرف اتنی ہی بات تھی کہ وہ صورت کو قائم کردے، حقیقت پر عمل کرنا اس کے اختیار سے باہر ہے۔ اور اس بارے میں صورت صلوۃ کے قائم کرنے کا یہ شخص مکلّف ہے اور شریعت نے ایسے حالات میں صورت کے قیام کا مطالبہ کیا ہے، جس کے بارے میں متعدد نظیریں پیش کی جاسکتی ہیں کہ صورت کا قیام شریعت کے نزدیک مطلوب بھی ہے اور ثواب کا باعث بھی ہے۔

نظیر میں پیش کیا جاسکتا ہے کہ اگر رمضان میں حائضہ پاک ہوجائے، یا غیر مسلم ایمان لے آئے، یا بچہ بالغ ہو جائے، تو سب کے نزدیک کھانا پینا درست نہیں ہے، بلکہ یہ سب روزہ داروں کی طرح کھانے پینے سے رکے رہیں گے، یا مثلاً حج میں فساد پیدا ہونے کی صورت میں حاجی اتمام حج کا مکلّف ہے، اگرچہ اس کی قضاء لازم ہے، ان چیزوں سے معلوم ہوا کہ جہاں حقیقت پر عمل کرنا ناممکن ہوجائے، وہاں صورت پر عمل کرنا مطلوب ہوتا ہے۔

رہا یہ اشکال کہ جب یہ شخص فاقد الطہورین ہے اور نماز کا بھی مکلّف ہے تو جس طرح دیگر شرطوں کے فقدان کی صورت میں نماز کا عمل صحیح قرار دیا جاتا ہے، مثلاً کسی کے پاس کپڑا نہیں ہے تو بغیر کپڑے کے بھی نماز ہوجاتی ہے، یا مثلاً یہ کہ نماز میں استقبال قبلہ ضروری ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایسے میدان میں ہے کہ جہاں پر سمت کا پتہ نہیں چلتا تو تحری سے ایک سمت کو قبلہ قرار دے کر اس کی طرف نماز پڑھنے کا حکم ہے، خواہ وہ تحری کی سمت واقعی قبلہ کی سمت نہ ہو، شریعت کی نظر میں اس کی وہ نماز صحیح ہے، علم کے بعد اس کی قضا بھی نہیں ہے، تو جس طرح بحالت مجبوری ان شرائط کے پورا نہ ہونے کے باوجود نماز ہوجاتی ہے، اسی طرح سے اس شرط کے پورا نہ ہونے کی صورت میں بھی نماز ہوجانی چاہئے۔ جواب اس اشکال کا یہ ہے کہ ایک تو وہ معاملہ ہے جو زندگی میں بار بار پیش آتا ہے اور اکثر لوگوں کو پیش آتا ہے اور ایک وہ معاملہ ہے جو زندگی میں کبھی کبھار کسی کو پیش آجائے، ان دونوں صورتوں میں بڑا فرق ہے، ان دونوں کے احکام یکساں نہیں ہوسکتے، میدان میں سمت قبلہ کا معلوم نہ ہونا، یا کپڑا مہیا نہ ہونا، یا سفر میں پانی میسر نہ آنا، یہ تو وہ احوال ہیں جو اکثر و بیشتر پیش آتے رہتے ہیں، لیکن اتفاقاً کوئی شخص ایسی حالت سے دوچار ہوجائے کہ طہارت کے لیے پانی میسر نہ آسکے اور نہ پاک مٹی ہی مہیا ہوسکے، یہ صورت نادر اور کم پیش آنے والی ہے، اس لیے ایک معاملہ کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ امام بخاریؒ نے اس سلسلہ میں امام احمدؒ کا مسلک اختیار کیا ہے کہ نماز اسی حالت میں ادا کرے اور قضاء کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے امام بخاریؒ، امام احمدؒ کی تائید میں روایت لارہے ہیں۔

**حدیث باب** روایت گزرچکی ہے، امام بخاریؒ کا مقصد یہاں صرف یہ ہے کہ یہ حضرات ایسی جگہ تھے، جہاں آلۂ طہارت موجود نہ تھا، کیوں کہ پانی تو معلوم ہے کہ موجود تھا ہی نہیں اور مٹی یوں موجود نہ تھی کہ اس وقت تک تیمم کا حکم ہی نہ آیا تھا، لہٰذا یہ حضرات فاقد الطہورین ہوگئے، ان میں سے بعض حضرات نے جو ہار کی تلاش میں گئے تھے، یعنی حضرت اسید بن حضیر اور ان کے رفقاء، ان لوگوں نے اسی حال میں بغیر وضوء کے نماز پڑھ لی، نماز پڑھنے

کے بعد پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

صحابہ کرامؓ نے پانی نہ ملنے کی شکایت اور نماز کے قضاء ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا، چنانچہ تیمّم کی آیت نازل ہوئی اور صحابہ نے تیمّم کر کے نماز پڑھی۔

استدلال کا مدار اس چیز پر ہے کہ اسید بن حضیر اور ان کے ساتھیوں نے جو بغیر طہارت نماز پڑھی تھی، پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے انھیں دوبارہ نماز پڑھنے کا حکم نہیں فرمایا، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو راوی ضرور اس کا ذکر کرتا، مگر روایت میں اس کے متعلق ایک لفظ بھی مذکور نہیں، پس معلوم ہوا کہ ان کی وہی بے طہارت والی نماز صحیح قرار دی گئی، مگر یہ استدلال جس درجہ کا ہے، ظاہر ہے، کیا معلوم کہ آپ ﷺ نے ان کی نماز کو صحیح قرار دیا اور اعادہ کا حکم نہیں فرمایا؟ کیا عدم ذکر عدم واقعی کی دلیل بن سکتا ہے، ظاہر تو یہ ہے کہ انھوں نے آں حضرت ﷺ اور دیگر صحابہ کی معیت میں تیمّم سے دوبارہ نماز پڑھی ہوگی۔

یہ کہنا کہ جناب حدیث میں تو اس کی صراحت ہے کہ ”فَصَلَّوْا بِغَیْرِ وُضُوْءٍ“ ان حضرات نے بغیر وضو کے نماز ادا کی، لیکن یہ الفاظ احناف پر حجت نہیں ہو سکتے، کیوں کہ روایت میں یہ تصریح نہیں ہے کہ یہ عمل پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمّم کا حکم نازل ہونے سے پہلے کرلیا گیا ہو، ہوسکتا ہے کہ تیمّم کا حکم آنے کے بعد نماز پڑھی ہو، جیسا کہ دوسری روایات میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمت میں شکایت کی گئی، انھوں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تنبیہ کی، اس کے بعد تیمّم کی آیت نازل ہوئی، تب لوگوں نے نماز ادا کی، تو ہوسکتا ہے کہ راوی نے اجزاء کی ترتیب بدل دی ہو، یا نماز کا ذکر مقدم کردیا ہو کہ پانی نہ تھا، لوگوں نے نماز پڑھ لی، دوسری بات یہ ہے کہ اس روایت میں جو واقعہ ہے وہ زیادہ سے زیادہ ”حکایة حال لا عموم لها“ یعنی یہ ایک واقعہ ہے جس میں عموم نہیں ہے، دوسری طرف ایک اصول بیان کیا گیا ہے ”لا صلوۃ الا بطہور“ بغیر پاکی کے نماز نہیں ہوسکتی، جب کوئی خاص واقعہ کسی اصول سے ٹکرائے گا تو ظاہر ہے کہ ترجیح اصول ہی کو ہوگی، تیسری بات یہ ہے کہ بخاری نے یہاں فقد ماء پر فاقد الطہورین کو قیاس کیا ہے، جب کہ پانی نہ ملنا اکثر وبیشتر پیش آنے والی چیز ہے اور پانی اور مٹی میں سے دونوں کا نہ ملنا بہت شاذ اور بہت نادر ہے اور قیاس کے لئے علت جامعہ ہونا ضروری ہے، حالاں کہ یہاں علت جامعہ نہیں ہے، بلکہ عام پیش آنے والی بات پر، نادر الوجود صورت کا قیاس قیاس مع الفارق ہے، چوتھی بات یہ ہے کہ جس طرح امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے پاس حضرت اسید بن حضیر کا واقعہ ہے کہ انھوں نے اور ان کے رفقاء نے بغیر وضوء کے نماز پڑھی اور انھیں اعادہ کا حکم نہیں ہوا، اسی طرح سے دوسرے حضرات کے پاس حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ انھوں نے پانی نہ ملنے کی صورت میں نماز ہی ادا نہیں کی بلکہ قضا کردی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں بھی یہ تفصیل نہیں ہے کہ نماز کے قضاء کرنے پر کسی طرح کا کوئی عتاب ہوا ہو۔

یہ چند باتیں ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ بخاری نے اپنے مدعا کے اثبات میں جو چیز پیش کی ہے نہ تو وہ نص ہے اور نہ وہ قیاس صحیح ہے، جس سے انھوں نے مدعا نکالنے کی کوشش کی ہے، اس لیے وہ قابل تسلیم نہیں ہے۔ واللہ اعلم

## [۳] بَابُ التَّيَمُّمِ فِي الْحَضَرِ إِذَا لَمْ يَجِدِ الْمَآءَ وَخَافَ فَوْتَ الصَّلٰوةِ

وَبِهٖ قَالَ عَطَآءٌ. وَقَالَ الْحَسَنُ فِي الْمَرِيْضِ عِنْدَهُ الْمَآءُ وَلَا يَجِدُ مَنْ يُنَاوِلُهُ يَتَيَمَّمُ. وَأَقْبَلَ ابْنُ عُمَرَ مِنْ أَرْضِهٖ بِالْجُرُفِ فَحَضَرَتِ الْعَصْرُ بِمَرْبَدِ النَّعَمِ فَصَلّٰى ثُمَّ دَخَلَ الْمَدِيْنَةَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ فَلَمْ يُعِدْ.

(۳۳۷) حَدَّثَنَا يَحْيٰى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ جَعْفَرِ بْنِ رَبِيْعَةَ عَنِ الْاَعْرَجِ قَالَ سَمِعْتُ عُمَيْراً مَوْلٰى ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ أَقْبَلْتُ أَنَا وَعَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يَسَارٍ مَوْلٰى مَيْمُوْنَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ حَتّٰى دَخَلْنَا عَلٰى أَبِيْ جُهَيْمِ بْنِ الْحَارِثِ بْنِ الصِّمَّةِ الْاَنْصَارِيِّ فَقَالَ أَبُوْ جُهَيْمٍ أَقْبَلَ النَّبِيُّ ﷺ مِنْ نَحْوِ بِيْرِ جَمَلٍ فَلَقِيَهُ رَجُلٌ فَسَلَّمَ عَلَيْهِ فَلَمْ يَرُدَّ عَلَيْهِ النَّبِيُّ ﷺ حَتّٰى أَقْبَلَ عَلَى الْجِدَارِ فَمَسَحَ وَجْهَهُ وَيَدَيْهِ ثُمَّ رَدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ.

**ترجمہ** باب، حضر یعنی غیر سفر کی حالت میں تیمّم کی اجازت کا بیان۔ جب پانی میسر نہ آئے اور نماز کے فوت ہوجانے کا خوف ہو، عطاء بن ابی رباح بھی اسی کے قائل ہیں، حسن بصری نے اس مریض کے بارے میں جس کے پاس پانی ہو، لیکن کوئی ایسا شخص نہ ہو جو اس کو پانی دے سکے، فرمایا کہ وہ تیمّم کرلے۔ حضرت ابن عمر اپنی اس زمین سے واپس ہوئے جو مقام جرف میں تھی مربد نعم کے مقام پر انھیں عصر کا وقت ہوگیا، تو آپ نے وہیں نماز ادا فرمالی، پھر مدینہ میں داخل ہوئے اور اس وقت آفتاب بلند تھا، لیکن آپ نے نماز نہیں لوٹائی۔ حضرت عمیر ابن عباس کے آزاد کردہ غلام فرماتے ہیں کہ میں اور عبداللہ بن یسار، حضرت میمونہؓ حرم نبی ﷺ کے آزاد کردہ غلام، ہم دونوں آئے اور حضرت ابوجہیم انصاری کی خدمت میں پہنچے تو حضرت ابوجہیم نے فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ بیر جمل کی جانب سے تشریف لائے تو آپ کو ایک صحابی ملے، انھوں نے آپ کو سلام کیا، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب نہیں دیا، یہاں تک کہ آپ ایک دیوار کے قریب پہنچے، پھر اپنے چہرۂ مبارک اور ہاتھوں پر مسح، یعنی تیمّم کیا اور اس کے بعد سلام کا جواب دیا۔

**مقصد ترجمہ** اگر حضر میں پانی میسر نہ آئے یا پانی کے استعمال پر قدرت نہ ہو تو تیمّم کر کے نماز پڑھ سکتا ہے یا نہیں؟ پھر وہ نماز جو غیر سفر یعنی حضر کی حالت میں تیمّم کے ساتھ پڑھی گئی ہے، اداء فرض لئے کافی ہوگی، یا پانی ملنے پر پھر اس کا اعادہ لازم ہوگا۔

اس ترجمہ کی ضرورت یوں پیش آئی کہ قرآن کریم میں تیمّم کی جو آیت ہے، اس میں سفر کی قید لگی ہوئی ہے،

اگر چہ اس کا حاصل صرف اتنا ہے کہ بیشتر مسافروں کو ہی یہ صورت پیش آتی رہتی ہے کہ پانی نہ ملے، حضر کی حالت میں ایسا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے، لیکن چونکہ سفر کی قید آیت میں موجود ہے، اس لیے سوال پیدا ہوا کہ حضر میں تیمم کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ اس مسئلہ میں جمہور کا مسلک تو یہی ہے کہ جس ضرورت سے تیمم کی اجازت سفر میں دی گئی ہے اگر اسی قسم کی کوئی ضرورت حضر میں پیش آ جائے تو تیمم درست ہے، البتہ حافظ نے حضرت امام شافعیؒ سے نقل کیا ہے کہ کیوں کہ حضر میں پانی میسر نہ آنا شاذ ونادر ہی ہوتا ہے، اس لیے پانی نہ ملنے کی صورت میں اس کی اجازت دی جائے گی کہ تیمم کر کے نماز پڑھ لے، مگر پانی ملنے کے بعد اس کا لوٹانا واجب ہوگا، امام مالک کی طرف منسوب ہے کہ حضر میں تیمم کے ساتھ نماز ادا ہو جائے گی، لیکن اگر اندرون وقت ہی پانی مل گیا تو نماز کا لوٹا لینا مستحب ہے، ہمارے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر حضر میں پانی میسر نہیں ہے، تو انتظار کرے، شاید کہیں سے پانی کا انتظام ہو جائے اور جب یہ سمجھ لے کہ مزید انتظار میں نماز فوت ہو سکتی ہے تو تیمم کر کے نماز پڑھ لے، پھر لوٹانے کی ضرورت نہیں، البتہ احناف میں امام زفر اور ایک قول میں امام ابو یوسف بھی اس کے قائل ہیں کہ حضر میں تیمم کی اجازت نہیں، نماز مؤخر کر دے، امام ابو یوسف کا دوسرا قول جو عینی نے ''شرح اقطع'' سے نقل کیا ہے، یہی ہے کہ پانی کے انتظار میں نماز کو اتنا مؤخر کیا جائے کہ مزید انتظار کی گنجائش نہ رہے، پھر اندورن وقت ہی تیمم سے نماز ادا کر لے۔

اب بخاری کے قائم کردہ ترجمہ'' التیمم فی الحضر '' کا رخ واضح ہے، اس کا رخ امام زفر اور امام ابو یوسف کے ایک قول کی طرف ہے، ورنہ دیگر حضرات ائمہ سب ہی حضر میں تیمم کے جواز کے قائل ہیں، بخاری کہتے ہیں'' اِذَا لَمْ یَجِدِ الْمَآءَ وَخَافَ فَوْتَ الصَّلٰوۃِ '' جب حضر میں پانی نہ مل سکے اور ڈر ہو کہ مزید انتظار کیا تو نماز فوت ہو جائے گی، ایسی صورت میں تیمم کر کے نماز پڑھ لے، آگے کہتے ہیں'' وَبِہٖ قَالَ عَطَآءٌ'' حضرت عطاء بن ابی رباح نے بھی یہی فرمایا ہے، یعنی حضرت عطاء کے نزدیک بھی اول وقت میں تیمم کی اجازت نہیں ہے، اتنا انتظار کیا جائے کہ مزید انتظار کی گنجائش نہ رہے۔

حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص بیمار ہے اور پانی موجود ہے، لیکن بیماری کی وجہ سے وہ شخص اٹھ کر پانی نہیں لے سکتا، نیز یہ کہ کوئی دوسرا ایسا شخص بھی نہیں ہے جو اس کو پانی اٹھا کر دے سکے تو ایسی صورت میں یہ مریض تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔ اصل یہ ہے کہ آیت تیمم میں فرمایا گیا ہے:'' اِنْ لَّمْ تَجِدُوْا مَآءً '' اگر پانی نہ ملے تو تیمم کر لو، پانی نہ ملنا دونوں صورتوں کو عام ہے کہ سرے سے پانی ہی نہ ہو، یا پانی ہو، لیکن اس کے استعمال پر قدرت نہ ہو، مثلاً یہ کہ ایسی بیماری ہے کہ اس میں پانی کا استعمال نقصان دہ ہے، یا کنویں میں پانی موجود ہے، مگر ڈول رسی نہیں ہے، یا پانی سامنے ہے اور کوئی درندہ وہاں پر بیٹھا ہوا ہے، یا سفر ہی کی حالت میں ہے، پانی بھی موجود ہے، مگر خطرہ یہ ہے کہ اگر یہ پانی وضو میں صرف کر لیا تو پیاسا رہنا ہوگا: ان تمام صورتوں میں اس شخص کے بارے میں فیصلہ یہی کیا جائے گا کہ وہ واجد ماء نہیں ہے،

گویا پانی کے استعمال پر اس کو قدرت نہیں ہے، وہ تیمم کر سکتا ہے، البتہ بخاری کی بیان کردہ صورت میں حضرت حسنؒ اور امام ابوحنیفہؒ میں فرق یہ ہے کہ حضرت حسن کے نزدیک اگر کوئی شخص پانی دینے والا موجود ہے، تو تیمم درست نہیں ہے، گویا ان کے نزدیک اپنی قدرت بھی قدرت ہے اور دوسرے کے ذریعہ حاصل کی جائے وہ بھی قدرت ہے، صاحبین بھی اسی کے قائل ہیں، مگر حضرت امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ جو قدرت شریعت میں معتبر ہے وہ انسان کی اپنی قدرت ہے، دوسرے سے حاصل کی گئی قدرت کا اعتبار نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسے موقعہ پر کوئی دوسرا شخص ہو تو اس سے کہہ دیکھے، اگر وہ اٹھا دے تو بہتر ہے، ورنہ اس کو قدرت نہیں کہا جائے گا۔

**وَاَقْبَلَ ابْنُ عُمَرَ الخ** حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ مقام جرف سے جہاں ان کی زمین تھی، مدینہ کی طرف چلے، جرف مدینہ سے تین میل کے فاصلے پر ہے، یہ وہ مقام ہے، جہاں غزوہ کے موقعہ پر لشکر جمع کیا جاتا تھا، تاکہ وہاں سے منزل مقصود کی طرف آگے بڑھے، تو حضرت ابن عمرؓ مقام جرف سے مدینہ کی طرف چلے، ابھی مربدنعم میں ہی پہنچے تھے کہ عصر کا وقت ہو گیا، مربدنعم شراح بخاری کی تصریحات کے مطابق مدینہ سے دو میل کے فاصلہ پر ہے، مربدنعم میں پہنچ کر حضرت ابن عمر نے عصر کی نماز پڑھی۔ ترجمۃ الباب سے مناسبت یہ ہے کہ اس روایت کے دوسرے طرق میں تصریح ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے تیمّم کیا اور عصر کی نماز ادا فرمائی، پھر مدینہ منورہ میں ایسے وقت میں داخل بھی ہو گئے کہ سورج ابھی بلند تھا اور حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں پہنچ کر نماز لوٹائی نہیں، بخاری رحمہ اللہ کا مقصد حل ہو گیا، کیوں کہ مربدنعم مدینہ سے اتنے فاصلہ پر نہیں ہے کہ اس کو سفر شرعی کا درجہ دیا جا سکے، اس لیے یقیناً حضرت ابن عمر کا یہ واقعہ حضر کا واقعہ ہے، جس میں آپ نے تیمّم سے عصر کی نماز ادا کی ہے، معلوم ہوا کہ اگر حضر میں بھی شرائط تیمم پائے جائیں تو تیمم کر کے ادا کی ہوئی نماز معتبر ہے، اس کو لوٹانے کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے عمل سے معلوم ہوا کہ آپ وقت کے اندر ہی مدینہ پہنچ گئے اور آپ نے عصر کی نماز نہیں لوٹائی۔

لیکن یہاں ایک اشکال ہے اور وہ یہ ہے کہ حضر میں تیمّم کی اجازت کے لیے ایک شرط اور یہ ہے کہ اگر پانی نہ ملے تو فوراً تیمم نہیں کرنا چاہئے، بلکہ پانی کا انتظار کرنا چاہئے، حتی کہ جب نماز فوت ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے، تب تیمّم کر کے نماز پڑھی جائے، جیسا کہ بخاری کے عنوان سے معلوم ہوتا ہے ''اِذَا لَمْ يَجِدِ الْمَآءَ وَخَافَ فَوْتَ الصَّلٰوةِ'' اور یہاں معاملہ یہ ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ مدینہ سے صرف دو میل کے فاصلہ پر ہیں، اگر پہنچنا چاہیں تو اندرون وقت پہنچ سکتے ہیں، چنانچہ نماز کے بعد روانہ ہوئے اور وقت کے اندر پہنچ بھی گئے، اس لیے حضرت ابن عمر کو احتیاط کرنی چاہئے تھی، جب وقت جاتا دیکھتے تو تیمّم سے پڑھ لیتے، ان چیزوں کے پیش نظر سوال یہ ہے کہ حضرت ابن عمر نے تیمم سے نماز کیوں پڑھی؟ جب کہ وہ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں وقت کے اندر اندر مدینہ پہنچ جاؤں گا۔

اس اشکال کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ یہ بات بھی ممکن ہے کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کو مربدنعم میں

دیر تک ٹھہرنا ہو اور انھیں یقین ہو کہ جس ضرورت سے میں یہاں ٹھہرا ہوں اس کے پورا کرنے میں اتنی دیر ضرور لگے گی کہ میں وقت کے اندر مدینہ نہیں پہونچ سکوں گا، اس لیے تیمم سے عصر کی نماز پڑھ لی، نماز سے فراغت کے بعد یا تو وہ ضرورت خلاف توقع پوری ہوگئی، یا ان کی رائے بدل گئی اور انھوں نے فوراً مدینہ کا رخ فرمایا اور اندرون وقت مدینہ منورہ پہنچ گئے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ہوسکتا ہے، حضرت ابن عمرؓ اس وقت باوضو ہوں اور چوں کہ ہر نماز کے لیے تجدید وضو حضرت ابن عمرؓ کی عادت تھی، اس لیے اس وقت پانی نہ ہونے کے سبب تجدید طہارت انھوں نے وضو کے بجائے تیمم سے کر لی ہو، اس لیے مربدنعم میں ادا کی گئی نماز تیمّم سے ادا نہیں ہوئی، بلکہ وضو سے ادا ہوئی، لیکن بخاری رحمہ اللہ کا ترجمہ ان کے ظاہری عمل سے متعلق ہے کہ مربدنعم میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ نے تیمم سے عصر کی نماز ادا کی اور مدینہ اندرون وقت پہنچ گئے، لیکن نماز لوٹائی نہیں، معلوم ہوا کہ حضر میں بھی تیمم سے نماز کی اجازت ہے۔ آگے حدیث پیش کر رہے ہیں۔

**حدیث باب** | عمیر مولی ابن عباس فرماتے ہیں کہ میں اور عبداللہ بن یسار مولی حضرت میمونہ ہم دونوں حضرت ابوجہیمؓ کے گھر حاضر ہوئے، ابوجہیم نے یہ واقعہ سنایا کہ آں حضرت ﷺ بیر جمل سے تشریف لا رہے تھے، بیر جمل مدینہ سے قریب ہے، اس کنویں میں کسی موقعہ پر اونٹ گر گیا تھا اس لیے اس کو بیر جمل کہتے ہیں، بیر جمل سے واپسی میں آں حضور ﷺ سے ایک شخص کی ملاقات ہوئی، دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص ابوجہیم ہی ہیں، جب سامنا ہوا تو ابوجہیم نے سلام عرض کیا، مگر نبی اکرم ﷺ نے جواب نہیں فرمایا، تا ایں کہ جب ایک دیوار سامنے آئی تو آپ نے تیمّم فرمایا اور پھر جواب دیا۔

یہ روایت یہاں بہت مختصر ہے، تفصیلی روایت نسائی، ترمذی اور دوسری کتابوں میں موجود ہے، صورت یہ تھی کہ ابوجہیم نے جس وقت سلام کیا اس وقت آپ باوضو نہیں تھے، جب انھوں نے سلام عرض کیا، اس وقت آں حضرت ﷺ نہیں چاہتے تھے کہ بغیر وضو کے خدا کا نام لیں، کیوں کہ سلام کے جواب میں "وَعَلَیْکُمُ السلام" کہنا پڑتا ہے اور سلام اسماء باری تعالیٰ میں ہے، اس لیے آں حضور ﷺ نے سلام کا فوراً جواب نہیں دیا، اس کے بعد یہ ہوا کہ یہ سلام کرنے والے ابوجہیم کسی گلی میں مڑنے والے تھے، پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے خیال فرمایا کہ اگر یہ چلے گئے تو سلام کا قرض باقی رہ جائے گا، اس لیے فوراً دیوار پر تیمّم کر کے جواب عنایت فرما دیا اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا کہ مجھے یہ بات ناپسند معلوم ہوئی کہ غیر طہارت کی حالت میں خدا کا نام زبان پر جاری ہو، اس لیے تیمم کے بعد جواب دیا ہے، بعض اور روایات بھی ہیں، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ سلام کرنے والے نے اس وقت سلام کیا تھا، جب آپ پیشاب میں مشغول تھے، لیکن آیا یہ روایت اور وہ روایت الگ الگ ہیں یا ایک ہی ہیں؟ اس سلسلہ میں محدثین کرام نے بڑی بحثیں کی ہیں اور بالآخر فیصلہ یہ ہوا کہ یہ دونوں روایات الگ الگ ہیں۔

اس روایت سے امام بخاریؒ کا مدعا تو صرف اس قدر ہے کہ آں حضرت ﷺ قضاء حاجت سے فارغ ہو کر

آرہے تھے اور آپ کا وضو نہ تھا، ابوجہیمؓ نے آپ کو سلام کیا، آپ پر اس وقت خاص حالت طاری تھی، اور آپ بغیر طہارت زبان پر نام خداوندی لانا نہیں چاہتے تھے، جب سلام کرنے والا رخصت ہونے لگا تو آپ نے دیوار پر تیمّم کیا اور سلام کا جواب دیا، ظاہر ہے کہ آپ اس وقت سفر میں نہیں تھے، بیر جمل سے واپس ہورہے تھے، بیر جمل مدینہ سے قریب ہی ایک جگہ ہے، پانی مدینہ میں موجود ہے، لیکن آپ نے تیمّم سے جواب دیا، بس بخاری کا مدعا ثابت ہوگیا کہ حضر کی حالت میں بھی تیمّم کی اجازت ہے۔

بخاریؒ کا استدلال اس طرح ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ نے سلام کا جواب فوت ہونے کے اندیشہ سے تیمّم فرمالیا، حالاں کہ اذکار اور سلام کے لیے طہارت شرط نہیں ہے، پھر اگر حضر میں نماز فوت ہوجانے کا اندیشہ ہو تو بدرجۂ اولیٰ تیمّم کی اجازت ہونی چاہئے۔

**احناف کا مسلک** یہیں سے احناف نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ جن اذکار کے لیے طہارت مستحب ہے، ان کے لیے پانی ہوتے ہوئے بھی تیمّم سے کام لیا جاسکتا ہے، اسی طرح جو فرائض لا الی خلف فوت ہورہے ہوں (یعنی جن کا کوئی بدل نہ ہو) ان کے لئے بھی پانی کے استعمال پر قدرت کے باوجود تیمّم کی اجازت ہے، اگر یہ خیال ہو کہ پانی استعمال کروں گا تو شرکت نہ ہوسکے گی، جیسے نماز جنازہ اور نماز عید وغیرہ۔ واللہ اعلم

## [۴] بَابٌ هَلْ يَنْفُخُ فِيْ يَدَيْهِ بَعْدَ مَا يَضْرِبُ بِهِمَا الصَّعِيْدَ لِلتَّيَمُّمِ

(۳۳۸) حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا الْحَكَمُ عَنْ ذَرٍّ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَانِ بْنِ اَبْزىٰ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلىٰ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَالَ اِنِّي اَجْنَبْتُ فَلَمْ اُصِبِ الْمَآءَ فَقَالَ عَمَّارُ بْنُ يَاسِرٍ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اَمَا تَذْكُرُ اَنَّا كُنَّا فِيْ سَفَرٍ اَنَا وَاَنْتَ فَاَجْنَبْنَا فَاَمَّا اَنْتَ فَلَمْ تُصَلِّ وَاَمَّا اَنَا فَتَمَعَّكْتُ فَصَلَّيْتُ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ اِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكَ هٰكَذَا فَضَرَبَ النَّبِيُّ ﷺ بِكَفَّيْهِ الْاَرْضَ فَنَفَخَ فِيْهِمَا ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهٗ وَكَفَّيْهِ . (آئندہ: ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷)

**ترجمہ** کیا تیمّم کے لیے مٹی پر دونوں ہاتھ مارنے کے بعد دونوں ہاتھوں پر پھونک مار کر مٹی کو اڑا سکتا ہے؟ حضرت عبدالرحمان بن ابزیٰ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر بن خطابؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا کہ مجھے جنابت لاحق ہوگئی اور پانی نہ ملا، تو حضرت عمار بن یاسرؓ نے حضرت عمر بن خطاب سے فرمایا، کیا آپ کو یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں اور آپ ایک سفر میں تھے اور دونوں کو جنابت لاحق ہوگئی تھی، آپ نے تو نماز ادا نہیں کی اور میں نے مٹی میں لوٹ لگائی اور نماز ادا کرلی، پھر میں نے رسول اکرم ﷺ سے ذکر کیا، تو آپ

نے فرمایا، تمہیں بس یہی کافی تھا: پھر رسول اکرم ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھ زمین پر مارے، پھر ان میں پھونک ماری، پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے چہرے اور ہاتھوں کا مسح فرمایا۔

**مقصد ترجمہ** سوال یہ ہے کہ تیمّم کے لیے زمین پر ہاتھ مارا، اس سے ہاتھوں پر مٹی لگ گئی تو کیا انھیں آلودہ ہاتھوں کو چہرے پر پھیرے یا اس مٹی کو پھونک مار کر اڑا دے اور پھر مسح کرے، اس عمل کی اجازت ہے یا نہیں؟ اس سوال کی بنیاد یہ ہے کہ مٹی پانی کا بدل ہے، اس لیے پانی کی طرح سے اس کا استعمال ہونا چاہئے، یعنی جس طرح پانی چہرے پر ڈالا جاتا ہے اور اس کا ایک اثر قائم ہوتا ہے، اسی طرح سے مٹی کے استعمال میں بھی اس کی رعایت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ جب تک مٹی کا اثر چہرے اور ہاتھوں پر نمایاں نہ ہو، اس وقت تک مٹی کا استعمال درست نہ مانا جائے، چنانچہ حضرات شوافع کا ایک خیال یہ بھی ہے کہ زمین پر ہاتھ مارنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ غبار ہاتھوں کو لگ جائے، تب تیمّم درست ہوگا اور اگر زمین ایسی ہے کہ ہاتھوں کو کچھ نہیں لگتا تو تیمّم درست نہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ بخاریؒ ان حضرات کے خلاف کی طرف بھی اشارہ کر رہے ہوں۔

چنانچہ بخاریؒ ترجمہ میں ثابت کر رہے ہیں کہ پانی کی طرح مٹی کے اثرات کا چہرے اور ہاتھ پر نمایاں ہونا ضروری نہیں ہے، مٹی سے آلودہ ہاتھوں کو چہرے پر پھیرنا مثلہ کرنے کے مرادف ہے جس کی ممانعت ہے، نیز یہ کہ اس میں بھبوت ملنے سے مشابہت ہے اور یہ عمل طہارت ونظافت کے بھی خلاف ہے، اس لیے تیمّم کے لیے مٹی پر ہاتھ مارنے کے بعد ہاتھوں پر پھونک مار کر زائد مٹی کو اڑا دے، پھر ہاتھ اور چہرے کا مسح کرے، معلوم ہوا کہ تیمّم کا مقصد مخصوص قسم کا تعبد (عبادت) ہے، مٹی سے چہرے اور ہاتھوں کا ملوث کرنا مقصد نہیں ہے، آگے حدیث لا رہے ہیں۔

**تشریح حدیث** یہ حدیث یہاں مختصر ہے، آگے یہ روایت تفصیل سے آرہی ہے، ایک شخص حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے نہانے کی ضرورت ہے اور پانی نہیں ہے، تو حضرت عمرؓ نے تیمّم نہیں بتلایا، بلکہ فرمایا کہ اگر مجھے ایک ماہ تک بھی پانی نہ ملے تو میں تیمّم نہ کروں گا، حضرت عمار بن یاسرؓ بیٹھے تھے، انھوں نے فرمایا امیر المومنین! کیا آپ کو وہ واقعہ یاد نہیں ہے کہ ایک بار میں اور آپ اونٹ چرانے کے لیے جنگل گئے تھے اور دونوں کو نہانے کی ضرورت ہوگئی تھی، آپ نے تو نماز کو مؤخر کر دیا تھا اور میں نے زمین پر لوٹ کر نماز پڑھ لی تھی، پھر پیغمبر ﷺ کے سامنے یہ ذکر آیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کی ضرورت نہ تھی، یعنی تم نے جو تیمّم جنابت کو غسل جنابت پر قیاس کیا، یہ قیاس درست نہ تھا، بلکہ یہ بات کافی تھی اور اس کے بعد آپ نے اپنا دست مبارک زمین پر مارا، اس کے بعد پھونک ماری اور چہرۂ مبارک اور ہاتھوں کا مسح فرمایا۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عمارؓ کے مناظرے سے جو مسئلہ متعلق ہے وہ تو آگے آئے گا، بخاری کا مقصد تو صرف پھونک سے ہے۔

روایت میں آیا ہے کہ آپ نے ہاتھ زمین پر مارنے کے بعد پھونک ماری کہ غبار اڑ جائے، معلوم ہوا کہ اس کی

اجازت ہے، قسطلانی میں مزید یہ ہے کہ "اَدْنَاهُمَا" پہلے تو آپ نے دونوں ہاتھ منہ سے قریب کئے، پھر پھونک ماری، اس کا ظاہر یہ ہے کہ اگر دور سے پھونک مارتے تو غبار رہ جاتا، قریب سے پھونک مارنے کا مقصد یہ تھا کہ تمام غبار اڑ جائے۔ یہ مسئلہ حضرات شوافع اور احناف کے درمیان مختلف فیہ ہے، بات اپنی جگہ طے شدہ ہے، کتب فقہ سے رجوع کیا جائے۔

## [۵] بَابٌ اَلتَّيَمُّمُ لِلْوَجْهِ وَالْكَفَّيْنِ

(۳۳۹) حَدَّثَنَا حَجَّاجٌ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ اَخْبَرَنِي الْحَكَمُ عَنْ ذَرٍّ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَانِ بْنِ اَبْزٰى عَنْ اَبِيْهِ قَالَ عَمَّارٌ بِهٰذَا وَضَرَبَ شُعْبَةُ بِيَدَيْهِ الْاَرْضَ ثُمَّ اَدْنَاهُمَا مِنْ فِيْهِ ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ . (گذشتہ: ۳۳۸)

وَقَالَ النَّضْرُ اَخْبَرَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْحَكَمِ قَالَ سَمِعْتُ ذَرًّا عَنِ ابْنِ عَبْدِالرَّحْمَانِ بْنِ أَبْزٰى قَالَ الْحَكَمُ وَقَدْ سَمِعْتُهُ مِنِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمَانِ بْنِ اِبْزٰى عَنْ اَبِيْهِ قَالَ عَمَّارٌ .

(۳۴۰) حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ ابْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْحِكَمِ عَنْ ذَرٍّ عَنِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمَانِ بْنِ ابْزٰى عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهُ شَهِدَ عُمَرَ وَقَالَ لَهُ عَمَّارٌ كُنَّافِيْ سَرِيَّةٍ فَاَجْنَبْنَا وَقَالَ تَفَلَ فِيْهِمَا . (گذشتہ: ۳۳۸)

(۳۴۱) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ كَثِيْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنِ الحَكَمِ عَنْ ذَرٍّ عَنِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَانِ بْنِ ابْزٰى عَنْ اَبِيْهِ عَبْدِ الرَّحْمَانَ قَالَ قَالَ عَمَّارٌ لِعُمَرَ تَمَعَّكْتُ فَاَتَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَقَالَ يَكْفِيْكَ الْوَجْهُ وَالْكَفَّيْنِ . (گذشتہ: ۳۳۸)

(۳۴۲) حَدَّثَنَا مُسْلِمٌ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْحَكَمِ عَنْ ذَرٍّ عَنِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمَانِ بْنِ ابْزٰى عَنْ عِبْدِ الرَّحمٰنِ قَالَ شَهِدْتُ عُمَرَ قَالَ لَهُ عَمَّارٌ وَسَاقَ الْحَدِيْث . (گذشتہ: ۳۳۸)

(۳۴۳) حَدَّثَنَا مَحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ حَدَّثَنا غُنْدُرٌ قَالَ حَدَّثَنا شُعْبَةُ عَنِ الحَكَمِ عَنْ ذَرٍّ عَنِ ابْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بنِ ابْزٰى عِنْ اَبِيْهِ قَالَ عَمَّارٌ فَضَرَبَ النَّبِيُّ ﷺ بِيَدِهِ الاَرْضَ فَمَسَحَ وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ . (گذشتہ: ۳۳۸)

**ترجمہ** باب، تیمم صرف چہرے اور دونوں ہاتھوں کے لیے ہے۔ عبدالرحمان اپنے والد ابزی سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے یہی فرمایا ہے اور حضرت شعبہ نے اپنے دونوں ہاتھوں کو زمین پر مارا پھر دونوں ہاتھ منہ سے نزدیک کئے، پھر چہرے اور ہاتھوں پر مسح فرمایا۔ نضر نے کہا کہ شعبہ نے حکم سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا کہ میں نے یہ روایت بلا واسطہ ذر بن عبدالرحمان سے بھی سنی ہے۔ حضرت عبدالرحمان بن ابزی اپنے والد

سے روایت کرتے ہیں کہ وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، عمارؓ نے ان سے کہا کہ ہم ایک سریہ میں گئے تھے اور دونوں کو جنابت لاحق ہوگئی اور اس روایت میں عمارؓ نے سرکار رسالت مآب ﷺ کی طرف نفخ کے بجائے تفل کی نسبت کی، یعنی سرکار رسالت مآب ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں پر اتنی زور سے پھونک ماری کہ اس کے ساتھ قدرے لعاب مبارک بھی شامل ہوگیا، یہاں تفل سے مراد مجرد نفخ ہے، صرف تعبیر کا فرق ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابزی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمارؓ نے حضرت عمرؓ سے کہا کہ میں خاک میں لوٹا اور رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ چہرے اور دونوں ہاتھوں کا مسح تجھے کافی تھا۔ عبدالرحمان بن ابزی سے روایت ہے کہ میں حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا، ان سے حضرت عمارؓ نے کہا اور عبدالرحمان نے یہی حدیث دہرائی۔ حضرت عبدالرحمان بن ابزی اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمار نے فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے ہاتھ کو زمین پر مارا اور پھر اپنے منہ اور ہاتھوں کا مسح کیا۔

**مقصد ترجمہ** شاہ ولی اللہ صاحب قدس سرہ نے فرمایا کہ "امام بخاری کا مسلک اس سلسلہ میں اصحاب ظواہر اور بعض مجتہدین کے مطابق ہے کہ تیمّم صرف چہرے اور ہاتھوں سے متعلق ہے، کہنیوں تک مسح کرنا ضروری نہیں اور یہ مسلک جمہور کا نہیں ہے"۔ اصحاب ظواہر کا مسلک یہ ہے کہ مسح کفین تک ہے، امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ تیمّم میں کفین کا مسح بھی کافی ہے، مرفقین (کہنیوں) تک ضروری نہیں، امام مالکؒ کی موطا سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کہنیوں تک کے مسح کو ضروری قرار دیتے ہیں، امام شافعیؒ کا آخری اور مشہور قول بھی کہنیوں تک مسح کی ضرورت کا ہے اور حضرات حنفیہ بھی کہنیوں تک کے مسح کو ضروری قرار دیتے ہیں۔

امام بخاریؒ اصحاب ظواہر اور حنابلہ کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں، اس لیے امام بخاریؒ نے ذیل میں جو روایات جمع کی ہیں، ان کی جواب دہی کی ذمہ داری بھی تنہا حنفیہ پر نہیں ہے، بلکہ شوافع اور موالک اور دیگر ان تمام حضرات پر ہے، جو اس مسئلہ میں ان کے ساتھ ہیں۔

مقصد ترجمہ کے سلسلے میں کہا جاسکتا ہے کہ امام بخاری نے "اَلتَّیَمُّمُ لِلْوَجْهِ وَالْکَفَّیْنِ" کے عنوان سے اصحاب ظواہر اور حنابلہ کی تائید مراد نہیں لی، بلکہ اس عنوان کا مقصد یہ ہے کہ دیکھو تیمّم خلیفہ ہے وضو کا، اس لیے قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ جن جن اعضاء سے وضوء کا تعلق ہے ان ہی اعضاء سے تیمّم کا تعلق ہو، لیکن ایسا نہیں ہے، تیمّم کا تعلق صرف چہرے اور ہاتھوں سے ہے، سر اور پیروں سے نہیں، اس مقصد کے اعتبار سے امام بخاریؒ بھی جمہور کے ساتھ آجاتے ہیں، حنابلہ اور اصحاب ظواہر کے ساتھ نہیں رہتے۔

**روایات باب** روایت وہی ہے جو باب سابق میں مختصراً گزر چکی ہے، روایت یہاں بھی مختصر ہی ہے، لیکن یہاں اس کو امام بخاریؒ نے چھ طریق سے ذکر کیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں امام احمدؒ یا امام

بخاریؒ کے پاس بس یہی ایک روایت ہے جو اضطراب کی وجہ سے محل نظر سمجھی گئی ہے، امام بخاری چونکہ اس مسئلہ میں امام احمدؒ کی زبردست حمایت کررہے ہیں، اس لیے امام بخاریؒ اس روایت کو متعدد طرق سے ذکر کر کے تقویت دینا چاہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود روایت چند در چند وجوہ سے محل نظر ہے، جیسا کہ آئندہ ذکر کیا جائے گا۔

## امام بخاریؒ کا استدلال

حضرت عبدالرحمٰن بن ابزی کی وہی روایت ہے، شعبہ راوی نے اس کی تصویر اس طرح پیش کی کہ زمین پر ہاتھ مار کر پھونک سے زائد مٹی کو اڑادیا اور پھر چہرے اور ہاتھوں پر مسح کرلیا، پھر متعدد طرق سے وہی روایت امام بخاری نے ذکر کی ہے، اس میں ایک روایت کے الفاظ ہیں "یَکْفِیْكَ الوجهُ والکَفَّیْنِ"[1] چہرے اور کفین کا مسح کافی ہے، اس روایت سے امام بخاریؒ نے امام احمد اور اصحاب ظواہر کے مسلک کی تائید کی ہے، بخاری کا طریق استدلال یہ ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے قولاً فرمایا ہے کہ صرف چہرے اور ہاتھوں کا مسح کافی ہے، یہ روایت قولی ہے، اس میں دوسرا احتمال نہیں نکالا جاسکتا، اگر تیمّم میں مرفقین کا مسح بھی مطلوب ہوتا تو اس کی بھی تصریح ہونی چاہئے تھی، تو ظاہر الفاظ پر نظر کرتے ہوئے یہ استدلال بڑا قوی معلوم ہوتا ہے۔

## روایت قولی راوی کا تصرف ہے

لیکن یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ یہ روایت جس کو ہم قولی سمجھ رہے ہیں یقیناً راوی کا تصرف ہے، رواۃ کے تصرفات بھی عجیب ہوتے ہیں، اس سے قبل جو یہ روایت گزری اور ابوداؤد اور دوسرے محدثین کے طرق سے نقل کی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ جب آپ کے سامنے یہ ذکر کیا گیا کہ زمین پر لوٹ کر تیمّم کیا اور نماز پڑھی، تو آپ نے فرمایا: "اِنَّمَا یَکْفِیْكَ هٰکَذا فَضَرَبَ النَّبِیُّ صلی اللہ علیہ وسلم بِکَفَّیْهِ الْاَرْضَ فَنَفَخَ فِیْهِمَا ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهٗ وَ کَفَّیْهِ" راوی کے اس بیان میں روایت کے دو جز ہیں: ایک جزو قولی ہے: "اِنَّمَا کَانَ یَکْفِیْكَ هٰکَذَا" پھر اس پر عمل کر کے دکھلایا گیا ہے کہ دیکھو بس اس قدر کافی ہے، تمعّک یعنی خاک میں لوٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ ایک غلطی پر تنبیہ مقصود ہے کہ تم نے تیمّم جنابت کو غسل جنابت پر قیاس کیا اور اس طرح تمہیں زمین پر لوٹنے کی ضرورت محسوس ہوئی، تمہارا یہ قیاس درست نہ تھا، بلکہ وہی تیمم جو حدث اصغر کے لیے کیا جاتا ہے، جنابت کے لیے بھی کافی ہے، گویا یہ کوئی نئی تعلیم نہیں ہے، بلکہ سابق تعلیم پر اشارۃً ان کو متوجہ کیا جارہا ہے کہ غسل اور حدث کے تیمم میں کوئی فرق نہیں ہے اور اس کے لیے آپ نے ہاتھ مار کر چہرے اور ہاتھوں پر مسح کر کے دکھادیا۔

---

[1] یہاں یکفیك الوجه والکفین، کفین کے نصب کے ساتھ آیا ہے، یہ روایت ابوذر اور کریمہ کی ہے، اصیلی کی روایت میں یکفیك الوجه والکفان رفع کے ساتھ ہے اور یہ رفع فاعلیت کی بنا پر بالکل ظاہر ہے، البتہ ابوذر اور کریمہ کی روایت میں جو نصب کے ساتھ ہے، اس سلسلہ میں شراح نے متعدد وجوہ ذکر کی ہیں، سب سے اچھی اور درست بات یہ ہے، والکفین میں واؤ بمعنی مع ہے اور الکفین مفعول معہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔۱۲ (افادات شیخ)

تمام روایات مختلف کتابوں میں اسی طرح ہیں کہ جزوقولی اور جزوفعلی کو الگ الگ بیان کیا گیا ہے، بعض راویوں نے اس جزوفعلی کو بھی قول کی شکل دے دی ''فَقَالَ يَكْفِيكَ الْوَجْهُ وَالْكَفَّيْنِ'' کہ سرکار رسالت مآب ﷺ نے فرمایا کہ بس چہرے اور کفین کا مسح کافی ہے، اب معنی ہی دوسرے ہوگئے اور وہ فعلی روایت جو متعدد وجوہ سے محل نظر تھی، اب قولی ہوگئی اور اس میں بہ ظاہر کوئی احتمال نہ رہا۔

لیکن یہ راوی کا تصرف ہے اور رواۃ کے تصرفات معلوم کرنے کے لیے تمام روایات کو سامنے رکھنا پڑتا ہے، تاکہ حقیقت حال پورے طور پر منکشف ہوجائے اور وجہ اشتباہ بھی کھلم کھلا سامنے آجائے، راوی کے تصرف کے بعد امام احمدؒ اور امام بخاریؒ نے استدلال فرمالیا، تو وہ استدلال ہمارے نزدیک ناکافی ہے اور از روئے دلائل وہی مسلک مضبوط ہے جس کی طرف دیگر ائمہ ثلاثہ گئے ہیں۔ علامہ سندیؒ نے بھی اس روایت سے استدلال کے جواب میں بڑی اچھی بات کہی ہے۔

## علامہ سندھیؒ کا ارشاد

علامہ سندھیؒ نے فرمایا کہ اس حدیث سے مصنف نے یہاں تو یہ استدلال کیا ہے کہ تیمم میں کہنیوں تک مسح کی ضرورت نہیں اور آگے اسی حدیث سے مصنف یہ استدلال کریں گے کہ تیمّم میں صرف ایک ضرب کافی ہے، دوسری ضرب واجب نہیں ہے، لیکن یہ جواب دیا جاسکتا ہے کہ جس حدیث سے آپ یہ استدلال کررہے ہیں، اس کا مقصد ضربات کی گنتی یا تیمّم میں ہاتھ کے مسح کی حد بیان کرنا نہیں ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ حضرت عمار کے قیاس کی تردید کردی جائے، کیوں کہ حضرت عمارؓ نے تیمّم جنابت کو غسل جنابت پر قیاس کر کے پورے بدن کا مسح فرمایا تھا۔ رہی یہ بات کہ تیمّم میں ضربات کتنی ہوں گی اور ہاتھ کا مسح کہاں تک کیا جائے گا؟ تو سندی فرماتے ہیں کہ یہ چیز خارجی دلائل پر موقوف ہے، پھر علامہ سندی فرماتے ہیں کہ اس روایت میں ''انما کان یکفیك'' بصیغۂ قصر آیا ہے کہ تمھیں صرف یہ کافی تھا اور قصر کے مفہوم کی تعیین مخاطب کے زعم کے مطابق کی جاتی ہے، اس لیے روایت کے معنی مخاطب کے زعم کے مطابق یہ ہوں گے کہ تمھیں مٹی کا استعمال صرف دو عضو میں کافی تھا، ایک چہرے پر اور دوسرے ہاتھوں پر، پورے بدن پر مٹی استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب رہی یہ بات کہ ہاتھوں کا مسح کہاں تک ہوگا اور تیمّم میں کتنی ضربیں ہوں گی؟ تو یہ تمام بحثیں دیگر دلائل سے طے ہوں گی، چنانچہ ایک صحیح روایت میں ہے: ''التیمم ضربة للوجه وضربة للذراعین الی المرفقین'' علامہ سندی کہتے ہیں کہ اس روایت کا مقصد ہی تیمّم میں ضربات کی تعداد اور ہاتھوں کے مسح کی تحدید ہے اور اس روایت کی حفاظ حدیث کی طرف سے بھی تصحیح کردی گئی ہے، اس لیے اس دوسری حدیث کو ضربات کی تعداد اور ہاتھوں کے مسح کی تحدید کے سلسلے میں مقدم سمجھا جائے گا، نہ کہ روایت باب کو جس کا مقصد ضربات کی تعداد اور مسح کی مقدار کی تحدید نہیں ہے، صرف حضرت عمارؓ کے قیاس کی تردید ہے۔ واللہ اعلم

## [٦] بَابٌ الصَّعِيْدُ الطَّيِّبُ وَضُوْءُ الْمُسْلِمِ يَكْفِيْهِ عَنِ الْمَاءِ

وَقَالَ الْحَسَنُ يُجْزِئُهُ التَيمُّمُ مَالَمْ يُحْدِثْ. وَاَمَّ ابْنِ عَبَّاسٍ وَهُوَ مُتَيَمِّمٌ. وَقَالَ يَحْيٰى بْنُ سَعِيْدٍ لَابَاسَ بِالصَّلٰوةِ عَلَى السَّبْخَةِ وَالتَّيَمُّمِ بِهَا.

(۳۴۴) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى بْنُ سَعِيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَوْفٌ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ رَجَاءٍ عَنْ عِمْرَانَ بْنِ حُصَيْنٍ قَالَ كُنَّا فِيْ سَفَرٍ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ وَاِنَّا اَسْرَيْنَا حَتّٰى كُنَّا فِيْ اٰخِرِ اللَّيْلِ وَقَعْنَا وَقْعَةً وَلَا وَقْعَةَ اَحْلٰى عِنْدَ الْمُسَافِرِ مِنْهَا فَمَا اَيْقَظَنَا اِلَّا حَرُّ الشَّمْسِ وَكَانَ اَوَّلُ مَنِ اسْتَيْقَظَ فُلَانٌ ثُمَّ فُلَانٌ ثُمَّ فُلَانٌ يُسَمِّيْهِمْ اَبُوْ رَجَاءٍ فَنَسِيَ عَوْفٌ ثُمَّ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ الرَّابِعُ وَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ اِذَا نَامَ لَمْ نُوْقِظْهُ حَتّٰى يَكُوْنَ هُوَ يَسْتَيْقِظُ لِاَنَّا لَانَدْرِيْ مَايَحْدُثُ لَهُ فِيْ نَوْمِهِ فَلَمَّا اسْتَيْقَظَ عُمَرُ وَرَاٰى مَااَصَابَ النَّاسَ وَكَانَ رَجُلًا جَلِيْدًا فَكَبَّرَ وَرَفَعَ صَوْتَهُ بِالتَّكْبِيْرِ فَمَا زَالَ يُكَبِّرُ وَيَرْفَعُ صَوْتَهُ بِالتَّكْبِيْرِ حَتّٰى اسْتَيْقَظَ بِصَوْتِهِ النَّبِيُّ ﷺ فَلَمَّا اسْتَيْقَظَ شَكَوْا اِلَيْهِ الَّذِيْ اَصَابَهُمْ فَقَالَ لَاضَيْرَ اَوْلَا يَضِيْرُ ارْتَحِلُوْا فَارْتَحَلُوْا فَسَارَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ثُمَّ نَزَلَ فَدَعَا بِالْوَضُوْءِ فَتَوَضَّأَ وَنُوْدِيَ بِالصَّلٰوةِ فَصَلّٰى بِالنَّاسِ فَلَمَّا انْفَتَلَ مِنْ صَلٰوتِهِ اِذَا هُوَ بِرَجُلٍ مُعْتَزِلٍ لَمْ يُصَلِّ مَعَ الْقَوْمِ قَالَ مَامَنَعَكَ يَافُلَانُ اَنْ تُصَلِّيَ مَعَ الْقَوْمِ؟ فَقَالَ اَصَابَتْنِيْ جَنَابَةٌ وَلَا مَآءَ، قَالَ عَلَيْكَ بِالصَّعِيْدِ فَاِنَّهُ يَكْفِيْكَ ثُمَّ سَارَ النَّبِيُّ ﷺ فَاشْتَكٰى اِلَيْهِ النَّاسُ مِنَ الْعَطَشِ فَنَزَلَ فَدَعَا فُلَانًا كَانَ يُسَمِّيْهِ اَبُوْ رَجَاءٍ نَسِيَهُ عَوْفٌ وَدَعَا عَلِيًّا فَقَالَ فَابْتَغِيَا الْمَآءَ فَانْطَلَقَا فَتَلَقَّيَا امْرَاَةً بَيْنَ مَزَادَتَيْنِ اَوْ سَطِيْحَتَيْنِ مِنْ مَآءٍ عَلٰى بَعِيْرٍ لَّهَا فَقَالَا لَهَا اَيْنَ الْمَآءُ؟ قَالَتْ عَهْدِيْ بِالْمَآءِ اَمْسِ هٰذِهِ السَّاعَةَ وَنَفَرُنَا خُلُوْفًا، قَالَا لَهَا انْطَلِقِيْ اِذًا، قَالَتْ اِلٰى اَيْنَ؟ قَالَ اِلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ، قَالَتِ الَّذِيْ يُقَالُ لَهُ الصَّابِيُّ، قَالَا هُوَ الَّذِيْ تَعْنِيْنَ فَانْطَلِقِيْ فَجَاءَا بِهَا اِلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَحَدَّثَاهُ الْحَدِيْثَ قَالَ فَاسْتَنْزَلُوْهَا عَنْ بَعِيْرِهَا وَدَعَا النَّبِيُّ ﷺ بِاِنَاءٍ فَاَفْرَغَ فِيْهِ مِنْ اَفْوَاهِ الْمَزَادَتَيْنِ اَوِ السَّطِيْحَتَيْنِ وَاَوْكَاَ اَفْوَاهَهُمَا وَاَطْلَقَ الْعَزَالِيَ وَنُوْدِيَ فِي النَّاسِ اِسْقُوْا وَاسْتَقُوْا، فَسَقٰى مَنْ شَآءَ وَاسْتَقٰى مَنْ شَآءَ وَكَانَ اٰخِرُ ذٰلِكَ اَنْ اُعْطِيَ الَّذِيْ اَصَابَتْهُ الْجَنَابَةُ اِنَاءً مِنْ مَّاءٍ قَالَ اذْهَبْ فَاَفْرِغْهُ عَلَيْكَ وَهِيَ قَائِمَةٌ تَنْظُرُ اِلٰى مَايُفْعَلُ بِمَاءِهَا وَاَيْمُ اللهِ لَقَدْ اُقْلِعَ عَنْهَا وَاِنَّهُ لَيُخَيَّلُ اِلَيْنَا اَنَّهَا اَشَدُّ مِلْئَةً مِنْهَا حِيْنَ ابْتَدَأَ فِيْهَا فَقَالَ

النَّبِیُّ ﷺ اِجْمَعُوْا لَهَا فَجَمَعُوْا لَهَا مِنْ بَيْنِ عَجْوَةٍ وَدَقِيْقَةٍ وَّسَوِيْقَةٍ حَتّٰى جَمَعُوْا لَهَا طَعَاماً فَجَعَلُوْهُ فِيْ ثَوْبٍ وَحَمَلُوْهَا عَلٰى بَعِيْرِهَا وَوَضَعُوا الثَّوْبَ بَيْنَ يَدَيْهَا، قَالَ تَعْلَمِيْنَ مَارَزِئْنَا مِنْ مَّائِكِ شَيْئاً وَلٰكِنَّ اللهَ هُوَ الَّذِيْ اَسْقَانَا فَاَتَتْ اَهْلَهَا وَقَدِ احْتَبَسَتْ عَنْهُمْ فَقَالُوْا مَاحَبَسَكِ يَافُلَانَةُ ، قَالَتِ الْعَجَبُ ،لَقِيَنِيْ رَجُلَانِ فَذَهَبَا بِيْ اِلٰى هٰذَاالرَّجُلِ الَّذِيْ يُقَالُ لَهُ الصَّابِئُ ، فَفَعَلَ كَذَا وَكَذَا فَوَاللهِ اِنَّهُ لَاَسْحَرُالنَّاسِ مِنْ بَيْنِ هٰذِهٖ وَهٰذِهٖ وَقَالَتْ بِاِصْبَعَيْهَا الْوُسْطٰى وَالسَّبَّابَةِ فَرَفَعَتْهُمَا اِلَى السَّمَآءِ ،تَعْنِيْ السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ اَوْاِنَّهُ لَرَسُوْلُ اللهِ حَقّاً فَكَانَ الْمُسْلِمُوْنَ بَعْدُ يُغِيْرُوْنَ عَلٰى مَنْ حَوْلَهَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَلَا يُصِيْبُوْنَ الصِّرْمَ الَّذِيْ هِيَ مِنْهُ فَقَالَتْ يَوْماً لِقَوْمِهَا مَااَرٰى اَنَّ هٰؤُلَاءِ الْقَوْمَ قَدْيَدَعُوْنَكُمْ عَمَداً فَهَلْ لَكُمْ فِي الْاِسْلَامِ ؟ فَاَطَاعُوْهَا فَدَخَلُوْافِي الْاِسْلَامِ . قَالَ اَبُوْعَبْدِ اللهِ صَبَا خَرَجَ مِنْ دِيْنٍ اِلٰى غَيْرِهٖ، قَالَ اَبُوالْعَالِيَةِ الصَّابِئِيْنَ فِرْقَةٌ مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ يَقْرَؤُوْنَ الزَّبُوْرَ، اَصْبُ اَمِلْ . (آئندہ:۳۴۸،۳۵۷۱)

**ترجمہ** باب، پاک مٹی مسلمان کے لیے وضو کے پانی کے حکم میں ہے، جو اس کو پانی کے بجائے کافی ہے۔حضرت حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ تیمم اس وقت تک کافی ہے جب تک حدث لاحق نہ ہو۔حضرت ابن عباسؓ نے تیمّم کی حالت میں امامت فرمائی۔ یحیٰ بن سعید فرماتے ہیں کہ شورزمین پرنماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں اوراس سے تیمّم کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ ہم رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ایک سفر میں تھے اور ہم نے رات میں سفر کیا، حتی کہ رات کا آخر ہوگیا تو ہم بے اختیار نیند میں پڑ گئے اور ہارے تھکے مسافر کے نزدیک اس نیند سے زیادہ لذیذ اور مزیدار اور کوئی نیند نہیں ہوتی، چنانچہ ہمیں سورج کی گرمی نے بیدار کیا اور سب سے پہلے جو بیدار ہوا وہ فلاں تھا، پھر فلاں اور پھر فلاں، حضرت ابورجاء نے ان سب کے نام بھی ذکر کئے تھے، لیکن حضرت عوف بھول گئے، پھر چوتھے نمبر پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیدار ہوئے اور طریق یہ تھا کہ جب رسول اکرم ﷺ سوجاتے تو ہم لوگ بیدار نہیں کرتے تھے، تاایں کہ آپ خود ہی بیدار ہوجائیں؛ اس لیے کہ ہم یہ نہیں جانتے کہ نیند میں آپ کو کیا حالت درپیش ہے؟ لیکن جب حضرت عمرؓ بیدار ہوئے اور انھوں نے دیکھا کہ کیا صورت حال لوگوں کے ساتھ پیش آئی ہے؟ اور حضرت عمرؓ نڈر اور بہادر آدمی تھے، تو حضرت عمرؓ نے تکبیر کہنی شروع کی اور برابر بلند آواز سے تکبیر کہتے رہے، یہاں تک کہ ان کی آواز سے نبی اکرم ﷺ بیدار ہوگئے، جب آپ بیدار ہوگئے تو صحابۂ کرامؓ نے آپ کی خدمت میں پیش آمدہ صورت حال کی شکایت کی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ کوئی نقصان نہیں یا کوئی نقصان نہ ہوگا، (راوی کا شک ہے) اور فرمایا کہ

یہاں سے کوچ کرو، چنانچہ سب لوگوں نے کوچ کیا، آپ نے تھوڑی دور چل کر نزول فرمایا، پھر وضو کا پانی طلب فرمایا اور وضو کیا، پھر اذان دی گئی اور آپ نے نماز پڑھائی، جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص الگ بیٹھا ہے اور اس نے لوگوں کے ساتھ نماز ادا نہیں کی، آپ نے فرمایا، اے فلاں! تجھے لوگوں کے ساتھ نماز ادا کرنے سے کیا چیز مانع ہوئی؟ تو اس نے عرض کیا، مجھے جنابت لاحق ہوگئی اور پانی غسل کے لیے نہیں ہے، آپ نے ارشاد فرمایا، تمہیں مٹی سے تیمم کرنا چاہیے تھا کہ وہ طہارت کے لیے کافی ہے، پھر رسول اکرم ﷺ روانہ ہوئے، تو لوگوں نے آپ کی خدمت میں پیاس کی شکایت کی پھر آپ نے نزول فرمایا، اور بلایا کہ اے فلاں! ابو رجاء نے ان کا نام بتلایا تھا، عوفؓ بھول گئے اور دوسرے حضرت علیؓ کو بلایا اور فرمایا، دونوں جاؤ اور پانی تلاش کرو، چنانچہ دونوں گئے، ان حضرات کو ایک عورت ملی جو اپنے اونٹ پر دو پکھالوں یا مشکیزوں میں پانی لا رہی تھی، ان دونوں حضرات نے اس سے سوال کیا، پانی کہاں ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں کل گزشتہ اسی وقت پانی کے پاس تھی اور ہمارے مرد پیچھے ہیں، ان حضرات نے کہا کہ اب تو چل، عورت نے کہا، کہاں؟ ان حضرات نے کہا رسول اکرم ﷺ کے پاس، عورت نے کہا وہی شخص جس کو صابی بھی کہتے ہیں، ان دونوں نے جواب دیا، ہاں وہی جو تیری مراد ہے وہیں چل، چنانچہ یہ دونوں حضرات اس عورت کو رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں لے آئے اور آپ کو قصہ کی اطلاع دی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اس کو اونٹ سے اتارو، پھر نبی اکرم ﷺ نے برتن طلب فرمایا اور اس میں دونوں مشکوں کے منہ سے کچھ پانی لیا اور پھر ان کا دہانہ بند کر دیا اور ان مشکوں کا نیچے کا تنگ منہ کھول دیا اور لوگوں میں اعلان کر دیا گیا کہ وہ پانی پی لیں اور پلا دیں، چنانچہ جس کا جی چاہا اس نے پانی پیا اور پلایا، سب سے آخر میں یہ ہوا کہ جس شخص کو جنابت لاحق ہوئی تھی اس کو بھی ایک برتن پانی آپ نے عطا فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ اس کو اپنے اوپر ڈال لو اور وہ عورت کھڑی ہوئی دیکھتی رہی کہ اس کے پانی کا کیا کیا جا رہا ہے، راوی کا بیان ہے کہ قسم بخدا، اس کے بعد جو پانی باقی رہا، اس کے بارے میں ہم لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس وقت سے زیادہ بھرا ہوا ہے، جس وقت کہ ہم نے پانی لینے کی ابتداء کی تھی، پھر نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس کے لیے کچھ جمع کرو، چنانچہ صحابہ کرام نے اس کے لیے کھانے کا سامان، چھوارے، آٹا اور ستو جمع کیا اور اس سامان کو ایک کپڑے میں باندھ دیا، اس عورت کو اونٹ پر بٹھا دیا اور کپڑا اس کے آگے رکھ دیا، آپ نے اس عورت سے فرمایا تو جانتی ہے کہ ہم نے تیرے پانی میں سے کچھ کم نہیں کیا ہے، لیکن صرف اللہ تعالی ہی نے ہمیں پانی دیا ہے، پھر وہ عورت اپنے گھر پہنچی اور اس کو تاخیر ہوگئی تھی، تو اس سے پوچھا گیا کہ اے فلانی! تجھے کس لیے تاخیر ہوئی؟ اس نے کہا کہ مجھے عجیب چیز نے روک لیا تھا، مجھے دو مرد ملے اور وہ مجھے اس شخص کے پاس لے گئے جس کو صابی کہا جاتا ہے اور اس نے ایسا اور ایسا کیا، پس قسم ہے اللہ کی کہ وہ شخص اس کے اور اس کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے اور وہ ''اس'' کے ساتھ اپنی شہادت کی اور بیچ کی انگلی کے ذریعہ آسمان اور زمین کی طرف اشارہ کر رہی تھی، یا پھر بلاشبہ وہ شخص اللہ کا سچا رسول ہے، پھر یہ ہوتا رہا کہ

مسلمان اس عورت کے قبیلہ کے اردگرد کے مشرکین پر غارت گری کرتے تھے اور اس جماعت کو کوئی نقصان نہ پہنچاتے تھے جو اس عورت کے اہل خاندان پر مشتمل تھی، تو اس عورت نے ایک دن اپنی قوم سے کہا کہ میں یہ سمجھتی ہوں کہ یہ مسلمان قوم تم کو اپنی غارت گری سے جان بوجھ کر از خود چھوڑ رہی ہے، کیا تمہارے اندر اسلام کی کوئی رغبت ہے؟ ان لوگوں نے اس عورت کی بات مانی اور اسلام میں داخل ہو گئے۔ ابوعبداللہ بخاری کہتے ہیں کہ "صبأ" کے معنی ہیں ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونا، ابوالعالیہ نے کہا کہ "صابئین" اہل کتاب کا ایک فرقہ ہے، جو زبور کی تلاوت کرتا ہے۔ "اَصْبُ" کے معنی یہ ہیں کہ میں مائل ہو جاؤں گا۔

**مقصد ترجمہ** امام بخاریؒ اس ترجمہ کے تحت دو اختلافی مسئلہ بیان کر رہے ہیں اور اتفاق سے ان دونوں مسئلوں میں انھوں نے امام ابوحنیفہؒ کی موافقت کی ہے، ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ تیمم طہارت مطلقہ اصلیہ ہے یا طہارت ضروریہ ہے؟ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ تیمّم مطلقاً وجہِ ارض سے درست ہے یا اس میں ارض منبت اور غیر منبت کا فرق ہے؟

شوافع، موالک اور حنابلہ کے نزدیک تیمم طہارت ضروریہ ہے، یعنی تیمم کے ذریعہ پاکی حاصل کرنا مجبوری کے درجہ کی چیز ہے، یہ رافع حدث نہیں، صرف استباحت صلوۃ کا کام دے سکتا ہے۔ اور قاعدہ ہے "الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ" جتنی ضرورت ہو اتنی دیر اور اتنے وقت تیمّم سے کام لے سکتے ہیں، لہذا پانی نہ ملنے یا پانی پر استعمال کی قدرت نہ ہونے کی صورت میں تیمّم کی اجازت تو ہوگی لیکن ضرورت کے بعد یہ طہارت ختم ہو جائے گی اور ایک تیمم سے اندرون وقت صرف وقتی فریضہ ہی ادا کیا جا سکتا ہے، کسی دوسرے فریضہ کی قضا بھی نہیں کر سکتے، اس کے لیے دوسرا تیمم ضروری ہوگا، البتہ نوافل چونکہ فرائض کے تابع ہیں، لہذا وہ بہ تبعیتِ فرائض اندورن وقت ادا ہو سکیں گے، اس میں بھی مالکیہ نے صرف فریضہ کے بعد کی سنتوں کی اجازت دی ہے، فریضہ سے پہلے کی سنتوں کی اجازت نہیں دی۔ اسی طرح جب وقت ختم ہو جائے گا، خواہ حدث ہو یا نہ ہو، اب دوسرے وقت کے لیے دوسرے تیمّم کی ضرورت ہوگی۔

امام بخاریؒ اس رائے سے متفق نہیں، وہ کہتے ہیں "الصعید الطیب وضوء المسلم یکفیہ عن الماء" پاک مٹی مومن کے حق میں وضوء کی جگہ ہے، جو پانی سے اگر وہ میسر نہ ہو بے نیاز کر دیتی ہے، ترجمہ کے یہ الفاظ ایک حدیث کے الفاظ ہیں، یہ روایت حضرت ابوذر کی ہے اور ترمذی، ابن حبان اور دارقطنی نے اس کی تصحیح کی ہے، الفاظ یہ ہیں "الصَّعید الطیب طَهورُ المسلم وان لم یجد الماء عشر سنین" پاک مٹی مومن کے لیے پاکی حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، اگرچہ اس کو دس سال تک پانی نہ ملے۔ امام بخاریؒ نے اپنے مدعا کے لئے جو حدیث ذیل میں پیش کی ہے، اس میں ہے "علیك بالصعید فانه یکفیك" یعنی اگر پانی نہیں ہے، تو مٹی سے تیمم کر لیا جائے کہ یہ پانی کا بدل ہے اور پانی ہی کا کام دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ شریعت نے نماز کے لیے طہارت کو ضروری قرار دیا ہے۔

اور یہ طہارت دو الگ الگ صورتوں میں دو طرح حاصل کی جاسکتی ہے، اگر پانی میسر ہے اور اس کے استعمال پر قدرت بھی ہے تو پانی کے ذریعہ طہارت حاصل کی جائے اور اگر پانی نہ ہو یا استعمال پر قدرت نہ ہو تو مٹی اس کا بدل ہے، گویا طہارت کے حصول میں پانی اصل ہے اور مٹی اس کا بدل یا خلیفہ ہے اور اصل کے نہ ملنے کی صورت میں خلیفہ سے تمام وہ کام لیے جائیں گے جو اصل سے لئے جاتے ہیں اور شریعت نے ان دونوں کو ایک ہی درجہ دیا ہے، اس لیے پانی نہ ملنے کی صورت میں قبل از وقت تیمّم کی بھی اجازت ہوگی، تیمّم وقت کے ختم ہونے سے ختم نہیں ہوگا اور جس طرح ایک وضو سے ہر قسم کی نمازیں فرائض، فوائت، نوافل اور نماز جنازہ ادا کئے جاسکتے ہیں، اسی طرح ایک تیمّم سے بھی سب کام لئے جاسکیں گے، فرق صرف اتنا ہوگا کہ نواقض تیمّم میں ایک چیز نواقض وضو سے زائد ہے اور وہ ہے پانی کا ملنا کہ پانی دیکھتے ہی تیمّم ختم ہو جائے گا، ''آب آمد تیمّم برخاست'' خواہ یہ دیکھنا اثناء صلوۃ میں ہو، البتہ شوافع اور دیگر حضرات اثناء صلوۃ میں رؤیت ماء کو ناقض تیمّم نہیں قرار دیتے۔

**قال الحسن الخ** حسن بصری کا قول نقل فرمایا ہے کہ جب تک حدث لاحق نہ ہو تیمّم کافی ہوگا، دوسری کتابوں میں حسن بصری کا قول ان الفاظ میں منقول ہوا ہے: ''**تصلی الصلوات کلها بتیمم واحد مثل الوضوء مالم یحدث**'' یعنی جب تک حدث لاحق نہ ہو تمام نمازیں ایک ہی تیمّم سے وضوء کی طرح ادا کی جاسکتی ہیں، مناسبت اس قول کی ظاہر ہے کہ حسن بصری خروج وقت کو نواقض تیمّم میں شمار نہیں کرتے۔

**امَّ ابن عباسٍ الخ** حافظ ابن حجر کو بھی یہاں یہ کہنا پڑ گیا کہ امام بخاری نے اس مسئلہ میں کوفیین کی موافقت کی ہے، کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے تیمّم کی حالت میں ان لوگوں کی امامت فرمائی جو باوضو تھے، معلوم ہوا کہ ابن عباس وضو اور تیمّم کی طہارت میں فرق نہیں کرتے تھے، ورنہ اگر وہ یا ان کے مقتدی جن میں حضرت عمار بن یاسر بھی تھے، تیمّم کو طہارت ضعیفہ مانتے تو ضعیف طہارت سے قوی طہارت والوں کی امامت نہ فرماتے، تعجب تو ان دیگر حضرات ائمہ پر ہے کہ وہ تیمّم کو طہارت ضرور یہ قرار دیتے ہوئے بھی ''**صلوۃ المتوضّی خلف المتیمم**'' کو جائز فرماتے ہیں، البتہ امام مالک نے اس کو مکروہ فرمایا ہے اور امام محمد کی طرف عدم جواز کا قول منسوب ہوا ہے، مگر ان سے تو اس مسئلہ میں ''لاینبغی'' کے الفاظ منقول ہوئے ہیں جو اصل جواز کے منافی نہیں۔

**قَالَ یحْیٰی بْنُ سَعِیْدٍ الخ** یحیٰ بن سعید انصاری کے قول سے ایک دوسرے اختلافی مسئلہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ مطلق جنس ارض سے تیمّم جائز ہے، حضرات شوافع اس میں تراب منبت اور غیر منبت کا فرق کرتے ہیں، امام بخاریؒ اس فرق کو قبول نہیں کرتے، کہتے ہیں کہ زمین شور پر بھی تیمّم کی اجازت ہے، احناف کے یہاں بھی یہی مسئلہ ہے۔

**تشریح حدیث** حضرت عمران بن حصینؓ راوی ہیں کہ ہم نے رسول اکرم ﷺ کی معیت میں سفر کیا، خیبر سے واپسی پر یہ واقعہ پیش آیا، رات بھر چلتے رہے، جب چلتے چلتے چور ہو گئے تو رات کے آخر میں رسول اکرم

ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، آپ نے فرمایا بھی کہ ذکھورات کا آخری وقت ہے، کہیں نیند غالب آ کر نماز کو فوت نہ کر دے، لیکن ساتھیوں کی مجبوری پر نظر فرماتے ہوئے ان کی استدعا قبول فرمالی، جماعت میں سے ایک صاحب نے یہ ذمہ لیا کہ وہ وقت پر بیدار کر دیں گے، اتفاق یہ پیش آیا کہ جن صحابی کو جاگتے رہنے کے لئے مقرر کیا تھا، ان کو بھی نیند آ گئی اور طلوع آفتاب سے پہلے ان کی بھی آنکھ نہ کھل سکی، تین آدمی یکے بعد دیگرے بیدار ہوئے، چوتھے نمبر پر حضرت عمر بیدار ہوئے، ضرورت تھی کہ اس وقت سرکار رسالت مآب ﷺ کو جگایا جائے، لیکن راوی کہتے ہیں کہ ہم لوگ سرکار دوعالم ﷺ کو خواب سے بیدار نہیں کرتے تھے، اس لیے کہ ہم یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ خواب میں آپ پر کیا حالت طاری ہے؟ لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہادر اور نڈر آدمی تھے، انھوں نے ادب نبوی کی رعایت فرماتے ہوئے سرکار رسالت مآب ﷺ کو بیدار کرنے کا یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ بلند آواز سے تکبیر کہنی شروع کی اور بار بار بلند آواز سے تکبیر کہتے رہے، تا ایں کہ حضور اکرم ﷺ کی آنکھ کھل گئی[1]، آپ کے بیدار ہونے کے بعد آپ کی خدمت میں اس واقعہ سے اپنی سخت بے چینی کا اظہار کیا، آپ نے ارشاد فرمایا "لا ضیر" یعنی گھبرانے کی بات نہیں، ایسا ہونا بعض شرعی مصالح کی بناء پر ضروری تھا، پھر تم نے بالاختیار ایسا نہیں کیا ہے، اس لیے اس پر کوئی مواخذہ بھی نہیں "ارتحلوا" یہاں سے چلے چلو، نیند کا اثر دور کرنے کے لیے نقل وحرکت اور جگہ کی تبدیلی موثر ہے، اس لیے ارشاد فرمایا کہ آگے بڑھو۔

شوافع کا نظریہ یہ ہے کہ ارتحال کا حکم مکان کے نقصان سے بچانے کے لیے ہوا تھا، کیوں کہ ان کے نزدیک تو اوقات مکروہہ نائم اور ناسی کے حق میں مکروہ نہیں ہیں، احناف کے نزدیک یہ حکم اس بنا پر تھا کہ وہ وقت شیطان کی عبادت کا ہے، ازروئے احادیث بھی یہی راجح نظر آتا ہے کہ وقتِ مکروہ باقی ہو اور اس خیال سے کہ چلنا تو ہے ہی، اس لیے یہیں بیٹھ کر کیوں انتظار کریں؟ آپ کے حکم کے مطابق صحابہ کرامؓ اس جگہ سے چلے، تھوڑی دور چلنے کے بعد جب وہ وقت مکروہ

---

[1] اس روایت میں یہ آیا کہ آپ کی فجر بھی نیند کے سبب قضا ہوگئی، جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "ان عینی تناماں ولا ینام قلبی" میری آنکھیں سو جاتی ہیں، قلب نہیں سوتا، بظاہر ان دونوں باتوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے، علماء امت نے ان دونوں روایت کے درمیان تطبیق اور جمع کی صورتوں کے بارے میں تفصیلی کلام کیا ہے، نووی کہتے ہیں کہ اس کے دو جواب ہیں، ایک تو یہ کہ قلب ان محسوسات کا ادراک کرتا ہے، جو اس سے براہ راست متعلق ہیں، جیسے حدث یا تکلیف وغیرہ، لیکن جو محسوسات آنکھ یا کسی اور چیز سے متعلق ہیں ان کا ادراک قلب نہیں کرتا، اور یہاں طلوع سحر کے ادراک کا تعلق قلب سے نہیں، آنکھ سے ہے۔ اس لیے یہ اشکال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ قلب کی بیداری کے ساتھ یہ صورت کیسے پیش آ گئی، دوسرا جواب یہ ہے کہ قلب کی دو حالتیں ہیں، ایک بیداری جو عام طور پر رہتی تھی، دوسرے نیند جو شاذ و نادر پیش آ گئی، اتفاق سے یہ واقعہ قلب کی نیند کی حالت میں پیش آ گیا، لیکن پھر نووی خود ہی کہتے ہیں کہ پہلا جواب قابل اعتماد اور دوسرا ضعیف ہے، ابن منیر نے کہا کہ آپ کو کبھی کبھی بیداری کی حالت میں تشریع اور احکام قضا کے بیان کی مصلحت سے سہو ہوتا تھا جیسا کہ نماز کا واقعہ ہے، پھر جب بیداری میں سہو کی صورت پیش آ سکتی ہے تو نیند کی حالت میں ایسا ہونا کیا جائے تعجب ہے، گویا یہ واقعہ یہ نہیں بتلاتا کہ آپ کا قلب مبارک اس وقت بیدار نہ تھا، قلب بیدار تھا لیکن تشریع کی مصلحت سے سہو ہو گیا، میں کہتا ہوں کہ تشریع کی مصلحت سے عمر میں ایسا واقعہ پیش آنا ضروری تھا۔ (فخر الدین)

ختم ہوگیا، آپ نے نزول فرمایا، چنانچہ بعض طرق حدیث میں "حتى ابيضت الشمس" اور بعض میں "ارتفعت الشمس" کی صراحت موجود ہے، نزول فرمانے کے بعد آپ نے وضو کا پانی منگایا، وضو کیا، پھر اذان دی گئی، معلوم ہوا کہ "فائتہ" کے لیے اذان ہے، ابوداؤد میں ہے کہ اس کے بعد سنتیں ادا کیں، پھر جماعت ہوئی اور بعض روایات میں قراءت کے جہری ہونے کی بھی تصریح ہے۔

نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ایک شخص لوگوں سے الگ بیٹھا ہوا ہے، پوچھا تم نے سب کے ساتھ جماعت میں شرکت کیوں نہیں کی؟ انھوں نے عرض کیا کہ حضور جنابت لاحق ہوگئی اور نہانے کے لیے پانی میسر نہیں ہے، آپ نے فرمایا کہ اس صورت میں تم پر مٹی کا استعمال ضروری ہے، وہ تمہارے لیے کافی ہوگی، اس جواب سے اندازہ یہ ہوتا ہے کہ آیت تیمّم بھی آگئی تھی اور ان صحابی کو تیمّم کا طریقہ بھی معلوم تھا، لیکن ان کو یہ معلوم نہ تھا کہ تیمّم جنابت کے لیے بھی کافی ہوسکتا ہے، اس کے بعد پھر آپ روانہ ہوئے تو حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین نے آپ کی خدمت میں پیاس کی شکایت کی، آپ نے پھر سفر موقوف کیا اور دو شخصوں کو جن میں ایک حضرت علیؓ تھے بلاکر پانی تلاش کرنے کا حکم فرمایا، یہ دونوں حضرات پانی کی تلاش میں روانہ ہوئے، اتفاق سے ایک عورت جو اونٹ پر پانی کی مشکیں لادے ہوئے چلی آرہی تھی سامنے نظر آئی، ان دونوں حضرات نے اس عورت سے معلوم کیا، پانی یہاں سے کتنی دور ہے؟ اس نے جواب دیا کہ کل میں اس وقت پانی کے پاس تھی، یعنی پانی یہاں سے ایک دن کی مسافت پر ہے، یہ سن کر ان حضرات نے اس عورت سے کہا چل! اس نے دریافت کیا کہاں؟ ان حضرات نے کہا، رسول اکرم ﷺ کے پاس، عورت نے کہا وہی جن کو صابی کہا جاتا ہے، یعنی ایک دین کو چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرنے والا۔

اب اگر یہ حضرات اس عورت کی تردید کرتے ہیں تو مقصد فوت ہوتا ہے کہ وہ نہیں بلا رہے ہیں اور اگر ہاں کہتے ہیں تو شان رسالت میں بے ادبی کے مرتکب ہوتے ہیں، اس لیے شان رسالت کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے جواب دیتے ہیں کہ ہاں وہی جو تمہاری مراد ہے، انھوں نے عورت کو جانے کے لیے اس لیے کہا تاکہ آپ کی خدمت میں یہ بات پہنچادیں کہ اس عورت کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پانی یہاں سے بہت دور ہے، چنانچہ اس عورت کو لے گئے اور واقعہ بیان کردیا۔

آپ نے حکم دیا کہ اس کو اونٹ سے اتارو، پھر آپ نے ایک برتن منگایا اور مشکوں کا بالائی دہانہ کھلوا کر اس میں سے کچھ پانی لیا اور اس میں لعاب دہن شامل فرما کر ان کا وہ منھ بند کردیا گیا اور مشکوں کے نیچے کا منھ کھلوا کر یہ اعلان کردیا گیا کہ پانی پئیں اور پلائیں، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی پیا بھی گیا اور مویشیوں کو بھی پلایا گیا اور مشکیں بھی بھرلی گئیں کہ ساتھ لے چلیں گے، اس کے بعد آپ نے اس شخص کو پانی دیا جس کو جنابت لاحق ہوگئی تھی اور فرمایا کہ جاؤ یہ پانی اپنے اوپر بہالو، اس سے یہ معلوم ہوا کہ پینے کا معاملہ وضو اور غسل پر مقدم ہے، اگر یہ خیال ہو کہ پانی سے وضو

کرلیا تو پینے کے لیے پانی نہیں بچے گا، تو ایسی صورت میں پانی کے ہوتے ہوئے بھی تیمم کی اجازت ہوگی، پھر اپنا ہی پینا نہیں، بلکہ اپنی ضرورت ہو، یا رفقاء کی ضرورت ہو، یا جانوروں کے لیے پانی روکنا ہو حتی کہ اگر حفاظتی کتا ساتھ میں ہے اور اس کے لیے ضرورت پڑنے والی ہو تب بھی تیمم کی اجازت ہوگی۔

یہ تمام کام ہوتے رہے اور وہ عورت کھڑی رہی اور یہ دیکھتی رہی کہ پانی سے کیا کیا کام لیا جا رہا ہے، اور اس سے زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اتنا کچھ پانی صرف ہوا اور کمی کچھ محسوس نہیں ہوئی، راوی قسم کھا کر بیان کرتے ہیں کہ اتنا پانی صرف ہو گیا لیکن ہم یہ خیال کر رہے تھے کہ اب یہ مشک پہلے سے بھی زیادہ بھری ہوئی ہے۔

اس کے بعد رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اس کے لیے کھانے پینے کی چیزیں جمع کردو، یہ قیمت دی جا رہی ہے، کیوں کہ بیع میں تراضی شرط ہے، اور وہ یہاں ہے نہیں، اسی طرح سے نہ یہ تاوان ہے کہ وہ بالمثل ہوتا ہے، پھر یہ کہ وہ حربیہ غیر معاہدہ ہے، اس کے تاوان کی ضرورت نہیں ہے، پھر یہ کہ اس کے پانی میں کمی بھی نہیں کی ہے، خود پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس سے فرمایا کہ دیکھو ہم نے تمہارے پانی میں سے کچھ کمی نہیں کی ہے، پانی اس مشک میں غیب سے آیا ہے۔

لیکن چونکہ آیا ہے اس کے پانی کے راستے سے، اس لیے یہ اس کا احسان ہو گیا اور "هل جزاء الاحسان الا الاحسان" احسان کا بدلہ احسان ہی سے دیا جا سکتا ہے، اس لیے آپ نے فرمایا کہ اس عورت کے لیے سامان جمع کرو، چنانچہ آٹا، کھجوریں اور ستو وغیرہ اس عورت کے لیے جمع کر دیا گیا، اس سامان کو کپڑے میں باندھ دیا گیا، پھر عورت کو اونٹ پر سوار کر کے یہ کپڑا اس کے سامنے رکھ دیا گیا۔

جب یہ عورت گھر پہنچی تو اہل خانہ نے تاخیر کا سبب دریافت کیا، اس نے پورا واقعہ اس طرح سے دہرایا کہ دو آدمی مجھ سے ملے اور وہ مجھے اس شخص کے پاس لیے گئے جس کو صابی کہا جاتا ہے، اور وہاں پر ایسا واقعہ پیش آیا، پھر اس عورت نے اس واقعہ پر اپنا تبصرہ یہ کیا کہ یا تو یہ شخص زمین اور آسمان کے درمیان سب بڑا جادوگر ہے، یا پھر وہ اللہ کا سچا رسول ہے۔

اس تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عورت بڑی مدبرہ تھی، وہ یہ سمجھ چکی تھی کہ جادو ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا، لیکن اگر وہ اہل قبیلہ کے سامنے اپنے اسلام کا اظہار کرتی ہے تو معاملہ خطرناک ہو سکتا ہے، ممکن ہے کہ گھر والے اس کی بات اور اس کے تاثرات کو سننا بھی پسند نہ کریں بلکہ قتل پر آمادہ ہو جائیں، اس لیے اس نے ایک اچھی راہ اختیار کی اور پورا واقعہ تفصیل سے سنانے کے بعد کہا کہ یا تو یہ شخص زمین و آسمان کے درمیان سب سے بڑا جادوگر ہے، یہ تو ایک عام خیال تھا جو اس نے سامنے رکھ دیا، اب دوسرے نمبر پر کہتی ہے، اَوْ انہ لرسولُ اللہ حقاً یا پھر وہ اللہ کا سچا رسول ہے، اس جملہ میں اس نے اشارہ کر دیا کہ دیکھو جادو ایسا نہیں ہو سکتا۔

اس عورت نے اہل قبیلہ کے دل میں ایک بات ڈال دی، اور خاموش ہو گئی، اب صورت یہ پیش آئی کہ مسلمان رات کو کفار کی بستی پر چھاپے مارتے ہیں، لیکن بستی میں اس ٹکڑی یا منڈیا کو چھوڑ دیتے ہیں جو اس عورت کے اہل

قبیلہ سے متعلق ہے، اس صورت حال کے پیش آتے ہی اس عورت کو دوبارہ اپنی بات کہنے کا موقعہ مل گیا اور اس نے کہا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ مسلمان رات کو چھاپے مارتے ہیں، لوٹتے ہیں، لیکن تمہیں کوئی کچھ نہیں کہتا، کیا یہ لوگ تم سے ڈرتے ہیں، یا ان کو معلوم نہیں کہ یہاں بھی کافر رہتے ہیں، یا یہ بھول جاتے ہیں، ظاہر ہے کہ ان تینوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے، کیوں کہ تمہاری کوئی دھاک نہیں ہے کہ لوگ تم سے ڈریں، بھول جانے یا معلوم نہ ہونے کا خیال بھی غلط ہے اس لیے ظاہر ہے کہ یہ لوگ جان بوجھ کر تم کو چھوڑ دیتے ہیں۔

اور اس چھوڑنے کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ میرے اور ان کے درمیان ایک معاملہ ہو گیا تھا، انھوں نے میرے پانی سے فائدہ اٹھایا تھا، اور یہ لوگ میرا احسان مانتے ہیں، گو انھون نے اس احسان کے بدلہ کھانے کی صوررت میں دے دیا تھا، لیکن اس کے باوجود یہ اسی احسان کا اثر ہے، یہ لوگ قصداً تمہاری ٹکڑی کو چھوڑ دیتے ہیں اور یہ احسان مندی پیغمبرانہ شان معلوم ہوتی ہے۔

اب سوچو! کیا تم اپنے اندر اسلام کے لیے کچھ رغبت پاتے ہو، چنانچہ ان لوگوں نے اس عورت کی بات مان لی، اور اسلام میں داخل ہو گئے، اس طرح عورت نے اپنے اہل قبیلہ کو اسلام کی طرف متوجہ کیا۔

**بخاری کا مدعا** اس پوری روایت میں بخاریؒ کا مدعا صرف سرکار رسالت مآب ﷺ کے ارشاد ''علیك بالصعید فانه یکفیك'' سے متعلق ہے، قولی روایت ہے، آپ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح پانی کے استعمال پر قدرت کے وقت غسل کامل طہارت ہے، اور اس طہارت سے ہر طرح کے فرائض، نوافل وغیرہ، کی ادائیگی درست ہے، اسی طرح اگر پانی نہ ہو تو پانی کی جگہ مٹی کا استعمال ان تمام چیزوں کے لیے کافی ہوگا، فانه یکفیك یعنی مٹی کا استعمال پانی کی جگہ کافی ہے، اور جو کام پانی کی طہارت سے لیا جاتا ہے وہی کام مٹی کی طہارت سے لیا جا سکے گا، بخاری کا مدعا ثابت ہو گیا، واللہ اعلم

''قال ابو عبد الله الخ'' امام بخاریؒ یہاں لفظ صابی کے لغوی معنی کی تحقیق کر رہے ہیں اور اسی کے ساتھ لفظ صابی کی مناسبت سے قرآن عزیز میں جو صابئین آیا ہے، اس کی تشریح کرنا چاہتے ہیں، پھر بہ ادنی مناسبت اصب کا ذکر بھی فرما گئے جو سورۂ یوسف میں آیا ہے، جس کے معنی '' أمِل '' کے ہیں وہ صبا یصبو سے ناقص واوی ہے یہ صابی '' صبأ یصبأ '' سے مہموز ہے، قرآن کریم میں جو صابئین مذکور ہے ان کا شمار اہل کتاب میں نہیں ہے اس کی تحقیق اپنے مقام پر آئے گی۔

[۷] بَابٌ اِذَا خَافَ الْجُنُبُ عَلٰی نَفْسِهِ الْمَرَضَ اَوِ الْمَوْتَ اَوْ خَافَ الْعَطَشَ تَيَمَّمَ وَيُذْكَرُ اَنَّ عَمْرَو بْنَ الْعَاصِ اَجْنَبَ فِيْ لَيْلَةٍ بَارِدَةٍ فَتَيَمَّمَ وَتَلَا وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللهَ كَانَ

بِكُمْ رَحِيماً فَذَكَرَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَلَمْ يُعَنِّفْ .

(۳۴۵) حَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ خَالِدٍ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدٌ هُوَ غُنْدَرٌ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ سُلَيْمَانَ عَنْ اَبِيْ وَائِلٍ قَالَ اَبُوْ مُوْسٰى لِعَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ اِذَا لَمْ يَجِدِ الْمَآءَ لَايُصَلِّى قَالَ عَبْدُ اللهِ نَعَمْ لَوْ رَخَّصْتُ لَهُمْ فِيْ هٰذَا كَانَ اِذَا وَجَدَ اَحَدُكُمُ الْبَرْدَ قَالَ هٰكَذَا يَعْنِيْ تَيَمَّمَ وَصَلّٰى قَالَ قُلْتُ فَاَيْنَ قَوْلُ عَمَّارٍ لِعُمَرَ قَالَ اِنِّىْ لَمْ اَرَ عُمَرَ قَنِعَ بِقَوْلِ عَمَّارٍ. (گذشتہ:۳۳۸)

(۳۴۶) حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ حَفْصٍ قَالَ حَدَّثَنَا اَبِيْ قَالَ حَدَّثَنَا الْاَعْمَشُ قَالَ سَمِعْتُ شَقِيْقَ بْنَ سَلَمَةَ قَالَ كُنْتُ عِنْدَ عَبْدِ اللهِ وَاَبِيْ مُوْسٰى فَقَالَ لَهٗ اَبُوْمُوْسٰى اَرَاَيْتَ يَااَبَا عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اِذَا اَجْنَبَ فَلَمْ يَجِدِ الْمَآءَ كَيْفَ يَصْنَعُ فَقَالَ عَبْدُ اللهِ لَايُصَلِّى حَتّٰى يَجِدَ الْمَآءَ فَقَالَ اَبُوْمُوْسٰى فَكَيْفَ تَصْنَعُ بِقَوْلِ عَمَّارٍ حِيْنَ قَالَ لَهُ النَّبِيُّ ﷺ كَانَ يَكْفِيْكَ؟ قَالَ اَلَمْ تَرَ عُمَرَ لَمْ يَقْنَعْ بِذٰلِكَ مِنْهُ فَقَالَ اَبُوْمُوْسٰى فَدَعْنَامِنْ قَوْلِ عَمَّارٍ، كَيْفَ تَصْنَعُ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ؟ فَمَادَرٰى عَبْدُ اللهِ مَايَقُوْلُ فَقَالَ اِنَّا لَوْرَخَّصْنَا لَهُمْ فِيْ هٰذَالَاَوْشَكَ اِذَا بَرَدَ عَلٰى اَحَدِهِمُ الْمَآءُ اَنْ يَّدَعَهٗ وَيَتَيَمَّمَ فَقُلْتُ لِشَقِيْقٍ فَاِنَّمَا كَرِهَ عَبْدُ اللهِ لِهٰذَا .قَالَ نَعَمْ. (گذشتہ:۳۳۸)

**ترجمہ** باب، جب جنبی اپنے بارے میں بیماری یا موت یا پیاس کا اندیشہ کرتا ہو تو اس کو تیمم کی اجازت ہے، حضرت عمرو بن العاص کو ایک سرد رات میں جنابت لاحق ہوگئی تو انھوں نے تیمّم کیا اور یہ آیت تلاوت کی، کہ تم اپنی جانوں کو قتل نہ کرو، بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ رحمت کرنے والا ہے، پھر یہ بات حضرت عمرؓ نے سرکار رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں نقل کی تو آپ نے ان کو اس پر سرزنش نہیں کی، ابووائل سے روایت ہے کہ اگر جنبی کو پانی نہ ملے تو کیا وہ نماز نہ پڑھے، حضرت ابومسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر ہم اس معاملہ میں رخصت دے دیں تو پھر یہ ہوگا کہ جب کسی کو سردی کا احساس ہوگا وہ یہی کرے گا یعنی تیمّم کر کے نماز پڑھ لے گا، حضرت ابوموسیٰؓ نے کہا کہ حضرت عمارؓ بن یاسر کے اس قول کے بارے میں کیا خیال ہے جو انھوں نے حضرت عمرؓ سے کہا تھا، حضرت ابومسعودؓ نے کہا کہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ خود حضرت عمرؓ کو حضرت عمارؓ کے قول پر اطمینان نہیں ہوا تھا، شقیق بن سلمہ راوی کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن مسعود اور ابوموسیٰ اشعریؓ کے پاس تھا، حضرت ابوموسیٰ نے حضرت ابن مسعودؓ سے کہا کہ ابوعبدالرحمٰن آپ کی کیا رائے ہے اگر کسی کو جنابت لاحق ہو جائے اور اس کو پانی نہ ملے تو وہ کیا کرے؟ حضرت ابن مسعودؓ نے کہا جب تک پانی نہ ملے نماز نہ پڑھے، حضرت ابوموسیٰؓ نے کہا کہ آپ حضرت عمارؓ کے اس قول کی کیا تاویل کریں گے، جب رسول اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تمہیں چہرے اور ہاتھوں کا مسح کافی تھا؟ حضرت ابن مسعودؓ نے جواب دیا، کیا تم نہیں جانتے کہ حضرت عمرؓ کو حضرت عمارؓ کی اس روایت سے اطمینان نہیں ہوا تھا، حضرت ابوموسیٰ نے کہا حضرت عمارؓ کی روایت کو جانے دیجئے، اس آیت

کا کیا جواب ہوگا، یعنی آیت تیمم کے بارے میں آپ کیا کہیں گے، اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود نہ سمجھ سکے کہ کیا کہیں، بلکہ فرمایا کہ اگر ہم نے لوگوں کو اس کے بارے میں رخصت دے دی تو یہ بات بعید نہیں کہ جب کسی کو پانی سرد محسوس ہوگا، تو وہ پانی کو چھوڑ کر تیمم کرلیا کرے گا، حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ میں نے ابووائل شقیق بن سلمہ سے کہا کہ حضرت ابن مسعودؓ اس سبب سے تیمّم کی اجازت نہیں دیتے! ابووائل نے عرض کیا کہ جی ہاں ایسا ہی ہے۔

**مقصد ترجمہ** بخاریؒ کہتے ہیں کہ جو لوگ تیمّم جب کے بارے میں یہ قید لگاتے ہیں کہ جب تک جنبی کو اپنی موت کا اندیشہ نہ ہو یا جب تک اس کو کسی عضو کے تلف ہونے کا خطرہ نہ ہو تو اس وقت تک تیمّم کی اجازت نہ ہوگی یہ تشدد ہے۔

بخاریؒ کہتے ہیں کہ جس طرح پیاس کا معاملہ تمام فقہاء کے نزدیک متفق علیہ ہے یعنی اگر جنبی یہ خیال کرتا ہے کہ اگر میں نے پانی صرف کرلیا تو پیاس کی ضرورت کے لیے پانی نہیں بچے گا، تو اس کو اجازت ہے کہ پانی محفوظ رکھے اور تیمّم کرلے، اسی طرح سے اگر جنبی کو یہ اندیشہ ہو کہ اگر اس نے پانی استعمال کرلیا تو وہ بیمار ہو جائے گا، یا بیماری سے صحت یاب ہونے میں دیر لگے گی، یا بیماری بڑھ جائے گی، تو اس صورت میں اس کو تیمّم کی اجازت ہے، گویا امام بخاریؒ کے نزدیک، موت، پیاس اور مرض تینوں اندیشوں کے لیے تیمم کی اجازت ہے، بیماری کے اندیشہ کا مطلب تو یہ ہے کہ یا تو اس جنبی کو اس چیز کا تجربہ ہو کہ جب بھی ایسی صورت پیش آئی وہ بیمار ہوگیا، یا طبیب حاذق مسلم نے کسی مرض کے سبب پانی کے استعمال سے منع کردیا، حضرات احناف کے یہاں بھی مسئلہ اسی طرح ہے کہ ان تینوں اندیشوں کے تحت جنبی کو یہ اجازت ہے کہ پانی سے پرہیز کرے اور تیمم کرلے۔

**حضرت عمروؓ بن العاص کا اجتہاد** وَيـذكـر الخ واقعہ صحیح اور ثابت ہے، لیکن یہاں بہت مجمل ذکر کیا گیا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت عمرو بن العاص کو غزوۂ ذات السلاسل کے موقعہ پر ایک شدید سرد رات میں نہانے کی ضرورت ہوگئی، حضرت عمرو بن العاص نے تیمّم کرکے نماز پڑھا دی، لوگوں کو ناگواری ہوئی کہ پانی موجود تھا لیکن حضرت عمرو بن العاص نے غسل نہیں کیا، چنانچہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں شکایت کی گئی، آپ نے باز پرس کی اور فرمایا، عمرو! کیا یہ صحیح ہے کہ تم نے جنابت کی حالت میں پانی کے ہوتے ہوئے تیمم کرکے اپنے رفقاء کو نماز پڑھا دی؟ حضرت عمرو بن العاص نے اپنا عذر پیش کیا کہ سردی اتنی شدید تھی اور اپنے عمل کے جواز میں سرکار رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں ایک آیت پیش فرمادی کہ باری تعالیٰ فرماتا ہے، لا تـقـتلوا انفسكم ان الله كـان بكم رحيماً یعنی خداوند قدوس کریم و رحیم ہے، کیسی ہی ضرورت کیوں نہ سامنے ہو لیکن اگر ہلاکت تک نوبت پہنچ سکتی ہو تو رک جاؤ۔

اس آیت کے پیش کرنے کا مدعا بظاہر یہی ہے کہ اگر میں غسل کرتا تو ہلاکت واقع ہوسکتی تھی، حضرت عمروؓ کے اس بیان کو سن کر آپ نے تبسم فرمایا اور خاموش ہوگئے اور حضرت عمرو کو کوئی ملامت یا باز پرس نہیں کی، گویا آپ نے حضرت عمروؓ کے عمل کی تقریر اور توثیق کردی، بخاری کا مدعا ثابت ہوگیا کہ اگر موت کا اندیشہ ہو تو جنبی کو تیمم کی اجازت ہے۔

**حضرت ابن مسعود اور ابوموسیٰ کا مناظرہ** حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ وہ جنبی کو تیمّم کی اجازت نہیں دیتے، اس موضوع پر ان کا حضرت ابوموسیٰ اشعری سے مناظرہ ہوگیا، ذیل کی دو روایتوں میں بخاری اسی مناظرہ کو نقل کررہے ہیں، پہلی روایت میں اختصار بھی ہے، اور تقدیم وتاخیر بھی ہے، البتہ دوسری روایت مفصل اور درست ہے؟ چونکہ سند پہلی روایت کی بھی درست ہے، گو نقل درست نہیں اس لیے امام بخاری نے اس کو بھی لے لیا ہے،، اس کی وجہ یہ ہے کہ محدثین سند کی صحت پر اعتماد کرکے روایات لے لیتے ہیں، محدثین کے یہاں ایسا بھی ملتا ہے کہ ایک روایت کو عقل قبول نہیں کرتی، لیکن چونکہ اس کی سند صحیح ہے، اس لیے محدثین اس کے لے بھی لیں گے، اور اس کی تصحیح بھی کردیں گے، جیسے تلك الغرانیق العُلیٰ مختلف اسناد سے منقول ہوئی حافظ نے اس کو صحیح قرار دے دیا، لیکن ان محدثین کے گروہ میں وہ لوگ بھی ہیں جو سند بھی دیکھتے ہیں اور واقعہ بھی دیکھتے ہیں، اور پھر صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کرتے ہیں۔

بہر حال اس پہلی روایت میں قلب ہے اور اس لیے بخاری نے دوسری روایت بھی اس کے بعد ذکر کردی ہے تا کہ یہ معلوم ہوجائے کہ مناظرہ کی اصل شکل یہ تھی۔

حضرت ابوموسیٰ نے حضرت ابن مسعودؓ سے یہ کہا کہ ابوعبدالرحمٰنؒ یہ تو فرمایئے کہ اگر کسی شخص کو جنابت لاحق ہوجائے اور اس کو پانی نہ ملے تو یہ شخص کیا صورت اختیار کرے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے جواب دیا کہ نماز نہ پڑھے، اب حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے اپنا استدلال پیش فرمایا اور کہا، کیا فتویٰ صحیح نہیں ہے کہ ایک سفر میں عمارؓ اور عمرؓ شریک تھے نہانے کی ضرورت ہوئی تو حضرت عمرؓ نے تو نماز کو موخر کردیا اور حضرت عمار نے زمین پر لوٹ لاٹ کر نماز پڑھ لی، جب رسول اکرم ﷺ کے سامنے یہ واقعہ بیان ہوا تو آپ تے حضرت عمارؓ سے یہ نہیں فرمایا کہ جنبی کو تیمّم کی اجازت نہیں ہے، بلکہ آپ نے ان کے عمل کی اصلاح فرمادی کہ زمین پر لوٹنے کی ضرورت نہیں تھی، بس اس قدر عمل کافی تھا، اور اس کے بعد آپ نے چہرے اور ہاتھوں پر مسح کرکے دکھلا دیا۔

یہ ایک اعتراض ہوا حضرت ابن مسعود پر! حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے مناظرانہ اصول کے تحت اس کا جواب دے دیا کہ جناب آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ کے بارے میں کیا کہا ہے، حضرت عمارؓ نے حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ واقعہ بیان کیا تو انھوں نے فرمایا اتق اللہ یا عمَّارُ عمار خدا سے ڈرو، حضرت عمارؓ نے کہا کہ اگر آپ کا حکم ہو تو میں آئندہ بیان نہ کروں، کیوں کہ ایک مرتبہ بیان کرکے میں حق تبلیغ ادا کرچکا ہوں، حضرت عمرؓ نے

کہا نولیك ماتولیت یعنی میں تم کو واقعہ کے بیان سے نہیں روکتا، بلکہ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ واقعہ کے ذکر میں مجھے شامل نہ کیا جائے، بلکہ تم اپنے اعتماد پر جس چیز کو حق سمجھتے ہو بیان کرو اس میں مضائقہ نہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ جناب آپ جس واقعہ کو پیش فرما کر استدلال کر رہے ہیں، اس کا تو خود صاحب واقعہ منکر ہے، پھر وہ کس طرح میرے اوپر حجت ہو سکتا ہے؟

اس کے بعد حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے دوسرا استدلال کیا کہ اچھا اس واقعہ کو چھوڑیئے، یہ فرمایئے کہ آیت تیمم کے بارے میں آپ کیا کہیں گے یعنی "فَإِنْ لَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْداً طَيِّباً" کا کیا جواب ہے؟

راوی کہتا ہے کہ جب حضرت ابوموسیٰؓ نے یہ آیت پیش کی تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اپنا وہ انداز ہ جس کو انھوں نے ابتداء سے اب تک نبھایا تھا باقی نہ رکھ سکے، انداز ہ یہ تھا کہ معترض کے اعتراض کا جواب بھی ہو جائے اور مصلحت بھی پردہ میں رہے، بلکہ اس آیت کے پیش ہونے کے بعد وہ مصلحت سے پردہ اٹھانے پر مجبور ہو گئے اور فرمایا کہ تم مجھے مخالف کیوں سمجھ رہے ہو، بات صرف اتنی ہے کہ اگر ہم اس معاملہ میں رخصت دے دیں تو قدرت اور عدم قدرت کا فیصلہ تو خود مکلف کرے گا، اور پھر معاملہ یہاں تک پہنچ سکتا ہے کہ ذرا سردی ہوئی تو وضو اور غسل چھوڑ کر تیمم پر اتر پڑے گا، اس مصلحت سے میں یہ فتویٰ نہیں دینا چاہتا۔

**آیت تیمم میں "لَمْسْ" کے معنی** حضرت ابوموسیٰ نے جو آیت تیمم پیش فرمائی تھی، اس میں "لَامَسْتُمُ النِّسَآءَ" کے الفاظ ہیں، اگر لمس سے مراد لمس بالید ہوتا، جماع نہ ہوتا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو اپنی مصلحت پر پردہ ڈالنے کا بہترین موقعہ تھا، وہ فرما سکتے تھے کہ تم جس آیت سے استدلال کر رہے ہو وہاں جنابت کا قصہ ہی نہیں ہے، بلکہ حدث اصغر کی بات ہے، لمس سے مراد جماع نہیں ہے، لمس بالید ہے، لیکن حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے ایسا نہیں فرمایا، معلوم ہوا کہ ان کی طرف "لامستم" کے معنی کے ذکر میں جو لمس بالید کی نسبت کی جاتی ہے وہ درست نہیں ہے، بلکہ وہ بھی جمہور صحابہ کی طرح آیت تیمم میں لمس سے جماع ہی مراد لیتے ہیں۔

شیخ الاسلام الدہلویؒ نے نقل کیا ہے کہ ابن ابی شیبہ نے ایک منقطع سند کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے تیمم جنب کے بارے میں اپنے اس فتوے سے رجوع فرما لیا تھا۔　　　واللہ اعلم

## [۸] بَابُ التَّيَمُّمُ ضَرْبَةٌ

(۳۴۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْمُعَاوِيَةَ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ شَقِيْقٍ قَالَ كُنْتُ جَالِساً مَعَ عَبْدِ اللهِ وَاَبِيْ مُوْسىٰ الْاَشْعَرِيِّ فَقَالَ لَهٗ اَبُوْمُوْسىٰ لَوْ اَنَّ رَجُلاً اَجْنَبَ فَلَمْ يَجِدِ الْمَآءَ شَهْراً مَاكَانَ يَتَيَمَّمُ وَيُصَلِّيْ فَقَالَ عَبْدُ اللهِ لَا يَتَيَمَّمُ وَاِنْ كَانَ لَمْ يَجِدْ

شَهْرًا فَقَالَ لَهُ اَبُوْمُوْسٰى فَكَيْفَ تَصْنَعُوْنَ بِهٰذِهِ الْاٰيَةِ فِي سُوْرَةِ الْمَائِدَةِ فَلَمْ تَجِدُوْا مَاءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا؟ (مائدہ:۶) فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ لَوْ رُخِّصَ لَهُمْ فِيْ هٰذَا لَاَوْشَكُوْا اِذَا بَرَدَ عَلَيْهِمُ الْمَآءُ اَنْ يَتَيَمَّمُوْا الصَّعِيْدَ قُلْتُ اِنَّمَا كَرِهْتُمْ هٰذَا لِذَا قَالَ نَعَمْ فَقَالَ اَبُوْمُوْسٰى اَلَمْ تَسْمَعْ قَوْلَ عَمَّارٍ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ بَعَثَنِيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِيْ حَاجَةٍ فَاَجْنَبْتُ فَلَمْ اَجِدِ الْمَآءَ فَتَمَرَّغْتُ فِي الصَّعِيْدِ كَمَا تَمَرَّغُ الدَّابَّةُ فَذَكَرْتُ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ اِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكَ اَنْ تَصْنَعَ هٰكَذَا وَضَرَبَ بِكَفِّهِ ضَرْبَةً عَلَى الْاَرْضِ ثُمَّ نَفَضَهَا ثُمَّ مَسَحَ بِهَا ظَهْرَ كَفِّهِ بِشِمَالِهِ اَوْظَهْرَ شِمَالِهِ بِكَفِّهِ ثُمَّ مَسَحَ بِهِمَا وَجْهَهُ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ اَلَمْ تَرَ عُمَرَ لَمْ يَقْنَعْ بِقَوْلِ عَمَّارٍ وَزَادَ يَعْلٰى عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ شَقِيْقٍ قَالَ كُنْتُ مَعَ عَبْدِ اللّٰهِ وَاَبِيْ مُوْسٰى فَقَالَ اَبُوْمُوْسٰى اَلَمْ تَسْمَعْ قَوْلَ عَمَّارٍ لِعُمَرَ اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ بَعَثَنِيْ اَنَا وَاَنْتَ فَاَجْنَبْتُ فَتَمَعَّكْتُ بِالصَّعِيْدِ فَاَتَيْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَاَخْبَرْنَاهُ فَقَالَ اِنَّمَا كَانَ يَكْفِيْكَ هٰكَذَا وَمَسَحَ وَجْهَهُ وَكَفَّيْهِ وَاحِدَةً. (گذشتہ:۳۳۸)

**ترجمہ** باب، تیمم صرف ایک ضرب ہے، حضرت شقیق سے روایت ہے کہ میں عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابوموسیٰ الاشعریؓ کے پاس بیٹھا تھا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے کہا کہ اگر کسی شخص کو جنابت لاحق ہوجائے اور اس کو ایک ماہ تک پانی نہ ملے تو کیا وہ تیمم نہ کرے اور نماز نہ پڑھے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے کہا کہ وہ شخص تیمم نہیں کرے گا خواہ ایک ماہ تک پانی نہ ملے، حضرت ابوموسیٰ اشعری نے فرمایا کہ آپ سورۂ مائدہ کی اس آیت کے بارے میں کیا کہیں گے۔ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيْدًا طَيِّبًا اگر تمہیں پانی نہ ملے تو تم پاک مٹی کا قصد کرو؟ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر اس بارے میں لوگوں کو رخصت دے دی جائے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ لوگوں کو جب بھی پانی ٹھنڈا محسوس ہوگا وہ پاک مٹی سے تیمم کرلیا کریں گے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن مسعود سے کہا کہ آپ اس رخصت کو اس مصلحت کے سبب ناپسندیدہ قرار دیتے ہیں، ابن مسعودؓ نے کہا جی ہاں! حضرت ابوموسیٰ نے کہا کیا تم نے وہ بات نہیں سنی جو حضرت عمارؓ نے حضرت عمرؓ سے کہی تھی کہ مجھے رسول اکرم ﷺ نے کسی کام سے کہیں بھیجا، مجھے وہاں جنابت لاحق ہوگئی اور پانی نہیں ملا تو میں نے چوپایہ کی طرح زمین پر لوٹ لاٹ کر نماز پڑھ لی تھی، پھر میں نے واقعہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، آپ نے فرمایا کہ تمہارے لیے بس اتنا کافی تھا، پھر آپ نے ایک بار زمین پر اپنا ہاتھ مارا پھر اس سے غبار کو جھاڑ دیا، پھر آپ نے اس مٹی سے داہنے ہاتھ کی پشت پر بائیں ہاتھ یا بائیں ہاتھ کی پشت پر داہنے ہاتھ سے مسح فرمایا، پھر آپ نے ان دونوں ہاتھوں سے چہرۂ مبارک پر مسح فرمایا، حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت عمارؓ

کے قول سے مطمئن نہیں ہوئے تھے۔

یعلیٰ نے شقیق سے بواسطۂ اعمش یہ زیادتی کی ہے میں عبداللہ بن مسعود اور ابوموسیٰ اشعری کے پاس تھا، ابوموسیٰ نے کہا کیا تم نے وہ قول نہیں سنا جو حضرت عمارؓ نے حضرت عمر سے کہا تھا کہ آں حضرت ﷺ نے مجھے اور آپ کو کہیں بھیجا تھا، مجھے جنابت لاحق ہوگئی تو میں نے مٹی میں لوٹ لگائی پھر ہم رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور صورت حال عرض کی، آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم کو صرف ایسا کر لینا کافی تھا، اور آپ نے چہرے اور ہاتھوں کا ایک بار مسح فرمایا۔

**مقصد ترجمہ** اس سے قبل ایک اور باب گزر چکا ہے، اس میں مقصد یہ رکھا گیا تھا کہ تیمم کا تعلق کن اعضاء سے رہے گا؟ اور اس میں یہ بتلایا گیا تھا کہ تیمم کا تعلق چہرے اور کفین سے ہے، یہاں بخاری دوسرا ترجمہ رکھ رہے ہیں اس کا مقصد بظاہر امام احمد رحمۃ اللہ کے مسلک کی تائید معلوم ہوتا ہے، امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ ایک ہی بار زمین پر ہاتھ مار کر چہرے اور ہاتھوں کا مسح کر سکتے ہیں، ممکن ہے خود امام بخاری کا فیصلہ بھی یہی ہو اور ممکن ہے کہ بخاری جنبی کے لیے تیمم کا طریقہ بتلانا چاہتے ہوں اور مقصد یہ ہو کہ جنبی کا تیمم بھی حدث اصغر کے تیمم کی طرح ہے، اس مقصد کے تحت ترجمہ کی عبارت یوں بنے گی، التَیَمُّمُ ضَرْبَۃٌ لَاتَمَرُّغُ فِیْ التُّرَابِ یعنی جنابت کے لیے تیمم کرنے میں بھی مٹی پر لوٹنے کی ضرورت نہیں، ہاتھ مار کر مسح کر لینا کافی ہے۔

**حدیث باب** حدیث گزر چکی ہے اور اس پر تفصیلی کلام بھی گزر چکا ہے، یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ پچھلے ابواب میں اس روایت سے امام بخاری نے صرف کفین کے مسح پر استدلال کیا ہے، وہاں ہم نے جواب میں یہ عرض کیا تھا کہ روایت میں اختصار ہے اور اصل وجہ اس اختصار کی یہ ہے کہ آپ نئے سرے سے تعلیم نہیں دے رہے ہیں، بلکہ سابق تعلیم کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں۔

یہاں روایت میں اور زیادہ اختصار کر دیا گیا کہ داہنے ہاتھ کی پشت پر بایاں ہاتھ پھیرا یا بائیں ہاتھ کی پشت پر داہنے ہاتھ سے مسح کیا، یہاں صرف ہاتھ کی پشت کا ذکر ہے، باطن کف یعنی ہاتھ کے اندر کی جانب مسح کا ذکر ہی نہیں، پھر یہاں کفین کا مسح چہرے کے مسح سے مقدم مذکور ہے اور ابن ابزی کے طریق سے سابق روایات میں چہرہ کا مسح کفین کے مسح سے مقدم مذکور ہے۔

لیکن یہ سب رُوایان حدیث کی تعبیرات ہیں، ان تعبیرات کے گورکھ دھندے میں اصل مقصد کو نہیں بھولنا چاہئے، بلکہ تمام روایات پر نظر کر کے فیصلہ کرنا چاہئے۔

## [۹] بَابٌ

(۳۴۸) حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰہِ قَالَ اَخْبَرَنَا عَوْفٌ عَنْ اَبِیْ رَجَاءٍ قَالَ حَدَّثَنَا

عِمْرَانُ بْنِ حُصَيْنِ الْخُزَاعِيُّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَأٰى رَجُلاً مُعْتَزِلاً لَمْ يُصَلِّ فِي الْقَوْمِ فَقَالَ يَافُلاَنُ مَامَنَعَكَ اَنْ تُصَلِّيَ فِي الْقَوْمِ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَصَابَتْنِيْ جَنَابَةٌ وَّلاَ مَآءَ قَالَ عَلَيْكَ بِالصَّعِيْدِ فَاِنَّهٗ يَكْفِيْكَ . (گذشتہ:۳۴۴)

**ترجمہ** باب، حضرت عمران بن حصین سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے دیکھا کہ ایک شخص بالکل الگ ہے اور اس نے لوگوں کے ساتھ نماز نہیں پڑھی، آپ نے فرمایا کہ اے فلاں! تجھے لوگوں کے ساتھ نماز ادا کرنے سے کیا چیز مانع رہی، انھوں نے عرض کیا کہ مجھے جنابت لاحق ہوگئی اور پانی میرے پاس نہیں ہے، آپ نے فرمایا، تم نے مٹی کا استعمال کیا ہوتا وہ بلاشبہ تمہاری ضرورت کو پورا کر دیتی۔

**تشریح باب** باب موجود ہے لیکن ترجمہ نہیں ہے اور مستملی کے نسخہ میں باب بھی نہیں ہے، اس صورت میں یہ روایت بھی بابِ سابق ہی سے متعلق ہے اور اس کو اس ترجمہ سے اس طرح متعلق کیا جاسکتا ہے کہ ترجمہ میں ''التيمم ضربة'' آیا ہے اور حدیث مذکور میں بھی کسی عدد کا ذکر نہیں ہے، معلوم ہوا کہ کسی خاص عدد کی تعیین نہیں ہے ایک بار ہاتھ مار کر مسح کر لینا بھی کافی ہے اس لئے استدلال اس روایت کے اطلاق سے ہے، یعنی ''عَلَيْكَ بِالصَّعِيْدِ'' سے جس طرح جنس ارض کا عموم سمجھا جاتا ہے، اسی طرح دربارۂ عدد بھی عموم ہے خواہ ایک ضربہ ہو یا دو ضربات۔

اور اگر دوسرے نسخوں کا اعتبار کریں کہ بخاریؒ نے ''باب'' تو لکھا ہے مگر کوئی ترجمہ اس پر نہیں لگایا، اس صورت میں ترجمہ کا چھوڑنا ذہنوں کا امتحان یا تشحیذ اذہان کے لیے ہے، اگرچہ شارحینؒ نے کوئی ترجمہ نہیں لگایا ہے، لیکن حدیث ذیل کی مناسبت اور ابواب سابق کی رعایت سے ترجمہ لگایا جاسکتا ہے'' باب الجنب اذا لم يجد ماءً تيمم وصلّى''، یعنی جنبی کو اگر پانی نہ ملے تو وہ تیمم کرے اور نماز ادا کرے۔ واللہ اعلم

❁❁❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# [۸] ﴿کتابُ الصَّلٰوة﴾

## [۱] بَابٌ كَيفَ فُرِضَتِ الصَّلٰوةُ فِي الْإِسْرَآءِ

**وَقَالَ ابْنُ عَبَّاس حَدَّثَنِي اَبُوْ سُفيَانَ فِي حَدِيْثِ هِرَقْلَ فَقَالَ يَاْمُرُنَا يَعْنِي النَّبِيَّ ﷺ بِالصَّلٰوةِ وَالصِّدْقِ وَالْعَفَافِ .**

**ترجمہ** باب، جس رات آنحضرت ﷺ کو آسمان پر لے جایا گیا، اس رات میں نماز کس طرح فرض ہوئی؟ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ ابوسفیان نے ہرقل کی حدیث میں بیان فرمایا کہ آپ یعنی نبی اکرم ﷺ ہم کو نماز، سچائی اور پاک دامنی کا حکم دیا کرتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** امام بخاریؒ یہاں سے کتاب الصلوٰۃ شروع فرما رہے ہیں، ترتیب کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کتاب الطہارۃ کے بعد کتاب الصلوٰۃ آرہی ہے، طہارت نماز کے لیے شرط ہے اور وسیلہ بھی ہے، اس لیے امام بخاری شرط اور وسیلہ کے بعد مشروط اور مقصود کے بارے میں گفتگو فرمانا چاہتے ہیں۔

یہاں امام بخاری نے جو پہلا عنوان قائم فرمایا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ لیلۃ المعراج میں نماز کی فرضیت کس شان اور کس کیفیت کے ساتھ ہوئی ہے، یہ بات قابل لحاظ ہے کہ یہاں سوال کیفیت سے ہے اور کیفیت زماں، مکان، حالات اور شان سب کو عام ہے، بلکہ اگر توسع سے کام لیا جائے تو اس میں کیفیت عددی بھی شامل ہوسکتی ہے، یعنی اگر سوال کیفیت زمانی سے ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا، کہ نماز ہجرت سے قبل فرض ہوئی یا ہجرت کے بعد؟ اگر سوال کیفیت شان اور احوال سے ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ نماز کی فرضیت میں کیا شان رہی، یعنی جس طرح دیگر فرائض اور احکام حضرت جبرئیل کی معرفت دنیا میں پہنچائے گئے، آیا نماز کی بھی یہی کیفیت ہے یا اس کی فرضیت میں کوئی خاص طریقہ اختیار کیا گیا؟ اسی طرح اگر سوال کیفیت عددی کا ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس وقت جو ہم پانچ نمازیں پڑھتے ہیں، ابتداء میں یہ پانچ ہی تھیں یا اس سے کم زیادہ تھیں اور بعد میں تخفیف یا اضافہ ہوا؟

یہ سب سوالات کیفیت کے تحت آسکتے ہیں اور اس باب کے ذیل میں امام بخاری نے ان تمام باتوں کا جواب دیا ہے، کہیں یہ بتلائیں گے کہ نماز مکہ معظّمہ میں فرض ہوئی، یہ کیفیت مکانی کا جواب ہے، کہیں یہ معلوم ہوگا کہ نماز ہجرت سے قبل فرض ہو چکی تھی، یہ کیفیتِ زمانی سے متعلق ہے، کہیں بتلائیں گے کہ نماز کی فرضیت کے متعلق وہ طریقہ اختیار نہیں

کیا گیا جو عام فرائض اور احکام کا ہے کہ حضرت جبرئیل آئیں اور تعلیم دے جائیں، بلکہ نماز کی فرضیت کی شان یہ ہوئی کہ سرکار دو عالم ﷺ کو فرش سے عرش پر بلایا گیا اور جس طرح میزبان کی طرف سے معزز مہمان کو کچھ نہ کچھ پیش کیا جاتا ہے، اسی طرح آپ کو لیلۃ المعراج میں نماز جیسی عظیم الشان چیز عطاء کی گئی۔ کیوں کہ معراج کا معاملہ تو صرف سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ خاص تھا اور ایک ہی بار تھا، لیکن اس رات میں آپ کو ایسی عظیم الشان عبادت عطاء کردی گئی کہ انسان جب بھی رب العالمین کے دربار میں حاضری دینا چاہے، دے سکتا ہے، اسی لیے نماز کو معراج المؤمنین فرمایا گیا، کہ نماز مومنین کے لیے معراج ہے، پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو معراج میں ہم کلامی کا شرف بخشا گیا تھا، نماز میں بالکل یہی صورت ہوتی ہے کہ بندہ خداوند قدوس کے سامنے کھڑا ہو کر حمد وثنا کرتا ہے اور خدا کی بارگاہ میں اپنا مقصد عرض کرتا ہے: اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّيْنَ۔

اسی طرح کیفیت عددی کے بارے میں حدیث میں جواب آرہا ہے کہ پہلے پچاس نمازیں دی گئیں اور پھر کس طرح ان میں تخفیف ہوئی؟ یہ سب سوالات کیفیت سے متعلق ہیں، ان کے جوابات ذیل میں دیئے گئے ہیں۔

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ الخ یہاں امام بخاریؒ نے حضرت ابن عباسؓ کی ہرقل والی روایت سے ابوسفیان کا بیان نقل کردیا، یہ روایت کتاب الوحی میں گزر چکی ہے، یہاں جو ٹکڑا نقل کیا گیا ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ ہم کو نماز، سچائی اور پاک دامنی کا حکم دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ''کَیْفَ فُرِضَتِ الصَّلٰوۃُ'' سے اس کو کیا مناسبت ہے؟ حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ العزیز ارشاد فرماتے ہیں: ''ترجمۃ الباب سے اس کی مناسبت یہ ہے کہ نماز اسلام کے ابتدائی دور میں فرض کردی گئی تھی حتی کہ وہ شہرت کے عروج اور دور دراز ممالک تک پہنچ گئی''۔

گویا حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ کے نزدیک ابوسفیان کا یہ بیان کیفیت زمانی سے متعلق ہے، حافظ ابن حجرؒ نے بھی اسی کے قریب قریب بات کہی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ابوسفیان کی روایت میں اس طرف اشارہ ہے کہ نماز ہجرت سے قبل فرض کی گئی، اس لیے کہ ہجرت کے بعد ابوسفیان ہرقل کی ملاقات تک آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوسکے تھے، اس لیے "یامُرُنَا" میں ابوسفیان نے سرکار کی طرف جو امر کی نسبت کی ہے وہ مجاز ہے، اس نسبت کا مدار شہرت پر ہے اور اسراء کا واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ نماز مکہ میں اور ہجرت سے پہلے فرض کی گئی، پھر آگے خود ہی کہتے ہیں کہ وقت کی تعیین اگرچہ کیفیت کے ذیل میں حقیقی طور پر داخل نہیں ہے، لیکن اس کے متعلقات میں سے تو ضرور ہے، جیسا کہ کتاب الوحی میں گزر چکا ہے کہ وہاں امام بخاری نے ''کَیْفَ کَانَ بَدْءُ الْوَحْیِ'' کا ترجمہ منعقد کیا اور پھر وحی کے تمام متعلقات اس کے ذیل میں ذکر کردیئے۔

علامہ عینی رحمہ اللہ نے مناسبت کے سلسلے میں ایک اور بات فرمائی ہے، بات دور کی ہے اور نئی ہے، وہ کہتے ہیں کہ کسی چیز کی کیفیت کے بارے میں سوال جب ہی کیا جاسکتا ہے، جب پہلے اس کی اصل اور ذات کو ثابت وقائم کردیا

جائے، اس لیے امام بخاری نے پہلے ابوسفیان کا بیان نقل کر کے اصل فرضیت کی طرف اشارہ کر دیا اور اس کے بعد لیلۃ الاسراء کی تفصیلی روایت ذکر کی، گویا ابوسفیان کا بیان بطور تمہید ہے۔

علامہ عینی رحمہ اللہ نے قابل قدر اور اچھی بات کہی ہے، لیکن حضرت شاہ ولی اللہ اور حافظ ابن حجر کی بات بھی اپنی جگہ بہت وزنی ہے اور اگر کیف کے اندر توسع اختیار کیا جائے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم

(۳۴۹) حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ ثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يُوْنُسَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ اَبُوْ ذَرٍّ يُحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ فُرِجَ عَنْ سَقْفِ بَيْتِيْ وَاَنَا بِمَكَّةَ فَنَزَلَ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ فَفَرَجَ صَدْرِيْ ثُمَّ غَسَلَهٗ بِمَاءِ زَمْزَمَ ثُمَّ جَاءَ بِطَسْتٍ مِّنْ ذَهَبٍ مُمْتَلِئٍ حِكْمَةً وَّاِيْمَانًا فَاَفْرَغَهٗ فِيْ صَدْرِيْ ثُمَّ اَطْبَقَهٗ ثُمَّ اَخَذَ بِيَدِيْ فَعَرَجَ بِيْ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا فَلَمَّا جِئْتُ اِلَى السَّمَاءِ الدُّنْيَا قَالَ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ لِخَازِنِ السَّمَاءِ اِفْتَحْ قَالَ مَنْ هٰذَا قَالَ هٰذَا جِبْرَئِيْلُ قَالَ هَلْ مَعَكَ اَحَدٌ قَالَ نَعَمْ مَعِيْ مُحَمَّدٌ فَقَالَ أُرْسِلَ اِلَيْهِ قَالَ نَعَمْ فَلَمَّا فُتِحَ عَلَوْنَا السَّمَاءَ الدُّنْيَا فَاِذَا رَجُلٌ قَاعِدٌ عَلٰى يَمِيْنِهٖ اَسْوِدَةٌ وَعَلٰى يَسَارِهٖ اَسْوِدَةٌ اِذَا نَظَرَ قِبَلَ يَمِيْنِهٖ ضَحِكَ وَاِذَا نَظَرَ قِبَلَ شِمَالِهٖ بَكٰى فَقَالَ مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْاِبْنِ الصَّالِحِ قُلْتُ لِجِبْرَئِيْلَ مَنْ هٰذَا قَالَ هٰذَا اٰدَمُ وَهٰذِهِ الْاَسْوِدَةُ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَشِمَالِهٖ نَسَمُ بَنِيْهِ فَاَهْلُ الْيَمِيْنِ مِنْهُمْ اَهْلُ الْجَنَّةِ وَالْاَسْوِدَةُ الَّتِيْ عَنْ شِمَالِهٖ اَهْلُ النَّارِ فَاِذَا نَظَرَ عَنْ يَمِيْنِهٖ ضَحِكَ وَاِذَا نَظَرَ قِبَلَ شِمَالِهٖ بَكٰى حَتّٰى عُرِجَ بِيْ اِلَى السَّمَاءِ الثَّانِيَةِ فَقَالَ لِخَازِنِهَا اِفْتَحْ فَقَالَ لَهٗ خَازِنُهَا مِثْلَ مَا قَالَ الْاَوَّلُ فَفُتِحَ قَالَ اَنَسٌ فَذَكَرَ اَنَّهٗ وَجَدَ فِي السَّمٰوٰتِ اٰدَمَ وَاِدْرِيْسَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰى وَاِبْرَاهِيْمَ وَلَمْ يُثْبِتْ كَيْفَ مَنَازِلُهُمْ غَيْرَ اَنَّهٗ ذَكَرَ اَنَّهٗ وَجَدَ اٰدَمَ فِي السَّمَاءِ الدُّنْيَا وَاِبْرَاهِيْمَ فِي السَّمَاءِ السَّادِسَةِ قَالَ اَنَسٌ فَلَمَّا مَرَّ جِبْرَئِيْلُ عَلَيْهِ السَّلَامُ بِالنَّبِيِّ ﷺ بِاِدْرِيْسَ قَالَ مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْاَخِ الصَّالِحِ فَقُلْتُ مَنْ هٰذَا قَالَ هٰذَا اِدْرِيْسُ ثُمَّ مَرَرْتُ بِمُوْسٰى فَقَالَ مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْاَخِ الصَّالِحِ قُلْتُ مَنْ هٰذَا قَالَ هٰذَا مُوْسٰى ثُمَّ مَرَرْتُ بِعِيْسٰى فَقَالَ مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْاَخِ الصَّالِحِ قُلْتُ مَنْ هٰذَا قَالَ هٰذَا عِيْسٰى ثُمَّ مَرَرْتُ بِاِبْرَاهِيْمَ فَقَالَ مَرْحَبًا بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْاِبْنِ الصَّالِحِ قُلْتُ مَنْ هٰذَا قَالَ هٰذَا اِبْرَاهِيْمُ، قَالَ ابْنُ شِهَابٍ فَاَخْبَرَنِي ابْنُ حَزْمٍ اَنَّ ابْنَ عَبَّاسٍ وَاَبَا حَبَّةَ الْاَنْصَارِيَّ كَانَا يَقُوْلَانِ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ ثُمَّ عُرِجَ بِيْ حَتّٰى ظَهَرْتُ لِمُسْتَوًى اَسْمَعُ فِيْهِ صَرِيْفَ الْاَقْلَامِ قَالَ ابْنُ حَزْمٍ وَاَنَسُ بْنُ مَالِكٍ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ فَفَرَضَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ عَلٰى اُمَّتِيْ خَمْسِيْنَ صَلٰوةً فَرَجَعْتُ بِذٰلِكَ حَتّٰى مَرَرْتُ عَلٰى مُوْسٰى فَقَالَ مَا فَرَضَ اللهُ لَكَ عَلٰى اُمَّتِكَ قُلْتُ فَرَضَ

خَمْسِيْنَ صَلٰوةً قَالَ فَارْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَاتُطِيْقُ ذٰلِكَ فَرَاجَعْتُ فَوَضَعَ شَطْرَهَا فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى قُلْتُ وَضَعَ شَطْرَهَا فَقَالَ رَاجِعْ رَبَّكَ فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ فَرَاجَعْتُ فَوَضَعَ شَطْرَهَا فَرَجَعْتُ اِلَيْهِ فَقَالَ اِرْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ فَاِنَّ اُمَّتَكَ لَا تُطِيْقُ ذٰلِكَ فَرَاجَعْتُ فَقَالَ هِىَ خَمْسٌ وَهِىَ خَمْسُونَ لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَىَّ فَرَجَعْتُ اِلٰى مُوْسٰى فَقَالَ رَاجِعْ رَبَّكَ فَقُلْتُ اِسْتَحْيَيْتُ مِنْ رَّبِّىْ ثُمَّ انْطُلِقَ بِىْ حَتّٰى انْتَهٰى بِىْ اِلَى السِّدْرَةِ الْمُنْتَهٰى وَغَشِيَهَا اَلْوَانٌ لَا اَدْرِىْ مَاهِىَ ثُمَّ اُدْخِلْتُ الْجَنَّةَ فَاِذَا فِيْهَا حَبَائِلُ اللُّؤْلُؤِ وَاِذَا تُرَابُهَا الْمِسْكُ

(آئندہ: ۳۳۴۲،۱۶۳۶)

**ترجمہ** حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ یہ حدیث بیان کیا کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: میرے گھر کی چھت کھولی گئی اور میں اس وقت مکہ میں تھا، پس جبرئیل علیہ السلام اترے اور انہوں نے میرا سینہ چاک کیا، پھر حضرت جبرئیل نے اس کو آبِ زمزم سے دھویا، پھر وہ سونے کا ایک طشت لائے جو حکمت اور ایمان سے لبریز تھا اور جو کچھ اس طشت میں تھا وہ انہوں نے میرے سینہ میں انڈیل دیا، پھر انہوں نے سینہ برابر کر دیا، پھر حضرت جبرئیلؑ نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے لے کر آسمان دنیا کی طرف عروج کیا۔ جب میں قریب ترین آسمان تک پہنچا تو جبرئیل علیہ السلام نے اس آسمان کے تحویلدار سے کہا کھولو! تحویلدار نے معلوم کیا کون؟ کہا جبرئیل! تحویلدار نے دریافت کیا، کیا تمہارے ساتھ کوئی ہے؟ جبرئیل نے کہا، ہاں میرے ساتھ محمد ﷺ ہیں، تحویلدار نے کہا کیا ان کو معراج کے لئے تشریف آوری کی دعوت دے دی گئی؟ جبرئیل نے کہا ہاں، چنانچہ جب اس نے دروازہ کھول دیا، تو ہم آسمان دنیا پر آ گئے، وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص بیٹھے ہوئے ہیں جن کی داہنی جانب بھی کچھ پرچھائیاں ہیں اور بائیں جانب بھی پرچھائیاں ہیں، جب وہ اپنی داہنی جانب دیکھتے ہیں تو ہنستے ہیں اور جب بائیں جانب دیکھتے ہیں تو روتے ہیں۔ یہ دیکھ کر میں نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے معلوم کیا کہ یہ کون ہیں؟ جبرئیل نے جواب دیا کہ یہ حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور یہ جو پرچھائیاں ان کے داہنے یا بائیں ہیں یہ ان کی اولاد کی روحیں ہیں، ان روحوں میں سے داہنی جانب والے اہل جنت ہیں اور بائیں جانب والے اہل دوزخ ہیں، چنانچہ جب حضرت آدم داہنی طرف دیکھتے ہیں، تو ہنستے ہیں اور جب بائیں جانب دیکھتے ہیں تو روتے ہیں، اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے مجھے لے کر دوسرے آسمان کی طرف عروج کیا اور اس کے تحویلدار سے کہا کھولو، دوسرے آسمان کے تحویلدار نے بھی پہلے آسمان کے تحویلدار کی طرح سوالات کئے، پھر دروازہ کھول دیا، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضرت ابوذرؓ نے یہ بتلایا کہ رسول اکرم ﷺ نے مختلف آسمانوں میں حضرت آدم، حضرت ادریس، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہم الصلوٰۃ والسلام سے ملاقات کی، لیکن حضرت ابوذر نے یہ نہیں بتلایا کہ ان کے مقامات کی ترتیب کیا ہے، بس صرف یہ بتلایا کہ آپ کی ملاقات حضرت آدم علیہ السلام سے آسمان دنیا پر اور حضرت ابراہیم علیہ السلام سے چھٹے آسمان پر ہوئی، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب حضرت جبرئیل رسول اکرم

ﷺ کو لے کر حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس سے گزرے تو حضرت ادریس نے نبی صالح اور برادر صالح کہہ کر استقبال کیا، میں نے جبرئیل سے دریافت کیا، یہ کون ہیں؟ تو انھوں نے بتلایا کہ یہ حضرت ادریس ہیں، پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر میرا گزر ہوا تو انہوں نے بھی نبی صالح اور برادر صالح کے الفاظ کے ساتھ مرحبا کہا، میں نے معلوم کیا کہ یہ کون ہیں؟ تو جبرئیل نے بتایا کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، پھر حضرت عیسیٰ کے پاس سے میرا گزر ہوا، تو انھوں نے بھی برادر صالح اور نبیِ صالح کے ساتھ مرحبا کہا، میں نے معلوم کیا یہ کون ہیں؟ تو جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا کہ یہ حضرت عیسیٰ ہیں، پھر میرا گزر حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوا، تو انھوں نے بھی نبیِ صالح اور ولد صالح کے ساتھ مرحبا کہا، میں نے معلوم کیا کہ یہ کون ہیں؟ جبرئیل نے بتلایا کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ابن شہاب زہری کہتے ہیں کہ ابن حزم نے حدیث بیان کی کہ حضرت ابن عباس اور حضرت ابوحبہؓ انصاری دونوں کہتے تھے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ پھر مجھے ایسے ہموار بلند مقام پر پہنچا دیا گیا، جہاں میں قلموں کے چلنے کی آواز سن رہا تھا، ابن حزم اور انس بن مالک کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ پھر باری تعالی نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض فرما دیں، میں یہ حکم لے کر واپس ہوا تا ایں کہ میرا گزر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہوا، انہوں نے پوچھا کہ اللہ تعالی نے تمہاری امت پر کیا فرض کیا؟ میں نے کہا پچاس نمازیں! حضرت موسیٰ نے کہا کہ آپ دوبارہ پروردگار کے پاس جایئے؛ اس لیے کہ آپ کی امت ایک دن رات میں پچاس نمازیں ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتی، چنانچہ میں واپس ہوا اور باری تعالی نے نمازوں کا ایک حصہ کم فرما دیا، پھر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف آیا اور انہیں بتلایا کہ ایک حصہ کم کر دیا گیا، حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ پروردگار کی طرف رجوع کرو، اس لیے کہ آپ کی امت اس کی طاقت نہیں رکھتی، پھر میں نے رجوع کیا، پھر ایک حصہ باری تعالیٰ نے وضع فرما دیا، اس کے بعد میں دوبارہ حضرت موسیٰ کی طرف آیا، انہوں نے پھر یہی فرمایا کہ پروردگار کی طرف رجوع کرو، اس لیے کہ آپ کی امت اس کی بھی طاقت نہیں رکھتی، چنانچہ میں نے پھر پروردگار کی طرف رجوع کیا، تو پروردگار عالم نے فرمایا کہ فرض نمازیں پانچ ہیں اور وہ پچاس کے حکم میں ہیں، میرے نزدیک بات بدلی نہیں جاتی، پھر اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی طرف آیا، انہوں نے پھر یہی کہا کہ پروردگا عالم کے پاس جاؤ، اس پر میں نے کہا کہ مجھے پروردگار سے شرم آتی ہے، پھر جبرئیل مجھے لے کر چلے تا اینکہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہونچے، اس کو رنگا رنگ الوان نے گھیر رکھا تھا، جن کی حقیقت مجھے معلوم نہ ہو سکی، پھر مجھے جنت کی سیر کرائی گئی جس میں موتیوں کی لڑیاں پڑی ہوئی تھیں اور اس کی مٹی مشک تھی۔

**ترجمہ سے ربط** حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی اس روایت میں سرکار دو عالم رسالت مآب ﷺ کے واقعہ معراج کی ضروری تفصیلات ہیں اور اس روایت میں بخاری کے قائم کردہ ترجمہ ”کَیْفَ فُرِضَتِ الصَّلٰوۃُ فِی الْاِسْرَآءِ“ سے متعلق بہت سی باتوں کا تذکرہ آ گیا ہے، اس روایت سے معلوم ہوا کہ نماز مکہ میں فرض ہوئی، چوں کہ معراج کا واقعہ مکہ کا ہے، اسی طرح یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نماز کی فرضیت کا تعلق ہجرت سے قبل کے زمانہ سے ہے، اس روایت میں کیفیت عددی کے بارے میں بھی ذکر آ گیا کہ پہلے پچاس نمازیں فرض ہوئیں اور تخفیف کے بعد پانچ رہ

گئیں، اور نماز کی فرضیت کی شان وشوکت اور عظمت ورفعت بھی معلوم ہوگئی، کہ کس طرح آپ کو بلایا گیا اور اس معراج کی عظیم الشان رات میں جو عطیہ آپ کو امت کے لیے دیا گیا، اسی کا نام نماز ہے، اب اس واقعہ کی تفصیل مع تشریحات عرض کی جاتی ہے۔

**جبرئیل کی خلاف معمول طریقے پر آمد**

"فرج عن سقف بیتی الخ" مکہ کا واقعہ ہے فرماتے ہیں کہ میں ام ہانی کے مکان میں سورہا تھا، ام ہانی نبی کریم ﷺ کی چچازاد بہن ہیں، اس لیے بہ ادنی مناسبت آپ نے ان کے مکان کو بیتی اپنا مکان فرمایا، صورت یہ ہوئی کہ میں سورہا تھا، جبرئیل علیہ السلام آئے، اور حسب معمول دروازے سے نہیں بلکہ خلاف معمول انہوں نے مکان کی چھت کھول کر نزول فرمایا، اس خلاف معمول آمد میں کئی چیزوں کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے، ایک تو یہ کہ اس وقت کی جبرئیل کی حاضری عام حاضری کے انداز کی نہیں، بلکہ کوئی عظیم الشان مقصد ہے، دوسرے یہ کہ جبرئیل چھت کھول کر آئے ہیں، انہوں نے ادھر ادھر توجہ نہیں کی بلکہ سیدھے پہنچے ہیں، ظاہر ہے کہ جبرئیل اپنی طرف سے ایسا نہیں کرسکتے تھے، بلکہ انہوں نے حکم خداوندی کی تعمیل میں ایسا کیا ہے، اس سے غایت اہتمام کا پتہ چلتا ہے، تیسری چیز یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کے آسمان سے بالکل سیدھا پہنچنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اس وقت کی حاضری کا مقصد اس دنیا کے کسی معاملہ سے نہیں؛ بلکہ عالم بالا کے کسی امر سے متعلق ہے، چوتھی چیز یہ بھی قابل اعتبار ہے کہ جبرئیل علیہ السلام نے چھت کھولی اور برابر کردی، نہ مٹی گری اور نہ کوئی عیب پیدا ہوا، اب وہ اسی طرح شق صدر کریں گے، اس معاملہ میں بالکل مطمئن رہنا چاہیے، جس طرح چھت کھول کر برابر کی جاسکتی ہے اسی طرح سینہ بھی بغیر کسی گھبراہٹ کے چاک اور برابر کیا جاسکتا ہے۔

**شق صدر کا راز**

جبرئیل علیہ السلام آئے، سینہ مبارک چاک کیا اور قلب مبارک کو نکال کر آب زمزم سے دھویا، پھر وہ سونے[1] کا ایک طشت لائے جو حکمت اور ایمان سے لبریز تھا، انہوں نے اس حکمت وایمان کو قلب مبارک میں اتار دیا اور پھر سینۂ مبارک کو برابر کردیا۔

شق صدر اس سے پہلے بھی ہوچکا ہے، مگر وہ دوسرے مقاصد کے لیے تھا، یہاں جس شق صدر کا تذکرہ ہے وہ دوسرے مقاصد کے لیے ہے، عالم بالا کی سیر کرانی ہے، تصور سے بالاتر چیزیں دکھانی ہیں، اس لیے ضرورت ہے کہ قلب

---

[1] یہاں یہ اشکال نہیں ہونا چاہئے کہ سونے کا استعمال کیوں کیا گیا؟ پہلی بات تو یہ کہ جبرئیل اپنی طرف سے ایسا نہیں کرسکتے، جو کچھ ہوا بحکم خداوندی ہوا، پھر حرمت وحلت کا سوال ہی ختم ہوجاتا ہے، دوسرے یہ کہ طشت یہاں کا نہیں جنت کا ہے، اور استعمال کرنے والے خود سرکار دو عالم ﷺ نہیں بلکہ جبرئیل ہیں، اور یہ حرمت وحلت کے احکام جنت کے ظروف اور جبرئیل کے بارے میں نہیں ہیں، تیسرے یہ کہ واقعہ مکہ کا ہے، جب تک احکام نازل نہیں ہوئے تھے، سونے کے برتن کا استعمال بھی غایت اہتمام کی طرف مشیر ہے۔ سونا اور وہ بھی جنت کا، نہایت اعلیٰ قسم کی دھات ہے، تغیر کو قبول نہیں کرتا، اور مافی الظرف کی حفاظت کرتا ہے، ظرف کی بھی خاصیت ہوتی ہے، اور اطباء جانتے ہیں کہ کس کام کے لیے کونسی دھات کا استعمال موزوں ہے، اسی طرح یہاں بحکم خداوندی سونے کا طشت استعمال ہوا۔ واللہ اعلم۔

مبارک میں اتنی قوت پیدا کردی جائے جو ان چیزوں کا متحمل ہو سکے، ایسا نہ ہو کہ آپ کی نظر خیرہ ہو جائے اور جن چیزوں کو دکھانا اور سمجھانا ہے ان کو دیکھنے اور سمجھنے میں دقت ہو، چنانچہ شق صدر کیا گیا اور حکمت وایمان سے لبریز سونے کا طشت قلب مبارک میں انڈیل دیا گیا۔

ایمان تو پہلے ہی سے کامل واکمل تھا، لیکن بہ ظاہر بنیہ[1] بشری ان مافوق العادۃ چیزوں کا متحمل نہیں ہوتا، چنانچہ جب جبرئیل پہلی بار وحی لے کر آئے، تو اگر چہ وہ اپنی اصل شکل وصورت میں نہ تھے، لیکن آپ پر بے حد اثر رہا، کچھ دنوں کے لئے سلسلہ روک دیا گیا، پھر دوبارہ یہ واقعہ پیش آیا کہ آپ کہیں تشریف لے جارہے تھے، آواز آئی، دیکھتے ہیں کہ ایک فرشتہ جو آپ کے پاس غار میں آیا تھا، زمین وآسمان کے درمیان کرسی بچھائے بیٹھا ہے اور دونوں افق اس کے وجود سے گھرے ہیں، یہ صورت دیکھ کر آپ پر لرزہ طاری ہو گیا، یہ تو جبرئیل کا معاملہ تھا اور اس وقت عالم بالا کی سیر کرانی ہے، وہاں میکائیل بھی ہیں، ان کے سامنے جب جبرئیل پہنچتے ہیں تو چھوٹے پرندے کی طرح سمٹ جاتے ہیں، اور میکائیل سے بھی بڑے فرشتے ہیں اور دوسری عجائبات بھی ہیں، اس ضرورت کے تحت قلب مبارک کو چاک کیا گیا، اور حکمت وایمان سے لبریز کردیا گیا۔

**معراج کے لیے روانگی**

"ثُمَّ اَخَذَ بِیَدِیْ الخ" ان تمام مراحل سے فارغ ہو کر جبرئیل علیہ السلام نے میرا ہاتھ پکڑا اور آسمان کی طرف لے گئے، یہ معراج جسدی ہے، منامی نہیں ہے، حضرت جبرئیل علیہ السلام آپ کا ہاتھ پکڑے آسمان کی طرف لے جارہے ہیں، آپ ایک برق رفتار براق پر سوار ہیں، جس کے بارے میں روایت میں آیا ہے، "یضع قدمہ منتھی نظرہ" جس کا قدم منتہائے نظر پر پڑتا ہے، سواری کی اس برق رفتاری کے سبب ضرورت تھی کہ جبرئیل آپ کا دست مبارک تھامیں، تاکہ کسی طرح کا اندیشہ آپ کے قلب مبارک میں پیدا نہ ہو، دوسرے یہ کہ آپ ملائکہ وبشر سب میں افضل وبرتر ہیں اور خصوصی دعوت پر آسمان کی طرف بلائے جارہے ہیں، اس لیے جبرئیل ہوں، یا میکائیل ان کا فرض ہے کہ اپنے مخدوم کی رکاب سنبھالیں اور ساتھ چلیں۔

امام بخاریؒ نے جو روایت ذکر کی ہے، اس میں بیت المقدس تک اسراء کا تذکرہ نہیں ہے، اس بناء پر بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ معراج کا واقعہ دوبار پیش آیا، ایک مرتبہ آپ مکہ سے براہ راست آسمان کی طرف تشریف لے گئے جس کا تذکرہ اس روایت میں ہے۔ اور دوسری معراج وہ ہے کہ جس میں آپ پہلے بیت المقدس گئے اور پھر وہاں سے آسمان کی طرف تشریف لے گئے۔ پھر بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ ایک معراج منامی ہے اور دوسری بیداری کی اور اس میں کچھ استبعاد نہیں ہے، ایسا آپ کی زندگی میں بارہا ہوا ہے، کہ جو چیز آپ کو بیداری میں پیش آنے والی ہوتی وہ آپ کو خواب میں پہلے معلوم ہو جاتی تھی، ہمارے اسلاف میں حضرت علامہ کشمیریؒ کی رائے بھی یہی ہے کہ معراج دو ہیں ایک منامی ہے اور دوسری بیداری کی حالت میں۔

---

[1] بِنیَہ: ڈھانچہ، شکل، فطرت، مراد ہے جسم انسانی۔۱۲

امام بخاریؒ اسی کے قائل ہیں، کہ جس رات میں نماز فرض ہوئی اسی رات میں بیت اللہ سے بیت المقدس تک اسراء بھی ہے اور عالم بالا تک معراج بھی ہے، اگر چہ اسراء اور معراج دو الگ الگ چیزیں ہیں کہ بیت اللہ تک سفر اسراء کہلاتا ہے اور بیت المقدس سے آسمانوں کا سفر معراج ہے، مگر امام بخاریؒ کی تحقیق میں یہ دونوں سفر ایک ہی رات سے متعلق ہیں، اس لیے "کیْفَ فرضت الصّلوٰۃ فی الاسراء" کے معنی یہ ہوئے: "کیْفَ فرضت الصّلوٰۃ فی لَیْلَۃِ الاسراء" کہ لیلۃ الاسراء میں نماز کیسے فرض ہوئی؟

اس ترجمہ کے الفاظ میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ اگر چہ روایت میں بیت المقدس تک جانے کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن وہ واقعہ بھی اسی رات میں بحالت بیداری پیش آیا، تذکرہ نہ ہونا راوی کا اختصار ہے، اس میں بیت المقدس کے ذکر کے علاوہ اور بھی بعض چیزیں مذکور نہیں، جیسے براق وغیرہ۔

**آسمان دنیا کے دروازے پر** "فَلَمَّا جِئْتُ اِلَی السَّمَآءِ الدُّنیا" جب ہم قریب والے آسمان کے دروازے پر پہنچے تو جبرئیل نے دربان سے جس کا نام اسمٰعیل تھا کہا، دروازہ کھولئے، معلوم ہوا کہ دروازہ بند تھا، اگر دروازہ کھلا ہوتا تو اس میں اعزاز کی خاص صورت نہ تھی، دروازہ کھلا ہو تو آمد و رفت ہوتی رہتی ہے، اعزاز اس میں ہے کہ جس کے لیے تقریب کا اہتمام کیا گیا ہے اس کے آنے ہی پر دروازہ کھولا جائے۔ دروازہ بند کرنے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اگر دروازہ کھلا ہوتا تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظر اندر پہنچتی، دروازہ کا بیرونی حسن و جمال اور اس کی زینت آپ کے سامنے نہ آسکتی۔

چنانچہ حضرت جبرئیل نے دروازہ کھولنے کے لئے کہا تو دربان نے سوال کیا کون ہے؟ جواب دیا جبرئیل! اس جواب پر دربان نے دروازہ نہیں کھولا، بلکہ وہ پہلے یہ معلوم کرتا ہے، کہ آپ تنہا ہیں یا کوئی ساتھ ہے؟ جواب دیا کہ ہاں میرے ساتھ محمد ہیں۔ قال أ اُرْسِلَ اِلَیْہِ دربان نے سوال کیا، کیا تمہیں ان کو بلانے کے لئے بھیج دیا گیا تھا؟ جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا، ہاں! اس کے بعد دربان نے دروازہ کھول دیا۔

أ اُرْسِلَ اِلَیْہِ کے یہ معنی نہیں جیسا کہ بعض حضرات نے بیان کئے ہیں کہ کیا ان کو رسالت دے دی گئی اور پیغمبر بنادیا گیا؟ اس سوال کے کوئی معنی ہی نہیں ہیں، کیوں کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت اہل آسمان کے لیے کوئی پوشیدہ بات نہ تھی، خصوصاً دربان کے لئے جہاں سے اعمال خیر کا صعود ہوتا رہتا ہے، جس دروازے سے جبرئیل وحی لیکر آتے جاتے ہیں، وہاں رسالت محمدیہ کی اطلاع نہ ہو، ناممکن ہے، البتہ یہ سوال قرین قیاس ہے کہ کیا تم کو ان کے بلانے کے لیے بھیجا گیا تھا؟ اور اس سوال کی معقول وجہ یہ ہوسکتی ہے، کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اعزاز میں جبرئیل علیہ السلام کو دعوت دینے کے لیے کسی مخصوص دروازے سے بھیجا گیا ہو، اس خاص دروازے سے جبرئیل کو جانے کا شرف آپ کو دعوت دینے کے اعزاز میں حاصل ہوا، لیکن جب وہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو لے کر واپس ہوئے تو مخصوص دروازے سے نہیں، بلکہ

عام راستہ سے بلایا گیا، تا کہ ایک طرف تو آپ کے سامنے قدرت کا انتظام اس طرح آ جائے کہ دربان بھی بغیر یہ بات معلوم کئے کہ آپ کے ساتھ محمد ﷺ ہیں اور وہ بلوائے ہوئے آئے ہیں، دروازہ کھولنے کے لیے تیار نہ ہوا، اس سے آپ کے سامنے ملکوت السمٰوات والارض کا انتظام آ گیا اور اس سے دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ اہل آسمان پر آپ کی شان اور عظمت کا مظاہرہ ہو گیا۔

اس معنی کے اعتبار سے آسمان کے دربان اسمٰعیل کے سوال کا مفہوم یہ ہوگا کہ میاں تم کس راہ سے چلے گئے اور کب چلے گئے؟ ورنہ یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آتی کہ کیا تم ان کو بلانے کے لیے بھیجد یئے گئے تھے، فرشتے کو اور پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے اوپر طلب کئے جانے کی اطلاع نہ ہو، جب کہ اس سلسلہ میں آسمانوں کو خاص طریقہ پر مزین کیا گیا، جب کہ دروازوں پر انبیاء کرام خوش آمدید کہنے کے لیے موجود ہیں، فرشتوں کے پرے کے پرے استقبال کے لیے کھڑے ہیں اور آسمان کی زینت خدا معلوم کیا ہوگی؟ اس لیے ان حالات میں آپ کے اوپر طلب کئے جانے کی اطلاع نہ ہو، یہ بھی بعید ہے، اس لیے قرین عقل یہی ہے، کہ فرشتہ سوال یہ کر رہا ہے کہ تم کب اور کدھر سے چلے گئے؟

اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ فرشتے کو بعثت کی خبر ہے اور اوپر بلائے جانے کی بھی خبر ہے، لیکن یہ خبر نہیں کہ اس دعوت کے لئے کون سا وقت مقرر کیا گیا ہے، وہ درِ آسمان کی زینت اور دوسرے انتظامات سے بھی باخبر ہے، فرشتوں اور انبیائے کرام کے اہتمام سے بھی واقف ہے، مگر وہ فرشتہ ہے، یفعلون مایؤمرون (انہیں جو حکم دیا جائے بجالاتے ہیں) کے سبب اپنی ذمہ داری کے علاوہ دوسری چیزوں کی تحقیق اس کا شیوہ نہیں، اس معنی کے اعتبار سے اس کا یہ سوال کہ کیا ان کو اوپر تشریف آوری کی دعوت دے دی گئی؟ صحیح ہے، البتہ اس معنی کی کسی صورت گنجائش نہیں کہ کیا ان کو رسول بنا دیا گیا؟

## پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ سے ملاقات

سوال وجواب کے بعد دروازہ کھلا، اوپر چڑھے تو دیکھا کہ ایک شخص بیٹھے ہوئے ہیں، ان کی داہنی جانب بھی کچھ پرچھائیاں پڑ رہی ہیں اور بائیں جانب بھی، ان بزرگ کی حالت یہ ہے کہ داہنی جانب نظر جاتی ہے تو خوشی سے ہنستے ہیں اور بائیں طرف دیکھتے ہیں تو غم سے روتے ہیں، جب آپ تشریف لے گئے تو ان بزرگ نے " مَرْحَباً بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْاِبْنِ الصَّالِحِ " کہہ کر استقبال کیا، آپ نے حضرت جبرئیل سے معلوم کیا، یہ کون ہیں؟ تو بتلایا گیا کہ حضرت آدم ہیں اور ان کے داہنے بائیں جو پرچھائیاں ہیں، یہ ان کی اولاد کی روحیں ہیں، داہنی سمت والے جنتی ہیں اور بائیں طرف والے دوزخی، اس لیے جب وہ داہنی طرف دیکھتے ہیں تو خوشی ہوتی ہے، ہنستے ہیں، بائیں طرف دیکھتے ہیں تو روتے ہیں۔

پہلے آسمان پر حضرت آدم علیہ السلام سے ملاقات کرائی گئی، کیوں کہ سلسلۂ انسانیت انہیں سے چلا ہے، وہ سب کے باپ ہیں اور اسی نسبی حیثیت سے ان کا حق ہے کہ سب سے پہلے ان ہی سے ملاقات کرائی جائے۔

روایت میں آیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے دائیں اور بائیں روحیں ہیں، اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کتاب

وسنت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ کافروں کی روحیں مقام سجین میں رہتی ہیں اور مومنین کی روحیں علیین میں انعام ربانی سے نوازی جاتی ہیں، پھر ان دونوں طرح کی روحوں کا آسمان دنیا پر حضرت آدم کے داہنے اور بائیں ہونے کا کیا مفہوم ہے؟ اس اشکال کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ اگر چہ روحیں اپنی اپنی جگہ رہتی ہیں، لیکن ہوسکتا ہے کہ اس خاص وقت میں ان روحوں کو حضرت آدم کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہو، لیکن اس تقدیر پر اشکال یہ ہے کہ روایت سے یہ چیز ثابت ہے کہ کافروں کی روحوں کے لیے آسمان کا دروازہ نہیں کھولا جاتا، اس کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ ہوسکتا ہے جنت حضرت آدم کے داہنی طرف اوپر ہو اور جہنم بائیں طرف نیچے اور حضرت آدم کے لیے درمیانی حجابات اٹھادیئے جاتے ہوں، تاکہ وہ اپنی دونوں طرح کی اولاد کے حالات سے باخبر ہوسکیں۔

نیز یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ حضرت آدمؑ کی اولاد کی روحیں تین حالتوں میں ہیں: ایک تو وہ روحیں ہیں جو اس عالم میں آکر عالم آخرت کی طرف منتقل ہوگئیں، دوسری روحیں وہ ہیں جو اس وقت انسانوں کے جسموں سے متعلق ہیں اور تیسری روحیں وہ ہیں جو ابھی تک اس دنیا میں نہیں آسکی ہیں، اشکال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب ہم پہلی اور دوسری قسم کی روحیں مرادلیں، ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں روحیں مراد ہی نہیں ہیں، اس لیے کہ جو روحیں اس عالم میں آگئیں اور پھر دوسرے عالم کی طرف منتقل ہوگئیں، ان کا انجام معلوم ہے کہ کافروں کی روحیں سجین سے متعلق ہیں اور مومنین کی روحیں علیین سے، اسی طرح وہ روحیں بھی مراد نہیں ہوسکتیں جن کا تعلق ابھی تک انسانی جسموں سے ختم نہیں ہوا، کیونکہ وہ روحیں ابھی تک اس دنیا میں جسموں سے متعلق ہیں، اس لیے صرف تیسری قسم کی روحیں مراد ہوسکتی ہیں، یعنی جو ابھی تک اس دنیا میں نہیں آسکی ہیں، یہ روحیں حضرت آدم علیہ السلام کے داہنے اور بائیں آسمان دنیا پر ہیں اور ان کا حال حضرت آدم علیہ السلام پر منکشف ہوتا رہتا ہے۔ اس تقدیر پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ واللہ اعلم

**دوسرے آسمان پر** پہلے آسمان کے بعد دوسرے آسمان کے دروازے پر پہنچے، دروازہ کھلوایا اور وہاں بھی سوال وجواب ہوا، حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ آسمانوں پر آدم، ادریس، موسیٰ، عیسیٰ اور ابراہیم علیہم الصلوۃ والسلام سے ملاقات ہوئی، لیکن حضرت ابوذرؓ نے یہ نہیں بتلایا کہ کس آسمان پر کس پیغمبر سے ملاقات ہوئی؟ بس یہ بتلایا کہ پہلے آسمان پر حضرت آدمؑ اور چھٹے آسمان پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات ہوئی، یہاں اشکال یہ ہے کہ اس روایت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات چھٹے آسمان پر بتلائی گئی ہے، جب کہ اس روایت کے علاوہ باقی تمام روایات میں تقریباً حضرت ابراہیمؑ سے ملاقات ساتویں آسمان پر بیان کی گئی ہے، اب اگر معراج کا واقعہ ایک بار سے زائد پیش آیا ہے، تو کوئی اشکال کی بات ہی نہیں؛ ورنہ چونکہ دوسری روایات میں ساتویں آسمان کے ساتھ یہ چیز بھی مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام بیت المعمور سے کمر لگائے بیٹھے تھے اور بیت المعمور اکثر کے نزدیک ساتویں آسمان پر ہے اس لیے اس روایت میں تاویل کی جائے گی اور وہ تاویل نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقام

ان کے درجہ کے اعتبار سے گو ساتواں آسمان ہی ہے، لیکن وہ استقبال کی غرض سے چھٹے آسمان تک آ گئے تھے، پھر آپ کے ساتھ ہی ساتھ ساتویں پر چلے گئے، اس معنی کے اعتبار سے جن روایات میں ساتواں آسمان مذکور ہے وہ بھی درست ہے، اور جن روایات میں چھٹے آسمان کا ذکر ہے وہ بھی صحیح ہے۔

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ جب رسول اکرم ﷺ حضرت ادریس کے پاس سے گزرے تو انہوں نے "مَرْحَباً بِالنَّبِيِّ الصَّالِحِ وَالْاَخِ الصَّالِحِ" نبی صالح اور برادر صالح کے الفاظ سے مرحبا کہا، یہاں یہ بات قابل لحاظ ہے کہ صرف حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام نے آپ کو صالح نبی اور صالح بیٹے کہہ کر خطاب فرمایا ہے، باقی تمام انبیاء کرام صالح نبی اور صالح بھائی کہہ کر خطاب کر رہے ہیں، اسی لئے حضرت ادریسؑ کے بارے میں اختلاف ہوگیا کہ یہ کون ہیں؟ جمہور کی رائے تو یہ ہے کہ یہ بھی حضرت نوحؑ کی طرح آپ کے اجداد میں داخل ہیں اور ان کا زمانہ حضرت نوحؑ سے بھی پہلے ہے، لیکن بعض حضرات جن میں امام بخاری بھی شامل ہیں یہ کہتے ہیں کہ حضرت ادریس علیہ السلام آپ کے عمود نسب اور آپ کے اجداد میں سے نہیں ہیں، جیسا کہ بخاری آگے کتاب الانبیاء میں بتلائیں گے، کہ یہ حضرت ادریس بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے ہیں اور دراصل حضرت الیاس کا نام ادریس ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ آپ کے عمود نسب میں نہیں ہیں، ان حضرات کی دلیل یہ بھی ہے کہ اگر حضرت ادریس عمود نسب میں شامل ہوتے تو وہ آپ کو اخ کہہ کر خطاب نہ کرتے، بلکہ حضرت آدمؑ اور حضرت ابراہیم کی طرح ابن (بیٹا) کہتے، لیکن یہ کوئی مضبوط دلیل نہیں، ہوسکتا ہے کہ حضرت ادریسؑ نے آپ کی عظمت و رفعت کے اعتراف کے لیے ابن کے بجائے اخ سے خطاب کیا ہو، حضرت ابراہیم اور حضرت آدم نے تو ابن (بیٹے) کے لفظ سے اس لیے خطاب کیا کہ حضرت آدم تو ابوالبشر ہیں، سب ہی کے باپ ہیں، اور حضرت ابراہیم کی ابوّت کا اعلان آپ نے خود اس دنیا میں فرمایا ہے، پھر بعض روایات میں حضرت ادریس کی طرف بھی ابن کا لفظ منسوب ہے، اس لیے قرین قیاس جمہور ہی کی بات ہے، کہ حضرت ادریس علیہ السلام وہی ہیں جو حضرت نوحؑ سے بھی پہلے ہیں اور آپ کے عمود نسب میں شامل ہیں۔ واللہ اعلم

**نماز کی فرضیت** اس کے بعد فرماتے ہیں کہ ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد مجھے ایسے ہموار و بلند مقام پر پہنچایا گیا جہاں سے میں فرشتوں کے دفتروں میں قلم چلانے کی آواز سن رہا تھا، یہ نہیں بتلایا کہ آپ ان دفتروں میں تشریف بھی لے گئے یا نہیں؟ یا وہ فرشتے جو قلم چلا رہے تھے، اپنی جگہوں سے نکل کر باہر آئے یا نہیں؟ ان چیزوں میں سے کوئی چیز مذکور نہیں ہے؛ کیونکہ جتنی چیزیں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دکھلانی تھیں دکھلا دی گئیں اور جن چیزوں کو دکھلانا نہ تھا، ان کا معائنہ آپ کو نہیں کرایا گیا، بہر کیف اتنی بات اس روایت سے معلوم ہوئی کہ آپ اتنی بلندی پر پہنچے کہ وہاں سے قلم چلانے کی آواز سن رہے تھے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ باری تعالیٰ نے میری امت پر پچاس نمازیں فرض فرمادیں، یعنی پیغمبر علیہ الصلوٰۃ

والسلام کو تو معراج کرادی گئی، اس معراج میں سے امت کو بھی تو کچھ حصہ ملنا چاہئے، پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام تو اوپر تشریف لے گئے، پروردگار سے مناجات اور مناجات کے بعد رویت کا شرف حاصل ہوا، امت کا کیا ہوگا؟ اس شرف میں امت کو حصہ یہ ملا کہ پچاس نمازیں مقرر کردی گئیں، جس قدر خشوع اور خضوع سے نمازیں ادا ہوں گی اسی قدر امت کو ترقی ہوگی، "الصَّلٰوۃ مِعراج المؤمنین" فرمایا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ نماز پروردگار سے مناجات کا ذریعہ ہے، تم نماز پڑھ رہے ہو، باری تعالی سے بات کر رہے ہو، تمہارا رب تمہارے اور قبلہ کے درمیان ہے، چنانچہ آپ بے چون و چرا اس تحفہ کو لے کر واپس ہوئے، آپ نے یہ خیال ہی نہیں فرمایا کہ یہ پچاس نمازیں کس طرح ادا ہوں گی، اس لیے کہ آپ مقام عبدیت میں ہیں، سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ فرمایا گیا ہے، عبودیت کامل تھی اور عبودیت کا تقاضا ہے کہ جب بلوایا جائے چلے جائیں اور جو چیز دی جائے اس کو بے چوں چرا قبول کریں۔

پچاس نمازوں کی فرضیت میں پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی عظمت کی طرف بھی اشارہ ہوگیا، کیوں کہ خداوند قدوس کی اپنے بندوں پر سب سے بڑی نعمت نماز ہے، جس قدر یہ نعمت زیادہ ہوگی اسی قدر شان نمایاں ہوگی۔

**حضرت موسیٰ کا مشورہ** آپ پچاس نمازوں کا عطیہ بارگاہ رب العالمین سے لے کر چلے آرہے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام کو راستے میں کھڑا کردیا گیا، تاکہ جب آپ ﷺ ادھر سے گزریں تو وہ نمازوں کے سلسلے میں آپ کو مشورہ دیں، چنانچہ جب آپ حضرت موسیٰ کے پاس سے گزرے تو انہوں نے معلوم کیا کہ آپ کیا ہدیہ لے کر آرہے ہیں؟ آپ نے فرمایا، پچاس نمازیں! اس پر حضرت موسیٰؑ فرماتے ہیں کہ یہ تو بڑی ذمہ داری ہوگئی، میں سمجھتا ہوں کہ امت بڑی کمزور ہے، اس بارگراں کو برداشت نہ کر سکے گی، اس لئے واپس جائیے، ابھی عرض ومعروض کی گنجائش ہے، آپ واپس ہوئے اور درخواست پیش کی، چنانچہ ایک حصہ کم کردیا گیا، یہاں شطر کا لفظ ہے، جس کا ترجمہ نصف نہیں بلکہ ایک حصہ ہے، دوسری روایات میں اس کی تفصیل پانچ آئی ہے، آپ پھر بارگاہ رب العالمین سے لوٹے حضرت موسیٰ منتظر تھے پوچھا، کیا ہوا؟ آپ نے فرمایا: پانچ کم کردی گئیں! حضرت موسیٰؑ نے کہا ابھی اور جاؤ، اب بھی بہت ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بار بار واپس فرما رہے ہیں اور آپؐ واپس جارہے ہیں اور پروردگار کی طرف سے پانچ پانچ کی تخفیف کی جارہی ہے، ایک مرتبہ میں بھی تخفیف کر کے پانچ کی جاسکتی تھیں، مگر ایسی صورت میں آپ کی شان محبوبیت کا اظہار نہ ہوتا، جواب ہو رہا ہے کہ بار بار حاضری کا موقع دیا جارہا ہے اور جو عرضداشت محبوب کی جانب سے پیش کی جارہی ہے، قبول ہو رہی ہے۔ یہاں تک کہ نمازیں پچاس سے کم ہوتے ہوتے پانچ رہ گئیں اور فرمادیا گیا "هِيَ خَمْسٌ وَهِيَ خَمْسُونَ لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ" کہ اب نمازیں پانچ ہیں اور وہ پانچ رہتے ہوئے بھی پچاس ہی ہیں، عالم شہود کی پانچ اور عالم غیب کی پچاس، یا وجود حسی کے اعتبار سے پانچ اور وجود حقیقی کے اعتبار سے پچاس ہیں۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ عطاء کا سلسلہ پچاس سے شروع کیا تھا، لیکن منظور کتنی نمازوں کا بقاء تھا، یہ نہیں بتلایا تھا۔

آخر میں معلوم ہوا کہ بس پانچ نمازوں کا باقی رکھنا منظور ہے، اس کے بعد فرمادیا ’’ لَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ ‘‘ یعنی ہم تو تبدیلی پہلے ہی سے طے کر چکے تھے، البتہ تمھیں خیال گزرا کہ پچاس کا مطلب پچاس ہی ہے، حالانکہ ہمیں منظور پانچ ہی کا بقاء تھا، ان دونوں معنی کے اعتبار سے ’’ لَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ ‘‘ کا تعلق آئندہ کے معاملات سے نہیں، بلکہ اسی معاملے سے ہے، جواب تک ہوتا رہا ہے، یعنی اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ آئندہ تبدیلی نہ ہوگی، بلکہ معنی یہ ہیں کہ دیکھو ہمارے یہاں تبدیلی نہیں ہوتی، پہلے ہم نے پچاس کہا تھا، اب بھی پانچ رہتے ہوئے پچاس ہی ہیں، یا پہلے ہم نے پچاس کہا ضرور تھا، لیکن منظور پانچ ہی کا باقی رکھنا تھا۔

**علامہ سندھیؒ کا ارشاد** آپ جب آخری بار پروردگار کی بارگاہ سے واپس ہوئے تو پھر حضرت موسیٰ نے سوال کیا، آپ نے بتلایا کہ اب پانچ رہ گئی ہیں، حضرت موسیٰ نے پھر وہی مشورہ دیا کہ ابھی اور جاؤ اور عرض معروض کرو، میں نے اپنی امت کو بہت آزمایا ہے، باوجودیکہ ان کے قویٰ مضبوط اور ان کی عمریں طویل تھیں، وہ تین نمازیں بھی نہ پڑھ سکے، آپ کی امت بہت کمزور ہے، وہ پانچ نمازیں کیسے ادا کر سکے گی، اب بھی بہت ہیں، لیکن آپ حضرت موسیٰ کے جواب میں ارشاد فرماتے ہیں ’’اسْتَحْيَيْتُ مِنْ رَبِّی‘‘ اب مجھے حیا آتی ہے۔

علامہ سندھیؒ نے فرمایا کہ آپ کے اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ’’ لَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ ‘‘ کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ اب پانچ نمازوں میں کمی زیادتی نہیں ہو سکے گی، اس لیے کہ اگر مفہوم یہی ہوتا تو سرکار رسالت مآب ﷺ حضرت موسیٰ کے جواب میں ’’ استحییت من ربی ‘‘ نہ فرماتے، بلکہ یہ فرماتے کہ اب واپسی اور عرض معروض کی گنجائش نہیں رہ گئی ہے ’’ لَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ ‘‘ فرمایا جاچکا ہے۔

آپ کا حضرت موسیٰ کے جواب میں یہ فرمانا کہ اب میں نہیں جاؤنگا، اب مجھے حیا آتی ہے۔ یہ بتلا رہا ہے کہ آپ بھی یہی سمجھ رہے ہیں کہ عرض معروض کی گنجائش ہے لیکن حیا مانع ہے۔

پھر علامہ سندھی کہتے ہیں کہ ’’ لَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ ‘‘ کا مفہوم یہ ہوگا کہ دیکھو ہمارے یہاں اصول یہ ہے کہ ایک نیکی کے بدلے دس نیکیاں دی جاتی ہیں اور اس اصول میں کوئی تغیر وتبدل نہیں ہوتا، علامہ کہتے ہیں کہ یہ اصول ’’ هِيَ خَمْسٌ وَهِيَ خَمْسُوْنَ ‘‘ سے مستنبط ہو رہا ہے کہ نمازیں پانچ ہیں اور پچاس بھی ہیں، ایک اور دس کی نسبت کی طرف اشارہ ہے۔[1]

---

[1] حنفیہ پر وجوب وتر کے سلسلہ میں اس روایت کو سامنے رکھ کر اعتراض کیا گیا ہے، کہ فرض نمازیں پانچ ہی ہیں، اس سلسلہ میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی اور اضافہ وتر کا قول اس اعلان کے خلاف ہے، لیکن جب ’’ هی خمس وهی خمسون ‘‘ کا مفہوم ایک اور دس کی نسبت ہوا اور ’’ لا یبدل القول لدی ‘‘ کا مطلب یہ ہوا کہ اس اصول کلی میں کوئی تغیر یا ترمیم نہ ہوگی، تو اضافہ وتر کے بعد کہا جائے گا، کہ جب نمازیں پانچ تھیں، تو ان کا شمار پچاس تھا، اب وتر کے اضافہ کے بعد چھ ہو گئیں تو دس کا اضافہ اور کرلو، علامہ سندھیؒ نے جو بات فرمائی ہے اس کی رو سے وتر کا مسئلہ بھی صاف ہو گیا۔ ۱۲

**حیاء کیوں آتی ہے** آپ نے فرمایا کہ اب مجھے اور عرض معروض سے شرم آتی ہے، اس لیے کہ اب معاملہ ہے عزت نفس کا، کیوں کہ انبیاء علیہم السلام سے نماز کے سلسلہ میں جو تعداد منقول ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ بعض انبیاء نے دو نمازیں ادا کی ہیں، بعض نے تین اور چار اور بعض انبیاء کرام سے پانچ نمازوں کی گنتی بھی منقول ہے، گویا دیگر انبیاء کرام کے سلسلہ میں کم سے کم دو اور زیادہ سے زیادہ پانچ نمازوں کا عمل منقول ہوا ہے، اور آپ سید الانبیاء ہیں آپ کی امت خیر الامم ہے، اس سیادت اور خیریت کا تقاضا کیا ہے؟ خیریت کا انحصار ہے عمل پر، اعمال میں سب سے افضل عمل نماز ہے، اس لیے سیادت اور خیریت کا تقاضا یہ ہے کہ جب نمازیں پانچ رہ گئی ہیں تو اب مزید تخفیف کی درخواست نہ کی جائے، تاکہ اس امت کی نمازوں کی تعداد امم سابقہ سے وجود حسی میں بھی کم نہ ہو۔

حیا کی دوسری وجہ یہ ہے کہ پچاس نمازوں کی فرضیت کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورے سے آپ جب جب واپس ہوتے ہیں پانچ پانچ کم کردی جاتی ہیں، اب جب کہ نمازیں صرف پانچ ہی رہ گئی ہیں، مزید تخفیف کی درخواست کا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ باقی ماندہ پانچ نمازیں بھی بالکل ہی معاف کردی جائیں، اس کا مآل العیاذ باللہ عطیۂ خداوندی کا واپس کردینا ہوگا، جو کسی حال میں مناسب نہیں، نیز یہ کہ اگر تمام نمازیں ہی ختم کردی جائیں تو "لا خیر فی دین لیس فیہ رکوع" جس دین میں نماز نہ ہو اس میں بھلائی نہیں کیسے صادق آئے گا؟ پھر یہ کہ جب آخری مرتبہ میں آپ نے "لَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ" سے یہ سمجھ لیا کہ پانچ کا باقی رکھنا خداوند قدوس کی رضا ہے، تو جس سلسلہ میں رضائے الٰہی معلوم ہوگئی اس سلسلے میں عرض معروض سے حیا مانع ہوئی، یہ متعدد وجوہ ہیں جن کی بنا پر آپ نے حضرت موسیٰ سے فرما دیا، کہ اب میں عرض معروض نہیں کرونگا، مجھے حیا آتی ہے۔ واللہ اعلم

**مشورہ کے لئے حضرت موسیٰ کا انتخاب** یہاں ایک یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مشورہ کے لیے تمام پیغمبروں میں سے صرف حضرت موسیٰ کا انتخاب کیا گیا، اس خصوصیت کی کیا وجہ ہے؟ جب کہ دیگر انبیاء کرام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ہیں اور یہ ملت ملت ابراہیمی بھی ہے "مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ" فرمایا گیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ابراہیم خلیل اللہ ہیں، خلت کے مقام پر ہیں، اور خلت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جو حکم ملے اس کو تسلیم کیا جائے، جیسا کہ زندگی میں بیٹے کی قربانی وغیرہ کے معاملہ میں اس کا اظہار بھی ہو چکا ہے، جب حضرت ابراہیم یہ مشورہ نہیں دے سکتے تو اب یہ مشورہ کس سے دلایا جائے؟ ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اس امت محمدیہ کے شرف اور اس کی عظمت کا بہت زیادہ خیال ہے، دعا کرتے ہیں "رَبِّ اجعلنی من امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم" دوسرے یہ کہ انبیاء میں تقسیم ہے، انبیاء بنی اسرائیل اور انبیاء بنی اسماعیل، بنی اسرائیل کے جلیل القدر پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حق پہنچتا ہے، کہ ان سے مشورہ دلایا جائے، نیز یہ حضرت موسیٰ یہ بھی

جانتے ہیں کہ میری بعثت ونبوت کا دورتو ختم ہو چکا ہے، اس لیے اب میری امت کی فلاح اور نجات کا مدار بھی آپ ہی کے اوپر ایمان لانے میں ہے، بنی اسرائیل بھی آپ ہی کی امت میں آرہے ہیں، جن کا تجربہ حضرت موسیٰ فرما چکے ہیں، اسی لیے وہ مشورہ کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے، کہ جب نبی اکرم ﷺ حضرت موسیٰ کے پاس سے گزرے تھے تو روایات میں آتا ہے: کہ حضرت موسیٰ رو پڑے اور فرمایا "انّ ھذا الغلام یکثر بامّته" اس نوجوان کی امت بہت زیادہ ہوگی، یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نوجوان کے معنی میں غلام کا لفظ استعمال کیا ہے، جس میں توہین کا ایہام تھا اور حضرت موسیٰ کی شان ہے "کَانَ عِنْدَاللہِ وَجِیْهاً" بہ ظاہر یہ غلام کا لفظ حضرت موسیٰ کی شان وجاہت کے خلاف معلوم ہوتا ہے، اس لیے خداوند قدوس نے حضرت موسیٰ کو مشورہ کے لئے آگے بڑھادیا، کہ اگر معاذ اللہ یہ کلمہ توہین کے لیے ہوتا تو حضرت موسیٰ اتنی دل سوزی سے کیوں مشورہ دیتے ؟ اول تو انبیاء کرام ان عیوب سے مبرّا و ماوراء ہیں، پھر حضرت موسیٰ اس عالم میں ہیں جہاں اس طرح کے جذبات ہی نہیں پیدا ہوتے، لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شان وجاہت کو صاف فرمانا مقصود تھا، اس لیے حضرت موسیٰ ہی سے مشورہ دلایا گیا۔ واللہ اعلم

## سدرۃ المنتہی کے پاس

اس کے بعد آپ ارشاد فرماتے ہیں کہ جبرئیل پھر مجھے لے کر سدرۃ المنتہی تک پہنچ گئے، سدرۃ المنتہی جمہور کے نزدیک بیری کے اس درخت کا نام ہے، جس کی جڑ چھٹے آسمان پر ہے اور اس کی شاخیں ساتویں آسمان پر ہیں، گویا کہ یہ درخت چھٹے آسمان پر بھی ہے اور ساتویں آسمان پر بھی، اس کو سدرۃ المنتہی اس لیے کہتے ہیں کہ فرشتے اعمال کو سدرۃ المنتہی تک لے جاتے ہیں اور متعلقہ احکام وہیں سے لاتے ہیں۔

حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ سدرۃ المنتہی کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ارشاد فرماتے ہیں کہ ساتوں آسمان اور زمینیں میرے نزدیک جہنم کا علاقہ ہیں اور جنت ساتوں آسمان کے اوپر کا حصہ ہے، جنت کی چھت باری تعالیٰ کا عرش اعظم ہے، گویا سدرۃ المنتہی کی جڑ جو چھٹے آسمان پر ہے جہنم کی حدود میں ہے اور اس کی شاخیں جو ساتویں آسمان سے بھی اوپر ہیں، جنت کے حدود میں ہیں، قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا "عِنْدَ ھَا جَنَّةُ الْمَاوٰی" اس کے پاس سے یعنی اس کی شاخوں سے جنت کا علاقہ شروع ہوجاتا ہے، معلوم ہوا کہ اس سے نیچے کا علاقہ جنت کا نہیں ہے، بلکہ اس کو جنت کے مقابلہ میں جہنم کا علاقہ کہہ سکتے ہیں، یہ تمام علاقے قیامت میں جہنم کی صورت میں تبدیل ہوجائیں گے، گویا حضرت علامہ نور اللہ مرقدہ کے نزدیک سدرۃ المنتہی کو سدرۃ المنتہی اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں سے جنت کا علاقہ شروع اور جہنم کا علاقہ ختم ہوجاتا ہے۔

آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ اس سدرۃ المنتہی کی سیر کرائی گئی، وہاں میں نے دیکھا کہ اس کو طرح طرح کے رنگوں نے چھپا رکھا تھا، لیکن ان رنگوں کی حقیقت مجھے معلوم نہیں ہوسکی، قرآن کریم میں بھی اس حقیقت کو مبہم الفاظ ہی میں بیان کیا گیا ہے، "اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی" دوسری روایات میں آتا ہے کہ اس درخت کے ہر پتے پر فرشتے کھڑے

رہتے ہیں جو باری تعالی شانہ کی تقدیس وتسبیح کرتے رہتے ہیں، یہ طرح طرح کے رنگ غالباً انہی فرشتوں سے عبارت ہیں، جو تجلیات ربانی پر فدا ہو رہے تھے، مسلم کی روایت میں " فراش من ذهب " کے الفاظ آئے ہیں، یعنی اس درخت پر رنگ رنگ کے سونے کے پتنگے تھے۔

یہاں آپ نے ارشاد فرمایا ''لا ادری ماھی '' اس کی حقیقت مجھے معلوم نہ ہوسکی کہ سدرۃ المنتہی پر یہ کیا چیز ہے؟ معلوم ہوا کہ محض پردہ ہٹا دینے اور مشاہدہ کرا دینے سے ضروری نہیں کہ کسی چیز کی حقیقت بھی معلوم ہو جائے، آپ طرح طرح کے رنگوں کا مشاہدہ فرما رہے ہیں، لیکن یہ فرماتے ہیں کہ ان رنگوں کی حقیقت مجھے معلوم نہ ہوسکی، حیرت ہے کہ سرکار رسالت مآب ﷺ کے لئے علم غیب کا دعویٰ کرنے والے ترمذی کی روایت: '' فتجلّٰی لی کل شیئ '' سے استدلال کرتے ہیں کہ خواب میں خداوند قدوس نے آپؐ کے سینۂ مبارک پر ہاتھ رکھا اور آپ کے سامنے ہر چیز روشن ہوگئی، یہ تو خواب کا معاملہ تھا، آپ بیداری میں مشاہدہ کے بعد بھی حقیقت کے ادراک سے انکار فرما رہے ہیں، اسی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ '' فتجلّٰی لی کل شیئ '' سے علم غیب پر استدلال کی کیا حقیقت ہے؟ جب کہ چیزوں کے سامنے آنے اور مشاہدہ ہو جانے پر بھی ان چیزوں کی حقیقت کا علم ضروری نہیں۔

اس کے بعد ارشاد فرماتے ہیں کہ پھر مجھے جنت کی سیر کرائی گئی، معلوم ہوا کہ جنت سدرۃ المنتہی کے بعد ہے، اس لیے کہ درجہ بدرجہ عروج ہو رہا ہے اور سیر کرائی جا رہی ہے، حضرت علامہ کشمیری کی اس تحقیق کے لئے کہ جنت ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے، ایک شہادت مہیا ہوگئی۔

جنت میں داخل ہوئے تو دیکھا " حبائل اللؤلؤ " موتیوں کی لڑیاں لٹکی ہوئی ہیں، جیسا کہ اس دنیا میں امراء وسلاطین کے یہاں کھڑکیوں پر موتیوں کے پردے ڈالنے کا رواج ہے، بعض نسخوں میں حبائل کے بجائے " جنابذ " کا لفظ ہے، یہ جنبذ کی جمع ہے، جو گنبد فارسی کا معرب ہے، یعنی وہاں آپ نے موتیوں کے گنبد دیکھے اور آپ نے دیکھا کہ جنت میں مٹی کے بجائے مشک ہے، یعنی وہاں کی مٹی مشک کی طرح معطر ہے۔ واللہ اعلم

(۳۵۰) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ صَالِحِ بْنِ كَيْسَانَ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَتْ فَرَضَ اللّٰهُ الصَّلٰوةَ حِيْنَ فَرَضَهَا رَكْعَتَيْنِ رَكْعَتَيْنِ فِي الْحَضَرِ وَالسَّفَرِ فَاُقِرَّتْ صَلٰوةُ السَّفَرِ وَزِيْدَ فِيْ صَلٰوةِ الْحَضَرِ. (آئندہ: ۱۰۹۰، ۳۹۳۵)

**ترجمہ** ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے نماز کو فرض کیا تو اس وقت سفر اور حضر دونوں میں دو دو رکعت فرض قرار دی تھیں، پھر سفر کی نماز تو اسی حال پر برقرار رکھی گئی اور حضر کی نماز میں زیادتی کردی گئی۔

**ترجمہ سے ربط** سابق حدیث میں ترجمہ سے متعلق بہت سی چیزوں کا جواب آ گیا، لیکن یہ بات رہ گئی کہ نماز کی فرضیت کے وقت رکعات کی تعداد کیا تھی، آیا یہی موجودہ شکل نماز کی رکعتوں کی تعداد کے بارے میں

شروع سے چلی آرہی ہے، یا اس میں کچھ کمی زیادتی ہوئی ہے؟ اس لیے امام بخاریؒ نے حضرت عائشہ کی روایت پیش کردی کہ جب نماز فرض ہوئی تو ابتداء میں دودو رکعت فرض کی گئی تھیں، پھر حضر کی نماز میں دودو رکعت کا اضافہ کردیا گیا اور سفر کی نماز اپنی حالت پر برقرار رکھی گئی، معلوم ہوا کہ نماز کی موجودہ شکل کہ ظہر، عصر اور عشاء میں چار چار رکعات ہیں اضافہ کے بعد بنی ہے، ورنہ ابتداء میں دودو رکعت ہی تھی، ابن اسحاق کی روایت میں مغرب کا استثناء کیا گیا ہے، یعنی مغرب کی نماز ابتداء ہی سے تین رکعات ہے، گویا اس روایت میں کیفیت عددی کا جواب آ گیا۔

## سفر میں قصر کیوں ہے؟

اس روایت سے یہ بات ثابت ہورہی ہے کہ حنفیہ جو سفر میں دو ہی رکعت کو ضروری قرار دیتے ہیں وہ اس روایت کے مطابق سفر کی اصلی نماز ہے، ایسا نہیں ہے کہ اصل نماز تو چار چار رکعت تھی، لیکن سفر میں سہولت کی غرض سے دو کی تخفیف کردی گئی، جیسا کہ شوافع کہتے ہیں، بلکہ احناف کے نزدیک سفر میں جو دو رکعت ہیں یہ رخصت اسقاط ہیں، خداوند قدوس نے مسافر سے دو رکعت ساقط فرمادی ہیں یعنی اصل نماز پر مسافر کے لیے کوئی اضافہ نہیں فرمایا ہے، اب اگر کوئی شخص دو کی جگہ چار ادا کررہا ہے، تو وہ قدر مفروض پر زیادتی کررہا ہے، جس کی قطعاً گنجائش نہیں ہے، جس طرح مقیم کی نماز چار کی جگہ دو نہیں ہوسکتی، ایسا کرنے سے نماز کا فرض بدستور ذمہ پر باقی رہے گا، اور ترک فرض کی بنا پر سخت گنہگار ہوگا، اسی طرح مسافر بجائے دودو رکعت کے چار چار رکعت پڑھے، تو بالقصد ایسا کرنے والا گنہ گار ہوگا اور فریضۂ وقت بھی اس کے ذمہ باقی رہے گا۔

اس روایت میں ''اقرت'' اور ''زید'' کا تقابل ہے، یعنی سفر کی نماز میں زیادتی نہیں کی گئی بلکہ اس کو سابقہ حالت پر قائم رکھا گیا، اس لیے اگر کوئی شخص دو کی جگہ چار ادا کررہا ہے، تو وہ گنہ گار ہوگا، اگر اس نے بالقصد ایسا کیا ہے تو فریضہ ادا نہ ہوگا، کیوں کہ اس نے فریضہ کے ساتھ نفل کو شامل کردیا اور نتیجہ ارذل کے تابع ہوتا ہے، اس لیے پوری نماز نفل ہوجائے گی۔

## روایت باب پر شوافع کے اشکالات

حدیث باب حضرات شوافع کے لئے پریشان کن ثابت ہوئی ہے، شوافع کا مسلک یہ ہے کہ سفر میں عزیمت چار ہی رکعات کی ادائیگی ہے، البتہ اجازت دو کی بھی ہے، اگر کسی نے دو ہی رکعات ادا کیں تو اس سے مواخذہ نہ ہوگا۔

روایت باب کے بارے میں حضرات شوافع کہتے ہیں کہ اس روایت کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ سفر میں دودو رکعت کی اجازت دے دی گئی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ سفر میں صرف دو ہی رکعت ہیں، اس پر اضافہ ناجائز ہوگا، بلکہ عزیمت یہ ہے کہ سفر اور حضر دونوں میں چار چار رکعت ادا کی جائیں، البتہ مسافر کو رخصت دے دی گئی ہے کہ وہ سفر میں دو بھی پڑھ سکتا ہے، فریضہ ادا ہوجائے گا۔ اسی طرح اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر زمانے میں سفر کی نماز کے اندر تخفیف کو جاری رکھا گیا، بلکہ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں بھی نمازوں کو پورا کردیا گیا تھا، اس کے بعد جب سفر کی مشکلات درپیش ہوئیں تو جہاں مسافر کو اور مراعات دی گئیں وہاں ایک رعایت نماز کے سلسلہ میں بھی دے دی گئی، جیسا کہ حضرت ابن

عباسؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز چار چار فرض کی گئی تھی، اس کے بعد مسافر کے لئے دو دو رکعت کردی گئیں۔

پھر یہ کہ حضرت عائشہؓ کا عمل خود اس کے خلاف موجود ہے، حضرت عائشہؓ سفر میں اتمام (پوری نماز ادا) فرماتی تھیں، اگر معاملہ اس طرح ہوتا کہ جس طرح حضر میں چار رکعت فرض ہیں، سفر میں بھی فرض صرف دو ہی رکعت ہوتیں، تو حضرت عائشہؓ کا عمل اس کے خلاف کیوں ہوتا؟ جب کہ خود حضرات احناف کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ اعتبار راوی کے عمل اور اس کی رائے کا ہے، روایت کا نہیں، یعنی اگر راوی کا عمل روایت کے خلاف ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ یا تو اس کی روایت منسوخ ہے، یا اس کے وہ معنی نہیں جو بظاہر سمجھ میں آرہے ہیں۔

تیسری چیز یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی یہ روایت مرفوع نہیں ہے، کیوں کہ نماز جس وقت فرض کی گئی ہے، اس وقت حضرت عائشہؓ آپ کے ساتھ نہیں تھیں، لہذا روایت میں انقطاع ہے، اس بناء پر اس روایت سے حنفیہ کا استدلال درست نہیں ہے۔ اور اس کا قرینہ یہ ہے کہ اگر معاملہ اسی طرح ہوتا جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے بیان کیا ہے، تو اس کی نقل متواتر ہونی چاہئے تھی، حالانکہ ان کے علاوہ اس کا کوئی راوی نہیں۔

**احناف کے جوابات** لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس روایت پر حضرات شوافع کی جانب سے جتنے اشکالات کئے گئے ہیں وہ کوئی وزن نہیں رکھتے، یہ کہنا درست نہیں ہے کہ سفر کی نماز میں تخفیف کو جاری نہیں رکھا گیا، بلکہ مدینہ طیبہ میں آنے کے بعد دو دو کا اضافہ کردیا گیا تھا، بعد میں مسافر کو سہولت دی گئی ہے۔

ہم سوال کرتے ہیں کہ یہ بات کسی روایت سے ثابت بھی ہے؟ بڑی مشکل سے حافظ بن حجر نے ابن حبان اور بیہقی وغیرہ سے حضرت عائشہؓ کی ایک روایت نقل کی ہے کہ ''حضر اور سفر دونوں میں دو دو رکعت نماز فرض کی گئی تھی، پھر جب رسول اکرم ﷺ مدینہ تشریف لے آئے اور اطمینان ہوگیا تو حضر کی نماز میں دو دو رکعت کا اضافہ کردیا گیا، البتہ فجر کی نماز میں طول قراءت اور مغرب کی نماز میں وتر نہار ہونے کی وجہ سے زیادتی نہیں کی گئی''۔

یہ روایت پیش کر کے حافظ نے یہ تبصرہ کیا ہے، کہ جب فریضہ کی چار رکعت قرار پاگئیں تو ہجرت کے چوتھے سال آیت قصر ''لاجناح الخ'' نازل ہوئی، لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی جس روایت کو پیش کر کے آپ ہجرت کے بعد فریضہ کی چار رکعت ہونے پر استدلال کررہے ہیں اس میں صاف ہے کہ حضر کی نماز میں دو رکعت کا اضافہ ہوا، سفر کی نماز کا تو اس میں تذکرہ ہی نہیں، یہ محض آپ کا ایک قیاس ہے کہ چوں کی آیت قصر ہجرت کے چوتھے سال نازل ہوئی ہے، اس لیے ان چار سال کی مدت میں نماز سفر بھی چار ہی رہی ہوگی، اس قیاس کے لئے آپ کے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے، سفر کی نماز کے بارے میں اگر کوئی روایت ہے تو وہ حضرت عائشہؓ کی یہی روایت ہے، جو زیر بحث ہے، معلوم ہوا کہ اضافہ سفر کی حالت میں ہوا ہی نہیں۔

اسی طرح اس روایت کے بارے میں یہ کہنا کہ حضرت عائشہؓ کا عمل اس کے خلاف موجود ہے، اس لیے روایت

یا منسوخ ہے یا اس کے کچھ اور معنی ہیں، اس لئے درست نہیں ہے کہ بخاری ہی میں آگے ابواب تقصیر الصلوۃ میں آ رہا ہے، کہ زہریؒ نے عروہؒ سے سوال کیا کہ حضرت عائشہؓ سفر میں نماز پوری کیوں ادا کرتی ہیں؟ تو عروہ نے جواب دیا: ''تأولت کما تأوّل عثمان'' جیسے حضرت عثمانؓ نے تاویل کی اسی طرح حضرت عائشہ بھی تاویل کرتی ہیں۔

حضرت عثمانؓ سے مختلف جوابات منقول ہوئے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح حضرت ابن مسعودؓ تیمم جنب کے بارے میں ایک مصلحت کی رو سے جواز کا فتوی نہ دیتے تھے اور مصلحت بھی پردہ میں رکھنا چاہتے تھے، اسی طرح حضرت عثمانؓ بھی کسی مصلحت کے تحت ایسا کرتے رہے، اسی لئے ان کی طرف سے مختلف جوابات منقول ہیں۔ کسی کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ میں نے یہاں شادی کر لی ہے، کبھی فرماتے ہیں کہ میں نے یہاں مکان بنالیا ہے، کبھی فرمایا کہ بہت سے لوگ باہر سے آئے ہوئے تھے اگر میں دو ہی ادا کرتا تو وہ سمجھتے کہ نماز کی دو ہی رکعت ہیں، اس لیے چار ادا کیں تاکہ غلط فہمی نہ ہو، کبھی انہوں نے یہ بیان کیا کہ سفر کی دو حالتیں ہیں: ایک حالت سیر کی ہے اور ایک قیام کی، سیر کا حکم اور ہے اور قیام کا اور ہے۔

ایک جواب یہ بھی منقول ہوا ہے کہ میں امیر المؤمنین ہوں اور امیر جہاں جائے وہ اس کا مکان ہے، غرض حضرت عثمان نے بالتاویل اپنے آپ کو مقیم بنا کر اتمام فرمایا ہے، مسافر رہتے ہوئے اتمام نہیں فرمایا، یہ دوسری بات ہے کہ ان تاویلات کا درجہ کیا ہے، وہ صحیح ہیں یا غیر صحیح؟ مگر اس کی جوابدہی حنفیہ پر لازم نہیں، وہ سوالات تو حضرت عثمانؓ سے کیجئے، وہی اس کا جواب دیں گے۔

حضرت عائشہؓ کے اتمام کے سلسلہ میں عروہ کا جواب واضح ہے، کہ تاویلاً مقیم بن کر اتمام فرمایا ہے، نہ کہ مسافر رہتے ہوئے اتمام کا عمل فرمایا، لہذا عمل اور روایت میں تضاد کا سوال ختم ہو گیا۔

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ کا اجتہاد ہے، کیوں کہ وہ فرضیت صلوۃ کے وقت حضور کے پاس نہیں تھیں، کیوں کہ اعداد رکعات کے بارے میں قیاس کا کوئی دخل نہیں، ظاہری بات ہے کہ یہ چیز یا تو انہیں سرکار دو عالم ﷺ سے معلوم ہوئی یا کسی اور صحابی سے، اس لیے حافظ ابن حجر نے بھی فرمادیا ہے کہ معنیً مرفوع ہے، نقل کا متواتر نہ ہونا بھی کوئی معقول وجہ نہیں، کیوں کہ جب ایک عمل منسوخ ہو گیا اور اس کے خلاف دوسرا عمل ہونے لگا تو منسوخ چیز کے متواتر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

## شوافع کے دوسرے دلائل

حضرات شوافع نے اپنے مسلک کے اثبات کے لیے اور بھی بعض دلائل پیش کئے ہیں، ان کی سب سے مضبوط دلیل قرآن کریم کی آیت ''فَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلٰوةِ'' ہے، کہ جب تم زمین میں سفر کرو تو اس وقت نماز کے قصر کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ شوافع کہتے ہیں کہ گناہ نہ ہونے کا مفہوم یہی ہے کہ اس کی صرف اجازت دیدی گئی ہے، عزیمت یہ نہیں ہے، یا

زیادہ سے زیادہ مسافر کو اختیار ہے کہ وہ جس چیز پر چاہے، عمل کرے، پھر یہ کہ آیت میں قصر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو اس کی دلیل ہے کہ سفر کی نماز، حضر کی نماز سے کم کر کے دو کی گئی ہے، اصل میں دو رکعت نہیں ہے، جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

شوافع کی دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سرکار رسالت مآب ﷺ سے دریافت کیا کہ اب تو پورے طور پر امن ہے، اب کیا ضرورت ہے کہ دو رکعت سفر میں ادا کی جائیں، اس پر آپ نے ارشاد فرمایا: "صدقة تصدق الله بها عليكم فاقبلوا صدقته" یہ خدا کی جانب سے صدقہ ہے، اس کا صدقہ قبول کرو، شوافع کہتے ہیں کہ لفظ صدقہ سے تعبیر میں اس طرف اشارہ ہے کہ معاملہ اختیاری ہے، کیوں کہ صدقہ قبول کرنا ضروری نہیں۔

حضرات شوافع کے دونوں استدلال بظاہر مضبوط معلوم ہوتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرات شوافع نے قرآن کریم کی جس آیت سے استدلال کیا ہے، وہ دو رکعت کے واجب نہ ہونے کے بارے میں نص نہیں کہی جا سکتی، آیت میں فرمایا گیا ہے کہ قصر میں کوئی گناہ نہیں، اس کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ قصر اختیاری چیز ہے، بلکہ اس کا منشا ایک شبہ کا ازالہ ہے، اصل چیز یہ ہے کہ حضرات صحابہ عبادت کے سلسلہ میں بہت زیادہ حریص تھے، اور نماز چونکہ تمام عبادتوں میں افضل ترین عبادت ہے، اس لیے نماز سے حضرات صحابہ کو بیحد شغف تھا، اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھ لیجئے کہ سفر کی حالت عارضی حالت ہے جو کم پیش آتی ہے اور حضر کی صورت اکثر رہتی ہے۔ اس لئے حضرات صحابہ اکثر تو چار رکعت ادا فرماتے اور جب سفر کی حالت پیش آتی تو دو رکعت پر اکتفا کرتے، لیکن اسی کے ساتھ وہ دل تنگی محسوس فرماتے کہ جو لوگ مقیم ہیں انہوں نے چار رکعت کا ثواب حاصل کیا اور ہم سفر کے عذر کے سبب صرف دو ہی ادا کر رہے ہیں، اس اندیشۂ نقصان کے ازالہ کے لیے آیت نازل فرما دی گئی، کہ تم دل تنگی محسوس نہ کرو، سفر کی حالت کی دو رکعت حضر کی حالت کی چار رکعتوں کے برابر ہیں، کیوں کہ مدار ثواب رکعات کی تعداد نہیں، بلکہ امتثال امر ہے، جس کو چار کا حکم تھا، اس نے چار ادا کیں، تمہیں صرف دو ہی کا حکم ہے، اس لیے تم دو ادا کرو، ثواب دونوں کا برابر ہے۔

اس شبہ کے ازالہ کے لئے فرمایا گیا ہے کہ اگر تم سفر میں ہو تو نماز کے قصر کرنے میں کوئی گناہ نہ سمجھو، جیسے ایک اور شبہ کے ازالہ کے لئے سعی بین الصفا والمروہ کے بارے میں یہی تعبیر اختیار فرمائی گئی ہے "لَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا" کہ صفا اور مروہ کے طواف میں کوئی گناہ نہیں ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ سعی بین الصفا والمروہ اختیاری چیز ہے، یہ سعی بھی واجب ہے، لیکن ایک شبہ کے ازالہ کے لئے "لا جناح" کی تعبیر اختیار کی گئی ہے، چنانچہ حضرات شوافع کا مسلک سعی بین الصفا والمروہ کے بارے میں یہ ہے کہ وہ من جملہ ارکان حج ہے، حالانکہ "لا جناح" کی تعبیر وہاں بھی موجود ہے۔ اس لیے "لا جناح" کی تعبیر سے اختیار نکالنا زبردستی ہے، اسی طرح قصر کی تعبیر سے اصل چار کو قرار دینا بھی درست نہیں، کیوں کہ اکثر و بیشتر تو حضر رہتا ہے، سفر اس کے مقابلہ پر کم پیش آتا ہے، نمازیں دونوں کی الگ الگ مقرر فرمائی گئی ہیں،

ایک حالت کی نمازیں چار چار ہیں اور دوسری حالت کی دو دو، سفر کی نماز کو حضر کی نماز کے مقابل قصر سے تعبیر کر دیا گیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ اصل تو چار تھیں، دو رکعت سہولت کی غرض سے کاٹ دی گئی ہیں۔

اسی طرح حضرت عمر کی روایت کے بارے میں یہ کہنا کہ صدقہ کی تعبیر ہے، اور صدقہ قبول کرنا لازم نہیں اختیاری چیز ہے، یہ بھی غلط ہے، دیکھنا یہ ہوگا کہ صدقہ دینے والا کون ہے؟ اگر صدقہ دینے والا انسان ہے تو بے شک اگر طبیعت چاہے قبول کر لیجئے اور اگر آپ اس کو عزت نفس کے خلاف سمجھتے ہیں تو واپس کر دیجئے، لیکن جب خداوند قدوس صدقہ دے اور پیغمبر علیہ السلام اس کے ساتھ یہ حکم فرمائیں "فاقبلوا صدقته" صدقہ قبول کرو، پھر اس میں اختیار کی گنجائش باقی نہیں رہ جاتی، نہ عزت نفس کا سوال پیدا ہوتا ہے، نہ غیرت کا، اس صورت میں لفظ صدقہ پر اصرار نازیبا معلوم ہوتا ہے۔ یہ ہے کچھ بحث، ورنہ اصل موضوع ابواب تقصیر الصلوۃ میں آ رہا ہے، وہاں انشاء اللہ کچھ مزید چیزیں پیش کی جائیں گی۔　　　واللہ الموفق

## [۲] بَابُ وُجُوْبِ الصَّلٰوةِ فِیْ الثِّیَابِ

وَقَوْلِ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ: خُذُوْا زِیْنَتَکُمْ عِنْدَ کُلِّ مَسْجِدٍ (اعراف: ۳۱) وَمَنْ صَلّٰی مُلْتَحِفاً فِیْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ. وَیُذْکَرُ عَنْ سَلَمَةَ بْنِ الْاَکْوَعِ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ یَزُرُّهٗ وَلَوْ بِشَوْکَةٍ. وَفِیْ اِسْنَادِهٖ نَظْرٌ. وَمَنْ صَلّٰی فِی الثَّوْبِ الَّذِیْ یُجَامِعُ فِیْهِ مَالَمْ یَرَ فِیْهِ اَذًی. وَاَمَرَ النَّبِیُّ ﷺ اَنْ لَّا یَطُوْفَ بِالْبَیْتِ عُرْیَانٌ.

(۳۵۱) حَدَّثَنَا مُوْسٰی بْنُ اِسْمٰعِیْلَ قَالَ ثَنَا یَزِیْدُ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ عَنْ مُحَمَّدٍ عَنْ اُمِّ عَطِیَّةَ قَالَتْ اُمِرْنَا اَنْ نُخْرِجَ الْحُیَّضَ یَوْمَ الْعِیْدَیْنِ وَذَوَاتِ الْخُدُوْرِ فَیَشْهَدْنَ جَمَاعَةَ الْمُسْلِمِیْنَ وَدَعْوَتَهُمْ وَتَعْتَزِلُ الْحُیَّضُ عَنْ مُصَلَّاهُنَّ. قَالَتْ امْرَاَةٌ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِحْدٰنَا لَیْسَ لَهَا جِلْبَابٌ قَالَ لِتُلْبِسْهَا صَاحِبَتُهَا مِنْ جِلْبَابِهَا وَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ رَجَاءٍ حَدَّثَنَا عِمْرَانُ قَالَ ثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِیْرِیْنَ قَالَ حَدَّثَتْنَا اُمُّ عَطِیَّةَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ ﷺ بِهٰذَا.　　(گذشتہ: ۳۲۴)

**ترجمہ** باب، کپڑوں میں نماز واجب ہونے کا بیان، اور باری تعالیٰ کا ارشاد کہ: "اپنا لباس ہر نماز اور طواف کے وقت پہن لو" اور اس شخص کا حکم جس نے ایک کپڑا لپیٹ کر نماز ادا کی۔ حضرت سلمۃ بن اکوع سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ان کو حکم فرمایا کہ گریبان کو بند کرو، اگرچہ کانٹا لگا کر بند کرنا پڑے، لیکن اس حدیث کی سند میں کلام ہے۔ اور اس شخص کا حکم جس نے انہیں کپڑوں میں نماز ادا کر لی جن میں جماع کیا تھا، جب تک کہ ان میں کوئی گندگی نہ دیکھی ہو، اور رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "بیت اللہ کا طواف برہنگی کی حالت میں نہ کرو"۔ حضرت ام عطیہ سے روایت ہے

کہ ہمیں یہ حکم دیا گیا کہ ہم حائضہ اور پردہ نشین عورتوں کو عیدین میں باہر لائیں، تاکہ وہ مسلمانوں کی جماعت اور ان کی دعاؤں میں شریک ہوں اور جو عورتیں ایام سے ہوں وہ عیدگاہ سے الگ رہیں، ایک عورت نے سوال کیا یارسول اللہ! ہم میں کوئی ایسی ہو جس کے پاس چادر نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ آپ نے فرمایا کہ: ''اس کے ساتھ جانے والی اس کو اپنی چادر میں لے لے'' عبداللہ بن رجاء نے کہا کہ ہمیں عمران نے یہ حدیث سنائی، انہوں نے کہا کہ ہم سے محمد بن سیرین نے یہ حدیث بیان کی اور محمد بن سیرین نے کہا کہ ہم سے ام عطیہ نے حدیث بیان کی کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے یہ حدیث سنی۔

**مقصد ترجمہ** نماز کی فرضیت ثابت کرنے کے بعد اب امام بخاری شرائط نماز کی طرف متوجہ ہیں، سب سے پہلے ستر عورت کے مسئلہ پر اس لیے توجہ فرمائی کہ ستر عورت کا معاملہ نماز اور غیر نماز دونوں میں ضروری ہے، البتہ اس سلسلہ میں موالک کا مسلک عجیب ہے، غیر نماز میں تو ستر عورت کی فرضیت میں وہ سب کے ساتھ ہیں؛ البتہ نماز میں ستر عورت کی کیا حیثیت ہے؟ جمہور تو اس کو ضروری اور شرط قرار دیتے ہیں، لیکن موالک کے یہاں یہ سنت کے درجہ کی چیز ہے، بخاری جمہور کے ساتھ ہیں، ممکن ہے اس ترجمہ کا رخ موالک کے رد کی طرف ہو۔

ستر عورت کے واجب ہونے کی دلیل یہ ہے کہ ''خُذُوا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ'' فرمایا گیا ہے، ہر مسجد میں حاضری کے وقت اپنی زینت اپنے ساتھ رکھو، جب مسجد میں حاضری کے لیے زینت کا ساتھ رکھنا ضروری ہوا تو نماز کے لیے بدرجۂ اولیٰ اس کی ضرورت ثابت ہوگئی، کیوں کہ مسجد میں حاضری کا مقصد ہی نماز کی ادائیگی ہے، اور شریعت کی نظر میں اصل نماز وہ ہے جو مسجد میں جماعت سے ادا کی جائے، کیوں کہ نماز میں اصل فرائض ہیں جن کے لیے جماعت کی جاتی ہے اور جماعت کا اصل محل مسجد ہے۔

زینت سے مراد یہ نہیں کہ اعلیٰ قسم کا لباس پہنا جائے، بلکہ مراد صرف یہ ہے کہ اس حصہ جسم کو ڈھانپ کر آؤ جس کا کھلا رہنا معیوب ہے، زینت سے بس یہی مراد ہے، کیوں کہ لباس والا جسم، برہنہ جسم کے مقابلہ پر مزین نظر آتا ہے، اس لیے لباس کو زینت فرمایا گیا ہے، چنانچہ آگے بخاری تعمیم کر رہے ہیں: ''وَمَنْ صَلّٰى مُلْتَحِفاً فِيْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ'' برہنگی دور کرنے کے لئے اگر ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھ لی جائے تو اس کی بھی اجازت ہے، ایک کپڑا کے استعمال میں بھی آزادی ہے کہ اس کو بطور تہمد استعمال کرے یا لپیٹ کر نماز پڑھ لے۔

ایک کپڑے میں نماز کی ادائیگی کی دلیل یہ ہے کہ حضرت سلمہ بن اکوع نے سرکار رسالت مآب ﷺ سے عرض کیا کہ میں شکار کی ضرورت سے زیادہ کپڑے ساتھ نہیں رکھتا، صرف ایک کرتا ڈال کر چلتا ہوں، کیا مجھے اس ایک کرتہ میں نماز کی اجازت ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نماز ہو جائیگی، لیکن گریبان بند کرلیا کرو، خواہ اس میں کانٹا ہی لگانا پڑے۔ کانٹا لگانے کا منشا بھی ستر عورت ہی ہے، اگر گریبان کھلا ہوگا تو عورت پر نظر پڑسکتی ہے، اگرچہ اس حصہ مستور پر اپنی نظر پڑنے سے نماز تو فاسد نہیں ہوتی، لیکن فتنہ کا سامان ضرور ہے۔ بخاری کا استدلال یوں بھی ہوسکتا ہے، کہ جب حصہ مستور کا چھپانا

خود مصلی ہی کے حق میں ضروری ہے تو غیر سے اس کا چھپانا بدرجہ اولی ضروری ہوگیا، بخاری کہتے ہیں کہ "وَفِیْ اسنادہ نَظَرٌ" اس کی اسناد میں کلام ہے، کیوں کہ اس کا ایک راوی موسی بن محمد منکر الحدیث ہے، اس لیے بخاری نے بصیغۂ "یذکر" تعبیر کیا ہے، باقی مسئلہ اسی طرح ہے اس لیے نقل کردیا۔

"ومن صلی فی الثوب الذی یجامع الخ" یہاں سے بخاری ایک اور تعمیم کر رہے ہیں کہ وہ کپڑا جو نماز میں استعمال کریں اس میں آزادی ہے خواہ وہ کپڑا نیا ہو یا مستعمل ہو، پھر مستعمل میں بھی آزادی ہے کہ وہ کپڑا عام حالات میں بدن پر رہا ہو یا مجامعت میں بدن پر ہو جس میں پسینہ بھی جذب ہو جاتا ہے، یعنی یہ ضروری نہیں کہ نماز کے لیے کچھ کپڑے الگ کرلئے جائیں؛ ضروری صرف یہ ہے کہ کپڑے پاک ہوں۔ "مالم یر فیہ اذیً" میں بخاری نے نجاست منی کی طرف اشارہ کردیا۔

"وامر النبی ﷺ ان لا یطوف بالبیت عریان" نماز میں ستر عورت کے وجوب پر استدلال ہے، یہ استدلال دو طرح ہوسکتا ہے، ایک تو یہ کہ برہنگی کی حالت میں طواف سے منع فرمایا گیا ہے، حالانکہ طواف نماز کے مقابلے میں غیر اہم ہے، اور طواف کے لیے اس قسم کے شرائط و آداب بھی نہیں، جس قسم کے نماز کے لئے رکھے گئے ہیں، اس کے باوجود حکم یہ ہے کہ بیت اللہ کا طواف برہنہ نہ کیا جائے، تو نماز جس کے شرائط و آداب زیادہ ہیں وہاں بدرجۂ اولی ضروری ہوگا، کہ برہنگی کی حالت میں یہ عمل نہ کیا جائے۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ طواف میں برہنگی کو اس لیے منع کیا گیا ہے کہ "طواف البیت صلوٰۃ" ممانعت اس لئے آئی کہ طواف پر نماز کا اطلاق کیا گیا، پھر جب طواف میں برہنگی کی اجازت نہیں تو اصل نماز میں کیسے اس کی اجازت ہوگی؟

نیز یہ بھی ممکن ہے کہ یہ ارشاد بھی زینت کی تشریح کے طور پر لایا گیا ہو اور مقصد یہ ہو کہ آیت میں جو "خذوا زینتکم" آیا ہے، اس کے معنی بیش قیمت اور مکمل لباس کے نہیں، گو پسندیدہ یہ ہے کہ لباس مکمل ہو، مگر نماز کی صحت کا مدار پورے جسم کے ستر پر نہیں بلکہ صرف اس حصہ کے ستر پر ہے، جس کو عورت کہا جاتا ہے، چونکہ جاہلیت میں ننگے ہو کر طواف کرنے کا رواج تھا، اس کے مقابل آپ نے ارشاد فرمایا کہ بیت اللہ کا طواف برہنگی کی حالت میں جائز نہیں، گویا آیت کریمہ میں جو زینت کا لفظ آیا ہے وہ برہنگی کے مقابل ہے، عورت اور حصہ مستور کھلا ہوا نہ ہو، اسی کا نام زینت ہے۔

**حدیث باب** روایت گزر چکی ہے، یہاں بخاری نماز میں ستر عورت کے مسئلہ پر استدلال کر رہے ہیں، اس روایت میں آیا کہ آپ نے عورتوں کو عیدگاہ میں جانے کی تاکید کی، مگر اسی کے ساتھ یہ بھی تاکید کی کہ پردہ کے اندر حاضر ہوں، ایک عورت نے عرض کیا کہ کسی کے پاس چادر نہ ہو تو وہ کیا کرے؟ فرمایا اپنی بہن سے مستعار لے لے، یا ایک بڑی چادر میں دو عورتیں چلی جائیں۔ معنی یہ ہوئے کہ عیدگاہ جانا ضروری بھی ہے اور بے پردہ جانے کی اجازت نہیں، پھر جب راستہ کا اس قدر اہتمام ہے تو پھر اصل نماز کپڑے کے بغیر کس طرح درست ہوگی؟ یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ راہ میں تو راہ

گیروں کی شرم کی وجہ سے پردہ کرلینے کا حکم ہے، جیسا کہ بعض شارحین نے اشکال پیش کیا ہے، مگر تعجب کی بات ہے کہ انسان کی شرم اس درجہ ضروری ہے، کہ بے نقاب عیدگاہ میں جانا ممنوع ہے، تو عیدگاہ میں جا کر کیا ہونا چاہئے؟ جہاں بکثرت نمازی بھی موجود ہیں جو راستے میں شرم وحیا کا باعث بنے اور خداوند کریم کا بھی سامنا ہے، جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے " الله احق ان یُستحییٰ منه من الناس " حیا لوگوں کے مقابلہ میں اللہ سے زیادہ ضروری ہے۔ استدلال کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب نماز میں حاضری کے وقت کپڑا ضروری ہے تو نماز میں بدرجہ اولی اس کی ضرورت ہوگی۔ واللہ اعلم

## [۳] بَابُ عَقْدِ الْاِزَارِ عَلَى الْقَفَا فِي الصَّلٰوةِ

وَقَالَ اَبُوْحَازِمٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ صَلَّوْا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ عَاقِدِيْ اُزُرِهِمْ عَلٰى عَوَاتِقِهِمْ

(۳۵۲) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ يُوْنُسَ قَالَ ثَنَا عَاصِمُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنِيْ وَاقِدُ بْنُ مُحَمَّدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ قَالَ صَلّٰى جَابِرٌ فِيْ اِزَارٍ قَدْ عَقَدَهٗ مِنْ قِبَلِ قَفَاهُ وَثِيَابُهٗ مَوْضُوْعَةٌ عَلَى الْمِشْجَبِ فَقَالَ لَهٗ قَائِلٌ تُصَلِّيْ فِيْ اِزَارٍ وَاحِدٍ فَقَالَ اِنَّمَا صَنَعْتُ ذٰلِكَ لِيَرَانِيْ اَحْمَقُ مِثْلُكَ وَاَيُّنَا كَانَ لَهٗ ثَوْبَانِ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ. (آئندہ ۳۵۳، ۳۶۱، ۳۷۰)

(۳۵۳) حَدَّثَنَا مُطَرِّفٌ اَبُوْمُصْعَبٍ قَالَ ثَنَا عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنِ اَبِي الْمَوَالِيْ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ قَالَ رَاَيْتُ جَابِرًا يُصَلِّيْ فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ وَقَالَ رَاَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّيْ فِيْ ثَوْبٍ. (گذشتہ: ۳۵۲)

**ترجمہ** باب، نماز کی حالت میں گردن پر تہبند کی گرہ لگانا کیسا ہے؟ ابوحازم، سہل سے روایت کرتے ہیں کہ صحابہ نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ اپنی گردنوں پر اپنے تہبند باندھے ہوئے نماز پڑھی۔ حضرت جابرؓ نے صرف ایک تہبند میں نماز پڑھی، جس کی گرہ انہوں نے اپنی گردن پر لگالی تھی، حالانکہ ان کے کپڑے ایک تپائی پر رکھے ہوئے تھے، چنانچہ کسی کہنے والے نے ان سے کہا کہ آپ نے ایک ہی تہبند میں نماز پڑھ لی؟ حضرت جابرؓ نے فرمایا، میں نے ایسا صرف اس لیے کیا تا کہ مجھے تم جیسا بیوقوف دیکھ لے، اور ہم میں سے رسول پاک ﷺ کے عہد میں کس کے پاس دو کپڑے ہوتے تھے؟ محمد بن منکدر سے روایت ہے کہ میں نے حضرت جابر کو ایک ہی کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا اور حضرت جابر نے فرمایا کہ نبی اکرم ﷺ کو ایک کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ نماز کی حالت میں تہبند کو اٹھا کر گردن پر گرہ لگائی جائے، کیوں کہ اگر گرہ نہیں لگاتے ہیں تو اندیشہ یہ ہے کہ رکوع یا سجدہ کی حالت میں تہبند کھینچ کر کھل جائے گا اور اس میں کشف ستر کا احتمال رہے گا، اس انتظام کے لیے گرہ لگانے کا معاملہ ہے، اس سے اپنی نظر کی بھی حفاظت ہو جائے گی، کشف ستر کا احتمال بھی باقی نہ

رہے گا اور دل کے خطرات سے بھی امن ہو جائے گا۔

حضرت ابوحازم انصاری فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرامؓ نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ایسی حالت میں نماز ادا کی کہ وہ اپنے کاندھوں پر تہمد کی گرہ لگائے ہوئے تھے، آپ نے دیکھا اور انکار نہیں فرمایا، معلوم ہوا کہ عمل جائز ہے، کیوں کہ اگر ایسا کرنا ناجائز ہوتا تو ممکن نہ تھا، کہ پیغمبر علیہ السلام ایک ناجائز فعل کو دیکھیں اور سکوت اختیار فرمالیں۔

**حدیث باب** روایت میں آیا کہ حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے صرف تہمد باندھ کر اور اس کی گرہ اپنی گردن پر لگا کر نماز پڑھی، اور یہ عمل اس لیے نہیں کیا کہ ان کے پاس کپڑے نہ تھے، بلکہ پاس ہی تپائی[1] پر کپڑے رکھے ہوئے تھے، لیکن بیان جواز کے لیے حضرت جابر نے ان کو نہیں پہنا، صرف ایک تہمد سے گردن پر گرہ لگا کر نماز پڑھ لی، کسی کہنے والے نے کہہ دیا کہ آپ نے صرف ایک تہمد میں نماز پڑھ لی، حالانکہ کپڑے موجود ہیں، حضرت جابرؓ نے جواب دیا کہ ہاں میں نے قصداً کیا ہے اور مسئلہ بتلانے کے لئے کیا ہے کہ نماز اس طرح بھی ہو جاتی ہے، تم جیسے احمقوں کو بتلانے کے لیے کیا ہے، مگر تم باز نہ آئے اور اعتراض کر بیٹھے، حالانکہ تمہارے لئے اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں۔ تمہیں سوچنا چاہیے تھا کہ ایک کثیر الصحبت اور واقف شریعت صحابی ایک عمل کر رہا ہے، اس کا یہ عمل خود جواز کی دلیل ہے؛ لیکن تم بجائے اس کے کہ اس کے عمل سے مسئلہ مستنبط کرتے اعتراض کرنے لگے، اب سمجھ لو کہ مسئلہ یہی ہے، جیسا کہ میں نے عمل کیا ہے، ایک کپڑے میں بھی نماز ہو جاتی ہے، مقصد ستر عورت ہے۔

اس کے بعد حضرت جابرؓ نے ارشاد فرمایا کہ پیغمبر علیہ السلام کے دور میں ایسے کتنے لوگ تھے جن کے پاس دو دو کپڑے ہوں؟ عام طور سے ایک کپڑا ہوتا تھا، اور اسی سے صحابۂ کرام نمازیں ادا کیا کرتے تھے، اگر ایک کپڑے میں نماز جائز نہ ہوتی یا ایک کپڑے میں نماز کا جواز صرف ناداری کے سبب ہوتا، تو پہلی صورت میں سرکار رسالت مآب ﷺ انکار فرما دیتے، دوسری صورت میں حالات کی تفتیش فرماتے اور جس کو ایک کپڑے میں نماز ادا کرتے دیکھتے تو اس سے پوچھتے کہ تم نے ایک کپڑے میں نماز ادا کی، کیا تم دوسرے کپڑے کے حصول پر قادر نہیں ہو؟ لیکن ان دونوں چیزوں میں سے ایک چیز بھی پیش نہیں آئی، معلوم ہوا کہ ایک کپڑے میں نماز بلا کراہت درست ہے بشرطیکہ وہ ساتر ہو، دوسرا کپڑا موجود ہو یا نہ ہو۔

**دوسری روایت** ترجمہ میں عقد ازار کا مسئلہ ہے کہ تہمد کی گرہ گردن پر لگانا کیسا ہے؟ اس دوسری روایت میں اس کا تذکرہ نہیں ہے، بظاہر روایت ترجمہ سے بے تعلق معلوم ہوتی ہے، لیکن اس روایت کا مقصد ہی یہ نہیں ہے، کہ ترجمہ ثابت کریں، ترجمہ تو پہلی روایت سے ثابت ہو گیا، لیکن جس روایت سے ثابت کیا ہے اس میں حضرت جابر کا عمل ہے کہ انہوں نے ایک کپڑے سے نماز ادا کی، دوسری روایت کو لا کر اس عمل کو مرفوع کر دیا، حضرت جابرؓ فرماتے

---

[1] مشجب کا ترجمہ ہمارے یہاں کی متداول تپائی نہیں ہے، بلکہ تین لکڑیاں جن کے سر جوڑ دئے جائیں مشجب کہلاتی ہیں، جیسے سپاہی پریڈ کے میدان میں تین تین بندوقیں جوڑ کر کھڑی کر دیتے ہیں۔۱۲

ہیں کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کو ایک کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا ہے، پھر ایک کپڑے میں تعمیم ہے، خواہ اس کی صورت عقد ازار کی ہو یا کوئی اور صورت ہو۔ واللہ اعلم

## [٤] بَابُ الصَّلٰوةِ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ مُلْتَحِفاً بِه

وَقَالَ الزُّهْرِيُّ فِيْ حَدِيْثِهِ الْمُلْتَحِفُ الْمُتَوَشِّحُ وَهُوَ الْمُخَالِفُ بَيْنَ طَرَفَيْهِ عَلٰى عَاتِقَيْهِ وَهُوَ الْإِشْتِمَالُ عَلٰى مَنْكِبَيْهِ. وَقَالَتْ أُمُّ هَانِئٍ اِلْتَحَفَ النَّبِيُّ ﷺ بِثَوْبٍ لَّهُ وَخَالَفَ بَيْنَ طَرَفَيْهِ عَلٰى عَاتِقَيْهِ

(۳۵۴) حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللهِ بْنُ مُوْسٰى قَالَ اَنَا هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عُمَرَ بْنِ اَبِيْ سَلْمَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى فِيْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ قَدْ خَالَفَ بَيْنَ طَرَفَيْهِ. (آئندہ: ۳۵۵، ۳۵۶)

(۳۵۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى قَالَ ثَنَا هِشَامٌ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَبِيْ عَنْ عُمَرَ بْنِ اَبِيْ سَلْمَةَ اَنَّهٗ رَاَى النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّيْ فِيْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ فِيْ بَيْتِ اُمِّ سَلَمَةَ قَدْ اَلْقٰى طَرَفَيْهِ عَلٰى عَاتِقَيْهِ. (گذشتہ: ۳۵۴)

(۳۵۶) حَدَّثَنَا عُبَيْدُ بْنُ اِسْمَاعِيْلَ قَالَ ثَنَا اَبُوْ اُسَامَةَ عَنْ هِشَامٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ عُمَرَ بْنَ اَبِيْ سَلْمَةَ اَخْبَرَهٗ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يُصَلِّيْ فِيْ ثَوْبٍ وَاحِدٍ مُشْتَمِلاً بِهٖ فِيْ بَيْتِ اُمِّ سَلَمَةَ وَاضِعاً طَرَفَيْهِ عَلٰى عَاتِقَيْهِ. (گذشتہ: ۳۵۴)

(۳۵۷) حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ اَبِيْ اُوَيْسٍ قَالَ حَدَّثَنِيْ مَالِكُ بْنُ اَنَسٍ عَنْ اَبِي النَّضْرِ مَوْلٰى عُمَرَ بْنِ عُبَيْدِ اللهِ اَنَّ اَبَا مُرَّةَ مَوْلٰى اُمِّ هَانِئٍ بِنْتِ اَبِيْ طَالِبٍ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ سَمِعَ اُمَّ هَانِئٍ بِنْتَ اَبِيْ طَالِبٍ تَقُوْلُ ذَهَبْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ عَامَ الْفَتْحِ فَوَجَدْتُّهٗ يَغْتَسِلُ وَفَاطِمَةُ ابْنَتُهٗ تَسْتُرُهٗ قَالَتْ فَسَلَّمْتُ عَلَيْهِ فَقَالَ مَنْ هٰذِهٖ؟ فَقُلْتُ اَنَا اُمُّ هَانِئٍ بِنْتُ اَبِيْ طَالِبٍ فَقَالَ مَرْحَباً بِاُمِّ هَانِئٍ فَلَمَّا فَرَغَ مِنْ غُسْلِهٖ قَامَ فَصَلّٰى ثَمَانَ رَكْعَاتٍ مُلْتَحِفاً فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ فَلَمَّا انْصَرَفَ قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللهِ زَعَمَ ابْنُ اُمِّيْ اَنَّهٗ قَاتِلٌ رَجُلاً قَدْ اَجَرْتُهٗ فُلَانُ بْنُ هُبَيْرَةَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ قَدْ اَجَرْنَا مَنْ اَجَرْتِ يَا اُمَّ هَانِئٍ! قَالَتْ اُمُّ هَانِئٍ وَذَاكَ ضُحًى. (گذشتہ: ۲۸۰)

(۳۵۸) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ سَائِلاً سَاَلَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ عَنِ الصَّلٰوةِ فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَوَلِكُلِّكُمْ ثَوْبَانِ؟ (آئندہ: ۳۶۵)

**ترجمہ** باب، ایک کپڑے کو لپیٹ کر نماز پڑھنا کیسا ہے؟ زہری نے اپنی روایت کردہ حدیث میں بیان کیا کہ ملتحف کے معنی متوشح کے ہیں، اور متوشح اس شخص کو کہتے ہیں جو کپڑے کے داہنے گوشہ کو بائیں بغل کے نیچے سے نکال

کر داہنی طرف اور بائیں گوشہ کو داہنی بغل کے نیچے سے نکال کر بائیں کاندھے پر ڈال لے اور دونوں مونڈھوں پر لپیٹ لینا بھی یہی ہے، ام ہانی نے فرمایا کہ سرکار دو عالم علیہ السلام نے ایک کپڑا کاندھوں پر اس طرح لپیٹا کہ بایاں گوشہ داہنی طرف اور داہنا بائیں طرف نکل آیا۔ حضرت عمر بن ابی سلمہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم علیہ السلام نے ایک کپڑے میں نماز ادا کی اور اس کا داہنا گوشہ بائیں طرف اور بایاں گوشہ داہنی طرف ڈال لیا۔ حضرت عمر بن ابی سلمہ سے روایت ہے کہ انہوں نے نبی کریم علیہ السلام کو حضرت ام سلمہ کے مکان میں ایک کپڑے میں نماز پڑھتے دیکھا جس کے دونوں گوشے آپ نے اپنے دونوں کاندھوں پر ڈال رکھے تھے۔ حضرت عمر بن ابی سلمہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ میں نے نبی اکرم علیہ السلام کو ام سلمہ کے مکان میں ایک کپڑا لپیٹ کر نماز پڑھتے دیکھا ہے، جس کے دونوں گوشے آپ نے اپنے دونوں مونڈھوں پر ڈال رکھے تھے۔ حضرت ابو مرہ مولی ام ہانی نے حدیث بیان کی کہ انہوں نے حضرت ام ہانی کو یہ حدیث بیان فرماتے سنا ہے، وہ فرماتی تھیں کہ میں رسول اکرم علیہ السلام کی خدمت میں فتح مکہ والے سال حاضر ہوئی، فرماتی ہیں کہ میں نے اس وقت رسول اکرم علیہ السلام کو غسل کرتے پایا، جب کہ آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ پردہ کئے کھڑی تھیں، فرماتی ہیں کہ میں نے سلام کیا، آپ نے سوال فرمایا کہ یہ کون عورت ہے؟ میں نے عرض کیا میں ام ہانی ہوں ابو طالب کی بیٹی! چنانچہ آپ نے کہا ام ہانی کو خوش آمدید ہو، پھر جب آپ غسل سے فارغ ہو گئے تو آپ نے ایک کپڑا لپیٹ کر آٹھ رکعت نماز ادا کی، جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میرے ماں جائے بھائی یعنی حضرت علیؓ یہ کہتے ہیں کہ وہ اس شخص کو قتل کر سکتے ہیں، جس کو میں نے پناہ دی ہے، یعنی فلاں بن ہبیرہ کو، جب کہ ان سے اس قسم کی توقع نہیں تھی، کہ میں جس کو پناہ دوں وہ اسے قتل کرنا چاہیں، یہ سن کر رسول اکرم علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اے ام ہانی! جس شخص کو تم نے پناہ دیدی اس کو ہم نے بھی پناہ دیدی، ام ہانی نے فرمایا کہ یہ چاشت کا وقت تھا۔ حضرت سعید بن المسیب حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک سائل نے رسول اکرم علیہ السلام سے ایک کپڑے میں نماز ادا کرنے کے بارے میں سوال کیا، تو رسول اکرم علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا تم میں سے ہر ایک کے پاس دو دو کپڑے ہیں؟

**مقصد ترجمہ** پچھلے ابواب میں ایک کپڑے میں نماز ادا کرنے کی ایک صورت گزر چکی ہے کہ گردن پر تہمد کی گرہ لگائی جائے، یہ اس کپڑے کے بارے میں ہدایت کی گئی تھی، جس میں لپیٹ لینے کی گنجائش نہ ہو، لیکن اگر کپڑے میں گنجائش ہو تو اس کے لئے اس باب میں دوسرا طریقۂ استعمال بیان کر رہے ہیں، کہ اس کو لپیٹ لیا جائے، یہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی دوسری صورت ہے کہ بغیر گرہ لگائے ہوئے اس کو دونوں شانوں پر ڈال لیا جائے۔

**قال الزّھری الخ** زہری کا قول نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سلسلہ میں روایات میں مختلف تعبیرات منقول ہیں، کہیں التحاف کا لفظ ہے، کہیں توشح کی تعبیر ہے، کہیں مخالفت بین الطرفین کہا گیا ہے، کہیں اشتمال علی المنکبین کے الفاظ آئے ہیں، روایات کے اس اختلاف کو دیکھنے والا دھوکہ کھا سکتا ہے کہ ایک کپڑے کے استعمال کی چار تعبیریں ذکر کی گئی

ہیں، شاید اس کی صورتیں بھی الگ الگ ہوں گی، لیکن جب سوچتا ہے تو مصداق میں فرق کرنے سے عاجز رہتا ہے۔ امام بخاریؒ نے زہریؒ کے کلام سے اس خلجان کو رفع کردیا کہ تعبیرات کا یہ فرق محض لفظی ہے، عمل کی صورتیں مختلف نہیں ہیں، چنانچہ زہریؒ کہتے ہیں " الملتحف المتوشح "معلوم ہوا کہ التحاف اور توشح ایک ہی چیز ہے، آگے کہتے ہیں "هو المخالف بين طرفيه على عاتقيه" یعنی توشح کا مطلب یہ ہے کہ کپڑے کے داہنے گوشہ کو بائیں کاندھے پر اور بائیں گوشے کو داہنے کاندھے پر ڈال لیا جائے، پھر آگے کہتے ہیں کہ اسی کو اشتمال بھی کہتے ہیں، معلوم ہوا کہ ان مختلف تعبیرات کا مصداق ایک ہی ہے۔

## عمر بن ابی سلمہ کی تین روایتیں

بخاریؒ نے ترجمہ کے ذیل میں پہلے حضرت عمر بن ابی سلمہ کی تین روایتیں ذکر کی ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک کپڑا لپیٹ کر نماز ادا کی، بخاریؒ کا مدعا ثابت ہوگیا۔

پہلی روایت کی سند عالی ہے، اس میں بخاری اور راوی حدیث حضرت عمر بن ابی سلمہ کے درمیان تین واسطے ہیں، اور دوسری اور تیسری روایت میں چار، سوال یہ ہے کہ ایک عالی سند کے بعد دوبارہ اسی روایت کو سافل سند کے ساتھ ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اصل یہ ہے کہ پہلی روایت کی سند گو عالی ہے لیکن راوی نے سرکار رسالت مآب ﷺ سے جو روایت کی ہے اس میں مشاہدہ کی تصریح نہیں ہے، بخاریؒ نے دوسری سافل سند ذکر کر کے مشاہدہ کی تصریح نقل کردی، کہ راوی نے جو روایت سرکار دوعالم ﷺ سے کی ہے، وہ مشاہدہ کے بعد کی ہے، اس کے بعد پھر وہی روایت تیسری بار سافل سند کے ساتھ بخاریؒ نے ذکر کی ہے، اس کا فائدہ یہ ہے کہ پہلی دونوں روایتوں میں حضرت عروہ نے حضرت عمر بن ابی سلمہ سے بصیغۂ عن روایت کی ہے، تیسری روایت سند سافل سے ذکر کر کے بخاریؒ نے عنعنہ کے بجائے سماع کی تصریح نقل کردی، کیوں کہ عنعنہ میں احتمال کے درجہ میں انقطاع کا شائبہ رہ جاتا ہے۔ واللہ اعلم

## حضرت ام ہانیؓ کی روایت

اس سلسلہ میں چوتھی روایت امام بخاریؒ نے حضرت ام ہانیؓ کی پیش کی ہے، اس روایت میں آیا کہ فتح مکہ کے دن رسول اکرم ﷺ نے غسل فرمایا، غسل کے درمیان ام ہانیؓ خدمت اقدس میں حاضر ہوئیں، اس وقت حضرت فاطمہؓ پردہ لئے کھڑی تھیں، حضرت ام ہانیؓ نے سلام عرض کیا، آپ نے معلوم کیا یہ کون عورت ہے؟ انہوں نے عرض کیا ام ہانی! کہتی ہیں کہ غسل کے بعد رسول اکرم ﷺ نے آٹھ رکعت ادا فرمائیں اور اس وقت آپ صرف ایک کپڑا پہنے ہوئے تھے۔ بخاری کا مقصد صرف اسی جزء سے متعلق ہے کہ آپ نے صرف ایک کپڑا لپیٹ کر آٹھ رکعت ادا کی ہیں، بعض حضرات نے ان رکعات کو فتح کے شکرانہ کی نماز قرار دیا ہے اور بعض نے اس کو چاشت کی نماز سمجھا ہے، وقت البتہ چاشت ہی کا تھا۔

نماز کے بعد حضرت ام ہانی نے سرکار دوعالم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ میرا ماں جایا بھائی یعنی حقیقی بھائی حضرت علیؓ کہتے ہیں کہ جس شخص کو میں نے پناہ دیدی ہے وہ اس کو قتل کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں، یعنی میں نے ابن ہبیرہ کو

پناہ دیدی ہے، لیکن وہ میری اس پناہ کو تسلیم نہیں کرتے، غالباً حضرت علیؓ نے سوچا ہوگا کہ چونکہ عورت کو سیاسی معاملات میں بصیرت نہیں ہوتی؛ اس لیے کوئی ضروری نہیں کہ اس کی پناہ کو تسلیم کیا جائے۔ لیکن جب ام ہانی نے شکایت کی تو آپ نے فرمایا کہ وہ قتل نہیں کر سکتے، جس کو تم نے پناہ میں لے لیا وہ ہماری پناہ میں ہے، یعنی ہم نے تمہاری پناہ کو برقرار رکھا یعنی اگر کوئی مسلمان کسی کافر کو پناہ میں لے لے، خواہ یہ مسلمان کسی طبقہ کا فرد ہو، مرد ہو یا عورت ہو، تو اس کی یہ پناہ تمام مسلمانوں کی طرف سے مانی جائے گی، اب کسی مسلمان کو اس کے جان و مال سے بلا وجہ تعرض کرنے کا حق نہ ہوگا، لیکن اگر امام اس کی پناہ کو مصلحت کے خلاف سمجھے تو پہلے اس پناہ کے ختم کرنے کا اعلان کرے گا، پھر اس کو اتنا موقع دے گا کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق کوئی فیصلہ کر سکے۔

**حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت**

پانچویں روایت امام بخاریؒ نے حضرت ابو ہریرہؓ کی پیش کی ہے، اس روایت میں یہ آیا ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے ایک کپڑے میں نماز کی ادائیگی کے بارے میں سوال کیا، تو آپ نے فرمایا، کیا تم میں ہر شخص کے پاس دو دو کپڑے ہیں؟ آپ کے اس سوال کا مقصد یہ ہے کہ تم دیکھتے نہیں، ایک بدیہی اور بالکل واضح چیز کے بارے میں سوال کر رہے ہو، تمہیں سوچنا چاہئے تھا کہ اگر ایک کپڑے میں نماز جائز نہ ہوتی، تو میں ضرور انکار کرتا، لیکن نہ تو میں نے ان کے اس فعل پر انکار کیا اور نہ ہی اس کی تفتیش کی کہ یہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے والا فاقد ثوب ہے، یا واجد ثوب؟ لہٰذا نتیجہ ظاہر ہے کہ ایک کپڑے میں نماز کا عمل جب کہ وہ ساتر عورت ہو، واجد ثوب کے حق میں بھی ایسا ہی صحیح ہے، جیسا کہ فاقد ثوب کے حق میں صحیح تھا۔ یہیں سے ایک اصول مستنبط ہوتا ہے کہ اگر سرکار رسالت مآب ﷺ کسی ایک شخص کو کسی چیز کی اجازت دیں تو وہ چیز سب کے لیے جائز ہوگی، جب تک کہ اس حکم کی خصوصیت اس شخص کے ساتھ کسی دلیل سے ثابت نہ ہو جائے، اس لیے معلوم ہوا کہ اس سلسلے میں وسعت اور تنگی کا فرق نہیں، دو کپڑے میسر ہوں یا نہ ہوں ہر کسی کے لئے صرف ایک کپڑے میں نماز کا جواز ہے، کیوں کہ نماز میں کپڑوں کی تعداد پر کوئی انحصار نہیں ہے، ستر عورت شرط ہے؛ البتہ مستحب یہ ہے کہ بشرط گنجائش ایک سے زائد کپڑے استعمال کئے جائیں۔　　　　واللہ اعلم

## [۵] بَابٌ اِذَا صَلّٰى فِى الثَّوْبِ الْوَاحِدِ فَلْيَجْعَلْ عَلٰى عَاتِقَيْهِ

(۳۵۹) حَدَّثَنَا اَبُوْ عَاصِمٍ عَنْ مَالِكٍ عَنْ اَبِى الزِّنَادِ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا يُصَلِّىْ اَحَدُكُمْ فِى الثَّوْبِ الْوَاحِدِ لَيْسَ عَلٰى عَاتِقِهٖ شَيْءٌ.　　(آئندہ: ۳۶۰)

(۳۶۰) حَدَّثَنَا اَبُوْ نُعَيْمٍ قَالَ حَدَّثَنَا شَيْبَانُ عَنْ يَحْيٰى بْنِ اَبِىْ كَثِيْرٍ عَنْ عِكْرَمَةَ قَالَ

سَمِعْتُهُ اَوْكُنْتُ سَأَلْتُهُ قَالَ سَمِعْتُ اَبَاهُرَيْرَةَ يَقُوْلُ أَشْهَدُ اَنِّى سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ صَلَّى فِي ثَوْبٍ وَّاحِدٍ فَلْيُخَالِفْ بَيْنَ طَرَفَيْهِ . (گذشتہ:۳۵۹)

**ترجمہ** باب، جب کوئی شخص ایک کپڑے میں نماز پڑھے تو اس کا کچھ حصہ اپنے کاندھوں پر ڈال لے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص ایک کپڑے میں اس وقت تک نماز نہ پڑھے جب تک کہ اس کے کاندھوں پر اس کپڑے کا کوئی حصہ نہ ہو۔ یحییٰ بن ابی کثیر حضرت عکرمہ سے راوی ہیں کہ میں نے حضرت عکرمۃ سے سنا، یا میں نے حضرت عکرمہ سے سوال کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے حضرت ابو ہریرہؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ایک کپڑے میں نماز پڑھے تو اس کا دایاں گوشہ بائیں طرف اور بایاں گوشہ داہنی طرف ڈال لے۔

**مقصد ترجمہ** بخاریؒ کے ترجمہ کے الفاظ کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ایک کپڑے میں نماز ادا کرنے کی نوبت آرہی ہے، تو احتیاط اس میں ہے کہ اس کپڑے کو اپنے دونوں کاندھوں پر ڈال لیا جائے، اس طرح ایک تو پورا بدن ڈھک جائے گا، اور دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ اس کپڑے کے گرجانے یا کھل جانے کا اندیشہ بھی نہ رہے گا، یہ بات اگر چہ سابق احادیث کے ضمن میں بھی معلوم ہوگئی تھی، لیکن بخاریؒ نے علیحدہ عنوان قائم کر کے اس حکم کو مستقل طور پر بیان کر دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ارشاد فرمایا کہ اس ترجمہ کا مقصد اس حکم کے متعلق استحباب کی طرف اشارہ کرنا ہے، امام احمد کے علاوہ ائمہ ثلاثہ اور جمہور کے نزدیک یہ حکم استحبابی ہے، امام احمدؒ سے منقول ہے کہ اگر تہبند کے بعد کاندھوں کے ستر کی بھی گنجائش ہو تو شانہ کھول کر نماز درست نہ ہوگی، کم از کم ایک شانہ ڈھک لینا ضروری ہے، کیوں کہ حدیث میں " لایُصلی " فرمایا گیا ہے، امام احمد نے اس نہی کو نہی تحریمی قرار دیا ہے، جمہورؒ کے نزدیک یہ نہی تنزیہی ہے، اب اگر امام بخاریؒ کے ترجمہ کے الفاظ " فليجعل "، میں امر کو امر وجوبی قرار دیں تو اس صورت میں وہ امام احمد کی موافقت میں ہیں، لیکن یہ ضروری نہیں، ہوسکتا ہے کہ امام بخاریؒ استحباب کی طرف اشارہ کر رہے ہوں، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے ارشاد فرمایا، تو اس صورت میں بخاریؒ جمہور کے ہم نوا ہوں گے۔ واللہ اعلم

## [٦] بَابُ اِذَا كَانَ الثَّوْبُ ضَيِّقاً

(۳۶۱) حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ صَالِحٍ قَالَ ثَنَا فُلَيْحُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ سَأَلْنَا جَابِرَبْنَ عَبْدِ اللهِ عَنِ الصَّلٰوةِ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ فَقَالَ خَرَجْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي بَعْضِ اَسْفَارِهِ فَجِئْتُ لَيْلَةً لِبَعْضِ اَمْرِىْ فَوَجَدْتُهُ يُصَلِّي وَعَلَيَّ ثَوْبٌ وَّاحِدٌ فَاشْتَمَلْتُ بِهِ وَصَلَّيْتُ اِلٰى جَانِبِهِ فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ مَا السُّرٰى يَاجَابِرُ فَاَخْبَرْتُهُ لِحَاجَتِيْ فَلَمَّا فَرَغْتُ قَالَ مَاهٰذَا الْإِشْتِمَالُ الَّذِىْ رَأَيْتُ قُلْتُ كَانَ ثَوْباً قَالَ فَاِنْ كَانَ وَاسِعًا فَالْتَحِفْ بِهِ وَاِنْ

كَانَ ضَيِّقاً فَاتَّزِرْبِهٖ. 　　　　(گذشتہ: ۳۵۲)

(۳۶۲) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ ثَنَا يَحْيٰى عَنْ سُفْيَانَ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَبُوْ حَازِمٍ عَنْ سَهْلٍ قَالَ كَانَ رِجَالٌ يُصَلُّوْنَ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ عَاقِدِيْ اُزْرِهِمْ عَلٰى اَعْنَاقِهِمْ كَهَيْأَةِ الصِّبْيَانِ وَيُقَالُ لِلنِّسَآءِ لَاتَرْفَعْنَ رُؤْسَكُنَّ حَتّٰى يَسْتَوِيَ الرِّجَالُ جُلُوْساً. 　　　　(آئندہ: ۸۱۴، ۱۲۱۵)

**ترجمہ** باب، جب کپڑا تنگ ہوتو مصلی کیا کرے؟ حضرت سعید بن حارث سے روایت ہے کہ ہم نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے بارے میں دریافت کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ میں ایک سفر میں رسول اکرم ﷺ کی معیت میں نکلا، پھر ایک رات میں اپنی کسی ضرورت سے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو میں نے دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں، اور صورت یہ کہ اس وقت میرے پاس ایک ہی کپڑا تھا، چنانچہ میں نے اس کپڑے کو لپیٹ لیا، اور سرکار رسالت مآب ﷺ کے پہلو میں نماز شروع کردی، جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے تو آپ نے فرمایا کہ اے جابر! رات میں آنے کی کیا وجہ ہے؟ چنانچہ میں نے آپ کی خدمت میں اپنی ضرورت عرض کی، جب میں ضرورت عرض کر چکا تو آپ نے فرمایا کہ اس طرح کپڑا لپیٹنے کا کیا مقصد ہے جو میں دیکھ رہا ہوں؟ میں نے عرض کیا کہ بس ایک ہی کپڑا تھا، آپ نے فرمایا کہ اگر کپڑا گنجائش دار ہو تو اس کو لپیٹ لیا کرو، اور اگر تنگ ہو تو اسکو تہمد بنالیا کرو۔ حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ بعض حضرات سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ اس طرح نماز پڑھتے تھے، کہ وہ بچوں کی طرح اپنے تہمد کی گرہ اپنی گردن پر لگا لیتے تھے، اور جو عورتیں پچھلی صف میں نماز پڑھتی تھیں ان سے آپ یہ فرمادیتے تھے، کہ جب تک مرد اچھی طرح بیٹھ نہ جائیں اس وقت تک وہ سجدے سے اپنے سر نہ اٹھائیں۔

**مقصد ترجمہ** باب سابق میں گزر چکا ہے کہ اگر ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کی ضرورت ہو تو اس کے دونوں گوشے دونوں کاندھوں پر ڈال لے، لیکن اگر کپڑا اتنا تنگ ہو کہ اس کو کاندھوں پر نہیں ڈالا جاسکتا، تو ایسی صورت میں کیا کرے؟ اس باب میں اسی مسئلہ کی وضاحت مقصود ہے کہ اگر کپڑا تنگ ہو تو کاندھوں پر ڈالنے کے بجائے اس کو بطور ازار استعمال کیا جائے۔

**تشریح حدیث** حضرت سعید بن حارث راوی ہیں کہ ہم نے حضرت جابرؓ سے ایک کپڑے میں نماز ادا کرنے کے بارے میں دریافت کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ غزوۂ بواط کے موقع پر رسول اکرم ﷺ نے مجھے اور جبار بن صخر کو اس غرض سے روانہ کیا کہ ہم آگے چل کر منزل پر پانی کا انتظام کریں، میں اس وقت رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا جب آپ رات میں نماز پڑھ رہے تھے، میں نے موقع کو غنیمت جانا اور نماز میں شرکت کی کوشش کی، مگر صورت یہ تھی کہ میرے پاس ایک کپڑا تھا اور وہ بھی چھوٹا تھا، کاندھوں پر نہ استعمال ہوسکتا تھا، نہ گرہ لگائی جاسکتی تھی، لیکن وہ کپڑا جھوردار تھا، اس لیے حضرت جابرؓ نے یہ صورت اختیار کی کہ کپڑے کو پلٹ کر جھور کو اوپر لیا اور

چھور کو تھوڑا اسے دبا کر نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز کے بعد آپ نے حضرت جابر سے رات میں آنے کا سبب دریافت کیا اور فرمایا کہ یہ کپڑا تم نے کس طرح استعمال کیا؟ حضرت جابر نے عرض کیا کہ حضرت ایک ہی کپڑا تھا، مقصد یہ ہے کہ کپڑا ایک تھا اور تنگ تھا، اور ایک کپڑے کے بارے میں ہدایت یہ فرمائی گئی کہ اس کو لپیٹ لیا جائے، آپ نے فرمایا کہ یہ غلطی ہے، دیکھو! اگر کپڑے میں گنجائش ہو تب تو اس کو لپیٹ لینا چاہئے، لیکن اگر کپڑا تنگ ہو اور لپیٹنا مشکل ہو تو نیچے ازار کی طرح باندھ لینا چاہئے، کیوں کہ مقصد ستر کو چھپانا ہے، اگر چھوٹے اور تنگ کپڑے کو بھی لپیٹا گیا تو ستر کھلنے کا اندیشہ رہے گا، جو درست نہیں ہے۔ واللہ اعلم

دوسری روایت میں آیا ہے کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز میں حاضر ہوتے، اس شان سے کہ گردن پر کپڑوں کی گرہ لگاتے جیسے بچوں کے کپڑے باندھ دیئے جاتے ہیں، کپڑا چھوٹا ہوتا، اس لیے قیام میں جسم ڈھکا رہتا، لیکن قیام کے بعد رکوع میں اور رکوع سے زیادہ سجود میں کپڑا کھنچتا ہے، اس لیے ممکن ہے عورت مکشوف ہو جائے، اس مصلحت سے پیچھے جو عورتیں کھڑی ہوتیں، ان کو حکم دیا گیا کہ وہ سجدے سے سر مردوں کے ساتھ نہ اٹھائیں، بلکہ جب مرد اچھی طرح بیٹھ جائیں اس وقت وہ سر اٹھائیں۔ ابو داؤد میں اس کی مصلحت یہ بیان کی گئی ہے: "خشية ان يرين عورات الرّجال" اس حکم کی مصلحت یہ تھی کہ کہیں عورتوں کی نظر مردوں کے حصہ مستور پر نہ پڑ جائے، پھر یہ صورت فتنہ کا باعث بنے۔

یہاں سے ایک مسئلہ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگر مصلی نے ستر کی حفاظت کا انتظام کر لیا اور پھر اتفاق سے کسی کی نظر اس کے حصہ مستور پر پڑ گئی تو اس سے مصلی کی نماز میں نقصان نہیں آتا، دیکھنے والے کے لیے دیکھنا درست نہیں ہے، لیکن اس کا دیکھ لینا مصلی کے لیے مفسد صلوۃ بھی نہیں ہے۔ واللہ اعلم

## [۷] بَابُ الصَّلٰوةِ فِي الْجُبَّةِ الشَّامِيَةِ

وَقَالَ الْحَسَنُ فِي الثِّيَابِ يَنْسُجُهَا الْمَجُوْسُ لَمْ يَرَ بِهَا بَأْساً. وَقَالَ مَعْمَرٌ رَأَيْتُ الزُّهْرِيَّ يَلْبَسُ مِنْ ثِيَابِ الْيَمَنِ مَاصُبِغَ بِالْبَوْلِ. وَصَلّٰى عَلِيُّ بْنُ اَبِي طَالِبٍ فِي ثَوْبٍ غَيْرِ مَقْصُوْرٍ.

(۳۶۳) حَدَّثَنَا يَحْيٰى قَالَ ثَنَا اَبُوْمُعَاوِيَةَ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ مُسْلِمٍ عَنْ مَسْرُوْقٍ عَنْ مُغِيْرَةَ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فِي سَفَرٍ فَقَالَ يَامُغِيْرَةُ خُذِ الْإِدَاوَةَ فَاَخَذْتُهَا فَانْطَلَقَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ حَتّٰى تَوَارٰى عَنِّي فَقَضٰى حَاجَتَهُ وَعَلَيْهِ جُبَّةٌ شَامِيَةٌ فَذَهَبَ لِيُخْرِجَ يَدَهُ مِنْ كُمِّهَا فَضَاقَتْ فَاَخْرَجَ يَدَهُ مِنْ اَسْفَلِهَا فَصَبَبْتُ عَلَيْهِ فَتَوَضَّاُ وُضُوْءَهُ لِلصَّلٰوةِ وَمَسَحَ عَلٰى خُفَّيْهِ ثُمَّ صَلّٰى. (گذشتہ: ۱۸۲)

**ترجمہ** باب، شامی جبہ میں نماز پڑھنا جائز ہے۔ حسن بصریؒ ان کپڑوں کے بارے میں جو آتش پرستوں کے ہاتھ کے بنے ہوں، فرماتے ہیں کہ ان میں نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ معمر کہتے ہیں کہ میں نے زہریؒ کو یمن

کے بنے ہوئے وہ کپڑے پہنے ہوئے دیکھا جن کے متعلق یہ شہرت تھی کہ وہ پیشاب میں رنگے جاتے ہیں۔ حضرت علیؓ نے کورے کپڑے میں بغیر دھوئے نماز پڑھی۔ حضرت مغیرہ بن شعبہ سے روایت ہے کہ میں رسول اکرم علیہ کے ساتھ سفر میں تھا، کہ آپ نے فرمایا کہ مغیرہ! چھاگل لے لو، چنانچہ میں نے چھاگل لے لیا، آپ چلے یہاں تک کہ آپ میری نگاہوں سے اوجھل ہوگئے، پھر آپ نے قضائے حاجت فرمائی اور اس وقت آپ شامی جبہ پہنے ہوئے تھے، پھر آپ نے یہ چاہا کہ اس جبہ کی آستین سے اپنا ہاتھ نکال لیں، لیکن جبہ کی آستین تنگ نکلی تو آپ نے آستین کے نیچے سے اپنا ہاتھ نکالا، میں نے پانی ڈالا اور آپ نے نماز کے لئے وضو فرمایا، خفین پر مسح کیا، پھر نماز ادا کی۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ دارالکفر کا بنا ہوا کپڑا مسلمان کے لیے استعمال کرنا مباح ہے، نماز میں بھی اور نماز کے علاوہ بھی، خواہ وہ کافر کے ہاتھ کا بنا ہوا ہو یا مسلمان کے ہاتھ کا، کافر یہودی، نصرانی ہو یا بت پرست، کپڑا اگر پاک ہے تو ہر حال میں اس کا استعمال درست ہے، کیوں کہ کپڑے میں استعمال کا مدار پاکی اور ناپاکی پر ہے، بننے والے کے احوال اور بننے کی جگہ پر مدار نہیں ہے۔

اور کیوں کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے، لہذا کپڑا دارالحرب کا بنا ہوا ہو یا دارالاسلام کا، اس کا استعمال اس وقت تک مباح ہوگا جب تک کہ کوئی خصوصی دلیل اس کی نجاست پر قائم نہ ہو جائے، اور خصوصی دلیل یہاں دو ہوسکتی ہیں، ایک مشاہدہ اور دوسرے مخبر صادق کی اطلاع، مشاہدہ مثلاً یہ کہ کوئی دھبہ اس کپڑے پر آجائے، اور اطلاع یہ کہ کوئی ثقہ اور معتبر آدمی یہ بتلائے کہ اس کپڑے کی تیاری میں مثلاً کلف یا مانڈی میں فلاں ناپاک چیز استعمال کی گئی ہے، بخاریؒ نے "الصلوٰة فی الجبة الشامیة" کہہ کر اسی مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے[1] کیوں کہ شام اس وقت دارالکفر تھا اور آپ نے شامی جبہ میں نماز ادا فرمائی اور یہ تفتیش نہیں کی کہ اس کا بننے والا کون ہے؟ اور اس میں کوئی ناپاک چیز تو شامل نہیں کی گئی ہے؟ رہا یہ کہ اگر یہی مسئلہ بیان کرنا تھا تو ترجمہ میں جبہ شامیہ کی قید کیوں لگادی، تو اس کے بارے میں کہا جاسکتا ہے کہ بخاری عام طور پر الفاظ حدیث کی رعایت کرتے ہوئے ترجمہ منعقد فرماتے ہیں۔

**حضرت حسنؒ کا قول** حضرت حسنؒ کا یہ قول ابونعیم نے ان الفاظ میں نقل کیا ہے "لا بأس بالصلوٰة فی الثوب الّذی ینسجه المجوس قبل ان یغسل" مجوسی کے ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑوں کے بارے میں فرمایا کہ بغیر دھوئے اس کو پہن کر نماز پڑھ لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بخاری کا مدعا ثابت ہوگیا، کہ جب تک مشاہدہ یا معتبر شہادت سے نجاست کا علم نہ ہوجائے اس وقت تک استعمال درست اور مباح ہے۔

---

[1] فیض الباری میں مولانا بدر عالم صاحب نے حضرت علامہ کشمیری کی طرف ایک دوسری بات منسوب کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ بظاہر امام بخاری اس ترجمہ میں کپڑے کی وضع قطع، تراش اور ساخت کی طرف اشارہ کررہے ہیں، کہ اگر کپڑے کی ساخت اور تراش غیر مسلموں کے طرز کی ہو تو اس کو پہن کر نماز درست ہوگی یا نہیں؟ روایت باب میں آگیا کہ رسول اکرم علیہ نے شامی جبہ میں نماز ادا کی، بخاری کا مدعا ثابت ہوگیا، کہ کپڑا اگر غیر مسلموں کی وضع وتراش کا ہو تو اس میں بھی نماز درست ہے، لیکن حضرت علامہ کشمیریؒ کی طرف یہ نسبت سمجھ میں نہیں آتی، کیوں کہ ترجمہ کے بعد دیئے گئے حضرت حسنؒ اور حضرت زہریؒ کے اقوال اس کی تائید نہیں کرتے، اور مولانا بدر عالم صاحبؒ نے بھی ترجمہ کا یہ مفہوم متعین کرکے ان اقوال کی کوئی توجیہ نقل نہیں کی۔ واللہ اعلم

**حضرت زہریؒ کا ارشاد** حضرت معمر کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت زہریؒ کو یمن کے بنے ہوئے وہ کپڑے پہنے دیکھا جن کے بارے میں پیشاب میں رنگنے کی افواہ تھی، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اشیاء میں اصل اباحت ہے، جب تک کوئی خصوصی دلیل ان کی نجاست پر قائم نہ ہو جائے، یمن سے جو کپڑے تیار ہو کر عرب میں درآمد کئے جاتے تھے، ان کے بارے میں ایک افواہ یہ تھی، کہ ان کی تیاری میں جانوروں کا پیشاب استعمال کیا جاتا ہے، جیسا کہ آج کل بھی بعض کپڑوں میں آب دینے کی غرض سے چربی کے استعمال کی شہرت ہے، حضرت معمر نے تو صرف استعمال ہی نقل فرمایا ہے، نماز کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن ظاہر یہی ہے کہ وہ نماز بھی انہیں کپڑوں میں ادا فرماتے ہوں گے، معلوم ہوا کہ حضرت زہریؒ نے اس افواہ یا شہرت کا اعتبار نہیں کیا بلکہ استعمال فرماتے رہے، کیوں کہ نہ تو کوئی ظاہری علامت نجاست کی موجود تھی اور نہ کسی مخبر صادق ہی نے خبر دی تھی، صرف افواہ کے درجہ میں ایک بات گشت کر رہی تھی۔

شارحین نے لکھا ہے کہ اگر البول سے مراد جنس بول ہے تو معمر کے قول کا مطلب یہ ہے کہ حضرت زہریؒ دھونے کے بعد ان کپڑوں کو استعمال کرتے تھے، یا پھر ان جانوروں کا پیشاب مراد ہے، جن کا گوشت کھایا جاتا ہے، اس لیے کہ زہریؒ "بول ما یو کل لحمهٗ" کی طہارت کے قائل تھے، لیکن یہ توجیہ "القول بما لا یرضی به قائلهٗ" کے قبیل سے ہے، اس لیے کہ اگر عام بول مراد ہو اور حضرت زہریؒ کے اس عمل کا یہ مطلب قرار دیں کہ وہ دھونے کے بعد استعمال فرماتے تھے، تو اس میں حضرت زہریؒ کی کیا خصوصیت ہوئی؟ سب ہی کے نزدیک بالاتفاق ایسے کپڑے دھونے کے بعد قابل استعمال ہیں، اور اگر "بول ما یو کل لحمهٗ" مراد لیں، تو حضرت علامہ کشمیریؒ نے مصنف عبد الرزاق کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے کہ زہریؒ نجاستِ ابوال کے قائل ہیں۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت زہریؒ کا خیال یہ ہو کہ کپڑا ابھی ان چیزوں میں سے ہے جن پر طہارت ونجاست کا حکمِ شرعی تیاری کے بعد لگایا جاتا ہے، تیاری کے دوران جو بھی حالات گزریں شریعت ان کا اعتبار نہیں کرتی، جیسے کفش دوز جوتا بناتا ہے، ایک ہی کونڈی میں سڑا ہوا پانی رہتا ہے، اسی پانی میں چمڑا دھاگا اور سب کچھ بھگوتا جاتا ہے، تیاری کے دوران کسی طرح کی احتیاط نہیں برتی جاتی۔ یا مثلاً شکر ہے، گنے کا رس بغیر کسی احتیاط کے نکالا جاتا ہے، پھر اس کو گرم کیا جاتا ہے، کیڑے مکوڑے گرم بھاپ سے مر کر اسی رس میں ملتے رہتے ہیں، ایک مرحلہ ایسا بھی آتا ہے، کہ مزدور اس کو پیروں سے کھوندتے ہیں، پیروں کے میل کے علاوہ کبھی خون بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے۔ یا مثلاً گیہوں پر دائیں چلاتے ہیں، بیل پیشاب بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن ان چیزوں پر شریعت نے تیاری کے بعد طہارت کا حکم دیا ہے، تیاری کے زمانہ کے احوال کا شریعت نے کوئی اعتبار نہیں کیا۔

اس لئے ہو سکتا ہے کہ حضرت زہری کا خیال یہ ہو کہ کپڑا ابھی انہیں چیزوں میں سے ہے، پھر اگر درمیانی حالات میں بول کا استعمال کیا بھی جاتا ہے، تو اس میں کیا مضائقہ ہے، شریعت تو تیاری کے بعد طہارت کا حکم دیتی ہے، حضرت زہریؒ کے استعمال کی ایک توجیہ یہ بھی ہے، شیخ الاسلام الدہلویؒ نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

**حضرت علیؓ کا عمل** حضرت علیؓ نے کورے کپڑے میں نماز پڑھی، جس میں مانڈی لگی ہوئی تھی، یعنی وہ کپڑا بالکل نیا اور کورا تھا، حضرت علی نے بغیر دھوئے اس کپڑے میں نماز ادا کی، مطلب یہی ہے کہ انہوں نے تحقیق حال کی ضرورت نہیں سمجھی، کیوں کہ بظاہر کوئی نجاست نہیں ہے اور نجاست پر کوئی معتبر شہادت بھی نہیں ہے، اس لیے ایسے کپڑے کو پاک قرار دیا جائے گا۔

**حدیث باب** روایت میں آیا کہ رسول اکرم ﷺ نے شامی جبہ میں نماز ادا فرمائی، بخاری نے اس سے اپنے مدعا پر اس طرح استدلال کیا ہے، کہ آپ نے جبہ استعمال فرمایا اور یہ دریافت نہیں کیا کہ یہ کس نے بنایا ہے؟ اور اس کی تیاری میں کوئی ناپاک چیز تو شامل نہیں کی گئی؟ اس کے ساتھ یہ بھی کہیں مذکور نہیں کہ آپ نے اس کو دھویا یا دھلوایا ہو، معلوم ہوا کہ ان چیزوں کی تحقیق میں جانے کی ضرورت نہیں، بلکہ بلاد کفار سے جو کپڑے درآمد کیے جاتے ہیں اگر ظاہری آثار اور مخبر صادق کی اطلاع اس کی نجاست پر نہ ہوں، تو ان کے استعمال میں مضائقہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

## [۸] بَابُ كَرَاهِيَةِ التَّعَرِّيْ فِي الصَّلٰوةِ وَغَيْرِهَا

(۳۶۴) حَدَّثَنَا مَطَرُبْنُ الْفَضْلِ قَالَ ثَنَا رَوْحٌ قَالَ ثَنَا زَكَرِيَّا بْنُ اِسْحٰقَ قَالَ ثَنَا عَمْرُوْ بْنُ دِيْنَارٍ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ يُحَدِّثُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَنْقُلُ مَعَهُمُ الْحِجَارَةَ لِلْكَعْبَةِ وَعَلَيْهِ اِزَارُهٗ فَقَالَ لَهُ الْعَبَّاسُ عَمُّهٗ يَاابْنَ اَخِيْ لَوْ حَلَلْتَ اِزَارَكَ فَجَعَلْتَ عَلٰى مَنْكِبَيْكَ دُوْنَ الْحِجَارَةِ قَالَ فَحَلَّهٗ فَجَعَلَهٗ عَلٰى مَنْكِبَيْهِ فَسَقَطَ مَغْشِيًّا عَلَيْهِ فَمَا رُاِىَ بَعْدَ ذٰلِكَ عُرْيَانًا۔ (آئندہ: ۱۵۸۲، ۳۸۲۹)

**ترجمہ** باب، نماز میں اور نماز کے علاوہ برہنگی کی کراہت کا بیان۔ حضرت عمرو بن دینار سے روایت ہے کہ میں نے حضرت جابر بن عبداللہ کو یہ حدیث بیان کرتے سنا ہے کہ رسول اکرم ﷺ قریش کے ساتھ کعبہ کی تعمیر کے لیے پتھر لے جاتے تھے، اس وقت آپ کے جسم پر آپ کا ازار تھا، اس وقت آپ کے چچا حضرت عباسؓ نے آپ سے کہا برادرزادے! اگر تم اپنا یہ ازار کھول لو اور اس کو اپنے کاندھوں پر پتھروں کے نیچے رکھ لو تو تمہیں سہولت ہو جائے، چنانچہ آپ نے ازار کھولا اور اس کو اپنے کاندھوں پر ڈال لیا، لیکن فوراً ہی آپ بے ہوش ہو کر گر پڑے، پھر اس کے بعد آپ کو کبھی برہنہ نہیں دیکھا گیا۔

**مقصد ترجمہ** برہنگی نماز اور غیر نماز دونوں حالتوں میں ممنوع ہے، نماز کی حالت میں تو ظاہر ہے، لیکن نماز کے علاوہ بھی بلاضرورت ستر کا برہنہ رکھنا شرعاً ممنوع ہے، بخاری جو روایت اس کے ذیل میں لا رہے ہیں، اس میں خارج صلوٰۃ کا واقعہ ہے، بخاری کا استدلال اس طرح ہے، کہ جب نماز کے علاوہ بھی اس قدر اہتمام ہے تو نماز میں بدرجہ اولی اس کی ضرورت ثابت ہوگئی۔

**حدیث باب** بخاریؒ نے واقعہ نقل کر دیا کہ قریش نے بیت اللہ کی تعمیر شروع کی تو اس میں تمام لوگ پتھر لانے میں شریک تھے، ان کے ساتھ نبی اکرم ﷺ دور سے پتھر اٹھا کر لا رہے تھے، اس وقت آپ ازار باندھے ہوئے تھے، پتھر چونکہ کھردرا ہوتا ہے، نوکیلا بھی ہوتا ہے، اونچا نیچا بھی ہوتا ہے، اس لیے ایک وزنی چیز کو اس طرح لانے میں کندھے زخمی ہونے کا اندیشہ تھا، حضرت عباسؓ نے جو آپ کے چچا تھے، از راہ شفقت یہ فرمایا کہ تہمد کھول کر کاندھے پر رکھ لو، پھر اس پر پتھر لاؤ، تا کہ کاندھے کو کوئی گزند یا زخم نہ پہنچے، آپ نے چچا کی بات کو مان لیا اور تہمد کھول کر اس جگہ رکھنا چاہا کہ فوراً ہی بے ہوش ہو کر گر گئے۔

راوی کہتے ہیں کہ اس کے بعد کبھی آپ کو برہنہ نہیں دیکھا گیا، نہ نبوت سے پہلے نہ نبوت کے بعد، بخاری کا مدعا ثابت ہو گیا، کہ نماز کا تو معاملہ ہی بہت اہم ہے، اس ایک واقعہ کے علاوہ نبوت سے پہلے یا نبوت کے بعد نماز اور غیر نماز کسی بھی حالت میں آپ کو برہنہ نہیں دیکھا گیا، معلوم ہوا کہ برہنگی ہر حال میں ممنوع ہے۔

رہا یہ کہ یہ واقعہ کیوں اور کب پیش آیا؟ تو زہریؒ نے فرمایا کہ قریش کے ہاتھوں تعمیر بیت اللہ کے وقت آپ بالغ نہ ہوئے تھے، ابن بطال اور ابن التین نے بھی اس کی تصریح کی ہے کہ اس وقت عمر شریف پندرہ سال تھی، اس اعتبار سے کشف ازار کا معاملہ کوئی اعتراض کی بات ہی نہیں، لیکن چونکہ یہ آپ کی شان کے خلاف تھا، اس لیے فوراً بے ہوشی طاری کر دی گئی؛ تا کہ اس چیز پر تنبیہ ہو جائے کہ برہنگی لوگوں کے سامنے اہم سے اہم ضرورت کے موقع پر بھی ناجائز ہے۔ اور چونکہ رسالت سے قبل انبیائے کرام کے لیے وحی کا سلسلہ تو ہوتا نہیں، اسی طرح منجانب اللہ تربیت دی جاتی ہے، کہ جہاں کوئی اس طرح کی صورت پیش آئی تنبیہ کر دی گئی، چنانچہ اسی واقعہ کا ایک جزیہ بھی ہے کہ آپ بے ہوش ہو کر گرے، آسمان کی طرف آپ کی نظر اٹھی اور آپ یہ فرماتے رہے کہ میرا تہمد جلدی دو۔

لیکن بناء کعبہ کے سلسلہ میں بعض دوسرے اقوال بھی ہیں، کسی نے کہا کہ یہ واقعہ آپ کی بعثت سے پانچ سال قبل کا ہے، کسی نے کہا کہ یہ تعمیر کا واقعہ سرکار دو عالم ﷺ کے حضرت خدیجہؓ سے نکاح فرمانے کے دس سال بعد کا ہے، ان اقوال کی بنا پر اس وقت آپ کی عمر شریف پینتیس سال ہوگی لیکن اول تو یہ واقعہ قبل النبوت کا ہے، جس پر فوراً تنبیہ کر دی گئی، جب کہ عرب میں یہ چیز کچھ زیادہ معیوب نہ تھی، نیز یہ کہ حضرت عباسؓ نے صرف تہمد ہی تو کھول کر کاندھے پر رکھنے کا مشورہ دیا تھا، کرتہ کا تو اس میں ذکر نہیں، اس لیے ضروری نہیں کہ اس صورت میں کامل برہنگی ہوئی ہو، لیکن چونکہ اتنی بات بھی آپ کی شان سے فروتر تھی، اس لیے فوراً تنبیہ ہوئی اور آسمانی اشارے یا سلامت طبع کے تحت فوراً آپ بے ہوش ہو گئے اور تہمد باندھ لیا۔ واللہ اعلم

## [۹] بَابُ الصَّلٰوةِ فِي الْقَمِيْصِ وَالسَّرَاوِيلِ وَالتُّبَّانِ وَالْقَبَاءِ

(۳۶۵) حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ أَيُّوْبَ عَنْ مُحَمَّدٍ عَنْ أَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَامَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَسَأَلَهُ عَنِ الصَّلٰوةِ فِي الثَّوْبِ الْوَاحِدِ فَقَالَ أَوَ

كُلُّكُمْ يَجِدُ ثَوْبَيْنِ؟ ثُمَّ سَأَلَ رَجُلٌ عُمَرَ فَقَالَ إِذَا وَسَّعَ اللهُ فَأَوْسِعُوْا جَمَعَ رَجُلٌ عَلَيْهِ ثِيَابَهُ صَلَّى رَجُلٌ فِي إِزَارٍ وَرِدَآءٍ، فِي إِزَارٍ وَ قَمِيْصٍ، فِيْ إِزَارٍ وَقَبَآءٍ، فِيْ سَرَاوِيلَ وَرِدَاءٍ، فِيْ سَرَاوِيْلَ وَقَمِيْصٍ، فِيْ سَرَاوِيْلَ وَقَبَآءٍ، فِيْ تُبَّانٍ وَقَبَاءٍ، فِيْ تُبَّانٍ وَقَمِيْصٍ، قَالَ وَاَحْسِبُهُ قَالَ فِيْ تُبَّانٍ وَرِدَآءٍ. (گذشتہ: ۳۵۸)

**ترجمہ** باب، قمیص، پائجامہ، جانگیے اور قباء میں نماز کے جواز کا بیان۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے، آپ نے فرمایا کہ تم میں سے ہر شخص کو دو کپڑے حاصل ہیں؟ پھر کسی شخص نے حضرت عمرؓ سے یہی سوال کیا تو انہوں نے فرمایا کہ جب اللہ تعالیٰ وسعت عطا فرمائے تو اس وسعت کا اظہار کرو، چاہئے کہ لوگ اپنے جسم پر اللہ کے دیئے ہوئے کپڑے استعمال کریں، چاہئے کہ نماز پڑھیں ازار اور چادر میں، ازار اور قمیص میں، ازار اور قباء میں، پائجامہ اور چادر میں، پائجامہ اور قمیص میں، پائجامہ اور قباء میں، جانگیے اور قباء میں، جانگیے اور قمیص میں، ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں، حضرت عمرؓ نے اسی کے ساتھ جانگیے اور چادر میں ادائیگی کے بارے میں بھی فرمایا تھا۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ یہ بات تو طے ہوگئی کہ نماز کے لئے ستر پوشی ضروری ہے، اب یہ بتلا رہے ہیں کہ اس ستر کے لیے نہ تو عدد ضروری ہے کہ کپڑے دو یا تین ہوں، نہ کسی نوعیت کی قید ہے کہ فلاں قسم کے کپڑے سے ستر کیا جائے، بلکہ نماز کی صحت کے لیے صرف ستر عورت کی ضرورت ہے، خواہ کپڑوں کا عدد کچھ ہو، خواہ نوعیت کے اعتبار سے کسی طرح کے ہوں، اس کے لئے امام بخاریؒ نے عنوان رکھا ہے، کہ نماز قمیص میں ہو جاتی ہے، پائجامہ میں بھی ہو جاتی ہے اور جانگیا اور چادر میں بھی ہو جاتی ہے، یعنی نہ سلے اور بغیر سلے کپڑے کی شرط ہے اور نہ یہ شرط ہے کہ سلا ہوا کپڑا فلاں طرح کا اور اتنے عدد ہو۔

**تشریح حدیث** حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ کیا تم میں سے سب کے پاس دو کپڑے ہیں، اتنی بات گذر چکی ہے، اس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کسی نے[1] یہی سوال کیا، تو حضرت عمرؓ نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جب خداوند کریم نے لباس کے معاملہ میں وسعت دی ہے، یعنی ایک سے زائد کپڑے موجود ہیں، تو تمہیں

[1] حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ یہ سائل حضرت عبداللہ بن مسعودؓ ہو سکتے ہیں، اس لیے کہ حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت اُبی ابن کعب کے درمیان ایک کپڑے میں نماز پڑھنے کے سلسلے میں اختلاف ہو گیا تھا، اُبی فرماتے تھے: کہ ایک کپڑے میں نماز پڑھنا درست ہے، یعنی مکروہ نہیں ہے، اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے تھے کہ ایک کپڑے میں نماز کی ادائیگی کی اجازت اس وقت کی بات ہے، جب کپڑے بہت کم تھے، چنانچہ حضرت عمر نے منبر پر ارشاد فرمایا کہ بات صحیح وہ ہے جو اُبی کہتے ہیں، لیکن حضرت ابن مسعودؓ نے بھی کوتاہی نہیں کی، علامہ عینیؒ نے اس پر تبصرہ یہ کیا ہے، کہ حضرت اُبی اور حضرت ابن مسعودؓ کے اختلاف سے یہ لازم نہیں آتا کہ سائل حضرت ابن مسعودؓ ہی ہوں، یہ بھی ہو سکتا ہے، کہ سوال حضرت اُبی نے فرمایا ہو۔ واللہ اعلم

وسعت کا اظہار کرنا چاہئے، اس طرح کے عمل میں اظہار نعمت کے علاوہ ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ مصلی کے ساتھ قیام وقعود اور رکوع وسجود میں وہ کپڑے بھی شریک نماز رہیں گے، جیسا کہ روایات سے ثابت ہے، تو لامحالہ بہ معیتِ مصلی ان کی وجہ سے مصلی کے ثواب میں اضافہ ہوگا، اس اصول پر لباس جس قدر زیادہ ہوگا اسی قدر ثواب بھی زیادہ ہوگا، خلاصہ یہ ہے کہ اگر چہ ایک کپڑے میں بھی نماز درست ہے، لیکن اگر کپڑے ایک سے زائد ہیں، تو زائد ہی کپڑوں سے نماز پڑھنی چاہئے۔

"جمع رجل الخ" حضرت عمر نے اس عبارت میں اپنے سابق ارشاد کی تفصیل فرمائی ہے، کہ وسعت کا اظہار اس طرح ہونا چاہئے۔ یہ صورتاً خبر ہے مگر معنی میں انشاء کے ہے، اس تفصیل میں حضرت عمرؓ نے بتلایا کہ دو کپڑے ملا کر نماز پڑھنی چاہیئے، ازار اور چادر، ازار اور قمیص، ازار اور قباء، پائجامہ اور چادر، پائجامہ اور قمیص، پائجامہ اور قباء، جانگیہ اور قباء، جانگیہ اور قمیص میں، دو دو کپڑے ملا کر نماز پڑھنی چاہئے، یہ کل آٹھ صورتیں ہیں۔

حضرت ابو ہریرۃؓ فرماتے ہیں کہ مجھے خیال ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کے ساتھ ایک نویں صورت بھی فرمائی تھی کہ جانگیہ اور چادر میں بھی دو کپڑے ملا کر نماز ادا کرنی چاہئے۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس تفصیل میں ستر کی رعایت مقدم رکھی ہے، یعنی یہ کہ کپڑوں سے مقصود چونکہ ستر پوشی ہے اس لیے دو کپڑے جو وسط جسم کے لیے ستر استعمال ہوتے ہیں، ان کو حضرت عمرؓ نے مقدم ذکر فرمایا ہے، کیوں کہ جس حصہ کا ستر ضروری ہے وہ وسط جسم ہی ہے، پھر یہ کہ جو کپڑے وسط جسم کی حفاظت کے لئے استعمال ہوتے ہیں وہ تین ہیں: ایک ازار، دوسرے سراویل، تیسرے جانگیہ، ان تینوں کپڑوں میں ازار کو سب سے مقدم ذکر کیا کیوں کہ یہ کثیر الاستعمال بھی ہے اور ساتر بھی۔

عہد نبوی میں شلوار کا استعمال بہت ہی شاذ ونادر تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں بھی اختلاف ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کبھی سراویل کا استعمال فرمایا ہے یا نہیں، ایک روایت میں خریدنا تو ثابت ہے، لیکن استعمال کی تصریح نہیں ہے، البتہ آپ نے تہمد کے مقابلہ میں اس کو استر (زیادہ چھپانے والا) فرمایا ہے، جس سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ استعمال بھی فرمایا ہوگا۔

یہاں صرف یہ بتلانا مقصود ہے کہ حضرت عمرؓ نے تین درجے فرمائے ہیں، پہلے ازار، دوسرے نمبر پر پائجامہ، اور تیسرے نمبر پر جانگیہ، جانگیہ کو سب سے آخر میں اس لیے ذکر کیا کہ اس میں ستر سب سے کم ہے، ہاں چادر یا قمیص کے ساتھ اس کا استعمال ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔

(۳۶۶) حَدَّثَنَا عَاصِمُ بْنُ عَلِيٍّ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِيْ ذِئْبٍ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ سَالِمٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ سَاَلَ رَجُلٌ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ فَقَالَ لَايَلْبَسُ الْقَمِيْصَ وَلَا

السَّرَاوِيلَ وَلَا الْبُرْنُسَ وَلَا ثَوْبًا مَسَّهُ زَعْفَرَانٌ وَلَا وَرْسٌ فَمَنْ لَمْ يَجِدِ النَّعْلَيْنِ فَلْيَلْبَسِ الْخُفَّيْنِ وَلْيَقْطَعْهُمَا حَتَّى يَكُونَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ. وَعَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِثْلَهُ. (گذشتہ: ۱۳۴)

**ترجمہ** باب، حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ سے سوال کیا کہ محرم کیا لباس پہنے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کہ محرم قمیص، پائجامہ اور بارانی کا استعمال نہ کرے، اور نہ وہ کپڑا پہنے جو زعفران یا ورس (ایک زرد رنگ دینے والی خوشبودار گھاس) سے رنگا گیا ہو، اور جس کے پاس جوتے نہ ہوں وہ خفین کا استعمال کرے، لیکن ان کو معقد شراک سے کاٹتا ہوا ٹخنوں کے نیچے لے آئے، نافع نے سرکار دو عالم ﷺ سے بواسطہ ابن عمرؓ یہی روایت کی ہے۔

**ترجمہ سے مناسبت** ترجمہ سے اس حدیث کی مناسبت یہ ہے کہ قمیص، سراویل اور بارانی کے پہننے سے عام احوال میں منع نہیں کیا گیا بلکہ صرف احرام کی حالت میں منع کیا گیا ہے، کیوں کہ احرام کی حالت میں مرد کے لیے سلے ہوئے کپڑے کا استعمال درست نہیں ہے، اس کا مفہوم یہ ہوا کہ غیر احرامی حالت میں عام طور پر ان کپڑوں کا استعمال رہتا تھا، جب عام حالات میں یہ کپڑے استعمال کئے جاتے تھے، تو ظاہر ہے کہ نماز بھی انہی کپڑوں میں ادا کی جاتی ہوگی، ورنہ اگر یہ کہا جائے کہ عام لباس تو یہی تھا، لیکن نماز کے وقت دوسرے کپڑے استعمال کئے جاتے تھے، تو یہ ایسی تنگی ہے جو شریعت نے روا نہیں رکھی، ترجمہ سے مناسبت ثابت ہوگئی کہ عام لباس میں قمیص، پائجامہ اور بارانی، میں نماز درست ہے، کسی نوع یا کسی عدد کی قید نہیں ہے۔

نیز احرام کی حالت میں منع کرنے کا مفہوم بھی صرف اسی قدر ہے کہ یہ کپڑے احرام کی حالت میں ممنوع ہیں، لیکن اگر کسی شخص نے احرام کی حالت میں ان ہی کپڑوں میں نماز پڑھ لی، تو نماز ادا ہو جائے گی، کیوں کہ نماز کی شرط صرف ستر عورت ہے، یہ الگ بات ہے کہ چونکہ ایک محذور اور ممنوع کا ارتکاب احرام کی حالت میں کیا، اس لیے اس جنایت کا فدیہ دینا ہوگا۔

ترجمہ سے مناسبت کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ حدیث میں یہ آیا ہے کہ احرام کی حالت میں قمیص، پائجامہ اور بارانی کا استعمال نہ کرے، بلکہ بلا سلے ہوئے کپڑے استعمال کرے، معلوم ہوا کہ نماز کے لیے کپڑے کا سلا ہوا ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ بغیر سلے ہوئے کپڑوں میں نماز ہو جاتی ہے، جیسا کہ احرام کی حالت میں ظاہر ہے۔

**علامہ سندھیؒ کا ارشاد** علامہ سندھیؒ نے ترجمہ کے ساتھ وجوداً و عدماً کی قید لگائی ہے، اس وقت ترجمہ کا مفہوم یہ ہوگا، کہ کیا نماز قمیص وغیرہ میں درست ہے اور بغیر قمیص وغیرہ کے نماز ادا کرنے کا کیا حکم ہے؟ چنانچہ پہلی حدیث میں یہ بات آ گئی کہ قمیص پہن کر نماز درست ہے، یہ مناسبت وجودی ہوگئی اور دوسری روایت میں یہ آ گیا کہ نماز بغیر قمیص کے بھی درست ہے، یہ مناسبت عدمی ہوگئی، لیکن ہمیں وجود و عدم کی یہ بحث تکلف معلوم ہوتی ہے، بالکل صاف بات

ہے کہ ترجمہ کا مفہوم یہ ہے کہ نماز نہ نوع ثیاب پر موقوف ہے نہ عدد پر، دونوں حدیثوں سے ترجمہ ثابت ہوگیا، یہ روایت کتاب العلم کے آخر میں گزر چکی ہے، تشریحات وہاں دیکھ لی جائیں، یہاں ترجمہ سے مناسبت بیان کر دی گئی۔ واللہ اعلم

## [۱۰] بَابُ مَايَسْتُرُ مِنَ الْعَوْرَةِ

(۳۶۷) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيْدٍ قَالَ ثَنَا اللَّيْثُ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ اَنَّهُ قَالَ نَهٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَنِ اشْتِمَالِ الصَّمَّآءِ وَاَنْ يَّحْتَبِيَ الرَّجُلُ فِيْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ لَيْسَ عَلٰى فَرْجِهٖ مِنْهُ شَيْءٌ. (آئندہ: ۱۹۹۱، ۲۱۴۴، ۲۱۴۷، ۵۸۲۰، ۵۸۲۲، ۶۲۸۴)

**ترجمہ** باب، حصہ مستور میں سے کس چیز کا چھپانا واجب ہے؟ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے کپڑے کو اس طرح لپیٹنے سے منع فرمایا ہے کہ دونوں کاندھوں میں سے ایک کاندھے پر تو اس کپڑے کو ڈال لے اور دوسری جانب کو بالکل کھلا چھوڑ دے، اور یہ کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک کپڑے میں احتباء کی شکل سے منع فرمایا ہے جب کہ اس کا عضو مستور مکشوف ہو۔

**مقصد ترجمہ** عورت جسم کا وہ حصہ ہے جو چھپایا جاتا ہے اور جس کا کھولنا انسان کے لیے شرمناک ہے، بخاری کے ترجمہ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جسم کا وہ حصہ جو عورت ہونے کی وجہ سے چھپایا جاتا ہے، اس میں سے کتنے حصے کا ستر واجب اور ضروری ہے، اب خواہ اس کو نماز کے ساتھ خاص رکھیے یا نماز اور نماز کے علاوہ ہر صورت میں عام کر دیجیے، پہلی صورت میں ترجمہ کا مطلب یہ ہوگا کہ صحت نماز کے لیے اس حصہ جسم میں جس کا نام عورت ہے کتنے حصہ کا ستر ضروری ہے؟ کہ اگر اس کا ستر نہ کیا گیا تو نماز نہ ہوگی، اور دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ خارج صلوۃ میں کتنے حصہ جسم کا ستر ضروری ہے، یعنی عورت کہ جو جمہور کے نزدیک ناف سے گھٹنے تک کا حصہ ہے، خارج صلوۃ میں کتنے حصہ کے کشف سے انسان کو غیر ساتر کہیں گے؟

گویا بتلانا یہ چاہتے ہیں کہ کشف اور ستر کا مدار کتنے حصہ پر ہے؟ آیا یہ ضروری ہے کہ ناف سے گھٹنے تک پورے حصہ کا ستر کیا جائے اور اگر صرف سوأتین (یعنی پیشاب اور پاخانے کا مقام) کا ستر کر رکھا ہو، باقی حصہ کھلا ہو تو ایسے شخص کو برہنگی کا الزام دے سکیں۔ بخاری نے بتلایا کہ عورت کے کشف اور ستر کا مدار سوأتین کے کشف اور ستر پر ہے، اگر سوأتین کھلے ہیں اور پورا جسم ڈھکا ہوا ہے تو ایسے شخص کو برہنہ کہا جائے گا اور اگر سوأتین مستور ہیں، تو پھر خواہ سارا جسم کھلا ہو، کشف ستر کا الزام نہیں دیا جا سکتا۔

نماز کا معاملہ تو گزر چکا ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ بخاری اس باب میں خارج صلوۃ کا مسئلہ بیان کرنا چاہتے

ہیں، حافظ ابن حجرؒ کی رائے یہی ہے کہ امام بخاری یہاں خارج صلوۃ کے مسئلہ سے بحث کر رہے ہیں، لیکن علامہ عینیؒ حافظ کی اس تخصیص سے مطمئن نہیں، وہ کہتے ہیں کہ نہی عام ہے، نماز میں ہو یا غیر نماز میں۔

مذکورہ بالا مقصد "مَایسْتُرمِنَ العَوْرَةِ" میں "مِنْ" کو تبعیضیہ مان کر ہے، لیکن حافظ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ دونوں اس طرف جارہے ہیں کہ "من" تبعیضیہ نہیں ہے، بیانیہ ہے، اگر "من" کو بیانیہ مانا جائے تو عبارت کا ترجمہ یہ ہوگا، کہ "مایستر" یعنی جس حصہ بدن کا ستر ضروری ہے وہ کیا ہے؟ کہ "من العورة" یعنی وہ عورت ہے، یعنی "مایستر" وہ حصہ جسم ہے، جس کو عورت کہا جاتا ہے، اس کی تفصیل آگے آرہی ہے۔

**تشریح حدیث** حدیث میں آیا کہ رسول اکرم ﷺ نے اشتمال صمّاء سے منع فرمایا ہے، اشتمال صماء کی ایک تشریح فقہاء نے کی ہے، اور دوسری اہل لغت نے، فقہاء کی بیان کردہ صورت یہ ہے کہ چادر اوڑھی اور اوپر سے دو مالا کاندھے پر ڈال لیا، جس سے جسم کا ایک حصہ بالکل کھل جائے گا، جب کہ اس کے نیچے کوئی دوسرا کپڑا نہ ہو، یہ فقہاء کی بیان کردہ تشریح ہے۔

دوسری تشریح اہل لغت نے کی ہے، اور وہ یہ کہ چادر اس طرح بدن پر لپیٹی جائے، کہ ہاتھ بھی بندھ جائیں، اور ہاتھوں کے باہر نکالنے کا کوئی راستہ نہ رہے، اس طرح لپیٹ لینے میں نقل وحرکت میں بہت دشواری ہوگی، ہاتھ نکالنے میں بہت تکلّف ہوگا اور ستر کھلنے کا قوی اندیشہ رہے گا، بہر حال ان دونوں معنی میں سے اشتمال صماء سے جو بھی مراد لیا جائے، حدیث میں نہی کا مقصد ستر کی رعایت ہے۔

"وان یجتبی الرّجل الخ" حدیث کا یہ جزء اس مدعا کو واضح کر رہا ہے، کہ کشف اور ستر کا مدار سوأتین پر ہے، کیوں کہ احتباء کا مطلب یہ ہے کہ سرین پر بیٹھا ہوا گھٹنوں کو پیٹ سے ملا کر ہاتھ یا کپڑے سے اس کی بندش کر لے۔

حدیث میں منع کیا گیا کہ کپڑے سے اس طرح احتباء جب کہ شرمگاہ کھلی رہ جائے، ممنوع ہے، گھٹنے اٹھا کر چادر لپیٹ لی اور شرمگاہ کو کھلا چھوڑ دیا، تو کہا جائے گا کہ جس حصہ کا ستر ضروری تھا اس کو کھلا چھوڑ دیا اور جس حصہ کا ستر ضروری نہ تھا اس کو ڈھک لیا۔ معلوم ہوا کہ کشف وستر کا مدار سوأتین پر ہے۔ واللہ اعلم

**(۳۶۸) حَدَّثَنَا قَبِيْصَةُ بْنُ عُقْبَةَ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيٰنُ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ قَالَ نَهَى النَّبِیُّ ﷺ عَنْ بَيْعَتَيْنِ عَنِ اللِّمَاسِ وَالنِّبَاذِ وَاَنْ يَّشْتَمِلَ الصَّمَّآءَ وَاَنْ يَّحْتَبِیَ الرَّجُلُ فِیْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ.** (آئندہ: ۵۸۴، ۵۸۸، ۱۹۹۳، ۲۱۴۵، ۲۱۴۶، ۵۸۱۹، ۵۸۲۱)

**ترجمہ** حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے دو طرح کی بیع، بیع ملامسہ اور بیع منابذہ سے منع فرمایا ہے اور ایک ہی کپڑے میں احتباء سے منع فرمایا ہے۔

**تشریح حدیث** بیع وشراء کے یہ دو طریقے جن میں ایک کا نام نباذ یا منابذہ ہے اور دوسرے کا لماس یا ملامسہ ہے، ایام جاہلیت میں رائج تھے، لیکن چونکہ یہ جوئے یا قمار کی شکل میں تھے، اس لیے شریعت نے ان سے منع

فرمادیا، بیع لماس کی شکل یہ تھی، کہ مثلاً کپڑے کی دوکان پر مشتری اور بائع کے درمیان زبانی بات چیت ہوگئی، قیمت طے ہوگئی، اب مشتری نے آنکھ بند کر کے اپنا ہاتھ جس تھان پر رکھ دیا وہی تھان اس مقرر شدہ قیمت میں اس کا ہوگیا، نہ بائع کو یہ اختیار ہے کہ وہ مشتری سے یہ کہہ سکے کہ یہ تھان بہت عمدہ ہے، ان داموں میں نہیں دیا جاسکتا، نہ مشتری ہی کو خیار عیب یا خیار رویت ہے، جس حال میں بھی ہو بس یہی تھان مشتری کو لینا ہوگا۔

اسی طرح نباذ کا طریقہ یہ تھا کہ زبانی بات چیت اور قیمت طے ہونے کے بعد بائع نے آنکھ بند کر کے جو تھان مشتری کی طرف پھینک دیا، وہی مشتری کا ہوگیا، خواہ وہ اعلیٰ قسم کا ہو یا گھٹیا ہو، یہ دونوں طریقے قمار میں داخل ہیں، اس لیے شریعت نے ان دونوں کو حرام قرار دیدیا۔ اس جزء سے ترجمہ کا کوئی تعلق نہیں۔

"وان یشتمل الصمّآء الخ" اشتمال صماء اور احتباء دونوں کی تشریح گزر چکی ہے۔ ترجمۃ الباب کا اثبات اس طرح ہے کہ لباس کا مقصد ستر پوشی ہے، اگر سارا جسم کھلا ہوا ہے اور ستر محفوظ ہے، تو اس شخص کو برہنگی کا الزام نہیں دیا جاسکتا؛ لیکن اگر سارا جسم ڈھکا ہوا ہے اور ستر بے پردہ ہے تو سارا لباس بے کار ہے۔

(۳۶۹) حَدَّثَنَا اِسْحٰقُ قَالَ ثَنَا یَعْقُوْبُ بْنُ اِبْرَاهِیْمَ قَالَ نَا ابْنُ اَخِیْ ابْنُ شِهَابٍ عَنْ عَمِّهٖ قَالَ اَخْبَرَنَا حُمَیْدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَانِ بْنِ عَوْفٍ اَنَّ اَبَا هُرَیْرَةَ قَالَ بَعَثَنِیْ اَبُوْبَكْرٍ فِیْ تِلْكَ الْحَجَّةِ فِیْ مُؤَذِّنِیْنَ یَوْمَ النَّحْرِ نُؤَذِّنُ بِمِنٰی اَنْ لَّا یَحُجَّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَلَا یَطُوْفَ بِالْبَیْتِ عُرْیَانٌ قَالَ حُمَیْدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَانِ ثُمَّ اَرْدَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلِیًّا فَاَمَرَهٗ اَنْ یُّؤَذِّنَ بِبَرَاءَةٍ قَالَ اَبُوْهُرَیْرَةَ فَاَذَّنَ مَعَنَا عَلِیٌّ فِیْ اَهْلِ مِنٰی یَوْمَ النَّحْرِ لَا یَحُجُّ بَعْدَ الْعَامِ مُشْرِكٌ وَلَا یُطُوْفُ بِالْبَیْتِ عُرْیَانٌ. (آئندہ: ۱۶۲۲، ۳۱۷۷، ۴۳۶۳، ۴۶۵۵، ۴۶۵۶، ۴۶۵۷)

**ترجمہ** حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ مجھے حضرت ابو بکرؓ نے حجۃ الوداع سے ایک سال قبل والے حج میں یوم النحر میں اعلان کرنے والوں کے ساتھ روانہ کیا، کہ ہم منی میں یہ اعلان کردیں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرسکے گا اور کوئی شخص برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف نہ کرسکے گا، حمید بن عبد الرحمان کہتے ہیں کہ پھر رسول اکرم ﷺ نے حضرت علیؓ کو پیچھے روانہ کیا اور انہیں حکم دیا کہ وہ سورۂ براءۃ کی ابتدائی آیات کا اعلان فرمادیں، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ نے ہمارے ساتھ منی میں نحر کے دن اعلان کیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرسکے گا اور کوئی شخص برہنہ ہو کر بیت اللہ کا طواف نہ کرسکے گا۔

**تشریح حدیث** روایت میں آیا ہے کہ طواف کے درمیان برہنگی سے منع کیا گیا، کیوں کہ "طواف البیت صلوۃ" فرمایا گیا ہے، اوپر کی روایات سے معلوم ہوا کہ برہنگی اور ستر پوشی کا مدار سوأتین کے ستر اور کشف پر ہے، اس لیے یہاں بھی وہی معنی مراد لئے جائیں گے۔

براءۃ کے اعلان کا مطلب یہ ہے کہ سورۂ براۃ کی ابتدائی آیات کا اعلان حضرت علیؓ سے کرایا گیا، ان ابتدائی آیات میں ان معاہدوں کا ذکر ہے، جو آپ کے اور دوسرے قبائل کے درمیان تھے۔

ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ ۶ھ میں جب آپ نے عمرہ کا ارادہ فرمایا اور قریش مکہ مکرمہ نے اس وقت مکہ میں نہ جانے دیا، تو حدیبیہ میں ان سے صلح ہوگئی تھی، اس صلح کی مدت معتبر روایات کے مطابق دس سال تھی، مکہ میں قریش کے علاوہ جو دوسرے قبیلے آباد تھے، ان کے بارے میں یہ بات طے ہوئی کہ اس صلح میں جو قبیلہ چاہے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ آجائے، اور جو قبیلہ چاہے قریش مکہ کے ساتھ رہے، چنانچہ خزاعہ آپ کے ساتھ رہے اور بنی بکر قریش کے ساتھ رہے، ایک سال تک کوئی بات نہ ہوئی، پھر ۷ھ میں حسب قرارداد سرکار دو عالم ﷺ نے عمرہ کی قضا فرمائی، آپ واپس تشریف لے آئے، آپ کی تشریف آوری کے چند ماہ بعد بنو بکر نے رات کے وقت بنو خزاعہ پر حملہ کردیا، اس حملہ میں قریش نے اسلحہ اور افراد سے بنو بکر کی مدد کی، اس حملہ سے حدیبیہ کی قرارداد کے مطابق یہ صلح ٹوٹ گئی، بنو خزاعہ نے آپ سے امداد طلب کی، چنانچہ آپ نے ۸ھ میں تیاری کر کے قریش پر چڑھائی کی اور مکہ فتح فرمالیا۔

سورۂ براءت کی ابتدائی آیات میں جن جماعتوں کا ذکر ہے، وہ چار ہیں: ایک تو یہی قریش مکہ جنہوں نے بدعہدی کی اور صلح کو توڑ دیا، دوسرے بنی کنانہ کے دو قبیلے بنی حمزہ اور بنی مدلج تھے جنہوں نے آپ سے معاہدہ کیا تھا، اور بقول معتبر مفسرین ان کی مدت معاہدہ ختم ہونے میں نو ماہ باقی تھے، تیسرے کچھ قبائل تھے جن سے معاہدہ تھا اور مدت معاہدہ معین نہیں کی گئی تھی، چوتھے چند وہ عام قبیلے تھے جن سے کسی طرح کا عہد نہ تھا، سورۂ براءت میں ان چاروں جماعتوں کے لیے احکام نازل فرمائے گئے۔

پہلے فریق یعنی قریش مکہ کے متعلق فتح مکہ سے قبل یہ حکم تھا کہ جب تک یہ حضرات معاہدہ پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو اور جب یہ جنگ کریں تو تم بھی قتال کرو، لیکن چونکہ ان حضرات نے معاہدہ کی خلاف ورزی کی، اس لیے سورۂ براءت میں اعلان کردیا گیا کہ اشہر حرام گذرنے کے بعد ان سے قتال کی اجازت ہے، دوسرے فریق کے بارے میں یہ حکم دیا گیا کہ چونکہ انہوں نے خلاف ورزی نہیں کی، اس لئے ان کی مدت معاہدہ پوری کی جائے، تیسرے اور چوتھے فریق کے بارے میں اعلان یہ ہے کہ وہ اس اعلان کی تاریخ سے چار ماہ کی مدت کے اندر اندر اپنا فیصلہ کرلیں، اگر وہ اسلام قبول کرلیں تو ان کو رہنے کی اجازت دی جاسکتی ہے، ورنہ انھیں اس جگہ رہنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور ان کے خلاف طاقت استعمال کی جائے گی۔

"ان یؤذن ببراءۃ الخ" کا مطلب یہ ہے کہ حضرت علیؓ کو ایک مخصوص اعلان کے لئے روانہ کیا، جس کا تعلق براءتِ ذمہ سے تھا، لیکن حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت علی نے ہمارے ساتھ اس اعلان میں بھی شرکت کی جس کو حضرت ابوہریرہؓ اور ان کے دوسرے ساتھی انجام دے رہے تھے۔ یعنی "لا یطوف بالبیت عریان" وغیرہ۔

## [۱۱] بَابُ الصَّلٰوۃِ بِغَیْرِ رِدَآءٍ

(۳۷۰) حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِیْزِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنِیْ اِبْنُ أَبِی الْمَوَالِیْ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ الْمُنْكَدِرِ قَالَ دَخَلْتُ عَلٰی جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ وَهُوَ یُصَلِّیْ فِیْ ثَوْبٍ وَّاحِدٍ مُلْتَحِفاً بِهٖ وَرِدَآؤُهٗ مَوْضُوْعٌ فَلَمَّا انْصَرَفَ قُلْنَا یَا اَبَا عَبْدِ اللّٰهِ تُصَلِّیْ وَرِدَآءُكَ مَوْضُوْعٌ قَالَ نَعَمْ اَحْبَبْتُ اَنْ یَّرَانِیْ الْجُهَّالُ مِثْلُكُمْ رَأَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یُصَلِّیْ كَذَا. (گذشتہ:۳۵۲)

**ترجمہ** باب، بغیر چادر کے نماز پڑھنے کا بیان۔ محمد بن منکدر سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ میں حضرت جابر کی خدمت میں حاضر ہوا، وہ اس وقت ایک کپڑا لپیٹے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اوران کی چادر پاس ہی رکھی ہوئی تھی، جب وہ نماز سے فارغ ہوگئے تو ہم نے عرض کیا، ابوعبداللہ! آپ ایک کپڑے میں نماز پڑھ رہے ہیں اور آپ کی چادر الگ رکھی ہوئی ہے حضرت جابر نے کہا جی! میں یہ چاہتا ہوں کہ تم جیسے جاہل مجھے دیکھ لیں، میں نے نبی اکرمؐ کو اس طرح بھی نماز پڑھتے دیکھا ہے۔

**مقصد ترجمہ** باب ’’عقد الازار علی القفافی الصلوۃ‘‘ کے ذیل میں حضرت جابرؓ کی اس روایت پر کلام گذر چکا ہے، یہاں امام بخاریؒ نے اس روایت پر دوسرا ترجمہ منعقد فرمایا ہے، کہ چادر کے ہوتے ہوئے صرف ایک کپڑا لپیٹ کر نماز ادا کرنا جائز ہے، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ تکمیل ہیئت کے لئے چادر کو عرفاً ضروری سمجھا گیا ہے، یعنی اگر کوئی شخص کرتہ پہنے ہوئے ہے، تہہ باندھے ہوئے ہے، تو یہ لباس بے شک کافی ہے، ساتر بھی ہے اور زینت بھی ہے، لیکن اس ہیئت کی تمامیت کا مدار چادر کے استعمال پر ہے، یہی طریق عام طور پر سلف میں بھی دیکھا گیا ہے، کہ وہ کرتہ اور ازار یا پائجامہ کے ساتھ چادر بھی استعمال کرتے تھے۔

توجب عام حالات میں چادر کا استعمال زینت کی تکمیل کے لیے ضروری سمجھا گیا تو نماز میں بھی چادر کی ضرورت ہونی چاہئے، اسی بنا پر بعض حضرات قائل ہوئے ہیں کہ نماز میں کرتہ اور ازار کے علاوہ چادر بھی ضروری ہے، بخاری تنبیہ کرنا چاہتے ہیں کہ نماز کی صحت کا مدار کپڑوں کی گنتی یا نوعیت پر نہیں ہے، صرف ستر عورت پر ہے، اگر ستر پوشی ازار سے ہوگئی تو چادر کی ضرورت نہیں ہے، یہ دوسری بات ہے کہ چادر سے زینت بڑھ جاتی ہے، لیکن گفتگو اس سلسلہ میں ہے کہ بغیر چادر نماز ہوجائے گی یا نہیں؟ کہتے ہیں کہ ہوجائے گی۔ جیسا کہ حضرت جابر نے چادر کے ہوتے ہوئے بیان جواز کے لیے بغیر چادر نماز پڑھ لی۔

## [۱۲] بَابُ مَا یُذْكَرُ فِی الْفَخِذِ

قَالَ اَبُو عَبْدِ اللّٰهِ وَیُرْوٰی عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ وَجَرْهَدٍ وَمُحَمَّدِ بْنِ جَحْشٍ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ الْفَخِذُ

عَوْرَةٌ. وَقَالَ اَنَسٌ حَسَرَ النَّبِيُّ ﷺ عَنْ فَخِذِهٖ . قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللهِ وَحَدِيْثُ اَنَسٍ اَسْنَدُ وَحَدِيْثُ جَرْهَدٍ اَحْوَطُ حَتّٰى نَخْرُجَ مِنْ اِخْتِلَافِهِمْ. وَقَالَ اَبُوْ مُوْسٰى غَطَّى النَّبِيُّ ﷺ رُكْبَتَيْهِ حِيْنَ دَخَلَ عُثْمَانُ. وَقَالَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ اَنْزَلَ اللهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ﷺ وَفَخِذُهٗ عَلٰى فَخِذِيْ فَثَقُلَتْ عَلَيَّ حَتّٰى خِفْتُ اَنْ تَرُضَّ فَخِذِيْ .

(۳۷۱) حَدَّثَنَا يَعْقُوْبُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ نَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ عُلَيَّةَ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ صُهَيْبٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ غَزَا خَيْبَرَ فَصَلَّيْنَا عِنْدَهَا صَلٰوةَ الْغَدَاةِ بِغَلَسٍ فَرَكِبَ النَّبِيُّ ﷺ وَرَكِبَ اَبُوْ طَلْحَةَ وَاَنَا رَدِيْفُ اَبِيْ طَلْحَةَ فَاَجْرٰى نَبِيُّ اللهِ ﷺ فِيْ زُقَاقِ خَيْبَرَ وَاَنَّ رُكْبَتِيْ لَتَمَسُّ فَخِذَ نَبِيِّ اللهِ ﷺ ثُمَّ حَسَرَ الْاِزَارَ عَنْ فَخِذِهٖ حَتّٰى اَنِّيْ اَنْظُرُ اِلٰى بَيَاضِ فَخِذِ نَبِيِّ اللهِ ﷺ فَلَمَّا دَخَلَ الْقَرْيَةَ قَالَ اللهُ اَكْبَرُ خَرِبَتْ خَيْبَرُ اِنَّا اِذَا نَزَلْنَا بِسَاحَةِ قَوْمٍ فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ قَالَهَا ثَلٰثًا قَالَ وَخَرَجَ الْقَوْمُ اِلٰى اَعْمَالِهِمْ فَقَالُوْا مُحَمَّدٌ قَالَ عَبْدُ الْعَزِيْزِ وَقَالَ بَعْضُ اَصْحَابِنَا وَالْخَمِيْسُ يَعْنِي الْجَيْشَ قَالَ فَاَصَبْنَاهَا عَنْوَةً فَجُمِعَ السَّبْيُ فَجَآءَ دِحْيَةُ فَقَالَ يَانَبِيَّ اللهِ اَعْطِنِيْ جَارِيَةً مِنَ السَّبْيِ فَقَالَ اِذْهَبْ فَخُذْ جَارِيَةً فَاَخَذَ صَفِيَّةَ بِنْتَ حُيَيٍّ فَجَآءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ يَانَبِيَّ اللهِ اَعْطَيْتَ دِحْيَةَ صَفِيَّةَ بِنْتَ حُيَيٍّ سَيِّدَةَ قُرَيْظَةَ وَالنَّضِيْرِ لَا تَصْلُحُ اِلَّا لَكَ قَالَ ادْعُوْهُ بِهَا فَجَآءَ بِهَا فَلَمَّا نَظَرَ اِلَيْهَا النَّبِيُّ ﷺ قَالَ خُذْ جَارِيَةً مِّنَ السَّبْيِ غَيْرَهَا قَالَ فَاَعْتَقَهَا النَّبِيُّ ﷺ وَتَزَوَّجَهَا فَقَالَ لَهٗ ثَابِتٌ يَا اَبَا حَمْزَةَ مَا اَصْدَقَهَا قَالَ نَفْسَهَا اَعْتَقَهَا وَتَزَوَّجَهَا حَتّٰى اِذَا كَانَ بِالطَّرِيْقِ جَهَّزَتْهَا لَهٗ اُمُّ سُلَيْمٍ فَاَهْدَتْهَا لَهٗ مِنَ اللَّيْلِ فَاَصْبَحَ النَّبِيُّ ﷺ عَرُوْسًا فَقَالَ مَنْ كَانَ عِنْدَهٗ شَيْءٌ فَلْيَجِئْ بِهٖ وَبَسَطَ نِطْعًا فَجَعَلَ الرَّجُلُ يَجِيْءُ بِالتَّمْرِ وَجَعَلَ الرَّجُلُ يَجِيْءُ بِالسَّمْنِ قَالَ وَاَحْسِبُهٗ قَدْ ذَكَرَ السَّوِيْقَ قَالَ فَحَاسُوْا حَيْسًا فَكَانَتْ وَلِيْمَةُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ . (آئندہ: ۶۱۰، ۹۴۷، ۲۲۲۸، ۲۲۳۵، ۲۸۸۹، ۲۸۹۳، ۲۹۴۳، ۲۹۴۴، ۲۹۴۵، ۲۹۹۱، ۳۰۸۵، ۳۰۸۶، ۳۳۶۷، ۳۶۴۷، ۴۰۸۳، ۴۰۸۴، ۴۱۹۷، ۴۱۹۸، ۴۱۹۹، ۴۲۰۰، ۴۲۰۱، ۴۲۱۱، ۴۲۱۲، ۴۲۱۳، ۵۰۸۵، ۵۱۵۹، ۵۱۶۹، ۵۳۸۷، ۵۴۲۵، ۵۵۲۸، ۵۹۶۸، ۶۱۸۵، ۶۳۶۳)

**ترجمہ** | باب، ران کے عورت ہونے نہ ہونے کے سلسلہ میں جو کچھ مذکورہ ہے اس کا بیان ابوعبداللہ بخاری کہتے ہیں کہ ابن عباس، جرہد اور محمد بن جحش نے نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ فخذ عورت ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ران کو کھول دیا، حضرت انس کی حدیث از روئے سند قوی ہے اور جرہد کی حدیث پر

عمل کرنے میں احتیاط ہے، تاکہ اس مسئلہ میں علماء کے اختلاف سے نکلا جاسکے۔ حضرت ابوموسیٰ نے بیان کیا کہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے دونوں گھٹنوں کو اس وقت ڈھک لیا جب حضرت عثمان آگئے۔

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ پر وحی نازل فرمائی اور اس وقت آپ کی ران میری ران کے اوپر تھی، مجھے اتنا وزن محسوس ہوا کہ مجھے یہ خوف ہوگیا کہ میری ران ٹوٹ جائے گی۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ خیبر پر غزوہ کے ارادے سے تشریف لے گئے، چنانچہ ہم نے خیبر کے پاس رات کی تاریکی ہی میں فجر کی نماز پڑھ لی، پھر نبی اکرم ﷺ سوار ہوئے اور ابوطلحہ بھی اپنی سواری پر سوار ہوئے، میں ابوطلحہؓ کے پیچھے بیٹھ گیا اور نبی اکرم ﷺ نے اپنی سواری کو خیبر کی گلیوں میں روانہ کردیا اور اس وقت میرا گھٹنہ نبی اکرم ﷺ کی ران مبارک سے مس کررہا تھا، پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی فخذ مبارک سے ازار کو ہٹادیا، یہاں تک کہ میں دیکھ رہا ہوں نبی اکرم ﷺ کی فخذ کی سفیدی کی طرف، چنانچہ جب آپ خیبر کی آبادی میں داخل ہوگئے تو آپ نے فرمایا کہ اللہ اکبر! خیبر تباہ ہوگیا، بے شک جب ہم کسی قوم کی سرزمین پر اترتے ہیں تو اس ڈرائی گئی قوم کی صبح اس کے حق میں بگڑ جاتی ہے، آپؐ نے یہ کلمات تین مرتبہ ارشاد فرمائے، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ جب خیبر والے اپنے اپنے کاموں کے لیے باہر نکلے، تو انہوں نے کہا ''یہ محمد ہیں'' عبدالعزیز کہتے ہیں کہ ہمارے بعض ساتھیوں نے کہا اور خمیس یعنی لشکر بھی ساتھ ہے، حضرت انسؓ کہتے ہیں چنانچہ ہم نے خیبر کو طاقت سے فتح کیا، پھر اس کے بعد قیدیوں کو جمع کیا گیا، پھر حضرت دحیہ آئے اور انہوں نے عرض کیا یارسول اللہ! مجھے گرفتار شدگان میں سے ایک باندی دے دیجئے، آپ نے فرمایا کہ جاؤ اور ایک لے لو! چنانچہ حضرت دحیہ نے حضرت صفیہ بنت حیی کو لے لیا۔ پھر ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے عرض کیا، یارسول اللہ! آپ نے صفیہ بنت حیی جو قریظہ اور نضیر کے سردار کی بیٹی ہیں، حضرت دحیہ کو بخش دیں، جب کہ وہ صرف آپ ہی کے لائق ہیں، آپ نے فرمایا کہ ان کو بلاؤ کہ وہ صفیہ کو اپنے ساتھ لے کر آئیں، چنانچہ حضرت دحیہ ان کو لے کر حاضر خدمت ہوئے۔ چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ نے حضرت صفیہ کی طرف دیکھا تو حضرت دحیہ سے فرمایا کہ تم قیدیوں میں سے صفیہ کے علاوہ اور کوئی باندی لے لو، حضرت انس کہتے ہیں کہ پھر رسول اکرم ﷺ نے حضرت صفیہ کو آزاد فرمادیا اور اپنے نکاح میں لے لیا، حضرت ثابت نے حضرت انس سے کہا، اے ابوحمزہ! حضرت صفیہ کو آپ ﷺ نے مہر کیا دیا تھا؟ حضرت انس نے کہا کہ خود صفیہ کی ذات، کہ پہلے آپ نے ان کو آزاد کیا پھر نکاح فرمایا، یہاں تک کہ جب رسول اکرم ﷺ راستہ میں تھے تو حضرت ام سلیم نے حضرت صفیہ کو دلہن بنایا اور اسی شب میں آنحضرت ﷺ کی خدمت میں بھیج دیا، چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے عروس ہوکر صبح کی اور فرمایا کہ جس کے پاس کھانے کی کوئی چیز ہو وہ اس کو لے آئے اور آپ نے چمڑے کا دسترخوان بچھادیا۔ چنانچہ کوئی شخص کھجور لے کر آرہا تھا اور کوئی گھی لے کر آرہا تھا، عبدالعزیز کہتے ہیں کہ میں گمان کرتا ہوں کہ حضرت انس نے ستو کا بھی ذکر فرمایا تھا، حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ پھر ان سب چیزوں کو ملا کر مالیدہ تیار کرلیا گیا، پس یہی رسول اکرم ﷺ کا ولیمہ تھا۔

**مقصد ترجمہ** ترجمہ کے الفاظ ہیں "مَا یُذکَرُ فی الفخذ" یعنی جو باتیں فخذ کے بارے میں مذکور ہوئی ہیں، امام بخاریؒ یہاں ان تمام باتوں کا ذکر کررہے ہیں، مگر صریح فیصلہ نہیں کرنا چاہتے، نہ فخذ کو عورت ہی کہتے ہیں کہ ستر ضروری ہے، نہ یہ بتلاتے ہیں کہ ران عورت نہیں ہے، بلکہ دونوں جانب کا مواد پیش کرکے فیصلہ قارئین پر چھوڑ رہے ہیں، بخاری نے دونوں نظریئے پیش کردیئے۔ فخذ کے عورت ہونے کے بارے میں انہوں نے بیان کیا کہ ابن عباس، جرہد اور محمد بن جحش سے پیغمبر علیہ السلام کا ارشاد "الفخذ عورۃٌ" منقول ہوا ہے، یہ ایک نظریہ ہوا، دوسرا نظریہ "لیست بعورۃ" کا ہے، اس کے متعلق بخاری نے تین چیزیں پیش کیں: پہلی بات تو حضرت انس کی روایت ہے کہ خیبر کی گلیوں میں حضرت انس کا گھٹنہ پیغمبر علیہ السلام کی فخذ مبارک سے بار بار رگڑ کھاتا تھا، نبی اکرم ﷺ نے اپنی ران مبارک سے کپڑے کو ہٹالیا، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ آپ کی فخذ کی وہ چمک دمک اب تک میری نظر میں ہے۔ یہ دوسرے نظریے کا مواد ہوا، اس سلسلہ میں دوسری بات یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ ایک باغ میں کنویں کے اوپر رکبۂ مبارک کھولے ہوئے پیر لٹکائے بیٹھے تھے، حضرت صدیق اکبرؓ آئے اور آپ کے داہنی طرف اسی شان سے گھٹنہ کھول کر بیٹھ گئے، حضرت عمرؓ آئے اور دیکھا کہ نبی اکرم ﷺ اور حضرت صدیق اکبرؓ ایک خاص شان سے بیٹھے ہوئے ہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ بھی اسی شان سے گھٹنہ کھول کر بائیں طرف بیٹھ گئے، پھر حضرت عثمانؓ آئے تو آپؐ نے اپنے گھٹنے ڈھک لئے، اور صدیق اکبر اور فاروق اعظم نے بھی ڈھک لئے۔ گھٹنہ دو ہڈیوں سے مرکب ہے، ایک ہڈی ساق کی ہے اور ایک ہڈی فخذ کی، اس گھٹنے کے کھولنے سے معلوم ہوا کہ فخذ کے عورت ہونے کا معاملہ قوی نہیں ہے۔

دوسرے نظریے کے مواد کے سلسلہ میں تیسری بات بخاریؒ نے یہ پیش کی کہ کاتب وحی حضرت زید کا بیان ہے کہ میں نبی اکرم ﷺ کے قریب بیٹھا تھا، نزول وحی کی کیفیت طاری ہوئی، اس کیفیت میں ایک خاص ثقل ہوتا تھا، اس کیفیت میں آپ کی فخذ مبارک میری فخذ پر آپڑی، اتنا ثقل ہوگیا کہ مجھے اپنی ران کے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہوگیا، معلوم ہوا کہ فخذ عورت نہیں ہے، اگرچہ فخذ کا اتصال غیر اختیاری تھا، لیکن پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کا غیر اختیاری فعل بھی اگر آپؐ نے اس کے بارے میں کوئی تنبیہ بعد میں نہ فرمائی ہو حجت ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ اتصال میں کوئی خرابی نہیں، پھر اگر کوئی یہ کہے کہ یہ اتصال بغیر حجاب کے نہ تھا، بلکہ دونوں حضرات تہہ باندھے ہوئے تھے اور کپڑا درمیان میں حائل تھا، اس لئے فخذ کے عورت ہونے پر اس سے استدلال درست نہیں، تو اس کا جواب یہ ہے کہ وہ اعضاء جو اتفاق اور اجماع کے ساتھ عورت ہیں جیسے سوأتین، ان کا حجاب اور حائل کے باوجود دوسرے سے اتصال حرام ہے، اور یہاں اتصال ہوا، خواہ حجاب اور حائل ہی کے ساتھ ہوا، اس سے معلوم ہوا کہ فخذ عورت نہیں ہے۔

**بخاری کا رجحان** امام بخاریؒ نے یہ دونوں مواد پیش کردیئے، لیکن کوئی واضح فیصلہ نہیں فرمایا، بس ایک تبصرہ یہ کیا کہ از روئے سند حضرت انسؓ کی روایت قوی ہے، جرہد کی روایت اس درجہ کی نہیں، لیکن تقاضائے احتیاط

یہی ہے کہ جرہد کی حدیث پر عمل کیا جائے، اور اس احتیاط کی وجہ بھی بتلادی "حتّی نخرج الخ" جب کسی معاملہ میں اختلاف ہو اور معاملہ حلت وحرمت یا جواز اور عدم جواز کا ہو تو تقاضائے احتیاط یہی ہے کہ حرمت پر عمل کیا جائے، کیوں کہ زیر بحث مسئلہ میں مثلاً اگر فخذ کو ڈھک کر نماز پڑھی جائے، تو سب کے نزدیک نماز ہو جائے گی، لیکن اگر فخذ کھلی ہو تو غیر عذر کی حالت میں جمہور ائمہ کے نزدیک سرے سے نماز ہی نہیں ہوگی، اس لیے اختلاف سے بچنے کے لیے احتیاط کا تقاضا یہی ہوا کہ جرہد کی روایت پر عمل کیا جائے، اسی طرح خارج صلوۃ میں بھی جو حضرات فخذ کو عورت نہیں مانتے ہیں ان کا مطلب یہ نہیں کہ بے ضرورت فخذ کھولے رہیں، زیادہ سے زیادہ یہ بات ہے کہ اگر فخذ کھلی ہو تو یہ قابل اعتراض نہیں ہے، امام بخاریؒ نے دونوں نظریوں کے استدلال ذکر فرمادیئے اور کوئی صاف بات نہیں کی، غالباً امام بخاریؒ کے ذہن میں اس سلسلہ میں کچھ تفصیل ہے، جس کو انہوں نے کسی وجہ سے صاف کر کے بیان نہیں کیا، بلکہ اس کی طرف اشارہ کر کے چھوڑ دیا ہے، وہ تفصیل یہ ہے کہ بخاری فخذ کا معاملہ بین بین بتلاتے ہیں، اعلائے فخذ کو سوأتین کے ساتھ ملحق کہتے ہیں؛ لیکن اسفل فخذ کو جو گھٹنے کی جانب ہے، اس کے متعلق بخاری کا خیال ہے کہ بے تکلف احباب اور ان حضرات کے سامنے جو کثرت سے آنے جانے والے ہیں، اس کے کشف میں مضائقہ نہیں ہے، لیکن اجانب اور وہ حضرات جو گاہے گاہے آنے جانے والے ہوں، یا ایسے حضرات جن سے بے تکلفی نہ ہو ان کے سامنے کشف فخذ کی اجازت نہیں دیتے۔

**اختلاف مذاہب اور احناف کا مسلک** یہاں تک تو امام بخاری کے رجحان کا تذکرہ تھا، خود ائمہ مجتہدین فخذ کے سلسلہ میں اختلاف رکھتے ہیں، احناف کا مسلک اس سلسلہ میں یہ ہے کہ ناف سے گھٹنے تک مرد کے لیے عورت ہے، اور ناف اور گھٹنہ بھی عورت میں شامل ہیں، اگر نماز کی حالت میں فخذ یا گھٹنہ کا کشف ہو گیا، تو اس سلسلہ میں اصول یہ ہے کہ ربع عضو کا کھلنا پورے عضو کے کھلنے کے حکم میں ہے، نماز باطل ہو جائے گی۔

حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ ناف اور گھٹنے کے درمیان کا جسم عورت ہے، لیکن ناف اور گھٹنہ اس میں شامل نہیں ہیں، گویا فخذ ان کے نزدیک بھی عورت کے حکم میں ہے، یہی صحیح روایت امام مالکؒ کی بھی ہے، اگرچہ ایک قول ان کی طرف یہ بھی منسوب ہوا ہے کہ وہ فخذ کو عورت نہیں مانتے، اسی طرح امام احمدؒ کی صحیح روایت فخذ کے عورت ہونے کی ہے، اگرچہ ایک دوسرا قول بھی ان کی طرف منسوب ہے، مگر وہ ضعیف ہے، اس لحاظ سے ائمہ اربعہ فخذ کے عورت ہونے پر متفق ہیں، البتہ اصحاب ظواہر داؤد ظاہری، علامہ ابن حزم وغیرہ کے نزدیک فخذ عورت نہیں ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ امام بخاری نے جو دلائل فریق ثانی کی تائید میں دیئے ان کی کیا حیثیت ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ جرہد کی روایت میں "الفخذ عورۃ" آیا ہے، یہ ایک کلیہ ہے، اس کی حیثیت تشریع عام کی ہے، کیوں کہ یہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کا قول ہے اور قول کی حیثیت تشریع عام کی ہوتی ہے، اسی لیے اگر قول وفعل میں تعارض ہو تو ترجیح قول کو

دی جاتی ہے" قول کو اپنے ظاہر پر رکھتے ہوئے فعل کو اس کے ماتحت لانے کی کوشش کی جاتی ہے، اور اگر فعل کسی بھی تاویل سے مطابق نہ ہو سکے تو اس جزئیہ کو یا خصوصیت پر محمول کیا جاتا ہے، یا "حکایة حال لاعموم لها" کہہ کر چھوڑ دیا جاتا ہے، یہاں حضرت انس، حضرت ابوموسیٰ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کی روایات جو بخاری نے فریق ثانی کے مواد میں پیش کی ہیں، سب کی سب جزئیات ہیں اور فعلی روایتیں ہیں، قولی روایت سے تعارض کے وقت ان میں تاویل کی جائے گی، حضرت انس کی روایت تو تفصیل سے بخاری نے ذکر کی ہے، اس پر تو کلام سب سے آخر میں کیا جائے گا، ابو موسیٰ او زید بن ثابت کی روایت کے بارے میں سن لیجئے۔

حضرت ابوموسیٰ کی روایت میں آیا کہ رسول اکرم ﷺ نے حضرت عثمان کی آمد پر اپنے گھٹنے ڈھک لیئے اول تو اس بارے میں روایات بہت مختلف ہیں، پھر یہ تعبیر کا توسع بھی ہو سکتا ہے: کہیں فخذ کے کشف کی تعبیر ہے، کہیں رکبہ کے کشف کا ذکر ہے، کسی روایت میں رکبہ کے بعض حصہ کا تذکرہ ہے، اس اختلاف کے ہوتے ہوئے، فخذ کے ستر اور عورت نہ ہونے پر استدلال بہت ہی کمزور استدلال ہے۔

اسی طرح حضرت زید بن ثابت نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالی نے رسول اکرم ﷺ پر وحی نازل فرمائی، اسی وقت آپ کی فخذ مبارک میری فخذ مبارک پر غیر اختیاری طور پر ثقل وحی کے باعث آ پڑی، جس سے مجھے اتنا وزن محسوس ہوا کہ اپنی ران کے ٹوٹ جانے کا خوف ہو گیا، اس روایت سے مدعا کے اثبات کے لیے کئی مقدمات لگائے گئے تھے، سابق میں گزر چکا ہے، لیکن اول تو روایات کا اختلاف کہ اتصال فخذ کا ہوا یا رکبہ کا؟ دوسرے یہ کہ اگر چہ یہ چیز مسلم ہے کہ عورت غلیظہ کا بدون حیلولت اور حیلولت کے ساتھ دونوں طرح اتصال حرام ہے، لیکن فخذ کا معاملہ سوأتین سے ہلکا ہے، اہل عرف حیلولت کے ساتھ اسفل فخذ کے اتصال کو زیادہ معیوب نہیں سمجھتے، تیسری چیز یہ کہ ایسا بالکل اضطراری کیفیت میں ہوا۔ پیغمبر علیہ السلام کے اضطراری افعال بھی اگر بعد میں تنبیہ نہ آئی ہو، حجت ہیں؛ اسی لیے ہم نے اس سے یہ مسئلہ اخذ کیا کہ حیلولت کے بعد اسفل فخذ کا معاملہ عورت غلیظہ سے مختلف ہے۔

**روایت باب** بخاری نے فریق ثانی کی تائید میں جو مواد فراہم کیا ہے، اس میں سب سے زیادہ مضبوط یہی روایت ہے، حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام نے غزوۂ خیبر کے موقع پر فجر کی نماز تاریکی شب میں ادا کی۔

بالکل سویرے تاریکی میں ادا کرنا اس مصلحت سے تھا کہ دشمن کو آمد کی اطلاع نہ ہو اور اس کی بے خبری میں ہم خیبر پہنچ جائیں، راوی کا حیرت کے انداز میں غلس کہنا بتلا رہا ہے کہ یہ آپ کی عادت شریفہ نہ تھی۔

پھر خیبر کی گلیوں میں پیغمبر علیہ السلام نے اپنی سواری ڈالدی، حضرت ابوطلحہ بھی اپنی سواری پر آپ کے ہمراہ ہو گئے، حضرت انس حضرت طلحہ کے پیچھے تھے، ان کی سواری پر بیٹھے تھے، تنگیٔ مقام کے باعث حضرت انس کا گھٹنہ پیغمبر علیہ

السلام کی فخذ سے رگڑ کھا جاتا تھا، اس لئے اس اندیشہ پر کہ کہیں گھٹنہ سے الجھ کر تہبند گر نہ جائے، آپ نے اس کو اوپر کر لیا تھا، اس میں اتفاقاً حضرت انس کی نظر آپ کی فخذ مبارک پر پڑ گئی۔ جس کا اس روایت میں ذکر ہے، روایت کا یہی جز اس وقت زیر بحث ہے، فریق ثانی کا استدلال اس طرح تھا کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے بالاختیار فخذ کا کشف فرمایا اور فخذ کھلی ہی رہی، یہاں تک کہ حضرت انس نے بھی دیکھا جو حضرت طلحہ کے پیچھے تھے، یہ کشف اضطراری نہ تھا، بلکہ اختیاری تھا، حسر کی تعبیر ہے جس کا ترجمہ ہے کھولدیا، معلوم ہوا کہ فخذ عورت نہیں ہے۔

لیکن یہ استدلال بھی چند در چند وجوہ سے محل نظر ہے، پہلی بات یہ ہے کہ ایک تنگ گلی میں سواری جا رہی ہے، ہوا کا رخ ہے، سواری تیزی سے چل رہی ہے، ہوسکتا ہے کہ گھٹنہ بار بار تہبند سے الجھتا ہو اور ہوا نے تہبند کا رخ پلٹ دیا ہو، یا اگر آپ نے خود پلٹا تو اس کی معقول وجہ یہ ہے کہ تہبند کے بار بار الٹنے سے آپ نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ کہیں اس الجھاؤ میں ایسا نہ ہو کہ اس حصہ جسم کی بے پردگی ہو جائے، جس کی کسی صورت نوبت نہیں آنی چاہئے، اور اس خیال سے کہ " **اذا ابتلی الانسان ببلیّتین فلیختر اھو نھما** " اس خیال سے آپ نے تہبند گھٹنہ پر سے ہٹا کر فخذ مبارک کے نیچے دبا لیا ہو، دوسری بات یہ ہے کہ " **حسر** " کی تعبیر پر مدار نہیں رکھا جا سکتا، دوسری روایات میں " **انحسر** " کا بھی لفظ ہے، چنانچہ مسلم اور مسند احمد وغیرہ میں بجائے، " **حسر** " کے " **انحسر** " وارد ہوا ہے، اور اگر اصل روایت " **حسر** " ہی ہے تو حسب تصریح صاحب قاموس یہ لازم بھی ہے اور متعدی بھی ہے، جو اضطراری کیفیت کی طرف مشیر ہے، اس لیے ہوسکتا ہے کہ تہبند ہوا کے زور اور سواری کی تیزی کے سبب خود ہی پلٹ گیا ہو، نیز اسمٰعیلی کی روایت میں " **اذ سقط الازار** " کے الفاظ ہیں کہ اچانک تہبند گر گیا، یہ سب رواۃ کی تعبیریں ہیں، ہمیں بھی احتمالات نکالنے کی گنجائش ہے، پھر اس درجہ محتمل روایت کو ایک قولی روایت " **الفخذ عورۃ** " کے مقابل لانا ہمارے نزدیک کسی طرح درست نہیں، خود اسی بخاری کی روایت میں موجود ہے کہ میرا قدم آپ کے قدم سے مس کر رہا تھا، اس اعتبار سے کشف فخذ کا معاملہ اور کمزور ہو گیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ حسر، ازار کے کھولنے کے لیے ہو، تا کہ وہ ران سے چپک نہ جائے، اتفاق سے کھولتے وقت کچھ فخذ پر حضرت انس کی غیر اختیاری نظر پڑ گئی... دلیل فخذ کے غیر عورت ہونے کے لیے کسی صورت میں صحیح نہیں قرار پاتی۔ آگے روایت میں آیا کہ راوی نے حضرت انس سے سوال کیا کہ آپ نے حضرت صفیہ کو مہر میں کیا دیا، حضرت انس نے کہا " **نفسھا اعتقھا ثم تزوجھا** " کہ مہر میں ان کو ان کا نفس دیا گیا، پہلے آپ نے ان کو آزاد کیا، پھر نکاح کیا، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ عتق بشرط التزوج میں بھی ایجاب وقبول کی ضرورت ہوگی، مہر میں حضرت صفیہ کو ان کا نفس دیا گیا، علماء نے اس سلسلہ میں کہا ہے کہ یہ سرکار دو عالم ﷺ کی خصوصیت تھی، لیکن امام احمدؒ اس کو اپنے ظاہر پر رکھتے ہیں اور عتق بشرط التزوج میں مستقل ایجاب وقبول کی ضرورت نہیں سمجھتے، روایت باب کے جواب میں کہا جا سکتا ہے کہ راوی کا یہ بیان راوی کے اپنے علم کے مطابق ہے، ورنہ ہوسکتا ہے کہ صورۃً یہی معاملہ رہا ہو کہ کچھ لین دین نہ ہوا ہو، کیوں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے حضرت صفیہ کو آزاد فرمایا

اورامہات المؤمنین میں داخل کیا، حضرت صفیہ نے اس کے شکریہ میں مہر سے دست برداری دیدی، صورۃً یہی معاملہ ہوا کہ مہر نہیں دیا گیا، لیکن مسئلہ اپنی جگہ رہا، تفصیل انشاء اللہ آگے اپنی جگہ آئے گی۔　　واللہ اعلم

## [۱۳] بَابٌ فِيْ كَمْ تُصَلِّي الْمَرْءَةُ مِنَ الثِّيَابِ

وَقَالَ عِكْرِمَةُ لَوْ وَارَتْ جَسَدَهَا فِيْ ثَوْبٍ جَازَ

(۳۷۲) حَدَّثَنَا اَبُوْ الْيَمَان قَالَ اَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عُرْوَةُ اَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ لَقَدْ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُصَلِّيْ الْفَجْرَ فَتَشْهَدُ مَعَهُ نِسَآءٌ مِّنَ الْمُؤْمِنَاتِ مُتَلَفِّعَاتٍ فِيْ مُرُوْطِهِنَّ ثُمَّ يَرْجِعْنَ اِلٰى بُيُوْتِهِنَّ مَايَعْرِفُهُنَّ اَحَدٌ.　　(آئندہ: ۵۷۸، ۸۶۷، ۸۷۲)

**ترجمہ** باب، عورت کتنے کپڑوں میں نماز پڑھے؟ حضرت عکرمہ نے فرمایا کہ اگر عورت نے ایک کپڑے سے اپنا جسم ڈھک لیا تو اس کی نماز درست ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ فجر کی نماز پڑھتے تھے، تو مسلمانوں کی عورتیں آپ کے ساتھ حاضر ہوتیں، اس حالت میں کہ وہ سر سے پیر تک چادروں میں لپٹی ہوتی تھیں، پھر وہ اپنے اپنے گھروں کو واپس ہوتیں اور ان کو کوئی پہنچان نہ سکتا تھا۔

**مقصد ترجمہ** عورت کتنے کپڑوں میں نماز پڑھے یعنی اس کے لیے کوئی عدد مطلوب ہے یا اس کا وہی حکم ہے جو مرد کا ہے کہ ستر کا چھپانا ضروری ہے، کپڑوں کی گنتی سے کوئی سروکار نہیں۔ حضرت عکرمہ کے بیان سے معلوم ہوا کہ مدار نوعیت اور عدد پر نہیں ہے بلکہ جسم چھپانے پر ہے، گویا مسئلہ دونوں جگہ ایک ہی ہے کہ مرد کے لیے بھی ستر عورت ضروری ہے اور عورت کے لیے بھی، البتہ فرق یہ ہے کہ مرد کے لیے تو ستر ناف سے رکبہ تک ہے، اور عورت کا پورا جسم قدم، کفین اور چہرے کے علاوہ عورت ہے، پورے جسم کے ستر کے لیے عام طور پر عورتوں کو ایک سے زائد کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے اس سلسلہ میں روایات بھی مختلف ہیں، اور علماء کے اقوال میں بھی اختلاف ہے، حضرت ام سلمہؓ کی روایت اس سلسلہ میں یہ ہے کہ عورت قمیص اور چادر میں نماز پڑھے، امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ عورت کو قمیص اور دوپٹے میں نماز پڑھنی چاہیے، عطاء فرماتے ہیں کہ نہیں! تین کپڑوں میں نماز پڑھے اور وہ ازار کا بھی اضافہ کرتے ہیں، ابن سیرینؒ نے ایک کا اور اضافہ کردیا اور وہ تین کے بجائے چار کے قائل ہیں کہ قمیص، دوپٹہ اور ازار کے بعد چادر بھی ہونی چاہیے۔

امام بخاری اس ترجمہ میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ اس اختلاف اقوال کا یہ مطلب نہیں کہ ان حضرات کے نزدیک عورت کے لیے نماز کی صحت کسی گنتی پر موقوف ہے، ایسا نہیں ہے، بلکہ منشاء ان اقوال کا یہ ہے کہ چونکہ عورت کا پورا جسم عورت ہے، اس لیے یہ سب حضرات ایک سے زائد کپڑوں کے استعمال کی ہدایت کررہے ہیں، کیوں کہ سر سے پیر تک کا

چھپانا عام حالات میں دو سے کم کپڑوں میں نہیں ہوتا، لیکن اگر ستر پوشی اور سارے جسم کو چھپانے کا مقصد ایک ہی کپڑے سے حاصل ہو جائے تو یہ بھی کافی ہے۔

**روایت باب** چنانچہ اس مدعا کے اثبات کے لیے امام بخاریؒ نے حضرت عائشہؓ کی روایت پیش کردی، کہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ عورتیں فجر کی نماز میں اس طریقہ پر حاضر ہوتیں کہ سر سے پیر تک ان کا پورا جسم چادروں سے ڈھکا ہوتا اور چونکہ یہ عورتیں اپنی اپنی چادروں میں لپٹی ہوتی تھیں، اس لیے جب وہ اپنے گھروں کو واپس ہوتیں تو انہیں کوئی پہچان نہ سکتا تھا، یعنی یہ تو معلوم ہوتا تھا کہ یہ عورت ہے مرد نہیں ہے، لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ کون عورت ہے۔

اس روایت کو ترجمہ سے مناسبت یہ ہے کہ جس دور کا یہ تذکرہ ہے وہ کپڑوں کی فراوانی نہیں بلکہ قلت کا دور ہے، اور روایت میں آیا کہ عورتیں چادروں میں سر سے پیر تک لپٹی ہوتی تھیں، اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ چادروں کے نیچے دوسرے کپڑے نہ ہوں گے، یا اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ پورا جسم تو چادر سے ڈھکا ہوا ہے، اس لیے دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ اس چادر کے نیچے دوسرا کپڑا ہے یا نہیں؟ اور پیغمبر علیہ السلام نے اس کی تفتیش نہیں کی کہ آیا ان عورتوں کے پاس صرف یہی چادریں ہیں یا اس کے نیچے اور بھی کپڑے ہیں؟ آپ نے تفتیش نہیں فرمائی، اگر عدد ضروری ہوتا تو آپ ضرور تفتیش فرماتے، گویا عورتوں کے ظاہر حال سے تو معلوم نہیں ہوتا ہے کہ ان کے پاس کتنے کپڑے ہیں اور پیغمبر علیہ السلام تفتیش بھی نہیں فرماتے، تو اس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ مدار عورتوں کے معاملہ میں بھی کپڑوں کی گنتی پر نہیں بلکہ ستر پر ہے، اگر عورت سر سے پیر تک چادر لپیٹ لے اور ستر ہو جائے تو نماز کے لیے کافی ہے۔ واللہ اعلم

## [۱۴] بَابٌ اِذَا صَلّٰى فِيْ ثَوْبٍ لَهٗ اَعْلَامٌ وَنَظَرَ اِلٰى عَلَمِهَا

(۳۷۳) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ يُوْنُسَ قَالَ اَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى فِيْ خَمِيْصَةٍ لَهَا اَعْلَامٌ فَنَظَرَ اِلٰى اَعْلَامِهَا نَظْرَةً فَلَمَّا انْصَرَفَ قَالَ اذْهَبُوْا بِخَمِيْصَتِيْ هٰذِهٖ اِلٰى اَبِيْ جَهْمٍ وَاْتُوْنِيْ بِاَنْبِجَانِيَّةِ اَبِيْ جَهْمٍ فَاِنَّهَا اَلْهَتْنِيْ اٰنِفًا عَنْ صَلَاتِيْ وَقَالَ هِشَامُ بْنُ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ كُنْتُ اَنْظُرُ اِلٰى عَلَمِهَا وَاَنَا فِي الصَّلٰوةِ فَاَخَافُ اَنْ تَفْتِنَنِيْ. (آئندہ: ۷۵۲، ۵۸۱۷)

**ترجمہ** جب کوئی شخص منقش کپڑے میں نماز پڑھے اور اس کے نقش و نگار کی طرف دیکھے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے ایک اونی چوکور سیاہ پلودار چادر میں نماز ادا فرمائی جو منقش تھی، جس کو خمیصہ کہتے ہیں اور ایک نظر اس کے نقش و نگار پر پڑی، چنانچہ جب آپ نماز سے فارغ ہو گئے، تو آپ نے فرمایا کہ میری اس چادر کو ابو جہمؓ

کے پاس لے جاؤ اور ان سے ان کی انبجانی چادر لے آؤ؛ اس لئے کہ اس منقش چادر نے مجھے ابھی نماز میں دوسری طرف متوجہ کر دیا۔ ہشام بن عروہ حضرت عروہ سے اور حضرت عروہ بواسطہ حضرت زبیرؓ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اس چادر کے نقش ونگار کی طرف نماز کی حالت میں نظر کی تو مجھے خوف ہوا کہ یہ کہیں مجھے فتنہ میں نہ ڈال دے۔

**مقصد ترجمہ** منقش کپڑا پہن کر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ کیوں کہ اگر کپڑا بیل بوٹوں دار ہوگا اور نمازی کی نظر ان نقش ونگار پر پڑے گی تو ہوسکتا ہے کہ نقش ونگار کی طرف طبیعت کا میلان نماز میں کسی نقصان کا سبب ہو جائے، اور فساد یا کراہت پیدا ہو، بخاری نے ترجمہ میں کوئی فیصلہ نہیں فرمایا، لیکن ذیل میں جو روایت پیش کی ہے، اس سے ثابت ہو گیا کہ نماز ہو جائے گی، کیوں کہ نماز کے لیے تو کپڑے کا ساتر اور طاہر ہونا شرط ہے جو اس صورت میں بھی حاصل ہے۔

**حدیث باب** حضرت ابوجہمؓ نے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں خمیصہ پیش کیا، خمیصہ ایک اونی سیاہ چادر ہوتی ہے، جس کے پلو بنے ہوئے ہوتے ہیں، آپ نے اس کو پہن کر نماز پڑھی، اور چونکہ وہ منقش کپڑا جسم مبارک پر نماز میں تھا، اس لیے اتفاقاً ایک نظر اس پر بھی پڑ گئی، لیکن یہ نظر قائم نہیں رہی " نظر نظرۃً" کے الفاظ ہیں، نماز سے فراغت کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ منقش چادر ابوجہمؓ کو دے آؤ اور ابوجہمؓ سے ان کی انبجانیہ چادر لے آؤ، انبجان ایک جگہ کا نام ہے، یہاں کے کپڑے سادہ اور موٹے ہوتے تھے۔ چنانچہ آپ نے چادر واپس کرا دی اور دوسری چادر منگائی، تاکہ ابوجہم یہ خیال نہ کریں کہ ان کا ہدیہ دربار رسالت سے واپس کر دیا گیا، ان کے لیے یہ خمیصہ بابرکت ہوگا اور میں اپنے لیے منقش کو پسند نہیں کرتا، کیوں کہ اس سے نماز میں توجہ بٹ سکتی ہے، معلوم ہوا کہ نماز تو ہو جاتی ہے کیوں کہ صحت نماز کے لیے صرف کپڑے کا ساتر ہونا شرط ہے، کپڑا منقش ہو یا غیر منقش نماز تو ہو جائے گی، لیکن اگر نمازی یہ خیال کرے کہ ایسا کپڑا نمازی کی توجہ اپنی طرف کھینچتا ہے تو اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

چنانچہ آپ کی نظر نماز کی حالت میں کپڑے پر پڑی تو آپ نے نماز کو نہ تو ختم کیا اور نہ اعادہ فرمایا، بلکہ صرف اس قدر فرمایا کہ یہ فتنہ کا سامان ہے: اَلْهَتْنِيْ اٰنِفاً عَنِ الصَّلٰوۃِ مجھے خطرہ ہوا کہ یہ کپڑا نماز سے مجھے غافل نہ کر دے، چنانچہ دوسری منقطع روایت لا کر بخاری نے اس مفہوم کو واضح کر دیا جس میں آیا " اخاف ان یفتننی " مجھے خوف ہوا کہ یہ فتنہ کا سامان نہ ہو جائے، مسئلہ نکل آیا کہ ایسے کپڑے میں نماز ہو جاتی ہے لیکن اگر فتنہ کا سامان ہو تو سادہ کپڑا استعمال کرنا اولی ہے، جیسا کہ پیغمبر علیہ السلام نے منقش کپڑا واپس فرما دیا اور سادہ چادر طلب فرمائی۔

رہ گئی یہ بات کہ حضرت ابوجہم اس کپڑے کو کیسے استعمال کریں جس کو سرکار دو عالم ﷺ فتنہ کا سامان فرما چکے ہیں، جب حضور کے لیے وہ کپڑا فتنہ کا سبب ہوسکتا ہے تو ابوجہم کے لیے بدرجۂ اولی ہوسکتا ہے، تو سیدھی سادی بات یہ ہے

کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے کپڑا دیا ہے، یہ نہیں فرمایا کہ وہ اس میں نماز بھی ادا کریں، ابوجہم دوسرے طریق پر اس کا استعمال کر سکتے ہیں، دوسری بات شارحین نے یہ کہی ہے کہ ابوجہم چونکہ نابینا تھے اس لیے منقش کپڑا ان کے حق میں سامان فتنہ نہ تھا۔

نیز یہ بھی ضروری نہیں کہ جس چیز کا اثر پیغمبر علیہ السلام کے قلب مبارک پر ہو اس کا اثر عوام کے دل پر بھی ہو، کیوں کہ پیغمبر علیہ السلام کا قلب مبارک تو ایک آئینہ ہے، اور آئینہ جس قدر مجلّٰی ہوگا اسی قدر کمال صفائی اور غایت لطافت کی بنا پر وہ ظاہری نقوش کا اثر جلد قبول کر سکے گا، لیکن اگر آئینہ پر جلاء نہ ہو تو معمولی نقوش کو قبول ہی نہیں کرتا، اس لیے یہ ضروری نہیں کہ جن چیزوں کا اثر سرکار دو عالم ﷺ کے آئینہ قلب پر ہو ان کا اثر عوام پر بھی ہو، اس لیے آپ نے ابوجہمؓ کو چادر واپس فرمادی کہ وہ استعمال کریں گے، تو کچھ مضائقہ نہ ہوگا، پھر یہ کہ آپ کے بھی قلب مبارک پر اثر نہیں ہوا، صرف اندیشہ ہوا، لیکن چونکہ آپ کی شان بیان احکام ہے، اس لیے آپ نے ایک حکم بیان فرمادیا کہ جو چیز بھی نمازی کی توجہ اپنی طرف کھینچتی ہو اس سے بچنا چاہیے۔ واللہ اعلم

## [۱۵] بَابُ اِنْ صَلّٰی فِیْ ثَوْبٍ مُصَلَّبٍ اَوْفِیْهِ تَصَاوِیْرُ هَلْ تَفْسُدُ صَلٰوتُهٗ؟ وَمَا يُنْهٰى مِنْ ذٰلِكَ.

(۳۷۴) حَدَّثَنَا اَبُوْ مَعْمَرٍ عَبْدُ اللهِ بْنُ عَمْرٍو قَالَ نَا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ نَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ صُهَيْبٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ كَانَ قِرَامٌ لِعَائِشَةَ سَتَرَتْ بِهٖ جَانِبَ بَيْتِهَا فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ أَمِيْطِیْ عَنَّا قِرَامَكِ هٰذَا فَاِنَّهٗ لَاتَزَالُ تَصَاوِيْرُهٗ تَعْرِضُ فِیْ صَلَاتِیْ. (آئندہ:۵۹۵۹)

**ترجمہ** باب، اگر نمازی ایسے کپڑے میں نماز پڑھے جس پر صلیب کی شکل بنی ہو، یا ایسی جگہ جہاں اس کے علاوہ دوسری صورتیں ہوں تو کیا اس کی نماز فاسد ہو جائے گی؟ اور ان چیزوں کا بیان جو ایسی چیزوں سے نہی کے سلسلہ میں وارد ہوئی ہیں۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا ایک باریک اونی رنگین منقش پردہ تھا جو انہوں نے اپنے حجرے کے ایک کونے میں ڈال رکھا تھا، چنانچہ نبی اکرم ﷺ نے ان سے فرمایا کہ تم یہ پردہ ہمارے سامنے سے ہٹا دو، اس کی تصویریں برابر میری نماز کے سامنے آتی رہتی ہیں۔

**مقصد ترجمہ** ترجمہ کے الفاظ ہیں "اذا صلی فی ثوب مصلب او فیہ تصاویر الخ" "وفیہ تصاویر" کا عطف اگر "مصلب" پر ہو تو الفاظ کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اگر ایسا کپڑا پہن کر نماز پڑھی جس پر صلیب کا نقش ہو یا دوسری تصویریں ہوں۔ اور اگر "فیہ تصاویر" کا عطف "ثوب" پر قرار دیں تو ترجمہ ہوگا کہ اگر ایسے کپڑے میں نماز پڑھی جس پر

صلیب کا نقش ہو، یا ایسی جگہ نماز پڑھی، جہاں تصویریں ہوں تو اس نماز کا کیا حکم ہے؟ ''ھل تفسد صلوٰتہٗ ام لا'' ایسے کپڑے میں یا ایسی جگہ نماز صحیح رہے گی، یا فاسد ہوجائے گی؟ آگے کہتے ہیں کہ ''وما ینھٰی عنه فی ذٰلك'' یعنی اس سلسلہ میں جو نہی وارد ہوئی ہے، گویا اب ترجمہ کے تین جزء ہوگئے: صلیب دار کپڑے میں نماز، محل تصاویر میں نماز اور تصویر کے بارے میں جو نہی وارد ہوئی ہے اس کا بیان، بخاری نے ترجمہ کے الفاظ میں کوئی فیصلہ نہیں کیا کہ نماز فاسد ہوگی یا نہیں، بلکہ انہوں نے ذیل میں جو روایت پیش کی ہے اس سے یہ مسئلہ نکل رہا ہے کہ نماز فاسد تو نہیں ہوگی، ہاں کراہت رہے گی۔

**روایت باب** روایت میں آیا کہ حضرت عائشہؓ نے اپنے مکان کے ایک گوشہ میں ایک باریک قسم کا منقش کپڑا پردے کے لیے لٹکا رکھا تھا، نبی اکرم ﷺ نے اس جگہ نماز پڑھی، نماز سے فراغت کے بعد ارشاد فرمایا کہ ہمارے سامنے سے یہ پردہ ہٹادو، کیوں کہ اس کی تصویریں نماز میں بار بار میرے سامنے آتی ہیں۔

روایت میں بس اسی قدر ہے، اب اسی روایت سے بخاری کے قائم کردہ ترجمہ کے تینوں اجزاء ثابت کرنے ہیں، ان تینوں اجزاء پر استدلال اس طرح ہوگا کہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت عائشہؓ کے اس پردے کے سامنے نماز پڑھی، لیکن اس پردے کے نقش ونگار کی وجہ سے نہ تو آپ نے نماز کو قطع کیا اور نہ اس نماز کا اعادہ فرمایا، البتہ یہ فرمایا کہ یہ پردہ ہٹادو، اس سے یہ بات سمجھ میں آگئی کہ ایسی صورت میں نماز فاسد تو نہیں؛ لیکن یہ صورت مکروہ ہے، اس سے احتراز کرنا چاہئے۔

''لاتزال تصاویرہ الخ'' آپ نے فرمایا کہ اس پردہ کی تصاویر نماز میں بار بار میرے سامنے آتی ہیں، تصویریں دو طرح کی ہوتی ہیں، ذی روح کی اور غیر ذی روح کی، پھر ان دونوں میں دو صورتیں ہیں، یا تو وہ تصویریں ایسی چیزوں کی ہوں گی، جن کی مشرکین کے یہاں پوجا کی جاتی ہے، یا وہ ہوں گی جن کی پوجا نہیں کی جاتی، روایت باب سے مخصوص طور پر کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ اس پردے پر کیسے نقوش تھے، چلیپا کا نقش تھا، یا اور کچھ تھا؟ آپ کے ارشاد میں صرف اس قدر ہے کہ اس پردے کی تصویریں بار بار میرے سامنے آتی ہیں، اس کو ہٹادو، معلوم ہوا کہ تصویر ذی روح کی ہو یا غیر ذی روح کی، اس کی پوجا کی جاتی ہو یا نہ کی جاتی ہو، بہر صورت تصویر کا نماز میں سامنے آنا نماز میں نقصان کا سبب ہے، لیکن نماز کو فاسد نہیں کرتا، پھر اس میں بھی فرق مراتب کرنا ہوگا کہ جن چیزوں کی پوجا کی جاتی ہے، ان کی تصویر کا سامنے آنا زیادہ برا ہے، بمقابلہ ان چیزوں کے جو یا تو ذی روح کی نہیں، یا ہیں تو ان کو معبود نہیں بنایا گیا، یہیں سے بخاری کا ترجمہ ثابت ہورہا ہے کہ جب ان تصویروں کا سامنے آنا ہی برا ہے، تو اگر یہ تصویریں اس کپڑے پر ہوں جو مصلی کے بدن پر ہے، تو کراہت کا ایک درجہ اور بڑھ جائے گا، اور یہ مسئلہ بھی نکل آیا کہ کراہت کے باوجود یہ کپڑا اگر طاہر اور ساتر عورت ہو تو نماز ہوجائے گی، خواہ کراہت ہی کے ساتھ ہو۔

اسی طرح ایسی جگہ کے بارے میں جہاں تصویریں ہوں تفصیل کرنی پڑے گی کہ وہ تصویر مصلی کی کس جانب ہے؟

اگر پس پشت ہے تو نماز میں کوئی خلل نہیں، کیوں کہ روایت میں " تعرض فی صلوتی " فرمایا گیا ہے، گویا جو تصویر نظر کے سامنے نہ ہو، وہ مضر نہیں، البتہ نظر کے سامنے ہونا نماز میں خلل کا باعث ہے، اس لیے اس سے منع کیا جائے گا، اسی طرح داہنے اور بائیں ہونے میں بھی کسی نہ کسی درجہ میں عرض کی صورت ہو جاتی ہے، اس لیے یہ بھی کراہت سے خالی نہ ہوگا، اب دو صورتیں اور باقی رہ گئیں کہ تصویر سر کے اوپر چھت یا کسی اور طرح ہو، یا پیروں کے نیچے ہو، ان دونوں صورتوں کا حکم یہ ہے کہ سر کے اوپر لگانا یا لٹکانا چونکہ تعظیم کی صورت ہے، اس لیے یہ بھی کراہت سے خالی نہیں ہے، البتہ تحت القدم پامال ہو تو یہ اہانت کی صورت ہے، لہذا اس میں کراہت بھی نہیں۔

اس طرح ترجمہ کے دو پہلے اجزاء تو ثابت ہو گئے، اب رہ گیا ترجمہ کا تیسرا جزء " ومایںھی عنه الخ " اس کا مقصد غالباً یہ ہے کہ کس قسم کی تصاویر سے نہی فرمائی گئی، کیون کہ غیر ذی روح کی تصویر سازی تو قابل اعتراض نہیں، تو اس کا گھروں میں رکھنا بھی جائز ہوا، ذی روح کی تصویر سازی بھی حرام ہے، تو اس کا استعمال بھی حرام قرار پایا، جس کی تفصیل ابھی گزر چکی ہے، خصوصیت کے ساتھ صلیب یعنی چلیپا کا نقش تو اس درجہ قابل نفرت ہے کہ پیغمبر علیہ السلام جہاں بھی اس کا نقش پاتے اس کو مٹا دیتے، یا اس کو اکھاڑ دیتے، جیسا کہ حضرت عائشہ کی روایت سے بصراحت ثابت ہے، غالباً بخاری کی بھی روایات میں آتا ہے کہ جس مکان میں ذی روح کی تصویر ہوتی ہے، اس میں رحمت کا فرشتہ پر نہیں مارتا، مصور پر بھی لعنت ہے، البتہ اگر وہ تصویر اتنی چھوٹی ہو کہ دیکھنے سے اس کے اجزاء یا اعضاء الگ الگ معلوم نہ ہوتے ہوں؛ بلکہ پھول معلوم ہو تو اس کے رکھنے میں مضائقہ نہیں ہے۔

ترجمہ کے ہر سہ اجزاء یعنی ثوب مصلب میں نماز کا عمل محل تصاویر میں نماز کی ادائیگی اور اس میں ممنوع صورت کا ذکر، یہ تینوں اسی حدیث سے ثابت ہو رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اس مقام پر نماز مکروہ ہوئی جہاں تصاویر ہوں تو تصویر والا کپڑا پہن کر بدرجۂ اولیٰ مکروہ ہوگی، اور " مایںھی " کے ذیل میں یہ بات ظاہر ہے کہ مدار نہی عرض تصاویر ہے، جہاں عرض کی صورت پیدا ہوگی، وہاں نہی کا عمل رہے گا، جیسا کہ سابق میں مذکور ہو چکا۔ واللہ اعلم

## [۱۶] بَابُ مَنْ صَلّٰی فِیْ فَرُّوْجِ حَرِیْرٍ ثُمَّ نَزَعَهٗ

(۳۷۵) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ یُوْسُفَ قَالَ نَا اللَّیْثُ عَنْ یَزِیْدَ عَنْ اَبِی الْخَیْرِ عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ قَالَ اُهْدِیَ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ فَرُّوْجُ حَرِیْرٍ فَلَبِسَهٗ فَصَلّٰی فِیْهِ ثُمَّ انْصَرَفَ فَنَزَعَهٗ نَزْعًا شَدِیْدًا کَالْکَارِهِ لَهٗ وَقَالَ لَا یَنْبَغِیْ هٰذَا لِلْمُتَّقِیْنَ . (آئندہ: ۵۸۰۱)

**ترجمہ** باب، جس شخص نے ریشمی قباء میں نماز پڑھی، پھر اس کو اتار دیا؟ حضرت عقبہ بن عامر سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں ریشم کی ایک قباء ہدیہ کی گئی، آپ نے اس کو پہنا اور اس میں نماز پڑھی، پھر آپ نماز سے فارغ ہوئے تو آپ نے اس کو اس طرح جلدی سے اتار کر الگ کر دیا کہ گویا آپ اس سے نفرت فرما رہے

ہیں، اور فرمایا کہ یہ لباس اہل تقوی کا نہیں ہے۔

**مقصد ترجمہ** امام بخاری مسئلہ یہ بیان کررہے ہیں کہ مردوں کے لیے ریشم استعمال کرنا جائز نہیں ہے، لیکن اگر کسی شخص نے ریشم کا لباس پہن کر نماز پڑھ لی تو اس کا کیا حکم ہے؟ بخاری کہتے ہیں کہ نماز ہوجائے گی، اگرچہ پہننا حرام ہے، جیسا کہ محرم کے لیے سلا ہوا کپڑا پہننا حرام ہے، لیکن اگر پہن لے اور نماز پڑھ لے تو نماز ہوجائے گی، ان عوارض سے جو نقصان آتا ہے، اس کی تعبیر کراہت سے کی جاتی ہے۔

**تشریح حدیث** "دومة الجندل" کے حاکم اکیدر نے آپ کی خدمت میں ریشم کا فروج ہدیہ کیا، فروج اس قباء کو کہتے ہیں جو پیچھے سے بھی کٹی ہوئی ہو، گھوڑے پر سواری کے لیے ایسے ہی لباس میں سہولت رہتی ہے، جو آگے پیچھے دونوں طرف سے کھلا ہوا ہو، آپ نے اس کو پہن کر نماز پڑھی، نماز کے بعد آپ نے اس کو اس طرح اپنے بدن سے الگ فرمایا، جیسے کسی چیز سے سخت نفرت ہو اور اس کے ساتھ فرمایا: " لا ینبغی ھذا للمتقین " اہل تقوی کا یہ لباس نہیں؛ لیکن اس کے باوجود آپ نے نماز کو لوٹایا بھی نہیں، معلوم ہوا کہ نماز ہوجائے گی، یہ دوسری بات ہے کہ ریشم کا استعمال درست ہے یا نہیں؟

حریر کے متعلق مذہب یہ ہے کہ اس کا استعمال مخصوص ضرورتوں کے علاوہ مردوں کے لئے حرام ہے، وہ مخصوص ضرورتیں مثلاً جہاد کے موقع پر زرہ کے نیچے حریر کا استعمال درست ہے، تاکہ زرہ کی کڑیاں بدن میں نہ گھسیں اور اگر دشمن کی تلوار زرہ کو کاٹ دے تو تلوار حریر پر جاکر بےکار ہوجائے، یا مثلاً اور کوئی کپڑا نہیں ہے تو ستر پوشی یا سردی سے حفاظت کے لیے لامحالہ اسی کا استعمال کیا جائے گا، یا خشونت جسم کے باعث خشک خارش پیدا ہوگئی ہو، یا جوئیں پڑگئی ہوں اور جہاد کی وجہ سے اس مقام پر فی الفور کوئی دوسری تدبیر بن نہ آتی ہو، تو بضرورت علاج اس کا استعمال مباح ہے، ان جیسی چند ضرورتوں کے علاوہ ریشم کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

آپ نے ارشاد فرمایا: " لاینبغی ھذا للمتقین " متقی کے دو معنی ہیں: ایک متقی عن المعاصی اور دوسرے متقی عن الکفر، متقی عن المعاصی کا مطلب یہ ہے کہ دل میں خوف ہے اس لیے ہر معاملہ میں احتیاط پر عمل کرتا ہے اور معاصی سے بچتا ہے، متقی کا یہ ترجمہ معروف ہے، اور متقی عن الکفر کا مطلب یہ ہے کہ کفر سے بچا ہوا ہے، اس دوسرے معنی کے اعتبار سے آپ کے ارشاد کا مفہوم یہ ہوگا کہ مسلمان کے لیے حریر کا استعمال درست نہیں، اور پہلے معنی کے اعتبار سے ترجمہ یہ ہوگا کہ یہ لباس اہل تقوی کا نہیں ہے، جو بھی معنی مراد لیے جائیں، سوال یہ ہے کہ آپ نے اولاً حریر کا استعمال فرمایا اور نماز کے فوراً بعد ناگواری کے ساتھ اس کو اتار دیا، اس کی کیا وجہ تھی؟ ہوسکتا ہے کہ نماز سے پہلے، جب آپ نے یہ لباس پہنا تھا، اس وقت تک ریشم کی حرمت آپ کو نہ بتلائی گئی ہو، بلکہ نماز کے فوراً بعد اس کی حرمت آپ کو بتائی گئی اور آپ نے ناگواری کے ساتھ اس کو اپنے جسم سے الگ فرمادیا۔ جیسا کہ مسلم کی روایت میں تصریح ہے کہ آپ نے نماز کے فوراً بعد اس لباس کو اتار

دیا اور فرمایا کہ مجھے جبرئیل نے اس سے منع کیا ہے، گویا ممانعت پہلے نہیں تھی اب نازل ہوئی۔
اب اگر ممانعت اسی وقت نازل ہوئی تب تو بات بالکل صاف ہے کہ جب آپ نے استعمال کیا اس وقت تک حرمت نہیں تھی۔ ورنہ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جب تک آپ نے ریشم استعمال نہیں کیا تھا، اس وقت تک آپ کو اس کے عیب ونقصان کا اندازہ نہ تھا، جب آپ نے استعمال کیا تو اس کا عیب معلوم ہوا اور آپ ﷺ نے اپنی سلامت طبع کی بنا پر اس کو ناگواری کے ساتھ اتار دیا۔ عیب مثلاً یہی کہ ریشم عیش پرستوں کا لباس ہے، اس کے استعمال سے جسم میں لینت اور نرمی پیدا ہوتی ہے، جو عورتوں کے مناسب حال ہے، مرد کا جسم تو سخت اور مضبوط ہونا چاہئے، اس کا نزاکت سے کیا واسطہ؟ اس لیے آپ نے اتارتے وقت فرمایا کہ یہ خدا پرستوں کا لباس نہیں، یعنی عیش پرستوں کا لباس ہے، جس سے بچنا چاہئے۔
بہر حال بخاری نے اپنا مطلب نکال لیا کہ گو مردوں کے لیے ریشم کا استعمال حرام ہے، لیکن اگر حریر میں بھی نے نماز پڑھ لی، تو چونکہ نماز کی شرط صرف ستر عورت ہے اس لیے حریر کے استعمال کا گناہ الگ رہا؛ لیکن نماز ہو جائے گی۔ واللہ اعلم

## [۱۷] بَابُ الصَّلٰوةِ فِي الثَّوْبِ الْاَحْمَرِ

(۳۷۶) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَرْعَرَةَ قَالَ حَدَّثَنِيْ عُمَرُ بْنُ اَبِيْ زَائِدَةَ عَنْ عَوْنِ بْنِ اَبِيْ جُحَيْفَةَ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِيْ قُبَّةٍ حَمْرَآءَ مِنْ اَدَمٍ وَرَأَيْتُ بِلَالًا اَخَذَ وَضُوْءَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَرَأَيْتُ النَّاسَ يَبْتَدِرُوْنَ ذٰلِكَ الْوَضُوْءَ فَمَنْ اَصَابَ مِنْهُ شَيْئًا تَمَسَّحَ بِهٖ وَمَنْ لَّمْ يُصِبْ مِنْهُ شَيْئًا اَخَذَ مِنْ بَلَلِ يَدِ صَاحِبِهٖ ثُمَّ رَأَيْتُ بِلَالًا اَخَذَ عَنَزَةً لَهٗ فَرَكَزَهَا وَخَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ فِيْ حُلَّةٍ حَمْرَآءَ مُشَمِّرًا صَلّٰى اِلَى الْعَنَزَةِ بِالنَّاسِ رَكْعَتَيْنِ وَرَأَيْتُ النَّاسَ وَالدَّوَآبَّ يَمُرُّوْنَ مِنْ بَيْنِ يَدَيِ الْعَنَزَةِ۔ (گذشتہ: ۱۸۷)

**ترجمہ** باب، سرخ کپڑے میں نماز کا بیان۔ حضرت ابو جحیفہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو چمڑے کے سرخ خیمہ میں دیکھا اور حضرت بلال کو دیکھا کہ وہ نبی اکرمؐ کے وضوء کا پانی لئے ہوئے تھے اور لوگوں کو دیکھا کہ وہ اس آب وضو کے حصول کے لیے جلدی کر رہے ہیں، جس شخص کو اس پانی کا کچھ حصہ مل جاتا ہے وہ اس کو اپنے چہرے پر مل لیتا ہے اور جس کو اس پانی میں سے کچھ نہیں ملتا، وہ اپنے ساتھی کے ہاتھ کی تری میں سے کچھ حاصل کرتا ہے، پھر میں نے حضرت بلال کو دیکھا کہ وہ ایک نیزہ لیے ہیں، انہوں نے عنزہ[1] زمین میں گاڑ دیا، پھر رسول اکرمؐ سرخ جوڑے میں ازار اُڑسے ہوئے تشریف لائے اور عنزہ کو سترہ بنا کر آپ نے لوگوں کو دو رکعت پڑھائیں، میں نے دیکھا کہ لوگ اور چوپائے عنزہ کے سامنے سے گزر رہے تھے۔

---

[1] عنزہ (عین، نون اور زاء کے فتحہ کے ساتھ) یہ نیزے سے چھوٹا اور عصا سے بڑا ہوتا ہے، اس میں شیام لگی ہوتی ہے، گویا یہ ایک شیام دار لاٹھی ہوتی ہے، جس کو زمین میں نصب کر دیتے ہیں۔ ۱۲

**مقصد ترجمہ** حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے ارشاد فرمایا، بخاری کا مقصد یہ ہے کہ سرخ کپڑے میں نماز بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہ سرخی قرطم کی نہ ہو، یہی بات صحیح ہے، کیوں کہ قرطم یعنی عصفر کے رنگے ہوئے سرخ کپڑے کی ممانعت روایات سے ثابت ہے، اس لیے اس ترجمہ میں حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے جو قید لگائی ہے وہ بالکل درست ہے۔

لیکن حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ اس ترجمہ کا رخ اصل احناف کی تردید کی طرف ہے، کیوں کہ حنفیہ کے نزدیک سرخ رنگ کا لباس مکروہ تحریمی ہے، اور حدیث سے معلوم ہوا کہ آپ نے سرخ حلہ زیب تن فرمایا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ابن حجرؒ احناف کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیتے، چونکہ بہت دیر سے کہیں بخاری کو احناف کے مقابل لانے کا موقع نہیں ملا تھا؛ اس لیے اس موقع پر انہوں نے احناف کے مسلک کی صحیح تحقیق کیے بغیر لکھ دیا کہ ترجمہ احناف کی تردید میں ہے، حالانکہ سرخ رنگ کے استعمال کے سلسلہ میں احناف کے یہاں بہت زیادہ تفصیل ہے، ملا علی قاریؒ نے اس مسئلہ پر تفصیلی کلام فرمایا ہے، احناف کا مسلک اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اگر وہ رنگ عصفر یا زعفران کا ہے تو اس کا استعمال مرد کے لیے مکروہ تحریمی ہے، اور اگر ان دو چیزوں کے علاوہ سرخ رنگ ہو، تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ رنگ شوخ ہے یا پھیکا ہے؟ اگر رنگ شوخ ہے، تو اس کا استعمال مکروہ تنزیہی یا خلاف تقوی ہے اور اگر رنگ پھیکا ہے تو اس کا استعمال مباح ہے۔ پھر اگر یہ سرخ کپڑا دھاری دار ہو، یعنی زمین دوسرے رنگ کی ہو اور اس پر سرخ دھاریاں پڑی ہوں تو اس کے استعمال میں نہ صرف یہ کہ کوئی کراہت نہیں، بلکہ اس اعتبار سے کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام اس کو پسند فرماتے تھے، مستحب یا اس معنی کر کہ پیغمبر علیہ السلام نے اس کو استعمال فرمایا، ترقی کر کے سنت بھی کہا جا سکتا ہے۔ گویا سرخ رنگ کے استعمال میں اختلاف اسباب کی بنا پر احناف کے یہاں مکروہ تحریمی، مکروہ تنزیہی، مباح بلا کراہت، مندوب اور سنیت تک کے اقوال ہیں، پھر یہ کہاں کا انصاف ہے کہ مذہب کی تفصیلات سے یکسر آنکھ بند کر کے حافظ ابن حجرؒ ترجمہ کا رخ احناف کی طرف موڑ دیں۔

**تشریح حدیث** حضرت ابو جحیفہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو سرخ چمڑے کے قبہ میں تشریف فرما دیکھا، آپ کے وضو کا بچا ہوا پانی بلالؓ لے کر آئے، تو لوگوں کا یہ عالم تھا کہ اس پانی پر ٹوٹے پڑتے تھے، جسے وہ پانی مل گیا اس کے زہے نصیب! اس نے اپنے چہرے پر مل لیا، اور جسے نہ مل سکا اس نے کسی دوسرے کے ہاتھ سے تری حاصل کر کے اپنے چہرے پر ملا، اس کے بعد حضرت بلالؓ ایک عنزہ لے کر آئے اور اس کو زمین میں گاڑ دیا، پھر نبی اکرم ﷺ سرخ حلہ زیب تن فرمائے، دامن اٹھائے ہوئے، تشریف لائے اور عنزہ کو سترہ بنا کر دو رکعت نماز لوگوں کو پڑھائی، بخاری کا مقصد اسی جزء سے متعلق ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سرخ حلہ پہن کر نماز ادا فرمائی، ظاہر ہے کہ اس روایت میں دور دور تک یہ ذکر نہیں ہے کہ یہ سرخ رنگ عصفر کا تھا، اس لیے اس روایت کو احناف کی تردید کے لیے پیش نہیں کیا جا سکتا، پھر ابو داؤد کی روایت میں " علیه حلة حمراء من برود یمانیة قطریة " کے

الفاظ ہیں یعنی یہ سرخ حلہ یمنی، قطری چادروں کا تھا، علامہ عینی فرماتے ہیں کہ قطر عمان اور سیف البحر کے درمیان ایک مقام کا نام ہے، قطری اس مقام کی تیار کردہ وہ چادریں کہلاتی ہیں جن میں سرخی ہو، یا وہ کپڑا جس پر سرخ دھاریاں ہوں، چنانچہ حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ نے ارشاد فرمایا کہ حلۂ حمراء کے بارے میں میں نے تلاش کیا تو "احکام القرآن لابن العربی" میں ایک روایت ملی جس سے معلوم ہوا کہ اس حلہ پر سرخ خطوط تھے، پھر ان تفصیلات کے بعد یہ کہنا قطعاً انصاف کے خلاف ہے کہ اس روایت سے احناف کے مسلک پر زد پڑتی ہے۔

آگے راوی کا بیان ہے کہ عنزہ کو سترہ بنا کر آپ نے دو رکعت نماز ادا کی، اور لوگ نیز چوپائے اس سترے کے آگے سے گزر رہے تھے، معلوم ہوا کہ سترے کے اس طرف گزرنے میں مضائقہ نہیں۔　　واللہ اعلم

## [۱۸] بَابُ الصَّلٰوةِ فِي السُّطُوْحِ وَالْمِنبَرِ وَالْخَشَبِ

قَالَ اَبُوعَبْدِ اللهِ وَلَمْ يَرَ الْحَسَنُ بَاْ ساً اَنْ يُصَلِّيَ عَلَى الْجَمْدِ وَالْقَنَاطِيْرِ وَاِنْ جَرٰى تَحْتَهَا بَوْلٌ اَوْ فَوْقَهَا اَوْ اَمَا مَهَااِذَا كَانَ بَيْنَهُمَا سُتْرَةٌ. وَصَلّٰى اَبُوْهُرَيْرَةَ عَلٰى ظَهْرِالْمَسْجِدِ بِصَلٰوةِ الْاِمَامِ وَصَلّٰى ابْنُ عُمَرَ عَلَى الثَّلْجِ.

(۳۷۷) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ نَا سُفْيٰنُ قَالَ نَا اَبُوْحَازِمٍ قَالَ سَأَلُوْا سَهْلَ بْنَ سَعْدٍ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ الْمِنْبَرُ؟ فَقَالَ مَا بَقِيَ فِي النَّاسِ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّي هُوَ مِنْ اَثْلِ الْغَابَةِ عَمِلَهٗ فُلَانٌ مَوْلٰى فُلَانَةٍ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَقَامَ عَلَيْهِ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ حِيْنَ عُمِلَ وَوُضِعَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَكَبَّرَ وَقَامَ النَّاسُ خَلْفَهٗ فَقَرَأَ وَرَكَعَ وَرَكَعَ النَّاسُ خَلْفَهٗ ثُمَّ رَفَعَ رَاْسَهٗ ثُمَّ رَجَعَ الْقَهْقَرٰى فَسَجَدَ عَلَى الْاَرْضِ ثُمَّ عَادَ عَلَى الْمِنْبَرِ ثُمَّ قَرَأَ ثُمَّ رَكَعَ ثُمَّ رَفَعَ رَاْسَهٗ ثُمَّ رَجَعَ قَهْقَرٰى حَتّٰى سَجَدَ بِالْاَرْضِ فَهٰذَا شَانُهٗ. قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللهِ قَالَ عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ سَأَلَنِيْ اَحْمَدُ بْنُ حَنْبَلٍ عَنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ قَالَ وَاِنَّمَا اَرَدْتُّ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ كَانَ اَعْلٰى مِنَ النَّاسِ فَلَا بَاْسَ اَنْ يَّكُوْنَ الْاِمَامُ اَعْلٰى مِنَ النَّاسِ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ. قَالَ فَقُلْتُ فَاِنَّ سُفْيٰنَ ابْنَ عُيَيْنَةَ كَانَ يُسْئَلُ عَنْ هٰذَا كَثِيْراً فَلَمْ تَسْمَعْهُ مِنْهُ قَالَ لَا.　　(آئندہ: ۴۴۸، ۹۱۷، ۲۰۹۴، ۲۵۶۹)

**ترجمہ** باب، چھت، منبر اور تختوں پر نماز پڑھنے کا حکم۔ ابوعبداللہ بخاری کہتے ہیں کہ حضرت حسن، برف اور پلوں پر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے، اگرچہ پلوں کے نیچے یا اوپر یا سامنے پیشاب بہہ رہا ہو، اگر پیشاب کے سامنے ہونے کی صورت میں نمازی اور پیشاب کے درمیان کوئی چیز حائل ہو۔ حضرت ابوہریرہؓ نے امام کے پیچھے مسجد کی چھت پر نماز ادا کی اور حضرت ابن عمرؓ نے برف پر نماز پڑھی۔ حضرت ابوحازم سے روایت ہے کہ لوگوں نے حضرت

سہل بن سعد سے دریافت کیا کہ آپ علیہ السلام کا منبر کس چیز سے تیار کیا گیا تھا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں لوگوں میں مجھ سے زیادہ جاننے والا اب کوئی نہیں ہے، مقام غابہ کے جھاؤ کے درخت سے تیار کیا گیا تھا، اور اس منبر کو رسول اکرم علیہ السلام کے لیے فلاں عورت کے فلاں غلام نے تیار کیا تھا، جب وہ منبر تیار ہو گیا اور مسجد میں رکھ دیا گیا تو آپ اس پر کھڑے ہوئے، قبلہ کا استقبال کیا اور تکبیر کہی، لوگ آپ کے پیچھے اقتداء کے لیے کھڑے ہوئے، پھر آپ نے قراءت کی اور رکوع کیا، لوگوں نے آپ کے پیچھے رکوع کیا، پھر آپ نے رکوع سے سر مبارک اٹھایا، پھر آپ الٹے پاؤں پیچھے ہٹے اور زمین پر سجدہ کیا، پھر منبر پر گئے، پھر قراءت کی اور رکوع کیا، پھر رکوع سے سر اٹھایا، پھر الٹے پاؤں پیچھے ہٹے اور زمین پر سجدہ کیا۔ یہ اس منبر کا حال ہے جس کے بارے میں سوال کیا گیا۔

مؤلف کہتے ہیں کہ علی بن عبداللہ مدینی نے کہا کہ مجھ سے احمد بن حنبل نے اس حدیث کے بارے میں سوال کیا اور کہا کہ میرا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم علیہ السلام لوگوں سے بلند جگہ پر تھے، اس لیے اس حدیث کی رو سے اس چیز میں کوئی حرج نہیں کہ امام مقتدیوں سے بلند جگہ پر ہو؟ علی بن مدینی کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے کہا کہ سفیان بن عیینہ سے اس روایت کے بارے میں بہت سوال کیا جاتا تھا، کیا تم نے ان سے یہ روایت نہیں سنی؟ تو انہوں نے فرمایا نہیں۔

**سابق سے ربط** کتاب الصلوۃ کے آغاز میں امام بخاریؒ نے سب سے پہلے فرضیت صلوۃ کے مسئلہ سے بحث کی ہے، اس کے بعد شرائط صلوۃ کے سلسلہ میں ستر عورت کی شرط کو مقدم ذکر کیا، کیوں کہ ستر عورت خارج صلوۃ اور داخل صلوۃ دونوں حالتوں میں ضروری ہے، داخل صلوۃ میں تو اگر بغیر مجبوری کے ستر کھلا رہ جائے، تو نماز ہی نہیں ہوگی۔

اب امام بخاریؒ دوسری شرط یعنی نماز کی جگہ کی طہارت بیان کرنا چاہتے ہیں، اس کا مختصر بیان یوں سمجھئے کہ محل صلوۃ کی طہارت کا حاصل بس اس قدر ہے کہ مصلی جہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھ رہا ہے وہ جگہ اور جس جگہ سجدہ ہو وہ مقام پاک ہونا چاہئے، خواہ ماحول کتنا ہی گندہ اور آلودہ ہو، ایسی جگہ نماز ادا کرنے سے نماز کا فرض پورا ہو جائے گا اور نماز صحیح اور درست مانی جائے گی، اس سے قطع نظر کہ وہ پاک جگہ اونچی ہو یا نیچی، ہموار ہو یا ناہموار، گڑھا ہو یا ٹیلہ، زمین کا کوئی قطعہ ہو یا بالا خانہ، مکان کی چھت ہو یا منبر کے درجات ہوں، یا گندے نالے کا پل ہو، خواہ پل کے اوپر نیچے نجاست بہہ رہی ہو، بلکہ خود پل پر مصلی کے سامنے بھی پیشاب بہہ رہا ہو، لیکن مصلی کی سجدہ گاہ اور کھڑے ہونے کی جگہ محفوظ ہو تو نجاست کے بہنے سے اس کی نماز پر کوئی اثر نہیں پڑے گا، اسی طرح یہ بھی ضروری نہیں کہ جس زمین پر نماز پڑھے، اس پر کسی قسم کا فرش ہو تو وہ جنس ارض کی کسی چیز کا ہو، بلکہ ہر قسم کے پاک فرش کو زمین پر پھیلا کر نماز پڑھ سکتا ہے، وہ فرش خواہ تختوں کا ہو یا بورے کا ہو، یا دری اور قالین کا ہو، یا پوستین اور کمبل کا، یا برف نے زمین پر اپنی تہ جما رکھی ہو، یا پانی پر منجمد برف کی تہہ چھت کے طور پر قائم ہو گئی ہو، اسی طرح شب خوابی کے بستر پر بھی نماز درست ہے، بلکہ اگر عورت اس پر لیٹی ہو

اور قرب کے باعث مصلی کا کپڑا اس کے بدن پر گر رہا ہو، تو ہر صورت میں نماز ہو جائے گی۔ غرض یہ کہ صرف نماز کی جگہ کا پاک ہونا شرط ہے، اگر یہ شرط پوری ہو جاتی ہے، تو نماز بہر حال ہو جائے گی۔

**مقصد ترجمہ** چنانچہ اس سلسلہ میں امام بخاریؒ نے جو پہلا باب منعقد فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ مکان کی چھت پر نماز پڑھیں یا منبر پر یا لکڑی کے تختوں پر، یہ سب صورتیں جائز ہیں، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ نے ارشاد فرمایا کہ بخاری کا مقصد یہ ہے کہ ''جعلت لی الارض مسجداً و طھوراً'' کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ زمین پر بغیر حائل کے سجدہ ہونا چاہئے، بلکہ اگر زمین اور مصلی کے درمیان چھت، تختہ یا منبر ہو تو یہ سب صورتیں جائز قرار دی جائیں گی۔

ہمارے خیال میں بھی بخاری اس مسئلہ میں توسع ثابت کرنا چاہتے ہیں، اور انہوں نے اس کے لئے راہ یہ اختیار کی ہے کہ دراصل جگہ کی طہارت ضروری ہے، اگر جگہ پاک ہے، تو چھت اور سطح زمین کا فرق نہیں ہے۔

سلف میں حضرت حسن بصریؒ، حضرت ابن سیرین، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت ابن عمرؓ سے الواح اور اخشاب پر نماز کی کراہت منقول ہوئی ہے، اس لیے بخاری کو ترجمہ میں ''والخشب'' کی تصریح کرنی پڑی کہ تختوں پر بھی نماز درست ہے۔

**حسن بصریؒ کا مسلک** ''ولم یرا لحسن بأساً ان یصلی علی الجمد'' حضرت حسن بصری برف پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے تھے، یعنی مثلاً پانی پر جو برف جم جاتی ہے، وہ پانی پر بمنزلہ چھت کے ہے، جیسے مکان کی چھت ہوتی ہے، اس پر نماز درست ہے، اسی طرح منجمد برف پر جو پانی کی چھت ہے، نماز درست ہے۔

اس معنی کے اعتبار سے لفظ ''جَمْد'' بسکون المیم وفتح الجیم ہوگا، یعنی جما ہوا پانی، برف، لیکن برف پر نماز کی صحت اس پر موقوف ہے کہ سجدہ کی حالت میں پیشانی زمین پر ڈال دی جائے محض پیشانی سے برف کا چھو جانا ادائے سجدہ میں کافی نہ ہوگا، کیوں کہ سجدہ کی حقیقت زمین پر پیشانی ڈال دینا ہے، نہ کہ محض زمین کا چھو جانا۔

اور اگر حضرت حسن بصریؒ کے قول کو جُمُد نہ پڑھیں، جمد (جیم کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ) پڑھیں تو اس کا ترجمہ سخت اور بلند زمین ہوگا، یہ معنی بھی مراد لیے جا سکتے ہیں، اس وقت مناسبت یہ ہوگی کہ جس طرح چھت بلند ہوتی ہے اور اس پر نماز پڑھ سکتے ہیں اسی طرح اگر بلندی بغیر چھت کے خود زمین ہی میں ہو، تب بھی نماز پڑھنے میں مضائقہ نہیں۔

آگے فرماتے ہیں ''والقناطیر وان جری الخ'' ''قنطرہ'' پتھر کے پل کو کہتے ہیں، لکڑی کے پل کو ''جسر'' کہا جاتا ہے، پل پر نماز چھت اور منبر دونوں کے مشابہ ہے، کہ جس طرح چھت اور منبر کے نیچے خلا ہوتا ہے، اسی طرح پل کے نیچے خلا ہوتا ہے، فرماتے ہیں کہ پل پر نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، خواہ اس کے نیچے یا اوپر یا سامنے پیشاب بہہ رہا ہو، بشرطیکہ نمازی اور پیشاب کے درمیان آڑ ہو، یعنی اس حصہ میں پیشاب نہ پہنچ سکے جس سے

مصلی کے قیام اور سجدے کا تعلق ہو۔

**حضرت ابو ہریرہؓ اور ابن عمرؓ کا عمل** ''صلّی ابو هریرة علیٰ ظهر المسجد الخ'' حضرت ابو ہریرہؓ نے مسجد کی چھت پر امام کی اقتداء کی۔ معلوم ہوا کہ چھت پر نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں اور اس کا بھی جواز معلوم ہوا کہ اگر امام کے ساتھ کچھ لوگ نیچے کھڑے ہو جائیں اور کچھ لوگ کسی عذر سے امام سے بلند جگہ پر ہوں تو نماز ہو جاتی ہے۔ احناف اور شوافع کے یہاں یہ ضروری ہے کہ مقتدی چھت پر امام کے آگے نہ ہوں، ''وصلّی ابن عمر علی الثَّلجِ'' حضرت ابن عمرؓ نے برف پر نماز پڑھی، شرط یہی ہے کہ برف سخت ہو اور پیشانی اس پر جما کر سجدہ کیا جائے، ورنہ اگر ایسی صورت ہے کہ برف میں تلبُّد نہیں آیا ہے، یا برف میں تلبد آ گیا ہے، لیکن پیشانی جما کر سجدہ نہیں کیا جا سکا، تو چونکہ حقیقت سجدہ متحقق نہیں ہوئی اس لئے نماز نہیں ہوگی، سجدہ میں دو چیزیں شرط ہیں، ایک تو یہ کہ جس پر سجدہ کیا جا رہا ہو، وہ اتنی سخت ہو کہ پیشانی اس پر رک جائے، اسی لیے روئی پر سجدہ نہیں ہوتا، دوسری شرط ''طرح اور القاءُ الجبہۃ'' ہے یعنی سر ڈال دیا جائے، صرف مسجود علیہ کا چھونا کافی نہیں ہے۔　　واللہ اعلم

**تشریح حدیث** حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے دریافت کیا گیا کہ حضور اکرم ﷺ کا منبر کس چیز کا تھا؟ انہوں نے فرمایا کہ آج اس منبر کے متعلق مجھ سے زیادہ معلومات کسی کو نہیں، حضرت سہلؓ مدینہ منورہ میں سب سے آخر میں وفات پانے والے صحابی ہیں، اس لیے ان کا یہ فرمانا کہ اس سلسلہ میں مجھ سے زیادہ معلومات کسی کو نہیں، اس معنی کر بھی ہو سکتا ہے کہ سب حضرات کا انتقال ہو چکا ہے، اور یہ بھی مطلب ہو سکتا ہے کہ یہاں میرے سوا اس کو جاننے والا کوئی نہیں، پھر فرمایا کہ آپ کا منبر مقام غابہ کے جھاؤ کے درخت سے بنایا گیا تھا، معتبر روایات کے مطابق عائشہ انصاریہؓ کے میمون نامی غلام نے یہ منبر تیار کیا تھا، جو مدینہ منورہ میں نجاری کی شہرت رکھتا تھا،[1] منبر پر کھڑے ہو کر امامت کی وجہ مسلم کی روایت میں یہ بیان کی گئی ہے کہ بغیر منبر کی امامت میں آپ کو صرف وہ لوگ دیکھ سکتے تھے، جو پہلی صف میں ہوں، پچھلی صفوں کے لوگ اگلی صفوں کو دیکھ کر اقتداء کرتے تھے، آپ نے خیال فرمایا کہ تمام مقتدی آپ کی نماز کا مشاہدہ کر لیں، اس لیے آپ نے منبر پر کھڑے ہو کر امامت فرمائی، چنانچہ آپ ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر نماز شروع فرمائی قرأت اور رکوع منبر پر فرمایا، رکوع سے سر اٹھایا تو منبر پر سجدہ کی جگہ نہ تھی، اس لیے پچھلے پاؤں اترے تاکہ قبلہ سے

---

[1] رہا یہ کہ منبر کی تیاری کا یہ واقعہ کب پیش آیا؟ حافظ ابن حجرؒ نے ۹ھ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ذوالیدین کے واقعہ میں یہ آیا ہے کہ نماز کے بعد رسول اکرم ﷺ درخت کے ایک تنے کے سہارے کھڑے ہوئے، ظاہر ہے کہ درخت کا یہ تنہ وہی تھا، جس سے منبر کی تیاری کے بعد رونے کی آواز سنی گئی تھی، حنفیہ ذوالیدین کے واقعہ کو نسخ کلام سے پہلے کا بیان کرتے ہیں، اس لیے حافظ ابن حجرؒ تیاری منبر کے اس واقعہ کو ۹ھ میں ثابت کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ذوالیدین کے واقعہ کو زیادہ سے زیادہ مؤخر ثابت کر سکیں، لیکن اول تو یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ یہ واقعہ ۹ھ کا ہے، دوسرے یہ کہ معتبر روایات سے یہ ثابت ہے کہ ذوالیدین غزوۂ بدر میں شہید ہوئے ہیں، اس لیے یہ ماننا ہوگا کہ ذوالیدین کا وہ واقعہ بدر سے پہلے کا ہے، اور اس طرح حافظ ان دور از کار راستوں سے اپنا کام نہیں نکال سکیں گے۔ تفصیل اپنی جگہ آئے گی۔　　واللہ اعلم

انحراف نہ ہو اور منبر کی جڑ میں سجدہ کیا، بخاری کا ترجمہ ثابت ہو گیا، ترجمہ کے تین جز تھے، چھت، منبر اور تختوں پر نماز کا جواز، روایت میں آ گیا کہ آپ نے منبر پر نماز پڑھی جو لکڑی کا تھا اور سطح زمین سے بلند تھا، تینوں اجزاء اسی روایت سے ثابت ہو گئے۔

آپ کا یہ منبر دو سیڑھیوں اور ایک نشست گاہ پر مشتمل تھا، منبر سے اترنے میں عمل کثیر کا شبہ نہیں ہونا چاہئے، اول تو ایک ہی قدم چل کر زمین پر اترا جا سکتا ہے، دوسرے یہ کہ حنفیہ کے نزدیک دو قدم سے زیادہ چلنا اس وقت عمل کثیر کہلائے گا جب اس میں تسلسل ہو، اگر تسلسل نہ ہو بلکہ صورت یہ ہے کہ ایک قدم اٹھایا اور رک گئے، پھر چلے اور رک گئے تو یہ عمل کثیر نہیں بلکہ عمل قلیل کا تکرار ہے، اس لیے آپ کے منبر سے اتر کر سجدہ کرنے سے عمل کثیر پر استدلال نہیں ہو سکتا۔

" قال ابو عبداللہ الخ" علی بن مدینی، بخاری کے استاذ کہتے ہیں کہ مجھ سے امام احمدؒ نے اس حدیث کے متعلق دریافت کیا کہ کیا اس روایت کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح رسول اکرم ﷺ نے منبر پر نماز پڑھائی اور آپ مقتدیوں سے اونچے تھے، اسی طرح اگر امام قوم کے بالمقابل کسی اونچی جگہ کھڑے ہو کر نماز پڑھائے تو یہ اس حدیث کی رو سے جائز ہونا چاہئے؟ اس سوال پر علی بن مدینی نے امام احمدؒ سے کہا کہ مجھے تعجب ہے، کیا آپ نے سفیان بن عیینہ سے اس روایت کے بارے میں کچھ نہیں سنا، سفیان سے اس مسئلہ کے متعلق بار بار پوچھا گیا، تو امام احمدؒ نے کہا کہ میں نے نہیں سنا، یعنی میں نے پوری بات نہیں سنی، اتنا تو سنا ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے منبر تیار کرایا اور وہ مسجد میں رکھا گیا، خود مسند احمد میں سفیان سے اتنی روایت موجود ہے، لیکن اس منبر پر نماز بھی پڑھائی، یہ حصہ امام احمد کے پاس نہیں ہے، علی بن مدینی سے یہ حصہ بھی معلوم ہو گیا کہ منبر پر نماز پڑھی گئی۔

رہا یہ مسئلہ کہ امام مقتدی سے اونچائی پر کھڑا ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ تو مسئلہ یہ ہے کہ بے ضرورت تو امام کا مقتدی سے یا مقتدی کا امام سے بلندی پر کھڑا ہونا کراہت سے خالی نہیں، البتہ اگر یہ فرق کسی ضرورت کی بنا پر ہو رہا ہے، تو یہ اس حدیث کی رو سے جائز ہے، امام کے اونچا کھڑے ہونے کی وجہ مثلاً یہ ہو سکتی رہے کہ پچھلی صفوں والے مقتدی حضرات بھی امام کی حرکات وسکنات سے باخبر رہ سکیں، جیسا کہ تعلیم کی غرض سے خود سرکار دو عالم ﷺ نے منبر پر کھڑے ہو کر نماز پڑھائی۔ اسی طرح مقتدی کے امام سے اونچا ہونے کی ضرورت یہ ہو سکتی ہے کہ امام کی تکبیرات دوسرے مقتدیوں تک پہونچانے کے لیے کوئی مقتدی بلند جگہ کھڑا ہو جائے۔ یا مثلاً جمعہ میں مجمع زیادہ ہو، جگہ کم رہ جائے، تو فصیل یا چھت پر نماز پڑھنے کی نوبت آ جائے وغیرہ۔ بے ضرورت اس اونچائی کو مکروہ اس لیے کہا گیا ہے کہ جگہ کی بلندی امام یا مقتدی کا ایسا امتیاز ہے جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی، امام کی امامت کے لیے شریعت نے صرف یہ امتیاز باقی رکھا ہے کہ وہ آگے کھڑا ہوگا، اسی لیے جب امام سلام پھیر دیتا ہے تو امام کے لیے یہ مناسب نہیں کہ وہ اپنی پشت قوم طرف کئے رہے، بلکہ امام کو داہنی یا بائیں جانب مڑ جانا چاہئے، کیوں کہ نماز سے فراغت کے بعد امام کی حیثیت ختم ہو گئی ہے، اسی طرح بے

ضرورت اونچا رہنا بھی پسندیدہ نہیں ہے۔ اور جب امام کے لیے درست نہیں تو مقتدی کے لیے بھی بدرجہ اولیٰ پسندیدہ نہ ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ امام کی بے ضرورت بلندی میں اہل کتاب سے تشبّہ ہے اور مسلمانوں کو جہاں تک ممکن ہو اس تشبہ سے بچنا چاہئے، البتہ ضرورت کے موقعہ پر جواز میں کوئی شبہ نہیں۔ واللہ اعلم

(۳۷۸) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحِيْمِ قَالَ نَا يَزِيْدُ بْنُ هَارُوْنَ قَالَ اَنَا حُمَيْدُ الطَّوِيْلُ عَنْ اَنَسِ بنِ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَقَطَ عَنْ فَرَسِهِ فَجُحِشَتْ سَاقُهُ اَوْ كَتِفُهُ وَالٰى مِنْ نِّسَآئِهِ شَهْراً فَجَلَسَ فِيْ مَشْرُبَةٍ لَهُ دَرَجَتُهَا مِنْ جُذُوْعِ النَّخْلِ فَاَتَاهُ اَصْحَابُهُ يَعُوْدُوْنَهُ فَصَلّٰى بِهِمْ جَالِساً وَهُمْ قِيَامٌ فَلَمَّا سَلَّمَ قَالَ اِنَّمَا جُعِلَ الْاِمَامُ لِيُؤْتَمَّ بِهِ فَاِذَا كَبَّرَ فَكَبِّرُوْا وَاِذَا رَكَعَ فَارْكَعُوْا وَاِذَا سَجَدَ فَاسْجُدُوْا وَاِنْ صَلّٰى قَآئِماً فَصَلُّوْا قِيَاماً وَنَزَلَ لِتِسْعٍ وَّعِشْرِيْنَ فَقَالُوا يَا رَسُوْلَ اللهِ! اِنَّكَ اٰلَيْتَ شَهْراً فَقَالَ اِنَّ الشَّهْرَ تِسْعٌ وَّعِشْرُوْنَ. (آئندہ: ۶۸۹، ۷۳۲، ۷۳۳، ۸۰۵، ۱۱۱۴، ۱۹۱۱، ۲۴۶۹، ۵۲۰۱، ۵۲۸۹، ۶۶۸۴)

**ترجمہ** حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ گھوڑے سے گر گئے اور آپ کی پنڈلی یا شانہ مجروح ہوگیا۔ اور آپ نے ایک ماہ تک ازواج مطہرات کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی اور اپنے بالا خانہ میں تشریف فرما ہوئے، جس کی سیڑھی، کھجور کے تنوں کی تھی، چنانچہ صحابۂ کرام آپ کی عیادت کے لیے آئے، آپ نے صحابۂ کرام کو بیٹھ کر نماز پڑھائی اور وہ کھڑے ہوئے تھے، پھر جب آپ نے سلام پھیر دیا تو فرمایا کہ امام صرف اس لیے بنایا گیا کہ اس کی اقتداء کی جائے، جب وہ تکبیر کہے تو تم بھی تکبیر کہو، جب وہ رکوع کرے تو تم بھی رکوع کرو، جب وہ سجدہ کرے تو تم بھی سجدہ کرو، اگر وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھے تو تم بھی کھڑے ہو کر اس کی اقتداء کرو۔ اور آپ نے انتیس یوم میں بالا خانہ سے نزول فرمایا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ نے ایک ماہ الگ رہنے کی قسم کھائی تھی، آپ نے فرمایا کہ مہینہ انتیس دن کا ہے۔

**روایت باب کے دو واقعات** ذی الحجہ ۵ھ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نبی اکرم ﷺ گھوڑے سے گر گئے اور آپ کی پنڈلی یا شانہ مجروح ہوگیا، چوٹ معمولی نہیں بلکہ زیادہ تھی، بعض روایات میں "انفکت قدمه" کے الفاظ آئے ہیں، یعنی آپ کا قدم مبارک اتر گیا تھا، اس وقت چونکہ عذر تھا، اس لیے آپ بالا خانہ پر رہتے تھے، تاکہ صحابہ کو عیادت اور زیارت کی سہولت رہے، وہیں نمازیں پڑھتے، صحابۂ کرام عیادت کے لیے تشریف لاتے اور موقع پاکر نماز میں شریک ہوجاتے تھے، یہ ایک واقعہ ہے۔

دوسرا واقعہ بالا خانہ ہی پر قیام کا ۹ھ میں پیش آیا، اس وقت آپ نے ایک ماہ تک ازواج مطہرات سے الگ رہنے کی قسم کھائی، یہ لغوی ایلاء تھا، اس لیے آپ نے بالا خانہ پر قیام فرمایا، پہلے واقعہ میں بالا خانہ پر قیام معذوری کے سبب

ہے اور دوسرے واقعہ میں تخلیہ کی غرض سے ہے، پہلے واقعہ میں آپ معذوری کے سبب مسجد میں تشریف نہ لاتے تھے، لیکن دوسرے واقعہ میں آپ کا مسجد میں تشریف لانا ثابت ہے، آپ حسب معمول نماز کے اوقات میں مسجد میں تشریف لا کر امامت فرماتے تھے؛ چنانچہ خود بخاری میں دوسرے واقعہ کی تفصیلات میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فجر کی نماز مسجد میں آپ کے پیچھے ادا کی۔ پہلے واقعہ کے ۵ھ میں ہونے کی تصریح ابن حبان نے کی ہے، لیکن حافظ ابن حجر کو دھوکا لگ گیا اور انہوں نے دونوں واقعات کو ایک ہی سلسلہ میں رکھ دیا، فتح الباری جلد ثامن میں یہ بحث ہے، حالانکہ ان دونوں واقعات میں قدرِ مشترک صرف بالا خانہ کا قیام ہے، غالباً اسی قدر مشترک کے سبب راوی نے ان دو واقعات کو جن میں چار سال کا فاصلہ ہے ایک ہی روایت میں ذکر کیا ہے۔

**ترجمہ کا ثبوت** دونوں واقعات کی روایت کا حاصل یہ ہے کہ آپ نے بالا خانہ پر قیام فرمایا اور نماز پڑھی، اس نماز پر صادق ہے کہ یہ مرتفع مکان اور چھت کی نماز ہے، پھر وہ چھت اگر لکڑی کی تھی، تو اس سے صلوۃ علی الخشب بھی نکل آیا۔ اصل یہ ہے کہ ان تفصیلات کی ضرورت ہی نہیں، کیوں کہ بخاری نے یہ چند جزئیات چھت، پل، منبر، برف وغیرہ تمثیلاً ذکر کی ہیں، ورنہ حضرت شاہ ولی اللہ کے بیان کردہ مقصد کے مطابق تو بخاری غیر ارض پر نماز کا حکم بیان کر رہے ہیں، جو بہر حال ثابت ہے، یا پھر یہ کہ بخاری کا اصل مدعا جگہ کی طہارت کا اثبات ہے اور یہ چیزیں بطور مثال ذکر کی ہیں، جگہ طاہر ہے تو وہ بالا خانہ کی چھت ہو یا اور کوئی صورت ہو، بخاری کا مدعا ثابت ہو جائے گا۔

**تشریح حدیث** روایت میں آیا کہ جب صحابۂ کرام بالا خانہ پر عیادت کے لئے آئے تو انہوں نے دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں، صحابۂ کرام اس کو غنیمت سمجھتے تھے، اعتکاف کے زمانے میں بھی صحابۂ کرام سے ایسا منقول ہوا ہے کہ حاضر خدمت ہوئے اور دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں تو شامل ہو گئے۔ ظاہر یہی ہے کہ صحابۂ کرام فریضہ مسجد میں ادا کر کے حاضر خدمت ہوئے ہوں گے، لیکن حصول برکت کے لیے انہوں نے آپ کی اقتداء میں نفل کی نیت کر لی۔ رہا یہ کہ نفل کی جماعت ہو سکتی ہے یا نہیں؟ چنانچہ ابن حزم نے اسی روایت سے استدلال کیا ہے کہ ہو سکتی ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ استدلال علی الاطلاق محل نظر ہے، روایت سے صرف یہ معلوم ہو رہا ہے کہ اگر بغیر تداعی کے کچھ لوگ از خود جمع ہو جائیں اور وہ نفل نماز میں کسی مقتدیٰ کی اقتداء سے برکت حاصل کرنا چاہیں تو اس کی گنجائش ہے، علی الاطلاق نفل کی جماعت پر استدلال درست نہیں قرار دیا جائے گا۔

روایت میں آیا کہ صحابہؓ نے کھڑے ہو کر آپ کی اقتداء کی جب کہ آپ بیٹھ کر نماز پڑھا رہے تھے، معلوم ہوا کہ قائم کی اقتداء قاعد کے پیچھے درست ہے، امام مالک اس سے مطلقاً منع کرتے ہیں، امام احمدؒ نے ایک تفصیل فرمائی ہے اور بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں روایات میں جو تعارض نظر آ رہا تھا امام احمد نے اس کے رفع کی ایک صورت نکالی ہے، اور کہا ہے کہ اثناءِ صلوۃ میں قعود طاری ہو تو قائم کی اقتداء قاعد کے پیچھے درست ہے اور اگر امام ابتداء سے بیٹھا ہوا ہو، تو مقتدی

کھڑے ہوکر اس کی اقتداء نہیں کرسکتے، ان دونوں حضرات کا استدلال یہ ہے کہ آپ نے نماز سے فراغتؐ کے بعد فرمایا کہ امام اس لیے بنایا جاتا ہے کہ اس کا اتباع کیا جائے، یعنی اگر کسی کو امام بناؤ تو اس کے اوراپنے عمل میں مشاکلت ہونی چاہئے، پھر ذہنوں میں راسخ کرنے کے لیے آپ نے اس کی تفصیل بھی فرمادی کہ اگر نماز کھڑے ہوکر پڑھنی ہے تو قائم کی اقتداء کرو، اگر کھڑے ہوکر بیٹھے ہوئے کی اقتداء کروگے تو یہ موضوع امامت کے منافی ہوگا۔

احناف اور شوافع کے یہاں امام قاعد کی اقتداء کھڑے ہوکر درست ہے، روایت باب کا جواب یہ ہے کہ چونکہ صحابۂ کرام کی یہ نماز درست قراردی گئی، اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا حکم استحباب پر محمول تھا اور نافلہ سے متعلق تھا، مرض الوفات کے واقعہ نماز سے بھی جمہور کی تائید ہوتی ہے۔ تفصیل آئندہ آئے گی۔

آگے آیا کہ انتیس دن کے بعد آپ بالا خانہ سے اترے، یہ پھر دوسری ایلاء والی روایت کا جز آ گیا، صحابۂ کرام نے عرض کیا کہ آپ نے ایک ماہ تک علیحدگی کی قسم کھائی تھی اور ابھی ۲۹ دن ہوئے ہیں، آپ نے فرمایا کہ مہینہ انتیس دن کا بھی ہوتا ہے، یعنی تم نے خیال کیا ہوتا کہ یہ ماہ انتیس دن کا ہی ہوگا، اسی لئے تو میں انتیس دن میں اتر آیا ہوں، یہ بھی کہا گیا ہے کہ " الشھر " میں الف لام عہد کا ہے، یعنی یہ مہینہ انتیس دن کا ہے۔　　　واللہ اعلم

## [۱۹] بَابٌ اِذَا اَصَابَ ثَوْبُ الْمُصَلِّی اِمْرَاَتَهٗ اِذَا سَجَدَ

(۳۷۹) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ عَنْ خَالِدٍ قَالَ حَدَّثَنَا سُلَیْمَانُ الشَّیْبَانِیُّ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَدَّادٍ عَنْ مَیْمُوْنَةَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُصَلِّی وَاَنَا حِذَاءَهٗ وَاَنَا حَائِضٌ وَرُبَمَا اَصَابَنِیْ ثَوْبُهٗ اِذَا سَجَدَ، قَالَتْ وَکَانَ یُصَلِّی عَلَی الْخُمْرَةِ.　　　(گذشتہ: ۳۳۳)

**ترجمہ** باب، اگر سجدے کی حالت میں نمازی کا کپڑا اس کی بیوی کے بدن سے مس کرجائے؟ حضرت میمونہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ نماز ادا فرماتے تھے اور میں بحالت حیض آپ کی روبرو لیٹی ہوتی، بسا اوقات آپ کا کپڑا سجدہ کی حالت میں میرے بدن پر پڑجاتا تھا، حضرت میمونہؓ نے یہ فرمایا کہ آپ چھوٹے بوریئے پر نماز پڑھتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** نماز کی حالت میں اگر مصلی کا کپڑا عورت کے بدن سے مس ہوتا رہے تو اس سے نماز میں نقصان نہیں آتا، مطلب یہ ہے کہ اگر نمازی کے قریب اس کی بیوی سورہی ہو اور نمازی کے کپڑے کا کوئی گوشہ سجدہ وغیرہ میں جاتے وقت عورت کے بدن پر گرجائے تو اس کا مضائقہ نہیں، نماز بے کھٹکے ہوجائے گی، کیوں کہ صحت نماز کی شرط تو صرف مقام صلوۃ کی طہارت ہے، یعنی اگر نمازی کے سجدے اور قیام کی جگہ پاک ہے تو قریب میں عورت کے لیٹے رہنے سے خواہ وہ کسی جانب ہو نقصان نہیں آتا، اور قریب میں لیٹے رہنا تو درکنار اگر نمازی کا کپڑا ابھی عورت کے بدن

سے لگتا رہے تو کوئی اندیشہ نہیں، بلکہ اگر قربت اس درجہ کی ہو کہ نمازی کا کپڑا کچھ نمازی کے بدن پر ہو اور کچھ قریب والی عورت کے بدن پر ہو، تب بھی نماز میں نقصان نہ ہوگا، ہاں کپڑا اتنا وسیع ہو کہ رکوع سجدے کی حرکت سے اس حصہ میں حرکت نہ ہو جو عورت کے بدن پر پڑا ہوا ہے، غرض نجس یا خبث کا قرب مانع صحت صلوۃ نہیں ہے، یہ امر آخر ہے کہ اس قسم کے عوارض سے خالی جگہ کی نماز اولی اور افضل رہے گی، روایت میں آگیا کہ حضرت میمونہ ایام حیض میں آپ کے قریب لیٹی رہتیں اور آپ نمازیں پڑھتے رہتے، بخاری کا مدعا ثابت ہوگیا۔

## [۲۰] بَابُ الصَّلٰوةِ عَلَى الْحَصِيْرِ

وَصَلّٰى جَابِرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ وَاَبُوْسَعِيْدٍ فِي السَّفِيْنَةِ قَائِماً. وَقَالَ الْحَسَنُ تُصَلِّي قَائِماً مَالَمْ تَشُقَّ عَلٰى اَصْحَابِكَ تَدُوْرُ مَعَهَا وَاِلَّا فَقَاعِداً.

(۳۸۰) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ اِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ اَبِيْ طَلْحَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ جَدَّتَهُ مُلَيْكَةَ دَعَتْ رَسُوْلَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِطَعَامٍ صَنَعَتْهُ لَهُ فَاَكَلَ مِنْهُ ثُمَّ قَالَ قُوْمُوْا فَلِاُصَلِّيَ لَكُمْ، قَالَ اَنَسٌ فَقُمْتُ اِلٰى حَصِيْرٍ لَنَا قَدِ اسْوَدَّ مِنْ طُوْلِ مَالُبِسَ فَنَضَحْتُهُ بِمَاءٍ فَقَامَ رَسُوْلُ اللهِ وَصَفَفْتُ اَنَا وَالْيَتِيْمُ وَرَاءَهُ وَالْعَجُوْزُ مِنْ وَّرَآئِنَا فَصَلّٰى لَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ انْصَرَفَ. (آئندہ: ۸۲۷، ۸۶۰، ۸۷۱، ۸۷۴، ۱۱۶۴)

**ترجمہ** باب، بوریے پر نماز پڑھنے کا حکم۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ اور حضرت ابوسعیدؓ نے کشتی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی۔ حضرت حسن نے فرمایا کہ اگر تمہارے رفقاءِ سفر قائماً نماز پڑھنے میں زیادہ مشقت محسوس نہ کریں تو قائماً ہی نماز پڑھی جائے، ورنہ قاعداً بھی نماز پڑھ سکتے ہو، لیکن ہر حال میں کشتی کے ساتھ سمت قبلہ کی طرف گھومتے رہو۔
حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ان کی نانی ملیکہؓ نے رسول اکرم ﷺ کو کھانے کی دعوت پر بلایا، جس کو انہوں نے آپ ہی کی خاطر تیار کیا تھا، چنانچہ آپ نے وہ کھانا تناول فرمایا، پھر فرمایا کہ کھڑے ہو جاؤ، تاکہ میں تم لوگوں کو نماز پڑھادوں، حضرت انس کہتے ہیں کہ میں اٹھ کر ایک بوریا لایا جو زیادہ استعمال کی بنا پر سیاہ ہوگیا تھا، پھر میں نے اس کو پانی سے دھویا، پھر رسول اکرم ﷺ کھڑے ہوئے اور میں نے اور یتیم نے آپ کے پیچھے ایک صف بنائی اور ہمارے پیچھے پیرانہ سال نانی کھڑی ہوگئیں، پھر رسول اکرم ﷺ نے ہم لوگوں کو نماز پڑھائی اور واپس تشریف لے آئے۔

**مقصد ترجمہ** بعض حضرات زمین پر فرش بچھا کر نماز پڑھنے کو اچھا نہیں سمجھتے، حضرت عمر بن عبدالعزیز سے منقول ہے کہ وہ جب بوریے پر کھڑے ہوتے تو سجدہ زمین پر کرتے تھے، یا پھر بوریے پر سجدے کی جگہ مٹی ڈال کر سجدہ فرماتے، حضرت عروہ سے بھی اسی قسم کا عمل منقول ہے۔ بخاری کہتے ہیں کہ بوریے پر نماز پڑھنا درست ہے اور

ان حضرات کا عمل تواضع پر محمول ہے، جمہور کے نزدیک اس میں کچھ مضائقہ نہیں ہے، بخاری اس سلسلے میں جمہور کے ساتھ ہیں، حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ آپ کا ایک بوریا تھا، جس کو دن میں بچھا کر نماز پڑھتے اور شب میں اس کو کھڑا کر کے معتکف کی دیوار بناتے، حضرت عائشہ کی ایک روایت یزید بن مقدام کے طریق سے ایسی بھی نقل ہوئی کہ آپ حصیر پر نماز نہیں پڑھتے تھے، غالباً اس ترجمہ میں اس کی تردید کا اشارہ ہے، یزید بن مقدام محدثین میں قابل اعتبار نہیں۔ بوریئے پر نماز کے سلسلہ میں اصل یہ ہے کہ جن لوگوں کو زمین پر زیادہ تواضع حاصل ہو ان کو نماز خالی زمین پر پڑھنی چاہئے، لیکن جن لوگوں کی طبیعت میں خالی زمین پر نماز پڑھنے سے انتشار ہوتا ہو ان کے لیے فرش بچھا کر نماز پڑھنا اولی ہے، حضرات صحابہؓ سے بھی دونوں عمل ثابت ہیں، اس سلسلہ میں بھی اصل یہ ہے کہ بخاری غیر ارض پر نماز کا جواز ثابت کر رہے ہیں، اس کے لیے انہوں نے ترجمہ رکھا "الصّلوٰۃُ علی الحصیر" حصیر بڑے بوریے کو کہتے ہیں جس پر مصلی کھڑا بھی ہو سکے اور اسی پر سجدہ بھی کر سکے، آگے "باب الصلوة علی الخمرة" آ رہا ہے، خمرہ چھوٹے مصلے کو کہتے ہیں، کہ اگر اس پر کھڑے ہو جائیں، تو سجدہ نہ ہو سکے، اگر اس پر سجدہ کریں تو کھڑے نہ ہو سکیں، یہ اصل میں چھوٹی چٹائی ہوتی تھی، جس کا مقصد بحالت سجود ہاتھ اور پیشانی کا تحفظ ہوتا تھا، یعنی یہ ضروری نہیں کہ چٹائی پر نماز ہو تو مصلی کا ہر جز چٹائی ہی پر ہو، بلکہ یہ بھی جائز ہے کہ کچھ حصہ چٹائی پر ہو اور کچھ حصہ زمین پر ہو، یہاں سے ہر دو بابوں یعنی "الصلوة علی الحصیر" اور "الصّلوة علی الخمره" کا فرق بھی ظاہر ہو گیا اور ساتھ ہی ساتھ دوسرے باب کو رکھنے کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔

حضرت جابرؓ اور حضرت ابو سعیدؓ نے کشتی میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی، یہ ایک اثر پیش کر دیا، معلوم ہوا کہ کشتی میں بھی قادر علی القیام سے قیام ساقط نہیں ہے، کھڑا ہونا پڑے گا، یہی مسلک ہمارے یہاں صاحبین کا ہے، امام اعظمؒ جالسین کشتی کی عمومی حالت کا لحاظ کر کے بیٹھ کر نماز پڑھنے کی بھی اجازت دیتے ہیں، کیوں کہ کشتیاں عموماً چکر کھاتی ہیں، بیٹھنے والوں کا سر چکراتا ہے، متلی کی شکایت ہوتی ہے، گرنے کا بھی خطرہ رہتا ہے، چونکہ کشتی میں یہ شکایت عموماً رہتی ہے اس لیے امام صاحب نے ان اکثری احوال کے ماتحت سب ہی کو کشتی میں بیٹھ کر نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے، چنانچہ حضرت انسؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے بغیر عذر کے کشتی میں بیٹھ کر نماز ادا کی، البتہ اگر کسی شخص کو کوئی شکایت اور خطرہ لاحق نہ ہو، مثلاً جہاز اور کشتی پر کام کرنے والے ملاح وغیرہ جن پر کوئی اثر نہیں ہوتا تو ان لوگوں کو کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھنی چاہئے، اگرچہ جواز امام صاحب کے قول پر ان حضرات کے لیے بھی ہے[1]۔

"قال الحسن الخ" حضرت حسنؒ فرماتے ہیں کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھو جب تک کہ تمہارے ساتھیوں پر قیام بھاری نہ ہو، ساتھیوں سے مراد نماز کے ساتھی ہو سکتے ہیں اور کشتی کے رفقاء بھی، نماز کے ساتھی مراد ہوں تو مفہوم یہ ہوگا، کہ

---

[1] البتہ ریل کو کشتی پر قیاس نہیں کرنا چاہئے، اس لیے کہ ریل کے حالات کشتی کے حالات سے مختلف ہیں، ریل میں نہ تو عموماً دوران سر ہوتا ہے، نہ ریل میں ایسے جھٹکے لگتے ہیں کہ نمازی کو گرنے کا اندیشہ ہو، اور اگر بالفرض کوئی گر بھی جائے تو زیادہ اندیشہ کی بات نہیں۔ گرے گا بھی تو ریل کے اندر ہی رہے گا اس لیے ہمارے اسلاف کا عمل بھی رہا ہے کہ ریل میں کھڑے ہو کر نماز ادا کرتے رہے ہیں۔

اگر یہ سمجھو کہ دوسرے ساتھی کھڑے نہیں رہ سکتے تو بیٹھ کر نماز پڑھو، اس سے بطور مفہوم یہ نکل آیا کہ اگر کھڑے ہونے میں کوئی اندیشہ ہو تو بیٹھ کر نماز پڑھنے کا جواز ہے۔ یدور معها کشتی میں نماز پڑھنے کی صورت یہ ہے کہ چونکہ کشتی گھومتی رہتی ہے، اس لیے ابتداء میں تو سمت قبلہ درست کی جائے گی، لیکن درمیان میں اگر کشتی گھومتی ہے تو سمت قبلہ کی حفاظت ضروری ہوگی اور کشتی کے ساتھ نمازی کو بھی گھومنا ہوگا۔

ان دونوں باتوں کی "الصلوٰۃ علی الحصیر" سے مناسبت یہ ہے کہ جس طرح بوریا زمین کا فرش ہوتا ہے، اسی طرح کشتی پانی کا فرش ہے، پھر دونوں کا مادہ ایک ہی ہے، یعنی جس طرح بوریا نباتی ہے، اسی طرح کشتی جو تختوں سے بنائی جاتی ہے وہ بھی نباتی ہے، چونکہ معنوی اور مادی اعتبار سے کشتی اور بوریئے میں یہ چیزیں قدر مشترک ہیں اس لیے بخاری نے ان دونوں آثار کو "الصلوٰۃ علی الحصیر" کے تحت ذکر کیا۔

**تشریح حدیث** حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ ان کی نانی ملیکہؓ نے رسول اکرم علیہ کو کھانے کی دعوت پر بلایا، یہ کھانا انہوں نے رسول اکرم علیہ ہی کے لیے تیار کیا تھا، چنانچہ آپ تشریف لے گئے اور جس مقصد کے لیے انہوں نے بلایا تھا پہلے اس سے فراغت حاصل کی، اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اب کھڑے ہو جاؤ نماز بھی پڑھا دوں، کیوں کہ بزرگوں کی دعوت سے مقصود حصول برکت ہوتا ہے، اس لئے برکت کے لیے آپ نے ایسا کیا، مقصد یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حضرت انسؓ تو جماعت میں شریک ہوتے ہی رہتے ہیں، لیکن ملیکہ کو یہ موقع نصیب نہیں ہوتا، اس طرح یہ بھی نماز کا مشاہدہ کرلیں گی، چنانچہ حضرت انسؓ اٹھے اور ایک بوریا لائے جو کثرت استعمال سے سیاہ ہو گیا تھا، اس پر پانی کے چھینٹے دیئے، ممکن ہے کہ حضرت انسؓ سیاہی دور کرنا چاہتے ہوں، یا ہوسکتا ہے وہ بوریا سخت ہو اور حضرت انسؓ نے اس طرح اس کو نرم کیا ہو۔ بہر کیف آپ نے بوریئے پر نماز پڑھائی، اس شان سے کہ پہلی صف میں حضرت انسؓ اور ان کے چھوٹے بھائی ضمیرہ جن کو یتیم بھی کہتے تھے کھڑے ہو گئے، اور ان کے پیچھے دوسری صف میں ملیکہ کھڑی ہو گئیں، آپ نے دو رکعت پڑھائیں اور واپس تشریف لے آئے۔ یہاں چونکہ آپ کو اصل میں کھانے کی دعوت پر بلایا گیا تھا، اس لیے پہلے آپ نے کھانا تناول فرمایا پھر نماز پڑھائی۔ ایک دوسرا واقعہ آگے آرہا ہے کہ حضرت عتبانؓ نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ میرا بدن بھاری ہے، آنکھیں خراب ہیں، برسات میں راستہ گلناک ہو جاتا ہے، اس لیے مسجد میں آنا دشوار ہوتا ہے، آپ میرے گھر میں کسی جگہ نماز پڑھ دیں تو اس کو میں مصلی بنالوں، آپ تشریف لے گئے اور پہلے نماز پڑھی، اس

---

۱؎ انّ جدّتہ ملیکۃ الخ جدۃ کی ضمیر بعض حضرات کے نزدیک حضرت انس کی طرف راجع ہے، اور یہ ملیکہ ان کی نانی ہیں، کیوں کہ یہ ام سلیمؓ کی والدہ ہیں، بعض حضرات کے نزدیک یہ ضمیر اسحاق بن عبداللہ بن ابی طلحہ کی طرف راجع ہے، اور یہ بھی درست ہے، کیوں کہ ام سلیم پہلے مالک بن نضر کے نکاح میں تھیں، ان سے انسؓ پیدا ہوئے، پھر مالک بن نضر کے بعد ان کا نکاح ابوطلحہ سے ہوا، ابوطلحہ سے عبداللہ اور ابوعمر پیدا ہوئے، اور یہ عبداللہ اسحاق راوی حدیث کے والد ہیں، اس لیے ملیکہ حضرت انس کی نانی ہیں، اور اسحاق راوی حدیث کی پردادی، دونوں کا سلسلہ اس طرح ہوگا، انس بن ام سلیم بنت ملیکہ اور اسحاق بن عبداللہ بن ام سلیم بنت ملیکہ۔ بہر حال دونوں کی طرف ضمیر راجع ہوسکتی ہے۔ ۱۲

کے بعد کھانا تناول فرمایا۔ آپ کے اس عمل سے معلوم ہوا کہ جو چیز مقصود ہو اس کو مقدم کرنا چاہئے۔

## [۲۱] بَابُ الصَّلٰوةُ عَلَی الْخُمْرَةِ

(۳۸۱) حَدَّثَنَا اَبُو الْوَلِیْدِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا سُلَیْمَانُ الشَّیْبَانِیُّ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ شَدَّادٍ عَنْ مَیْمُوْنَةَ قَالَتْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُصَلِّی عَلَی الْخُمْرَةِ. (گذشتہ: ۳۳۳)

**ترجمہ** باب، چھوٹی چٹائی پر نماز کا بیان۔ حضرت میمونہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ چھوٹی چٹائی پر نماز ادا فرماتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** ''خمرہ'' وہ چھوٹی چٹائی جو قد آدم نہ ہو، باب سابق میں حصیر اور خمرہ کا فرق اور ان دونوں ابواب کے الگ الگ منعقد کرنے کی وجہ بیان کی جا چکی ہے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ان ابواب کے متعلق ارشاد فرمایا ہے کہ بخاری ان ابواب میں ایک واہمہ کا ازالہ کرنا چاہتے ہیں، سرکار دو عالم ﷺ کے ارشاد: ''جعلت لی الارض مسجداً وطهوراً'' اور ''عفر وجهك في التراب'' سے یہ واہمہ گزرتا ہے کہ شاید مٹی ہی پر سجدہ کرنا ضروری ہو، اسی طرح آپ نے حضرت رباح سے فرمایا ''تَرِّبْ تَرِّبْ'' حضرت رباح نے پھونک مار کر مٹی کو اڑانا چاہا، تو آپ نے فرمایا ایسا نہ کرو بلکہ پیشانی کو مٹی سے آلودہ کرو، ان روایات سے جو واہمہ پیدا ہو رہا ہے کہ سجدہ مٹی ہی پر کیا جائے، بخاری ان ابواب میں اس کی نفی کر رہے ہیں ''الصلوة على الحصير'' ''الصلوة على الفراش'' وغیرہ میں اسی واہمہ کا ازالہ ہے کہ زمین پر سجدہ ضروری نہیں، بلکہ بوریا، چٹائی اور دوسرے کسی بھی طرح کے پاک فرش پر سجدہ کرنا جائز ہے۔

'' الصَّلوٰة على الخمرة '' کو مستقل بیان کرنے کی ایک وجہ باب سابق میں گزر چکی ہے، دوسری وجہ یہ ہے کہ کبھی کبھی بخاری تکرار کی پرواہ کئے بغیر جو روایات اپنے اساتذہ سے جس عنوان سے سنتے ہیں اسی طرح نقل فرما دیتے ہیں، پہلے یہی روایت حضرت مسدد سے مطول سنی تھی، تو اس پر دوسرا ترجمہ منعقد کیا تھا، پھر یہی روایت مختصراً دوسرے شیخ ابوالولید سے سنی تو اس پر ایک اور ترجمہ منعقد فرما دیا، اس میں دوسرے فوائد کے ساتھ الفاظ حدیث کی بھی رعایت ہو گئی۔ واللہ اعلم

## [۲۲] بَابُ الصَّلٰوةُ عَلَی الْفِرَاشِ

وَصَلّٰی اَنَسٌ عَلٰی فِرَاشِهٖ وَقَالَ کُنَّا نُصَلِّی مَعَ النَّبِیِّ ﷺ فَیَسْجُدُ اَحَدُنَا عَلٰی ثَوْبِهٖ

(۳۸۲) حَدَّثَنَا اِسْمَاعِیْلُ قَالَ حَدَّثَنِی مَالِكٌ عَنْ اَبِی النَّضْرِ مَوْلٰی عُمَرَ بْنِ عُبَیْدِاللّٰهِ عَنْ اَبِیْ سَلَمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهَا قَالَتْ کُنْتُ اَنَامُ بَیْنَ یَدَیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَرِجْلَایَ فِیْ قِبْلَتِهٖ فَاِذَا سَجَدَ غَمَزَنِیْ فَقَبَضْتُ رِجْلَیَّ وَاِذَا قَامَ بَسَطْتُهُمَا قَالَتْ وَالْبُیُوْتُ یَوْمَئِذٍ لَیْسَ فِیْهَا مَصَابِیْحُ. (آئندہ: ۳۸۳، ۳۸۴، ۵۰۸، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴،

۵۱۵، ۵۱۹، ۹۹۷، ۱۲۰۹، ۶۲۷۶)

(۳۸۳) حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ أَخْبَرَنِي عُرْوَةُ أَنَّ عَائِشَةَ أَخْبَرَتْهُ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّيْ وَهِيَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ عَلَى فِرَاشِ أَهْلِهِ اِعْتِرَاضَ الْجَنَازَةِ. (گذشتہ: ۳۸۲)

(۳۸۴) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ يَزِيْدَ عَنْ عِرَاكٍ عَنْ عُرْوَةَ أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّي وَعَائِشَةُ مُعْتَرِضَةٌ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ عَلَى الْفِرَاشِ الَّذِيْ كَانَا يَنَامَانِ عَلَيْهِ. (گذشتہ: ۳۸۲)

**ترجمہ** باب، زمین پر فرش بچھا کر نماز پڑھنے کا بیان۔ حضرت انس نے اپنے فرش پر نماز پڑھی اور فرمایا کہ ہم لوگ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے اور ہم میں سے کوئی اپنے کپڑے پر سجدہ کر لیتا تھا۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں رسول اکرم ﷺ کے سامنے ہوتی تھی، اور میرے دونوں پیر آپ کی سجدہ گاہ کی جانب ہوتے تھے، جب آپ سجدہ میں جاتے تو میرے پیروں کو دبا دیتے اور میں ان کو کھینچ لیتی، اور جب آپ کھڑے ہو جاتے تو میں پیروں کو دراز کر لیتی، حضرت عائشہ نے یہ بھی فرمایا کہ اس وقت گھروں میں چراغ نہ تھے۔ حضرت عروہ سے روایت ہے کہ انہیں حضرت عائشہ نے بتلایا کہ رسول اکرم ﷺ اپنے اہل کے بستر پر نماز پڑھتے تھے، حضرت عائشہ آپ کے اور قبلہ کے درمیان جنازہ کی طرح آپ کے سامنے لیٹی رہتیں۔ حضرت عروہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نماز پڑھتے تھے اور حضرت عائشہؓ آپ کے اور قبلہ کے درمیان اس بستر پر لیٹی رہتیں جس پر وہ دونوں سوتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** ''فراش'' ہر وہ چیز جو زمین پر بچھائی جائے، خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، دری ہو یا قالین، یا اور کوئی دوسری چیز، پچھلے دو ابواب میں بخاری نے حصیر اور خمرہ پر نماز کا جواز بتلایا تھا، اب آگے ترقی کر کے کہتے ہیں کہ حصیر اور خمرہ کی کوئی تخصیص نہیں، کوئی بھی پاک چیز زمین پر بچھا کر نماز پڑھنا جائز ہے، اور اس طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے کہ فرش میں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ سلف نے ان پر نماز پڑھنے سے انکار کیا ہے، جیسے عمدہ قالین یا ایسا فرش جس پر رؤاں زیادہ ہو، حضرت اسود ایسی چیزوں پر نماز پڑھنا مکروہ قرار دیتے تھے، حضرت امام مالکؒ سے اس قسم کا عمل منقول ہے، یہ حضرات قالین یا کمبل پر کھڑے بھی ہوں تو سجدہ زمین پر کرتے تھے، اس لیے امام بخاری نے ترجمہ رکھ دیا کہ فرش کسی قسم کا ہو، گھٹیا ہو یا بڑھیا ہو، سب پر نماز درست ہے۔ امام اعظمؒ اور امام شافعیؒ کا بھی یہی مسلک ہے، البتہ ایسا فرش جو تکلف کے سبب قلب کو نماز سے مشغول کر سکے اس پر نماز پسندیدہ نہیں، لیکن اگر نماز پڑھ لی جائے گی تو اس کی صحت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم رسول اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے اور ہم میں سے کوئی شخص اپنے کپڑے

پر سجدہ کرتا، اگلے باب میں آ رہا ہے کہ یہ کپڑا جسم سے الگ نہ ہوتا تھا، بلکہ بدن ہی کے ملبوس کپڑے کو کسی ضرورت سے زمین پر ڈال کر اس پر سجدہ کیا جاتا تھا، اس سے جو مسئلہ متعلق ہے وہ آگے آ رہا ہے، یہاں بخاری کا مدعا صرف یہ ہے کہ سجدہ کے لیے زمین ضروری نہیں، کوئی بھی پاک چیز زمین پر بچھا کر اس پر نماز پڑھی جاسکتی ہے اور سجدہ کیا جاسکتا ہے۔

**روایات باب** حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں رات کے وقت اپنے بستر پر نبی اکرم ﷺ کے سامنے لیٹی رہتی اور میرے پیر آپ کے قبلہ کی جگہ ہوتے، جب آپ سجدہ میں جانے لگتے تو میرا پیر[1] دباتے، میں پیر کھینچ لیتی، جب آپ کھڑے ہو جاتے تو میں پیر پھیلا لیتی، اس کی نوبت اس لیے آتی تھی کہ اس وقت مکانوں میں چراغ نہ تھے، اگر چراغ ہوتا تو میں دیکھ سکتی تھی کہ آپ سجدہ میں کس وقت جا رہے ہیں، اور خود ہی پیر سمیٹ لیتی، لیکن چونکہ اندھیرے کے سبب کچھ نظر نہ آتا تھا اس لیے آپ کو پیر دبانے کی ضرورت پڑتی تھی۔

ترجمہ کے اثبات کے لیے یہ روایت بھی کافی تھی، ظاہر بات ہے کہ جس بستر پر حضرت عائشہؓ لیٹی رہتیں، اس بستر پر آپ نماز پڑھتے تھے، لیکن چوں کہ یہ چیز اس روایت میں صراحت کے ساتھ مذکور نہ تھی، اس لیے بخاری نے اس کے ساتھ دوسری روایت بھی ذکر کر دی کہ آپ اپنے اہل خانہ کے بستر پر نماز پڑھتے اور حضرت عائشہؓ اسی بستر پر آپ کے سامنے جنازہ کی طرح لیٹی رہتیں، پھر تیسری روایت میں اس بستر کی مزید تفصیل آ گئی: ''علی الفراش الذی کانا ینامان علیه'' یعنی یہ بستر وہ تھا جس پر یہ دونوں سوتے بھی تھے۔

ان روایات سے بخاری کا مدعا ثابت ہو گیا کہ بوریا، چٹائی اور دوسرے فرش، خواہ وہ استعمالی ہوں اور خواہ وہ سونے کے کام بھی آتے ہوں، ان سب پر نماز درست ہے، پیشانی زمین پر رکھنا ضروری نہیں۔

## [۲۳] بَابُ السُّجُوْدِ عَلَى الثَّوْبِ فِيْ شِدَّةِ الْحَرِّ

وَقَالَ الْحَسَنُ كَانَ الْقَوْمُ يَسْجُدُوْنَ عَلَى الْعِمَامَةِ وَالْقَلَنْسُوَةِ وَيَدَاهُ فِيْ كُمِّهٖ

(۳۸۵) حَدَّثَنَا اَبُوْ الْوَلِيْدِ هِشَامُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ قَالَ حَدَّثَنَا بِشْرُ بْنُ الْمُفَضَّلِ قَالَ حَدَّثَنَا غَالِبُ الْقَطَّانُ عَنْ بَكْرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّيْ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَيَضَعُ اَحَدُنَا طَرَفَ الثَّوْبِ مِنْ شِدَّةِ الْحَرِّ فِيْ مَكَانِ السُّجُوْدِ. (آئندہ: ۵۴۲، ۱۲۰۸)

**ترجمہ** گرمی کی شدت کے سبب کپڑے پر سجدہ کا بیان۔ حضرت حسنؒ نے ارشاد فرمایا کہ صحابۂ کرامؓ عمامہ اور ٹوپی پر سجدہ کیا کرتے تھے اور ان میں سے ہر ایک کا ہاتھ اس کی آستین میں ہوتا تھا۔ حضرت انس بن مالکؓ سے

---

[1] یہاں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مس مرأۃ ناقض وضو نہیں، حضرات شوافع تاویلیں کر رہے ہیں، کہ یہاں پیر کا مس بالحجاب تھا جو ناقض طہارت نہیں، لیکن یہ تاویل ظاہر روایت کے خلاف ہے، بحث اپنی جگہ گزر چکی ہے۔۱۲

روایت ہے کہ ہم لوگ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، پس ہم میں سے کوئی شخص گرمی کی شدت کے سبب اپنے کپڑے کے فاضل گوشہ پر سجدہ کرتا تھا۔

**مقصد ترجمہ** ترجمہ میں " فی شدۃ الحر " کی قید الفاظ حدیث کی رعایت سے ہے، ورنہ اصل مقصد یہ ہے کہ اگر زمین گرمی کی شدت کے سبب تپ رہی ہو، یا سردی کے سبب اولا بن گئی ہو اور زمین پر پیشانی کا ٹھہرانا دشوار ہو، تو ان دونوں صورتوں میں سجدہ کے لیے زمین پر کپڑا ڈالنے کی اجازت ہے، خواہ زمین پر کپڑا ڈال لو یا پیشانی پر کپڑا ڈال کر سجدہ کرلو، خواہ کپڑا الگ سے بچھایا جائے، یا پہنے ہوئے کپڑے کے فاضل حصہ کو زمین پر ڈال کر سجدہ کیا جائے۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ لوگ گرمی کے زمانے میں زمین کے تپ جانے کے سبب عمامہ اور ٹوپی پر سجدہ کرتے تھے، عمامہ پر سجدہ کا مطلب یہ ہے کہ عمامہ کے پیچ یا شملہ پر سجدہ کیا جائے، لیکن شرط یہ ہے کہ عمامہ کا پیچ اتنا ہلکا ہونا چاہئے کہ پیشانی کو زمین کی صلابت کا احساس ہو اور پیشانی زمین پر ٹھہر جائے، ورنہ سجدہ درست نہ ہوگا۔ " ویداہ فی کمہ " کا مفہوم یہ ہے کہ گرمی سے پیشانی کی حفاظت تو عمامہ یا ٹوپی کے ذریعہ کی جاتی اور ہاتھوں کی حفاظت آستین سے، یعنی آستین کو آگے بڑھا کر اس پر ہاتھ رکھ لیے، اس طرح پیشانی کی حفاظت بھی ہو جاتی تھی اور ہاتھ کی بھی، ظاہر ہے کہ عمامہ اور ٹوپی ملبوس ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ ثوب ملبوس پر سجدے کی اجازت ہے۔

**حدیث باب** حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ نماز پڑھتے، اور ہم میں سے کوئی شخص اپنے کپڑے کے گوشہ پر گرمی کی شدت کے سبب سجدہ کرتا تھا، طرف الثوب کے معنی یہی ہیں کہ صحابۂ کرام ثوب ملبوس کے فاضل حصہ پر سجدہ کرتے تھے۔ امام اعظمؒ، امام مالک، امام احمد اور امام اسحٰق وغیرہم نے اسی روایت سے استدلال کیا ہے کہ گرمی کی شدت سے بچنے کے لیے ثوب ملبوس کے فاضل حصہ پر سجدہ درست ہے، کیوں کہ سرکار دو عالم ﷺ نے حضرات صحابہ کرام کا یہ عمل دیکھا اور اس پر انکار نہیں فرمایا، پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تقریر سے یہ بات ثابت ہوگئی، لیکن امام شافعیؒ ثوب ملبوس کے فاضل حصہ پر سجدہ کی اجازت نہیں دیتے، حدیث باب کی تاویل میں حضرات شوافع نے یہ کہا ہے کہ طرف الثوب سے مراد یا تو وہ کپڑا ہے جو مصلی کے بدن پر نہ ہو، اور اگر بدن پر ہو تو وہ اتنا گنجائش دار ہو کہ اس کا سجدہ کی جگہ ڈالا گیا گوشہ مصلی کی حرکت سے متحرک نہ ہو، اگر دانستہ نمازی نے ایسے ثوب ملبوس پر سجدہ کیا جو مصلی کی حرکت سے متحرک ہوتا ہو، تو اس کی نماز باطل ہو جائے گی، باطل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ایسا کپڑا مصلی کے ساتھ نماز میں شامل ہے، گویا وہ مصلی کے بدن کا جزء ہے، اس لیے ایسے ثوب ملبوس پر سجدہ زمین پر سجدہ نہیں، اپنے جزء پر سجدہ ہے، جس کی اجازت نہیں۔

لیکن جمہور کے نزدیک سجدہ میں نمازی کے بدن کے کپڑے اور دوسرے کپڑے کے درمیان کوئی فرق نہیں، ان کی دلیل روایت باب ہے، استدلال اس طرح ہے کہ صحابہ کرام کی مجموعی حالت یہ تھی کہ ان کے پاس تو پہننے کے کپڑے

بھی پورے نہ تھے، چہ جائے کہ فاضل کپڑے جنہیں محل سجود میں ڈال لیا کریں، اور نہ بدن کے کپڑے میں اتنی کشادگی کا امکان ہے کہ نمازی کی حرکت سے کپڑا متحرک نہ ہو، اس لیے یہ فرق قابل قبول نہیں، نیز حضرت ابو ہریرہ، ابن عباس، ابن عمر، عبداللہ بن ابی اوفی اور حضرت انسؓ وغیرہ سے مختلف طرق سے حفاظ حدیث نے روایت کی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے اپنے دستار مبارک کے پیچ پر سجدہ کیا، اسی طرح ابن ابی شیبہ نے حضرت عمرؓ سے روایت کی ہے کہ ایک مرتبہ سخت گرمی کے دن حضرت عمرؓ نے جمعہ کی نماز پڑھائی اور اپنے کپڑے کا گوشہ زمین پر ڈال کر سجدہ کرلیا اور حاضرین سے فرمایا کہ تم میں سے جس شخص کو زمین کی گرمی محسوس ہو اور وہ زمین پر پیشانی نہ ٹیک سکے، اس کو چاہئے کہ اپنے کپڑے کے گوشہ پر سجدہ کرلے۔ ان روایات میں کوئی تفصیل نہیں کہ کپڑا اتنا کشادہ ہونا چاہئے جو مصلی کی حرکت سے متحرک نہ ہو، اس لیے جمہور اس تاویل کو قبول نہیں کرتے، بخاری نے بھی جمہور کی تائید کی ہے، ترجمہ کے ذیل میں حضرت حسن کی روایت سے عمامہ اور ٹوپی پر سجدہ کا ذکر بخاری کے مسلک کی وضاحت کے لیے کافی ہے۔　　　واللہ اعلم

## [۲۴] بَابُ الصَّلٰوةِ فِي النِّعَالِ

(۳۸۶) حَدَّثَنَا اٰدَمُ بْنُ اَبِيْ اِيَاسٍ قَالَ نَا شُعْبَةُ قَالَ انا اَبُوْ مَسْلَمَةَ سَعِيْدُ بْنُ يَزِيْدَ الْاَزْدِيُّ قَالَ سَاَلْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ اَكَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْ فِيْ نَعْلَيْهِ؟ قَالَ نَعَمْ.　　(آئندہ: ۵۸۵۰)

**ترجمہ** باب، جوتے پہن کر نماز پڑھنے کا بیان۔ سعید بن یزید ازدی سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت انس بن مالکؓ سے دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نعلین پہن کر نماز پڑھتے تھے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ہاں!

**مقصد ترجمہ** باب سابق میں گرمی یا سردی سے بچنے کے لیے پیشانی کی حفاظت کی صورت بیان ہو چکی ہے، یہاں پیروں کی حفاظت کا طریقہ بتلا رہے ہیں کہ اگر جوتا پاک ہو اور وہ عرب کے طرز کا ہو یعنی چپل ہو جس میں بوقت سجدہ پیر کی انگلیاں زمین سے لگ سکتی ہوں، تو ایسا جوتا پہن کر نماز پڑھنا جائز ہے۔ مذاس اور مکعب جن میں پیر کا اتصال زمین سے نہیں ہوتا ہے بلکہ جوتے کی نوک یا صرف ٹوہ کا سہارا زمین پر ہوتا ہے اور پیر بالکل معلق رہتا ہے، ان میں نماز کا عمل صحیح نہیں، کیوں کہ پیر زمین سے بالکل الگ رہتے ہیں، اور سجدہ میں وضع قدم علی الارض ضروری ہے، خوب سمجھ لیں! روایت میں آیا کہ حضرت انسؓ سے سوال کیا گیا کہ رسول اکرم ﷺ نے جوتا پہن کر نماز پڑھی ہے؟ انہوں نے فرمایا کہ ہاں پڑھی ہے، معلوم ہوا کہ یہ عمل جائز ہے، بعض حضرات نے جوتے پہن کر نماز پڑھنے کو رخصت قرار دیا ہے، اور بعض حضرات نے مستحب کہا ہے، فیصلہ کی بات یہ ہے کہ یہ عمل بذات خود مطلوب نہیں ہے، شریعت نے اس کو صرف جائز قرار دیا ہے، لیکن ہمارے فقہاء نے یہ تصریح بھی کی ہے، کہ جہاں یہود کی آبادی ہو وہاں جوتے پہن کر نماز پڑھنا مستحب ہے، کیوں کہ یہود جوتا پہن کر نماز پڑھنے کو جائز نہیں قرار دیتے اور آپ نے ارشاد فرمایا ہے: "خالفوا الیہود"

یہود کی مخالفت کرو، گویا دراصل تو یہ چیز مباح تھی، لیکن یہود کے عمل سے اختلاف ظاہر کرنے کی صورت میں استحباب پیدا ہوگیا ہے، یہود نے عدم جواز کا فیصلہ ایک غلط فہمی کی بنا پر کیا: جب موسیٰ علیہ السلام طور پر تشریف لے گئے تو ندا آئی "یَامُوْسیٰ اِنِّی اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوىً" اے موسیٰ! میں تمہارا رب ہوں، جوتے اتاردو، تم اس وقت مقدس وادی میں ہو، اس حکم کا مطلب یہ تھا کہ دیکھو تم رب کے سامنے ہو، مقدس جگہ میں ہو، اس لیے مقام ادب کا تقاضا ہے کہ جوتے اتاردو، لیکن یہود نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ مطلقاً مواقع قرب میں جوتا پہن کر جانے کی اجازت نہیں، اس بنا پر وہ نعلین پہنے ہوئے کی نماز کو باطل قرار دیتے ہیں، شریعت مطہرہ نے یہود کی اس غلط فہمی پر تنبیہ فرماتے ہوئے اس کی اجازت دیدی کہ تم نعلین پہنے ہوئے نماز پڑھ سکتے ہو، اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اور اگر مخالفت یہود کی نیت کی ہو تو اس میں استحباب بھی آجاتا ہے۔ واللہ اعلم

## [۲۵] بَابُ الصَّلٰوةِ فِي الْخِفَافِ

(۳۸۷) حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ نَا شُعْبَةُ عَنِ الْاَعْمَشِ قَالَ سَمِعْتُ اِبْرَاهِيْمَ يُحَدِّثُ عَنْ هَمَّامِ بْنِ الْحَارِثِ قَالَ رَأَيْتُ جَرِيْرَبْنَ عَبْدِ اللّٰهِ بَالَ ثُمَّ تَوَضَّأَ وَمَسَحَ عَلٰى خُفَّيْهِ ثُمَّ قَامَ فَصَلّٰى فَسُئِلَ فَقَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ صَنَعَ مِثْلَ هٰذَا. قَالَ اِبْرَاهِيْمُ فَكَانَ يُعْجِبُهُمْ لِاَنَّ جَرِيْراً كَانَ مِنْ اٰخِرِ مَنْ اَسْلَمَ.

(۳۸۸) حَدَّثَنَا اِسْحَاقُ بْنُ نَصْرٍ قَالَ نَا اَبُوْ اُسَامَةَ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ مَسْرُوْقٍ عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ وَضَّأْتُ النَّبِيَّ ﷺ فَمَسَحَ عَلٰى خُفَّيْهِ وَصَلّٰى. (گذشتہ:۱۸۲)

**ترجمہ** باب، موزوں میں نماز کا بیان۔ ہمام بن حارث سے روایت ہے، انہوں نے کہا کہ میں نے حضرت جریرؓ بن عبداللہ کو دیکھا، انہوں نے پیشاب کیا، پھر وضو کیا اور خفین پر مسح کیا، پھر وہ کھڑے ہوئے اور نماز پڑھی، پھر حضرت جریرؓ سے اس مسح کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے۔ ابراہیم نخعیؒ کہتے ہیں کہ حضرت جریرؓ کے اس بیان کو حاضرین نے بہت پسند فرمایا، اس لیے کہ حضرت جریر ان لوگوں میں تھے جو آخر میں اسلام لائے تھے۔ حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم ﷺ کو وضو کرایا، آپ نے خفین پر مسح فرمایا اور نماز پڑھی۔

**مقصد ترجمہ** باب سابق میں بیان ہو چکا ہے کہ جوتے پہن کر نماز پڑھنا یہود کی مخالفت کی وجہ سے مستحب ہے، حضرات شیعہ کے نزدیک موزے پہن کر نماز پڑھنا درست نہیں ہے، امام بخاریؒ نے اسی کے ساتھ یہ مسئلہ بھی بتلادیا کہ موزے پہن کر نماز پڑھنا درست ہے، گرمی اور سردی سے پیروں کی حفاظت کا یہ دوسرا طریقہ ہے کہ

زمین اور پیروں کے درمیان موزوں کو حائل کردیا جائے۔

روایت میں آگیا کہ حضرت جریرؓ نے موزوں پر مسح کر کے نماز پڑھی اور جب ان سے موزوں کے مسح کے سلسلہ میں معلوم کیا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو ایسا کرتے دیکھا ہے، اور چونکہ حضرت جریر رمضان ۱۰ھ میں نزول مائدہ کے بعد ایمان لائے ہیں، اس لیے ان کی روایت "فَامْسَحُوْا بِرُؤُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ" کے بعد کی ہے اور اس میں وہ اپنا مشاہدہ نقل فرمارہے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام نے موزے پر مسح فرمایا۔ بعض صحابہ کو آیت وضو کے بعد یہ شبہ ہو گیا تھا کہ اب کسی حال میں بھی پیر کا مسح درست نہیں، پیر دھونا ہی پڑے گا، جب حضرت جریر نے یہ واقعہ نقل فرمایا اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان کا تو اسلام ہی آیت مائدہ کے نزول کے بعد ہوا ہے، تو یہ اطمینان ہو گیا کہ مسح خف کا جواز بدستور باقی ہے، غسل رجل کا تعلق صرف عدم تخفف کی حالت سے ہے، چنانچہ بعض روایات میں ہے کہ جب حضرت جریرؓ سے یہ سوال کیا گیا کہ یہ حکم تو نزول مائدہ سے پہلے تھا تو انہوں نے جواب میں ارشاد فرمایا: "مَا اسلمت الّا بعد المائدةِ" میں تو اسلام ہی نزول مائدہ کے بعد لایا ہوں۔ "باب المسح علی الخفین" کے ذیل میں یہ بحث گزر چکی ہے۔

اس روایت سے جہاں یہ معلوم ہوا کہ موزے پہن کر نماز پڑھنا درست ہے، وہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرات شیعہ نے جو آیت مائدہ کا یہ مفہوم قرار دیا ہے، کہ اس آیت میں پیروں کا مسح بغیر موزے کے ہے وہ بھی سرتاسر غلط ہے۔ واللہ اعلم

## [۲۶] بَابٌ اِذَا لَمْ يُتِمَّ السُّجُوْدَ

(۳۸۹) حَدَّثَنَا الصَّلْتُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ نَا مَهْدِيٌّ عَنْ وَاصِلٍ عَنْ اَبِیْ وَائِلٍ عَنْ حُذَيْفَةَ اَنَّهٗ رَاٰی رَجُلًا لَا يُتِمُّ رُكُوْعَهٗ وَلَا سُجُوْدَهٗ فَلَمَّا قَضٰی صَلَاتَهٗ قَالَ لَهٗ حُذَيْفَةُ مَا صَلَّيْتَ. قَالَ وَاَحْسِبُهٗ قَالَ لَوْمُتَّ مُتَّ عَلٰی غَيْرِ سُنَّةِ مُحَمَّدٍ ﷺ. (آئندہ: ۷۹۱، ۸۰۸)

**ترجمہ** باب، جب نمازی سجدے کو تمامیت کے ساتھ نہ کرے۔ حضرت ابووائل سے روایت ہے کہ حضرت حذیفہ نے ایک شخص کو دیکھا جو اپنی نماز میں رکوع اور سجدے کو تمامیت کے ساتھ ادا نہیں کر رہا تھا، جب یہ شخص نماز سے فارغ ہو گیا تو حضرت حذیفہ نے اس سے فرمایا: تمہاری نماز نہیں ہوئی، ابووائل کہتے ہیں کہ میں خیال کرتا ہوں حضرت حذیفہ نے اس سے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر تم اسی حالت میں فوت ہو جاؤ تو رسول اکرم ﷺ کے طریقہ پر فوت نہ ہو گے۔

**مقصد ترجمہ** بخاری کے اس ترجمہ کے سلسلہ میں شارحین بہت حیران ہیں، ابھی تک تو ستر عورت کے ابواب چل رہے تھے، نماز کی کیفیت اور صفت کے مسائل شروع نہیں ہوئے تھے کہ بخاری نے یہ دو باب بظاہر بے جوڑ رکھ دیئے۔

حافظ ابن حجرؒ نے فرمادیا کہ یہ ابواب مستملی کے نسخہ میں نہیں ہیں، جو سب سے زیادہ معتبر ہے، اس لیے ان ابواب کا اس جگہ ہونا ناسخین کی غلطی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے فرمایا کہ فربری سے نقل کیا گیا ہے کہ صحیح بخاری کے بعض اوراق کتاب سے علیحدہ تھے، بعض ناسخین بخاری سے غلطی ہوئی اور انہوں نے ان اوراق کو ان جگہوں سے ملحق کردیا جہاں مصنف نے الحاق نہیں کیا تھا، پھر فرماتے ہیں کہ یہ باب اور اس سے ملحق باب اسی طرح کے ابواب ہیں، جو ناسخین کی غلطی سے دوسری جگہ لگ گئے، اس لیے کہ یہ مسائل دراصل ابواب صفة الصلوۃ کے ہیں۔

لیکن ہمارے خیال میں ان ابواب کے سلسلہ میں نہ ناسخین پر الزام دینے کی ضرورت ہے، نہ اوراق میں رد وبدل کہنے کی حاجت ہے، بلکہ ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ بخاری نے بالقصد ایسا کیا ہے، اور اس سے ان کا ایک خاص مقصد ہے، وجہ یہ ہے کہ پچھلے ابواب میں بخاری نے بیان کیا ہے کہ اگر گرمی کی شدت ہو تو پیشانی کے نیچے کپڑا ڈال لیا جائے، اسی طرح پیروں کی حفاظت کے لیے نعال اور موزوں میں نماز کا جواز ہے، سر اور پیر دونوں کی حفاظت کی صورت بیان کرنے کے بعد اب بتلاتے ہیں کہ اس انتظام کی ضرورت اس لئے ہے کہ نماز کا مدار تمامیت افعال پر ہے، اور افعال میں سجدہ کو خاص اہمیت ہے کہ اگر سجدہ نامکمل رہ گیا تو گویا نماز ہی نہ ہوگی، چنانچہ بخاری نے ترجمہ کے ذیل میں جو روایت پیش کی ہے، اس میں حضرت حذیفہ ایسے ہی شخص سے فرمارہے ہیں "مَا صَلَّيْتَ" تم نے نماز نہیں پڑھی، یعنی یہ عمل نماز کا عمل نہیں ہے، اور اسی پر بس نہیں فرماتے، بلکہ کہتے ہیں کہ اگر اسی حالت میں تمہیں موت آجائے تو یہ موت خلاف فطرت طریق پر ہوگی، مطلب یہ ہوا کہ نماز کے ارکان میں تمامیت کا ضرور خیال رکھا جائے، نماز کی صحت، حفاظت اور تمامیت کے لئے اگر پیشانی کے نیچے کپڑا اور پیروں کے لیے نعال یا موزے استعمال کرنے کی ضرورت ہو تو ایسا ضرور کرنا چاہئے، دراصل سجدہ میں یہی دو عضو اصل اصول اور مدار علیہ سجدہ ہیں، یعنی پیشانی اور قدم، یہ دونوں اگر زمین پر ٹھہرے ہوئے ہیں تو سجدہ مانا جائے گا، اگر ایسا نہیں ہے کہ پیشانی زمین پر لگی ہوئی نہیں، یا قدم زمین سے الگ ہے، تو وہ سجدہ نہیں ہے، اس لیے ان ابواب میں اس کا اہتمام کیا گیا۔

اس معنی کر یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بخاری نے اس باب میں پچھلے ابواب کی وجہ بیان کی ہے اور اسی کے ساتھ جب تمامیت سجدہ کی بحث چھڑ گئی تو انہوں نے دوسرا باب بھی رکھ دیا "يبدي ضبعيه" یعنی سجدہ کا اتمام یہ ہے کہ بازو کھلے اور پہلوؤں سے الگ رہیں، اس اعتبار سے ناسخین اور اوراق کے ردوبدل کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

حضرت علامہ کشمیریؒ نے اشاد فرمایا ہے کہ اتمام سجدہ کا مسئلہ کیفیت صلوۃ سے بھی متعلق ہے اور شرائط صلوۃ سے بھی، یعنی سجدہ کس شان سے ہو، اس کا تعلق کیفیت صلوۃ سے ہے، اور سجدہ میں تمکن علی الارض ہو، یہ اس کی شرائط سے متعلق ہے، اس لیے بخاری نے یہاں یہ مسئلہ شرائط کے سلسلہ میں ذکر کیا ہے، آگے کیفیت صلوۃ کے سلسلہ میں اس کو لائیں گے؛ اس لیے یہاں غیر متعلق ہونے کا اشکال نہ ہونا چاہئے۔　　　　واللہ اعلم

## [۲۷] بابٌ يُبْدِىْ ضَبْعَيْهِ وَيُجَافِىْ جَنْبَيْهِ فِىْ السُّجُوْدِ

(۳۹۰) حَدَّثَنَا يَحْيٰى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنِىْ بَكْرُبْنُ مُضَرَ عَنْ جعفرٍ عَنْ ابْنِ هُرْمُزَعَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَالِكٍ ابْنِ بُحَيْنَةَ اَنَّ النَّبِىَّ ﷺ كَانَ اِذَا صَلّٰى فَرَّجَ بَيْنَ يَدَيْهِ حَتّٰى يَبْدُوَ بَيَاضُ اِبِطَيْهِ وَقَالَ اللَّيْثُ حَدَّثَنِىْ جعفرُبْنُ رَبِيْعَةَ نَحْوَهُ. (آئندہ: ۸۰۷، ۳۵۶۴)

**ترجمہ** باب، نمازی سجدہ میں بازوؤں کو ظاہر کرے اور بازوں کو پہلوؤں سے الگ رکھے۔ حضرت عبداللہ بن مالک ابن بُحَینہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ جب نماز پڑھتے تو اپنے ہاتھوں کو کشادہ رکھتے، یہاں تک کہ آپ کے بغل مبارک کی سفیدی ظاہر ہوتی، لیث کہتے ہیں کہ جعفر بن ربیعہ نے مجھ سے اسی طرح کی روایت بیان کی۔

**مقصد ترجمہ** حافظ ابن حجرؒ اور حضرت علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ اس باب کو اس جگہ رکھنے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ستر عورت کے مسائل چل رہے ہیں، بخاریؒ نے آخر میں یہ باب رکھ کر اس طرف اشارہ کردیا کہ ستر عورت ضروری ہے، لیکن بازوں کا پہلوؤں سے سجدہ میں الگ رکھنا جیسا کہ حدیث باب سے معلوم ہوتا ہے، نہ خلاف سنت ہے، نہ ستر عورت کے منافی ہے۔

لیکن صاف بات یہ ہے کہ بخاری اس باب میں باب سابق یعنی اتمام سجدہ کی مزید تشریح کررہے ہیں کہ سجدہ میں جاؤ تو ہاتھوں کو کشادہ اور پہلوؤں سے الگ رکھو، پیغمبر علیہ السلام جب سجدہ میں جاتے تو یہی شان ہوتی تھی، یہ مسئلہ تفصیل کے ساتھ ابواب صفۃ الصلوٰۃ میں انشاء اللہ اپنی جگہ آئے گا۔ واللہ اعلم[1]

## [۲۸] بَابُ فَضْلِ اِسْتِقْبَالِ الْقِبْلَةِ

يَسْتَقْبِلُ بِاَطْرَافِ رِجْلَيْهِ الْقِبْلَةَ قَالَهُ اَبُوْ حُمَيْدٍ عَنِ النَّبِىِّ ﷺ

(۳۹۱) حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَبَّاسٍ قَالَ حَدَّثَنَا ابنُ مَهْدِىٍّ قَالَ حَدَّثَنَا مَنْصُوْرُبْنُ سَعْدٍ عَنْ مَيْمُوْنِ بْنِ سِيَاهٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ النَّبِىَّ ﷺ مَنْ صَلّٰى صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَاَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَذَالِكَ الْمُسْلِمُ الَّذِىْ لَهُ ذِمَّةُ اللهِ وَذِمَّةُ رَسُوْلِهٖ فَلَا تُخْفِرُوا اللهَ فِىْ ذِمَّتِهٖ. (آئندہ: ۳۹۲، ۳۹۳)

(۳۹۲) حَدَّثَنَا نُعَيْمٌ قَالَ نَا ابْنُ الْمُبَارَكِ عَنْ حُمَيْدِ الطَّوِيْلِ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ فَاِذَا قَالُوْهَا وَصَلَّوْا صَلٰوتَنَا وَاسْتَقْبَلُوْا قِبْلَتَنَا وَاَكَلُوْا ذَبِيْحَتَنَا فَقَدْ حُرِّمَتْ عَلَيْنَا دِمَاءُ هُمْ وَاَمْوَالُهُمْ اِلَّا

---

[1] حضرۃ الاستاذ مولانا سید فخر الدین احمد (نور اللہ مرقدہٗ) کا تصحیح فرمودہ مسودہ یہاں ختم ہوگیا۔

بِحَقِّهَا وَحِسَابُهُمْ عَلَى اللهِ . (گذشتہ:۳۹۱)

(۳۹۳) وَقَالَ عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ الْحَارِثِ قَالَ حَدَّثَنَا حُمَيْدٌ قَالَ سَأَلَ مَيْمُوْنُ بْنُ سِيَاهٍ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ فَقَالَ يَااَبَا حَمْزَةَ! مَايُحَرِّمُ دَمَ الْعَبْدِ وَمَالَهُ فَقَالَ مَنْ شَهِدَ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَصَلّٰى صَلٰوتَنَا وَاَكَلَ ذَبِيْحَتَنَا فَهُوَ الْمُسْلِمُ لَهُ مَالِلْمُسْلِمِ وَعَلَيْهِ مَاعَلَى الْمُسْلِمِ . (گذشتہ:۳۹۱) وَقَالَ ابْنُ اَبِي مَرْيَمَ اَنَا يَحْيٰى بْنُ اَيُّوْبَ قَالَ نَا حُمَيْدٌ قَالَ نَا اَنَسٌ عَنِ النَّبِيِّ النَّبِيِّ ﷺ .

**ترجمہ** باب، استقبال قبلہ کی فضیلت کا بیان۔نمازی اپنے پیروں کی انگلیوں کا رخ بھی قبلہ کی طرف رکھے۔اس کو ابوحمید نے نبی اکرم ﷺ سے روایت کیا ہے۔حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ہماری طرح نماز پڑھے اور نماز میں ہمارے قبلہ کی طرف رخ کرے اور ہمارا ذبح کیا ہوا کھائے تو یہ ایسا مسلمان ہے جس سے اللہ اور اس کے رسول کا عہد و امان متعلق ہے، پس تم اللہ کی ذمہ داری میں بدمعاملگی نہ کرو۔نعیم بن المبارک بواسطہ حمید الطّویل حضرت انس بن مالک سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ مجھے یہ حکم دیا گیا ہے کہ میں کلمۂ طیبہ کا قائل ہونے تک لوگوں سے جہاد کروں، پس جب لوگ کلمۂ طیبہ کے قائل ہو جائیں اور ہماری طرح نماز ادا کریں، ہمارے قبلہ کا استقبال کریں اور ہمارے ذبیحہ کو کھائیں تو اس وقت ہم پر ان کے خون اور مال حرام ہو جائیں گے؛ مگر حق تلفی کے بدلے میں ان کے جان و مال سے تعرض درست ہوگا، اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔حمید راوی نے کہا کہ میمون بن سیاہ نے حضرت انس بن مالک سے دریافت کیا کہ اے ابوحمزہ! کونسی چیز انسان کی جان اور اسکے مال کو حرام قرار دیتی ہے؟ تو حضرت انس نے فرمایا: جس شخص نے لا اِلٰہ اِلّا اللہ کی شہادت دی، ہمارے قبلہ کا استقبال کیا اور ہماری طرح نماز ادا کی اور ہمارا ذبح کیا ہوا کھالیا تو وہ مسلمان ہے، اس کے وہی حقوق ہوں گے جو ایک مسلمان کے ہیں اور اس سے وہی مؤاخذے ہوں گے جو ایک مسلمان سے کئے جاتے ہیں۔

**مقصد ترجمہ** ستر عورت کے ابواب سے فراغت کے بعد اب امام بخاریؒ نماز کی ایک شرط استقبال قبلہ کے متعلق ابواب منعقد فرمارہے ہیں، اسی ضمن میں وہ مساجد کے احکام بھی بیان فرمائیں گے، اس سلسلے کا پہلا باب "بابُ فضل استقبال القبلة" ہے یعنی استقبال قبلہ کی فضیلت کا بیان، استقبال قبلہ نماز کی شرط ہے، امام بخاریؒ سب سے پہلے اس کی فضیلت بیان کرنا چاہتے ہیں، کہتے ہیں کہ استقبال کرنا چاہئے حتی کہ سجدے اور قعود کی حالت میں بھی نمازی کو اپنے پیروں کی انگلیوں کا رخ موڑ کر قبلہ کی طرف کر لینا چاہئے۔

آگے روایت ذکر فرمارہے ہیں کہ جس شخص نے ہماری طرح نماز پڑھی، استقبال قبلہ اسی ضمن میں آگیا تھا، اس لیے کہ ہماری نماز وہ ہے جس میں رکوع بھی ہے، سجدہ بھی ہے اور قبلہ کا استقبال بھی ہے، لیکن روایت میں اس ضمنی تذکرے

پر اکتفاء نہیں ہے، بلکہ" و استقبل قبلتنا" میں مستقل طور پر استقبال قبلہ مذکور ہے، اس طرح روایت سے استقبال قبلہ کی خصوصی فضیلت اور اہمیت معلوم ہوگئی اور اس حقیقت پر تنبیہ ہوگئی کہ قبلہ کا استقبال مستقلاً مطلوب ہے۔

**تشریح حدیث** حدیث شریف میں تین چیزوں کا ذکر ہے (۱) جو شخص ہماری طرح نماز ادا کرے (۲) ہمارے قبلہ کا استقبال کرے (۳) ہمارے ذبیحہ کو حلال سمجھے، جب یہ تینوں چیزیں جمع ہو جائیں تو یہ وہ مسلمان ہے جس کو خدائے تعالی نے اپنی پناہ میں لے لیا ہے اور رسول اکرم علیہ کا ذمہ اس سے متعلق ہو گیا۔ اس ارشاد سے استقبال قبلہ کی اہمیت معلوم ہوگئی کہ یہ ان تین چیزوں میں سے ایک ہے، جن کے اختیار کرنے پر خداوند قدوس کا ذمہ اور رسول اکرم علیہ کا عہد متعلق اور قائم ہو جاتا ہے اور کسی شرعی جواز کے بغیر ایسے شخص سے تعرض یعنی بدعہدی کرنے کے جرم میں خدائے تعالی کی طرف سے مؤاخذہ شروع ہو جاتا ہے۔

انہیں احادیث کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے اہل قبلہ کا لقب اختیار کیا گیا ہے، اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ یہ تینوں چیزیں مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان امتیازی شان پیدا کرتی ہیں، نماز اور استقبال قبلہ مذہبی امتیاز ہے کہ دوسرے مذاہب میں اول تو نماز اس طرح کی نہیں ہے، کیوں کہ ان کی نماز میں رکوع نہیں ہے، دوسرے یہ کہ ان کی نماز کا جو بھی طریقہ ہے اس میں وہ ہمارے قبلہ کا استقبال نہیں کرتے؛ بلکہ مثلاً نصاری بیت اللحم کا استقبال کرتے ہیں اور یہودی صخرۂ بیت المقدس کا۔ دوسرا امتیاز ذبیحہ کا کھانا، یہ معاشرت کے سلسلے میں امتیاز ہے کہ مثلاً یہودی ہمارے ذبیحہ کا استعمال نہیں کرتے، جب کہ مسلمان اہل کتاب کے ذبیحہ کو حلال سمجھتے ہیں اور کھاتے ہیں، گویا یہ چیزیں مسلمانوں کے لیے شعار کے درجہ میں ہیں اور اگر ایسی چیز ظاہر نہ ہو جس کے اختیار کرنے سے کفر لازم آجاتا ہے، تو ان چیزوں کے اختیار کرنے والے کو مسلمان سمجھا جائے گا، اس کا یہ مطلب نہیں کہ صرف یہ تین چیزیں ہی مسلمان ہونے کے لیے کافی ہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دین کی دوسری ضروریات کے ساتھ ان امتیازات کو قائم رکھیں وہ مسلمان ہیں۔

دوسری روایت میں آیا: " فقد حرمت علینا دماء هم و اموالُهُمْ" کہ جو لوگ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه کا اقرار کریں، ہمارے طریقہ پر نماز پڑھیں، ہمارے قبلہ کا استقبال کریں اور ہمارے ذبیحہ کو استعمال کریں، تو ان کی جانیں اور ان کے اموال حرام ہو گئے، گویا اس روایت میں سابق روایت کی تشریح آگئی، پچھلی روایت میں صرف یہ آیا تھا کہ ایسے لوگوں سے اللہ اور اس کے رسول کا عہد قائم ہو جاتا ہے، اس روایت میں اس عہد کی تشریح اور وضاحت آگئی کہ ان لوگوں کے جان اور مال کے بلا وجہ درپے ہونا خدا اور اس کے رسول کے عہد میں دخل اندازی کرنا ہے، اِلَّا بِحَقِّهَا یعنی اگر ایسے شخص پر مال یا جان کا تاوان یا قصاص واجب ہو تو وہ اس سے ضرور وصول کیا جائے گا، اور یہ ذمہ اور عہد کے خلاف نہ ہوگا۔

تیسری روایت لا کر دوسری روایت کی سند میں عنعنہ سے پیدا ہونے والے اشتباہ کو ختم کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ دوسری روایت میں " حمید الطویل عن انس بصیغۂ عَنْ" تھا کہ تحدیث کی تصریح نہ تھی، اس لیے امام بخاری نے تیسری

روایت لاکر بتلا دیا کہ روایت کی سند میں کوئی اشتباہ نہیں ہے، بلکہ میمون بن سیاہ نے حمید الطّویل کی موجودگی میں حضرت انسؓ سے سوال کیا، معلوم ہوا کہ حمید الطّویل نے حضرت انسؓ سے بلا واسطہ روایت کی ہے، پھر اس کی تقویت کے لیے امام بخاری نے روایت کی چوتھی سند بھی ذکر فرما دی جس میں حمید الطّویلؒ اخبرنا انسؓ کی تصریح کر رہے ہیں، عنعنہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

## [۲۹] بَابُ قِبْلَةِ اَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَاَهْلِ الشَّامِ وَالْمَشْرِقِ

لَيْسَ فِي الْمَشْرِقِ وَلَا فِي الْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ لَا تَسْتَقْبِلُوْا الْقِبْلَةَ بِغَائِطٍ اَوْ بَوْلٍ وَلٰكِنْ شَرِّقُوْا اَوْ غَرِّبُوْا

(۳۹۴) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ ثَنَا سُفْيَانُ قَالَ نَا الزُّهْرِيُّ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَزِيْدَ اللَّيْثِيِّ عَنْ اَبِيْ اَيُّوْبَ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ اِذَا اَتَيْتُمُ الْغَائِطَ فَلَا تَسْتَقْبِلُوْا الْقِبْلَةَ وَلَا تَسْتَدْبِرُوْهَا وَلٰكِنْ شَرِّقُوْا اَوْ غَرِّبُوْا . قَالَ اَبُوْ اَيُّوْبَ فَقَدِمْنَا الشَّامَ فَوَجَدْنَا مَرَاحِيْضَ بُنِيَتْ قِبَلَ الْقِبْلَةِ فَنَنْحَرِفُ وَ نَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ. وَعَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عَطَاءٍ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا اَيُّوْبَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ مِثْلَهٗ . (گذشتہ: ۱۴۴)

**ترجمہ** باب، اہل مدینہ اور شامیوں کی سمت قبلہ کا بیان اور ان لوگوں کی سمت مشرق کا حکم۔[1] مشرق اور مغرب میں ان لوگوں کا قبلہ نہیں ہے، اس لیے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ پیشاب یا پاخانہ کے وقت روبقبلہ نہ ہو، بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف رخ کرلو۔ حضرت ابوایوب انصاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جب تم قضاء حاجت کے لیے جاؤ تو نہ قبلہ کی طرف رخ کرو اور نہ قبلہ کی طرف پشت کرو، بلکہ مشرق یا مغرب کی طرف رخ کرلو، حضرت ابوایوبؓ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد ہم شام گئے تو ہم نے وہاں بیت الخلاء قبلہ رخ پائے، چنانچہ ہم وہاں ترچھے ہو کر بیٹھتے اور باری تعالیٰ سے استغفار کرتے۔ زہری عطاء سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ سے یہ روایت سنی ہے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد ترجمہ یہ ہے کہ اہل مدینہ اور اہل شام کی سمت قبلہ کیا ہے؟ اور ان کی سمت مشرق و مغرب کا کیا حکم ہے؟ ان دونوں بلاد کی دونوں سمتوں کے بیان کے لیے فرمایا" لیس فی المشرق ولا فی المغرب قبلۃ "، یعنی اہل شام اور اہل مدینہ کا قبلہ نہ مشرق میں ہے، نہ مغرب میں ہے بلکہ، ان کا قبلہ جنوب میں ہے، مدینہ اور شام

---

[1] ترجمہ میں صرف مشرق ہی مذکور ہے، مغرب نہیں ہے، لیکن حکم بہر حال دونوں ہی سمتوں کا بیان کرنا پیش نظر ہے، مغرب کو ترک کر کے صرف مشرق کا تذکرہ کرنے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ امام بخاری نے ایک سمت کا حکم بیان کر دیا تو دوسری سمت مقابل کا حکم بھی سمجھا جا سکتا ہے، یا پھر یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے کہ اکثر آبادی اس وقت سمت مشرق ہی میں تھی، اس لیے صرف اسی سمت کا حکم بیان فرما دیا گیا۔ واللہ اعلم

یہ دونوں مکہ معظّمہ سے جانب شمال میں واقع ہیں اور مکہ معظّمہ ان کے جنوب میں ہے، اس لیے اہل شام اور اہل مدینہ کا قبلہ نہ مشرق میں ہوگا، نہ مغرب میں، بلکہ جنوب میں ہوگا۔

"لیس فی المشرق ولا فی المغرب قبلة" کا تعلق اہل مدینہ اور اہل شام اور ان لوگوں سے ہے جن کی سمتِ قبلہ مدینہ اور شام کے مطابق ہو، اس کو عموم پر محمول کرنا درست نہ ہوگا، کہ دنیا میں کسی کا قبلہ مشرق ومغرب کی طرف نہیں ہے، ابن بطال شارح بخاری نے صرف ایک صورت کے استثناء کے بعد اس کو عموم پر محمول کیا ہے، مگر ان کے قول کے مطابق بہت زیادہ اشکال پیش آتے ہیں، مثلاً خود امام بخاری جو بخارا کے رہنے والے ہیں ان کا قبلہ بھی سمت مغرب میں ہے، جیسا کہ ہم اہل ہندوستان کا قبلہ مغرب میں ہے، اس لیے امام بخاری کے قول "لیس فی المشرق ولا فی المغرب قبلة" کو عموم پر محمول کرنے کا مفہوم یہ ہوگا کہ خود امام بخاری کو اپنی سمت قبلہ بھی معلوم نہ ہو، حالانکہ یہ بعید از قیاس ہے، اس لیے امام بخاری کے اس جملہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ یہ حکم صرف اہل مدینہ اور اہل شام ہی کے لیے ہے، کہ مشرق اور مغرب میں ان کا قبلہ نہیں، بلکہ ان کا قبلہ مغرب اور مشرق کے مابین جنوباً وشمالاً واقع ہو رہا ہے، پھر امام بخاری نے خود ہی اس تخصیص کی دلیل بھی بیان فرمادی کہ روایت میں سرکار دوعالم ﷺ نے حکم دیا کہ قضائے حاجت کے وقت رو بہ قبلہ ہوکر، یا قبلہ کی جانب پشت کر کے نہیں بیٹھنا چاہئے، بلکہ شرقاً وغرباً بیٹھنا چاہئے، معلوم ہوا کہ یہ حکم صرف ان لوگوں کے لیے ہے جن کا قبلہ شرقاً وغرباً نہیں ہے، اور وہ اہل مدینہ، اہل شام اور وہ لوگ ہیں جن کی سمت قبلہ اہل مدینہ کے مطابق ہو۔

**تشریح حدیث** روایت پر تفصیلی گفتگو حدیث ۱۴۴ کے ذیل میں گزر چکی ہے، یہاں صرف اتنی بات ہے کہ ترجمہ میں یہ بتلایا گیا تھا، کہ اہل مدینہ اور اہل شام کا قبلہ مشرق ومغرب میں نہیں ہے، حضرت ابوایوب انصاریؓ کی روایت سے یہ بات ثابت کردی گئی جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ قضائے حاجت کے لئے شرقاً اور غرباً بیٹھا کرو، اس سے معلوم ہوا کہ اہل مدینہ کا قبلہ اس سمت میں نہیں ہے، اگر ان لوگوں کا قبلہ شرقاً اور غرباً ہو تو حدیث کے اول وآخر میں تعارض ہو جائے گا کہ اول تو یہ فرمایا گیا کہ استقبال قبلہ نہ کیا جائے اور آخر میں شرقاً وغرباً بیٹھنے کی تعلیم دی گئی۔

نیز یہ کہ روایت میں شام کا بھی تذکرہ ہے کہ ہم لوگ شام گئے تو وہاں یہ صورت حال دیکھی اور یہ عمل کیا۔ اس طرح ترجمہ کے دونوں جزء یعنی اہل مدینہ اور اہل شام دونوں کے قبلہ کے بارے میں علم حاصل ہوگیا۔

## [۳۰] بَابُ قَوْلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلّٰی (بقرہ: ۱۲۵)

(۳۹۵) حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِیُّ قَالَ نَا سُفْيَانُ قَالَ نَا عَمْرُو بْنُ دِيْنَارٍ قَالَ سَأَلْنَا ابْنَ عُمَرَ عَنْ رَجُلٍ طَافَ بِالْبَيْتِ لِلْعُمْرَةِ وَلَمْ يَطُفْ بَيْنَ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةِ اَيَاْتِیْ امْرَأَتَهٗ فَقَالَ قَدِمَ النَّبِیُّ ﷺ فَطَافَ بِالْبَيْتِ سَبْعاً وَصَلّٰی خَلْفَ الْمَقَامِ رَكْعَتَيْنِ وَطَافَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ وَقَدْ

كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَة. (آئندہ:۱۶۲۳، ۱۶۲۷، ۱۶۴۵، ۱۶۴۷، ۱۷۹۳)

(۳۹۶) وَسَأَلْنَا جَابِرَ بْنَ عَبْدِاللهِ فَقَالَ لَا يَقْرُ بَنَّهَا حَتَّى يَطُوْفَ بَيْنَ الصَّفَا وَالْمَرْوَةِ.

(آئندہ:۱۶۲۴، ۱۶۴۶، ۱۷۹۴)

**ترجمہ** باب، باری تعالیٰ کا ارشاد کہ تم مقام ابراہیم کو قبلۂ نماز بناؤ۔ عمرو بن دینارؒ سے روایت ہے کہ ہم نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا جس نے عمرہ کے لیے خانہ کعبہ کا طواف کیا اور صفا و مروہ کے درمیان سعی نہیں کی، آیا ایسا شخص اپنی بیوی کے پاس جاسکتا ہے؟ تو حضرت ابن عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ رسول اکرم ﷺ تشریف لائے اور آپ نے خانۂ کعبہ کا سات بار طواف کیا اور مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز ادا کی اور صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی اور بے شک تمہارے لیے رسول اکرم ﷺ کی ذات میں اسوۂ حسنہ موجود ہے۔ اور عمرو بن دینار نے کہا کہ ہم نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے بھی ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے جواب دیا کہ ایسا شخص ہرگز اپنی بیوی کے پاس نہ جائے، یہاں تک کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کر لے۔

**مقصد ترجمہ** امام بخاری نے آیت پاک " وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى "کو ترجمہ کے طور پر ذکر کیا ہے، کہ مقام ابراہیم کو نماز گاہ بناؤ "اِتَّخِذُوْا" امر کا صیغہ ہے اور امر کی اصل وجوب ہے، اور مقام ابراہیم دراصل وہ پتھر ہے، جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت اللہ کی تعمیر کی تھی، اس پتھر پر آپ کے دونوں پیروں کے نشانات موجود ہیں، یہ پتھر بیت اللہ کے سامنے نصب ہے، مُصَلّٰی کا مطلب قبلہ ہے، یہ دراصل مُصَلّٰی الیہ تھا، حرف جار کو حذف کر دیا گیا، اب گویا آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ مقام ابراہیم کی طرف نماز پڑھی جائے، حالانکہ مقام ابراہیم کی طرف نماز پڑھنے کو کوئی ضروری نہیں سمجھتا، اس لیے لامحالہ یا تو "اِتَّخِذُوْا" میں وجوب کے علاوہ کوئی اور معنی اختیار کیے جائیں، یا پھر مقام ابراہیم میں توسع اختیار کیا جائے، چنانچہ اکثر حضرات نے "اِتَّخِذُوْا" میں وجوب کے بجائے استحباب مراد لیا اور مقام ابراہیم سے مراد وہی پتھر لیا گیا جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقوش پا موجود ہیں، اس صورت میں جس نماز کو مقام ابراہیم میں پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ صرف تحیۃ الطّواف کی دو رکعت ہیں۔ یعنی وہ دو رکعتیں جو طواف کے بعد ادا کی جاتی ہیں، ان کے لیے تمام مقامات سے اولیٰ تر مقام مقامِ ابراہیم ہے، یعنی وہ جگہ جہاں یہ پتھر رکھا ہوا ہے، معلوم ہوا کہ "اِتَّخِذُوْا" صیغۂ امر وجوب کے لیے نہیں بلکہ استحباب کے لیے ہے۔

لیکن اس صورت میں دشواری یہ ہے کہ امام بخاری نے ترجمہ کے ذیل میں جو تین روایات ذکر کی ہیں، اس تقدیر پر ان تینوں روایات میں سے پہلی روایت تو ترجمہ سے بلا تکلف منطبق ہو جائے گی، لیکن باقی دو روایتوں کو منطبق کرنے کے لیے تکلفات سے کام لینا ہوگا، اس لئے امام بخاری کی ذکر کردہ روایات کے پیش نظر بہتر یہ معلوم ہوتا ہے کہ "اِتَّخِذُوْا" کو تو اپنے اصل معنی یعنی وجوب پر محمول کیا جائے، اور مقام ابراہیم میں توسع کر کے، اس سے مرادِ بیت اللہ شریف لیا جائے،

کیوں کہ بیت اللہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا ہے، اور ظاہر ہے کہ بیت اللہ چونکہ نماز کا قبلہ ہے، اس لیے ہر شخص مکلّف ہے کہ بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے، اس صورت میں صیغۂ امر اپنی اصل یعنی وجوب کے معنی میں رہا اور مقام ابراہیم کے معنی بیت اللہ ہو گئے، اس صورت میں تینوں روایات کے انطباق میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

**مقام ابراہیم کی مراد میں چند اقوال** اس سلسلہ میں علماء امت کے مختلف اقوال ہیں: (۱) وہ مقام جہاں وہ پتھر رکھا ہوا ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نشانات قدم ہیں (۲) بیت اللہ شریف (۳) مسجد حرام (۴) پورا حرم شریف۔ ان چار مشہور اقوال میں سے ہم نے دوسرے معنی مراد لئے ہیں، تیسرے اور چوتھے معنی میں بہت زیادہ توسع ہے، آیت کریمہ کی مراد یہ ہے کہ بیت اللہ شریف کے کسی بھی حصہ کا استقبال نماز میں فرض ہے، چونکہ بیت اللہ وہ مقام ہے، جس کو حضرت ابراہیمؑ نے قائم فرمایا اور تعمیر کیا تھا اور تمہاری ملت ملت ابراہیمی ہے؛ اس لیے بیت اللہ کو تمہارا قبلہ مقرر کیا گیا۔

یہ معنی مراد لینے کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ امام بخاری علیہ الرحمہ کی ذکر کردہ روایات بے تکلف ترجمہ سے منطبق ہو جاتی ہیں، دوسرے یہ کہ امام بخاری نے یہ باب، ابواب قبلہ میں ذکر کیا ہے، اگر "اِتَّخِذُوْا" کو استحباب پر محمول کیا جائے اور مقام ابراہیم سے مراد وہ خاص پتھر لیا جائے تو ابواب قبلہ سے اس باب کا ربط کمزور ہو جائے گا۔　　واللہ اعلم

**تشریح حدیث** حضرت عمرو بن دینار کہتے ہیں کہ حضرت عبد اللہؓ بن عمر سے ایسے شخص کے بارے میں سوال کیا جس نے عمرہ کی نیت کی، بیت اللہ شریف کا طواف کیا، لیکن صفا اور مروہ کے درمیان سعی نہیں کی، ایسا شخص اپنی بیوی کے پاس جا سکتا ہے یا نہیں؟ یعنی ایسے شخص کو احرام کھول دینے کی اجازت ہے، یا نہیں؟ حضرت عبد اللہ بن عمر نے صریح جواب نہیں دیا بلکہ پیغمبر علیہ السلام کا عمل نقل فرما دیا کہ آپ تشریف لائے، آپ نے بیت اللہ کے سات طواف کئے، پھر مقام ابراہیم کے پیچھے دو رکعت نماز تحیۃ الطّواف ادا کی، پھر صفا اور مروہ کے درمیان سعی فرمائی، پھر آخر میں حضرت ابن عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ پیغمبر علیہ السلام کا عمل تمہارے سامنے ہے اور آپ کا عمل وہ اسوۂ حسنہ ہے جس کی اقتداء تمہارے ذمہ لازم ہے۔ اس کے بعد یہی مسئلہ حضرت جابرؓ سے معلوم کیا گیا تو انہوں نے جواب میں صراحت فرما دی کہ عمرہ کرنے والے کو صفا اور مروہ کے درمیان سعی سے پہلے عورتوں کے قریب جانا جائز نہیں۔

بخاری کا مقصد صرف "صلّی خلف المقام رکعتین" سے ہے، اب اگر "اتخذوا من مقام ابراھیم مصلی" میں "اِتَّخِذُوْا" کو استحباب پر حمل کریں تو بھی روایت کی مطابقت ظاہر ہے کہ تحیۃ الطّواف کے لیے سب سے اولیٰ تر مقام مقام ابراہیم ہی ہے، ضروری کسی کے نزدیک نہیں۔ اور اگر "اِتَّخِذُوْا" کو وجوب پر حمل کریں تو مقام ابراہیم سے مراد بیت اللہ شریف ہوگا، اس صورت میں روایت کا ترجمۃ الباب سے انطباق ظاہر ہے کہ نماز میں کعبہ کو قبلہ بنایا جائے، جیسا کہ روایت میں آپ کے عمل سے یہی ثابت ہوا۔

(۳۹۷) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ سَيْفٍ قَالَ سَمِعْتُ مُجَاهِداً قَالَ أُتِىَ ابْنُ عُمَرَ، فَقِيْلَ لَهُ هٰذَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ دَخَلَ الْكَعْبَةَ فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ فَأَقْبَلْتُ وَالنَّبِىُّ ﷺ قَدْ خَرَجَ وَاَجِدُ بِلَالاً قَائِماً بَيْنَ الْبَابَيْنِ فَسَأَلْتُ بِلَالاً فَقُلْتُ اَصَلَّى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِى الْكَعْبَةِ قَالَ نَعَمْ رَكْعَتَيْنِ بَيْنَ السَّارِيَتَيْنِ عَلٰى يَسَارِهٖ اِذَا دَخَلْتَ ثُمَّ خَرَجَ فَصَلّٰى فِىْ وَجْهِ الْكَعْبَةِ رَكْعَتَيْن. (آئندہ: ۴۶۸، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۱۱۶۷، ۱۵۹۸، ۱۵۹۹، ۲۹۸۸، ۴۲۸۹، ۴۴۰۰)

(۳۹۸) حَدَّثَنَا اِسْحٰقُ بْنُ نَصْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ اَخْبَرَنَا ابْنُ جُرَيْجٍ عَنْ عَطَاءٍ قَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ قَالَ لَمَّا دَخَلَ النَّبِىُّ ﷺ الْبَيْتَ دَعَا فِىْ نَوَاحِيْهِ كُلِّهَا وَلَمْ يُصَلِّ حَتّٰى خَرَجَ مِنْهُ فَلَمَّا خَرَجَ رَكَعَ رَكْعَتَيْنِ فِىْ قُبُلِ الْكَعْبَةِ وَقَالَ هٰذِهٖ هِىَ الْقِبْلَةُ.

(آئندہ: ۱۶۰۱، ۳۳۵۱، ۳۳۵۲، ۴۲۲۸)

**ترجمہ** سیف مخزومی سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے مجاہد سے سنا ہے کہ حضرت ابن عمرؓ کو یہ بتایا گیا کہ یہ رسول اکرم ﷺ ہیں جو ابھی کعبہ کے اندر داخل ہوئے ہیں، حضرت ابن عمر کہتے ہیں کہ میں خانۂ کعبہ کی طرف گیا تو آپ ﷺ اندر سے تشریف لا رہے تھے، میں نے دیکھا کہ حضرت بلالؓ دونوں دروازوں کے درمیان کھڑے ہیں، چنانچہ میں نے حضرت بلال سے دریافت کیا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے کعبہ کے اندر نماز پڑھی ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ ہاں دو رکعت، ان دو ستونوں کے درمیان جو تمہارے اندر جاتے وقت بائیں ہاتھ کی طرف پڑتے ہیں، پھر پیغمبر علیہ السلام باہر تشریف لائے، اور آپ نے کعبہ کے سامنے دو رکعت نماز ادا کی۔ عطاء بن ابی رباح سے روایت ہے کہ انھوں نے کہا کہ میں نے حضرت ابن عباسؓ سے سنا انھوں نے کہا کہ جب رسول اکرم ﷺ بیت اللہ میں داخل ہوئے تو آپ نے خانۂ کعبہ کے تمام گوشوں میں دعا کی اور نماز ادا نہیں کی، حتی کہ آپ باہر تشریف لائے، پھر جب آپ باہر آ گئے تو آپ نے کعبہ کے سامنے دو رکعت ادا کیں اور فرمایا کہ قبلہ یہی ہے۔

**تشریح حدیث** اس باب کے تحت امام بخاری نے یہ دو روایتیں اور ذکر کی ہیں، ان روایات میں آیا کہ سرکار دو عالم ﷺ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے، آپ کے ہمراہ حضرت بلالؓ اور حضرت اسامہؓ تھے،[1] باہر سے دروازہ بند کر دیا گیا تا کہ ہجوم نہ ہو جائے۔ کعبہ میں داخل ہو کر آپ ﷺ نے کیا کیا؟ حضرت اسامہ کہتے ہیں کہ دعا فرمائی، حضرت بلال کہتے ہیں کہ نماز پڑھی، اس موقعہ پر حضرت بلالؓ کی بات کو قبول کیا گیا ہے اور حضرت اسامہؓ کی بات کو لاعلمی پر محمول کیا گیا ہے، حالانکہ دونوں حضرات اندر تھے مگر بات یہ ہوئی کہ جب آپ اندر داخل ہوئے تو آپ نے

---

[1] حضرت ابن عباسؓ کی روایت بظاہر مراسیل ابن عباس میں سے ہے، اس لیے کہ حضرت ابن عباس کا سرکار دو عالم ﷺ کے ساتھ خانہ کعبہ کے اندر جانا ثابت نہیں، لیکن مسلم نے محمد بن ابی بکر ابن جریج کے طریق سے اور اسماعیلی اور ابو نعیم نے اپنی مستخرج میں اسحاق بن راہویہ عن عبدالرزاق اور پھر اسی مذکورہ متن اسناد کے ساتھ روایت کیا کہ حضرت ابن عباس نے یہ روایت حضرت اسامہ بن زید سے کی ہے۔

دعا شروع کی، حضرت اسامہؓ بھی دعا میں مشغول ہوگئے، اس کے بعد آپ نے تو دو رکعت بھی ادا فرمالیں، لیکن حضرت اسامہ اپنی دعا ہی میں منہمک رہے، حضرت بلال نے چونکہ آپ کی نماز کا مشاہدہ بھی کیا، اس لیے ان کی روایت مشاہدہ کی وجہ سے قوی ہے اور از روئے اصول بھی چونکہ حضرت بلال ایک امر زائد مثبت کی خبر دے رہے ہیں، اس لیے ان کی روایت کو ترجیح دی جائے گی، بہر حال یہ ثابت ہوگیا کہ آپ نے کعبہ کے اندر نماز ادا کی۔

حضرت ابن عمرؓ کو معلوم ہوا کہ آپ کعبہ کے اندر تشریف لے گئے ہیں تو یہ فوراً وہاں پہنچے، دیکھا تو آپ باہر تشریف لا چکے ہیں اور حضرت بلال دروازے پر کھڑے ہیں، وہ کواڑوں کے درمیان تھے، اسی کو حضرت ابن عمرؓ نے بین البابین سے تعبیر فرمادیا، ابن عمر نے حضرت بلال سے آپؐ کی نماز کے بارے میں دریافت کیا تو حضرت بلال نے نماز کی اطلاع دی اور کہا کہ جب تم بیت اللہ میں داخل ہو جاؤ تو آگے بڑھتے رہو، جب آخری دیوار تین ذراع کے بقدر رہ جائے تو ان دو ستونوں کے درمیان جو داخل ہونے والے کے بائیں طرف واقع ہوتے ہیں، وہاں آپ نے دو رکعت ادا کی ہیں اور جب باہر تشریف لے آئے تو دو رکعت خانۂ کعبہ کے سامنے ادا کیں اور دوسری روایات میں یہ مزید آیا کہ کعبہ کے باہر دو رکعت ادا فرما کر آپ نے ارشاد فرمایا ''ھٰذہ ھی القبلة'' کہ یہی مسلمانوں کا قبلۂ نماز ہے۔

**ترجمہ کا ثبوت** ان دونوں روایات میں مقام ابراہیم بمعنی مخصوص پتھر کا کوئی ذکر نہیں، اس لیے اگر ترجمۃ الباب کی آیت ''وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاھِیْمَ مُصَلًّے'' میں ''اِتَّخِذُوْا'' کو استحباب پر حمل کریں اور مقام ابراہیم سے مخصوص پتھر مراد لیں تو بظاہر ان دونوں روایات کا ترجمہ سے ربط باقی نہیں رہتا، کیوں کہ ان دونوں ہی روایات میں مقام ابراہیم کا کوئی تذکرہ نہیں، اِلّا یہ کہ یوں کہا جائے کہ بخاری نے پہلی روایت سے تو تحیۃ الطواف کے لئے مقام ابراہیم کی تخصیص پر استدلال کیا ہے اور دوسری و تیسری روایت سے فرائض اور دیگر نمازوں کے لیے مقام ابراہیم کی عدم تخصیص پر استدلال کیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ اس توجیہ میں کس درجہ تکلف ہے؟

اور اگر امر کو وجوب پر حمل کریں اور مقام ابراہیم سے پورا بیت اللہ مراد لیں تو کوئی تکلف نہیں، ظاہر ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے کعبہ کے اندر نماز پڑھی، پھر باہر تشریف لا کر کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی اور فرمایا کہ ''ھٰذہ ھِیَ الْقِبْلَةُ'' یعنی مسلمانوں کا قبلہ نماز، یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعمیر فرمودہ اور قائم کردہ خانہ کعبہ ہے۔ اس تقریر پر کسی تکلف کی ضرورت نہیں۔　　واللہ اعلم

## [۳۱] بَابُ التَّوَجُّهِ نَحْوَ الْقِبْلَةِ حَيْثُ كَانَ

وَقَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اسْتَقْبِلِ الْقِبْلَةَ وَكَبِّرْ

(۳۹۹) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ رَجَاءٍ قَالَ نَا اِسْرَائِيْلُ عَنْ اَبِيْ اِسْحٰقَ عَنِ الْبَرَاءِ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ

اللہ علیہ وسلم صلّی نحو بیت المقدس ستۃ عشر شہرا او سبعۃ عشر شہرا و کان رسول اللہ علیہ وسلم یحب ان یوجہ الی الکعبۃ فانزل اللہ عزوجل قد نری تقلب وجھک فی السماء فلنولینک قبلۃ ترضھا فتوجہ نحو القبلۃ وقال السفھاء من الناس وھم الیھود ما ولّٰھم عن قبلتھم التی کانوا علیھا قل للہ المشرق والمغرب یھدی من یشاء الی صراط مستقیم (بقرہ:۱۴۲) فصلّی مع النبی علیہ وسلم رجل ثم خرج بعد ما صلی فمر علی قوم من الانصار فی صلوٰۃ العصر یصلون نحو بیت المقدس فقال ھو یشھد انہ صلّی مع رسول اللہ علیہ وسلم وانہ توجہ نحو الکعبۃ فتحرف القوم حتی توجھوا نحو الکعبۃ . (گذشتہ:۴۰)

**ترجمہ** باب، نمازی کہیں بھی ہو قبلہ کی طرف رخ کرے۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے کہا کہ نبی اکرم علیہ وسلم نے فرمایا کہ پہلے قبلہ کا استقبال کرو پھر تکبیر تحریمہ کہو۔ حضرت براء بن عازبؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم علیہ وسلم نے ۱۶ یا ۱۷ مہینے بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی اور آپؐ چاہتے یہ تھے کہ انہیں کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا حکم ہو جائے؛ چنانچہ باری تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی: "قد نری تقلب وجھک الی آخرا لآیۃ" یعنی ہم آپ کے چہرہ کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھ رہے ہیں، پس ہم ضرور آپ کے لیے وہی قبلہ مقرر کر دیں گے جو آپ چاہتے ہیں، اس حکم کے بعد آپ نے قبلہ کی طرف رخ فرما لیا، اس پر بے عقل لوگوں نے جو یہود تھے یہ کہا کہ ان لوگوں کو کس چیز نے اس قبلہ سے بدل دیا جس کی طرف پہلے متوجہ تھے؟ آپ فرما دیجیے کہ مشرق اور مغرب اللہ کی ملکیت ہیں، جس کو چاہتے ہیں سیدھا راستہ دکھا دیتے ہیں، پھر ایک شخص نے رسول اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رُو بہ قبلہ نماز پڑھی اور نماز کے بعد چلا گیا، پھر عصر کی نماز میں یہ شخص انصار کی ایک جماعت سے گزرا، یہ انصار اس وقت بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ رہے تھے، چنانچہ اس شخص نے ان لوگوں کو اطلاع دی کہ وہ اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس نے رسول اکرم علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی ہے اور یہ کہ رسول اللہ علیہ وسلم نے کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کی ہے، چنانچہ یہ خبر سنتے ہی سب لوگ نماز میں گھوم گئے اور انہوں نے اپنا رخ کعبہ کی طرف کر لیا۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ استقبال قبلہ ضروری ہے "حیث کان" نمازی کہیں بھی ہو، سفر میں ہو یا حضر میں، کعبہ کے پاس ہو یا دور، بیت اللہ کے اندر ہو یا باہر، ہر صورت میں نماز کے لیے قبلہ کا استقبال ضروری ہے، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم علیہ وسلم نے فرمایا کہ تکبیر کہنے سے پہلے سمت قبلہ صحیح کر لو، اگر کعبہ سامنے ہے تو استقبال عین کعبہ کا کرنا ہوگا، لیکن اگر سامنے نہیں ہے، تو عین کعبہ کا استقبال جمہور کے نزدیک تکلیف مالا یطاق ہے، اس لیے دوری کی صورت میں قبلہ کا نہیں جہت قبلہ کا استقبال ضروری قرار دیا گیا ہے۔ نوافل میں گنجائش ہے، اگر کوئی سفر میں جا رہا ہے، اور دابہ (سواری کے جانور) پر سوار ہے تو اس کو نفل میں اجازت ہے کہ جس طرف سواری کا رخ ہو اسی سمت میں

نفل پڑھتا چلا جائے۔ ابوداؤد کی روایت کے پیش نظر بعض حضرات نے یہ شرط کی ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رخ قبلہ کی طرف ہونا ضروری ہے، لیکن حنفیہ کے نزدیک یہ بھی شرط نہیں، البتہ اگر زمین پر نماز پڑھے تو اطمینان کی حالت میں رو بہ قبلہ ہونا ضروری ہے اور اگر غیر اطمینانی حالت ہے اور چلتے چلتے نماز ادا کرنے کی مجبوری ہے، تو جس طرف بھی رخ ہو اسی طرف نماز پڑھتا چلا جائے، اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ستر عورت اور استقبال قبلہ دونوں چیزوں کو خاص ضرورتوں میں ساقط مان لیا گیا ہے، مثلاً دابہ پر سوار ہے اور وہ سرکش ہے، قبضہ میں نہیں ہے اور بوجہ ضعف یا خوف دشمن یا کسی اور وجہ سے دابہ سے اتر بھی نہیں سکتا، یا اتر تو سکتا ہے لیکن بغیر سہارا دیئے ہوئے سوار نہیں ہوسکتا اور سہارا دینے والا وہاں کوئی نہیں ہے، یا مثلاً بارش کی کثرت ہے، یا درندے کا خوف ہے تو ان صورتوں میں مصلی مجبور ہے اور استقبال قبلہ اس سے ساقط ہے، جس طرف بھی رخ ہو اسی طرف نماز پڑھ لے۔

**تشریح حدیث** یہ روایت کتاب الایمان میں " باب الصلوة من الایمان" کے تحت گزر چکی ہے، اس روایت میں یہ آیا کہ حضرت بشر بن براء کا انتقال ہوگیا، سرکار دو عالم ﷺ نماز جنازہ کے لیے بنوسعد میں تشریف لے گئے، اس وقت قبلہ بیت المقدس تھا، وہیں ظہر کی نماز ادا کی، دو رکعت ادا کرنے پائے تھے کہ قبلہ کا حکم بدل گیا اور بیت المقدس کے بجائے بیت اللہ کے استقبال کا حکم آ گیا، آپ نے نماز کے درمیان ہی میں رخ بدل دیا، معلوم ہوا کہ استقبال قبلہ اس قدر ضروری ہے کہ اگر مصلی کو نماز کے دوران یہ معلوم ہو کہ وہ قبلہ سے منحرف ہے اور یہ انحراف اپنی تحری کی بناپر ہوا اور اثناء صلوۃ میں مصلی کا خیال بدل گیا، یا کسی شخص نے اس کو صحیح سمت قبلہ کی اطلاع دیدی، تو بقیہ نماز اسی حالت پر پوری کرنے کی اجازت نہیں، بلکہ رخ بدلنا ہوگا؛ کیوں کہ قبلہ کا استقبال ضروری ہے، ابتداء میں بھی اور انتہاء میں بھی، چنانچہ اس واقعہ میں یہ ہوا کہ دو رکعتیں پڑھی جا چکی تھیں، پھر یہ معلوم ہوا کہ وہ قبلہ اب منسوخ ہوگیا، تو یہ نہیں کیا گیا کہ اس نماز کو نا تمام چھوڑ کر نئے سرے سے بیت اللہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے اور یہ بھی نہیں ہوا کہ اس نماز کو بیت المقدس ہی کی طرف رخ کیے ہوئے پورا کر لیتے؛ بلکہ استقبال قبلہ کی اہمیت کے پیش نظر اسی وقت رخ بدل دیا گیا، حالانکہ اس تبدیلی میں یقیناً بہت زیادہ تکلف ہوا ہوگا، اس طرح نماز کی حالت میں رخ بدلنا خصوصاً امام کے لیے بہت دشوار ہے، کیوں کہ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھنے میں رخ شمال کی طرف تھا، اور اب جنوب کی طرف متوجہ ہونا پڑا، بہر حال تکلف اور دشواری تو ضرور ہوئی لیکن قبلہ اسی حالت میں درست کیا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ استقبال قبلہ کی بڑی اہمیت ہے، صورت حال کتنی بھی پریشان کن ہو اور مصلی کہیں بھی ہو سمت قبلہ کا درست کرنا ضروری ہے۔ واللہ اعلم

(۴۰۰) حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ نَاهِشَامُ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ نَا يَحْيىٰ بْنُ اَبِىْ كَثِيْرٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَانِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ كَانَ النَّبِىُّ ﷺ يُصَلِّىْ عَلىٰ رَاحِلَتِهٖ حَيْثُ تَوَجَّهَتْ بِهٖ فَاِذَا اَرَادَ الْفَرِيْضَةَ نَزَلَ فَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ. (آئندہ: ۱۰۹۴، ۱۰۹۹، ۴۱۴۰)

**ترجمہ** حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ اپنی سواری کے اونٹ پر نماز پڑھتے تھے، خواہ وہ سواری کسی بھی جانب آپ کو لے جا رہی ہو، لیکن جب آپ فرض کا ارادہ فرماتے تو سواری سے اتر جاتے اور قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے۔

**تشریح حدیث** اس روایت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ استقبال قبلہ کے معاملہ میں نوافل میں گنجائش ہے، سرکار دو عالم ﷺ سواری پر خواہ وہ کسی طرف بھی جا رہی ہو نمازیں پڑھ لیتے تھے، لیکن فرائض کے لیے آپ سواری سے اتر جاتے اور قبلہ رو ہو کر فرائض ادا فرماتے، گویا فرائض کا عمل تو سواری پر مجبوری کے بغیر درست ہی نہیں، البتہ اگر کوئی اس طرح کی مجبوری ہو جس کی مثالیں حدیث سابق کے ذیل میں دی جا چکی ہیں، تو فرائض میں بھی گنجائش دی گئی ہے۔ علامہ عینی نے ''خلاصۃ الفتاوی'' سے نقل کیا ہے:

''رہا فرض نماز کا سواری پر پڑھنا تو یہ بھی عذر میں جائز ہے، اور بارش بھی عذر ہی ہے، امام محمدؒ سے منقول ہے کہ اگر سفر میں بارش ہو جائے اور نماز پڑھنے کے لیے خشک جگہ نہ ملے تو سواری کو روک کر رو بہ قبلہ ہو کر فرض ادا کر لے اور اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو بغیر استقبال قبلہ ہی نماز ادا کرے، یہ اس صورت میں ہے جب اتنی کیچڑ ہو کہ منہ اس میں دھنس جائے اور اگر صرف زمین پر نمی اور تری ہی ہے، تو زمین پر نماز پڑھنی چاہئے، اور یہ سب اس وقت ہے کہ سواری قابو میں نہ ہو، اور اگر قابو میں ہو تو نفل یا فرض سواری پر پڑھنا درست نہیں''۔　(عینی جلد دوم ص ۳۰۹)

مفہوم یہ ہے کہ مجبوری میں تو ''الضرورات تبیح المحذورات'' کے اصول کے تحت نوافل ہی نہیں، فرائض میں بھی گنجائش ہے۔　واللہ اعلم

(۴۰۱) حَدَّثَنَا عُثْمَانُ قَالَ نَا جَرِيْرٌ عَنْ مَنْصُوْرٍ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللهِ صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ قَالَ اِبْرَاهِيْمُ لَا اَدْرِيْ زَادَ اَوْ نَقَصَ فَلَمَّا سَلَّمَ قِيْلَ لَهُ يَارَسُوْلَ اللهِ! أَحَدَثَ فِي الصَّلٰوةِ شَيْءٌ قَالَ وَمَا ذَاكَ؟ قَالُوْا صَلَّيْتَ كَذَا وَكَذَا فَثَنّٰى رِجْلَيْهِ وَاسْتَقْبَلَ الْقِبْلَةَ وَسَجَدَ سَجْدَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ، فَلَمَّا اَقْبَلَ عَلَيْنَا بِوَجْهِهٖ قَالَ اِنَّهٗ لَوْ حَدَثَ فِي الصَّلٰوةِ شَيْءٌ لَنَبَّأْتُكُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِثْلُكُمْ اَنْسٰى كَمَا تَنْسَوْنَ فَاِذَا نَسِيْتُ فَذَكِّرُوْنِيْ وَاِذَا شَكَّ اَحَدُكُمْ فِيْ صَلَاتِهٖ فَلْيَتَحَرَّ الصَّوَابَ فَلْيُتِمَّ عَلَيْهِ ثُمَّ لِيُسَلِّمْ ثُمَّ يَسْجُدُ سَجْدَتَيْنِ.　(آئندہ: ۴۰۴، ۱۲۲۶، ۶۶۷۱، ۷۲۴۹)

**ترجمہ** حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے نماز ادا کی، ابراہیم راوی حدیث کہتے ہیں کہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ سہواً نماز میں رکعت کی زیادتی ہوگئی تھی یا کمی، پس آپ نے جب سلام پھیر دیا تو آپ سے عرض کیا گیا کہ آپ نے اس طرح نماز پڑھی ہے، کیا نماز کے بارے میں کوئی نیا حکم نازل ہوگیا ہے؟ آپ نے فرمایا:

نئی بات کیا ہوئی؟ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ آپ نے اس اس طرح نماز پڑھی ہے، یہ سن کر آپ نے اپنے دونوں پیروں کو موڑا، قبلہ کا استقبال کیا اور دو سجدے کئے، پھر سلام پھیرا، پھر چہرۂ مبارک سے ہماری طرف متوجہ ہو کر ارشاد فرمایا کہ اگر نماز میں کوئی نئی بات پیش آئی ہوتی تو میں نے تمہیں آگاہ کر دیا ہوتا؛ لیکن میں تمہاری ہی طرح ایک بشر ہوں، جس طرح تمہیں بھول ہوتی ہے مجھے بھی ہوتی ہے، پس اگر مجھے بھول ہو جائے تو (سبحان اللہ وغیرہ کہہ کر) یاد دلایا کرو اور جب تم میں سے کسی کو اپنی نماز کے بارے میں شک ہو جائے تو وہ غلبۂ ظن سے درست صورت حال کی تلاش کرے، پھر اس درست صورت حال پر اپنی سابق نماز کو پورا کرے، پھر سلام پھیر دے، پھر دو سجدے کر لے۔

## تشریح حدیث

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے نماز پڑھائی، اور اس میں سہو ہو گیا، ابراہیم راویٔ حدیث کہتے ہیں کہ مجھے یہ خیال نہیں رہا کہ نماز میں زیادتی ہوئی تھی یا کمی؟ آگے انہی ابراہیم کی روایت دوسری سند سے آرہی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں زیادتی ہو گئی تھی اور چار کے بجائے پانچ رکعتیں ہو گئی تھیں، گویا روایت بیان کرتے وقت ابراہیم کو ایک بار زیادتی کا یقین رہا اور دوسری بار شک ہو گیا، جب آپ نے سلام پھیر دیا تو صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا نماز کے بارے میں کوئی نیا حکم آگیا ہے؟ آپ نے فرمایا کیوں؟ کیا ہوا؟ عرض کیا گیا کہ آپ نے اتنی رکعت پڑھی ہیں! نماز میں صحابہ کرام اس لیے خاموش رہے کہ شاید نماز میں کسی تبدیلی کا حکم آگیا ہے، نماز کے بعد جب صورت حال آپ سے عرض کی گئی تو آپ نے فوراً پیروں کو قبلہ کی طرف موڑ دیا اور سجدۂ سہو کر کے نماز کو پورا کیا، پھر نماز کے بعد فرمایا کہ میں بھی تمہاری طرح بشر ہوں، بشریت کے تقاضے اور عوارض میرے ساتھ بھی لگے ہوئے ہیں اور جس طرح نسیان تم لوگوں کو ہوتا ہے، اسی طرح مجھے بھی ہو سکتا ہے، اس لیے اگر میں بھول جایا کروں تو یاد دلا دیا کرو! پھر آپ نے فرمایا کہ اگر نماز کے بارے میں کوئی نیا حکم آیا ہوتا تو میں نماز سے قبل ہی آگاہ کر دیتا۔

آپ نے یہ فرما کر اس حقیقت پر متنبہ کر دیا کہ یہ سہو و نسیان اعمال کے معاملہ میں تو ممکن ہے، لیکن تبلیغ کے معاملہ میں ایسا ناممکن ہے؛ کیونکہ اس معاملہ میں ذمہ داری خداوند قدوس نے لے رکھی ہے " لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ" کہ آپ قرآن کریم کو محفوظ رکھنے کی غرض سے زبان کو عجلت کے ساتھ حرکت نہ دیجئے، بے شک اس کو جمع کرنا اور پڑھوانا ہمارا کام ہے، پھر یہ کہ اس کو بیان کرا دینا بھی ہماری ذمہ داری ہے، بیان کرا دینے کی ذمہ داری کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کوئی نیا حکم نازل ہوا ہو تو اس کے بیان میں تاخیر ناممکن تھی، پھر یہ کہ اعمال کے سلسلے میں جو سہو انبیاء علیہم السلام کو پیش آیا ہے وہ بھی دراصل باری تعالی کی ایک حکمت بالغہ کے سبب ان پر طاری کیا جاتا ہے، تاکہ عام مسلمانوں کو عملی طور پر مسائل سہو کی تعلیم دی جا سکے۔ واللہ اعلم

**نماز میں سہو پیش آنے پر تحری** اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی کو نماز کی رکعات کی تعداد کے بارے میں شک ہو جائے تو اس کو تحری کر لینی چاہیے، تحری کے معنی ہیں اَحریٰ یعنی انسب کی تلاش، اگر تحری کے ذریعہ غلبۂ ظن سے کوئی بات راجح ہو جائے تو اسی پر آگے عمل کی بنا کرے، پھر اگر تحری کی وجہ سے رکن کی ادائیگی میں تاخیر ہو گئی تو سلام کے بعد سہو کے دو سجدے کر لیے جائیں، اس روایت سے یہ معلوم ہوا کہ سجدۂ سہو سلام کے بعد ہے جیسا کہ حنفیہ کہتے ہیں، اس سلسلہ میں اختلاف صرف اولیٰ کا ہے، یہ بحث آئندہ سجدۂ سہو کے ابواب میں آ رہی ہے، نیز اس روایت سے معلوم ہوا کہ تحری جو شریعت غراء میں ایک ثابت شدہ اصل ہے، نماز میں سہو پیش آ جانے کی صورت میں اس کا اعتبار ہے، چنانچہ احناف نے اس پر عمل کیا ہے، احناف کے نزدیک مسئلہ یہ ہے کہ اگر نمازی کو زندگی میں پہلی بار سہو ہوا ہے تو نماز کو از سر نو پڑھنا چاہیے، اور اگر سہو پہلی بار نہیں ہے تو تحری کرنی چاہیے، اگر تحری سے کوئی جانب راجح ہو جائے تو آئندہ عمل کی بنا اسی غلبۂ ظن پر کرے، اور اگر دونوں جانب برابر ہیں تو جانب اقل پر عمل کرے، اس طرح حنفیہ نے اس سلسلے میں وارد شدہ تمام احادیث کو جمع کر لیا، لیکن حضرات شوافع کے یہاں اس باب میں تحری کا مسئلہ سرے سے نہیں ہے، بلکہ ان کے یہاں تمام صورتوں میں اقل پر بنا کرنے ہی کو ضروری قرار دیا گیا ہے، گویا ان حضرات نے نماز میں سہو پیش آ جانے کی صورت میں تحری کی ثابت شدہ اصل کو بالکل ترک کر دیا ہے۔

**ترجمہ سے ربط** نماز میں کلام کا مسئلہ امام بخاریؒ کے پیش نظر یہاں بالکل نہیں ہے، یہ بحث آگے ذوالیدین کی حدیث کے تحت آ رہی ہے، بلکہ امام بخاریؒ یہاں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت سے صرف یہ استدلال کرنا چاہتے ہیں کہ نماز میں قبلہ کی رعایت نہایت ضروری ہے حتیٰ کہ اگر کوئی شخص سہواً نماز سے خارج ہو کر غیر قبلہ کی طرف متوجہ ہو گیا ہو اور اس کو خیال آئے کہ اس نے سلام غلط پھیر دیا ہے تو اس صورت میں اگر کوئی مانع نہ ہو تو فوراً قبلہ کی طرف رخ کرے اور نماز پوری کر لے اور اگر صرف سجدۂ سہو کرنا ہو تو چونکہ وہ بھی متمم صلوٰۃ ہے، اس لیے اس کو بھی قبلہ رو ہو کر کرے، اس سے استقبال قبلہ کی اہمیت اور ضرورت ثابت ہو گئی۔

## [۳۲] بَابُ مَاجَاءَ فِي الْقِبْلَةِ وَمَنْ لَمْ يَرَ الْإِعَادَةَ عَلٰى مَنْ سَهَا فَصَلّٰى اِلٰى غَيْرِ الْقِبْلَةِ

وَقَدْ سَلَّمَ النَّبِيُّ ﷺ فِي رَكْعَتَي الظُّهْرِ فَاَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ بِوَجْهِهٖ ثُمَّ اَتَمَّ مَابَقِيَ

(۴۰۲) حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَوْنٍ قَالَ حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ عَنْ حُمَيْدٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ عُمَرُ وَافَقْتُ رَبِّي فِي ثَلٰثٍ: قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَوِ اتَّخَذْنَا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلّٰى فَنَزَلَتْ وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ اِبْرَاهِيمَ مُصَلّٰى (بقرہ:۱۲۵) وَاٰيَةُ الْحِجَابِ، قُلْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ لَوْ اَمَرْتَ نِسَاۤءَكَ اَنْ يَحْتَجِبْنَ فَاِنَّهٗ يُكَلِّمُهُنَّ الْبَرُّ وَالْفَاجِرُ فَنَزَلَتْ آيَةُ الْحِجَابِ، وَاجْتَمَعَ نِسَاۤءُ

النَّبِیِّ ﷺ فِی الْغَیْرَةِ عَلَیْهِ فَقُلْتُ لَهُنَّ عَسٰی رَبُّهُ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُبَدِّلَهُ اَزْوَاجاً خَیْراً مِنْکُنَّ (تحریم:۵) فَنَزَلَتْ هٰذِهِ الْاٰیَةُ. قَالَ اَبُوْعَبْدِ اللهِ وَقَالَ ابْنُ اَبِیْ مَرْیَمَ اَخْبَرَنَا یَحْیٰی بْنُ اَیُّوْبَ قَالَ حَدَّثَنِیْ حُمَیْدٌ قَالَ سَمِعْتُ اَنَساً بِهٰذَا. (آئندہ:۴۴۸۳،۴۷۹۰،۴۹۱۶)

(۴۰۳) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ یُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِیْنَارٍ عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ بَیْنَا النَّاسُ بِقُبَاءَ فِیْ صَلٰوةِ الصُّبْحِ اِذْجَاءَ هُمْ اٰتٍ فَقَالَ اِنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اللَّیْلَةَ قُرْاٰنٌ وَقَدْاُمِرَ اَنْ یَسْتَقْبِلَ الْقِبْلَةَ فَاسْتَقْبِلُوْهَا وَکَانَتْ وُجُوْهُهُمْ اِلَی الشَّامِ فَاسْتَدَارُوْا اِلَی الْکَعْبَةِ. (آئندہ:۴۴۸۸،۴۴۹۰،۴۴۹۱،۴۴۹۳،۴۴۹۴،۷۲۵۱)

(۴۰۴) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا یَحْیٰی عَنْ شُعْبَةَ عَنِ الْحَکَمِ عَنْ اِبْرَاهِیْمَ عَنْ عَلْقَمَةَ عَنْ عَبْدِ اللهِ قَالَ صَلَّی النَّبِیُّ ﷺ الظُّهْرَ خَمساً فَقَالُوْا اَزِیْدَ فِی الصَّلٰوةِ؟ قَالَ وَمَا ذَالِكَ؟ فَالُوْا صَلَّیْتَ خَمساً فَثَنّٰی رِجْلَیْهِ وَسَجَدَسَجْدَتَیْنِ. (گذشتہ:۴۰۱)

**ترجمہ** باب، ان چیزوں کا بیان جو قبلہ کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں اور اس شخص کے نقطۂ نظر کا بیان جو نماز کا اعادہ اس شخص پر واجب نہیں سمجھتا جس کو قبلہ کے بارے میں سہو ہوگیا اور اس نے غیر قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لی، اور یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے ظہر کی نماز میں دو رکعت پر سلام پھر دیا، پھر آپؐ نے اپنا چہرہ لوگوں کی طرف کیا اور پھر باقی نماز کو پورا فرمایا۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ تین معاملات میں حضرت عمر نے فرمایا کہ میری رائے میرے پروردگار کے موافق رہی: ایک یہ کہ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! اگر ہم مقام ابراہیم کو قبلۂ نماز بنالیں تو بہتر ہو، چنانچہ آیت پاک "وَاتَّخِذُوا مِنْ مَقَامِ اِبْرَاهِیْمَ مُصَلًّی" نازل ہوئی، دوسرا واقعہ حجاب کی آیت ہے، کہ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اگر آپ ازواج مطہرات کو پردہ کا حکم فرمادیں تو بہتر ہے، اس لیے کہ ان سے گفتگو کرنے والوں میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی، چنانچہ آیت حجاب نازل ہوگئی، تیسرا موقع یہ کہ رسول اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات آپ کی خدمت میں رشک وغیرت کے جذبات کے ساتھ جمع ہوئیں تو میں نے ان سے کہا کہ اگر رسول اللہ ﷺ تم سب عورتوں کو طلاق دے دیں تو کچھ بعید نہیں کہ آپ کا پروردگار آپ کو تم سے بہتر بیویاں عطا فرمادے، چنانچہ اسی مضمون کی آیت نازل ہوگئی، ابو عبداللہ بخاریؒ کہتے ہیں کہ سعید بن ابی مریم نے یہ روایت اس سند سے بیان کی ہے، کہ ہمیں یحیی بن ابی ایوب نے خبر دی، انہوں نے کہا کہ ہم سے حمید نے حدیث بیان کی اور حمید نے کہا کہ میں نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اسی طرح سنا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ اس حال میں کہ لوگ مسجد قباء میں فجر کی نماز پڑھ رہے تھے، کہ یکا یک ایک آنے والا آیا اور اس نے اطلاع دی کہ رات رسول اکرم ﷺ پر قرآن کریم نازل ہوا ہے، اور اس میں آپ کو قبلہ کے استقبال کا حکم دیدیا گیا ہے، چنانچہ ان سب لوگوں نے قبلہ کا استقبال کیا، اس وقت ان کا رخ شام کی طرف تھا، لیکن حکم سننے کے بعد

وہ کعبہ کی طرف گھوم گئے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے سہو سے ظہر کی رکعتیں پانچ پڑھ لیں، صحابہ نے عرض کیا، کیا نماز میں زیادتی ہوگئی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ کیوں؟ کیا ہوا؟ عرض کیا گیا کہ آپ نے پانچ رکعتیں پڑھی ہیں، چنانچہ یہ سنتے ہی آپ نے اپنے پیروں کو موڑا اور دو سجدے کیے۔

**مقصد ترجمہ** "بَابُ مَاجَاءَ فِي الْقِبْلَةِ" عنوان ہے اور مقصد یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے غیر قبلہ کی طرف سہواً نماز پڑھ لی اور سہو کی بنیاد غفلت نہیں بلکہ بنیاد یہ تھی کہ قبلہ مشتبہ تھا اور غور وفکر کے باوجود سمت قبلہ کے تعین میں غلطی ہوگئی، تو اطلاع کے بعد ایسے شخص کو نماز کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

یہ مسئلہ اختلافی ہے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اگر غلطی معلوم ہو جائے تو ہر صورت میں نماز کو دوبارہ پڑھنا ضروری ہے، امام مالکؒ کے یہاں اگر غلطی وقت کے اندر ہی معلوم ہو جائے تو نماز کا لوٹانا ضروری ہے، وقت گزرنے کے بعد معلوم ہو تو لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ امام بخاریؒ نے اس مسئلہ میں احناف کی موافقت کی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب ارشاد فرماتے ہیں:

"اس ترجمہ کا مقصد بظاہر امام ابوحنیفہؒ کی موافقت کی طرف اشارہ ہے، یعنی اگر نمازی نے کسی اندھیری رات میں قبلہ کی تحری کے سلسلے میں غلطی کی اور غیر قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھ لی تو اس کی نماز درست ہے، لوٹانے کی ضرورت نہیں۔ امام شافعیؒ کا اس سلسلہ میں دوسرا مسلک ہے، امام بخاری کا استدلال سرکار دو عالم ﷺ کے عمل سے اس طرح ہے کہ آپ نے چہرۂ مبارک نماز کے بعد مقتدیوں کی طرف پھیر دیا اور قبلہ رو نہ رہے، لیکن اس کے باوجود آپ نے اسی پر نماز کی بنا کی اور نماز کو نہیں لوٹایا"۔

امام بخاری نے بھی عنوان یہی قائم کیا ہے کہ اگر کسی نے سہواً غیر قبلہ کی طرف نماز پڑھی تو اس کی نماز ہوگئی، اعادے کی ضرورت نہیں۔ اس عنوان کا مقصد اور حاصل یہ ہے کہ تحری شرعاً معتبر ہے، یعنی اگرچہ نماز میں قبلہ کا استقبال ابتداء سے ضروری ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایسی جگہ ہو جہاں سمت قبلہ معلوم نہیں ہو سکتی، نہ ہی ایسی کوئی علامت موجود ہے، نہ کوئی ایسا شخص موجود ہے، جس سے سمت معلوم ہو سکے؛ اور نماز کا وقت آ جائے، تو امام بخاری کہتے ہیں کہ شریعت کا ضابطہ قبلہ و غیر قبلہ دونوں کے لیے ایک ہے کہ جس طرح شریعت کے اور تمام احکام میں مکلّف کی قوت و وسعت کا اعتبار ہے، اسی طرح استقبال قبلہ اور سمت قبلہ کے تعین کے سلسلے میں بھی شریعت نے مکلّف کی قوت و وسعت کی رعایت سے تحری کا ضابطہ مقرر فرمایا ہے؛ کیوں کہ یہی آخری چارۂ کار ہے اور جب تحری کے بعد ایک جانب متعین ہوگئی تو غلطی واضح ہو جانے کے بعد بھی اعادہ کی ضرورت نہیں؛ کیوں کہ متحری کے حق میں جہت تحری ہی قبلہ ہے۔

روایت میں آیا کہ آں حضرت ﷺ نے دو رکعت پر سلام پھیر دیا اور قبلہ رو نہ رہے، پھر معلوم ہوا کہ دو رکعت رہ گئی ہیں تو آپ ﷺ نے فوراً قبلہ رو ہو کر نماز کو پورا کیا، بخاریؒ نے مسئلہ نکال لیا کہ نماز کی حالت میں آپ نے دوگانہ کو

چار رکعت سمجھ کر سلام پھیر دیا، بعد میں معلوم ہوا کہ ظن واقعہ کے مطابق نہ تھا بلکہ سلام درمیان میں پھیر دیا گیا ہے، ظن کی غلطی واضح ہوجانے کے بعد بھی آپ نے نماز کا استیناف نہیں فرمایا؛ بلکہ انہیں دو رکعتوں پر نماز کی بنا کی، امام بخاری کہتے ہیں کہ تحری میں بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان اشتباہ کی حالت میں قبلہ معین کرتا ہے اور نماز شروع کر دیتا ہے، نماز کے بعد اگر جہت کی غلطی واضح ہو تو اعادے کی ضرورت نہیں، جیسا کہ آنحضرت ﷺ نے نماز کو پورا سمجھتے ہوئے سلام پھیرا تھا اور پھر نماز کا اعادہ نہیں کیا۔

**روایاتِ باب** پہلی روایت میں حضرت عمرؓ سے منقول ہے کہ میں نے تین باتوں میں اپنے رب کی موافقت کی یعنی جو تین باتیں میرے دل میں آئیں انہیں کے مطابق حکم خداوندی نازل ہوا، یہاں حضرت عمرؓ نے ادب کی رعایت کرتے ہوئے موافقت کی نسبت اپنی طرف کی ہے، ورنہ صورت واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم ان کی رائے کے موافق نازل ہوا ہے، اسی طرح تین جگہ کا تذکرہ بھی حصر کے لیے نہیں، بلکہ ان کے علاوہ اور بھی مواقع ہیں، جیسے غزوۂ بدر کے قیدیوں، منافقین کی نماز جنازہ اور حرمت خمر وغیرہ کے بارے میں قرآن کریم نے حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق حکم دیا ہے۔[1]

وہ تین مواقع یہ ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ اگر ہم مقام ابراہیم کو نماز گاہ بنالیں تو بہتر ہے، چنانچہ آیت پاک اسی طرح نازل ہوگئی، دوسرے حجاب کے واقعہ میں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا کہ آپ امہات المومنین کو پردہ کا حکم فرمادیں تو بہتر ہے، اس لیے کہ ان سے مومن ومنافق اور نیک وبد ہر طرح کا آدمی گفتگو کرتا ہے، چنانچہ آیت حجاب نازل ہوگئی "یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ وَبَنَاتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْهِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِهِنَّ" اور تیسرا واقعہ یہ کہ ازواج مطہراتؓ رشک وغیرت کے سبب سرکار دوعالم ﷺ کی خدمت میں اکٹھا ہوئیں، حضرت عمر نے اس موقعہ پر ان سے کہا کہ ہوش کی بات کرو، اگر آنحضرت ﷺ تم سب کو طلاق دیدیں تو اللہ تعالیٰ آپ کو حسن وجمال اور اطاعت ودینداری میں تم سے بہتر بیویاں دے سکتا ہے، چنانچہ اسی مضمون کی آیت نازل ہوگئی۔ یہ پہلی روایت ہے۔

دوسری روایت میں آیا کہ لوگ صبح کی نماز مسجد قبا میں ادا کر رہے تھے، کہ کسی نے آکر یہ اطلاع دی کہ رات رسول اکرم ﷺ پر قرآن کریم نازل ہوا ہے اور اس میں بیت اللہ کے استقبال کا حکم دے دیا گیا ہے، چنانچہ ان لوگوں نے جو شام کی طرف رخ کر کے نماز ادا کر رہے تھے نماز ہی میں گھوم کر قبلہ کی طرف رخ کرلیا۔

تیسری روایت وہی ہے جو ابھی باب سابق میں گزری ہے کہ سرکار دوعالم ﷺ نے ظہر کی نماز میں سہواً پانچ

[1] قسطلانی میں موافقات عمر کی تعداد بائیس لکھی ہے، تاریخ الخلفاء میں سیوطیؒ نے بیس سے زائد شمار کرائے ہیں، علامہ سیوطیؒ کا اس موضوع پر مستقل ایک رسالہ بھی ہے جس کا نام ہے، قطف الثمر فی موافقات عمرؓ۔

رکعت ادا فرمالیں، نماز کے بعد عرض کیا گیا کہ کیا نماز میں اضافہ کا حکم نازل ہو گیا ہے؟ آپ نے فرمایا، کیوں؟ کیا ہوا؟ عرض کیا گیا کہ آپ نے پانچ رکعت ادا فرمائی ہیں، چنانچہ یہ بات سنتے ہی آپ نے پیر موڑ لئے اور سہو کے دو سجدے کئے۔

**ترجمۃ الباب کا ثبوت** امام بخاریؒ نے اس ترجمہ کے ذیل میں تین روایات نقل فرمائی ہیں، پہلی روایت کا تعلق ترجمہ کے پہلے جز "ماجاء في القبلة" سے ہے کہ " اِتَّخِذُوْا مِنْ مَقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلّٰى" میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مقام ابراہیم کو قبلۂ نماز بنائیں۔

دوسری اور تیسری روایت ترجمۃ الباب کے دوسرے جز یعنی "من لم یر الاعادة علی من سَهَا" (سمت قبلہ میں سہو ہو جائے تو اعادے کی ضرورت نہیں) سے متعلق ہے، دوسری روایت سے اس جز کا ثبوت اس طرح ہو رہا ہے کہ استقبال قبلہ کا حکم نازل ہونے کے بعد جن لوگوں کو فوراً اطلاع ہو گئی انھوں نے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی، لیکن جن لوگوں کے علم میں یہ بات نہیں آئی انہوں نے بیت المقدس ہی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی، اس روایت میں قباء والوں کا تذکرہ ہے جن کے علم میں یہ بات تھی کہ خداوند قدوس نے تحویل قبلہ کا وعدہ فرمالیا ہے، لیکن ظہر کی نماز میں نازل شدہ تحویل کا حکم، ان لوگوں کے علم میں دوسرے دن فجر کی نماز میں آیا، مطلع ہوتے ہی ان لوگوں نے قبلہ کی طرف رخ کر لیا، اس موقع پر پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے صحابۂ کرام سے یہ نہیں فرمایا کہ وہ نمازوں کا اعادہ کریں اور نہ ان حضرات ہی کو خیال پیدا ہوا کہ بیت اللہ کے استقبال کا حکم نازل ہونے کے بعد، بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھی گئی نمازوں کے بارے میں استفسار کر لیں؛ بلکہ ان کی نمازوں کو درست قرار دیا گیا۔ امام بخاریؒ نے مسئلہ نکال لیا کہ چوں کہ ان کا عمل ان کے یقین کے مطابق درست تھا، اس لیے انہوں نے جو نمازیں پڑھیں انہیں درست قرار دیا گیا، اعادہ نہیں کرایا گیا۔ تحرّی میں بھی یہی ہوتا ہے کہ انسان غور وفکر کے بعد ایک سمت کو قبلہ قرار دیتا ہے اور نماز پڑھتا ہے جیسا کہ اہل قباء نے اپنے یقین کے مطابق بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نمازیں ادا کیں اور کوئی سوال اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے نہیں کیا۔

تیسری روایت سے اس جز کا ثبوت اس طرح ہو رہا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے نماز میں اپنے ظن کے مطابق عمل کیا جو خلاف واقعہ تھا، صحابۂ کرامؓ نے توجہ دلائی تو آپؐ نے اپنے ظن کے مطابق خلاف واقعہ کئے ہوئے عمل کو فساد صلوۃ کا موجب نہیں قرار دیا، بلکہ اسی وقت سہو کے دو سجدے کئے، معلوم ہوا کہ ظن اگر واقعہ کے خلاف بھی ہو تو فساد صلوۃ کا موجب نہیں۔ امام بخاری کے استدلال کے لیے اتنا بھی کافی ہے۔

یہ دوسری اور تیسری روایت ترجمہ کے پہلے جز "ماجاء في القبلة" سے بھی مربوط ہو سکتی ہے، دوسری روایت سے استدلال کا طریقہ یہ ہوگا کہ اس میں آپ کو قبلہ کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوا ہے اور تیسری روایت سے استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ استقبال قبلہ اتنی اہم چیز ہے، کہ سجدۂ سہو کے لیے بھی اس کا وجوب ثابت ہے۔ واللہ اعلم

## [۳۳] بَابُ حكّ الْبُزَاقِ بِالْيَدِ مِنَ الْمَسْجِدِ

(۴۰۵) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيْدٍ قَالَ نَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ حُمَيْدٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَاٰى نُخَامَةً فِي الْقِبْلَةِ فَشَقَّ ذٰلِكَ عَلَيْهِ حَتّٰى رُءِيَ فِيْ وَجْهِهٖ فَقَامَ فَحَكَّهٗ بِيَدِهٖ فَقَالَ اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا قَامَ فِيْ صَلَاتِهٖ فَاِنَّهٗ يُنَاجِيْ رَبَّهٗ اَوْاِنَّ رَبَّهٗ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ فَلَا يَبْزُقَنَّ اَحَدُكُمْ قِبَلَ قِبْلَتِهٖ وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْتَحْتَ قَدَمِهٖ ثُمَّ اَخَذَ طَرَفَ رِدَائِهٖ فَبَصَقَ فِيْهِ ثُمَّ رَدَّ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ فَقَالَ اَوْ يَفْعَلُ هٰكَذَا. (گذشتہ:۲۴۱)

(۴۰۶) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَنَا مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَاٰى بُصَاقاً فِيْ جِدَارِ الْقِبْلَةِ فَحَكَّهٗ ثُمَّ اَقْبَلَ عَلَى النَّاسِ فَقَالَ اِذَا كَانَ اَحَدُكُمْ يُصَلِّيْ فَلَا يَبْصُقْ قِبَلَ وَجْهِهٖ فَاِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ قِبَلَ وَجْهِهٖ اِذَا صَلّٰى. (آئندہ:۷۵۳، ۱۲۱۳، ۶۱۱۱)

(۴۰۷) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَنَا مَالِكٌ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَاٰى فِيْ جِدَارِ الْقِبْلَةِ مُخَاطاً اَوْ بُصَاقاً اَوْ نُخَامَةً فَحَكَّهٗ.

**ترجمہ** باب، مسجد میں تھوک پڑا ہوتو اس کو اپنے آپ کھرچ کر پھینک دینا چاہیے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے قبلہ کی سمت والی دیوار پر دیکھا کہ کھنکار (سینے سے نکلا ہوا بلغم) لگی ہوئی ہے، چنانچہ آپ کو یہ بات بہت گراں گزری حتی کہ آپ کے چہرۂ مبارک پر اس کے آثار نظر آنے لگے، چنانچہ آپ کھڑے ہوئے خود اس کو کھرچ ڈالا، پھر فرمایا کہ تم میں سے ہر کوئی شخص جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہ بے شک اپنے پروردگار سے مناجات کرتا ہے، یا یہ کہ بے شک اس کا پروردگار اس کے اور قبلہ کے درمیان ہوتا ہے؛ اس لیے کوئی شخص اپنے قبلہ کی جانب ہرگز نہ تھوکے لیکن اپنی بائیں جانب یا اپنے پیروں کے نیچے تھوک سکتا ہے۔ پھر آپ نے اپنی چادر کا ایک گوشہ لیا اور اس میں تھوک ڈال کر دکھایا، پھر اس کے حصہ کو دوسرے حصے سے رگڑ دیا اور فرمایا کہ اس طرح بھی کر سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے قبلہ کی سمت والی دیوار پر تھوک دیکھا تو اس کو کھرچ ڈالا پھر لوگوں سے مخاطب ہوئے اور فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص نماز پڑھ رہا ہو تو اپنے سامنے کی جانب نہ تھوکے، اس لیے کہ جب وہ نماز پڑھتا ہے، تو اللہ تعالی اس کے منھ کے سامنے ہوتا ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے دیوار قبلہ پر ناک کی رطوبت یا تھوک یا کھنکار کو دیکھا تو آپؐ نے اس کو کھرچ دیا۔

**ربط ابواب اور مقصد ترجمہ** امام بخاریؒ قبلہ کے احکام ذکر کر رہے تھے، ان سے فراغت کے بعد اب مسجدوں کے احکام بیان کر رہے ہیں، قبلہ اور مسجد کے درمیان جو مناسبت ہے وہ محتاج بیان نہیں،

کیوں کہ مسجد میں قبلہ کی سمت متعین ہوتی ہے، ہر خاص و عام کو یہاں استقبال قبلہ کی سہولت حاصل ہوتی ہے اور مسجد میں داخل ہونے والا ہر انسان قبلہ کی سمت پہچان لیتا ہے، بس اسی مناسبت سے امام بخاری نے مسجد کے احکام ابواب قبلہ کے ساتھ شامل کر دیئے کہ مسجد کی کیا شان ہے، اس کے کیا آداب ہیں اور داخل ہونے والے کو کیا کیا چیزیں ملحوظ رکھنی چاہئیں وغیرہ؟ بس اسی طرح کی باتیں ان ابواب میں ذکر کی جائیں گی[1]

اس سلسلے میں سب سے پہلے "حك البزاق باليد من المسجد" لا رہے ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ مسجد خانہ خدا ہے اس لحاظ سے اس کا احترام ضروری ہے، چنانچہ مسجد میں اگر کوئی گھناؤنی چیز پڑی ہو، تھوک ہو یا ناک کی رطوبت، یا کوئی اور چیز ہو تو جس کی بھی نظر پڑ جائے اس کا فرض ہو جاتا ہے کہ اس چیز کو مسجد سے صاف کر دے، یہ درست نہ ہوگا کہ خادم یا مؤذن کی آمد کا انتظار کرے، مسجد میں داخل ہونے والے کی یہ شان ہونی چاہئے کہ وہ مسجد کو خود صاف کر دے، مسجد کے احترام کا تقاضا بھی یہی ہے، خصوصاً اس مسجد کے نمازیوں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ مسجد کو گھناؤنی چیزوں سے پاک رکھیں۔

ترجمہ میں ''حك البزاق'' کے ساتھ باليد کا لفظ اسی مفہوم کو واضح کرنے کے لیے ہے، باليد کا مفہوم ہے بيده نفسه یعنی اپنے آپ، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس گھناؤنی چیز کو ہاتھ سے صاف کرے، اس کے لیے کسی آلہ کا استعمال نہ کرے، اگرچہ بعض حضرات نے آنے والے باب'' حك المخاط بالحصٰى'' کی رعایت سے جس میں بالحصٰی کی تصریح ہے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہاں باليد، بالحصی کے مقابل ہے، گویا ان حضرات کے نزدیک ایک باب میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ گھناؤنی چیز کو حصی یا کسی آلہ کی مدد سے چھیل دے اور اس باب میں یہ بتلانا مقصود ہے کہ کسی آلہ کے بغیر ہاتھ سے دور کرے، لیکن یہ خیال سرسری اور سطحی ہے؛ بخاری کا یہ مقصد نہیں، بخاری تو مسجد میں آنے والے ہر شخص پر یہ ذمہ داری ڈال رہے ہیں کہ جب آنے والے نے یہ دیکھ لیا کہ دیوار یا مسجد کے فرش پر کھنکار پڑی ہوئی ہے، تو یہ اس کا مستقل فریضہ ہو جاتا ہے، کہ اس کو ایک لمحہ کے لیے بھی پڑا نہ رہنے دے اور جس طرح بھی ممکن ہو اس کو صاف کرنے کی کوشش کرے رہا یہ کہ ترجمہ میں باليد اور بالحصى کے الفاظ کے ذریعہ فرق کرنے کی کیا وجہ ہے؟ تو یہ روایات باب کے الفاظ کے اتباع میں ہے، اور امام بخاری کا یہ طریق کار صحیح بخاری میں بہ کثرت موجود ہے۔

**تشریح احادیث** روایت میں آیا کہ نبی اکرم ﷺ نے دیکھا کہ قبلہ کی دیوار پر کھنکار پڑی ہوئی ہے، کھنکار میں غلظت اور لزوجت زیادہ ہوتی ہے، اور یہ بات جتنی زیادہ ہوگی اسی قدر تنفر بھی زائد ہوگا، چنانچہ آپ ﷺ کو یہ دیکھ کر اس قدر ناگواری ہوئی کہ چہرۂ مبارک سے اثر ظاہر ہونے لگا اور آپ اس تکلیف کو برداشت نہ کر سکے، فوراً کھڑے ہوئے اور اس کو کھرچ ڈالا'' فقام فحكّهٗ'' میں فاء تعقیب مع الوصل کے لیے ہے، دوسری روایت

---

[1] علامہ عینی نے فرمایا کہ یہاں سے باب سترۃ الامام تک پچپن ابواب ہیں جن میں مسجدوں کے احکام بیان کئے گئے ہیں اس لیے ان ابواب کے درمیان خصوصی ربط بیان کرنے کی چنداں ضرورت نہیں۔۱۲

میں تصریح ہے کہ آپ نے اس کو کسی نوکدار چیز سے کھرچا، اس لیے اس روایت میں بھی بیدہ کے معنی واضح اور متعین ہوگئے کہ اپنے آپ صاف کرے، یہ معنی نہیں ہیں کہ اپنے ہاتھ سے صاف کرے، کسی آلہ کو استعمال نہ کرے۔

پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ یاد رکھو جب تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو اس کی حیثیت مناجات کرنے والے کی ہوتی ہے، گویا وہ نماز میں باری تعالی سے سرگوشی اور عرض معروض کے لیے کھڑا ہے اور اس وقت اس کے پروردگار کی توجہ اس کے اور قبلہ کے درمیان ہے، کیوں کہ نمازی نے خداوند قدوس کی عبادت کے لیے اس وقت اسی سمت میں رخ کیا ہے ورنہ ذات خداوندی کسی مخصوص جہت کی قید سے منزہ اور پاک ہے، ایسی صورت میں قبلہ کی سمت میں تھوکنا خواہ وہ لعاب دہن ہو یا بلغم اور کھنکار ہو، انتہائی ناگوار امر ہے، کیوں کہ یہ سب ہی چیزیں قابل نفرت ہیں، نمازی کی طرف سے مناجات اور پروردگار عالم کی طرف سے نمازی اور قبلہ کے درمیان توجہ کے دوران یہ عمل ایک طرح کی بے اعتنائی اور اعراض کا معاملہ ہے، کہ تھوکنے سے زیادہ اور کیا بے توجہی ہوگی؛ اس لیے آپ نے متنبہ فرمایا کہ آئندہ یہ عمل ہرگز نہ کیا جائے۔[1]

پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر ایسی صورت میں تھوکنے کی مجبوری ہی پیش آجائے تو بائیں طرف تھوک سکتے ہیں اور اگر بائیں طرف بھی نمازی موجود ہے تو اپنے قدم کے نیچے تھوک سکتے ہیں اور اگر اس کا بھی موقع نہ ہو تو کپڑے میں لے کر مل دینا چاہئے، لیکن سمت قبلہ میں تھوک کر اعراض اور بے توجہی کا مظاہرہ نہ کرنا چاہئے۔

**روایات میں تعدد الفاظ کی وجہ** حضرت انسؓ والی پہلی روایت میں صرف نخامۃ کا لفظ ہے، یعنی کھنکار حضرت ابن عمرؓ والی دوسری روایت میں بصاق کا لفظ ہے یعنی تھوک اور حضرت عائشہؓ والی تیسری روایت میں شک کے طور پر مخاط، بصاق اور نخامۃ تینوں لفظ استعمال کئے گئے ہیں یعنی ناک کی رطوبت، تھوک اور کھنکار۔ امام بخاری ان تینوں روایتوں کو لاکر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ منھ کا تھوک ہو یا ناک کی رطوبت یا سینہ کا بلغم، تینوں چیزیں گھناؤنی ہیں اور مسجد کے معاملہ میں ان کا حکم یکساں ہے، یہ چیزیں مسجد کے فرش پر نظر آئیں، یا دیوار قبلہ پر، تر ہوں یا خشک، احترام مسجد کی رعایت سے ضروری ہوگا کہ ان کو مسجد سے فوراً کھرچ دیا جائے اور یہ ہر دیکھنے والے کی ذمہ داری ہے۔

## [۳۴] بَابُ حَكِّ الْمُخَاطِ بِالْحَصٰی مِنَ الْمَسْجِدِ

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ اِنْ وَطِئْتَ عَلٰی قَذِرٍ رَطْبٍ فَاغْسِلْهُ وَاِنْ كَانَ يَابِساً فَلَا

(۴۰۸،۴۰۹) حَدَّثَنَا مُوْسٰى بْنُ اِسْمَاعِيْلَ قَالَ نَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ قَالَ نَا ابْنُ شِهَابٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ اَنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ وَاَبَا سَعِيْدٍ حَدَّثَاهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَاٰى نُخَامَةً

---

[1] سمت قبلہ میں تھوکنے کی ممانعت کی وجہ اس روایت میں تو یہی احترام قبلہ اور پروردگار عالم کی اس سمت میں خاص تجلی ہی ہے، مگر دوسری روایات میں مسجد کا احترام، نماز کا احترام، کاتب حسنات کا احترام، داہنی سمت کا احترام اور نمازیوں کو ایذاء سے بچانا وغیرہ بھی مذکور ہیں۔ ۱۲

فِيْ جِدَارِ الْمَسْجِدِ فَتَنَاوَلَ حَصَاةً فَحَتَّهَا فَقَالَ إِذَا تَنَخَّمَ اَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَخَّمَنَّ قِبَلَ وَجْهِهٖ وَلَا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ الْيُسْرٰى۔ (آئندہ: ۴۱۰،۴۱۱،۴۱۴،۴۱۶)

**ترجمہ** باب، مسجد میں ناک کی رطوبت پڑی ہوتو اس کو کنکری سے کھرچ کر پھینکنے کا بیان۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ اگر تمہارا پیر کسی تر گندگی پر پڑ جائے تو اس کو دھوڈالو اور اگر خشک گندگی پر پڑے تو دھونے کی ضرورت نہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ اور حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے مسجد کی دیوار پر کھنکار کو دیکھا تو آپ نے ایک کنکری لی اور اس کو کھرچ ڈالا اور فرمایا کہ کسی شخص کو کھنکار میں بلغم آئے تو وہ سامنے کی جانب بلغم نہ ڈالے، نہ داہنی جانب ڈالے؛ بلکہ اپنی بائیں جانب یا قدم کے نیچے تھوکے۔

**مقصد ترجمہ** عنوان ہے کنکری کے ذریعہ مسجد میں پڑی ہوئی رطوبت کو صاف کرنا، اسی بنیاد پر بعض شارحین کو خیال ہوا کہ پچھلے باب میں بالید کا لفظ تھا، مقصد تھا ہاتھ سے رطوبت کو صاف کرنا اور یہاں بالحصی کا لفظ ہے اس لیے مقصد یہ ہوگا کہ کنکری، سنگریزے یا کسی بھی آلہ سے رطوبتوں کو صاف کرنا، لیکن باب سابق میں بیان کیا جاچکا ہے کہ یہ سرسری خیال ہے، امام بخاری کا یہ مقصد نہیں ہے۔

**حضرت شاہ ولی اللہؒ کی رائے** ارشاد فرماتے ہیں کہ اس عنوان سے امام بخاریؒ کا مقصد ان حضرات کی تردید ہے جنھوں نے حدیث باب سے استدلال کرتے ہوئے، ناک کی رطوبت کو نجس اور ناپاک قرار دیا ہے، ان حضرات کے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کا بذات خود اس کام کو انجام دینا صرف مسجد کی نظافت کے پیش نظر نہ تھا، بلکہ آپ مسجد کو نجاست سے پاک کرنا چاہتے تھے، ہوسکتا ہے کہ امام بخاریؒ کے پیش نظر ان حضرات کی تردید ہی ہو کیوں کہ امام بخاری نے اپنے تراجم میں عام طور پر ان چیزوں کو ملحوظ رکھا ہے اور حضرت ابن عباسؓ کا ارشاد بھی شاید اسی لئے نقل کیا ہو کہ اس سے ان لوگوں کی تردید ہوتی ہے۔

پھر ارشاد فرماتے ہیں کہ مقصد ترجمہ کے سلسلے میں عمدہ توجیہ میرے نزدیک یہ ہے کہ امام بخاری کے پاس اگر ایک حدیث متعدد سندوں سے ہوتی ہے تو وہ ان تمام سندوں کو ایک جگہ ذکر نہیں کرتے، بلکہ ان کی عادت یہ ہے کہ ہر روایت کو مستقل عنوان کے تحت ذکر کرتے ہیں اور الفاظ حدیث کی رعایت سے عنوان اور ترجمہ میں تنوع پیدا کردیتے ہیں، اصل مقصد اس حدیث کی مختلف سندوں کا ذکر کردینا ہوتا ہے، اس رائے کو حضرت علامہ کشمیری علیہ الرحمہ نے بھی پسند فرمایا ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ کی رائے کے مطابق یہاں امام بخاریؒ کے پیش نظر اس روایت کی دوسری سند کا بیان کردینا ہے اور اس کے لیے انھوں نے مستقل ایک ترجمہ منعقد کیا جس کا عنوان ہے کہ مسجد میں کسی گھناونی چیز کو پڑا نہ رہنے دیا جائے، بلکہ اس کو فوراً صاف کیا جائے، البتہ اس باب میں اس کی ایک مخصوص صورت کا تذکرہ ہوگیا کہ اگر اس گھناونی چیز

کو مسجد سے دور کرنے میں کسی آلہ کے استعمال کی ضرورت ہو تو اس کا اختیار ہے، خواہ کسی نوکدار چیز سے ازالہ کیا جائے، یا دھونے کی ضرورت ہو تو اس سے بھی گریز نہ کیا جائے۔

**حضرت ابن عباس کا اثر** حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا اگر تمہارا پیر کسی تر گندگی پر پڑے تو اس کو دھوڈالو اور اگر گندگی خشک ہے، تو دھونے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ امام بخاریؒ اس ارشاد کو اس باب کے تحت نقل کر کے کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ علامہ ابن حجرؒ کی رائے یہ ہے کہ امام بخاری یہ اثر نقل کر کے ادھر اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ اس نہی میں اہم ترین علت احترام قبلہ ہے، محض تھوک وغیرہ کا قابل نفرت ہونا نہیں، علامہؒ کی رائے میں اگرچہ ان چیزوں کا قابل نفرت ہونا بھی ایک سبب ہے، لیکن قبلہ کے احترام کی بات اس سے زیادہ اہم ہے، یہی وجہ ہے کہ مسجد کے سلسلے میں تر اور خشک کا فرق نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ جن چیزوں میں نہی کی علت محض ان کا قابل نفرت ہونا ہے وہاں یہ فرق کیا جاسکتا ہے کہ خشک پر پیر پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں اور تر پر پڑے تو اس کو دھونا چاہئے، گویا حضرت ابن عباس کے اثر میں تر اور خشک کا یہ فرق اس حقیقت پر مبنی ہے کہ وہ معاملہ مسجد کا نہیں ہے، مسجد کے معاملہ میں تر اور خشک کا فرق نہیں کیا جائے گا، وہ گندی چیز تر ہو یا خشک اس کو مسجد سے نکال کر پھینک دیا جائے، حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے بھی یہی مناسبت ذکر فرمائی ہے۔

حافظ ابن حجر کی بات بہت دور کی ہے مگر علامہ عینیؒ نے حسب عادت اس پر گرفت فرمائی اور کہا کہ نہی میں اہم علت احترام قبلہ کے ساتھ حصول اذیٰ بھی ہے، اس لیے کہ حضرت ابوسہلہ کی روایت میں "انك اذيت الله ورسوله" کی تصریح ہے، اس اعتراض کو مدلل کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ ابن عباسؓ کے اثر کی مناسبت یہ بھی تو ہوسکتی ہے کہ ترجمہ میں بھی "حك المخاط بالحصٰى" ہے اور روایت میں بھی، اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ناک کی یہ رطوبت خشک تھی، اس لیے کہ اگر رطوبت تر ہو تو کنکری وغیرہ سے ازالہ کی صورت میں وہ اور پھیل جائے گی، اس لیے ابن عباس کا یہ اثر دراصل خشک اور تر کے حکم میں فرق واضح کرنے کے لیے لایا گیا ہے، اگرچہ روایت میں بہ ظاہر اس کی صراحت نہیں ہے، علامہ عینیؒ کی ذکر کردہ مناسبت قریب کی ہے اور آسان بھی ہے۔

**روایت باب** روایت پر بحث گزر چکی ہے، ترجمہ بھی ثابت ہے کیوں کہ روایت میں یہ آیا کہ رسول اکرم ﷺ نے ایک سنگریزہ لیا اور اس سے رطوبت کو کھرچ کر صاف فرمادیا، معلوم ہوا کہ مسجد کی صفائی کے لیے اگر کسی آلہ کی ضرورت پڑے تو اس کے استعمال میں مضائقہ نہیں، کیوں کہ مقصد تو مسجد کو ہر طرح کی گھناؤنی چیزوں سے صاف کرنا ہے۔　　واللہ اعلم

## [۳۵] بَابُ لَا يَبْصُقْ عَنْ يَمِيْنِهِ فِي الصَّلٰوةِ

(۴۱۰،۴۱۱) حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ نَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ

عَبْدِ الرَّحْمَانِ اَنَّ اَبَا هُرَيْرَةَ وَاَبَا سَعِيْدٍ اَخْبَرَاهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ رَاٰى نُخَامَةً فِيْ حَائِطِ الْمَسْجِدِ فَتَنَاوَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حَصَاةً فَحَتَّهَا ثُمَّ قَالَ اِذَا تَنَخَّمَ اَحَدُكُمْ فَلَا يَتَنَخَّمْ قِبَلَ وَجْهِهٖ وَلَا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَلْيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ الْيُسْرٰى. (گذشتہ: ۴۰۸، ۴۰۹)

(۴۱۲) حَدَّثَنَا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ قَالَ نَا شُعْبَةُ قَالَ اَخْبَرَنِيْ قَتَادَةُ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسًا قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ لَا يَتْفُلَنَّ اَحَدُكُمْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ رِجْلِهِ الْيُسْرٰى. (گذشتہ: ۲۴۱)

**ترجمہ** باب، نماز میں اپنی داہنی جانب نہیں تھوکنا چاہیے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے مسجد کی دیوار پر کھنکار کو دیکھا تو آپ نے ایک کنکری لی اور اس کو کھرچ دیا، پھر فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص جب کھنکار کو تھوکے تو اس کو اپنے سامنے کی جانب میں یا داہنی طرف نہ تھوکے، بلکہ اپنے بائیں جانب یا پیر کے نیچے تھوکنا چاہیے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی شخص اپنے سامنے یا اپنی داہنی جانب نہ تھوکے، بلکہ اس کو اپنی بائیں جانب یا اپنے بائیں پیر کے نیچے تھوکنا چاہیے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ نماز کی حالت میں اگر مجبوراً تھوکنے کی ضرورت ہو تو داہنی جانب میں تھوکنے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے کہ اس طرف تھوکنے میں حسنات لکھنے والے فرشتے کی توہین ہے جو امیر بھی ہے، ہاں بائیں طرف اور قدم کے نیچے تھوکنے کی اجازت ہے، امام بخاری نے ترجمہ میں "فی الصّلوٰۃ" کی قید لگائی ہے، یہ اشارہ ہے کہ خارج صلوۃ میں داہنی طرف تھوکنے میں مضائقہ نہیں ہے۔

اشارے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ متعدد اسلاف نے اس کی ممانعت کی ہے، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی طرف منسوب ہے کہ انہوں نے نماز کی حالت کے علاوہ بھی داہنی طرف تھوکنے کو مکروہ قرار دیا ہے، حضرت معاذ بن جبلؓ نے فرمایا کہ میں نے اسلام قبول کرنے کے بعد کبھی داہنی جانب نہیں تھوکا، حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے صاحب زادے کو داہنی طرف تھوکنے سے مطلقاً منع فرمایا، چنانچہ علامہ نوویؒ نے وضاحت کردی کہ مسجد سے باہر ہو یا مسجد میں ہو، نماز میں ہو، یا خارج صلوٰۃ ہو، داہنی طرف تھوکنا بالکل ممنوع ہے، ان حضرات کی دلیل غالباً "فَاِنَّ عَنْ يَمِيْنِهٖ مَلَكًا" ہے، کہ داہنی طرف تھوکنے سے اس فرشتے کی توہین لازم آتی ہے، جو کاتب حسنات ہے "اِنَّ عَنْ يَمِيْنِهٖ مَلَكًا" کے الفاظ تو خود بخاری کی روایت میں ہیں اور مسند ابن ابی شیبہ میں یہ روایت "فَاِنَّ عَنْ يَمِيْنِهٖ كَاتِبَ الْحَسَنَاتِ" کے الفاظ میں منقول ہے۔

مگر امام بخاریؒ ترجمہ میں "فی الصلوۃ" کی قید بڑھا کر بتلانا چاہتے ہیں کہ نماز کی حالت میں تو اس سمت میں تھوکنے کی اجازت نہیں، لیکن خارج صلوۃ میں مضائقہ نہیں ہے، امام مالک سے بھی اسی طرح منقول ہے کہ نماز سے باہر

داہنی سمت میں تھوکنے میں مضائقہ نہیں، قاضی عیاض نے تو یہاں تک صراحت فرمادی ہے کہ نماز میں داہنی طرف تھوکنے کی ممانعت بھی اس وقت ہے جب کہ کوئی دوسری صورت ممکن ہو اور اگر مجبوری ہو تو اس کی بھی اجازت ہے، بشرطیکہ تھوکنے کے وقت ازالہ کی بھی نیت کر لی گئی ہو۔

**ترجمہ کا ثبوت** روایات تو گزر چکی ہیں، بس یہاں اتنی بات قابل لحاظ ہے کہ امام بخاریؒ نے ترجمہ میں "فی الصلوۃ" کی قید ذکر کی ہے، جب کہ روایات باب میں یہ قید نہیں ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس روایت کی بعض سندوں میں خود امام بخاری کے یہاں "اذا قَامَ فِيْ صَلٰوةٍ اور اذا كَانَ اَحَدُكُمْ يُصَلِّي" گذر چکا ہے، اور دوسرے باب کی روایت میں بھی یہ قید آ رہی ہے، اس لیے امام بخاری نے ترجمہ میں اس کی صراحت کر دی اور یہ امام بخاریؒ کی عادت ہے۔

## [۳۶] بَابٌ لِيَبْصُقْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْتَحْتَ قَدَمِهِ الْيُسْرٰى

(۴۱۳) حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ ثَنَا شُعْبَةُ قَالَ نَاقَتَادَةُ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا كَانَ فِيْ الصَّلٰوةِ فَاِنَّمَا يُنَاجِيْ رَبَّهٗ فَلَا يَبْزُقَنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلَا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ قَدَمِهٖ. (گذشتہ: ۴۱۱)

(۴۱۴) حَدَّثَنَا عَلِيٌّ قَالَ نَا سُفْيَانُ قَالَ نَا الزُّهْرِيُّ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ اَبْصَرَ نُخَامَةً فِيْ قِبْلَةِ الْمَسْجِدِ فَحَكَّهَا بِحَصَاةٍ ثُمَّ نَهٰى اَنْ يَبْزُقَ الرَّجُلُ بَيْنَ يَدَيْهِ اَوْ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ قَدَمِهِ الْيُسْرٰى. وَعَنِ الزُّهْرِيِّ سَمِعَ حُمَيْدًا عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ نَحْوَهٗ. (گذشتہ: ۴۰۹)

**ترجمہ** باب، اپنی بائیں جانب یا اپنے بائیں پاؤں کے نیچے تھوکنا چاہیے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آں حضرت ﷺ نے فرمایا کہ مومن جب نماز میں ہوتا ہے، تو وہ اپنے پروردگار سے مناجات کی حالت میں ہے، اس لیے اپنے سامنے یا اپنی داہنی جانب نہیں تھوکنا چاہئے، لیکن اپنی بائیں جانب یا اپنے قدم کے نیچے تھوکنا چاہئے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مسجد کے قبلہ کی سمت میں کھنکار کو دیکھا تو اس کو کنکری سے کھرچ دیا۔ پھر آپ نے سامنے کی سمت میں یا داہنی طرف تھوکنے سے منع فرمایا اور بائیں جانب یا بائیں پیر کے نیچے تھوکنے کی اجازت دی، دوسری روایت میں زہری نے حمید بن عبدالرحمٰن سے سماع کی تصریح بھی کی ہے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد واضح ہے کہ نمازی کو بائیں جانب یا بائیں قدم کے نیچے تھوکنے کی اجازت ہے، لیکن یہ بات ملحوظ رہے کہ یہ اجازت عام نہیں ہے، بلکہ اس سلسلہ میں وارد تمام روایات پر نظر ڈالنے کے بعد یہ حقیقت

معلوم ہوتی ہے کہ مسجد میں یا نماز میں تھوکنے میں توسع نہیں اور یہ بات تقریباً تمام ہی علماء کے نزدیک طے شدہ ہے کہ اضطرار اور انتہائی مجبوری میں بائیں جانب یا بائیں قدم کے نیچے اجازت دی گئی ہے، اس میں بھی تمام روایات کو جمع کیا جائے، تو یہ ترتیب معلوم ہوتی ہے کہ پہلے تو روکنے کی کوشش کرے، اگر یہ ممکن نہ ہو تو اگر بائیں جانب کوئی نہیں ہے تو ادھر تھوکنا چاہئے، اگر یہ سمت خالی نہ ہو تو بائیں پیر کے نیچے بشرطیکہ نیچے فرش وغیرہ نہ ہو اور اگر فرش ہو تو حاشیہ شیخ الاسلام میں ہے کہ پھر کپڑے ہی میں تھوکنے کی صورت متعین ہو جاتی ہے اور اگر کپڑا بھی موجود نہیں ہے، تو علامہ ابن حجر فرماتے ہیں کہ ایسی صورت میں نگل لینا ہی، امر ممنوع کے ارتکاب سے اولیٰ معلوم ہوتا ہے۔

**روایات باب** روایتیں گذر چکی ہیں، یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے، کہ امام بخاریؒ نے پچھلے ترجمہ میں ''فی الصّلوٰۃ'' کی قید ذکر کی ہے اور وہاں روایت میں اس قید کا ذکر نہیں تھا، اس باب میں ترجمہ عام ہے، جب کہ روایت میں ''ان المومن اذا کان فی الصّلوٰۃِ '' کی قید ہے، اس لیے یہ بدگمانی دور ہو جانی چاہئے کہ امام بخاریؒ خواہ مخواہ قیدیں بڑھا رہے ہیں۔

دوسری روایت میں یہ وضاحت آ گئی کہ مسجد میں یہ عمل انتہائی مجبوری کی صورت میں کیا جا سکتا ہے، اب پہلی روایت میں نماز اور دوسری روایت میں مسجد کی صراحت سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ان مواقع پر تھوکنے کا عمل ناگوار ہے اور اگر بالکل اضطرار کی صورت پیدا ہو جائے تو چند چیزوں کی رعایت کے ساتھ اس کی گنجائش ہے ورنہ نہیں۔ دوسری روایت کے آخر میں ایک سند نقل کر کے امام بخاریؒ نے یہ بھی وضاحت فرما دی کہ روایت اگرچہ معنعن ہے، لیکن زہری کا سماع حمید بن عبدالرحمان سے ثابت ہے۔

ترجمہ میں بصاق اور دوسری روایت میں نخامہ کے تذکرے سے امام بخاری یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ تھوک و بلغم کھنکار اور ناک کی رطوبت وغیرہ تمام ہی ناگوار اور ناپسندیدہ چیزوں کا مسجد کے بارے میں ایک ہی حکم ہے۔

## [۳۷] بَابُ كَفَّارَةِ الْبُزَاقِ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۱۵) حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ نَا شُعْبَةُ قَالَ نَا قَتَادَةُ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ الْبُزَاقُ فِي الْمَسْجِدِ خَطِيْئَةٌ وَ كَفَّارَتُهَا دَفْنُهَا .

**ترجمہ** مسجد میں تھوکنے کے کفارے کا بیان۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ مسجد میں تھوکنا گناہ ہے اور اس گناہ کا کفارہ اس کو دفن کر دینا ہے۔

**مقصد ترجمہ** مسجد میں ضرورت اور شدید مجبوری کے بغیر تو تھوکنا جائز ہی نہیں، لیکن اگر اضطرار کی صورت میں اس کی نوبت ہی آ جائے تو اس کا تدارک اور کفارہ کیا ہوگا؟ اضطرار کی صورت مثلاً یہ ہے کہ نماز پڑھ رہا ہے،

اب اگر تھوک منھ میں جمع کرتا ہے تو قرأت میں دشواری ہوگی، اور ہر شخص کی طبیعت اس کو گوارہ نہیں کرتی کہ تھوک کو جمع کرتا رہے، بسا اوقات طبیعت خود تھوک کو پھینکتی ہے، ایسی حالت میں کئی صورتیں ممکن ہیں کہ مسجد سے باہر جائے اور تھوک کر واپس آئے اور نماز شروع کردے، یا ممکن ہو تو مسجد میں کھڑے کھڑے باہر پھینک دے، لیکن مجمع زیادہ ہو اور سامنے کی جانب کوئی کھڑکی وغیرہ نہ ہو تو اب اضطرار کی صورت پیدا ہوگی اور متعین ہوگیا کہ یا تو بائیں قدم کے نیچے تھوکے یا کپڑے میں لے کر مل دے، پچھلے ابواب میں حاشیہ شیخ الاسلام سے یہ بات بیان کی جاچکی ہے کہ کپڑے میں لے کر مل دینا سب سے اہون ہے۔

حدیث بتلاتی ہے کہ تھوکنا گناہ ہے اور اس کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو دفن کردیا جائے، یعنی اگر زمین ریتیلی یا کچی ہے تو تھوک کر زمین کے اندر دبا دیا جائے اور اگر مسجد کا فرش پختہ ہو تو اٹھا کر پھینک دینا چاہئے۔

مقصد ترجمہ کی تعیین کے سلسلے میں یہ بھی ذکر کیا گیا ہے کہ امام بخاریؒ باب سابق "لیبصق عن یسارہ او تحت قدمه الیسریٰ" اور اس باب "کفارة البزاق فی المسجد" کے ذریعہ ایک اختلافی مسئلہ کی طرف اشارہ اور دونوں مسلک کے مستدلات بیان کردینا چاہتے ہیں، اختلاف یہ ہے کہ ان روایات میں تھوکنے کی اجازت یا ممانعت کا یہ مسئلہ احکام صلوٰۃ سے متعلق ہے یا احکام مسجد سے؟ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ روایات کے الفاظ میں دو جگہ عموم ہے، اور دونوں میں تعارض ہے، ایک جگہ ارشاد ہے "البزاق فی المسجد خطیئة" اور دوسری جگہ ارشاد ہے "لیبصق عن یسارہ او تحت قدمه" اگر پہلی روایت کو عام رکھا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ تھوکنا ہر حال میں گناہ ہے، دفن کی نیت ہو یا نہ ہو اور اگر تھوک ہی دیا اور بہ مجبوری یہ گناہ ہوگیا تو اس کا کفارہ دفن کردینا ہے، یہ نووی کی رائے ہے، اور اگر دوسری روایت کو عام رکھا جائے تو مفہوم یہ ہوگا کہ تھوکنا اس وقت گناہ ہے جب نیت اس کو دفن کرنے کی نہ ہو، دفن کرنے کی نیت ہو تو بائیں جانب یا پاؤں کے نیچے تھوکنے میں مضائقہ نہیں، یہ قاضی عیاض کا قول ہے، حافظ ابن حجرؒ قاضی عیاض کے خیال کی تائید میں ہیں اور اس سلسلے میں متعدد روایات سے استدلال کر رہے ہیں، کہتے ہیں کہ اس اختلاف کا حاصل یہ ہے کہ اس موضوع سے متعلق حضور اکرم ﷺ کے دو ایسے عام ارشادات ہیں جن میں بظاہر تعارض ہے، ایک ارشاد ہے "البزاق فی المسجد خطیئة" کہ مسجد میں تھوک ڈالنا گناہ ہے، اور دوسرا ارشاد ہے کہ ضرورت ہو تو بائیں جانب یا پاؤں کے نیچے تھوکنا جائز ہے، ان دونوں عام ارشادات میں نوویؒ نے پہلے کو عام قرار دیتے ہوئے دوسرے میں یہ تخصیص کی ہے کہ بائیں جانب یا پاؤں کے نیچے تھوکنے کی اجازت مسجد میں نہ ہونے کی صورت میں ہے، جب کہ قاضی عیاض نے ان دونوں ارشادات میں سے دوسرے کو عموم پر باقی رکھتے ہوئے پہلے ارشاد میں یہ تخصیص کی کہ اگر تھوکنے کے بعد زمین میں دفن کرنے کا ارادہ نہ ہو تو مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔

یہ اختلاف واضح کرنے کے بعد حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ متعدد علماء نے قاضی عیاض کی تائید کی ہے، پھر کئی

روایتیں ذکر کی ہیں جن سے قاضی عیاض کے خیال کی تائید ہوتی ہے۔

اس کے برخلاف علامہ عینیؒ نوویؒ کی تائید میں ہیں، علامہ عینیؒ نے "**باب لایبصق عن یمینه فی الصّلاة**" کے تحت فرمایا ہے کہ حدیث باب " **لا یتنخم قبل وجهه و لا عن یمینه** " میں کوئی قید نہیں اور اسی لئے نووی نے ہر حال میں سامنے اور داہنی سمت میں تھوکنے کی ممانعت کی ہے، نماز کے اندر ہو یا خارج صلوۃ میں، مسجد میں ہو یا مسجد کے باہر، پھر انہوں نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ وغیرہ سے اس کی تائید میں اقوال نقل کئے ہیں۔

اس لیے ممکن ہے کہ امام بخاری ان ابواب میں قاضی عیاض اور نووی کے پسندیدہ مسلک اور مستدل کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہوں، کیوں کہ زیر بحث باب "**کفارة البزاق فی المسجد**" سے امام نووی کے مسلک کی تائید اس طرح کی جاسکتی ہے کہ روایت میں صاف آرہا ہے کہ مسجد میں تھوک ڈالنا گناہ ہے اور دفن کردینے سے اگرچہ اس گناہ کا کفارہ ہوجاتا ہے، لیکن گناہ تو ثابت ہوگیا، جب کہ اس سے پہلے "**باب لیبصق عن یساره او تحت قدمه الیسری**" میں ترجمۃ الباب کا عموم قاضی عیاض کے مسلک کی طرف اشارہ کے لیے کافی ہے۔

**حضرۃ الاستاذؒ کا ارشاد** | امام بخاریؒ نے اگرچہ قاضی عیاضؒ اور امام نوویؒ کے مسلک کی طرف، دو الگ الگ ابواب میں اشارہ کردیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ قاضی عیاض کا استدلال تعجب انگیز ہے، کہتے ہیں کہ دفن کی نیت سے تھوکے تو گناہ نہیں ہے، گناہ جب ہے کہ دفن کرنے کی نیت نہ ہو، حالانکہ حدیث میں صاف فرمایا جارہا ہے کہ مسجد میں تھوکنا گناہ اور سیئہ ہے، اگر کسی سے یہ گناہ سرزد ہی ہوگیا تو اس کا کفارہ دفن کردینا ہے، گویا یہ گناہ کے بعد توبہ کے درجہ کی بات ہے، جب کہ قاضی عیاض کے مسلک کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ توبہ کی نیت سے گناہ کیا جائے تو گناہ نہیں، معلوم ہوا کہ قاضی عیاض کی بات بہت کمزور ہے۔　　واللہ اعلم

## [۳۸] بَابُ دَفْنِ النُّخَامَةِ فِی الْمَسْجِدِ

**(۴۱۶) حَدَّثَنَا اِسْحٰقُ بْنُ نَصْرٍ قَالَ اَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ عَنْ مَعْمَرٍ عَنْ هَمَّامٍ سمع اَبَا هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ اِذَا قَامَ اَحَدُکُمْ اِلَی الصَّلٰوةِ فَلَا یَبْصُقْ اَمَامَهٗ فَاِنَّمَا یُنَاجِیْ اللّٰهَ مَادَامَ فِیْ مُصَلَّاهُ وَلَا عَنْ یَمِیْنِهٖ فَاِنَّ عَنْ یَمِیْنِهٖ مَلَکاً وَلْیَبْصُقْ عَنْ یَسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ قَدَمِهٖ فَیَدْفِنُهَا.** (گذشتہ: ۴۰۸)

**ترجمہ** | ناک کی رطوبت کو مسجد میں دفن کرنے کا بیان۔ حضرت ابو ہریرہؓ نبی اکرم ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی نماز کے لیے کھڑا ہو تو وہ اپنے سامنے کی جانب نہ تھوکے؛ اس لیے کہ وہ جب تک اپنی نماز کی جگہ میں ہے، اس وقت تک وہ اپنے پرودگار سے مناجات کررہا ہے، نہ داہنی جانب تھوکے اس لیے کہ داہنی

جانب فرشتہ ہے، اس کو بائیں جانب یا پاؤں کے نیچے تھوکنا چاہئے، پھر اس کو دفن کر دینا چاہئے۔

**مقصد ترجمہ** عام طور پر شارحین کا یہ خیال ہے کہ امام بخاریؒ اس باب میں مسجد میں ان چیزوں کو دفن کرنے کا جواز بیان کرنا چاہتے ہیں، کیوں کہ بعض حضرات نے بیان کیا ہے کہ دفن کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ ان چیزوں کو مسجد سے باہر کر دیا جائے، وجہ یہ ہے کہ دفن کو حقیقی معنی پر محمول کرنے میں ان گھناؤنی چیزوں کا مسجد ہی میں باقی رہ جانا لازم آتا ہے، جو احترام مسجد کے منافی ہے، لیکن امام بخاری اس معاملہ میں جمہور علماء کی طرح جواز ثابت فرما رہے ہیں کہ اولاً تو یہ چیزیں ناپاک نہیں ہیں، پھر یہ کہ ان کو زمین کے نیچے دفن کر دیا جاتا ہے؛ اس لیے اس عمل میں مسجد کے احترام کی خلاف ورزی نہیں ہے اور یہ جائز ہے۔

**حضرۃ الاستاذؒ کا ارشاد** مگر ہم تو امام بخاریؒ کا منشا یہ سمجھ رہے ہیں کہ نماز کی حالت میں تھوکنے کی مجبوری ہو تو اس کے لیے احادیث میں مختلف صورتیں بیان کی گئیں ہیں کہ کپڑے میں لے کر مل دے، اپنے پاؤں کے نیچے یا بائیں سمت میں تھوکے وغیرہ، اس سلسلے میں یہ اختلاف ہوا ہے کہ ان چیزوں کا تعلق احکام مسجد سے ہے، یا احکام صلوۃ سے؟ مثلاً امام نووی اور ان کے نقطہ نظر کی تائید کرنیوالے بڑے شدومد سے یہ بیان کرتے ہیں کہ ان احکام کا مسجد سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان حضرات کا خیال ہے کہ مسجد سے باہر نمازی کو تھوکنے کی ضرورت پڑ جائے، تو وہ یہ عمل کرے کہ بائیں جانب یا پیروں کے نیچے تھوک لے، امام بخاری اس مسئلے میں اپنی تحقیق ظاہر فرما رہے ہیں اور انہوں نے ترجمۃ الباب میں ''فی المسجد'' کی قید کا اضافہ کر کے اس کو ظاہر فرمایا ہے کہ ان کے نزدیک تھوکنے کی مجبوری پیش آ جائے، تو مسجد اور بیرون مسجد کا فرق نہیں ہے، بلکہ مسجد میں نماز پڑھنے والے کو بھی مجبوری کی صورت میں پاؤں کے نیچے یا بائیں جانب تھوکنے کی اجازت ہے، البتہ مسجد میں ہو تو اسے نماز سے فراغت کے بعد دفن کر دینا ہوگا۔

**تشریح حدیث** روایت میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جب کوئی نماز کے لیے کھڑا ہو جائے تو اسے یہ اہتمام کرنا چاہئے کہ لعاب دہن سامنے کی سمت میں نہ پھینکے، کیوں کہ اس وقت وہ اپنے پروردگار سے مناجات کی حالت میں ہے، اور سامنے یعنی قبلہ کی سمت میں رحمت خداوندی کا نزول ہو رہا ہے، اسی طرح یہ بھی فرمایا جا رہا ہے، کہ داہنی سمت میں بھی تھوکنے کی اجازت نہیں، کیوں کہ داہنی جانب فرشتہ ہوتا ہے یعنی وہ فرشتہ کاتب حسنات ہے اور قابل تعظیم ہے، اس توجیہ کے مطابق یہ اشکال نہیں ہوسکتا کہ بائیں جانب تھوکنے میں کاتب سیئات کی توہین ہوگی، کیوں کہ ''فان عن یمینه ملکا'' میں ملکا کی تنوین تعظیم کے لیے ہے اور مراد یہ ہے کہ داہنی جانب کا کاتب حسنات فرشتہ جو امیر کی حیثیت رکھتا ہے، اس کے احترام کے پیش نظر داہنی طرف نہیں تھوکنا چاہئے، پھر ایک روایت میں تصریح ہے کہ بائیں جانب قرین یعنی شیطان ہوتا ہے، اس لیے بائیں جانب تھوک شیطان پر پڑے گا۔ یہ روایت طبرانی میں حضرت ابوامامہ سے مروی ہے: '' فانه یقوم بین یدی الله وملکه عن یمینه وقرینه عن یساره '' (فتح الباری جلد۲/ص ۵۸) اس لیے کہ نمازی اللہ کے روبرو کھڑا ہوا ہے

اور اس کا فرشتہ اس کے دائیں جانب ہے اور اس کا شیطان بائیں جانب ہے۔

رہا یہ کہ بائیں جانب کا فرشتہ یعنی کاتب سیئات اس وقت کہاں ہوتا ہے تو کہا جا سکتا ہے کہ چونکہ اس وقت نماز ہو رہی ہے، جو بدنی عبادات میں سب سے اچھا عمل خیر ہے، اس لیے اس وقت کاتب سیآت کی ضرورت نہیں۔ اس وقت وہ یا تو داہنی طرف منتقل ہو جاتا ہے، یا ہٹ جاتا ہے، اور یہ پھینکا ہوا تھوک شیطان ہی پر پڑتا ہے۔

روایت میں یہ بھی فرمایا جا رہا ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد اس تھوک کو دفن کرنا ہوگا، دفن کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ تھوک پر معمولی سی مٹی ڈال کر اس کو چھپا دیا جائے، کیوں کی اس صورت میں تو یہ امکان باقی رہتا ہے کہ وہاں کوئی بیٹھ جائے یا اس کا پیر وغیرہ پڑ جائے اور اس کو اس گندگی سے تکلیف ہو، اس وجہ سے دفن کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ زمین کھود کر تھوک کو اس کے اندر دبا دیا جائے، پھر زمین ہموار کر دی جائے، یہ بھی اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب زمین کچی ہو اور اگر فرش پختہ کر دیا گیا ہے تو یہ بات پچھلے ابواب میں بیان کی جا چکی ہے کہ ایسی صورت میں تھوک زمین پر پھینکنے کے بجائے کپڑے پر لے کر مل دینا ہی متعین ہے، اگر اس کی نوبت نہ آئی ہو بلکہ زمین پر تھوکنا ہی پڑ گیا ہو تو دفن کرنے کے بجائے اس کو اٹھا کر باہر پھینک دینا ضروری ہے اور مسجد کے فرش کو دھو کر صاف کرنا چاہئے۔ واللہ اعلم

## [۳۹] بَابٌ اِذَا بَدَرَهُ الْبُزَاقُ فَلْيَاخُذْ بِطَرَفِ ثَوْبِهٖ

(۴۱۷) حَدَّثَنَا مَالِكُ بْنُ اِسْمٰعِيْلَ قَالَ نَا زُهَيْرٌ قَالَ نَا حُمَيْدٌ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ رَاٰى نُخَامَةً فِي الْقِبْلَةِ فَحَكَّهَا بِيَدِهٖ وَ رُئِيَ مِنْهُ كَرَاهِيَّتُهٗ اَوْ رُئِيَ كَرَاهِيَّتُهٗ لِذٰلِكَ وَشِدَّتُهٗ عَلَيْهِ وَقَالَ اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا قَامَ فِيْ صَلَاتِهٖ فَاِنَّمَا يُنَاجِيْ رَبَّهٗ اَوْ رَبُّهٗ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ فَلَا يَبْزُقَنَّ فِيْ قِبْلَتِهٖ وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ قَدَمِهٖ ثُمَّ اَخَذَ طَرَفَ رِدَائِهٖ فَبَزَقَ فِيْهِ وَرَدَّ بَعْضَهٗ عَلٰى بَعْضٍ قَالَ اَوْ يَفْعَلُ هٰكَذَا. (گذشتہ: ۴۰۵)

**ترجمہ** باب، جب تھوک نمازی کو مجبور کر دے تو اس کو اپنے کپڑے کے گوشہ میں لینا چاہئے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے قبلہ کی سمت میں ناک کی رطوبت کو لگا ہوا دیکھا تو آپ نے اس کو اپنے ہاتھ سے کھرچ ڈالا اور اس کی ناگواری آپ کے چہرے سے ظاہر ہوئی یا اس رطوبت کے قبلہ کی سمت میں ہونے کے سبب آپ کی ناگواری اور شدید ناگواری ظاہر ہوئی اور آپ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص جب نماز کے لیے کھڑا ہوتا ہے تو وہ اپنے رب سے مناجات کی حالت میں ہوتا ہے، یا اس کا رب اس کے اور نمازی کے درمیان ہوتا ہے، اس لیے وہ قبلہ کی جانب میں ہرگز نہ تھوکے، لیکن بائیں جانب یا پاؤں کے نیچے تھوک لے، پھر آپ نے اپنی چادر کے کنارے کو پکڑا اور اس میں تھوکا اور اس کے ایک حصے کو دوسرے حصے پر مل دیا اور فرمایا کہ یا اس طرح بھی کر سکتا ہے۔

**مقصد ترجمہ** نماز میں تھوکنے کی ضرورت پیش آجائے تو اس سلسلہ میں دو صورتیں بیان فرمائی جا چکی ہیں: ایک بائیں جانب اور دوسرے پاؤں کے نیچے، اس کے آداب اور شرائط بیان کئے جا چکے ہیں، اب ایک تیسری صورت بیان کرتے ہیں کہ اپنے کپڑے کے اندر تھوک کو لے کر مل دینا بھی جائز ہے، مگر اس تیسری صورت کو امام بخاری نے "اذا بدره البزاق" سے مقید کیا ہے، اس کا مفہوم یہ ہے کہ کپڑے میں لے کر رگڑنے کی صورت اس وقت کے لیے ہے، جب تھوک نمازی پر غالب آجائے، اس کا موقع باقی نہ ہو کہ وہ دائیں اور بائیں کا امتیاز کر سکے تو ایسی مجبوری میں کپڑے میں لے کر مل دینا چاہئے۔

امام بخاریؒ نے اس قید کا اضافہ کر دیا اور حدیث میں یہ موجود نہیں ہے، اس کا جواب عام طور پر شارحین بخاری نے یہ دیا ہے کہ یہ قید مسلم شریف اور ابوداؤد شریف کی صحیح روایات میں موجود ہے، چونکہ وہ روایتیں امام بخاری کی شرط کے مطابق نہیں تھیں، اس لیے ان کو ذکر نہیں کیا گیا، البتہ وہ روایات بھی صحیح ہیں اس لیے بخاری نے ان روایات کے پیش نظر حدیث پاک کے مطلق حکم کو مقید فرما دیا، اور یہ امام بخاریؒ کی عادت ہے کہ وہ دوسری روایات کی رعایت سے کبھی ابہام کی وضاحت یا عموم کی تخصیص یا خصوص کی تعمیم فرمایا کرتے ہیں۔

جن روایات کے پیش نظر یہاں امام بخاری نے قید کا اضافہ کیا ہے، ان میں سے مسلم شریف کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: " ولیبصق عن یساره وتحت رجله الیسریٰ، فان عجلت به بادرة فلیقل بثوبه هکذا الحدیث" یعنی نمازی اپنی بائیں سمت میں اور اپنے بائیں پاؤں کے نیچے تھوک لے، لیکن اگر تھوک عجلت پر مجبور کرے تو اپنے کپڑے میں اس طرح لے لے۔

مفہوم یہ ہے کہ اگر نماز میں تھوکنے کی ضرورت پیش آجائے تو موقع دیکھ کر ان تفصیلات کے مطابق عمل کیا جائے جو روایات میں مذکور ہیں اور ان میں ایک مجبور کن صورت زیر بحث باب میں ذکر کی گئی ہے۔ روایت گذر چکی ہے اس لیے حدیث کی تشریح وہاں دیکھ لی جائے۔

## [۴۰] بابُ عِظَةِ الْإِمَامِ النَّاسَ فِيْ اِتْمَامِ الصَّلٰوةِ وَذِكْرِ الْقِبْلَةِ

(۴۱۸) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَنَا مَالِكٌ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ هَلْ تَرَوْنَ قِبْلَتِي هٰهُنَا فَوَاللهِ مَا يَخْفٰى عَلَيَّ خُشُوْعُكُمْ وَلَا رُكُوْعُكُمْ اِنِّي لَاَرَاكُمْ مِنْ وَرَاءِ ظَهْرِيْ. (آئندہ: ۷۴۱)

(۴۱۹) حَدَّثَنَا يَحْيٰى بْنُ صَالِحٍ قَالَ اَخْبَرَنَا فُلَيْحُ بْنُ سُلَيْمَانَ عَنْ هِلَالِ بْنِ عَلِيٍّ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ صَلّٰى لَنَا النَّبِيُّ ﷺ ثُمَّ رَقِيَ الْمِنْبَرَ فَقَالَ فِي الصَّلٰوةِ وَفِي الرُّكُوْعِ

اِنِّي لَا رَاكُمْ مِنْ وَّرَآئِي كَمَا اَرَاكُمْ. (آئندہ: ۷۴۲، ۶۶۴۴)

**ترجمہ** باب، ارکان نماز کو پوری طرح ادا کرنے کے سلسلے میں امام کے نمازیوں کو نصیحت کرنے کا اور قبلہ کے ذکر کرنے کا بیان۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میرا قبلہ یہاں ہے (یعنی میں قبلہ کی جانب متوجہ ہوں دوسری طرف متوجہ نہیں رہتا) قسم خدا کی، میرے اوپر تمہارا خشوع وخضوع اور رکوع پوشیدہ نہیں رہتا، بلا شک میں تم کو اپنے پیچھے کی جانب سے بھی دیکھتا ہوں۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ہم لوگوں کو نماز پڑھائی، پھر آپ منبر پر تشریف لے گئے اور نماز کے بارے میں رکوع کے بارے میں فرمایا کہ اے لوگو! میں تم کو اپنے پیچھے سے اسی طرح دیکھتا رہتا ہوں جس طرح کہ سامنے سے دیکھتا ہوں۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ امام کو ارکان نماز کی پوری طرح ادائیگی کے سلسلے میں مقتدیوں پر نظر رکھنی چاہئے اور کوئی کوتاہی سامنے آئے تو امام کے فرائض میں سے ہے کہ اس پر تنبیہ کرتا رہے، ایسا نہ ہو کہ تھوکنے کی مجبوری میں غلط روی اختیار کرلیں اور بلا ضرورت قبلہ سے منحرف ہوجائیں، جب کہ قبلہ کا معاملہ بہت زیادہ اہم ہے، کیوں کہ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھی جاتی ہے۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہو کہ امام کو مقتدیوں کے احوال پر نظر رکھنے کے لیے اگر دائیں بائیں التفات کرنا پڑے تو اس میں مضائقہ نہیں ہے، البتہ یہ التفات گوشۂ چشم سے ہونا چاہیے، منھ اور سینہ رو بہ قبلہ ہی رہنا چاہئے، کیوں کہ روایت میں بھی یہی مذکور ہے کہ رسول اکرم ﷺ کا روئے مبارک اور سینہ تو قبلہ ہی کی جانب رہتا، لیکن آپ مقتدیوں کے احوال کی نگرانی کے لیے پیچھے کی جانب بھی دیکھ لیتے تھے، آپ کا یہ دیکھنا گو معجزہ کے طور پر تھا، لیکن یہ معلوم ہو ہی گیا کہ نظر اگر قبلہ کے علاوہ کسی اور جانب ہوجائے، تو اس میں مضائقہ نہیں، البتہ چہرے اور سینے کا سمت قبلہ کے علاوہ کسی اور جانب مڑ جانا دوسرا حکم رکھتا ہے کہ چہرے کا انحراف کراہت اور سینے کا انحراف فساد صلوۃ کا حکم رکھتا ہے۔

**تشریح حدیث** پہلی روایت میں آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم لوگ مجھے قبلہ کی جانب پوری طرح متوجہ دیکھ کر یہ سمجھتے ہو کہ مجھے دوسری جانب اور احوال پر پوری اطلاع نہیں ہے، اسی وجہ سے تم لوگ آداب صلوۃ کی پوری رعایت نہیں رکھتے، کیوں کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ پیغمبر علیہ السلام کے قبلہ رو ہونے کی بنا پر ہم ان کی نگاہوں سے اوجھل ہیں، میں قسم کھا کر بیان کرتا ہوں کہ میں تم کو اپنے پیچھے کھڑا رہنے کے باوجود اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح سامنے سے دیکھتا ہوں اور مجھ پر تمہارے احوال میں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہتی۔

یہاں روایت میں ''هَل تَرونَ قِبلَتي هٰهُنا'' فرمایا گیا ہے، کہ تم لوگ مجھے قبلہ رُخ دیکھ کر یہ سمجھتے ہو کہ میری توجہ اور ہر سمت سے ہٹی ہوئی ہے اور مجھے صرف سمت قبلہ کی خبر ہے، بس اسی سے قبلہ کی اہمیت معلوم ہوگئی کہ رسول اکرم ﷺ کی توجہ قبلہ کی طرف اس درجہ رہتی تھی کہ دیکھنے والے اس سمت میں آپ کا استغراق محسوس کرتے تھے، اس کے بعد

آپ نے فرمایا کہ سمت قبلہ میں استغراق کے باوجود میں تمہارے رکوع وسجود اور خشوع وخضوع سے پوری طرح واقف رہتا ہوں، کیوں کہ میں پیچھے کی سمت میں بھی بالکل اسی طرح دیکھتا ہوں جس طرح مجھے سامنے کی سمت میں نظر آتا ہے، روایت کے اس جزء سے ترجمۃ الباب ثابت ہورہا ہے کہ آپ نے مقتدیوں کو ارکان نماز کے سلسلہ میں نصیحت فرمائی اور اسی کے ذیل میں قبلہ کی اہمیت معلوم ہوگئی۔

## پیچھے کی سمت میں دیکھنے کا مفہوم

آپ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ میں پیچھے کی سمت میں بھی سامنے کی طرح دیکھتا ہوں، اس دیکھنے کے سلسلے میں شارحین حدیث نے کئی باتیں کہی ہیں، ایک بات یہ ہے کہ وحی یا الہام کے ذریعہ آپ کو پیچھے کی سمت کا علم ہوجاتا ہے جس کو رویت سے تعبیر کردیا گیا، لیکن یہ وہ تاویل ہے جس کی روایت کے الفاظ سے تائید نہیں ہوتی، روایت میں " اِنِّی لَاَرَاکُمْ مِنْ وَرَآءِ ظَهْرِیْ" فرمایا جارہا ہے، کہ میں تم کو پشت کے پیچھے سے دیکھتا ہوں، دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ دیکھنے کا مفہوم گوشۂ چشم سے دیکھنا ہے، مگر ظاہر ہے کہ اس میں حضور اکرم علیہ کی کیا خصوصیت ہے، گوشۂ چشم سے سب ہی دیکھ لیتے ہیں، تیسری بات یہ کہی گئی ہے کہ اللہ تعالی نے حضور اکرم علیہ کی پشت مبارک میں قوت باصرہ عطا فرمائی تھی، پھر اس سلسلے میں یہ تشریح کی گئی ہے کہ یہ قوت باصرہ مہر نبوت میں تھی، یا دونوں شانوں کے درمیان سوئی کے نکوے کی طرح آنکھیں عطا کی گئی تھیں، چوتھی بات یہ کہی گئی ہے کہ دیوار قبلہ میں آئینہ کی طرح حضور اکرم علیہ کے سامنے نمازیوں کی صورتیں آجاتی تھیں جس سے آپ صورت حال پر مطلع ہوجاتے تھے، لیکن سب سے اچھی اور مضبوط بات یہ ہے کہ معجزہ اور خرقِ عادت کے طور پر حضور اکرم علیہ کے لیے انہی نگاہوں سے ہر سمت میں دیکھنے کا امکان اور وقوع تسلیم کرلیا جائے، اس صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ نظر آنے والی چیز دیکھنے والے کے سامنے کی سمت میں نہیں ہے، لیکن جمہور اہل سنت والجماعۃ کے نقطۂ نظر کے مطابق یہ کوئی اہم بات نہیں ہے، کیوں کہ ان کے نزدیک دیکھنے کے لیے از روئے عقل نہ آنکھ کی شرط ہے، نہ مخصوص جہت یا مخصوص فاصلہ کی شرط ہے عضو، جہت اور فاصلہ کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالی نے اس دنیا میں یہ عادت مقرر فرمادی ہے، مگر عقلاً ان چیزوں کے بغیر نظر نہ آنے پر کوئی دلیل عقلی قائم نہیں ہے، اسی لیے اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ آخرت میں مومنین کو جہت میں نہ ہونے کے باوجود باری تعالی کی رویت نصیب ہوگی، اہل سنت والجماعت کے اس نقطۂ نظر کے مطابق کہا جاسکتا ہے کہ حضور علیہ کو اللہ تعالیٰ نے معجزہ کے طور پر رویت کے سلسلے میں عام انسانوں کی مقررہ عادت کے خلاف انہیں آنکھوں سے ہر سمت میں دیکھنے کی طاقت عطا فرمادی تھی، بلکہ بعض علماء نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ رسول اکرم علیہ کے لیے پیچھے کی سمت میں دیکھنے کی یہ بات نماز ہی کے ساتھ خاص نہیں تھی، بلکہ آپ کو ہر حال میں اللہ تعالی نے یہ خصوصیت عطا فرمائی تھی، امام بخاری علیہ الرحمہ کا پسندیدہ موقف بھی یہی معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ انھوں نے یہ روایت " علامات النبوۃ " میں بھی ذکر فرمائی ہے، پھر یہ کہ عصر حاضر کی

تحقیقات جدیدہ کے مطابق تو کوئی بھی اشکال باقی نہیں رہتا، کیوں کہ اب جسم انسانی کے ہر حصہ سے نظر آنے کا امکان ثابت کیا جارہا ہے۔

اس باب کی دوسری روایت میں یہ آیا کہ حضور اکرم ﷺ نے نماز کے بعد منبر پر چڑھ کر نماز کے بارے میں یا رکوع کے بارے میں تنبیہ فرمائی اور کہا کہ میں تم کو پیچھے کی سمت میں پوری طرح دیکھتا ہوں، نماز یا رکوع کے بارے میں تنبیہ کرنے کی صراحت سے ترجمۃ الباب پوری طرح ثابت ہوگیا۔

## [۴۱] بَابٌ هَلْ يُقَالُ مَسْجِدُ بَنِيْ فُلَانٍ

(۴۲۰) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ أَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ أَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ سَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِيْ أُضْمِرَتْ مِنَ الْحَفْيَاءِ وَأَمَدُهَا ثَنِيَّةُ الْوَدَاعِ وَسَابَقَ بَيْنَ الْخَيْلِ الَّتِيْ لَمْ تُضْمَرْ مِنَ الثَّنِيَّةِ إِلَى مَسْجِدِ بَنِيْ زُرَيْقٍ وَأَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ فِيْمَنْ سَابَقَ بِهَا. (آئندہ: ۲۸۶۸، ۲۸۶۹، ۲۸۷۰، ۷۳۳۶)

**ترجمہ** باب، کیا یہ کہنا جائز ہے کہ مسجد فلاں کی اولاد کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے سواری کے لیے بنائے گئے گھوڑوں کے درمیان مقام حفیاء سے مقام ثنیۃ الوداع تک دوڑ کرائی اور جو سواری کے لیے تیار نہیں کئے گئے تھے ان کے درمیان ثنیۃ الوداع سے، مسجد بنی زریق تک دوڑ کرائی اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ ان لوگوں میں تھے جو اس دوڑ میں اپنے گھوڑے کو آگے لے گئے تھے۔

**سابق سے ربط اور مقصد ترجمہ** امام جہاں نمازیوں کو ارکان صلوۃ کی پوری طرح ادائیگی اور سمت قبلہ کا اچھی طرح اہتمام کی طرف توجہ دلاتے ہیں وہ مسجد ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ شرعی کون سی مسجد ہوتی ہے، جو مسجدیں کسی قوم یا کسی قبیلہ کی طرف منسوب ہوتی ہیں کہ یہ فلاں قبیلہ کی مسجد ہے، یا اس کو بانی کی طرف منسوب کردیا جاتا ہے، آیا اس نسبت کے باوجود ان مسجدوں کو شرعی مسجد قرار دیا جائے گا؟ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ اضافت عموماً تملیک کے لیے ہوتی ہے، کسی شخص یا قوم کی طرف انتساب سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اس قوم کی ملکیت ہے اور جب قوم مالک ہوئی تو پھر اس کو شرعی مسجد قرار دینا درست نہ ہوگا، نہ اس میں نماز پڑھنے سے مسجد کا ثواب حاصل ہوگا، اس لیے امام بخاریؒ نے "هل يقال مسجد بني فلان" کا عنوان قائم کرکے یہ واضح فرمادیا کہ مسجدوں کے بارے میں اس طرح کی نسبت جائز ہے، کیوں کہ اضافت کا تملیک کے لیے ہونا ضروری نہیں ہے، بلکہ اس قسم کی نسبتیں دوسرے تعلقات کی بنا پر بھی درست قرار دی جاسکتی ہیں، جیسے تولیت، قرب اور بانی ہونا وغیرہ۔

اس ترجمہ کے انعقاد کی ضرورت یا اس مضمون کی وضاحت اس لیے اور اہم تھی کہ ابراہیم نخعی نے اس طرح کی

نسبت کا مسجد کے بارے میں انکار فرمایا ہے، ان کی دلیل ہے "وَاِنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَداً" کہ مسجدیں صرف اللہ کے لیے ہوتی ہیں، اس لیے اللہ کے ساتھ کسی اور کو مت پکارو، مگر امام بخاریؒ باب منعقد کر کے جمہور کے مسلک کی تائید کرنا چاہتے ہیں کہ اس آیت کا یہ مطلب نہیں کہ مسجدوں کے لیے اس طرح کی نسبت جائز نہ ہوگی، آیت کا مفہوم تو یہ ہے کہ مسجدیں اللہ کی عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں اور ان عبادت گاہوں میں خدا کے علاوہ کسی اور کو مت پکارو، خلاصہ یہ ہے کہ امام بخاریؒ نے اس باب میں یہ ثابت کیا ہے کہ خصوصی تعلق کی بنیاد پر عرف کی رعایت سے مسجدوں کے انتساب میں توسع ہے۔

**تشریح حدیث** حدیث میں ارشاد فرمایا گیا کہ رسول اکرم ﷺ نے سواری کے لیے خاص طریقہ کے مطابق بنائے گئے گھوڑوں کے درمیان دوڑ کرائی اور یہ دوڑ مقام حفیاء سے مقام ثنیۃ الوداع تک کے درمیان ہوئی، ان دونوں جگہوں کے درمیان پانچ یا چھ میل کا فاصلہ تھا۔ اور جو گھوڑے بنائے نہیں گئے تھے، ان کی دوڑ ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زُریق کے درمیان ہوئی جس کا فاصلہ ایک میل تھا۔

مطلب یہ ہے کہ ایک موقع پر جہاد کے لیے پالے گئے گھوڑوں کا امتحان لیا گیا، ان میں کچھ گھوڑے تو وہ تھے جن کو سواری کے لیے بنایا جاتا ہے، عربی میں اس عمل کو اضمار اور تضمیر سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تو گھوڑوں کو خوب عمدہ خوراک کھلا کر فربہ کرتے ہیں، جب وہ لدّھڑ ہو جاتے ہیں تو ان کی خوراک کم کر دیتے ہیں، اس طرح گھوڑوں کو پسینہ خوب آتا ہے، جس سے زائد فربہی ختم ہو کر بدن نہایت سڈول اور خوبصورت ہو جاتا ہے اور اس طرح بنائے ہوئے گھوڑوں کا دم بڑھ جاتا ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے ان بنائے ہوئے گھوڑوں کی دوڑ کرائی اور جو بنائے ہوئے نہیں تھے ان کی بھی دوڑ کرائی، بنائے ہوئے گھوڑوں کا دم زیادہ ہوتا ہے، وہ ایک ہی بار میں فراٹے بھرتے ہوئے کئی کئی میل تک نکل جاتے ہیں اس لیے ایسے گھوڑوں کے لیے چھ میل کا میدان رکھا گیا، جب کہ دوسری طرح کے گھوڑوں کا میدان صرف ایک میل تھا، یہ ایک میل والا میدان ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زُریق تک تھا۔

مسجد بنی زریق سے امام بخاری کا ترجمۃ الباب ثابت ہو گیا کہ مسجدوں کی نسبت قبیلوں یا دوسری چیزوں کی طرف جائز ہے، کیوں کہ حدیث پاک میں مسجد کو بنو زریق کی طرف منسوب کیا گیا ہے "بنو زریق" انصار مدینہ کے مشہور قبیلے خزرج کی ایک شاخ کا نام ہے۔　　واللہ اعلم

## [۴۲] بَابُ الْقِسْمَةِ وَتَعْلِيْقِ الْقِنْوِ فِي الْمَسْجِدِ

قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ اَلْقِنْوُ الْعِذْقُ وَالْاِثْنَانِ قِنْوَانِ وَالْجَمَاعَةُ اَيْضاً قِنْوَانٌ مِثْلُ صِنْوٍ وَصِنْوَانٍ

(۴۲۱) وَقَالَ اِبْرَاهِیْمُ یَعْنِیْ ابْنَ طَهْمَانَ عَنْ عَبْدِ الْعَزِیْزِ بْنِ صُهَیْبٍ عَنْ اَنَسٍ قَالَ اُتِیَ النَّبِیُّ ﷺ بِمَالٍ مِّنَ الْبَحْرَیْنِ فَقَالَ انْثُرُوْهُ فِی الْمَسْجِدِ وَکَانَ اَکْثَرَ مَالٍ اُتِیَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَخَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِلَی الصَّلٰوةِ وَلَمْ یَلْتَفِتْ اِلَیْهِ فَلَمَّا قَضَی الصَّلٰوةَ جَآءَ فَجَلَسَ اِلَیْهِ فَمَا کَانَ یَرٰی اَحَدًا اِلَّا اَعْطَاهُ اِذْ جَآءَهُ الْعَبَّاسُ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَعْطِنِیْ فَاِنِّیْ فَادَیْتُ نَفْسِیْ وَفَادَیْتُ عَقِیْلًا فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خُذْ فَحَثَا فِیْ ثَوْبِهٖ ثُمَّ ذَهَبَ یُقِلُّهٗ فَلَمْ یَسْتَطِعْ ،فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ ! اُؤْمُرْ بَعْضَهُمْ یَرْفَعْهُ اِلَیَّ قَالَ لَا، قَالَ فَارْفَعْهُ اَنْتَ عَلَیَّ قَالَ لَا فَنَثَرَ مِنْهُ ثُمَّ ذَهَبَ یُقِلُّهٗ فَقَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اُمُرْ بَعْضَهُمْ یَرْفَعْهُ اِلَیَّ قَالَ فَارْفَعْهُ اَنْتَ عَلَیَّ قَالَ لَا فَنَثَرَ مِنْهُ ثُمَّ احْتَمَلَهٗ فَاَلْقَاهُ عَلٰی کَاهِلِهٖ ثُمَّ انْطَلَقَ فَمَا زَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ یُتْبِعُهٗ بَصَرَهٗ حَتّٰی خَفِیَ عَلَیْنَا عَجَبًا مِّنْ حِرْصِهٖ فَمَا قَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَثَمَّ مِنْهَا دِرْهَمٌ . (آئندہ:۳۰۴۹،۳۱۶۵)

**ترجمہ** باب، مسجد میں مال تقسیم کرنے اور کھجور کے خوشے لٹکانے کا بیان۔ بخاریؒ کہتے ہیں کہ قنو کے معنی ہیں کھجور کا خوشہ، یہ مفرد کا صیغہ ہے، اس کا تثنیہ قنوان آتا ہے، اور جمع بھی قنوان ہے، جیسے صنو کہ اس کا تثنیہ اور جمع ایک وزن پر آتا ہے۔ حضرت انس بن مالک سے (تعلیقاً) روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس بحرین سے مال لایا گیا تو آپ نے فرمایا کہ اس کو مسجد میں ڈال دیا جائے، اور یہ مال حضور اکرم ﷺ کے پاس آنے والے اموال میں سب سے زیادہ مال تھا، پھر آپ نماز کے لئے باہر تشریف لائے تو آپ ؐ نے نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، جب نماز سے فارغ ہو گئے تو اس مال کے پاس آکر بیٹھ گئے، یعنی تقسیم فرمانے لگے، چنانچہ جو سامنے آتا رہا اس کو عطا فرماتے رہے، کہ اچانک حضرت عباسؓ بھی آپہنچے اور یہ کہا کہ یارسول اللہ! مجھے بھی عطا فرمایئے، کیوں کہ میں نے (غزوۂ بدر میں) اپنی جان کا بھی فدیہ دیا تھا اور عقیل بن ابی طالب کا بھی زرفدیہ ادا کیا تھا، اس پر حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ آپ لے لیں، چنانچہ حضرت عباسؓ نے اپنے کپڑے میں مال بھر لیا، پھر اس کو اٹھانے لگے تو اٹھا نہ سکے، اس کے بعد انہوں نے کہا یارسول اللہ! کسی کو حکم فرمادیں کہ وہ مجھے یہ بوجھ اٹھوادے، آپ نے فرمایا کہ نہیں! حضرت عباسؓ نے کہا کہ پھر آپ ہی اٹھوادیجئے، آپ ﷺ نے فرمایا نہیں، پھر حضرت عباسؓ نے اس میں سے کچھ مال کم کیا، پھر اٹھانا چاہا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ! کسی کو حکم دیجئے کہ مجھے اٹھوادے، آپ نے فرمایا نہیں، پھر انہوں نے کہا کہ آپ ہی اٹھوادیجئے، آپ نے فرمایا کہ نہیں، پھر انہوں نے اس میں سے کم کیا، پھر اٹھایا، تو اس کو اپنے کاندھے پر ڈال لیا اور چل دیئے، حضور اکرم ﷺ ان کی حرص پر تعجب کے طور پر، مسلسل ان کو آنکھ اٹھا کر دیکھتے رہے حتی کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو گئے اور جب تک اس جگہ ایک بھی درہم رہا، رسول اکرم ﷺ وہاں سے کھڑے نہیں ہوئے۔

**مقصد ترجمہ** عہد رسالت میں نماز اور ذکر کے علاوہ مصالح عامہ سے متعلق مختلف قسم کے کام مسجد نبوی میں انجام دیئے گئے ہیں، امام بخاری ان چند ابواب میں ان کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ مسجدوں میں نماز اور ذکر وتسبیح کے علاوہ حالات کے تقاضے اور ضرورت کے مطابق دوسرے امور انجام دیئے جاسکتے ہیں اور ایسا کرنا" ان المساجد بنیت لما بنیت له" (یعنی مسجدیں خاص کام کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں) اور "انما هی لذکر الله والصلوة وقراء ة القرآن" (کہ مسجدیں صرف ذکر خداوندی، نماز اور تلاوت کے لیے ہیں) وغیرہ کے منافی نہیں ہے، گویا مذکورہ بالا روایات کی بنا پر یہ خیال ہوسکتا تھا کہ مسجد میں نماز، ذکر اور تلاوت قرآن کے علاوہ دیگر امور کی انجام دہی کی اجازت نہیں ہے، اس لیے امام بخاریؒ نے ضرورت کے مواقع پر اس میں توسع ثابت کر دیا۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ جو افعال نماز، ذکر اور ان کے متعلقات یا جنس عبادت سے نہیں ہیں، امام بخاریؒ مسجدوں میں ان کی انجام دہی کا جواز بھی احیاناً اور بوقت ضرورت ثابت کرنا چاہتے ہیں، بشرطیکہ ان امور کی انجام دہی سے مسجد کا احترام متاثر نہ ہو۔ رہا بے ضرورت یا مستقل طور پر مسجدوں کا ان چیزوں کے لیے استعمال تو ظاہر ہے کہ اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کیوں کہ حضور اکرم ﷺ نے وضاحت فرمادی ہے کہ مسجدوں کی بنا ان کاموں کے لیے نہیں ہے۔

حضور اکرم ﷺ نے جو مال مسجد میں تقسیم فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت بیت المال موجود نہیں تھا اور آپ کا حجرۂ شریفہ بھی بہت چھوٹا تھا، نیز یہ کہ آپ اموال کو اپنے گھر میں رکھنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے، پھر یہ کہ جہاں تقسیم کرنے والے پیغمبر علیہ السلام ہوں اور لینے والے حضرات صحابۂ کرام جیسے مہذب اور سنجیدہ بزرگ، وہاں نہ احترام مسجد کی خلاف ورزی کا اندیشہ ہے اور نہ اصل مقاصد کی ادائیگی میں تنگی کا امکان، اس لیے ضرورت کے سبب، اتفاقی طور پر، احترام ملحوظ رکھتے ہوئے یہ عمل کیا گیا، انہی شرائط کے ساتھ مسجدوں میں اس طرح کے عمل کی اجازت دی جاسکتی ہے، اس تشریح کے مطابق امام بخاریؒ اور جمہور فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف بھی باقی نہیں رہتا، کیوں کہ فقہاء نے مسجدوں میں ضرورت کے بغیر اس طرح کے امور کی مستقلاً انجام دہی کو مکروہ قرار دیا ہے، ضرورت کے تحت اتفاقاً انجام دہی میں کسی کے یہاں تنگی نہیں ہے۔

**ترجمۃ الباب کے دو جزء** ترجمۃ الباب کے دو جزء ہیں، ایک مسجد میں اموال کی تقسیم اور دوسرے مسجد میں خوشۂ انگور وغیرہ لٹکانے کا بیان، لیکن جو روایت امام بخاری نے پیش کی ہے اس سے صرف ترجمہ کا پہلا جزء یعنی اموال کی تقسیم کا مسئلہ ثابت ہوتا ہے، اس میں خوشۂ انگور کا ذکر نہیں ہے، بعض شارحین نے تو اسے امام بخاری کی بھول یا غفلت قرار دیا ہے، اور بعض شارحین نے امام بخاری کے ذوق کے مطابق مختلف توجیہات کی ہیں، کسی نے کہا کہ امام بخاری خوشۂ انگور لٹکانے کو اموال کی تقسیم پر قیاس کر رہے ہیں، کیوں کہ دونوں میں ضرورت مندوں کے لیے مسجد میں مال رکھنے کی بات مشترک طور پر پائی جاتی ہے، کسی نے کہا کہ امام بخاری ترجمۃ الباب میں اس جزء کا اضافہ

فرما کر اس روایت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو نسائی شریف میں حضرت عوف بن مالک اشجعی سے ان الفاظ میں مروی ہے:

خرج رسول الله ﷺ وبيده عصاو قد علق رجل قنا حشف فجعل يطعن في ذلك القنو ويقول لوشاء رب هذه الصدقة تصدق باطيب من هذا. (فتح الباری جلد:۲/ص:۶۲)

رسول اکرم ﷺ تشریف لائے اور آپ کے ہاتھ میں عصا تھا اور ایک شخص نے مسجد میں ردی کھجور کا خوشہ لٹکا دیا تھا، آپ نے اس خوشہ کو عصا سے مارتے ہوئے فرمایا کہ صدقہ دینے والا چاہتا تو اس سے بہتر صدقہ بھی کر سکتا تھا۔

معلوم ہوا کہ امام بخاریؒ کے ذہن میں ترجمۃ الباب کے ثبوت کے لیے روایت موجود ہے، لیکن چونکہ وہ ان کی شرط کے مطابق نہیں تھی اس لیے انہوں نے روایت ذکر نہیں کی، البتہ عنوان میں اس کی طرف اشارہ فرما دیا اور یہ امام بخاری کی عادت ہے۔

کسی نے کہا کہ اگر چہ روایت میں خوشۂ انگور کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن ابو محمد بن قتیبہ نے غریب الحدیث میں اس روایت کے ساتھ یہ جزء بھی بایں الفاظ ذکر کیا ہے۔

انه لما خرج رأى اقناء معلقة في المسجد و كان امر بين كل حائط بقنو يعلق في المسجد لياكل منه من لا شيء له. (عمدۃ القاری جلد:۴/ص:۱۶۰)

جب آپ تشریف لائے تو آپ نے مسجد میں کھجور کے خوشے لٹکے ہوئے دیکھے اور آپ نے ہر دیوار پر خوشے لٹکانے کا حکم دے رکھا تھا، تا کہ جن لوگوں کے پاس کھانے کیلئے کچھ نہیں ہے، وہ ان کو کھا سکیں۔

معلوم ہوا کہ اصل روایت میں خوشوں کو مسجد میں لٹکانے کا تذکرہ تھا جس کی طرف امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی عادت کے مطابق اشارہ کر دیا، خلاصہ یہ ہے کہ شارحین نے ترجمۃ الباب کے دوسرے جزء کے ثبوت کے لیے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں اور ان میں آخری بات زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

**تشریح مضامین** اس باب میں امام بخاری نے عنوان کے بعد قنو کے لغوی معنی بیان کئے ہیں، یعنی "قنو" (قاف کے ضمہ اور کسرہ کے ساتھ) کے معنی ہیں عذق یعنی کھجور کا خوشہ، اس کا تثنیہ قِنوان اور جمع بھی قنوانٌ آتی ہے، تثنیہ اور جمع میں فرق یہ ہے کہ تثنیہ میں نون مکسور ہوگا اور جمع میں نہیں، جیسے "صنو" ایک جڑ سے نکلے ہوئے دو درختوں میں سے ہر ایک کو صنو کہتے ہیں، اس کا تثنیہ بھی صنوان آتا ہے اور جمع بھی، فرق یہی ہے کہ تثنیہ میں نون مکسور ہوتا ہے اور جمع میں مکسور نہیں ہوتا۔ اس کے بعد امام بخاری نے روایت ذکر کی ہے کہ بحرین سے مال آیا، مال بہت زیادہ تھا، آپ نے فرمایا کہ مال مسجد میں ڈال دیا جائے، نماز کے لیے تشریف لائے تو ادھر نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، نماز سے فارغ ہوئے تو تقسیم فرمانا شروع کیا، جس پر نظر پڑتی اس کو مال عطا فرماتے، کہ حضرت عباسؓ بھی پہنچ گئے اور عرض کیا کہ

بدر کے موقع پر میرے ذمہ بہت تاوان پڑ گیا تھا؛ کیونکہ میں نے اپنا اور عقیل کا زر فدیہ ادا کیا تھا اور دوگنا ادا کیا تھا، آپ نے فرمایا کہ اس مال میں سے آپ بھی لے لیں، چنانچہ حضرت عباسؓ نے مال بھر لیا، مگر اب اٹھانا چاہتے ہیں تو اٹھتا نہیں، حضرت عباس کہتے ہیں کہ آپ کسی سے اٹھوا دیجیے، حضور ﷺ فرماتے ہیں، میں کیوں اٹھوا دوں؟ عرض کرتے ہیں کہ اچھا آپ ہی اٹھوا دیجیے، فرماتے ہیں کہ یہ بھی نہیں ہوگا، مطلب یہ ہے کہ جتنا خود اٹھا سکیں اتنا لے لیں، چنانچہ حضرت عباسؓ نے کم کیا اور تین مرتبہ کم کرنے کے بعد اس قابل ہوا کہ بڑے تکلّف کے ساتھ خود اٹھا سکیں، راوی کا بیان ہے کہ حضور ﷺ تعجب کے ساتھ، حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو نظر اٹھا کر اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل نہ ہو گئے، پھر آپ مال کے ختم ہونے تک وہیں تشریف فرما رہے۔

روایت میں مسجد میں اموال کی تقسیم کا مسئلہ ثابت ہو گیا، رہا خوشہ انگور کے مسجد میں لٹکانے کا ثبوت، تو وہ اگرچہ روایت میں نہیں ہے، لیکن قیاس یا اصل روایت یا دوسری روایات سے یہ مضمون امام بخاریؒ کے ذوق کے مطابق ثابت ہے۔ واللہ اعلم

## [۴۳] بابُ مَنْ دُعِيَ لِطَعَامٍ فِي الْمَسْجِدِ وَمَنْ اَجَابَ مِنْهُ

(۴۲۲) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ اِسْحَاقَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ سَمِعَ اَنَساً قَالَ وَجَدْتُ النَّبِيَّ ﷺ فِي الْمَسْجِدِ مَعَهُ نَاسٌ فَقُمْتُ فَقَالَ لِيْ اَرْسَلَكَ اَبُو طَلْحَةَ قُلْتُ نَعَمْ. فَقَالَ لِطَعَامٍ قُلْتُ نَعَمْ فَقَالَ لِمَنْ مَعَهُ قُوْمُوْا فَانْطَلَقَ وَانْطَلَقْتُ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ.

(آئندہ: ۳۵۸۷، ۵۳۸۱، ۵۴۵۰، ۶۶۸۸)

**ترجمہ** باب، اگر کسی شخص کو مسجد میں رہتے ہوئے کھانے کی دعوت دی جائے اور وہ مسجد ہی میں دعوت کو قبول کرلے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم ﷺ کو مسجد میں پایا جب کہ آپ کے ساتھ کچھ اور حضرات بھی تھے، میں جا کر کھڑا ہو گیا تو آپ ﷺ نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ تمھیں ابوطلحہ نے بھیجا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں! پھر آپ نے فرمایا کہ کھانے کی دعوت کے لیے بلایا ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں! چنانچہ آپ نے صحابۂ کرام سے فرمایا، چلئے پھر آپ روانہ ہوئے اور میں آپ کے آگے آگے روانہ ہو گیا۔

**مقصد ترجمہ** مسجد میں گفتگو کرنے سے منع کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں یہاں تک آیا ہے کہ مسجد میں بات کرنے سے انسان کی نیکیاں اس طرح برباد ہو جاتی ہیں جس طرح آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے، اسی طرح مسجد میں گفتگو کرنا نیکیوں کو کھا لیتا ہے۔

امام بخاریؒ ان ابواب میں یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ یہ ممانعت مسجد میں ہر طرح کی گفتگو سے متعلق نہیں ہے،

**معذرت**

یہ صفحہ موجود نہ ہو سکا۔

**بیسٹ اردو بکس ڈاٹ نیٹ**

میں قضا اور لعان کا جواز ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مسجد میں بیٹھ کران امور کی انجام دہی کی اجازت ہے۔ حنفیہ کا مسلک تو اس سلسلے میں یہ ہے کہ "قضا" باب عبادات سے ہے، لیکن مالکیہ اور حنابلہ کا بھی اتفاق ہے کہ مسجد میں قاضی کا بیٹھنا اور وہاں بیٹھ کر لوگوں کے معاملات کا تصفیہ کرنا جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے، امام مالکؒ سے منقول ہے کہ " **جلوس القاضي في المسجد للقضاء من الامر القديم المعمول به**" یعنی قاضی کا مسجد میں قضا کے لیے بیٹھنا، مسلمانوں کے قدیم معمولات میں سے ہے، البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک اگر قاضی کو اتفاقاً اس کی نوبت آ جائے تو مضائقہ نہیں، لیکن اس کو معمول بنانا ان کے یہاں مناسب نہیں مکروہ ہے۔

جمہور کے نزدیک قضا کے لیے اگر دارالقضاء علیحدہ تعمیر ہو گیا تو وہاں بیٹھنا مناسب ہے، ورنہ اس کے لیے موزوں ترین مقام ایسی مسجد ہے جو شہر کے وسط میں واقع ہو، یا پھر جامع مسجد، تا کہ ضرورت مند کسی روک ٹوک کے بغیر وہاں حاضر ہو سکے۔

جن حضرات نے قضا کی انجام دہی کو مسجد میں خلاف اولی یا مکروہ قرار دیا ہے، ان کا استدلال یہ ہے کہ فریقین میں عورت بھی ہو سکتی ہے اور مشرک بھی ہو سکتا ہے، پھر یہ کہ عورت حائضہ بھی ہو سکتی ہے، اس لیے قضاء کے لیے مسجد میں بیٹھنا مسجد کے احترام کے منافی ہے، لیکن یہ استدلال مضبوط نہیں ہے، کیوں کہ عورت اگر ایسی حالت میں ہے تو خود ہی احتیاط کرے گی، رہا مشرک کا معاملہ تو امام بخاری آئندہ ابواب میں ایک عنوان "**باب دخول المشركين في المسجد**" منعقد کریں گے۔

ہاں یہ ملحوظ رہے کہ ایک فیصلہ ہے اور ایک اس کا نفاذ، جیسے حدود کا جاری کرنا وغیرہ، تو ظاہر ہے کہ تصفیہ تو مسجد میں ہوگا اور اس کا اجراء مسجد سے باہر کیا جائے گا۔

**تشریح حدیث** امام بخاریؒ نے یہاں مختصر روایت ذکر کی ہے، کتاب الطلاق، کتاب التفسیر اور دیگر مقامات پر یہ روایت متعدد طرق سے تفصیل کے ساتھ آئے گی اور امام بخاری اس سے مختلف مسائل پر استدلال کریں گے، یہاں صرف اتنا مذکور ہے کہ ایک شخص نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اگر کوئی شخص اپنی عورت کے ساتھ کسی اجنبی مرد کو دیکھے تو وہ غیرت کے تقاضے میں اس کو قتل کر دے، یا صبر کرے، یا گواہوں کی تلاش میں سرگرداں رہے؟ بڑی پریشانی ہے، قتل کرتا ہے تو اس سے قصاص لیا جائے گا، قتل نہیں کرتا تو صبر کس طرح کرے، اور اگر گواہوں کو تلاش کرتا ہے تو بھی غیرت کب گوارا کرے گی کہ اپنے خانہ میں ایسی نا قابل برداشت صورت حال سامنے آ جائے اور وہ نہ صرف یہ کہ برداشت کرے، بلکہ گواہوں کو بھی تلاش کرے، پھر گواہوں کی تلاش کے لیے جانا مجرم کو فرار کا موقع دینے کے مرادف ہے، اس لیے شریعت نے اس نازک موقع پر لعان کا حکم دیا ہے۔ راوی حدیث کا بیان ہے کہ اس کے بعد میرے سامنے شوہر اور بیوی دونوں نے لعان کیا۔

# معذرت

## یہ صفحہ موجود نہ ہو سکا۔

**بیسٹ اردو بکس ڈاٹ نیٹ**

## [۴۵] بَابٌ إِذَا دَخَلَ بَيْتاً يُصَلِّيْ حَيْثُ شَآءَ اَوْ حَيْثُ اُمِرَ وَلَا يَتَجَسَّسُ

(۴۲۴) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْلَمَةَ قَالَ نَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ اِبْنِ شِهَابٍ عَنْ مَحْمُوْدِ بْنِ الرَّبِيعِ عَنْ عِتْبَانَ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ أَتَاهُ فِيْ مَنْزِله ، فَقَال: أَينَ تُحِبُّ اَنْ أُصَلِّيَ لَكَ مِنْ بَيْتِكَ فَأَشَرْتَ لَهُ إِلَى مَكَانٍ ، فَكَبَّرَ النَّبِیُّ ﷺ فَصَفَفْنَا خَلْفَهُ فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ . (آئندہ: ۴۲۵، ۶۶۷، ۶۸۶، ۸۳۸، ۸۴۰، ۱۱۸۶، ۴۰۰۹، ۴۰۱۰، ۵۴۰۱، ۶۴۲۳، ۶۹۳۸)

**ترجمہ** باب، جب کسی کے گھر میں جائے تو جس جگہ چاہے نماز پڑھ لے، یا جس جگہ کی نشاندہی کی جائے وہاں نماز پڑھے اور تجسس نہ کرے۔ حضرت عتبان بن مالکؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ ان کے گھر تشریف لائے اور فرمایا کہ تم کس جگہ کو پسند کرتے ہو کہ میں وہاں تمہارے گھر میں تمہارے لیے نماز پڑھوں؟ کہتے ہیں کہ میں نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کردیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھی اور ہمیں اپنے پیچھے صف میں کھڑا کرلیا اور دو رکعت نماز پڑھائی۔

**مقصد ترجمہ** عنوان کے دو جز ہیں، ایک "یصلّی حیث شاء" یعنی جانے والا اپنے اختیار سے جہاں مناسب سمجھے نماز پڑھ لے، دوسرا "یصلّی حیث اُمِرَ" یعنی جس جگہ کے لیے کہا جائے اس جگہ نماز پڑھے، ترجمہ کے ان دونوں جز کے درمیان کلمۂ "او" لایا گیا ہے، پھر ان دونوں کے بعد ایک قید ہے "ولا یتجسس" یعنی تجسس نہ کرے کلمۂ "او" تخییر اور تعیین احد الامرین، دونوں معنی کے لیے استعمال ہوسکتا ہے۔

تخییر یعنی دونوں صورتوں کے درمیان اختیار، اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جانے والے کو ان دونوں صورتوں میں سے کسی بھی صورت کا اختیار ہے، چاہے تو وہ اپنی خواہش کے مطابق نماز پڑھ لے اور چاہے تو صاحب خانہ کی نشاندہی کے مطابق نماز ادا کردے، گویا جانے والے کو ان دونوں باتوں میں سے کسی بھی صورت پر عمل کرنے کی آزادی ہے۔

اور اگر "کلمۂ او" تعیین احد الامرین کے لیے ہو، یعنی دو باتوں میں سے ایک کی تعیین کے لیے ہو تو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ جانے والے کو مندرجہ بالا دونوں صورتوں میں سے کس صورت کو اختیار کرنا چاہئے؟ روایت سے معلوم ہوا کہ بلانے والے کی بات کے مطابق عمل کرنا چاہئے، پھر یہ کہ دونوں صورتوں میں تجسس مذموم ہے، اپنے اختیار سے نماز پڑھ لے یا بلانے والے کی نشاندہی کے مطابق نماز ادا کرے: دونوں ہی صورتوں میں تجسس مذموم سے اجتناب کرتے ہوئے عمل کرنا چاہئے۔

**تشریح حدیث اور ترجمہ کا ثبوت** یہ روایت امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں دس سے زیادہ مرتبہ کہیں مختصر اور کہیں مفصل ذکر فرمائی ہے، یہاں بہت مختصر روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عتبان بن مالک کے گھر تشریف لاکر ان سے معلوم فرمایا کہ تم مجھ سے اپنے گھر کے کس حصہ میں نماز پڑھوانا چاہتے

ہو؟ حضرت عتبانؓ نے ایک جگہ کی طرف اشارہ کر دیا تو آپ نے اسی جگہ دو رکعت نماز پڑھا دی۔

علامہ عینی نے لکھا ہے کہ اس روایت سے گھروں میں جماعت کرنے یا نوافل کو باجماعت ادا کرنے کا جواز معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ حضرت عتبان نے رسول اللہ ﷺ کو اصالۃً نوافل کی جماعت کے انعقاد کے لیے مدعو نہیں کیا تھا، ان کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ ان کے گھر میں نماز پڑھ لیں، تو وہ اس متبرک مقام کو نماز کے لیے مقرر کر لیں، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ رسول اکرم ﷺ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ساتھ لے کر وہاں پہنچے تو راستہ میں اور بھی کچھ لوگ ساتھ ہو گئے اور وہاں نوافل با جماعت ادا کی گئیں، اسی لئے فقہاء نے کہا ہے کہ تداعی نہ ہو تو نوافل کا جماعت کے ساتھ ادا کرنا درست ہے، پھر یہ کہ اصل مذہب میں تداعی کی کوئی تعریف معین نہیں ہے، اس لیے مسئلہ میں گنجائش معلوم ہوتی ہے، البتہ باقاعدہ تداعی ہو تو فقہاء کے نزدیک مکروہ تحریمی ہے۔

اس مختصر روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ترجمۃ الباب میں ''کلمۂ او'' دو باتوں میں سے ایک کی تعیین کے لیے لایا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جانے والے کو بلانے والے کی مرضی کے مطابق عمل کرنا چاہئے، کیوں کہ حضور اکرم ﷺ نے جانے کے بعد اپنی مرضی کے مطابق عمل نہیں کیا، نہ اپنی خواہش کا اظہار فرمایا، بلکہ آپ ﷺ نے جاتے ہی یہ سوال کیا کہ نماز پڑھنے کے لیے کونسی جگہ بنا رکھی ہے؟ حضرت عتبانؓ نے معینہ جگہ کی نشاندہی کی اور حضور پاک ﷺ نے نماز پڑھا دی۔

لیکن اگر کلمۂ ''او'' کا استعمال دو باتوں میں سے ایک کی تعیین کے لیے مانا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ امام بخاری یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ جانے والے کو اختیار ہے کہ وہ اپنی تجویز سے نماز پڑھ لے یا بلانے والے کی مرضی کے مطابق نماز پڑھے، اس صورت میں مذکورہ بالا مختصر روایت سے ترجمہ کا ثبوت مشکل ہے، بلکہ یہ کہنا ہوگا کہ حضرت عتبانؓ کی اسی روایت میں بعض جگہ یہ تفصیل ہے کہ حضرت عتبانؓ نے جمعہ کی نماز میں حضور ﷺ سے عرض کیا کہ میری تمنا یہ ہے کہ آپ میرے مکان میں تشریف لا کر کسی جگہ نماز پڑھ دیں، تاکہ میں اس متبرک مقام کو مسجد بیت یعنی خانگی مسجد بنالوں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ اچھا، ہم آئیں گے، چنانچہ ہفتہ کے دن آپ حضرت صدیق اکبرؓ کو ساتھ لے کر تشریف لے گئے، مکان تک پہنچتے پہنچتے اور بھی صحابہ ساتھ ہو گئے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عتبان نے ابتداءً نماز کے لیے جگہ کا انتخاب حضور اکرم ﷺ پر چھوڑ دیا کہ جس جگہ مناسب سمجھیں نماز پڑھ دیں، اس پر آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم نے کون سی جگہ بنا رکھی ہے؟ چنانچہ حضرت عتبان نے مکان کے ایک حصہ کی طرف اشارہ کیا، آپ نے وہیں نماز پڑھا دی، اس تفصیلی روایت سے ترجمہ کا یہ جزء کہ جانے والے کو اپنی مرضی کے مطابق نماز پڑھنے کی اجازت ہے، دو طرح ثابت ہے، ایک حضرت عتبان کی درخواست سے کہ انہوں نے یہ عرض کیا تھا کہ آپ میرے مکان میں آ کر نماز پڑھ دیں، تاکہ میں اس کو مسجد بنالوں، اس میں آ کر نماز پڑھنے میں عموم ہے کہ جس جگہ چاہیں پڑھ دیں اور دوسرے وہ بعض

روایات ہیں جن میں جگہ کا انتخاب ابتداء آپ کے سپرد کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ترجمۃ الباب میں دو جز مذکور ہیں، اور امام بخاری کا منشاء ان دونوں ہی میں سے ایک کی تعیین بھی ہوسکتا ہے اور یہی ظاہر ہے کہ زائر کو اہل خانہ کی مرضی کے مطابق نماز پڑھنی چاہئے، لیکن اگر ترجمہ کا مقصد یہ قرار دیا جائے کہ عنوان میں ذکر کردہ دونوں صورتوں میں سے کسی بھی صورت پر عمل کرنے کی آزادی ہے، تو یہ بھی روایت باب سے ثابت کیا جاسکتا ہے، مگر اس ثبوت کے لیے دوسری روایات میں ذکر کردہ تفصیلات کا سہارا لینا ضروری ہوگا۔

## [٤٦] بَابُ الْمَسَاجِدِ فِي الْبُيُوْتِ

وَصَلّٰى الْبَرَاءُ بْنُ عَازِبٍ فِيْ مَسْجِدِ دَارِهٖ جَمَاعَةً

(۴۲۵) حَدَّثَنَا سَعِيْدُ بْنُ عُفَيْرٍ قَالَ نَا اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِيْ عُقَيْلٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ مَحْمُوْدُ بْنُ الرَّبِيْعِ الْاَنْصَارِيُّ اَنَّ عِتْبَانَ بْنَ مَالِكٍ وَهُوَ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مِمَّنْ شَهِدَ بَدْراً مِّنَ الْاَنْصَارِ اَنَّهٗ اَتٰى رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اِقَدْ اَنْكَرْتُ بَصَرِيْ وَاَنَا اُصَلِّيْ لِقَوْمِيْ فَاِذَا كَانَتِ الْاَمْطَارُ سَالَ الْوَادِي الَّذِيْ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُمْ لَمْ اَسْتَطِعْ اَنْ اٰتِيَ مَسْجِدَهُمْ فَاُصَلِّيَ بِهِمْ وَوَدِدْتُ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَنَّكَ تَاْتِيْنِيْ فَتُصَلِّيَ فِيْ بَيْتِيْ فَاَتَّخِذَهٗ مُصَلًّى قَالَ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ سَاَفْعَلُ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ تَعَالٰى قَالَ عِتْبَانُ فَغَدَا عَلَيَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاَبُوْبَكْرٍ حِيْنَ ارْتَفَعَ النَّهَارُ فَاسْتَاْذَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاَذِنْتُ لَهٗ فَلَمْ يَجْلِسْ حِيْنَ دَخَلَ الْبَيْتَ ثُمَّ قَالَ اَيْنَ تُحِبُّ اَنْ اُصَلِّيَ مِنْ بَيْتِكَ؟ قَالَ فَاَشَرْتُ لَهٗ اِلٰى نَاحِيَةٍ مِنَ الْبَيْتِ فَقَامَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَكَبَّرَ فَقُمْنَا فَصَفَفْنَا فَصَلّٰى رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ وَحَبَسْنَاهُ عَلٰى خَزِيْرَةٍ صَنَعْنَاهَا لَهٗ قَالَ فَثَابَ فِي الْبَيْتِ رِجَالٌ مِّنْ اَهْلِ الدَّارِ ذَوُوْ عَدَدٍ فَاجْتَمَعُوْا فَقَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ اَيْنَ مَالِكُ بْنُ الدُّخَيْشِنِ اَوِ ابْنُ الدُّخْشُنِ فَقَالَ بَعْضُهُمْ اِنَّهٗ مُنَافِقٌ لَا يُحِبُّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَا تَقُلْ ذٰلِكَ اَلَا تَرَاهُ قَدْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يُرِيْدُ بِذٰلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ قَالَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ قَالَ فَاِنَّا نَرٰى وَجْهَهٗ وَنَصِيْحَتَهٗ اِلَى الْمُنَافِقِيْنَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فَاِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ قَدْ حَرَّمَ عَلَى النَّارِ مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَبْتَغِيْ بِذٰلِكَ وَجْهَ اللّٰهِ. قَالَ ابْنُ شِهَابٍ ثُمَّ سَاَلْتُ الْحُصَيْنَ بْنَ مُحَمَّدٍ الْاَنْصَارِيَّ وَهُوَ اَحَدُ بَنِيْ سَالِمٍ وَهُوَ مِنْ سَرَاتِهِمْ عَنْ حَدِيْثِ مَحْمُوْدِ بْنِ الرَّبِيْعِ فَصَدَّقَهٗ بِذٰلِكَ. (گذشتہ: ۴۲۴)

**ترجمہ** باب، گھروں میں مسجدیں بنانے کا بیان۔ حضرت براء بن عازب نے اپنے گھر کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی۔ حضرت عتبان بن مالک انصاریؓ (اور حضرت عتبان رسول اکرم ﷺ کے صحابی ہیں اور یہ قبیلۂ انصار کے غزوۂ بدر میں شرکت کرنے والے صحابہ میں سے ہیں) روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے اپنی بینائی میں کمزوری محسوس ہوتی ہے اور میں اپنی قوم کو نماز پڑھاتا ہوں، مگر جب بارشیں ہوتی ہیں تو میرے گھر کے اور مسجد کے درمیان جو پانی کی گزرگاہ ہے اس میں پانی بھر جاتا ہے اور میں مسجد میں حاضر ہوکر نماز پڑھانے پر قادر نہیں رہتا، یا رسول اللہ! میری خواہش ہے کہ آپ میرے گھر تشریف لائیں اور میرے گھر میں نماز ادا فرمادیں تاکہ میں اس جگہ کو نماز پڑھنے کے لیے مقرر کرلوں۔ اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ میں انشاء اللہ ایسا کروں گا، حضرت عتبان فرماتے ہیں چنانچہ دوسرے دن صبح کو رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ دن چڑھے تشریف لائے، رسول اللہ ﷺ نے اجازت چاہی، میں نے اجازت دی، پھر جب آپ گھر کے اندر تشریف لائے تو ابھی بیٹھے بھی نہ تھے کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اپنے گھر میں مجھ سے کس جگہ نماز پڑھوانا چاہتے ہو؟ تو میں نے گھر کے ایک گوشہ کی طرف اشارہ کردیا، چنانچہ رسول اکرم ﷺ کھڑے ہوگئے اور تکبیر تحریمہ کہہ کر نماز شروع فرمادی اور ہم آپ کے پیچھے نماز کے لیے کھڑے ہوگئے اور صف بندی کرلی آپ نے دو رکعتیں پڑھائیں پھر سلام پھیر دیا، حضرت عتبان فرماتے ہیں کہ پھر ہم نے آپ کو قیمہ اور آٹے سے بنے ہوئے کھانے کے لیے روک لیا جو ہم نے آپ کے لیے تیار کیا تھا، آپ کو دیکھ کر محلہ کے متعدد لوگ گھر میں جمع ہوگئے اور ان میں سے ایک نے کہا کہ مالک بن الدخیشن یا ابن الدخشن کہاں ہے؟ یعنی وہ کیوں نہیں آئے، انہی میں سے کسی نے جواب دیا کہ وہ تو منافق ہے، اللہ اور اس کے رسول سے محبت نہیں رکھتا، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ایسی بات مت کہو، کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ اس نے لا الہ الا اللہ کا اقرار کرلیا ہے، جس سے اس کا مقصد رضائے خداوندی کا حصول ہے، اس پر اس شخص نے کہا کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ جاننے والے ہیں، اور (اعتذار کے طور پر) اس شخص نے عرض کیا کہ ہم چونکہ ان کا رخ منافقین کی طرف اور ان کی خیر خواہی منافقین کے ساتھ دیکھتے ہیں (اس لیے زبان سے یہ بات نکل گئی) حضور ﷺ نے فرمایا کہ اللہ عزوجل نے جہنم پر ہر اس شخص کو حرام فرمادیا ہے جو لا الہ الا اللہ کا اقرار کرلے اور اس کا مقصد رضائے خداوندی کا حصول ہو، ابن شہاب زہری کہتے ہیں کہ پھر میں نے حصین بن محمد انصاری سے جو قبیلہ بنو سالم کے ایک فرد اور ان کے سربرآوردہ لوگوں میں سے تھے، محمود بن الربیع کی روایت کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے اس کی تصدیق کی۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ گھر میں مسجد بنالی جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ یعنی اگر اپنے مکان میں نماز کے لیے کوئی جگہ مخصوص کرلی جائے اور اس کو مسجد کا نام بھی دیدیا جائے تو اس کی حیثیت اور مسجد شرعی کی حیثیت برابر ہے، یا دونوں میں فرق ہے؟

ظاہر ہے کہ مسجد شرعی کے احکام جداگانہ ہیں، وہ کسی کی ملک نہیں ہوتی، اس کی خرید وفروخت نہیں کی جاسکتی، اس میں وراثت جاری نہیں ہوتی اور جنابت کی حالت میں اس میں جانا جائز نہیں ہوتا وغیرہ، جب کہ گھر کی مسجد صاحب خانہ کی ملکیت ہوتی ہے، اس کی خرید وفروخت جائز ہے، اس کا میراث میں تقسیم کیا جانا بھی درست ہے اور جنابت کی حالت میں اس میں داخل ہونا بھی جائز ہے وغیرہ۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر گھر کی مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو صرف جماعت کا ثواب حاصل ہوجائے گا، مسجد کی جماعت کا ثواب نہیں ملے گا''منیۃ المصلی'' میں جزئیہ موجود ہے کہ گھر میں جماعت کرنے والے کو مسجد کی فضیلت کا تارک قرار دیا جائے گا، اگر چہ تارک جماعت نہیں سمجھا جائے گا۔

یہ تو ہوا مسئلہ، لیکن امام بخاری کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھر کی مسجدوں کو محلّہ کی مسجدوں کا حکم دینا چاہتے ہیں، کیوں کہ انہوں نے عنوان میں کوئی قید نہیں لگائی، مثلاً اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ عذر کی صورت میں مسجد گھر میں بنانے کا بیان، تو یہ سمجھا جاتا کہ وہ معذورین کے لیے اس کی گنجائش دینا چاہتے ہیں، لیکن انہوں نے بلا قید فرمایا کہ گھر میں مسجد بنانے کا بیان اور اس کے بعد حضرت براء بن عازب کا عمل اپنے ثبوت میں پیش کیا کہ انہوں نے اپنے گھر میں مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھی، ظاہر ہے کہ یہ ایک جلیل القدر صحابی کا عمل ہے، اگر مسجد شرعی کو چھوڑ کر گھر کی مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے میں کوئی نقصان ہوتا تو حضرت براء بن عازب جیسے صحابی اس کو کیوں اختیار کرتے؟

اس کے بعد امام بخاریؒ نے حضرت عتبان بن مالک کی تفصیلی روایت ذکر کی ہے، اس سے بخاری غالباً یہی ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت عتبان نے معذوری کا اظہار کرتے ہوئے، یہ خواہش بیان کی کہ آپ میرے مکان میں تشریف لاکر نماز پڑھ دیں تو میں برسات کے زمانہ میں مکان ہی کے اندر جماعت سے نماز پڑھ لیا کروں، چنانچہ ان کی درخواست قبول کرلی گئی۔ آپ تشریف لائے، گھر میں نماز پڑھ کر جگہ متعین کردی، اس کے بعد حضرت عتبان برسات کے زمانہ میں وہیں نماز پڑھتے اور دوسرے حضرات بھی جو ان کو افضل سمجھتے تھے یا وہ بھی معذور ہوں گے وہ مسجد کے بجائے ان کے گھر میں ان کے پیچھے نماز پڑھ لیا کرتے، گویا بخاری کے نزدیک گھر کی مسجد کو بھی وہی حیثیت حاصل ہوجاتی ہے، جو محلّہ کی مسجد کو ہے۔

لیکن امام بخاریؒ کے طرز عمل کی رعایت سے مقصد ترجمہ کی تعیین کے بعد یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ گھر کی مسجد کو مسجد شرعی کا حکم دینے کے لیے دونوں استدلال کمزور ہیں، کیوں کہ حضرت براء بن عازب کے اس عمل میں قوی احتمال یہ ہے کہ مسجد شرعی میں اتفاقاً جماعت فوت ہوجانے کی صورت میں انہوں نے ایسا کیا ہوگا کہ جماعت کا ثواب حاصل کرنے کے لیے اہل خانہ کو جمع کیا اور جماعت سے نماز ادا فرمالی۔ رہا روایت باب سے استدلال تو وہ اس سے زیادہ کمزور ہے، کیوں کہ یہ ایک ایسے معذور کا واقعہ ہے کہ جس کا عذر دربار نبوت میں قابل قبول سمجھا گیا ہے، ہاں اگر مقصد یہ قرار دیا جائے (اگر چہ بخاری کے الفاظ میں اس کی گنجائش کم ہے) کہ مسجد شرعی تو مسجد ہے ہی، لیکن معذور کے لیے فرائض

کی ادائیگی گھر میں بھی درست ہے، اور اگر وہ جماعت کی فضیلت حاصل کرنے کے لیے گھر میں کوئی جگہ مقرر کر لے جہاں معذوری کی صورت میں جماعت کر لی جائے تو اس کو جماعت کا ثواب بھی حاصل ہوجائے گا اور مسجد شرعی سے غیر حاضر ہونے کا الزام عائد نہیں ہوگا، اگر امام بخاری کا مقصد یہ قرار دیا جائے تو اس کی تائید کی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** پچھلے باب میں حضرت عتبان کی جو مختصر روایت ذکر کی گئی تھی یہاں اس کی تفصیل ہے کہ حضرت عتبان محلّہ کی مسجد کے امام تھے، نظر کمزور ہوگئی تو انہوں نے حضور ﷺ سے اپنی معذوری کے بارے میں عرض کیا کہ برسات کے زمانہ میں، مسجد کے اور میرے گھر کے درمیان جو پانی کی گزرگاہ ہے اس کے سبب بڑی دشواری ہے، نظر کمزور، بدن بھاری اور راستہ گلناک، بھاری بدن کے انسان کا پیر پھسل جائے تو سنبھلنا دشوار ہوتا ہے، اور نظر کمزور ہو تو معذوری میں مزید اضافہ ہوجاتا ہے، اس لیے انہوں نے عرض کیا کہ محلّہ کی مسجد میں حاضری سے تو معذور ہوں، اگر آپ میرے گھر تشریف لاکر، گھر میں کسی جگہ نماز کا افتتاح فرمادیں تو میں اس کو مسجد بنالوں، چنانچہ ان کی درخواست منظور ہوگئی، آپ صدیق اکبر کو ساتھ لے کر پہونچ گئے اور گھر کے ایک گوشہ میں دو رکعت نفل باجماعت ادا فرمائی، حضرت عتبان نے اس کو گھر کی مسجد بنالیا اور بارش کے موسم میں وہیں نماز باجماعت ادا کرتے رہے۔

اس تفصیلی روایت سے یا تو یہ سمجھ لیا جائے کہ گھروں میں نماز اور جماعت کے لیے جگہ مقرر کرلینا مستحب ہے، یا یہ سمجھ لیا جائے کہ معذورین اگر محلّہ کی مسجد میں نہ جاسکیں تو وہ اپنے گھروں میں مجبوری کے وقت جماعت کے ساتھ نماز ادا کرسکتے ہیں، یا یہ سمجھ لیا جائے کہ امام بخاری اپنے ذوق کے مطابق گھر کی مسجد کو محلّہ کی مسجد کے برابر حکم دینا چاہتے ہیں، اگرچہ یہ بات کمزور ہے، شارحین نے پہلی بات پر زور دیا ہے۔

نماز سے فارغ ہوگئے تو حضرت عتبان نے "خزیرہ" تناول فرمانے کے لیے ٹھہرنے کی درخواست کی، آپ ٹھہر گئے یہ ایک عربی کھانا ہے، گوشت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے دیگ میں چڑھا دیتے ہیں اور جب گل جاتا ہے تو اس پر آٹا چھڑک کر خوب گھوٹ دیتے ہیں، پھر نمک اور چکنائی شامل کر دیتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ صالحین کو مدعو کیا جائے، تو اپنی اور ان کی حیثیت کے مطابق تواضع کرنا بھی مستحب ہے۔

آگے روایت میں مذکور ہے کہ محلّہ والوں کو جب معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ عتبان بن مالک کے گھر تشریف لائے ہیں تو سارے اہل محلّہ جمع ہوگئے، لیکن مالک بن الدخشم[1] کسی وجہ سے نہ آسکے تو کسی نے کہا کہ ان کا کیا پوچھتے ہو، انہیں اللہ اور اس کے رسول سے کیا تعلق؟ وہ تو منافق ہیں، نبی کریم ﷺ نے تردید فرمائی کہ ایسا مت کہو، کیا تمہیں معلوم نہیں کہ انہوں نے لا الہ الا اللہ کا اقرار کیا ہے اور مخلصانہ طور پر کیا ہے، تبصرہ کرنے والے نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے

---

[1] بخاری کی روایت میں اگرچہ مالک بن الدخیشن او الدخشن ہے، یعنی راوی کو شبہ ہوگیا کہ ان کے والد کا نام دخشن ہے یا اس کی تصغیر دخیشن ہے لیکن صحیح نام مالک بن الدخشم بالمیم ہے جیسا کہ عینی میں طبرانی کے حوالہ سے موجود ہے۔ ۱۲

رسول زیادہ جاننے والے ہیں، مگر ہم نے تو یہ دیکھتے ہوئے عرض کیا کہ ان کے تعلقات، نشست و برخاست، معاملات منافقین کے ساتھ ہیں، اس پر حضور ﷺ نے فرمایا کہ بے شک اللہ تعالی نے اخلاص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہنے والے پر جہنم کی آگ کو حرام کر دیا ہے۔

حضرت مالک بن الدخشم کے بارے میں ارباب سیر کا اتفاق ہے کہ غزوۂ بدر میں شریک رہے ہیں، بلکہ بعض قابل قبول روایات میں اسی واقعہ میں یہ مذکور ہے کہ جب کہنے والے نے انہیں نفاق کا الزام دیا تو حضور ﷺ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ "الیس قد شھد بدراً" کیا وہ بدر میں شریک نہیں تھے؟ یعنی ان لوگوں میں سے ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے مغفرت کا اعلان فرمایا ہے، مغازی ابن اسحٰق میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جن لوگوں کو مسجد ضرار میں آگ لگانے کیلئے بھیجا تھا ان میں مالک ابن الدخشم بھی تھے، غرض یہ بڑے صاحبِ فضیلت صحابۂ کرام میں ہیں، اس کے باوجود ان پر حضور ﷺ کے سامنے نفاق کا الزام عائد کر دیا گیا اور حضور اکرم ﷺ نے اس کی تردید بھی فرمادی، جس میں یہ بات آئی کہ لا الہ الا اللہ کہنے والوں پر جہنم کی آگ حرام ہے، یہ بحث "کتاب الایمان" میں گذر گئی ہے کہ جہنم کی آگ حرام ہونے کا کیا مطلب ہے؟ یعنی یا تو یہ کہا جائے کہ جو مخلصانہ طور پر لا الہ الا اللہ کی شہادت دے گا وہ یقینی طور پر اس کی ذمہ داریاں بھی پوری کرے گا یعنی اعمال سے تہی دست نہ ہوگا، یا پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں پر وہ جہنم حرام ہے، جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور ابدی ہے۔

## پس پشت برائی سے یاد کرنے کا حکم

شریعت کا یہ حکم بالکل واضح اور مشہور ہے کہ کسی کی عدم موجودگی میں اس کو برائی سے یاد کرنا غیبت ہے، لیکن یہاں یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیئے کہ اس روایت میں ایک بزرگ صحابی پر نفاق کا الزام عائد کیا گیا ہے، حضور ﷺ نے اس کا جواب تو دیدیا، لیکن آپ نے الزام عائد کرنے والوں کو غیبت سے بچنے کی ہدایت نہیں کی، اس سے معلوم ہوا کہ پسِ پشت کی جانے والی، ہر برائی کو غیبت نہیں کہتے، بلکہ اس سلسلے میں تفصیل کی گئی ہے اور بعض چیزوں کا استثناء کیا گیا ہے، علامہ ابن حجر اور علامہ عینی رحمہم اللہ نے فوائد حدیث پر تفصیلی کلام کرتے ہوئے اس کی تصریح کی ہے، ابن حجر کی عبارت ہے:" **والتنبیه علی من یظن به الفساد فی الدین عند الامام علی جهة النصیحة ولا یعد ذلك غیبة**"۔ (فتح الباری جلد ۲)

روایت میں اس پر تنبیہ ہے کہ اگر کسی کے بارے میں دین کے فساد کا ظن ہو تو اس کی خیر خواہی کے طور پر امام (حاکم) کے سامنے بیان کرنا غیبت نہیں ہے۔

علماء کرام نے اس طرح کے مقامات کی تفصیل کی ہے، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں چھ جگہوں کو شمار کیا ہے، جن میں مختلف وجوہ کے سبب کسی کی عدم موجودگی میں اس کو برائی سے یاد کرنا غیبت میں شامل نہیں ہے، ان میں سے ایک منکر کی اصلاح یا کسی غلط کار کو راہ راست پر لانے کے لیے کسی صاحب اقتدار یا با اثر شخصیت سے

تعاون حاصل کرنا بھی ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا کہ نفاق کا الزام دینے والے کے سامنے صرف ظاہری صورت تھی، کہ حضرت مالک بن الدخشم کے منافقین سے تعلقات تھے، چنانچہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے سامنے صورت حال رکھ دی، آپ ﷺ نے تردید فرمائی کہ ان کے بارے میں یہ تصور غلط ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ حاکم یا با اقتدار لوگوں کو شکایت پر توجہ دینے سے پہلے پوری احتیاط کے ساتھ معاملہ پر غور کرنا چاہئے اور شکایت غلط ہونے کی صورت میں فوراً صورت حال کی وضاحت کر کے غلط فہمی کو دور کرنا چاہئے۔

رہا یہ کہ حضرت مالک بن الدخشم کے منافقین کے ساتھ تعلقات کیوں تھے؟ تو ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات سے ان کی رشتہ داری ہو اور حق قرابت کی ادائیگی کے لیے تعلقات منقطع نہ کئے ہوں، ممکن ہے کہ بعض منافقین کے بارے میں انہیں اصلاح احوال کی امید ہو اور اسی خیال سے ان سے ملتے ہوں کہ ان کے خیالات میں تبدیلی لاسکیں وغیرہ، ورنہ جو انسان اتنا بہادر ہو کہ منافقین کی مسجد کو گرا کر اس میں آگ لگا دے، اس پر بزدلی یا بزدلی کے سبب نفاق کا شبہ نہیں کیا جاسکتا۔

**صالحین کے تبرکات** روایت باب سے صالحین کے تبرکات کی اصلیت بھی ثابت ہوتی ہے، کیوں کہ حضرت عتبان گھر میں نماز کے لیے جو جگہ مقرر کرنا چاہتے تھے، پہلے انہوں نے یہ چاہا کہ اس جگہ کو آپ کے ذریعہ متبرک بنا دیا جائے، آپ ﷺ نے ان کی درخواست کو شرف قبول عطا فرما کر واضح کر دیا کہ صالحین کے ذریعہ برکت حاصل کرنا نہ صرف یہ کہ جائز بلکہ شرعاً مطلوب ہے۔

## [۴۷] بَابُ التَّيَمُّنِ فِيْ دُخُوْلِ الْمَسْجِدِ وَغَيْرِهٖ

وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَبْدَأُ بِرِجْلِهِ الْيُمْنٰى فَاِذَا خَرَجَ بَدَأَ بِرِجْلِهِ الْيُسْرٰى

(۴۲۶) حَدَّثَنَا سُلَيْمٰنُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ نَا شُعْبَةُ عَنِ الْاَشْعَثِ بْنِ سُلَيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ مَسْرُوْقٍ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحِبُّ التَّيَمُّنَ مَا اسْتَطَاعَ فِيْ شَاْنِهٖ كُلِّهٖ فِيْ طُهُوْرِهٖ وَتَرَجُّلِهٖ وَتَنَعُّلِهٖ. (گذشتہ:۱۶۸)

**ترجمہ** باب، مسجد میں داخل ہوتے وقت اور اس کے علاوہ دوسرے کاموں میں داہنی طرف سے شروع کرنے کا بیان۔ حضرت ابن عمرؓ جب مسجد میں داخل ہوتے تو پہلے داہنا پیر اندر رکھتے اور جب مسجد سے نکلتے تو بایاں پیر نکالتے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جہاں تک ممکن ہوتا تمام کاموں میں داہنی طرف سے شروع کرنا پسند فرماتے تھے، پاکی حاصل کرنے میں، کنگھا کرنے اور جوتا پہننے میں بھی۔

**مقصد ترجمہ** آداب مسجد سے متعلق ایک حکم بیان کرتے ہیں کہ مسجد میں داخل ہو تو پہلے داہنا پیر داخل کرنا چاہئے، کہ اس میں مسجد کا احترام بھی پایا جاتا ہے، اس کے ساتھ جن چیزوں میں شرافت یا خیریت پائے جانے

کے سبب، ان کا داہنی طرف سے شروع کرنا مسنون قرار دیا گیا ہے، اس کی بھی رعایت ہے، مثلاً اوپر چڑھ رہے ہیں، تو پہلے داہنا پیر رکھنا چاہئے کہ اس میں ایک طرح کا عروج پایا جاتا ہے، داہنی سمت سے آغاز کے سلسلے میں یہ ایک شرعی اصول ہے۔

امام بخاریؒ نے ترجمہ ثابت کرنے کے لیے پہلے حضرت ابن عمرؓ کا اثر پیش کیا ہے کہ جب وہ مسجد میں جاتے تو پہلے داہنا پیر رکھتے اور مسجد سے نکلتے تو بایاں پیر آگے بڑھاتے، یہ تو حضرت ابن عمر کا عمل ہے اور ان کا عمل بالسنۃ مشہور ہے، مگر اس کو مرفوعاً نقل نہیں کیا گیا ہے، البتہ اس کی تائید میں مستدرک حاکم سے حضرت انسؓ کی روایت پیش کی جا سکتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں: ''من السنة اذا دخلت المسجد ان تبدأ برجلك اليمنى واذا خرجت ان تبدأ برجلك اليسرىٰ'' (بحوالہ عمدۃ القاری جلد: ۴/ص: ۱۷۱) ترجمہ: سنت یہ ہے کہ جب تم مسجد میں جاؤ تو پہلے داہنا پیر اندر رکھو اور جب مسجد سے باہر نکلو، تو پہلے بایاں پیر باہر نکالو۔ اور محدثین کا اصول ہے کہ صحابۂ کرام اگر ''من السنۃ کذا'' کے الفاظ استعمال کریں تو انہیں مرفوع سمجھا جاتا ہے۔

**تشریح حدیث** روایت میں آیا کہ رسول اللہ ﷺ کو اپنے کاموں میں داہنی طرف سے شروع کرنا پسند تھا، پھر اس کے ساتھ حضرت عائشہؓ نے مثال کے طور پر تین چیزیں بیان کی ہیں: پاکی حاصل کرنے میں، کنگھا کرنے میں اور جوتا پہننے میں، اس لیے وہ تمام چیزیں جن میں کسی طرح کی شرافت، عزت یا زینت پائی جاتی ہو وہ اس میں شامل ہو جائیں گی۔

یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ حضرت عائشہ کا یہ بیان، حضور اکرم ﷺ کی مبارک عادت کا بیان ہے، یعنی ان چیزوں میں داہنی جانب سے ابتداء کا اہتمام عبادت کے طور پر نہیں عادت کے طور پر تھا، اس لیے فقہاء کے اصول کے مطابق اس سے ان جیسے کاموں میں تیامن یعنی داہنی طرف سے شروع کرنے کا استحباب ثابت ہوتا ہے۔　　واللہ اعلم

لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ اہل حق کے نزدیک غیر اہم کاموں میں سنت کا اتباع ایسے بڑے بڑے کاموں پر فوقیت رکھتا ہے جو سنت نہ ہوں، شیخ عبدالغنی مجددی قدس سرہ نے ارشاد فرمایا ہے: ''قال علماؤنا ان اتيان السنة اذا كان امرا يسيرا كادخال الرجل الا يسر في الخلاء ابتداءً اولىٰ من البدعة الحسنة وان كان امرا فخيما كبناء المدارس'' (انجاح الحاجہ/ص ۲) ترجمہ: علماء نے فرمایا کہ سنت پر عمل کرنا خواہ کتنا ہی غیر اہم معاملہ ہو جیسے بیت الخلاء جاتے وقت بائیں پیر کو آگے رکھنا، بدعت حسنہ سے اولیٰ ہے، خواہ وہ کتنے ہی اہم معاملہ سے متعلق ہو جیسے مدارس کا قیام۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت کی پیروی سے اللہ تعالیٰ نے وہ انوار و برکات اور رحمتیں متعلق فرمائی ہیں، جن کا شمار نہیں کیا جا سکتا، جب کہ بدعت کتنی ہی حسنہ ہو لیکن چونکہ وہ عمل پیغمبر علیہ السلام کا نہیں ہے، اس لیے اس میں اتباع سنت والے انوار و برکات کی شان کہاں پیدا ہو سکتی ہے۔　　واللہ اعلم

## [۴۸] بابٌ هَلْ يُنْبَشُ قُبُورُ مُشْرِكِي الْجَاهِلِيَّةِ وَيُتَّخَذُ مَكَانُهَا مَسَاجِدَ؟

لِقَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ لَعَنَ اللهُ الْيَهُودَ اِتَّخَذُوا قُبُوْرَ أَنْبِيَائِهِمْ مَسَاجِدَ، وَمَا يُكْرَهُ مِنَ الصَّلٰوةِ فِيْ الْقُبُورِ. وَرَأٰى عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ اَنَس بْنَ مَالِكٍ يُصَلِّي عِنْدَ قَبْرٍ فَقَالَ الْقَبْرَ الْقَبْرَ وَلَمْ يَامُرْهُ بِالْإِعَادَةِ.

(۴۲۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ نَا يَحْيٰى عَنْ هِشَامٍ اَخْبَرَنِي اَبِيْ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ اُمَّ حَبِيْبَةَ وَاُمَّ سَلْمَةَ ذَكَرَتَا كَنِيْسَةً رَأَيْنَهَا بِالْحَبَشَةِ فِيْهَا تَصَاوِيرُ فَذَكَرَنَ ذٰلِكَ لِلنَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ اِنَّ اُوْلٰئِكَ اِذَا كَانَ فِيْهِمُ الرَّجُلُ الصَّالِحُ فَمَاتَ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِداً وَصَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ وَاُوْلٰئِكَ شِرَارُ الْخَلْقِ عِنْدَ اللهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ. (آئندہ: ۴۳۴، ۱۳۴۱)

**ترجمہ** باب، ایام جاہلیت کے مشرکین کی قبروں کو اکھاڑ کران کی جگہ مسجد بنانے کے جواز کا بیان۔ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ نے یہودیوں کو اپنی رحمت سے دور فرمادیا کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنایا تھا، اور قبروں پر نماز کے مکروہ ہونے کا بیان۔ حضرت عمرؓ نے حضرت انس بن مالکؓ کو ایک قبر کے نزدیک نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ قبر سے بچیے، قبر سے بچیے، لیکن نماز کے دوبارہ پڑھنے کا حکم نہیں دیا۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ام حبیبہؓ اور حضرت ام سلمہؓ نے اس گرجا گھر کا تذکرہ کیا جس کو انہوں نے حبشہ میں دیکھا تھا، کہ اس میں تصویریں یعنی مجسمے رکھے ہوئے ہیں، ان دونوں نے جب یہ بات رسول اللہ ﷺ کے سامنے بیان کی تو آپ نے فرمایا کہ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان میں کسی نیک انسان کی وفات ہوتی تو یہ اس کی قبر پر مسجد تعمیر کرتے تھے اور اس میں یہ تصویریں بنادیتے تھے، یہ لوگ قیامت کے دن اللہ کے نزدیک بدترین مخلوق ہیں۔

**مقصد ترجمہ** مشرکین کا قبرستان ہو اور پھر کسی وقت وہاں مسجد تعمیر کرنے کا خیال پیدا ہو جائے تو کیا صورت اختیار کریں، قبروں کو باقی رکھیں اور مسجد تعمیر کرلیں، یا مشرکین کی ہڈیاں وغیرہ وہاں سے نکال کر جگہ کو صاف کرلیں اور پھر مسجد تعمیر کریں؟ امام بخاری یہ مسئلہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ مشرکین کی قبروں کو صاف کر کے مسجد تعمیر کرنا جائز ہے۔

یہ ترجمہ امام بخاری نے "هل تنبش الخ" بصیغۂ استفہام فرمایا ہے "هل" کو سوالیہ بھی قرار دیا جاسکتا ہے کہ آیا ایسا کرنا جائز ہے؟ جواب یہ ہے کہ روایات سے اس کا جواز ثابت ہے، اور یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ "هل" استفہام تقریری کے طور پر یا "قد" کے معنی میں استعمال ہوا ہے، ہر صورت میں مضمون یہی ہے کہ ایسا کرنا جائز اور ثابت ہے، لیکن امام بخاریؒ نے اس مضمون کے لیے جو دلیل پیش کی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہود پر اس لئے لعنت کی ہے کہ انہوں نے انبیاء کی قبروں کو مسجد بنالیا تھا، بظاہر دعوے اور دلیل میں مطابقت نہیں ہے، کیوں کہ دعویٰ تو یہ ہے کہ مشرکین کے قبرستان

پر قبروں کو صاف کر کے مسجد تعمیر کرنا درست ہے اور دلیل یہ ہے کہ انبیاء کی قبروں پر درست نہیں ہے، یا یوں کہیے کہ ترجمہ اور عنوان یہ ہے کہ خاص تصرف کے بعد مسجد بنا سکتے ہیں اور دلیل یہ ہے کہ قبرستان کو مسجد بنانے کی اجازت نہیں، اس اشکال کو شارحین اور علماء نے مختلف طریقوں سے حل کیا ہے۔

**علامہ کرمانیؒ کی رائے اور اس پر علامہ کشمیریؒ کا تبصرہ** علامہ کرمانیؒ جو بخاری کے مشہور شارح ہیں اور جن کی شرح سے حافظ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ دونوں نے کافی استفادہ کیا ہے، وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ جب لعنت صرف انبیاء کرام اور صالحین کی قبروں کو سجدہ گاہ اور مسجد بنانے کے ساتھ مخصوص ہے تو مشرکین کی قبروں کو صاف کرنے کے بعد ان کی جگہ مسجد بنانے کا جواز ثابت ہو گیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہود ونصاری نے انبیاء کرام کی قابل احترام قبروں کی اہانت کی اور اس اہانت کے سبب ان پر لعنت کی گئی، یہ بات مشرکین کی قبروں پر مسجد بنانے میں نہیں پائی جاتی، اس لیے ان پر مسجد بنانا جائز ہوگا، مگر حضرت علامہ کشمیری قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ یہ استدلال درست نہیں، کیوں کہ یہود ونصاری نے انبیاء کی قبروں کو صاف کر کے اور اس طرح پیغمبرانِ عالی مقام کی توہین کا ارتکاب کر کے مسجدیں تعمیر نہیں کی تھیں؛ بلکہ وہ انبیاء کرام کی قبروں کو ان کی اصل حالت پر باقی رکھتے ہوئے ان پر مسجد تعمیر کرتے تھے، اس لیے لعنت کا سبب توہین انبیاء نہیں، شرک فی العبادۃ ہے۔

**حافظ ابن حجرؒ کی رائے** اس کے بعد علامہ کشمیری قدس سرہٗ حافظ ابن حجرؒ کی رائے بیان فرماتے کہ اس میں قدرے اضافہ کر کے کرمانی کے استدلال کی کمزوری کی تلافی کر دی گئی ہے، حافظ فرماتے ہیں کہ یہود ونصاری کے حق میں وعید اور لعنت جس طرح ان لوگوں کو شامل ہے، جنھوں نے انبیاء کی قبروں کو تعظیم میں غلو کرتے ہوئے سجدہ گاہ بنالیا جس کے نتیجہ میں وہ انبیاء کو معبود سمجھنے لگے، اسی طرح یہ وعید ان لوگون کو بھی شامل ہے جو ان قبروں کی جگہ اس طرح مسجد تعمیر کریں کہ ان کے جسد اطہر کو قبر سے نکال دیں اور ہڈیاں پھینک دیں اور چونکہ یہ دونوں باتیں انبیاء اور ان کے متبعین ہی کے ساتھ خاص ہیں، کفار میں نہیں پائی جاتیں، اس لیے اگر کفار کی قبروں سے ہڈیاں نکال کر پھینک دی جائیں اور ان کی جگہ مسجد تعمیر کر لی جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

**حضرت گنگوہیؒ کا ارشاد** حافظ ابن حجرؒ کی رائے سے استدلال تو تام ہو گیا، لیکن امام بخاریؒ کے دعوی اور دلیل کی مطابقت میں حضرت گنگوہی قدس سرہ کا ارشاد اس سے زیادہ واضح اور مضبوط ہے، فرماتے ہیں کہ یہود پر لعنت کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو مسجود بنا کر بت پرستوں سے تشبہ اختیار کر لیا تھا، اس تشبہ سے بچنے کے لیے ضروری ہوگا کہ قبروں کو برابر کر کے تشبہ کی بنیاد کو ختم کر دیا جائے، البتہ قبروں کو مٹا کر برابر کرنے کی دو صورتیں ہیں: ایک یہ کہ قبر کی ہڈیاں نکال دی جائیں اور دوسرے یہ کہ قبر کو باقی رکھتے ہوئے اس کو زمین کی طرح ہموار کر دیا جائے، یہ دونوں باتیں انبیائے کرام کے حق میں جائز نہیں کہ اس سے توہین لازم آتی ہے، جب کہ

مشرکین کی قبروں کی ہڈیاں نکال کر صاف کر دینے میں اس طرح کی خرابی لازم نہیں آتی۔

**شیخ الاسلام دہلوی کی رائے** حضرت گنگوہیؒ علیہ الرحمہ کا یہ ارشاد شیخ الاسلام دہلوی کی رائے سے بہت قریب ہے، وہ کہتے ہیں کہ امام بخاریؒ کے دعوی اور دلیل میں مطابقت یہ ہے کہ یہود پر لعنت کا سبب یہ ہوا کہ انبیاء کی قبروں پر مسجد تعمیر کرنے کی دو صورتیں ہیں: یا تو قبروں کو اکھاڑ دیا جائے جس سے توہین لازم آتی ہے، یا قبروں کو باقی اور تعظیم میں غلو اختیار کرتے ہوئے انہیں مسجود بنالیا جائے اور یہ دونوں باتیں لعنت کا سبب ہیں، جب کہ مشرکین کی قبروں میں یہ دونوں باتیں نہیں، ان کی قبروں کو صاف کر کے مسجد بنانے میں ان کی تعظیم وتوقیر کا عمل نہیں بلکہ یہ تو سیئہ کو حسنہ سے تبدیل کرنے والا عمل ہے۔

**علامہ سندھیؒ کا ارشاد** علامہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ بخاری کا مقصد یہ ہے کہ اگر مشرکین کے مقبرے کو مسجد میں تبدیل کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو کیا یہ ضروری ہوگا کہ ان کی قبروں کو صاف کر کے اور ہڈیاں نکال کر مسجد بنائی جائے، تاکہ وہاں قبر باقی نہ رہے اور قبروں کو مسجد بنانے والوں کے حق میں وارد شدہ وعید کا مصداق نہ ہو، یا ایسا کرنا ضروری نہیں؟ بخاری نے یہود کے حق میں ذکر کردہ وعید نقل کر کے بتلا دیا کہ مشرکین کی قبروں کو ختم کر دینا ضروری ہوگا، اس لیے کہ حدیث پاک کا تقاضہ یہ ہے کہ قبروں کو مسجد نہیں بنایا جاسکتا، جب قبروں کو مسجد نہیں بنایا جاسکتا تو مشرکین کی ہڈیوں کو نکال کر صاف کر دینا ضروری ہوگا، تاکہ قبروں کو مسجد میں تبدیل کرنے کی وعید سے بچا جاسکے۔

**حضرت الاستاذؒ کی وضاحت** ان تمام ارشادات واقوال کے مطابق امام بخاری کے دعوے اور دلیل میں مطابقت ہو جاتی ہے، لیکن سب سے آسان اور عام فہم بات جو حضرت الاستاذ نے ارشاد فرمائی یہ ہے کہ بخاری کا دعوی یہ ہے کہ مشرکین کے قبرستان کو مسجد بنانا ہو تو قبروں کو صاف کر دینا ضروری ہوگا، کیوں کہ قبروں کو باقی رکھتے ہوئے مسجد کی تعمیر لعنت کا سبب ہے، یہود ونصاری پر لعنت کا سبب بھی یہ ہے کہ انہوں نے انبیاء کرام کی قبروں کو باقی رکھتے ہوئے ان کو مسجد بنالیا تھا، جب انبیاء کی قبروں کو باقی رکھتے ہوئے مسجد بنانا موجب لعنت ہے تو ظاہر ہے کہ قبور مشرکین کے ہوتے ہوئے مسجد بنانا بدرجہ اولی موجب لعنت ہوگا، اس طرح دعوی اور دلیل میں مطابقت بالکل واضح ہوگئی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ انبیاء کی قبروں کو کھود کر صاف کرنا حرام اور سخت توہین کا باعث ہے، اس لیے ان کی قبروں کی جگہ پر مسجد تعمیر کرنا کسی بھی حال میں جائز نہ ہوگا۔ برخلاف مشرکین کی قبروں کے کہ شرعاً ان کا کوئی احترام نہیں ہے، اس لیے ان کی قبروں کی جگہ مسجد تعمیر کرنی ہو تو ضروری ہوگا کہ قبروں کو اکھاڑ کر ہڈیاں الگ کردی جائیں اور جب زمین صاف ہو جائے تو وہاں مسجد بنائی جائے۔

**مسلمانوں کے قبرستان کو مسجد میں تبدیل کرنے کا حکم** یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انبیاء کرامؑ کی قبروں کو مسجد میں تبدیل کرنا کسی حال میں جائز نہیں اور صالحین کی

قبروں کا بھی یہی حکم ہے اور مشرکین کی قبروں کو صاف کر کے مسجد بنانا جائز ہے۔

رہا عام مسلمانوں کے قبرستان کا معاملہ، تو اس سلسلے میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ پرانے قبرستان (قبور عادیہ) پر مسجد تعمیر کرنے کی اجازت ہے اور ان کی حد راجح قول کے مطابق چالیس سال مقرر کی گئی ہے، یعنی اگر قبرستان میں چالیس سال سے تدفین نہیں ہو رہی ہے اور وہاں مسجد بنانے کی ضرورت پیش آجائے تو چوں کہ وہاں کچھ باقی نہیں رہتا اس لیے مسجد تعمیر کرنے کی اجازت ہے۔ اور اگر ایسی صورت ہو کہ جہاں مسجد تعمیر کی جارہی ہے وہاں قبر آگئی تو فقہاء نے اس کی صورت یہ لکھی ہے کہ قبر کو کھود کر صاف بھی نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ وہ مومن ہونے کے سبب قابل احترام ہے۔ اور میت کی ہڈیوں کو توڑنے کی ممانعت بھی ہے، حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سے روایت ہے: ''کسر عظم المیت ککسرہ حیًا'' (ابن ماجہ کتاب الجنائز) میت کی ہڈیوں کو توڑنا، زندہ کی ہڈیوں کو توڑنے کی طرح ممنوع ہے۔

اس لیے اگر تازہ قبر آجائے تو اس کی صورت یہ کی جائے گی کہ نشان تو نہ رکھا جائے گا کہ اس کی ممانعت ہے، البتہ قبر کے اوپر ڈاٹ لگا کر قبر کو وہیں محفوظ کر دیا جائے گا اور اوپر صحن وغیرہ پھیلا دیا جائے گا اس طرح کوئی خرابی نہ آئے گی۔

## قبرستان میں نماز پڑھنے کا حکم

یہ امام بخاری کے ترجمۃ الباب کا دوسرا جز ہے ''وما یکرہ من الصّلوۃ فی القبور الخ'' کہ قبروں کے پاس نماز پڑھنا مکروہ ہے، امام بخاری نے استدلال یہ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے حضرت انسؓ کو دیکھا کہ قبر کے قریب نماز پڑھ رہے ہیں، حضرت انسؓ کو معلوم نہ ہوگا کہ یہاں قبر ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا ''القبر'' یعنی قبر سے بچ کر نماز پڑھو، مگر اعادہ کا حکم نہیں دیا، معلوم ہوا کہ نماز تو ہو جائے گی، مگر مکروہ ہوگی، لیکن اس مسئلہ میں بھی فقہاء کرام کا اپنے اپنے اجتہاد کے مطابق اختلاف رائے ہے، امام احمد بن حنبلؒ نے قبرستان میں نماز پڑھنے کو مطلقاً حرام قرار دیا ہے، وہ اس میں تفصیل نہیں فرماتے کہ قبروں کے درمیان ہو یا قبروں سے بچ کر کوئی جگہ چبوترے کی صورت میں اونچی کر کے یا مستقل بنالی گئی ہو، زمین پر نجاست کا اثر ہو یا نہ ہو، امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک ہر صورت میں نماز حرام ہے، امام ابو ثورؒ بھی اسی کے قائل ہیں کہ حمام اور مقبرہ دونوں جگہ نماز نہیں پڑھی جائے گی، اصحاب ظواہر بھی حرمت کے قائل ہیں، ان حضرات کا عمل اس روایت کے ظاہری معنی پر ہے، جس میں آیا ہے: ''الارض کلها مسجد الا المقبرۃ والحمام'' (ابوداؤد، ترمذی) پوری سرزمین سجدہ گاہ یعنی نماز کی جگہ ہے علاوہ مقبرہ اور حمام کے۔

امام شافعیؒ نے تفصیل فرمائی ہے کہ اگر قبرستان میں قبروں کو اکھاڑا گیا ہے اور مردوں کے جسم کی ناپاکی مٹی سے ملی ہوئی ہے تو نماز نجاست کے سبب درست نہیں، لیکن اگر ایسا نہیں ہے، یا وہاں کوئی پاک جگہ ہے تو ان کے نزدیک نماز کی اجازت ہے۔ امام مالکؒ سے اس مسئلہ میں دو قول منقول ہیں: ایک یہ کہ قبرستان میں نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور دوسرا قول جمہور کے مطابق ہے کہ نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

امام ابوحنیفہؒ، امام اوزاعیؒ اور امام ثوریؒ سے قبرستان میں نماز پڑھنے کی کراہت منقول ہے، مگر اس میں فقہاء

احناف نے تفصیل کی ہے کہ قبر کے اوپر نماز پڑھنا، یا قبر کے سامنے کھڑے ہوکر نماز پڑھنا یا قبر کو داہنی یا بائیں طرف لے کر نماز پڑھنا مکروہ ہے، کیوں کہ پہلی صورت میں قبر کی توہین ہے، دوسری میں تشبہ بالاصنام ہے اور تیسری صورت میں بے جا تعظیم ہے، جس کی اجازت نہیں؛ لیکن اگر قبر کو پشت کی جانب لے کر نماز پڑھی جائے، یا نمازی اور قبر کے درمیان کوئی چیز حائل ہو، یا قبروں سے بچ کر نماز کے لیے کوئی چبوترہ وغیرہ بنایا گیا ہو تو وہاں نماز پڑھنا بلا کراہت درست ہے۔

## صالحین کے مزار کے قریب مسجد کی تعمیر

رہا یہ کہ صالحین کے مزار کے قریب مسجد تعمیر کرنے کا کیا حکم ہے تو علامہ عینیؒ نے ارشاد فرمایا کہ اگر کسی صالح انسان کی قبر کے قریب مسجد اس طرح تعمیر کرلی جائے کہ قبر مسجد سے بالکل باہر اور علیحدہ ہو، قرب سے مقصود صرف برکت کا حصول ہو، نماز میں صاحب قبر کی تعظیم یا ان کی جانب توجہ پیش نظر نہ ہو تو اس میں مضائقہ نہیں، حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ کسی مرد صالح کی قبر کے قریب مندرجہ بالا تفصیل کے ساتھ مسجد تعمیر کرنا وعید میں شامل نہیں ہے، ملا علی قاری نے بھی یہی لکھا ہے اور اسی طرح کے الفاظ قریب قریب تمام ہی علماء نے استعمال کیے ہیں، ملا علی قاری کے الفاظ یہ ہیں: ''واما من اتخذ مسجدا فی جوار صالح او صلی فی مقبرة وقصد الاستظهار بروحه او وصول اثر ما من اثر عبادته الیه لا للتعظیم له والتوجه نحوه فلا حرج علیه'' (مرقاة ص:۴۵۶/ ج:۱)

رہا یہ کہ اگر کوئی صالحین میں سے کسی کے مزار کے قریب مسجد بنالے یا مقبرہ میں نماز پڑھ لے اور ان کی روح سے تقویت یا ان کی عبادت کے اثرات سے مستفید ہونے کا ارادہ ہو، نماز میں ان کی تعظیم یا ان کی طرف توجہ کی نیت نہ ہو تو اس میں تنگی نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ صالحین کے مزارات کے قریب مساجد کی تعمیر میں مضائقہ نہیں۔

## تشریح حدیث

حضرت ام حبیبہؓ نے اپنے شوہر حضرت عبداللہؓ بن جحش کے ہمراہ اور حضرت ام سلمہؓ نے اپنے شوہر حضرت ابوسلمہؓ کے ساتھ حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی، عبداللہ بن جحش کا حبشہ ہی میں انتقال ہوگیا، تو عدت کے بعد نجاشی نے رسول اللہ ﷺ کی جانب سے ان کا مہر ادا کرکے ان کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے کردیا اور آپ کو اطلاع دیدی، آپ ﷺ نے قبول فرمالیا، حضرت ام سلمہؓ کے شوہر ابوسلمہؓ کا مدینہ طیبہ واپسی کے بعد انتقال ہوا، پھر آپ ﷺ نے ان سے نکاح کرلیا، غرض یہ دونوں ہی ازواج مطہرات حبشہ رہ آئی تھیں، انہوں نے مرض الوفات میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے حبشہ کے ایک گرجا گھر کا تذکرہ کیا، دوسری روایات میں آتا ہے کہ اس گرجا گھر کا نام ''ماریہ'' تھا، انہوں نے بتلایا کہ اس گرجا میں تصویریں رکھی ہوئی تھیں، حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ان کی اصل یہ ہے کہ ان لوگوں کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی مرد صالح وفات پاجاتا تو اس کی قبر پر یہ لوگ مجسمہ قائم کردیا کرتے تھے، شاید ابتدائی طور پر مقصد یہ رہا ہو کہ متوفی کے متعلقین اور عقیدت مندوں کو اسے دیکھ کر تسکین حاصل ہو اور وہ اس کے طریق کار پر عمل پیرا رہیں، پھر یہ ہوا کہ مجسمہ قائم کرنے والوں کا مقصد اصلی بعد میں آنے والوں کی نگاہوں سے اوجھل ہوگیا اور شیطان کو رہزنی کا موقع

مل گیا، اس نے دھوکا دیا کہ یہ مجسمے تمہارے باپ دادا نے پوجا کے لیے بنائے تھے، چنانچہ ان کی پرستش شروع ہوگئی۔

حضور اکرم ﷺ نے فرمایا کہ یہ لوگ قیامت کے دن بدترین مخلوق ہوں گے کہ انہوں نے ایک رسم بدقائم کی، مرض الوفات میں آپ کی جانب سے اس ہدایت کا یہ مفہوم ہے کہ آپ کے بعد آپ کے مزار کے ساتھ ایسا نہ کیا جائے، چنانچہ الحمدللہ آپ کی امت اس پر قائم ہے۔

روایت میں قبروں کو سجدہ گاہ بنانے، تصویریں بنانے، مجسمے قائم کرنے کی نہایت تاکید کے ساتھ ممانعت آ گئی اور چونکہ یہ حکم رسول ﷺ کی زندگی کے آخری ایام کا ہے، اس لیے کسی بھی ذی روح کی تصویر کھینچنا یا مجسمے بنانا قطعاً حرام قرار دیا گیا ہے۔

(۴۲۸) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنْ اَبِی التَّیَّاحِ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ قَدِمَ النَّبِیُّ ﷺ الْمَدِیْنَةَ فَنزلَ أعلیٰ المدینةِ فِیْ حَیٍّ یُقالُ لَهُمْ بنو عَمرِوبْنِ عَوْفٍ فَاَقَامَ النَّبِیُّ ﷺ فِیْهِمْ اَرْبَعاً وَّعِشْرِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اَرسَلَ اِلٰی بَنِی النَّجَّارِ فَجَاؤوا مُتَقَلِّدِیْنَ السُّیُوفَ فَکَاَنِّیْ اَنْظُرُ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ عَلٰی رَاحِلَتِهٖ وَاَبُوْبَکْرٍ رِدْفُهٗ وَمَلَأُ بَنِی النَّجَّارِ حَوْلَهٗ حَتّٰی اَلْقٰی بِفَنَاءِ اَبِیْ اَیُّوْبَ وَکَانَ یُحِبُّ اَنْ یُصَلِّیَ حَیْثُ اَدْرَکَتْهُ الصَّلٰوةُ وَیُصَلِّی فِیْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ وَاِنَّهٗ اَمَرَ بِبِنَاءِ الْمَسْجِدِ فَاَرْسَلَ اِلٰی مَلَأِ بَنِی النَّجَّارِ فَقَالَ یَابَنِی النَّجَّارِ ثَامِنُوْنِیْ بِحَائِطِکُمْ هٰذا قَالُوا لَاوَاللهِ لَانَطْلُبُ ثَمَنَهٗ اِلَّا اِلَی اللهِ عَزَّوَجَلَّ قَالَ اَنَسٌ فَکَانَ فِیْهِ مَااَقُوْلُ لَکُمْ قُبُوْرُ الْمُشْرِکِیْنَ وَفِیْهِ خَرِبٌ وَفِیْهِ نَخْلٌ فَاَمَرَالنَّبِیُّ ﷺ بِقُبُوْرِالْمُشْرِکِیْنَ فَنُبِشَتْ ثُمَّ بِالْخَرِبِ فَسُوِّیَتْ وَبِالنَّخْلِ فَقُطِعَ فَصَفُّوْا النَّخلَ قِبْلَةَ الْمَسْجِدِ وَجَعَلُوْا عِضَادَتَیْهِ الْحِجَارَةَ وَجَعَلُوْا یَنْقُلُوْنَ الصَّخْرَ وَهُمْ یَرْتَجِزُوْنَ وَالنَّبِیُّ ﷺ مَعَهُمْ وَهُوَ یَقُوْلُ:

اَللّٰهُمَّ لَاخَیْرَ اِلَّا خَیْرُ الْاٰخِرَةِ ☆ فَاغْفِرِالْاَنْصَارَ وَالْمُهَاجِرَه. (گذشتہ: ۲۳۴)

**ترجمہ** انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے اور آپ نے مدینہ کے بالائی علاقہ میں ایک قبیلے میں جنھیں بنوعمرو بن عوف کہا جاتا تھا تشریف ارزانی کی، وہاں آپ نے چوبیس یوم تک قیام فرمایا پھر آپ نے بنوالنجار کے پاس (بلوانے کے لئے) پیغام بھیجا تو وہ تلواریں حمائل کئے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے، (آپ ان کے ساتھ روانہ ہوئے) پس گویا کہ میں حضور ﷺ کو آپ کی سواری پر دیکھ رہا ہوں، جب کہ ابوبکر صدیقؓ آپ کے پیچھے سوار ہیں، اور قبیلہ بنونجار چاروں طرف سے آپ کو گھیر ہوئے ہے حتی کہ آپ نے سامان ابوایوب انصاریؓ کے صحن میں اتار دیا اور آپ کا دستور یہ تھا کہ جہاں نماز کا وقت ہو جاتا وہیں نماز پڑھ لیتے تھے، آپ

بکریوں کے بیٹھنے کی جگہ میں بھی نماز پڑھ لیتے تھے اور یہ کہ آپ نے مسجد کی تعمیر کا حکم دیدیا اور بنونجار کی جماعت کو بلوایا اوران سے فرمایا کہ اے بنونجار! تم مجھ سے اپنے اس باغ کی قیمت لے لو، ان لوگوں نے کہا کہ بخدا ہم اس کی قیمت اللہ کے علاوہ کسی سے طلب نہ کریں گے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں بتلاتا ہوں کہ اس میں مشرکین کی قبریں تھیں کچھ کھنڈرات تھے اور کچھ کھجور کے درخت تھے، پھر حضور ﷺ نے مشرکین کی قبروں کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں اکھاڑ دیا جائے، ویران حصے کے بارے میں حکم دیا کہ اسے ہموار کردیا جائے اور درختوں کے بارے میں حکم دیا کہ انہیں کاٹ دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، پھران کھجوروں کو مسجد کے قبلہ کی سمت میں (ستون کی جگہ) برابر برابر کھڑا کردیا گیا، ان کے دائیں بائیں بازوؤں کی جگہ (یعنی دوستونوں کے درمیانی خلا میں) پتھر لگادئے گئے اور لوگ رجز پڑھتے ہوئے پتھر اٹھا کرلانے لگے، خود حضور ﷺ بھی ان کے ساتھ رہے اور آپ اس وقت یہ رجز پڑھتے تھے، اے اللہ! کوئی خیر آخرت کی خیر کے علاوہ نہیں ہے۔ اس لیے انصار اور مہاجرین کی مغفرت فرمادے۔

**تشریح حدیث** ہجرت کا واقعہ مختصر طور پر بیان فرماتے ہیں کہ جب رسول اکرم ﷺ نے ہجرت فرمائی تو سیدھے شہر مدینہ میں تشریف نہیں لے گئے، بلکہ آپ پہلے اعلائے مدینہ میں جہاں بنوعمرو بن عوف آباد تھے، قیام پذیر رہے، مراد ہے قباء جہاں اسی قیام کے دوران آپ ﷺ نے مسجد قبا تعمیر فرمائی اور جس میں ہر ہفتہ آپ کے تشریف لے جانے کا معمول تھا، اس جگہ آپ کا قیام ۲۴ روز رہا، بخاری کی بعض روایات میں ۱۴ دن قیام کا تذکرہ ہے، جس دن آپ نے قباء میں نزول اجلال فرمایا، راجح قول کے مطابق پیر کا دن تھا اور ربیع الاول کی ۸ تاریخ تھی، قباء میں قیام کے دوران ۱۴ دن کے اندر دو جمعہ اور ۲۴ روز قیام کی روایت کے مطابق تین جمعہ آئے، لیکن حضور ﷺ نے جمعہ ادا نہیں فرمایا، حالانکہ مکہ میں جمعہ کی فرضیت ہوچکی تھی، پہلا جمعہ آپ نے قباء سے روانہ ہونے کے بعد محلّہ بنوسالم میں پڑھا۔

**مدینہ طیبہ کے لیے روانگی** "ثم ارسل الی بنی النجار الخ" پھر آپ نے بنونجار کے پاس جو آپ کے ننھیالی رشتہ دار تھے اطلاع بھیجی کہ ہم مدینہ طیبہ آرہے ہیں، بنونجار حضور ﷺ کے استقبال کے لئے اس شان سے حاضر ہوئے کہ تلواروں اور نیزوں کے ساتھ استقبال کیا جائے، آپؐ نے حضرت صدیق اکبرؓ کو ان کی عزت افزائی کے لیے پیچھے بٹھا رکھا تھا، حالانکہ حضرت صدیق اکبرؓ کے پاس سواری الگ موجود تھی۔ آپ اس شان سے روانہ ہوئے کہ صدیق اکبر ہم رکاب ہیں اور قبیلہ بنونجار کے سردار آپ کے اردگرد چل رہے ہیں، راستے میں جتنے قبائل آتے رہے، ان میں سے ہر ایک نے یہ خواہش ظاہر کی کہ آپ ہمارے یہاں تشریف فرما ہوں اور خدمت کا موقع دیں، مگر آپ ان حضرات کو دعا دیتے اور فرماتے کہ ناقہ یعنی آپ کی سواری منجانب اللہ مامور ہے، جہاں اس کو حکم ہوگا وہیں یہ بیٹھے گی، یہاں تک کہ ناقہ ابوایوبؓ انصاری کے مکان کے سامنے بیٹھ گئی، ایک روایت میں ہے کہ ناقہ پھر کھڑی ہوئی اور مسجد کی تعمیر کے پاس گئی، مگر پھر لوٹی اور آکر وہیں بیٹھ گئی، آپ نے وہاں سامان اتروایا، پھر نبی کریم ﷺ

نے ان کے مکان میں چھ مہینہ قیام فرمایا۔

**حضرت ابوایوبؓ کے گھر کی تاریخی اہمیت**

تاریخ وسیر کی کتابوں میں یہ ہے کہ حضرت ابوایوب انصاریؓ کا یہ مکان جس میں آپ نے قیام فرمایا، یمن کے بادشاہ تبّع اول نے حضور علیہ السلام ہی کے نام سے تعمیر کرایا تھا، جس کو ایک ہزار سال گزر چکے تھے، تبّع اول نے ایک ہزار سال پہلے ادھر کا سفر کیا تھا، مکہ معظمہ میں اس نے بیت اللہ پر غلاف چڑھایا، جب وہ مدینہ طیبہ پہنچا تو اس کے ساتھ چار سو علماء تھے، جب یہ علماء مدینہ پہنچے تو انہوں نے تبّع سے درخواست کی کہ انہیں قیام کی اجازت دی جائے، اس نے وجہ دریافت کی تو ان علماء نے بتلایا کہ ہم انبیاء علیہم السلام کے صحیفوں میں یہ لکھا ہوا پاتے ہیں کہ نبی آخر الزماں جن کا نام محمد ہوگا، یہ سرزمین ان کا دار الہجرت ہوگی، ہم یہاں قیام کر کے ان کا انتظار کرنا چاہتے ہیں، اگر ہماری زندگی میں ایسا ہوگیا تو زہے قسمت! ورنہ ہم آپ علیہ السلام کے بارے میں اپنی اولاد کو وصیت کر دیں گے، کہا جاتا ہے کہ وہ علماء اوس وخزرج کے آباء واجداد تھے، تبّع نے نہ صرف یہ کہ ان علماء کو یہاں قیام کی اجازت دی، بلکہ وہ خود بھی یہاں کچھ دنوں کے لیے قیام پذیر رہا اور اس نے ہر عالم کے لیے مستقل ایک مکان تعمیر کرایا، ان کے نکاح کا انتظام کیا اور ان کو بیش قیمت اموال عطاء کیے، علماء کے مکانات کے علاوہ اس نے ایک مکان خاص رسول اللہ علیہ السلام کے لیے تیار کرایا کہ جب نبی آخر الزماں مدینہ میں منتقل ہوں تو وہ اس مکان میں قیام فرمائیں، اور آپؐ کے نام اس نے ایک تحریر لکھی جس میں اپنے اسلام اور ملاقات کے اشتیاق کا اظہار تھا، یہ تحریر اس نے ان علماء میں سے ایک بڑے عالم کے سپرد کی کہ اگر آپ نبی آخر الزماں کا زمانہ پائیں تو میری یہ تحریر آپ کی خدمت میں پیش کر دینا، ورنہ میری یہ تحریر اپنی اولاد کے سپرد کر کے انہیں یہی وصیت کرنا جو میں تم کو کر رہا ہوں، کہتے ہیں کہ حضرت ابوایوبؓ انصاری اسی بڑے عالم کی اولاد میں تھے اور انھوں نے تبّع کی وہ تحریر آپ کی خدمت میں پیش کی تھی، جو ان کے پاس نسلاً بعد نسل وصیت کے طور پر منتقل ہوتی ہوئی پہنچی تھی۔

**مسجد نبوی کی تعمیر**

بہرحال حضرت ابوایوبؓ انصاری کے گھر پر ناقہ بیٹھ گئی، روایت میں آیا کہ اس سفر میں جس جگہ بھی نماز کا وقت ہو جاتا تھا آپ وہیں نماز پڑھ لیتے تھے اور بکریوں کے باڑے میں بھی پڑھ لیتے تھے، مدینہ طیبہ پہنچنے کے چھ مہینے کے بعد آپ نے ۱ھ میں مسجد کی تعمیر کا ارادہ فرمایا تو نظر انتخاب اس جگہ پر پڑی جہاں آپ کی ناقہ آ کر بیٹھ گئی تھی، جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دو یتیموں کا مربد یعنی کھجور خشک کرنے کا میدان تھا، اس روایت میں آ رہا ہے کہ وہ بنو النجار کا ایک باغ تھا، آپ علیہ السلام نے بنو نجار کے ذمہ داروں کو بلایا اور ان سے اس جگہ کو خریدنے کی بات کی، یہ دونوں یتیم سہل اور سہیل چونکہ قبیلۂ بنو نجار کے تھے، اور اسعد بن زرارہ یا معاذ بن عفراء کی زیر تربیت تھے، جن سے بلا کر بات کی گئی، اس لیے ان دونوں باتوں میں تضاد نہیں ہے، ان حضرات نے قیمت لینے سے انکار کیا کہ ہم اس کی قیمت صرف اللہ سے لیں گے، لیکن وہ چونکہ یتیموں کی جائیداد تھی، اس لیے قیمت ادا کی گئی، زہری کہتے ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ صدیق کو قیمت ادا کرنے کا حکم دیا، بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس کی قیمت دس دینار ادا کی۔

### مسجد نبوی کی جگہ پہلے کیا تھا؟

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ میں تم کو بتلاتا ہوں کہ اس باغ میں کیا کیا تھا؟ اس میں مشرکین کی قبریں تھیں، جگہ جگہ کھنڈر یا گڑھے تھے، کچھ کھجور کے درخت تھے، پھر آپ کے حکم سے ان قبروں کو اکھاڑ دیا گیا، بعض روایات میں آتا ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے مشرکین کی قبروں کی کھدائی کرانے کے بعد ان کے اندر پانی چھڑکوایا تاکہ تطہیر کی ظاہری صورت کے ساتھ عذاب خداوندی کی گرمی کو ٹھنڈا کیا جائے، کھنڈرات کے حصوں کو ہموار کیا گیا اور درختوں کو کاٹ دیا گیا، پھر وہ درخت قبلہ کی سمت کے ستونوں میں کام آئے اور ان ستونوں کے درمیان کی جگہ کو پتھروں سے پر کیا گیا۔

حضرت انسؓ نے " فصفوا النخل قبلة المسجد وجعلو اعضادتيه الحجارة " فرمایا ہے جس کا مطلب بعض شارحین نے یہ سمجھا کہ دیوار تو مٹی اور گارے ہی سے تیار کی گئی، البتہ ستون کی جگہ کھجوروں کو استعمال کیا گیا، کسی نے یہ سمجھا ہے کہ سمت قبلہ میں مسقّف حصہ کے ستونوں کی جگہ کھجور کے تنے استعمال کئے گئے، لیکن حضرت انسؓ کے ارشاد کا حاصل ہمارے نزدیک یہ ہے کہ دیوار قبلہ میں ستون کی جگہ کھجور کے تنے استعمال کئے گئے اور ان تنوں کے درمیانی خلا کو پتھروں سے پر کیا گیا۔ "عضادتیہ" کی ضمیر نخل کی طرف لوٹ رہی ہے، اور عضادۃ کا ترجمہ جہاں بازو اور دروازے کی چوکھٹ وغیرہ آتا ہے، وہاں اس کا ترجمہ "مايشد او يسد جوانب الشئی" یعنی جو کسی چیز کے جانبین کو پر یا مضبوط کرے، بھی آتا ہے، یہاں یہی مراد ہے کہ نخل کے تنوں کی دونوں جانب کو یعنی درمیانی خلا کو پتھروں سے پر کیا گیا۔

### رجز شعر ہے یا نہیں؟

یہ پتھر چونکہ دور سے لائے جارہے تھے، اس لیے بوجھ میں تخفیف پیدا کرنے کے لیے زبانوں پر رجز جاری تھا، رجز کلام موزوں کی ایک قسم ہے اور اس میں اختلاف ہے کہ یہ شعر ہے یا نہیں؟ عام علماء عروض اور اہل ادب کی رائے یہ ہے کہ یہ شعر نہیں ہے، اختلاف کی وجہ یہ ہوئی کہ رجز حضور اکرم ﷺ سے ثابت ہے، جب کہ شعر کہنے کی نص قرآنی میں حضور ﷺ سے نفی کی گئی ہے "وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْبَغِىْ لَهٗ" کہ نہ ہم نے آپ کو شعر کی تعلیم دی اور نہ یہ آپ ﷺ کی ذات کے شایان شان ہے، اس لئے آپ کی جانب سے رجز کا ثبوت اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شعر کی اقسام میں سے نہیں ہے۔ اور جن حضرات نے رجز کو شعر کی قسم قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ شعر وہ کلام موزوں ہے جس میں قصد وارادہ کا دخل ہو اور حضور پاک ﷺ سے رجز کے طور پر جو ثابت ہے اس میں آپ کے قصد وارادہ کا دخل نہیں ہے، اس لیے وہ شعر کی تعریف میں نہیں آتا۔

بہر حال دور سے پتھر لانے کے سبب زبانوں پر رجزیہ بند جاری تھے، یہ انسان کی طبیعت ہے کہ وہ بھاری چیز اٹھاتے ہوئے یا تسلسل کے ساتھ محنت کا کام کرتے ہوئے، سانس وغیرہ کو درست کرنے کے لیے، ہمت بڑھانے اور

نشاط کی تجدید کرنے کے لیے ایسا کرتا ہے، چھپر چڑھاتے وقت یا ریل کی لائن بچھاتے وقت ایسا ہوتا ہے، بس فرق یہ ہے کہ عام انسانوں کے رجز یہ کلمات چند فقروں کی تک بندی پر مشتمل ہوتے ہیں، اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نیز سرکار دو عالم ﷺ کے رجز یہ کلمات میں بھی ذکر خداوندی، تذکرۂ آخرت اور دعائے مغفرت کے علاوہ کوئی مضمون نہیں ہے۔

**قبرستان وقف نہ ہوتو تصرف کا جواز** حدیث پاک سے معلوم ہوا کہ مسجد نبوی جس جگہ تعمیر کی گئی ہے وہاں پہلے مشرکین کا قبرستان تھا، مگر یہ قبرستان بنو نجار کی ملکیت تھا، رسول اکرم ﷺ نے اس کو خریدنے کی خواہش ظاہر کی، ابتداءً ان حضرات نے قیمت لینے سے انکار کیا یعنی کہ اس کو ہبہ کرنا چاہا، لیکن راجح قول یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ سے اس کی قیمت ادا کرا دی، معلوم ہوا کہ قبرستان اگر وقف نہ ہو، بلکہ کسی کی ملکیت ہو تو اس کو فروخت یا ہبہ کیا جا سکتا ہے، البتہ اگر وقف ہو تو اس کی بیع یا ہبہ کی اجازت نہیں ہے۔

## [۴۹] بَابُ الصَّلٰوةِ فِيْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ

(۴۲۹) حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ اَبِي التَّيَّاحِ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي فِيْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ ثُمَّ سَمِعْتُهُ بَعْدُ يَقُوْلُ كَانَ يُصَلِّي فِيْ مَرَابِضِ الْغَنَمِ قَبْلَ اَنْ يُبْنَى الْمَسْجِدُ. (گذشتہ: ۲۳۴)

**ترجمہ** باب، بکریوں کے باڑے میں نماز کا جواز۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھتے تھے، پھر میں نے اس کے بعد انہیں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ بکریوں کے باڑے میں مسجد نبوی کی تعمیر سے پہلے نماز پڑھتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** "مرابض" مربض کی جمع ہے، جس جگہ رات کے وقت بکریاں باندھی جاتی ہیں اس کو مرابض کہتے ہیں اس کا ترجمہ ہے "باڑا" اور جہاں بکریوں سے بڑے جانور یعنی گائے بیل اونٹ وغیرہ رات کے وقت باندھے جاتے ہیں یا رکھے جاتے ہیں اس کو اردو میں "سال" کہتے ہیں، مسئلہ یہ ہے کہ بکریوں کے باڑے یا گائے بیل اونٹ کی سال میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ اس ترجمہ میں امام بخاری واضح فرما رہے ہیں کہ اس امت کی خصوصیات میں یہ ہے کہ ان کی نماز کے لیے کسی مکان کی قید نہیں، امم سابقہ کے مقابلہ پر انہیں یہ امتیاز عطا کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "**جعلت لی الارض مسجدا وطهورا**" (رواہ مسلم) میرے لیے پوری زمین سجدہ گاہ اور ذریعۂ طہارت بنا دی گئی۔

یعنی بکریوں کا باڑا ہو یا اونٹ کی سال ہو "**جعلت لی الارض مسجدا**" کے عموم میں یہ بھی شامل ہیں اور ان تمام جگہوں پر نماز پڑھنا درست ہے، بکریوں کے قریب کھڑے ہونے یا بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے سے کسی

قسم کا نقصان واقع نہیں ہوتا۔

البتہ یہ ضرور ہے کہ اگر بکریوں کے باڑے اور اونٹوں کی سال کے علاوہ کوئی اور مناسب جگہ نماز کے لیے مہیا نہ ہو تو اونٹوں کی سال کے مقابلہ پر بکریوں کے باڑے کو ترجیح دی جائے گی، کیوں بکریوں کے باڑوں میں زمین کو عموماً نرم اور ہموار رکھا جاتا ہے، ان میں صفائی کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے، اور بکریوں کے قریب نماز پڑھنے سے نمازی کو کوئی خطرہ یا تشویش لاحق نہیں ہوتی۔ ابوداؤد میں موجود ہے کہ حضور ﷺ نے بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا: ''صلوا فیھا فانھا برکۃ'' (رواہ ابوداؤد) بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھو کہ بکری میں اللہ نے برکت دی ہے، جب کہ اونٹوں کی جگہ سنگلاخ اور ناہموار ہوتی ہے، وہاں صفائی کا اہتمام نہیں ہوتا، اور اونٹ میں طبعی طور پر شرارت ہوتی ہے، ابن ماجہ میں روایت ہے: **''عن عبداللہ بن مغفل المزنی قال قال رسول اللہ ﷺ صلّوا فی مرابض الغنم ولا تصلّوا فی اعطان الابل فانھا خلقت من الشیاطین''.** (رواہ ابن ماجہ ص ۵۶)

عبداللہ بن مغفل مزنیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لو اور اونٹ کی سال میں نماز نہ پڑھو، کیوں کہ اونٹ کی تخلیق شیاطین سے ہوئی ہے۔

اونٹ کی اس طبعی شیطنت کی بنیاد پر نمازی کو اس کے قریب اطمینان نصیب نہیں ہو سکے گا، بس یہی وجہ ہے کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنا اونٹ کی سال سے بہتر ہے ورنہ جہاں تک جواز کا تعلق ہے تو وہ دونوں جگہ پایا جاتا ہے کہ اس امت محمدیہ کے لیے پوراروئے زمین مصلّٰی اور نماز کی جگہ بنا دیا گیا ہے۔

## تشریح حدیث

روایت میں آیا کہ رسول اکرم ﷺ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھ لیتے تھے، پھر یہ وضاحت آئی کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنے کا یہ عمل مسجد نبوی کی تعمیر سے پہلے تھا، مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد آپ کا معمول مسجد میں نماز پڑھنے کا رہا، اس سے بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ بکریوں کے باڑے میں نماز پڑھنا مطلوب نہیں ہے، بلکہ ایسا **''جعلت لی الارض مسجدا''** کے عموم کی عملی وضاحت کے طور پر کیا گیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم ﷺ کے پانچ امتیازات بیان کرتے ہوئے فرمایا: **''وجعلت لی الارض مسجداً وطھورا فایما رجل من امتی ادرکتہ الصلوۃ فلیصل''** ۔ (مشکوۃ ص ۵۱۲) پوری زمین کو میرے لیے نماز کی جگہ اور طہارت کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے، میری امت میں سے جس کو بھی جہاں نماز کا وقت آجائے نماز پڑھ لینی چاہئے۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ کسی بھی جگہ نماز پڑھنے کے امتیازی وصف کی تفصیل میں بکریوں کے باڑے میں پڑھی جانے والی نماز بھی شامل ہے، اس کا تعلق ماکول اللحم جانوروں کے پیشاب کی طہارت ونجاست سے براہ راست نہیں ہے۔　　　واللہ اعلم

## [۵۰] بَابُ الصَّلٰوةِ فِيْ مَوَاضِعِ الْإِبْلِ

(۴۳۰) حَدَّثَنَا صَدَقَةُ بْنُ الْفَضْلِ قَالَ حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَيَّانَ قَالَ حَدَّثَنَا عُبَيْدُ اللّٰهِ بْنُ نَافِعٍ قَالَ رَأَيْتُ ابْنَ عُمَرَ يُصَلِّيْ اِلٰى بَعِيْرِهٖ وَقَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَفْعَلُهٗ. (آئندہ: نمبر ۵۰)

**ترجمہ** باب، اونٹ کی جگہوں میں نماز پڑھنے کا بیان۔ حضرت نافع سے روایت ہے کہ میں نے حضرت ابن عمرؓ کو اپنے اونٹ کی طرف نماز پڑھتے ہوئے دیکھا اور ابن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول پاک ﷺ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

**مقصد ترجمہ اور الفاظ میں ادب کی رعایت** روایت میں اونٹ کی سال میں نماز پڑھنے سے جو ممانعت فرمائی گئی ہے ان میں کہیں "مَبَارِكْ" کا لفظ ہے اور کہیں "مواطِنْ" کا اور کہیں "مَعَاطِنْ" کا، اس لیے امام بخاریؒ نے بیان جواز کے لیے جو ترجمہ منعقد فرمایا تو ان الفاظ میں سے کوئی لفظ اختیار نہیں کیا بلکہ "مَوَاضِع" کا لفظ استعمال کیا، تا کہ حدیث پاک کے الفاظ سے تقابل نہ ہو جائے۔ یہ امام بخاریؒ کی احتیاط اور ان کا ادب ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ اونٹوں کی سال ہو یا ان کے بیٹھنے کی جگہ ہو یا معطن یعنی پانی پینے کے بعد ان کے بیٹھنے کی جگہ ہو یعنی جہاں وہ پانی پینے کے بعد تازہ دم ہو کر ستانے پر اتر آتے ہیں اور قریب رہنے والوں کے لئے خطرہ بڑھ جاتا ہے، ان تمام مقامات پر اگر نجاست نہ ہو تو جمہور کے نزدیک نماز پڑھنے کی اجازت ہے، امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ سب ہی جواز کے قائل ہیں۔

ظاہریہ اور امام احمد بن حنبلؒ نے اونٹوں کے معطن میں نماز کو فاسد قرار دیا ہے، ان حضرات کے پیش نظر ابوداؤد اور ابن ماجہ کی روایات ہیں، ابوداؤد کی روایت میں "انھا من الشیاطین" فرمایا گیا ہے، یعنی بلاشک اونٹ شیاطین میں سے ہے اور ابن ماجہ کی روایت میں "فانھا خلقت من الشیاطین" ہے، کہ اونٹ کی تخلیق شیاطین سے کی گئی ہے، اس بنا پر امام احمدؒ اور اصحاب ظاہر کا فیصلہ یہ ہے کہ معاطن ابل یعنی پانی پینے کے بعد اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ میں نماز فاسد ہے، حسن بصری، ابوثور اور بعض دیگر فقہاء نے اس جگہ نماز پڑھنے کو مکروہ قرار دیا ہے۔

امام بخاریؒ اس باب میں یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ان جگہوں پر نماز کی ممانعت کی علت اونٹ کا شیاطین سے ہونا مان لی جائے تو پھر اس میں معاطن ہی کی کیا خصوصیت ہے؟ اونٹ جہاں بھی ہو اور جس حالت میں بھی ہو اس کے قریب نماز درست نہ ہونی چاہیے، جب کہ روایات میں اونٹ کا گھٹنا باندھ کر اس کو نماز میں سترہ بنانے کا تذکرہ موجود ہے، نیز سترہ بنانے کی تو اتنی اہمیت نہیں کہ اس میں فی الجملہ بعد ہوتا ہے، اونٹ پر سواری کی حالت میں نماز پڑھنا ثابت

ہے، جس میں اونٹ کا قرب ہی نہیں اونٹ کا استعمال پایا جاتا ہے، امام بخاری اس ترجمۃ الباب میں یہی واضح کرنا چاہتے ہیں کہ "انها خلقت من الشياطين" کو علت قرار دے کر معاطن ابل وغیرہ میں نماز کے ناجائز ہونے کا فیصلہ درست نہیں، کیوں کہ اس کا یہ مطلب ہی نہیں ہے، اس روایت کا مطلب تو اونٹ کی فطری شرارت اور شیطنت کا بیان ہے، یہ بات اونٹ میں اتنی زیادہ ہے کہ اونٹ پالنے والے کی طبیعت میں بھی سختی اور درشتی پیدا ہو جاتی ہے، کبر اور غرور جیسے امراض بھی ان لوگوں میں۔ الا ماشاء اللہ۔ پیدا ہو جاتے ہیں، پھر پانی پینے کی جگہ جہاں بہت زیادہ اونٹ ہوتے ہیں، سب آزاد ہوتے ہیں، پانی پی کر تازہ دم ہو جاتے ہیں، اس لیے وہاں نماز پڑھنے میں اطمینان قلب کے میسر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی لیے نہی فرما دی گئی۔

لیکن "جعلت لی الارض مسجدا وطهورا" کے عموم کے مطابق یہ جگہ بھی اگر پاک ہو اور اونٹ کے خطرات کو نکیل ڈال کر، یا اس کے گھٹنے باندھ کر کم کر دیا گیا ہو تو ان مقامات میں نماز پڑھنے میں مضائقہ نہیں ہے۔

روایت باب سے بھی یہی مضمون ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اونٹ کو سامنے بٹھلا کر نماز پڑھی اور فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا ہے، معلوم ہوا کہ اونٹ کی شرارت سے تحفظ ہو تو اس کے قریب نماز پڑھنے میں حرج نہیں ہے۔ واللہ اعلم

## [۵۱] بَابُ مَنْ صَلّٰى وَقُدَّامَهُ تَنُّورٌ اَوْنَارٌ اَوْ شَيْئٌ مِمَّا يُعْبَدُ فَأَرَادَبِهٖ وَجْهَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ

وَقَالَ الزُّهْرِيُّ اَخْبَرَنِيْ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ عُرِضَتْ عَلَيَّ النَّارُ وَاَنَا اُصَلِّي

(۴۳۱) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ اَسْلَمَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَبَّاسٍ قَالَ انْخَسَفَتِ الشَّمْسُ فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ ثُمَّ قَالَ اُرِيْتُ النَّارَ فَلَمْ اَرَ مَنْظَراً كَالْيَوْمِ قَطُّ اَفْظَعَ. (گذشتہ:۲۹)

**ترجمہ** باب، جو شخص اس حال میں نماز پڑھے کہ اس کے سامنے تنور یا آگ یا کوئی ایسی چیز ہو جس کی عبادت کی جاتی ہو، لیکن اس کی نیت صرف اللہ کی رضا حاصل کرنے کی ہو۔ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ نماز پڑھنے کی حالت میں میرے سامنے جہنم لائی گئی۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ سورج گہن ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی پھر فرمایا کہ مجھے نماز کی حالت میں جہنم دکھائی گئی، چنانچہ میں نے آج کی طرح کا ہیبت ناک منظر کبھی نہیں دیکھا۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ایسی جگہ نماز پڑھنا چاہتا ہے، جہاں سامنے تنور ہے جس میں آگ بھری ہوئی ہے، یا سامنے کی سمت میں کوئی شمع روشن ہے، یا کوئی بھی ایسی چیز ہے جس کی پوجا کی جاتی ہے،

جیسے پیپل کا درخت وغیرہ، لیکن نماز پڑھنے والے نے نہ تو ان چیزوں کے استقبال کا ارادہ کیا اور نہ اس کے دل میں ان بے ہودہ چیزوں کی تعظیم کا خیال آ سکتا ہے، بلکہ اس کی نماز صرف اللہ کے لیے ہے، مثلاً کسی ایسی جگہ نماز کا ارادہ کیا جہاں پیپل کا درخت سترہ کے طور پر استعمال ہوا، اس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں ہے کہ یہ درخت کچھ لوگوں کے نزدیک متبرک اور قابل پرستش بھی ہے، یا مثلاً تنور میں آگ دہک رہی تھی، موسم سرد تھا، نمازی اس خیال سے وہاں کھڑا ہو گیا کہ آگ کے قریب حرارت پہنچتی رہے گی، تو اگر ایسی چیزیں اتفاقی طور پر سامنے ہو جائیں جب کہ نمازی کی نیت نماز میں محض رضائے خداوندی کے حصول کی ہو، ان چیزوں کے لائق احترام یا قابل پرستش ہونے کا تصور تک نہ ہو، تو ایسی صورت میں نماز فاسد ہے نہ مکروہ۔

امام بخاریؒ نے ترجمہ میں تین چیزوں کا ذکر کیا ہے، تنور یا آگ یا کوئی ایسی چیز جس کی عبادت کی جاتی ہو اور بتلایا ہے کہ سب کا ایک ہی حکم ہے، یہ نمازی کی نیت پر موقوف ہے، ان تینوں چیزوں میں بخاری نے تنور کو اس لیے مقدم کیا ہے کہ اس کی اہمیت ہے کیوں کہ مجوسی اس کی پرستش کرتے ہیں، ابن سیرین سے روایت ہے کہ انھوں نے تنور کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کو مکروہ قرار دیا ہے، مصنف ابن ابی شیبہ میں ہے: "**انہ کرہ الصلٰوۃ الی التنور وقال ھو بیت نار**" کہ ابن سیرین نے تنور کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کو مکروہ قرار دیا ہے اور کہا کہ یہ آگ کا گھر ہے، امام بخاریؒ نے غالباً اسی وجہ سے تنور کو سب سے مقدم ذکر کیا ہے، اور مقصد یہی ہے کہ نماز میں نمازی کے سامنے کوئی ایسی چیز آ جائے جس کی پرستش کی جاتی ہو جب کہ نمازی کی نیت صحیح ہو تو اس سے نماز میں کراہت یا فساد واقع نہیں ہوتا، بلکہ نماز بلا کراہت صحیح ہوتی ہے۔

## ترجمہ کا ثبوت اور تشریح احادیث

اس ترجمہ کے تحت امام بخاریؒ نے دو روایتیں ذکر کی ہیں، پہلی روایت میں جو امام بخاریؒ نے حضرت انسؓ بن مالک سے تعلیقاً ذکر کی ہے، یہ بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے نماز کی حالت میں آگ پیش کر دی گئی اور آپ بدستور نماز میں مشغول رہے، نہ نماز کو توڑا گیا، نہ استیناف فرمایا، نہ اس میں کراہت پیدا ہوئی، معلوم ہوا کہ نماز میں آگ سامنے آ جائے تو اس سے نماز میں کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا، کیوں کہ روایت میں یہ مضمون صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ نماز میں آگ میرے سامنے پیش کی گئی، امام بخاری نے اس سے استدلال کر لیا کیوں کہ عبارت کا ظاہر یہی ہے کہ آگ قریب لائی گئی، یہ احتمال بعید ہے کہ آگ اپنی جگہ رہی اور درمیان سے حجابات رفع کر دیئے گئے، اور بخاری کے مقصد اور مدعا کے لیے الفاظ کا ظاہر اور تبادر کافی ہے۔

دوسری روایت جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے اور یہاں اس کا نہایت مختصر حصہ نقل کیا گیا ہے، اس کی تفصیل میں یہ مضمون ہے کہ نماز کے دوران رسول اللہ ﷺ دفعۃً پیچھے ہٹے، کبھی آگے بڑھے، نماز کے بعد دریافت کیا

گیا، تو آپ نے فرمایا کہ نماز کے دوران جنت میرے سامنے لائی گئی اور میں نے خوشۂ انگور توڑنا چاہا پھر کچھ خیال کر کے ہاتھ کھینچ لیا۔ اور جہنم بھی مجھ کو دکھلائی گئی، اس سے شارحین نے یہ سمجھا کہ سامنے کی دیوار میں جہنم کو ممثل کر دیا گیا تھا، جیسے آئینہ میں صورت نظر آتی ہے۔ امام بخاری نے اسی سے ترجمۃ الباب ثابت کر دیا کہ جہنم کے سامنے کی دیوار میں ممثل ہونے سے ثابت ہو گیا کہ اگر نمازی کے سامنے آگ ہو، جب کہ نمازی کی نیت صرف اللہ کے لیے نماز پڑھنے کی ہو تو اس میں مضائقہ نہیں ہے۔

امام بخاریؒ کو اس طرح کے مضامین ثابت کرنے کے لیے اشاروں سے کام لینا پڑتا ہے، کیوں کہ اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے ان کے پاس نص صریح نہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے آگ کو سامنے کی سمت میں لے کر نماز پڑھی ہو۔

یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امام بخاریؒ نے اس ترجمۃ الباب مین حنفیہ پر تعریض کی ہو، فقہاء احناف نے آگ کو سامنے رکھ کر نماز پڑھنے کو مکروہ قرار دیا ہے، لیکن اس صورت میں امام بخاری اپنے مدعا میں کامیاب نہیں ہیں، احناف غیر اللہ کی عبادت سے تشبہ کے سبب ارادۃً اس آگ کو سامنے رکھ کر نماز پڑھنے کی کراہت کے قائل ہیں جس کی عبادت کی جاتی ہو، جب کہ امام بخاری کی ذکر کردہ روایات میں عالم غیب یا تکوینیات کی ایک چیز پیش کی گئی ہے، اس میں آپ کے ارادہ اور اختیار کا بالکل دخل نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ اختیاری امور کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا، پھر یہ کہ جو آگ رسول اللہ ﷺ کے سامنے پیش کی گئی تھی وہ بالکل دوسری چیز ہے، مجوسی جس کی عبادت کرتے ہیں وہ دوسری چیز ہے، وغیرہ اور بھی مختلف امور ایسے ہیں جن کے پیش نظر فقہاء احناف پر تعریض کو درست نہیں کہا جا سکتا۔ واللہ اعلم

## [۵۲] بَابُ كَرَاهِيَّةِ الصَّلٰوةِ فِي الْمَقَابِرِ

**(۴۳۲) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ قَالَ اَخْبَرَنِيْ نَافِعٌ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ اجْعَلُوْا فِيْ بُيُوْتِكُمْ مِنْ صَلَاتِكُمْ وَلَا تَتَّخِذُوْهَا قُبُوْراً۔** (آئندہ:۱۱۸۷)

**ترجمہ** باب، قبرستان میں نماز کی کراہت کا بیان۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا کہ اپنے گھروں میں بھی اپنی نمازوں کا کچھ حصہ پڑھا کرو اور ان گھروں کو قبروں کی طرح مت رہنے دو۔

**مقصد ترجمہ** چند صفحات پہلے "**هل تنبش قبور مشركي الجاهلية**" اور اس کے ساتھ "**مايكره من الصلوٰة في القبور**" گزر چکا ہے اور وہاں تفصیل آچکی ہے کہ قبرستان میں نماز پڑھنے کے مسئلہ میں فقہاء کرام کا کیا اختلاف ہے؟ یہاں امام بخاریؒ مستقلاً اس مسئلہ کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ قبرستان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، اس کی وضاحت کی وجہ یہ ہے کہ زمین کے ہر حصہ پر نماز پڑھنے کی اجازت ہے، آپ کا ارشاد ہے "**جعلت لي الارض مسجدا وطهورا**" اور مقابر بھی زمین کا ایک حصہ ہیں، بخاری بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اصل کے اعتبار سے زمین کا ہر حصہ

نماز کے قابل تھا؛ لیکن عوارض کی وجہ سے خاص خاص حصوں میں نماز پڑھنے سے روک دیا گیا ہے، یہ عوارض بھی زمین میں ہوتے تھے، اور کبھی ماحول میں، انہی عوارض کی بنیاد پر قبرستان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے؛ کیوں کہ قبرستان میں نماز کا عمل بت پرستوں یا قبر پرستوں سے تشبہ پیدا کرتا ہے، اس لیے فقہاء اربعہ اس پر متفق ہیں کہ قبرستان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے۔

**ترجمہ کا ثبوت** مسئلہ تو یہی ہے کہ قبرستان میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، مگر اس سلسلے میں جو روایت نص کا درجہ رکھتی ہے وہ بخاری کی شرط کے مطابق نہیں ہے، وہ روایت ابوداؤد اور ترمذی میں ان الفاظ میں منقول ہے:

"الارض کلها مسجدا لا المقبرة والحمام" زمین سب کی سب سجدہ گاہ ہے علاوہ قبرستان اور حمام کے۔ چوں کہ یہ روایت بخاری کی شرط کے مطابق نہیں تھی، اس لیے اس کا تو ذکر کر نہیں سکتے، دوسرے طریقوں سے نہایت لطیف طور پر مدعا ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام نے فرمایا کہ نماز کا کچھ حصہ گھروں میں ادا کرو یعنی فریضہ مسجد میں تو نوافل گھروں میں۔ "ولا تتخذوها قبورا" اور گھروں کو نماز سے خالی کر کے انہیں قبر کی طرح مت ہونے دو، اس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ قبرستان نماز کی جگہ نہیں ہے، کیوں کہ روایت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ گھر نماز سے خالی ہو تو گھر نہ رہا قبرستان بن گیا۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ گھروں میں مردوں کی تدفین نہ کی جائے، کیوں کہ مردوں کو گھروں میں دفن کرو گے تو نماز کی گنجائش نہ رہے گی اور حکم دیا جا رہا ہے کہ گھروں میں نماز پڑھی جائے، بہرحال اشارہ سے یہ بات نکل آئی کہ قبرستان میں نماز نہیں پڑھی جائے گی۔

## [۵۳] بَابُ الصَّلٰوةِ فِيْ مَوَاضِعِ الْخَسْفِ وَالْعَذَابِ

وَيُذْكَرُ اَنَّ عَلِيًّا رَضِيَ اللهُ عَنْهُ كَرِهَ الصَّلٰوةَ بِخَسْفِ بَابِلَ

(۴۳۴) حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيلُ بْنُ عَبْدُ اللهِ قَالَ حَدَّثَنِيْ مَالِكٌ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ دِيْنَارٍ عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ لَا تَدْخُلُوْا عَلٰى هٰؤُلَاءِ الْمُعَذَّبِيْنَ اِلَّا اَنْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ فَاِنْ لَمْ تَكُوْنُوْا بَاكِيْنَ فَلَا تَدْخُلُوْا عَلَيْهِمْ لَا يُصِيْبُكُمْ مَا اَصَابَهُمْ.

(آئندہ: ۳۳۸۰، ۳۳۸۱، ۴۴۱۹، ۴۴۲۰، ۴۷۰۲)

**ترجمہ** باب، ایسی جگہ نماز پڑھنے کا حکم جہاں زمین دھنس جانے کا عذاب یا کوئی اور عذاب نازل ہو چکا ہو اور حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ انہوں نے بابل میں زمین دھنسنے کے عذاب والی جگہ میں نماز پڑھنے کو مکروہ سمجھا۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ان معذبین کے یہاں مت جاؤ الا یہ کہ تم پر گریہ و بکاء طاری ہو، اگر گریہ و بکاء طاری نہ ہو تو مت جاؤ، ایسا نہ ہو کہ تم پر وہی عذاب نازل ہو جائے جو ان پر ہو چکا ہے۔

**مقصد ترجمہ** باب سابق میں بیان کیا گیا کہ قبرستان میں نماز پڑھنا کراہت سے خالی نہیں جب کہ قبرستان میں ہر طرح کے لوگ دفن کیے جاتے ہیں، یعنی وہ لوگ بھی دفن کیے جاتے ہیں جن پر رحمت کا نزول ہوتا ہے اور وہ لوگ بھی دفن ہوتے ہیں، جو غضب خداوندی میں ماخوذ ہیں؛ لیکن وہ مقامات جہاں عذاب کا نزول ہو چکا ہے تو ظاہر ہے کہ جب مقابر میں نماز پڑھنا مکروہ ہے، جہاں ہر طرح کے لوگ دفن ہیں تو عذاب کے مقامات پر نماز پڑھنا بدرجۂ اولیٰ مکروہ ہوگا۔

اس لیے امام بخاریؒ اس باب میں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ عذاب خداوندی خسف یعنی زمین دھنسنے کی صورت میں ہو، یا کسی اور طرح کا عذاب ہو ان مقامات میں نماز کی ادائیگی مکروہ ہوگی، حنفیہ کے یہاں بھی ان مقامات میں نماز پڑھنا مکروہ تنزیہی ہے، وجہ ظاہر ہے کہ محل عذاب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا یعنی رحمت کی طلب کرنا ایک طرح کی جسارت اور آثار غضب سے لاپرواہی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے، مقامات غضب میں اقامت اختیار کرنے پر قرآن کریم میں بھی ناپسندیدگی کا اظہار کیا گیا ہے، ارشاد ہے: ”وَسَكَنْتُمْ فِي مَسَاكِنِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا اَنْفُسَهُمْ وَتَبَيَّنَ لَكُمْ كَيْفَ فَعَلْنَا بِهِمْ“ (سورۂ ابراہیم: آیت:۴۵) تم نے ان لوگوں کی قیام گاہوں میں سکونت اختیار کی جنھوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا اور تم پر یہ حقیقت واضح تھی کہ ان کے ساتھ ہم نے کیا معاملہ کیا۔

**ترجمہ کا ثبوت اور تشریح** امام بخاریؒ نے اپنے دعوی کے ثبوت میں دو چیزیں پیش کی ہیں: ایک حضرت علیؓ کا اثر اور دوسرے حضور پاک ﷺ کا ارشاد، اور دونوں سے ان کے مقصد کا ثبوت ظاہر ہے،

حضرت علیؓ کے اثر کی تفصیل یہ ہے کہ جب وہ صفین کے موقع پر سفر کرتے ہوئے ان مقامات سے گزرے جہاں پہلے شہر بابل آباد تھا، (یہ علاقہ اب عراق سے تقریباً ساٹھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے) تو آپ نے وہاں نماز نہیں پڑھی؛ بلکہ تیزی سے راستہ طے کیا اور ان حدود سے باہر نکل کر نماز ادا کی۔ تاریخی روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ یہ وہی علاقہ ہے جہاں نمرود نے پانچ ہزار ذراع اونچا منارہ رصد گاہ کے طور پر تعمیر کیا تھا، جو بدعملیوں اور سازشوں کے سبب اس پر اور اس کی قوم پر الٹ دیا گیا، قرآن کریم میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں فرمایا گیا ہے: ”قَدْ مَكَرَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَاَتَى اللّٰهُ بُنْيَانَهُمْ مِنَ الْقَوَاعِدِ فَخَرَّ عَلَيْهِمُ السَّقْفُ مِنْ فَوْقِهِمْ“ (سورہ النحل: آیت:۲۶) ان سے پہلے لوگ بھی طرح طرح کی چالیں چل چکے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ نے ان کی عمارتوں کو بنیاد سے اکھاڑ پھینکا اور اوپر سے چھت ان پر آ کر گری۔

بہر حال حضرت علیؓ بابل کے مقامات خسف سے گزرے تو انھوں نے وہاں نماز نہیں پڑھی اور ان علاقوں سے آگے بڑھنے کے بعد نماز ادا کی، معلوم ہوا کہ جہاں عذاب خداوندی کا نزول ہو چکا ہو ان مقامات پر نماز پڑھنا مستحسن نہیں ہے۔

امام بخاریؒ کا دوسرا استدلال ہے حضور ﷺ کا ارشاد کہ جب آپ غزوۂ تبوک کے لیے جاتے ہوئے قوم ثمود کی بستیوں سے گزرے، حالانکہ ثمود کو گزرے ہوئے سیکڑوں نہیں ہزاروں سال ہو چکے تھے، مگر آپ ادھر سے گزرے تو

آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ بستیاں ان لوگوں کی ہیں جن پر عذاب خداوندی نازل ہو چکا ہے، اس لیے ضرورۃً یہاں سے گزرنا یا ان آبادیوں میں داخل ہونا ہو تو خدا کے خوف سے روتے اور ذکر کرتے ہوئے گذرو، یعنی گذرنے کی تو مجبوری ہے کہ یہ راہ گذر ہے، لیکن لاپرواہی کے ساتھ گذرنا خطرہ سے خالی نہیں، بلکہ گذرنے والوں کو سوچنا چاہئے کہ یہ مقامات کسی زمانہ میں آباد تھے، یہاں پیغمبر بھیجے گئے تھے، مگر ان کی نافرمانی کی گئی اور خدا نے قوم کو تباہ و برباد کر دیا، اس لیے جلال خداوندی کا اتنا اثر ضرور ہونا چاہئے کہ گزرنے والوں پر خوف وخشیت کا غلبہ ہو جائے، وہ بھی انسان ہے کہ خطرناک مقامات سے گزرے اور اس کے دل پر کوئی اثر نہ ہو، خوف وخشیت کے قلوب پر طاری کرنے کی وجہ یہ ارشاد فرمائی کہ اگر ایسا نہ کرو گے اور غفلت اور لاپرواہی اختیار کرو گے تو اندیشہ ہے کہ تم بھی انھی چیزوں میں مبتلا نہ کر دیئے جاؤ جن میں وہ قومیں گرفتار ہو چکی ہیں۔ اور آپ نے صاف ارشاد فرمایا کہ اگر یہ گریہ وبکا طاری نہ ہو تو ان مقامات میں داخل ہونے کی ہمت ہی نہ کرو۔

امام بخاریؒ نے یہیں سے اپنا مدعا ثابت کر دیا کہ جب ان مقامات میں داخلہ کی شرط گریہ وبکاء ہے اور اگر یہ طاری نہ ہو تو داخلہ سے منع کیا گیا ہے، تو ظاہر ہے کہ نماز کے اندر تو کچھ نہ کچھ ٹھہراؤ ہوتا ہے، اس لیے جب گزرنے کے لئے گریہ کی شرط ہے تو نماز کے لیے بھی یہ شرط ہوگی اور معذبین کے احوال میں غور وفکر کے نتیجہ میں گریہ وبکا طاری ہو تو ظاہر ہے کہ نماز نہ پڑھ سکے گا، نہ قرأت ہو سکے گی، اس لیے معلوم ہوا کہ مواضع عذاب وخسف میں نماز کو پسند نہیں کیا گیا اور یہی امام بخاری کا مقصود تھا۔

یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ گریہ وبکاء کا طاری ہونا تو کمال خشوع کی دلیل ہے اور نماز میں حضور وخشوع تام مطلوب ہے اس لیے نماز سے روکنا کیسے ثابت ہوگا؟ کیوں کہ نماز کے اندر جو خشوع وخضوع مطلوب ہے وہ بسلسلۂ نماز ہے اور اس صورت میں جو گریہ طاری ہوگا وہ معذبین کے احوال میں غور فکر سے متعلق ہے جو نماز میں حضور قلب کے منافی ہے۔

## [ ٥٤ ] بَابُ الصَّلٰوةِ فِي الْبِيْعَةِ

وَقَالَ عُمَرُ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ اِنَّا لَا نَدْخُلُ كَنَائِسَكُمْ مِنْ اَجْلِ التَّمَاثِيْلِ الَّتِيْ فِيْهَا الصُّوَرُ. وَكَانَ ابْنُ عَبَّاسٍ يُصَلِّيْ فِي الْبِيْعَةِ اِلَّا بِيْعَةً فِيْهَا تَمَاثِيْلُ

(۴۳۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدَةُ عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ اُمَّ سَلَمَةَ ذَكَرَتْ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ كَنِيْسَةً رَأَتْهَا بِاَرْضِ الْحَبْشَةِ يُقَالُ لَهَا مَارِيَةُ فَذَكَرَتْ لَهُ مَارَاَتْ فِيْهَا مِنَ الصُّوَرِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اُولٰئِكَ قَوْمٌ اِذَا مَاتَ فِيْهِمُ الْعَبْدُ الصَّالِحُ اَوِ الرَّجُلُ الصَّالِحُ بَنَوْا عَلٰى قَبْرِهٖ مَسْجِدًا وَصَوَّرُوْا فِيْهِ تِلْكَ الصُّوَرَ

اُولٰئِكَ شِرَارُ الخَلْقِ عِنْدَ اللهِ . (گذشتہ: ۴۲۷)

**ترجمہ** باب، نصاریٰ کے گرجا گھر میں جا کر نماز پڑھنے کا بیان۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم تمہارے عبادت خانوں میں تماثیل یعنی تصویروں کی وجہ سے داخل نہیں ہوتے اور حضرت عباس گرجا گھر میں نماز پڑھ لیتے تھے، مگر اس گرجا گھر میں نماز نہیں پڑھتے تھے، جس میں تصویریں ہوں۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اس گرجا گھر کا ذکر کیا جس کو انھوں نے سرزمین حبشہ میں دیکھا تھا، جس کو "ماریہ" کہا جاتا تھا، حضرت ام سلمہ نے اس میں جو تصویریں دیکھی تھیں ان کو بیان کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ وہ لوگ تھے کہ جب ان میں سے نیک انسان کا انتقال ہو جاتا، تو یہ اس کی قبر پر مسجد تعمیر کر دیتے تھے اور اس مسجد میں یہ تصویریں بنا دیتے تھے، یہ لوگ اللہ کے نزدیک مخلوق میں سے بدترین لوگ ہیں۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ یہود و نصاریٰ کے عبادت خانوں میں نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ امام بخاریؒ نے حضرت عمرؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے آثار پیش کر کے یہ رجحان ظاہر کیا ہے کہ اس مسئلہ میں تفصیل کرنا ہوگی، جس عبادت خانے میں مجسمے یا تصویریں ہوں تو اس میں داخلہ بھی ممنوع ہے، پھر نماز کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ لیکن جس عبادت خانے میں یہ چیزیں نہ ہوں تو وہاں نماز ادا کرنا درست ہے، اس لیے کہ مسلمانوں کی مسجد ہو یا یہودیوں اور نصرانیوں کے گرجا ہوں، عبادت خانہ ہونے کی حیثیت میں مشترک ہیں؛ لیکن چونکہ یہودیوں اور نصرانیوں کے عبادت خانے عام طور پر تصویروں اور مجسموں سے خالی نہیں ہوتے اور جہاں تصویریں ہوں وہاں خدا کا عذاب نازل ہوتا ہے، اس لیے ان لعنت اور غضب کی چیزوں کے ہوتے ہوئے نماز پڑھنا، یعنی رحمت خداوندی طلب کرنا بڑی جسارت کی بات ہے، بہر حال امام بخاری نے دونوں اثر نقل کر کے اپنے ذوق کے مطابق اس مسئلہ میں تفصیل کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

اس سلسلہ میں امام بخاریؒ نے سب سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اثر نقل کیا ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے شام کا سفر کیا تو وہاں کے ایک بڑے پادری قسطنطین نے حضرت عمرؓ کی کھانے کی دعوت کی، تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم ان تصویروں کی وجہ سے جو تم نے عبادت خانوں میں بنا رکھی ہیں، تمہارے عبادت خانوں میں داخل نہیں ہوتے، معلوم ہوا کہ جب داخلہ تک درست نہیں تو ایسی جگہوں پر نماز پڑھنا بدرجۂ اولیٰ درست نہ ہوگا۔

پھر اس کے بعد امام بخاری نے حضرت ابن عباس کا اثر نقل کیا جس میں یہ آیا کہ وہ نصاریٰ کے ایسے عبادت خانوں میں نماز پڑھ لیتے تھے جن میں تصاویر نہ ہوں، چنانچہ تصاویر اور دیگر منکرات سے پاک و صاف نصاریٰ کے عبادت خانوں میں نماز کا جواز حضرت حسن، حضرت عمر بن عبدالعزیز، امام شعبی اور امام اوزاعی سے بھی منقول ہے، بلکہ بعض حضرات نے تو تصاویر کے باوجود گنجائش دی ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے خانہ کعبہ میں تصاویر کی موجودگی میں نماز پڑھی ہے، لیکن

امام بخاری کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سلسلہ میں تفصیل کرنا چاہتے ہیں کہ اگر یہود ونصاری کے عبادت خانے تصاویر اور منکرات سے پاک ہوں، تو ان میں نماز پڑھنے میں مضائقہ نہیں ہے اور تصاویر کی موجودگی میں نماز تو درکنار داخلہ بھی ممنوع ہے۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** روایت چند ابواب پہلے تشریح کے ساتھ گذر چکی ہے، یہاں امام بخاری کا مدعا اس طرح ثابت ہے کہ جب حضرت ام سلمہ نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے حبشہ کے اس گرجا کا ذکر کیا جس میں تصاویر تھیں، تو آپ نے یہ وضاحت فرمائی کہ یہ ان قوموں کی عبادت گاہیں ہیں، جن کے یہاں صالحین کے انتقال کے بعد عبادت خانے تعمیر کرنے اور ان عبادت گاہوں میں تصویریں نصب کرنے کا عام رواج تھا اور یہ لوگ مسجدوں میں تصاویر نصب کرنے کے سبب بدترین خلائق شمار کئے گئے، بس اسی سے معلوم ہوا کہ عبادت خانوں میں تصویر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ واللہ اعلم

## [۵۵] بَابٌ

(۴۳۵،۴۳۶) حَدَّثَنَا اَبُوْ الْيَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ اَخْبَرَنَا عُبَيْدُ اللهِ ابْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ اَنَّ عَائِشَةَ وَعَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ قَالَا لَمَّا نَزَلَ بِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ طَفِقَ يَطْرَحُ خَمِيْصَةً لَهُ عَلٰى وَجْهِهٖ فَاِذَا اغْتَمَّ بِهَا كَشَفَهَا عَنْ وَجْهِهٖ فَقَالَ وَهُوَ كَذٰلِكَ لَعْنَةُ اللهِ عَلَى الْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآئِهِمْ مَسَاجِدَ يُحَذِّرُ مَا صَنَعُوْا.

(آئندہ: ۱۳۳۰، ۱۳۹۰، ۳۴۵۳، ۳۴۵۴، ۴۴۴۱، ۴۴۴۳، ۴۴۴۴، ۵۸۱۵، ۵۸۱۶)

(۴۳۷) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ قَاتَلَ اللهُ الْيَهُوْدَ اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَآئِهِمْ مَسَاجِدَ.

**ترجمہ** باب، حضرت عائشہؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ پر مرض الوفات میں نزع کے آثار شروع ہوئے تو آپ نے اپنی اونی چادر کو بار بار چہرۂ مبارک پر ڈالنا شروع کیا اور جب اس سے گرمی محسوس فرماتے تو اس کو چہرے سے اتار دیتے، اس حالت میں ارشاد فرمایا کہ اللہ کی لعنت یہود ونصاری پر ہوئی کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا، اس طرح آپ اپنی امت کو یہود ونصاری کے مشرکانہ عمل کی تباہ کاری سے ڈرا رہے تھے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے یہودیوں کو ہلاک فرمادیا کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا تھا۔

**باب بلا ترجمہ کا مقصد** امام بخاری کی عادت ہے کہ وہ کبھی کبھی ترجمہ منعقد کیے بغیر باب لکھ دیتے ہیں، عام طور پر شارحین اس کو کالفصل من الباب السابق قرار دیتے ہیں، یہاں بھی ایسا ہی ہے کہ اس باب میں جس روایت کا ذکر کیا گیا وہ ایک طرح باب سابق ہی سے متعلق ہے، کیوں کہ قبروں کو سجدہ گاہ بنانے سے روکنے کا مضمون دونوں میں مشترک ہے۔

یہ تو شارحین کی رائے ہے اور ہمارا خیال یہ ہے کہ امام بخاری نے باب سابق میں یہ بیان کیا ہے کہ یہود ونصاری کی عبادت گاہوں میں نماز کی کراہت کی وجہ یہ ہے کہ وہاں مجسمے اور تصاویر نصب ہوتے ہیں، ورنہ اصل کے اعتبار سے تو ہر جگہ نماز جائز ہے "جعلت لی الارض مسجدا" اس لیے اصل کے اعتبار سے تو نماز درست ہونی چاہیے، لیکن تصویروں کی بنیاد پر ان عبادت خانوں میں نماز سے منع کر دیا گیا۔ اب امام بخاری اس باب میں ترقی کر کے یہ بتانا چاہتے ہیں کہ منکرات پائے جانے کے سبب نماز کی ممانعت صرف یہود ونصاری کے معابد کے ساتھ ہی خاص نہیں ہے، بلکہ اگر مسلمانوں کی مسجد میں بھی کوئی ایسی صورت پیدا کر دی جائے مثلاً یہ کہ مسجدوں میں قبروں کو نمایاں طور پر برقرار رکھا جائے، تو چونکہ مسجدوں میں قبروں کا برقرار رکھنا ایک قابل لعنت فعل ہے، اس لیے اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے تو ان مساجد میں بھی نماز پڑھنا کراہت سے خالی نہ ہوگا، گویا امام بخاری نے اس باب میں یہ بیان کیا کہ مسجدوں میں قبروں کو باقی رکھنا ایسا ہی ہے، جیسے یہود ونصاری کے عبادت خانوں میں تصاویر کا پایا جانا، کیوں کہ مسجدوں کے بارے میں صاف ارشاد فرمایا گیا ہے: "وَاَنَّ الْمَسَاجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا" (سورۃ الجن آیت:۱۸) اور یہ کہ مسجدیں اللہ کی یاد کے واسطے ہیں سو اللہ کے ساتھ کسی کو مت پکارو۔ اس لیے مسجدوں میں کسی بھی عام وخاص کی قبر باقی رکھنے کا جواز نہیں ہے؛ البتہ اگر قبروں کا احاطہ کر کے ان کو مسجدوں سے الگ کر دیا جائے تو گنجائش ہے۔

بہر حال امام بخاری نے باب بلا ترجمہ منعقد کر کے یہ واضح کر دیا کہ اگر مسجدوں میں قبروں کو باقی رکھا جائے تو ان میں بھی نماز مکروہ ہے، اس طرح یہاں ترجمۂ جدیدہ اس طرح منعقد کیا جاسکتا ہے "باب کراھیۃ الصلوۃ فی المساجد التی فیھا قبور"۔ واللہ اعلم

**تشریح احادیث** حضرت عائشہؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے ارشاد فرمایا کہ جب سرکار دو عالم ﷺ پر نزع کے آثار شروع ہوئے اور تکلیف کی شدت ہوئی تو آپ بار بار اپنی گرم چادر کو چہرۂ مبارک پر ڈالتے تھے، پھر جب گرمی محسوس فرماتے تو چادر کو چہرہ سے ہٹا دیتے تھے، اسی بے قراری اور بے تابی کے عالم میں ارشاد فرمایا کہ اللہ نے یہود ونصاری کو اپنی رحمت سے دور کر دیا کہ وہ انبیاء کی قبروں پر مسجدیں تعمیر کرتے تھے، گویا ان کی قبروں پر سجدہ کرنا روا سمجھتے تھے، اس طرح آپ اپنی امت کو یہود ونصاری کے عبرت ناک انجام سے باخبر کر کے انھیں اس بدترین فعل سے روکنا چاہتے تھے۔

دوسری روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہود کو ہلاک کردیا کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔

دونوں روایتوں کا مضمون ایک ہی ہے کہ جو پیغمبر دنیا کو توحید کی دعوت دینے کے لیے اور شرک کو مٹانے کے لیے آئے تھے، بدنصیب قوموں نے انہی کی قبروں پر شرک کا بدترین عمل شروع کردیا اور وہ اس طرح لعنت کی مستحق ہوگئیں۔

پہلی روایت میں اس مشرکانہ عمل کے لیے یہود و نصاریٰ دونوں کو موردِ الزام قرار دیا گیا ہے اور دوسری روایت میں صرف یہود کا تذکرہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ پیغمبروں کی قبروں کو سجدگاہ بنانے کے اصل مجرم تو یہود ہی ہیں، نصاریٰ کے بارے میں یہ اشکال کیا گیا ہے کہ چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے درمیان کوئی نبی ہی نہیں ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھایا گیا اور ان کی قبر بنانے کی نوبت ہی نہیں آئی، اس لیے پیغمبروں کی قبر کو سجدگاہ بنانے کے جرم میں نصاریٰ کو یہود کے ساتھ شریک کرنا بظاہر درست نہیں معلوم ہوتا، اسی لیے پچھلے باب میں جہاں صرف نصاریٰ کا تذکرہ تھا ارشاد فرمایا گیا تھا: ''اذا مات فیھم العبد الصالح او الرجل الصالح'' لیکن زیر بحث باب کی پہلی روایت میں '' لعنة اللّٰه علی الیھود والنصاریٰ'' فرمایا گیا ہے، اس کی متعدد توجیہات کی گئی ہیں، ایک تو یہ کہ اصالۃً یہ کام یہود ہی نے کیا اور وہی اس مشرکانہ عمل کے موجد تھے، لیکن نصاریٰ نے اس کو غلط نہیں سمجھا بلکہ یہودیوں کے اس فعل بد کا وہ برابر اتباع کرتے رہے، اس لئے لعنت میں دونوں شریک ہوگئے، دوسرے یہ کہ پیغمبر علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کسی نبی کا نہ ہونا محلِ نظر ہے، کیوں کہ ''وَاضْرِبْ لَهُمْ مَثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ '' (سورۂ یٰسین آیت:۱۸) اور ان کے سامنے اہلِ قریہ کی ضرب المثل بیان کیجئے، جب وہاں رسول آگئے، جب ہم نے ان کی طرف دو کو بھیجا تو ان کو جھٹلایا، پھر ہم نے تیسرے کو بھیج کر ان کو تقویت پہنچائی۔

اس آیت میں اہلِ انطاکیہ کی رہنمائی اور ہدایت کے لیے حضرت عیسیٰ کی جانب سے بھیجے گئے فرستادے مراد لئے گئے ہیں، جن کے نام حضرت کعب کی جانب روایت کا انتساب کرتے ہوئے بعض مفسرین نے صادق اور مصدوق اور شلوم یا شمعون لکھے ہیں، اس لیے نصاریٰ میں بھی اگر انبیاء کا وجود تسلیم کرلیا جائے تو قبروں کو سجدگاہ بنانے کا الزام براہ راست ان پر بھی عائد ہوتا ہے، وغیرہ۔

ہمیں اس بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں، باب سے متعلق تو صرف یہ ہے کہ اگر مسجدوں کو بھی قبروں سے الگ نہ رکھا جائے تو یہود و نصاریٰ کے عبادت خانوں میں نماز کی ادائیگی میں جو کراہت ہے وہی کراہت مسجدوں میں نماز ادا کرنے میں بھی ہوجائے گی، اس لیے قبروں کو مسجدوں میں برقرار رکھنا موجب لعنت فعل ہے۔ واللہ اعلم

البتہ اگر صالحین کے مزارات سے قریب مسجد تعمیر کی جائے اور مقصد ان سے تقرّب حاصل کرنا نہ ہو، نہ نماز

میں قبر یا صاحب قبر کی تعظیم پیش نظر ہو، بلکہ یہ خیال ہو کہ مقدس مقامات پر نماز پڑھنے سے نماز میں خشوع وخضوع کی کیفیت حاصل ہوگی اور پروردگار عالم کی طرف توجہ زائد ہو جائے گی وغیرہ تو یہ درست ہے، یہود ونصاری برکت حاصل کرنے کے لیے نہیں، بلکہ صاحب قبر سے تقرب حاصل کرنے، یا صاحب قبر ہی کی عبادت میں تعظیم بجالانے کے لیے ایسا کرتے تھے، جو شرک کی قسم ہے، اس لیے ان پر لعنت کی گئی، امت محمدیہ میں سے کوئی اگر اس طرح کی جسارت کرتا ہے، تو اس کا فعل بھی لعنت ہی کا سبب ہے۔ واللہ اعلم

## [۵۶] بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ ﷺ جُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَّطَهُوْراً

(۴۳۸) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ قَالَ حَدَّثَنَا هُشَيْمٌ قَالَ حَدَّثَنَا سَيَّارٌ هُوَ أَبُو الْحَكَمِ قَالَ حَدَّثَنَا يَزِيْدُ الْفَقِيْرُ قَالَ حَدَّثَنَا جَابِرُ بْنُ عَبْدِاللهِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ أُعْطِيْتُ خَمْساً لَمْ يُعْطَهُنَّ أَحَدٌ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ قَبْلِيْ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ مَسِيْرَةَ شَهْرٍ وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِداً وَّطَهُوْراً وَأَيُّمَا رَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي أَدْرَكَتْهُ الصَّلٰوةُ فَلْيُصَلِّ وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَآئِمُ وَكَانَ النَّبِيُّ يُبْعَثُ إِلٰى قَوْمِهٖ خَاصَّةً وَّبُعِثْتُ إِلَى النَّاسِ كَافَّةً وَّأُعْطِيْتُ الشَّفَاعَةَ. (گذشتہ: ۳۳۵)

**ترجمہ** باب، رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ میرے لیے ساری زمین کو سجدہ گاہ اور پاکی کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے پانچ ایسی چیزیں عطا کی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئی تھیں، ایک مہینہ کی مسافت تک کا رعب عطا کر کے میری مدد فرمائی گئی، پوری زمین کو میرے لیے سجدہ گاہ اور پاکی کا ذریعہ بنایا گیا، چنانچہ میری امت کے کسی بھی شخص کو جہاں بھی نماز کا وقت آ جائے اس جگہ نماز پڑھ لینی چاہیے، مال غنیمت کو میرے لیے حلال قرار دیا گیا، یہ کہ نبی کو پہلے اس کی مخصوص قوم کی طرف مبعوث کیا جاتا تھا اور مجھے تمام انسانوں کے لیے مبعوث کیا گیا اور مجھے قیامت میں شفاعت (کبری) کا حق عطا کیا گیا۔

**مقصد ترجمہ** پچھلے ابواب میں یہ بیان کیا جا رہا تھا کہ کن کن مقامات پر نماز کی ادائیگی میں کراہت پائی جاتی ہے، ان ابواب کے بعد اس باب کے انعقاد کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ اصل کے اعتبار سے روئے زمین کا ہر حصہ سجدہ گاہ بننے کے لائق ہے، عوارض کی بنیاد پر جو کراہت آتی ہے، وہ تابقاء عوارض ہے، اگر عوارض ختم کر دیئے جائیں تو حکم بدل جائے گا، صفا اور مروہ کے معاملہ میں یہ حقیقت واضح کی جا چکی ہے کہ جب تک وہاں مشرکین کے رکھے ہوئے بت سیاف ونائلہ رہے طواف نہیں ہوا، یہ بت ہٹا دیئے گئے تو آیت نازل ہوئی اور طواف کا حکم اصلی لوٹ آیا، اس طرح زمین کے کسی حصہ میں اگر ایسی کوئی صورت ہو جائے کہ وہاں نماز ادا کرنا ممنوع قرار دے دیا جائے، تو یہ حکم محض عارضی ہوگا اور اس عارض کے ختم ہوتے ہی حکم اصلی لوٹ آئے گا، علامہ سندھی نے بھی مقصد ترجمہ کا یہی تعین کیا ہے کہ کسی زمین

میں کسی عارض کی بنیاد پر کراہت یا عدم صحت کا انحصار عارض کے بقا تک ہے۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** یہ حدیث نمبر ۳۳۵ پر گذر چکی ہے اور وہاں تمام اجزاء کی تشریح کی جا چکی ہے، روایت میں حضور پاک ﷺ نے جو پانچ چیزیں شمار کرائیں ہیں ان میں سے دوسری خصوصیت امام بخاری کا مستدل ہے کہ امت محمدیہ کے لیے سرزمین کا ہر حصہ سجدہ گاہ قرار دیا گیا ہے، جب کہ دوسری امتوں کے لیے حکم یہ نہیں تھا، بلکہ انھیں اپنی عبادت کے لیے عبادت گاہوں ہی میں جانا ضروری ہوتا تھا۔ اس روایت کا تقاضہ یہی ہے کہ پوری سرزمین نماز کے لئے سجدہ گاہ ہونے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس سے کسی جگہ کا استثناء نہیں ہے، اس لیے جہاں جہاں ممانعت وارد ہوئی ہے، وہ محض عارضی ہے۔

روایت میں ایک راوی ہیں "یزید الفقیر" یہاں فقیر کا لفظ "فقرة" سے لیا گیا ہے، فقرۃ کے معنی ہیں ریڑھ کی ہڈی کا مہرہ جسے منکا کہتے ہیں، چونکہ ان کی کمر کے مہروں میں درد رہتا تھا، اس لیے ان کو فقیر کہتے ہیں۔

## [۵۷] بَابُ نَوْمِ الْمَرْأَةِ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۳۹) حَدَّثَنَا عُبَيْدُ بْنُ إِسْمَاعِيلَ قَالَ حَدَّثَنَا أَبُوْ أُسَامَةَ عَنْ هِشَامٍ عَنْ أَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ وَلِيْدَةً كَانَتْ سَوْدَاءَ لِحَيٍّ مِنَ الْعَرَبِ فَأَعْتَقُوْهَا فَكَانَتْ مَعَهُمْ قَالَتْ فَخَرَجَتْ صَبِيَّةٌ لَهُمْ عَلَيْهَا وِشَاحٌ أَحْمَرُ مِنْ سُيُوْرٍ قَالَتْ فَوَضَعَتْهُ أَوْ وَقَعَ مِنْهَا فَمَرَّتْ بِهِ حُدَيَّاةٌ وَهُوَ مُلْقًى فَحَسِبَتْهُ لَحْماً فَخَطِفَتْهُ قَالَتْ فَالْتَمَسُوْهُ فَلَمْ يَجِدُوْهُ قَالَتْ فَاتَّهَمُوْنِيْ بِهِ قَالَتْ فَطَفِقُوْا يُفَتِّشُوْنِيْ حَتّٰى فَتَّشُوْا قُبُلَهَا قَالَتْ وَاللّٰهِ إِنِّيْ لَقَائِمَةٌ مَعَهُمْ إِذْ مَرَّتْ بِهِ الْحُدَيَّاةُ فَأَلْقَتْهُ قَالَتْ فَوَقَعَ بَيْنَهُمْ قَالَتْ فَقُلْتُ هٰذَا الَّذِيْ اتَّهَمْتُمُوْنِيْ بِهِ زَعَمْتُمْ وَأَنَا مِنْهُ بَرِيْئَةٌ وَهُوَ ذَا هُوَ قَالَتْ فَجَاءَتْ إِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَأَسْلَمَتْ قَالَتْ عَائِشَةُ فَكَانَتْ لَهَا خِبَاءٌ فِي الْمَسْجِدِ أَوْ حِفْشٌ قَالَتْ فَكَانَتْ تَأْتِيْنِيْ فَتَحَدَّثُ عِنْدِيْ قَالَتْ فَلَا تَجْلِسُ عِنْدِيْ مَجْلِساً إِلَّا قَالَتْ:

وَيَوْمَ الْوِشَاحِ مِنْ تَعَاجِيْبِ رَبِّنَا ❁ أَلَا إِنَّهُ مِنْ بَلْدَةِ الْكُفْرِ أَنْجَانِيْ

قَالَتْ عَائِشَةُ فَقُلْتُ لَهَا مَا شَأْنُكِ لَا تَقْعُدِيْنَ مَعِيْ مَقْعَداً إِلَّا قُلْتِ هٰذَا قَالَتْ فَحَدَّثَتْنِيْ بِهٰذَا الْحَدِيْثِ. (آئندہ: ۳۸۳۵)

**ترجمہ** باب، عورت کے مسجد کے اندر سونے کا بیان۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ عرب کے قبیلوں میں سے کسی قبیلہ کی ایک سانولے رنگ کی باندی تھی جس کو انھوں نے آزاد کر دیا تھا، لیکن وہ انھیں کے ساتھ رہا کرتی تھی،

پھر یہ ہوا کہ اس قبیلہ کی ایک بچی اس حالت میں باہر نکلی کہ اس نے چمڑے کے تسمہ میں سرخ جڑاؤ والا ہار پہن رکھا تھا، یہ باندی کہتی ہے کہ اس بچی نے وہ ہار اتار دیا، یا اس سے گر گیا، ہار گرا ہوا تھا کہ ایک چیل وہاں سے اڑتی ہوئی گذری اور اس نے ہار کو گوشت سمجھ کر اچک لیا، اہل قبیلہ نے ہار تلاش کیا اور ان کو ہار نہ ملا تو انھوں نے مجھ پر چوری کی تہمت لگادی، میری تلاشی لینی شروع کی یہاں تک کہ شرمگاہ تک کی تلاشی لی، باندی نے بتلایا کہ میں ابھی ان لوگوں کے ساتھ کھڑی ہی تھی کہ چیل پھر ادھر سے گذری اور اس نے ہار گرادیا جو ان لوگوں کے درمیان آ کر گرا، وہ کہتی ہے کہ اب میں نے ان سے کہا کہ اسی کے سبب تم مجھے تہمت لگا رہے تھے، حالانکہ میں اس سے بالکل بری ہوں، وہ ہار یہ ہے دیکھو! باندی کہتی ہے کہ اس واقعہ کے بعد وہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اسلام قبول کرلیا، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ اس عورت کا خیمہ یا جھونپڑی مسجد نبوی میں پڑی ہوئی تھی، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ وہ میرے پاس آیا کرتی تھی اور باتیں کیا کرتی تھی، وہ میرے پاس جب بھی بیٹھا کرتی تو یہ شعر ضرور سناتی: ہار کا دن ہمارے رب کے عجیب دنوں میں سے ہے کہ اس نے مجھے کفر کے شہر سے نجات عطا فرمادی۔ حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ میں نے اس باندی سے کہا، کیا بات ہے کہ تمہیں جب بھی میرے پاس بیٹھنے کا موقع ملتا ہے، تم یہ شعر ضرور پڑھتی ہو؟ تو اس نے مجھ سے یہ تفصیل بیان کی۔

**مقصد ترجمہ** مسجدیں اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر کی جاتی ہیں اور عبادت کے خاص کاموں کی انجام دہی ان کا مقصد ہے، عبادت کے علاوہ دوسرے کاموں کے لیے ان کا استعمال ایک قابل اعتراض چیز ہے، امام بخاری اس باب میں یہی بیان کرنا چاہتے ہیں کہ دوسرے کاموں کی کہاں تک اجازت ہے، مثلاً اگر کوئی مسجد میں سونا چاہے تو اس کی اجازت دی جائے گی یا نہیں، امام بخاری نے بتلایا کہ جن لوگوں کو مسجد میں قیام کی اجازت ہے، انھیں سونے کی بھی اجازت ہے، خواہ مرد ہو یا عورت۔ اگرچہ عورت کے سونے میں حیض آنے کا اندیشہ ہے اور مرد کے سونے میں احتلام ہونے کا خطرہ ہے، لیکن اس کے باوجود اجازت ہے، جیسے معتکف کے لیے اجازت ہے۔

لیکن یہ بات واضح رہنی چاہئے کہ اس طرح کے مسائل کے بیان کرنے سے امام بخاری کا منشاء یہ نہیں ہے کہ مسجد میں عورتوں کو قیام اور سونے کی ترغیب دی جائے، بلکہ ان کا منشاء محض یہ ہے کہ یہ امور رخصت کے درجہ میں گنجائش رکھتے ہیں، ان کے لیے شرائط ہیں: مثلاً یہ کہ سونے والے یا رہنے والے کے پاس کوئی قیام گاہ نہ ہو، فتنہ کا اندیشہ نہ ہو اور مسجد کا جو اصل موضوع ہے یعنی نمازوں کا قیام اس میں کوئی خلل واقع نہ ہو وغیرہ، تو رخصت کے درجہ میں اس کی گنجائش ہے۔

**تشریح حدیث** حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ کسی عربی قبیلے کی ایک سانولے رنگ کی باندی تھی، اہل قبیلہ نے اس کو آزاد کردیا، لیکن اس کو اپنے محسنوں کے ساتھ ایسا تعلق تھا کہ وہ آزادی کے بعد انہی کے ساتھ مقیم رہی، شارحین کو قبیلہ اور باندی کے بارے میں معلوم نہ ہوسکا کہ یہ کہاں کا اور کس کا واقعہ ہے؟ ایک دن اس قبیلہ کی

ایک لڑکی ہار پہنے ہوئے باہر آئی اور اس نے وہ ہار کسی ضرورت سے اتارا یا گر گیا، یہ راوی کا شک ہے، ورنہ بعض روایات میں یہ مذکور ہے کہ یہ بچی دلہن تھی، اس نے نہانے کے لیے ہار اتارا، ہار چونکہ سرخ چمڑے کا تھا اور اس پر موتیوں کا سرخ جڑاؤ تھا یعنی موتی ٹکے ہوئے تھے، اس لیے چیل اتری اور اس نے گوشت کا ٹکڑا سمجھ کر ہار اچک لیا، بچی گھر گئی تو اہل خانہ کو فکر ہوئی، ہار کو ادھر ادھر تلاش کیا مگر کہیں نہ ملا، تو انھیں اس باندی کی طرف بدگمانی ہوئی، چنانچہ اس سے پوچھ گچھ ہوئی، تلاشی لی گئی اور حد یہ ہے کہ شرمگاہ تک کی تلاشی لی گئی، چوروں کو مشق ہوتی ہے کہ وہ جسم کے اندرونی حصوں میں چیزیں چھپا لیتے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ بدگمانی ہوئی اور انھوں نے اس غریب کو بہت زیادہ رسوا کیا، بعض روایات میں آتا ہے کہ اس نے پروردگار سے اپنی براءت کے لیے دعاء کی، اتنے میں چیل دوبارہ آئی اور اس نے سب کے سامنے وہ ہار ڈال دیا، باندی نے کہا لو دیکھو یہی وہ ہار ہے جس کی بنیاد پر تم ساری عمر کے اعتماد کے باوجود مجھ سے بدگمانی کررہے تھے، اس واقعہ کے بعد اس باندی کو ماحول سے نفرت ہوگئی کہ یہ بدگمانی مسلمانوں میں نہیں ہوتی، چنانچہ وہ وہاں سے ترک وطن کر کے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور اسلام لے آئی، رسول اللہ ﷺ نے اس کے لیے مسجد سے متعلق ایک گوشہ میں کوٹھریا بنوادی تھی جس میں وہ رہا کرتی تھی۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ وہ جب میرے پاس آتی تھی تو یہ شعر ضرور پڑھتی تھی: ہار کے واقعہ کا دن میرے پروردگار کے کرشمہ سازی کا دن تھا، اس نے مجھے دارالکفر سے نجات دے دی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم یہ شعر ضرور سناتی ہو، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو اس نے یہ پورا قصہ بیان کیا۔

بخاری نے مسئلہ نکال لیا کہ عورت بھی مسجد میں سو سکتی ہے کیوں کہ جو چھوٹا سا خانہ اس کے قیام کے لیے بنایا گیا تھا وہ مسجد یا متعلقات مسجد کے گوشہ میں تھا، لیکن ظاہر ہے کہ موسم گرما میں اس کو مسجد میں سونا پڑتا ہوگا۔

## [۵۸] بَابُ نَوْمِ الرِّجَالِ فِي الْمَسْجِدِ

وَقَالَ اَبُوْ قِلَابَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَدِمَ رَهْطٌ مِنْ عُكْلٍ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ وَكَانُوْا فِي الصُّفَّةِ.

وَقَالَ عَبْدُ الرَّحْمٰنِ بْنُ اَبِيْ بَكْرٍ كَانَ اَصْحَابُ الصُّفَّةِ الْفُقَرَاءَ

(۴۴۰) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنِيْ نَافِعٌ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ عُمَرَ اَنَّهُ كَانَ يَنَامُ وَهُوَ شَابٌّ اَعْزَبُ لَا اَهْلَ لَهُ فِيْ مَسْجِدِ النَّبِيِّ ﷺ.

(آئندہ: ۱۱۲۱، ۱۱۵۶، ۳۷۳۸، ۳۷۴۰، ۷۰۱۵، ۷۰۲۸، ۷۰۳۰)

(۴۴۱) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ اَبِيْ حَازِمٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ جَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بَيْتَ فَاطِمَةَ فَلَمْ يَجِدْ عَلِيًّا فِي الْبَيْتِ فَقَالَ اَيْنَ ابْنُ عَمِّكِ؟

قَالَتْ كَانَ بَيْنِيْ وَبَيْنَهُ شَيْءٌ فَغَاضَبَنِيْ فَخَرَجَ فَلَمْ يَقِلْ عِنْدِيْ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لِإِنْسَانٍ اُنْظُرْ اَيْنَ هُوَ؟ فَجَآءَ فَقَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ هُوَ فِي الْمَسْجِدِ رَاقِدٌ فَجَآءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ مُضْطَجِعٌ قَدْ سَقَطَ رِدَآءُهُ عَنْ شِقِّهِ وَاَصَابَهُ تُرَابٌ فَجَعَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَمْسَحُهُ عَنْهُ وَيَقُوْلُ قُمْ اَبَا تُرَابٍ قُمْ اَبَا تُرَابٍ. (آئندہ: ۳۷۰۳، ۶۲۰۴، ۶۲۸۰)

(۴۴۲) حَدَّثَنَا يُوْسُفُ بْنُ عِيْسٰى قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ فُضَيْلٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ اَبِيْ حَازِمٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ قَالَ لَقَدْ رَاَيْتُ سَبْعِيْنَ مِنْ اَصْحَابِ الصُّفَّةِ مَامِنْهُمْ رَجُلٌ عَلَيْهِ رِدَآءٌ اِمَّا اِزَارٌ وَاِمَّا كِسَآءٌ قَدْ رَبَطُوْا فِيْ اَعْنَاقِهِمْ فَمِنْهَا مَايَبْلُغُ نِصْفَ السَّاقَيْنِ وَمِنْهَا مَايَبْلُغُ الْكَعْبَيْنِ فَيَجْمَعُهُ بِيَدِهٖ كَرَاهِيَةَ اَنْ تُرٰى عَوْرَتُهُ.

**ترجمہ** باب، مردوں کے مسجد میں سونے کا جواز۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ قبیلہ عکل کے چند افراد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور صفہ میں رہے۔ عبدالرحمان بن ابی بکر نے فرمایا کہ صفہ میں رہنے والے صحابہ فقراء میں سے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ وہ مسجد میں سویا کرتے تھے اور اس وقت وہ غیر شادی شدہ جوان تھے اور ان کی بیوی نہیں تھی۔ حضرت سہلؓ بن سعد سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت فاطمہ کے گھر میں تشریف لائے تو وہاں حضرت علیؓ نہیں تھے، آپؐ نے حضرت فاطمہ سے پوچھا کہ تمارے چچا کے صاحب زادے (حضرت علی) کہاں ہیں؟ حضرت فاطمہ نے جواب مین عرض کیا۔ کہ میرے اوران کے درمیان کچھ ایسی بات پیش آ گئی تھی جس پر وہ ناراض ہوکر گھر سے باہر چلے گئے اور آج دوپہر میرے پاس قیلولہ نہیں کیا، پھر رسول اللہ ﷺ نے کسی شخص سے فرمایا کہ دیکھو وہ کہاں ہیں؟ چنانچہ وہ صاحب دیکھ کر آئے اور عرض کیا کہ وہ مسجد میں سو رہے ہیں، چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لائے، حضرت علیؓ کروٹ سے لیٹے ہوئے تھے، ان کی چادر مونڈھے سے اتر گئی تھی اور مٹی لگ گئی تھی، رسول اللہ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے مٹی کو صاف کرتے ہوئے فرمایا کہ ابوتراب اٹھو، ابوتراب اٹھو! حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ میں نے اصحاب صفہ میں سے ستر آدمیوں کو دیکھا کہ ان میں سے ایک کے پاس بھی چادر پوری نہ تھی، یا چادر مع ازار کے نہ تھی، یا صرف تہہ بند تھا اور یا صرف کملی تھی جس کو وہ اپنی گردنوں میں باندھ لیتے تھے، ان میں سے بعض کی کملیاں ایسی تھیں جو آدھی پنڈلی تک آجاتی تھیں اور بعض کی ایسی کہ ٹخنوں تک آجاتی تھیں، اور استعمال کرنے والا اس کو اپنے ہاتھ سے اس خطرہ سے سمیٹ لیتا تھا کہ شرمگاہ نہ کھل جائے۔

**مقصد ترجمہ** باب کا مقصد وہی ہے جو پچھلے باب میں بیان کردیا گیا ہے، البتہ وہاں یہ تذکرہ تھا کہ عورت مسجد میں سوسکتی ہے یا نہیں؟ اور چونکہ روایت میں ایک باندی کے قیام کا ثبوت تھا، اس لیے امام بخاریؒ نے ترجمہ میں بھی مفرد لفظ کا استعمال کیا تھا "نوم المرأة فی المسجد" اس باب کے تحت یہ بھی واضح کردیا گیا تھا کہ مردوں

کے مقابلہ پر عورت کا مسجد میں سونا زیادہ قابل اشکال ہے، اس لیے امام بخاری نے اس کو مستقلاً ذکر کر دیا، اس باب میں مردوں کے مسجد میں سونے کا جواز بیان کرنا چاہتے ہیں، اور چونکہ کئی روایات میں مردوں کے مسجد میں رہنے اور سونے کا ثبوت ہے، اس لیے ترجمہ میں جمع کا صیغہ " نوم الرجال في المسجد " استعمال کیا گیا ہے۔

اس مسئلہ کو واضح کرنے کی وجہ یہ ہے کہ بعض روایات میں مسجد میں سونے سے ممانعت وارد ہوئی ہے، حضرت جابر سے روایت ہے " قوموا لا ترقدوا في المسجد " کہ یہاں سے کھڑے ہو جاؤ کہ مسجد میں سونے کی اجازت نہیں ہے، حضرت ابن عباس سے منقول ہے کہ وہ نماز کے ارادہ سے آنے والوں کے لیے انتظار کے دوران سونے کی اجازت دیتے ہیں، جو نماز کا منتظر نہیں ہے اس کے لئے سونے کو مکروہ قرار دیتے ہیں، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ہر حال میں مسجد میں سونے کی کراہت منقول ہے، امام مالکؒ سے یہ تفصیل منقول ہے کہ اگر کسی کے پاس جائے سکونت ہے تو مسجد میں سونا مکروہ ہے اور جائے قیام نہیں ہے تو سونے کی اجازت ہے۔

لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود جمہور علماء جواز ہی کے قائل ہیں، امام بخاریؒ نے ترجمہ منعقد کر کے جمہور کے قول کی تائید کی ہے کہ مردوں کے لیے ضرورت کے وقت مسجد میں سونے کی اجازت ہے۔　　واللہ اعلم

## ترجمہ کا ثبوت اور تشریح روایات

مدعا کے ثبوت میں امام بخاری نے دو تعلیقات اور تین روایات ذکر کی ہیں: پہلی تعلیق قبیلہ عکل کے لوگوں کے بارے میں ہے جن کے متعلق تفصیلی روایت کتاب الطہارۃ میں گذر چکی ہے کہ ان لوگوں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر پہلے تو اسلام قبول کیا، پھر مدینہ طیبہ کی آب و ہوا موافق نہ آنے کی شکایت کی تو آپؐ نے انھیں صدقہ کے اونٹوں میں جانے کی اجازت دیدی، وہاں جا کر انھوں نے راعی کو قتل کر دیا اور اونٹوں کو لے کر بھاگ گئے، پھر ان کو تلاش کر لیا گیا اور سخت سزا دی گئی۔

امام بخاریؒ کا مقصد یہاں اس کے نقل کرنے سے یہ ہے کہ ان لوگوں کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا گیا، معلوم ہوا کہ مسافر کے لیے مسجد میں رہنا اور سونا جائز ہے۔

دوسری تعلیق اصحاب صفہ کے بارے میں ہے، عبدالرحمان بن ابی بکر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صفہ میں رہنے والے صحابہ فقراء اور غریب تھے یعنی ان کے رہنے کا کوئی مسکن نہ تھا، اس لیے ان کا رہنا سونا سب صفہ میں ہوتا تھا اور صفہ مسجد نبوی کا وہ حصہ تھا، جس پر سائبان پڑا ہوا تھا، جس میں مسجد نبوی کے غریب و نادار طلبہ رہتے تھے، بخاری کا مدعا ثابت ہو گیا۔

ان تعلیقات کے بعد امام بخاری نے روایات ذکر کی ہیں، پہلی روایت میں حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنے بارے میں بیان کیا کہ جب وہ غیر شادی شدہ جوان تھے، تو وہ مسجد نبوی میں سو جایا کرتے تھے، معلوم ہوا کہ اگر کسی کے پاس رہائش کے لیے مکان نہ ہو، خواہ وہ مسافر نہ بھی ہو تب بھی وہ مسجد میں سو سکتا ہے، رہا احتلام کا اندیشہ تو اس کی وجہ سے بھی سونے کی ممانعت نہیں ہے۔

دوسری روایت میں حضرت علیؓ کے بارے میں آیا کہ وہ حضرت فاطمہؓ سے ناراض ہوئے اور مسجد نبوی میں جا کر سو گئے، سرکار دو عالم ﷺ نے تلاش کرایا اور بلا کر لائے۔ معلوم ہوا کہ مسافر اور بے گھر انسان ہی نہیں وہ حضرات جن کے پاس جائے سکونت ہو؛ لیکن وہ بھی کسی مصلحت سے مسجد میں سونا چاہیں تو اس میں تنگی نہیں ہے، کیوں کہ حضرت علی اپنے گھر سے خفا ہوئے تو خدا کے گھر میں آ کر سو گئے اور پیغمبر علیہ السلام نے اس موقعہ پر مسجد میں سونے سے منع نہیں کیا، بلکہ ایک مصلحت سے ان کی دلجوئی فرمائی۔

تیسری روایت میں اصحاب صفہ کے بارے میں حضرت ابو ہریرہ نے بیان کیا کہ میں نے ستر اصحاب صفہ کو دیکھا کہ ناداری کے سبب ان میں سے کسی کے پاس بھی مکمل لباس نہیں تھا، الفاظ ہیں ''مامنهم من احد علیه رداء'' ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں تھا، جس کے پاس چادر ہو، رداء کہتے ہیں اس چادر کو جسے جسم کے بالائی حصہ کے ستر کے لیے استعمال کیا جائے، اس لیے ایک ترجمہ تو یہ ہے کہ جسم کے بالائی حصہ کے ستر کے لیے کوئی مستقل کپڑا نہ ہوتا تھا، بلکہ ایک ہی کملی ہوتی تھی، جسے وہ گردن میں گرہ باندھ کر پورے جسم کے ستر کے لیے استعمال کرتے تھے، اور ایک ترجمہ کیا ہے شیخ الاسلام دہلوی نے ''نبود از ایشاں مردے کہ بروے چادرے باشد بالائے ازار'' (شیخ الاسلام ص ۱۴۱ ج ۱) ان میں ایک مرد بھی ایسا نہیں تھا کہ اس کے پاس ازار کے ساتھ اوپر کے لیے چادر ہو، یہ ترجمہ زیادہ صاف ہے کہ کسی کے پاس بھی جسم کے دو حصوں کے لیے الگ الگ لباس نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ جب فقر کا یہ عالم ہے کہ پہننے کیلئے لباس نہیں ہے تو رہنے کے لیے مکان کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ اور ایسی صورت میں ان کا سونا بھی مسجد ہی میں تھا۔

ان تمام واقعات سے بخاری نے یہ ثابت کر دیا کہ مردوں کے لیے مسجد میں سونے کی اجازت ہے، مگر یہاں بھی یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ یہ مسجد میں سونے کی ترغیب نہیں ہے، بلکہ یہ اجازت محض وقت ضرورت کے لیے ہے؛ ورنہ ''ان المساجد بنیت لمابنیت له'' مسجدوں کی تعمیر کا مقصد اصلی عبادت ہے، یعنی نمازوں کا قیام۔ واللہ اعلم

## [۵۹] بَابُ الصَّلٰوةِ اِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ

وَقَالَ كَعْبُ بْنُ مَالِكٍ كَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا قَدِمَ مِنْ سَفَرٍ بَدَأَ بِالْمَسْجِدِ فَصَلّٰى فِيْهِ

(۴۴۳) حَدَّثَنَا خَلَّادُ بْنُ يَحْيٰى قال حدثنا مِسْعِر قَالَ حَدَّثَنَا مُحَارِبُ بْنُ دِثَارٍ عن جَابِرِ بْنِ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ اَتَيْتُ النَّبِیَّ ﷺ وَهُوَ فِی الْمَسْجِدِ. قال مِسْعِرٌ أراه قال ضُحًی فَقَالَ صَلِّ رَكْعَتَيْنِ وَكَانَ لِیْ عَلَيْهِ دَيْنٌ فَقَضَانِیْ وَزَادَنِیْ. (آئندہ ۱۸۰۱، ۲۰۹۷، ۲۳۰۹، ۲۳۸۵، ۲۳۹۴، ۲۴۰۶، ۲۴۷۰، ۲۶۰۳، ۲۶۰۴، ۲۷۱۸، ۲۸۶۱، ۲۹۶۷، ۳۰۸۷، ۳۰۸۹، ۳۰۹۰،

۴۰۵۲، ۵۰۷۹، ۵۰۸۰، ۵۲۴۳، ۵۲۴۴، ۵۲۴۵، ۵۲۴۶، ۵۲۴۷، ۵۳۶۷، ۶۳۸۷)

**ترجمہ** سفر سے واپسی کے بعد نماز کا بیان۔ حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ جب سفر سے واپس آتے تو سب سے پہلے مسجد میں تشریف لاتے اور وہاں نماز پڑھتے۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ مسجد میں بیٹھے تھے، مسعر کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چاشت کا وقت تھا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دو رکعت نماز پڑھ لو، حضرت جابر کہتے ہیں کہ میرا رسول اللہ ﷺ کے ذمہ قرض تھا، جو آپ نے ادا فرمایا اور قرض سے زیادہ عطا فرمایا۔

**مقصد ترجمہ** مقصد ظاہر ہے سفر سے واپسی کے بعد بخیر وسلامت وطن لوٹنے کی وجہ سے شکرانہ کے طور پر جو دو رکعت ادا کی جاتی ہیں ان کا استحباب بیان کرنا چاہتے ہیں، اس نماز کو "تحیۃ القدوم من السفر" کہتے ہیں، یہ مسجد کا بھی حق ہے اور سفر سے بخیر واپسی کا شکرانہ بھی۔

**تشریح حدیث** ترجمہ کے ثبوت میں پہلے تو امام بخاری نے حضرت کعب بن مالک کی روایت تعلیقاً ذکر کی ہے۔ یہ حضرت کعب بن مالک کی روایت کا ایک حصہ ہے جس میں غزوۂ تبوک میں شرکت سے محرومی اور اپنی توبہ کی تفصیلات ذکر کی ہیں، اس میں حضرت کعب نے رسول اکرم ﷺ کا یہ عمل نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ سفر سے واپس ہوتے تو مسجد میں تشریف لے جاتے اور وہاں دو رکعت نماز ادا کرتے، بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ نماز کے بعد مسجد میں کچھ دیر قیام بھی ہوتا، تاکہ آنے جانے والے ملاقات کا شرف حاصل کرلیں۔

اس کے بعد امام بخاری نے حضرت جابر کی روایت ذکر کی ہے، تاکہ حضرت کعب کی عملِ رسول اللہ ﷺ کے بیان پر مشتمل روایت کے بعد اس سلسلہ میں آپ کی قولی روایت بھی آجائے اور معلوم ہوجائے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات میں سے نہیں ہے، بلکہ آپ نے حضرت جابر کو بھی اس نماز کی ادائیگی کی ہدایت فرمائی۔

یہاں حضرت جابر کی اس روایت میں سفر کا تذکرہ نہیں ہے، مگر تفصیلی روایات میں خود بخاری ہی میں ہے کہ غزوہ سے واپسی کے موقع پر حضرت جابر جس اونٹ پر سوار تھے، وہ تھک گیا تھا، آپ ادھر سے گذرے تو آپ نے ایک چھڑی لگادی اور دعا دی، پھر کیا تھا اونٹ تیز چلنے لگا، حضور ﷺ نے حضرت جابر سے فرمایا کہ یہ اونٹ ہمیں فروخت کردو، ابتداءً حضرت جابر نے انکار کیا، لیکن آپ کے اصرار کے بعد فروخت کردیا، پھر پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت جابر کو اسی اونٹ پر مدینہ تک سفر کی اجازت دی، مدینہ واپس ہوئے تو سرکار دو عالم ﷺ رات کے آخر میں پہلے پہنچ گئے، حضرت جابر صبح کے وقت پہنچے، حضرت جابر نے آپ کی خدمت میں اونٹ پیش کردیا، آپ نے پہلے تو دو رکعت نماز پڑھنے کی ہدایت کی، پھر قیمت ادا فرمادی، حضرت جابر چلنے لگے تو آپ نے واپس بلایا اور اونٹ حضرت جابر کے حوالہ کردیا۔

بہرحال روایت میں یہ آیا کہ حضرت جابر سفر سے واپسی کے بعد خدمت اقدس میں اونٹ کی قیمت لینے کے

ارادے سے پہنچے تو آپ نے دو رکعت نماز ادا کرنے کا حکم دیا، سفر سے واپسی کے بعد دو رکعت نماز پڑھنے کا استحباب معلوم ہو گیا۔ واللہ اعلم

## [۶۰] بَابٌ اِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يَجْلِسَ

(۴۴۴) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَمْرِو بْنِ سُلَيْمِ الزُّرَقِيِّ عَنْ اَبِي قَتَادَةَ السَّلَمِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ اِذَا دَخَلَ اَحَدُكُمُ الْمَسْجِدَ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ قَبْلَ اَنْ يَجْلِسَ. (آئندہ:۱۱۶۳)

**ترجمہ** باب، جب تم میں سے کوئی مسجد میں جائے تو پہلے دو رکعت نماز پڑھے۔ حضرت ابو قتادہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی انسان جب مسجد میں داخل ہو تو اسے بیٹھنے سے پہلے دو رکعت پڑھنی چاہئے۔

**مقصد ترجمہ** مسجد میں داخل ہوتے ہی دو رکعت نماز پڑھنے کا حکم بیان کرنا چاہتے ہیں، یہ دو رکعتیں ''تحیۃ المسجد'' کے نام سے موسوم ہیں، جمہور اس کو مستحب کہتے ہیں، ابن بطالؒ نے اہل ظاہر سے اس کا وجوب نقل کیا ہے، نیز یہ کہ حنفیہ کے نزدیک اس استحباب پر عمل کرنے کی تفصیل یہ ہے کہ جن اوقات میں نوافل کی اجازت ہے ان اوقات میں مسجد میں داخل ہونے والے کو اس کی رعایت کرنی چاہئے، لیکن جن اوقات میں نفل کی ممانعت ہے اگر ان اوقات میں مسجد میں داخل ہونے کا اتفاق ہو تو آنے والا تحیۃ المسجد کا مکلف نہیں ہے، کیونکہ حضرت عقبہ بن عامرؓ سے مسلم شریف اور دوسری کتابوں میں روایت موجود ہے: '' **ثلث اوقات نهانا رسول الله ﷺ ان نصلی فيها وان نقبر فيها موتانا: عند طلوع الشمس حتى ترتفع وعند زوالها حتى تزول وحين تضيف للغروب**'' (اخرجہ مسلم والاربعۃ الا البخاری)

تین اوقات کے بارے میں ہمیں رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا کہ ہم ان میں نماز پڑھیں یا اپنے مردوں کی نماز جنازہ پڑھیں، ایک طلوع آفتاب کے وقت یہاں تک کہ وہ بلند ہو جائے، دوسرے زوال کے وقت یہاں تک کہ زوال ختم ہو جائے اور ایک غروب کے وقت۔

احناف حضرت عقبہ بن عامر کی رویت میں آنے والی نہی کو عموم پر محمول کرتے ہیں کہ جب ان اوقات میں نماز سے ممانعت کر دی گئی تو اس وقت تحیۃ المسجد کی بھی اجازت نہیں ہے، لیکن شوافع نے اس نہی کو عموم پر محمول نہیں کیا، وہ کہتے ہیں کہ جن نمازوں اور نوافل کے اسباب معلوم ہیں ان کے بارے میں نہی نہیں ہے، تحیۃ المسجد کا سبب مسجد میں داخل ہونا ہے، اس لیے اس سبب کے ہوتے ہوئے کسی وقت کی قید نہیں ہے۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** روایت باب معنی مرادی پر دلالت کرنے میں واضح ہے کہ آپ ﷺ نے مسجد میں داخل ہونے والے ہر انسان کو دو رکعت نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے، یہ حکم وجوب پر محمول نہیں کیا جاسکتا کیوں کہ صحابہؓ کرامؓ سے مسجد نبوی میں جانا اور تحیۃ المسجد کی پابندی نہ کرنا ثابت ہے، نیز امام طحاوی نے واجب نہ ہونے پر یہ استدلال بھی قائم کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ مسجد میں لوگوں کی گردنوں کے اوپر سے گذر رہا ہے تو آپ ﷺ نے اس سے یہ تو فرمایا کہ " اجلس فقد آذیت " بیٹھ جاؤ تم نے تکلیف پہنچائی ،لیکن آپ نے اس کو تحیۃ المسجد پڑھنے کا حکم نہیں دیا، معلوم ہوا کہ تحیۃ المسجد واجب نہیں ہے۔

روایت میں ایک لفظ ہے " قبل ان یجلس " کہ تحیۃ المسجد بیٹھنے سے پہلے پڑھنا چاہئے، شوافع اس کے قائل ہیں کہ داخل ہونے کے بعد بیٹھنے سے پہلے تحیۃ المسجد کی نماز پڑھنی چاہئے ، بیٹھ گیا تو وقت فوت ہو جائے گا؛ لیکن حنفیہ کہتے ہیں کہ یہ وقت مستحب کا بیان ہے، بیٹھنے سے تحیۃ المسجد کے فوت نہ ہونے کے لیے حضرت ابوذرؓ کی روایت موجود ہے:

"انه دخل المسجد فقال له النبی علیه الصلوة والسلام ارکعت رکعتین قال لا ثم قال قم فارکعهما" (ابن حبان، بحوالہ عمدۃ القاری ص:۲۰۲/ ج:۴)

حضرت ابوذرؓ مسجد میں داخل ہوئے تو ان سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ دو رکعت نماز پڑھ لی؟ تو انھوں نے عرض کیا نہیں، پھر آپ نے فرمایا کہ کھڑے ہو جاؤ اور دو رکعت پڑھ لو۔ معلوم ہوا کہ بیٹھنے کے بعد بھی تحیۃ المسجد کا وقت باقی رہتا ہے۔ واللہ اعلم

## [۶۱] بَابُ الْحَدَثِ فِی الْمَسْجِدِ

(۴۴۵) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ اَبِی الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اِنَّ الْمَلآئِكَةَ تُصَلِّی عَلٰی اَحَدِكُمْ مَادَامَ فِیْ مُصَلَّاهُ الَّذِیْ صَلّٰی فِیْهِ مَالَمْ یُحْدِثْ تَقُوْلُ اللّٰهُمَّ اغْفِرْلَه اللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ . (گذشتہ:۱۷۶)

**ترجمہ** باب، مسجد میں وضو ٹوٹ جانے کا بیان۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بے شک فرشتے تم میں سے کسی بھی شخص کے لیے رحمت کی دعاء کرتے رہتے ہیں، جب تک وہ نماز پڑھنے کی جگہ میں وضو ٹوٹنے سے پہلے بیٹھا رہے، فرشتے دعا کرتے ہیں کہ اے اللہ! اس کی مغفرت فرما دے۔ اے اللہ! اس پر رحم فرما۔

**مقصد ترجمہ** حدث سے مراد حدث اصغر یعنی وضو ٹوٹنا ہے، حدث اکبر یعنی جنابت نہیں ہے، حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ امام بخاریؒ اس باب میں ان لوگوں کا رد کرنا چاہتے ہیں جنھوں نے جنبی کی طرح بے وضو کو بھی مسجد میں داخل ہونے یا بیٹھنے سے منع کیا ہے، لیکن صاف بات یہ ہے کہ امام بخاری اس باب میں یہ وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ

مسجد میں وضوٹوٹ جانے کا کیا حکم ہے؟ یعنی اگر مسجد کے اندر ریح خارج کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو ایسا کرنا جائز ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ مسجد میں حدث بے ادبی ہے، احترام مسجد کے خلاف ہے اور فرشتوں کے لیے باعث اذیٰ و تکلیف ہے، اس لیے احتراز کرنا چاہئے، لیکن فقہ کی اصطلاح میں اس کو حرام قرار دیا جائے گا، یا مکروہ؟ تو حنفیہ میں بعض حضرات نے اسے مکروہ تنزیہی قرار دیا ہے، کبیری نے "غایت" سے کراہت تحریمی کا قول نقل کیا ہے، شوافع میں نووی نے شرح مہذب میں یہ لکھا ہے کہ مسجد میں ریح خارج کرنا حرام نہیں ہے، لیکن سروجی نے اسے مکروہ قرار دیا ہے، امام بخاری کے طرز عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے جائز اور خلاف اولیٰ قرار دے رہے ہیں، مگر ان تمام تفصیلات کے ساتھ یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ معتکف اس حکم سے مستثنیٰ ہے؛ کیونکہ وہ پابند ہے اور حوائج ضروریہ کے علاوہ مسجد سے باہر قدم نہیں نکال سکتا اور روزہ کی بنیاد پر اس کے منھ کی بو بھی اللہ کے نزدیک مشک سے زیادہ پسندیدہ ہے؛ اس لیے حدث بھی قابل معافی ہونا چاہئے۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** عنوان ہے مسجد میں وضوٹوٹ جانے کا بیان اور اس کے ذیل میں حضرت ابوہریرہ کی روایت دی گئی ہے کہ فرشتے اس شخص کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں، جو نماز پڑھنے کے بعد مسجد میں باوضو رہے، دعاء یہ ہے کہ اے اللہ! اس کی مغفرت فرمادے، اس پر رحمت نازل فرما، مغفرت کا تعلق گناہوں کا ازالہ اور درگزر سے ہے، اور رحمت کا تعلق نزول کرم سے ہے، فرشتوں کی دونوں قسم کی دعائیں ملتی رہتی ہیں، اور وضوٹوٹ جائے تو یہ دعائیں ختم ہوجاتی ہیں، بس اس سے بخاری کا مدعا ثابت ہے کہ فرشتوں کی دعاؤں سے محرومی نے واضح کردیا کہ مسجد میں حدث کا لاحق ہونا مستحسن نہیں ہے، اگرچہ خلاف اولیٰ کے ساتھ جواز معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

## [۶۲] بَابُ بُنْيَانِ الْمَسْجِدِ

وَقَالَ اَبُوْ سَعِيْدٍ كَانَ سَقْفُ الْمَسْجِدِ مِنْ جَرِيْدِ النَّخْلِ. وَاَمَرَ عُمَرُ بِبِنَاءِ الْمَسْجِدِ وَقَالَ اَكِنَّ النَّاسَ مِنَ الْمَطَرِ وَاِيَّاكَ اَنْ تُحَمِّرَ اَوْ تُصَفِّرَ فَتَفْتِنَ النَّاسَ. قَالَ اَنَسٌ يَتَبَاهَوْنَ بِهَاثُمَّ لَا يَعْمُرُوْنَهَا اِلَّا قَلِيْلًا. وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ لَتُزَخْرِفُنَّهَا كَمَا زَخْرَفَتِ الْيَهُوْدُ وَالنَّصَارىٰ

(۴۴۶) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنَا يَعْقُوْبُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ حَدَّثَنَا اَبِيْ عَنْ صَالِحِ بْنِ كَيْسَانَ قَالَ ثَنَا نَافِعٌ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَخْبَرَهُ اَنَّ الْمَسْجِدَ كَانَ عَلٰى عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ مَبْنِيًّا بِاللَّبِنِ وَسَقْفُهُ الْجَرِيْدُ وَعُمُدُهُ خَشَبُ النَّخْلِ فَلَمْ يَزِدْ فِيْهِ اَبُوْبَكْرٍ شَيْئًا وَزَادَ فِيْهِ عُمَرُ وَبَنَاهُ عَلٰى بُنْيَانِهِ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِاللَّبِنِ وَالْجَرِيْدِ وَاَعَادَ عُمُدَهُ خَشَبًا ثُمَّ غَيَّرَهُ عُثْمَانُ فَزَادَفِيْهِ زِيَادَةً كَثِيْرَةً وَبَنٰى جِدَارَهُ بِالْحِجَارَةِ الْمَنْقُوْشَةِ وَالْقَصَّةِ وَجَعَلَ عُمُدَهُ مِنْ حِجَارَةٍ مَنْقُوْشَةٍ وَسَقَّفَهُ بِالسَّاجِ.

**ترجمہ** باب، مسجد کی تعمیر کا بیان۔ حضرت ابوسعید خدریؓ نے فرمایا کہ مسجد نبوی کی چھت کھجور کی ایسی شاخوں سے بنائی گئی تھی جن کے پتے صاف کر دیئے گئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی کی تعمیر کا حکم دیا اور فرمایا کہ لوگوں کو بارش سے محفوظ کر دو اور سرخ یا زرد رنگ کے استعمال سے پوری احتیاط کرنا، ایسا نہ ہو کہ رنگ کے استعمال سے لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کر دو۔ حضرت انس نے فرمایا کہ (آئندہ) لوگ مسجدوں کی تعمیر میں فخر کے لیے مقابلہ آرائی کریں گے مگر ان کو عبادت سے آباد بہت کم لوگ کریں گے اور حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ تم (آئندہ) مسجدوں کو ضرور اسی طرح نقش ونگار سے آراستہ کرو گے، جیسے یہود ونصاری نے اپنے عبادت خانوں کو کیا تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں مسجد نبوی کی تعمیر کچی اینٹوں سے کی گئی تھی، اس کی چھت میں کھجور کی بے پتوں کی شاخیں استعمال کی گئی تھیں اور اس کے ستون کھجور کی لکڑی کے تھے، حضرت ابوبکرؓ نے اس میں کوئی اضافہ نہیں کیا اور حضرت عمرؓ نے اس میں اضافہ کیا اور رسول اللہ ﷺ کے عہد مبارک کی بنیادوں ہی پر (توسیع) کے ساتھ کچی اینٹوں اور کھجور کی شاخوں سے نئی تعمیر فرما دی اور لکڑی کے ستونوں کی بھی تجدید کر دی، پھر حضرت عثمانؓ نے اس کو بدل دیا اور اس میں بہت زیادہ اضافے فرمائے، دیواروں کی تعمیر نقشیں پتھروں اور گچ سے کی اور ستون بھی منقش پتھروں کے لگوائے اور چھت سال کی لکڑی کی ڈالوادی۔

**مقصد ترجمہ** اس باب کا عنوان ہے "بنیان المسجد" مسجد کی تعمیر کا بیان اور دو ابواب کے بعد ایک عنوان آرہا ہے "باب من بنی مسجدا" یعنی مسجد کے تعمیر کرنے والے کی فضیلت کا بیان، ان دونوں ابواب میں فرق ہے، اس باب میں امام بخاری یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ مسجد کیسی ہونی چاہیے، اس کی شان کیا ہو، بانی کی نیت کیسی ہو، اور مسجد تعمیر میں کن باتوں اور کن اصولوں کی رعایت کی جائے وغیرہ۔ بخاری نے اس سلسلہ میں اصولی طور پر چند باتیں رکھ دی ہیں جن کی طرف ترجمۃ الباب کے تحت دیئے گئے، آثار اور روایت باب میں اشارات موجود ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر میں سادگی کا لحاظ رکھا جائے، مسجد دنیوی تکلفات سے پاک صاف ہوتا کہ نماز میں نمازی کی توجہ صرف عبادت کی طرف مبذول رہے، اگر دنیوی نقش ونگار، زیب وزینت اور بے جا تکلفات کا اہتمام کیا جائے گا تو توجہ میں یکسوئی نہ رہے گی اور اصل مقصد یعنی عبادت کا خشوع اور خضوع متاثر ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ مسجدیں نماز باجماعت کے لیے بنائی جاتی ہیں، اس لیے ان ضروریات کے مہیا کرنے کی طرف توجہ رکھنی چاہیے، جن کا تعلق نمازیوں کی راحت رسانی سے ہو، مثلاً یہ کہ مسجد مسقف اور چھت والی ہوتا کہ نماز پڑھنے والے سردی گرمی اور برسات کے موسم میں محفوظ رہیں، ورنہ ظاہر ہے کہ بارش کے موقع پر یا سخت گرمی اور سردی کے زمانہ میں نماز پڑھنے میں بہت دشواری ہوگی۔ تیسری اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر میں بانی کی نیت نام ونمود اور شہرت وغیرہ کی نہ ہو، بلکہ اخلاص کے ساتھ مسجد تعمیر کی جائے۔

ترجمۃ الباب میں آثار صحابہ کے ذریعہ مندرجہ ذیل تین باتوں کی طرف اشارہ کرکے روایت باب سے چوتھی بات کی طرف اشارہ کردیا کہ حالات تبدیل ہوجائیں، تو بقدر ضرورت اضافہ اور استحکام کی رعایت بھی مناسب ہے، بلکہ ضروریات زمانہ کے مطابق اس کو سادگی کے باوجود شاندار بنانے کی بھی اجازت ہے، چھت بھی بلند کی جاسکتی ہے اور مسجد کی عظمت قائم کرنے کے لئے دوسری چیزوں کی رعایت بھی کی جاسکتی ہے۔ واللہ اعلم

**تشریحات** ترجمۃ الباب اور روایت باب سے جو اشارات سمجھے گئے ان کو اصولی طور پر پیش کردیا گیا، ان کی تفصیل یہ ہے کہ امام بخاری نے اس باب میں حضرت ابوسعید خدریؓ، حضرت عمرؓ، حضرت انسؓ اور حضرت ابن عباسؓ کے چار آثار اور حضرت ابن عمرؓ کی روایت پیش کی ہے۔

پہلا اثر حضرت ابوسعید خدریؓ سے ہے کہ مسجد نبوی کی چھت کھجور کی شاخوں سے بنائی گئی تھی، مطلب یہ ہے کہ کڑیوں کی جگہ کھجور کی شاخیں تھیں، گویا ایک طرح کا چھپر تھا جس میں گرمی سے حفاظت ہوجاتی تھی، باقی کوئی انتظام نہ تھا، بارش کے زمانہ میں یہ اس طرح ٹپکتا تھا کہ خود بخاری میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ بادل اٹھا اور برسنے لگا، چھت کھجور کی شاخوں کی تھی، نماز قائم کی گئی تو میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے سجدے کی جگہ میں بھی مٹی اور پانی تھا اور آپ کی پیشانی پر مٹی لگ گئی تھی، اس اثر کو نقل کرکے امام بخاری نے مسجد کی تعمیر میں سادگی کا اصول اپنانے کی طرف اشارہ کیا کہ مسجد کو دنیوی تکلفات سے پاک رکھا جائے۔

دوسرا اثر حضرت عمرؓ سے ہے کہ جب انھوں نے اپنے عہد خلافت میں مسجد نبوی کی تجدید کرائی تو معماروں کو ہدایت دی کہ میرا مقصد نمازیوں کے لیے بارش سے حفاظت کا سامان کرنا ہے، تاکہ لوگ بارش کے زمانہ میں سکون کے ساتھ نماز پڑھ سکیں، یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ رنگ وروغن اور گلکاری کرکے اور مختلف رنگ استعمال کرکے لوگوں کو فتنہ میں مبتلا کیا جائے، حضرت عمرؓ کے اس ارشاد سے دوسرے اصول یعنی نمازیوں کی راحت رسانی کے انتظام اور پہلے اصول یعنی سادگی کی رعایت کی اہمیت معلوم ہوئی۔

حضرت عمرؓ کے ارشاد میں " اکن الناس من المطر " فرمایا گیا ہے " اکن " کو ثلاثی بھی پڑھا گیا ہے اور باب افعال سے بھی، ثلاثی ہو تو یہ باب نصر سے مضارع کا صیغہ ہے، ترجمہ ہوگا کہ میں لوگوں کو بارش سے محفوظ کرنا چاہتا ہوں، اور باب افعال سے ہو تو اس کو مضارع کا صیغہ بھی پڑھا گیا ہے اور امر کا بھی، مضارع کا صیغہ ہو تو ثلاثی کے ہم معنی ہوگا، ثلاثی یا باب افعال سے مضارع پڑھنے کی صورت میں پہلا جملہ " اکن الناس من المطر " حضرت عمر کا اپنے بارے میں اظہار خیال ہوگا، اور دوسرا جملہ ایاک ان تحمر الخ معمار سے خطاب ہوگا، اس لیے پہلے جملہ کے بعد دوسرے جملہ میں التفات ماننا پڑے گا، اور امر کا صیغہ ہو تو دونوں جملے معماروں کی ہدایت سے متعلق ہوں گے کہ ایک بات تو یہ ہے کہ تم لوگوں کو بارش سے محفوظ کردو اور دوسری بات یہ ہے کہ رنگ اور زیب وزینت سے اجتناب ضروری ہے۔ اس صورت میں

التفات ماننے کی ضرورت نہیں۔

تیسرا اثر حضرت انسؓ سے ہے کہ لوگ مسجدوں کے سلسلے میں ایک دوسرے کے مقابل فخر کریں گے اور وہ جو مسجد کا مقصد اصلی ہے کہ اس کو آباد کیا جائے اس کی طرف کم توجہ کی جائے گی، یہ اثر صحیح ابن خزیمہ میں حضرت انسؓ سے رسول اللہ ﷺ سے مرفوعاً منقول ہے، ابوقلابہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت انس کے ساتھ ایک مسجد کے پاس گذرے تو فرمایا کہ:

| | |
|---|---|
| قال انس ان رسول اللہ ﷺ قال یاتی علی الناس زمان یتباھون بالمسجد ثم لا یعمرونھا الا قلیلاً . (عینی ص:۲۰۴/ ج:۴) | کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جب وہ مسجد کے معاملے میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے، پھر یہ کہ اس کو آباد کرنے والے بہت کم ہوں گے۔ |

ابوداؤد، نسائی وغیرہ میں بھی مرفوعاً ان الفاظ میں نقل ہے:

| | |
|---|---|
| عن انس قال قال رسول اللہ ﷺ ان من اشراط الساعۃ ان یتباھی الناس فی المساجد. رواہ ابو داؤد والنسائی . (مشکوٰۃ ص:۶۹/ ج:۱) | حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ علامات قیامت میں سے یہ ہے کہ لوگ مسجدوں کے معاملہ میں ایک دوسرے پر فخر کریں گے۔ |

بہرحال حضرت انسؓ کا یہ اثر مرفوعاً بھی منقول ہے، امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں ذکر کر کے تیسرے اصول کی وضاحت کی کہ مسجد کی تعمیر میں نام ونمود فخر ومباہات سے نیت کو پاک رکھا جائے اور صرف اخلاص کے ساتھ بنا کی جائے، تاکہ اخلاص کی کشش لوگوں کو مسجد کی طرف لائے اور مسجد جماعت، نماز، ذکر اور تلاوت وغیرہ کے ذریعہ خوب آباد ہو، ایک دوسرے کے مقابلہ پر نمائش اور برتری حاصل کرنے کے خیال سے تعمیر کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اسے قبولیت نصیب نہ ہوگی۔

چوتھا اثر حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ تم ضرور مسجدوں کو اسی طرح آراستہ وپیراستہ کرو گے جس طرح یہود ونصاریٰ اپنے عبادت خانوں کی تزئین کیا کرتے ہیں، ابوداؤد شریف کی روایت میں حضرت ابن عباس کے اس ارشاد سے پہلے یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے مسجدوں کے آراستہ، بلند اور نقش ونگار کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے اور ابن عباس نے اس کے بعد فرمایا کہ تم ضرور یہ کام کرو گے، روایت کے الفاظ یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| قال رسول اللہ ﷺ ما امرتُ بتشیید المساجد. قال ابن عباس لتزخرِفُنّھا کما زخرفت الیھود والنصاری . | رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مجھے مسجدوں کے بلند، آراستہ اور منقش کرنے کا حکم نہیں دیا گیا ہے، ابن عباس نے فرمایا کہ تم ضرور مسجدوں کو مزین |

کروگے جیسے یہود ونصاریٰ مزین کرتے ہیں۔ (ابوداؤد بحوالہ مشکوۃ ص:۶۹/ ج:۱)

اس اثر کے ذریعہ بھی امام بخاری پہلے اصول یعنی سادگی کی طرف متوجہ کررہے ہیں کہ حضرت ابن عباس کے ارشاد میں تنبیہ کی جارہی ہے کہ عبادت گاہوں میں زیب وزینت کے اہتمام کا یہ طریقہ یہود ونصاریٰ کا ہے، مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں مسجد تو خانۂ خدا ہے، اس میں دنیوی تکلفات اور ظاہری زیبائش کی کیا ضرورت ہے۔

بہر حال ان آثار صحابہ کے ذریعہ امام بخاری نے مساجد کی تعمیر کے سلسلہ میں سادگی، نمازیوں کی راحت رسانی اور اخلاص کے استحضار وغیرہ کی اصولی چیزوں کی نشاندہی فرمادی کہ مسجدوں کی تعمیر میں ان چیزوں کی رعایت ضروری ہے۔

**تشریح حدیث** حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ عہد رسالت میں مسجد نبوی کی دیواریں کچی اینٹوں اور چھت کھجور کی شاخوں کی تھی اور ستون بھی کھجور کی لکڑی کے تھے، عہد رسالت میں مسجد نبوی کی تعمیر دوبار ہوئی ہے، پہلی بار اس کی وسعت ۶۰ + ۶۰ ذراع تھی، خیبر کی فتح کے بعد توسیع فرمائی گئی اور اس کا رقبہ ۱۰۰+۱۰۰ ذراع کردیا گیا، لیکن تعمیر کے لیے جو چیزیں استعمال کی گئیں وہ دونوں مرتبہ میں وہی تھیں جن کا ابن عمر نے تذکرہ فرمایا، پھر حضرت ابوبکر صدیق ؓ کے زمانہ میں کوئی اضافہ عمل میں نہیں آیا، صرف بوسیدہ ستون تبدیل کیے گئے، البتہ حضرت عمرؓ کا عہد خلافت آیا تو حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ: ''زاد فیه عمر وبناه علی بنیانه فی عهد رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم'' کہ حضرت عمر نے اضافہ بھی کیا اور عہد رسالت کی بنیادوں کو بھی باقی رکھا، ان دونوں جملوں میں تعارض نہیں ہے، کیوں کہ پہلے جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت عمر نے جگہ میں اضافہ کیا، طول وعرض میں توسیع دی، یا جانب قبلہ میں دوصفوں کا اضافہ کیا۔ اور دوسرے جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے باوجود عہد رسالت کی بنیادوں کو بھی باقی رکھا اور تعمیر کیلئے سامان اور انداز بھی وہی برقرار رہا، یعنی وہی کچی اینٹ، وہی کھجور کی لکڑی کے ستون اور وہی کھجور کی شاخوں کی چھت، لیکن جب حضرت عثمانؓ کا دور خلافت آیا تو انھوں نے کمیت وکیفیت میں بہت اضافے فرمائے، طول وعرض دونوں ہی میں اضافہ کیا، ازواج مطہرات کے حجرات کو خرید کر مسجد نبوی میں شامل فرمایا اور سامان تعمیر میں بھی تبدیلیاں ہوئیں، کچی اینٹ کی جگہ پتھر استعمال کیے گئے۔ اور پتھر بھی وہ جو منقش تھے، الفاظ ہیں ''حجارة منقوشة'' اس کا ایک ترجمہ تو یہ ہے کہ پتھروں کو اس طرح سے گھڑا گیا کہ وہ ایک دوسرے سے پیوست ہوجاتے تھے، یعنی ان کی درزوں کو ملانے کے لیے انھیں توڑکر اور نقش کرکے برابر کیا گیا۔ اور دوسرا ترجمہ یہ ہوسکتا ہے کہ ان پتھروں میں نقش ونگار بھی تھے، یعنی پتھروں میں صنّاعی کا عمل کرکے نقشیں بنایا گیا تھا، یہ بھی مذکور ہے کہ یہ نقش ونگار حضرت عثمانؓ نے نہیں بنوائے تھے، بلکہ اتفاقاً اس زمانہ میں ایسے منقش پتھر دستیاب ہوگئے، تو انھیں حضرت عثمان نے مسجد نبوی میں استعمال فرمالیا۔

سامان تعمیر میں دیگر تبدیلیاں یہ ہوئیں کہ پتھروں کی تعمیر مٹی سے نہیں بلکہ گچ اور چونے سے کی گئی، ستون بھی

نقشیں پتھروں کے بنائے گئے، اور چھت میں کھجور کی شاخوں کے بجائے ساگون کی کڑیاں استعمال کی گئیں۔

حضرت عثمانؓ سے اس مخلصانہ عمل پر اس زمانہ میں اعتراضات بھی کئے گئے، جن کا جواب حضرت عثمان نے منبر پر آکر دیا، وہ روایت دو ابواب کے بعد "باب من بنی مسجدا" کے تحت آ رہی ہے۔

بہر حال حضرت عثمان غنیؓ کے عمل سے اصل یہ نکل آئی کہ مسجد کے اندر بقدر ضرورت اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے اور استحکام کی خاطر اپنے دور کا مضبوط ساز و سامان بھی استعمال کیا جا سکتا ہے، نیز سادگی کی رعایت کے ساتھ مسجد کو پر شوکت اور شاندار بھی بنایا جا سکتا ہے۔ واللہ اعلم

## [۶۳] باب التَّعاوُنِ فِيْ بِنَاءِ الْمَسْجِدِ

وَقَوْلِ اللهِ عَزَّوَجَلَّ مَاكَانَ لِلْمُشْرِكِينَ اَنْ يَعْمُرُوْا مَسَاجِدَ اللهِ شَاهِدِيْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خَالِدُوْنَ . اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسَاجِدَ اللهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللهَ فَعَسٰى اُولٰئِكَ اَنْ يَكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ. (توبہ:۱۷)

(۴۴۷) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ مُخْتَارٍ قَالَ حَدَّثَنَا خَالِدُ الْحَذَّاءُ عَنْ عِكْرَمَةَ قَالَ قَالَ لِيْ ابْنُ عَبَّاسٍ وَلِابْنِهِ عَلِيٍّ اِنْطَلِقَا اِلٰى اَبِيْ سَعِيْدٍ فَاسْمَعَا مِنْ حَدِيْثِهِ فَانْطَلَقْنَا فَاِذَا هُوَفِيْ حَائِطٍ يُصْلِحُهُ فَاَخَذَ رِدَآءَهُ فَاحْتَبٰى ثُمَّ اَنْشَأَ يُحَدِّثُنَا حَتّٰى اَتٰى عَلٰى ذِكْرِ بِنَآءِ الْمَسْجِدِ فَقَالَ كُنَّا نَحْمِلُ لَبِنَةً لَبِنَةً وَعَمَّارٌ لَبِنَتَيْنِ فَرَاٰهُ النَّبِيُّ ﷺ فَجَعَلَ يَنْفُضُ التُّرَابَ عَنْهُ وَيَقُوْلُ وَيْحَ عَمَّارٍ تَقْتُلُهُ الْفِئَةُ الْبَاغِيَةُ يَدْعُوْهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ وَيَدْعُوْنَهُ اِلَى النَّارِ قَالَ يَقُوْلُ عَمَّارٌ اَعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الْفِتَنِ . (آئندہ:۲۸۱۲)

**ترجمہ** باب، مسجد کی تعمیر میں تعاون باہمی کا بیان۔ اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ مشرکین اس لائق ہی نہیں ہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں، جب کہ وہ اپنے خلاف قول و عمل سے خود کفر کی گواہی دیتے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن کے سب اعمال اکارت ہو گئے، اور جہنم میں یہ لوگ ہمیشہ رہیں گے، اللہ کی مسجدوں کو آباد کرنا تو صرف ان لوگوں کا کام ہے جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے اور انھوں نے نمازوں کو قائم رکھا اور زکوۃ ادا کی اور اللہ کے علاوہ کسی سے نہیں ڈرے، پس امید ہے کہ یہ لوگ ہدایت یاب ہو جائیں۔ حضرت عکرمہؒ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے مجھ سے اور اپنے صاحبزادے علیؒ سے فرمایا کہ تم دونوں حضرت ابو سعید خدریؓ کی خدمت میں جاؤ اور ان سے احادیث سنو، چنانچہ ہم دونوں گئے تو یہ دیکھا کہ وہ ایک باغ میں ہیں اور اس کو درست فرما رہے ہیں (انھوں نے ہمیں دیکھا) تو اپنی چادر لی اور احتباء کر کے (یعنی سرین زمین پر رکھ کر گھٹنے کھڑے کر کے اور چادر کو کمر سے گھٹنوں تک لپیٹ کر) بیٹھ گئے

اوراحادیث سنانے لگے حتی کہ مسجد نبوی کی تعمیر کا ذکر آیا تو فرمایا کہ ہم لوگ ایک ایک اینٹ لاتے تھے، اور عمار دو دو اینٹیں لاتے تھے جب ان کو نبی اکرم ﷺ نے دیکھا تو ان کے جسم سے مٹی صاف کی اور فرمایا کہ عمار کی حالت قابل رحم ہے، ان کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی، عمار انھیں جنت کی دعوت دیں گے اور وہ عمار کو جہنم کی طرف بلائیں گے، حضرت ابوسعید نے فرمایا کہ عمار نے (یہ سنا تو) کہا کہ میں فتنوں سے اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔

**مقصد ترجمہ** امام بخاری کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ مسجد کون لوگ بنائیں اور کیسے مال سے بنائیں؟ امام بخاری نے آیت پیش کر کے بتلادیا کہ یہ خالص مسلمانوں کا کام ہے اور یہ صرف مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہی باہمی تعاون سے اس خدمت کو انجام دیں اور جب تک مسلمان معمار اور مزدور مل سکیں غیر مسلم سے کام بھی نہ لیا جائے، کیوں کہ یہ کام مسلمانوں کے ذمہ فرض کفایہ کے طور پر واجب ہوتا ہے۔ جب یہ بات ہے کہ تعمیر مسلمانوں کے ذمہ ہے تو اس سے یہ بھی نکلا کہ تعمیر میں جو مال صرف کیا جائے وہ بالکل پاک اور صاف ہو، مشرکین وکافرین کے اموال یا مسلمانوں کے ناجائز اموال خبث شامل ہونے کے سبب اس قابل نہیں ہیں کہ ان سے مسجد تعمیر کی جائے، اسی لیے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ مسجد میں غیر مسلم کا روپیہ نہ لگایا جائے، ابوالبرکات نسفی نے "المستصفی" میں اس کی تصریح کی ہے۔

امام بخاریؒ نے اپنے مقصد کے ثبوت میں آیت پاک کو پیش کیا ہے، بعض مفسرین نے اسی آیت کے ذیل میں امام اعظمؒ سے نقل کیا ہے کہ کافر کا روپیہ مسجد میں لگانا جائز نہیں ہے۔ جصاصؒ رازی حنفی نے "احکام القرآن" میں اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے:

عمارة المسجد تكون بمعنيين احدهما زيارته والسكون فيه والآخر ببنائه وتجديد مااسترم منه فاقتضت الآية منع الكفار من دخول المساجد ومن بنائها وتولي مصالحها والقيام بها لا نتظام اللفظ للامرين. (احکام القرآن جلد:۳/ص:۸۷)

مسجد کی آبادکاری کے دو معنی ہیں: ایک مسجد کی زیارت اور اس میں رہنا اور دوسرے اسکی تعمیر اور مرمت طلب حصہ کی مرمت، آیت کا تقاضہ یہ ہے کہ کفار کا مسجدوں میں داخل ہونا بھی ممنوع ہے اور مسجدوں کی تعمیر کرنا، اس کی مصلحتوں کا متولی ہونا یا انتظام کرنا بھی ممنوع ہے، کیوں کہ لفظ عمارة بھی دونوں معنی پر مشتمل ہے۔

البتہ کوئی کافر یا مشرک مسجد تعمیر ہی کرنا چاہے یا مسلم رعایا کے مطالبہ پر کافر حکومت یا کوئی جاگیردار کافر مسجد تعمیر کرے تو اس کے لیے فقہاء نے یہ حیلہ شرعی بیان کیا ہے کہ وہ کسی مسلمان کو رقم ہبہ کردے اور پھر یہ مسلمان اس رقم کو مسجد میں صرف کرے، نیز کافر کے چندہ کے بارے میں یہ تصریح فقہاء نے کی ہے کہ اس کو اصل مسجد میں نہ لگایا جائے، بلکہ خارج مسجد میں

جو مسجد کے متعلقات غسل خانہ، بیت الخلاء وغیرہ ہوتے ہیں، وہاں صرف کیا جائے، اگر چہ وہاں بھی صرف نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

اور اگر یہ صورت ہوئی کہ غیر مسلم کی رقم مسجد میں صرف کرنے کے لیے حیلہ شرعی نہیں کیا گیا، بلکہ اس نے پوری مسجد بنا کر مسلمانوں کے حوالے کر دی تو مولانا عبدالحئی لکھنوی کی رائے یہ ہے کہ وہ مسجد نہیں ہے، بلکہ عام گھروں کی طرح ایک گھر ہے، اس میں نماز پڑھنے سے مسجد میں نماز پڑھنے کا ثواب نہ ہوگا، لیکن قطب العالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کی رائے میں غیر مسلم اگر بہ نیت ثواب اور لوجہ اللہ مسجد بنا کر مسلمانوں کے حوالہ کر دے، تو وہ مسجد ہے اور اس میں نماز پڑھنے سے مسجد کا ثواب حاصل ہوگا، حضرت گنگوہی کی دلیل یہ ہے کہ حرم مکہ مشرکین کا تعمیر کیا ہوا تھا، رسول پاک ﷺ نے اس کو بعینہ باقی رکھا اور وہ مسلمانوں کی سب سے زیادہ قابل احترام مسجد ہے، پھر جب غیر مسلم کی جانب سے کی گئی مسجد کی مکمل تعمیر کا یہ حکم ہے تو ان کی جانب سے دیا گیا جزوی چندہ بھی مسجد میں لگانا جائز ہے، حضرت گنگوہی کے فتاویٰ میں اس کی تصریح موجود ہے، ان معلومات میں حضرت گنگوہی کی رائے زیادہ قوی اور راجح ہے، اگر چہ امام بخاری کے ترجمۃ الباب کا رجحان یہ نہیں ہے، بہر حال بخاری کا منشاء اور مدعا یہ ہے کہ پاک صاف مال سے مسلمان تعاون باہمی سے مسجد کی تعمیر کریں اور مشرکین کو اس کا موقع نہ دیں، مسلمان کارکنان خواہ معاوضہ لے کر کام کریں اور ان کو اجرت مال حلال سے ادا کی جائے، یا بلا معاوضہ کام کرنے پر راضی ہوں، بہر حال یہ صرف مسلمانوں کا حق اور ان کی ذمہ داری ہے۔

**تشریح حدیث** حضرت عکرمہ کہتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ نے مجھے اور اپنے صاحبزادے علی کو ہدایت کی کہ حضرت ابوسعید خدریؓ کی خدمت میں جاؤ اور ان سے احادیث سنو، یہ علی بن عبداللہ بن عباس بڑے عابد اور زاہد زبردست عالم اور صورت و سیرت میں نہایت خوبیوں کے مالک تھے، حضرت علیؓ کی شہادت والے دن پیدا ہوئے، تو ان کا نام علی رکھ دیا گیا، ان کے تذکرے میں مذکور ہے کہ ان کے پاس زیتون کے پانچ سو درخت تھے، ان کا معمول تھا کہ روزآنہ ہر درخت کے نیچے دو رکعت نفل ادا کرتے تھے، گویا ایک ہزار رکعت نفل روزانہ کا معمول تھا، بہر حال عکرمہ کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ کی ہدایت کے مطابق ہم دونوں حضرات ابوسعید خدریؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ وہ اپنے باغ میں کام کر رہے ہیں، معلوم ہوا کہ ہر انسان کو اپنے سے متعلق کاموں کی نگرانی خود کرنی چاہئے، بلکہ یہ کوشش کرنی چاہئے کہ وہ کام عملاً خود انجام دے، اس میں تواضع بھی ہے، اور بہت سے جسمانی اور روحانی فوائد ہیں۔

"**فاخذ رداءہ فاحتبیٰ الخ**" یعنی جب ہم نے عرض کیا کہ ہمیں حضرت ابن عباس نے آپ کی خدمت میں احادیث سننے کے لیے بھیجا ہے، تو انھوں نے باغ کا کام چھوڑ دیا اور پھر اپنی چادر لی اور سنبھل کر بیٹھ گئے اور احادیث سنانے لگے، معلوم ہوا کہ درسِ حدیث کے وقت محدث کو خاص اہتمام کرنا چاہئے، وہ لباس جو عام حالات میں پہنا جاتا ہے جس میں

بو وغیرہ پیدا ہو جاتی ہے، درس حدیث کے وقت مناسب یہ ہے کہ اس کو بدل دیا جائے، پھر یہ بھی نہیں کہ طلبہ کے جانے کے بعد حضرت ابوسعید خدری نے کچھ تاخیر فرمائی ہو کہ بیٹھ جایئے، میں فارغ ہو کر آتا ہوں، بلکہ ان کے جاتے ہی کام چھوڑ دیا اور اہتمام فرما کر حدیث سنانے کے لیے بیٹھ گئے۔

"حتی اتی علی ذکر بناء المسجد الخ" احادیث سناتے سناتے مسجد نبوی کی تعمیر کا ذکر آیا تو حضرت ابو سعید خدری نے فرمایا کہ اینٹیں دور سے لانی پڑتی تھیں اور ہم سب لوگ ایک ایک اینٹ لا رہے تھے اور حضرت عمارؓ دو دو، حضرت عمارؓ کے دو اینٹ لانے کی وجہ یہ تھی کہ ابتداء میں حضور پاک ﷺ بھی صحابہ کے ساتھ اینٹ لا رہے تھے، حضرت عمار نے گزارش کی کہ آپ اپنے حصہ کی اینٹ لانے کی مجھے اجازت دیں، میں خدمت انجام دونگا، آپ نے حضرت عمار کی پیش کش کو قبول فرمالیا۔

اس سے یہ ادب معلوم ہوتا ہے کہ اگر اکابر تواضع اور تعاون کے طور پر چھوٹوں کے ساتھ مشقت کا کام کرنا چاہیں تو اصاغر کو ان کے حصہ کا کام کرنے کی پیش کش کرنی چاہئے اور بڑوں کو چاہئے کہ چھوٹوں کی اس پیش کش کو قبول فرمالیں، یہ حضرت عمارؓ کی انتہائی جفاکشی کی بات ہے، کیوں کہ صحابۂ کرام کا ایک ایک اینٹ لانا بتلا رہا ہے کہ یہ اینٹیں چھوٹی نہ ہوں گی، اتنی بڑی ہونگی کہ ایک ہی اینٹ لائی جاسکتی ہوگی، حضرت عمار رضی اللہ عنہ سابقین اولین اور ان صحابۂ کرام میں سے ہیں جن پر کفار نے ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے ہیں، ان کے فضائل کئی احادیث میں آئے ہیں، اسلام لانے کے بعد بڑی مشقتیں برداشت کیں اور ان پر صبر فرماتے رہے، ثواب آخرت کی طلب میں مشقت طلبی کا یہ عالم ہے کہ حضور پاک ﷺ کی اینٹ بھی اٹھا کر لا رہے ہیں۔ رضی اللہ عنہ وعن کل الصحابۃ اجمعین۔

"فرآہ النبی ﷺ الخ" حضور پاک ﷺ نے دیکھا کہ دو دو اینٹ لانے کے سبب حضرت عمار کے سر اور بدن پر غبار لگ گیا ہے، تو آپ نے اپنے دست مبارک سے غبار صاف کیا اور فرمایا "ویح عمار" عمار کی حالت قابل رحم ہے، ان کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی، عمار انھیں جنت کی طرف بلائیں گے اور وہ عمار کو جہنم کی طرف بلائیں گے، یہ سن کر حضرت عمار نے دعاء کی کہ میں فتنوں سے اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں۔

اس سے مختلف آداب معلوم ہوئے: ایک تو یہ کہ اصاغر اگر دینی کام میں مشقت برداشت کریں تو اکابر کو ان کی ہمت افزائی کرنی چاہئے اور دعاء دینی چاہئے، حضور پاک ﷺ ریت اور سر سے غبار صاف فرماتے جاتے ہیں اور دعا دیتے ہیں کہ ان کی حالت قابل رحم ہے، قابل رحم ہونے کی وضاحت میں آپ کی زبان سے نکلا کہ انھیں شہید کیا جائے گا، تو حضرت عمارؓ نے اللہ کی پناہ طلب کی، معلوم ہوا کہ ہمہ وقت فتنوں سے اللہ کی پناہ طلب کرنی چاہئے۔

### حضرت عمارؓ کی شہادت

حضور پاک ﷺ نے اس موقع پر حضرت عمارؓ کی شہادت کے بارے میں جو پیش گوئی فرمائی تھی وہ پوری ہوئی اور حضرت عمارؓ معرکہ صفین میں حضرت معاویہؓ کی جماعت

کے ہاتھوں ۳۷ھ میں شہید ہوئے، حضور ﷺ نے جو الفاظ استعمال فرمائے ہیں ان کی رو سے حضرت معاویہؓ کا خطاء اجتہادی پر ہونا متعین ہوگیا، آپ کے الفاظ یہ ہیں کہ عمار کو ایک باغی جماعت شہید کرے گی، جب کہ عمار ان کو جنت کی طرف بلا رہے ہوں گے اور وہ جماعت عمار کو جہنم کی طرف بلا رہی ہوگی۔ ان الفاظ میں یہ بات واضح اور صاف ہے کہ حضرت عمار جس جانب ہوں گے وہی جماعت حق پر ہوگی حضرت عمار کے بارے میں حضور ﷺ کے ارشادات میں یہ موجود ہے: " عمار ماعرض علیه امر ان الا اختار الارشد منهما " (ابن ماجہ ص:۱۴) عمار پر کبھی دو باتیں پیش نہیں کی گئیں، مگر انھوں نے ان میں سے رشد والی بات کو اختیار کیا۔

اس لئے جس جانب حضرت عمارؓ ہوں اس جانب حق کا ہونا ثابت ہے، صفین کے معاملہ میں حضرت عمار حضرت علیؓ کی طرف تھے، اس لیے یہ ثابت اور طے ہے کہ اس معاملہ میں حضرت علیؓ کا موقف درست اور حق تھا، چنانچہ تاریخ کی روایتوں میں ہے کہ حضرت عمار کی شہادت کے بعد حضرت عمرو بن العاص نے جو حضرت معاویہؓ کے دست راست تھے، قتال سے ہاتھ روک لیا اور ایک بڑی جماعت حق واضح ہونے کی بنیاد پر ان کے ساتھ ہوگئی، تو حضرت معاویہؓ نے حضرت عمرو بن العاص سے اس کا سبب دریافت کیا، انھوں نے جواب دیا کہ عمار کی شہادت سے ہمارے موقف کی غلطی واضح ہوگئی، کیوں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے " تقتله الفئة الباغية " ان کو وہ جماعت قتل کرے گی جو امام عادل کی اطاعت سے خروج کر کے بغاوت اختیار کرے گی، یہ سنکر حضرت معاویہ نے فرمایا کہ انھیں ہم نے کہاں قتل کیا ہے؟ اصل قاتل تو وہ ہیں جو انھیں میدان قتال میں لے کر آئے تھے، پھر بعض تاریخی روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ جب حضرت علیؓ کو حضرت معاویہ کا یہ جواب معلوم ہوا تو انھوں نے یہ تبصرہ فرمایا کہ اگر اس دلیل کی رو سے حضرت عمار کے قاتل ہم لوگ ہیں تو حضرت حمزہ کے قاتل تو حضور پاک ﷺ ہوئے کہ وہی انھیں کفار کے مقابلہ میں میدان قتال میں لے کر آئے تھے، پھر بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ جب حضرت معاویہ کو حضرت علی کا یہ جواب پہنچا تو وہ خاموش ہوگئے۔

## حضرت معاویہؓ کے موقف کی وضاحت

لیکن حضرت معاویہؓ کے موقف کی وضاحت میں اہل سنت والجماعت یہ کہتے ہیں کہ وہ بلاشک صاحب مناقب صحابی ہیں، اور دلائل کی روشنی میں تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں حسن ظن اور کف لسان کا امت کو مکلّف کیا گیا ہے، اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت معاویہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوتا تو وہ ہرگز ایسا نہ فرماتے، وہ تو اپنے بارے میں یہی سمجھ رہے تھے کہ حق ان کی جانب ہے، پھر یہ کہ حضرت معاویہ بھی تنہا نہیں ہیں ان کے ساتھ بھی صحابہؓ اور تابعینؒ کی ایک جماعت ہے، اور وہ سب یہ سمجھ رہے ہیں کہ ہم حق پر ہیں، حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قاتلین سے قصاص لینا ضروری ہے، اور حضرت علیؓ دانستہ قاتلین عثمان سے قصاص لینے کی طرف التفات نہیں کر رہے ہیں، جب کہ خلیفۂ راشد حضرت عثمانؓ

کے قتل کا قصاص لینا اہم واجبات میں سے ہے اور اگر قاتلوں اور مفسدوں کو اس طرح چھوڑ دیا جائے گا تو نظام کیسے چلے گا؟ ان کا مقصد خلیفۂ برحق کی اطاعت سے خروج ہرگز نہیں تھا، جب کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے مختلف مجبوریاں تھیں، اول تو قاتلین کا تعین نہیں تھا، اور دوسرے یہ کہ حضرت معاویہ شام پر قابض تھے اور حضرت علی کی خلافت کمزور تھی، اس لیے شرعی مصلحتوں کا تقاضہ یہ تھا کہ ابھی اس مسئلہ کو نہ چھیڑا جائے۔ غرض یہ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے چند در چند اعذار ہیں، مگر حضرت معاویہؓ کسی عذر کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، وہ فرماتے تھے کہ قاتلین سے قصاص لینے کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔

مگر اشکال یہ ہے کہ روایت باب میں دو لفظ آرہے ہیں، ایک تو یہ کہ حضرت عمار کے قاتلین کے لیے باغی کا لفظ استعمال کیا گیا ہے کہ انھیں وہ جماعت قتل کرے گی جو باغی ہوگی یعنی امام برحق کی اطاعت سے خروج کر کے بغاوت اختیار کرنے والی ہوگی، دوسرا لفظ یہ ہے کہ حضرت عمار ان کو جنت کی طرف بلا رہے ہوں گے اور وہ جماعت انھیں جہنم کی طرف بلا رہی ہوگی، اس لیے روایت سے ظاہر ہے کہ عمار کے قاتلین کی جماعت باغی اور جہنمی ہو، جب کہ اہل سنت والجماعت کا یہ مسلک نہیں ہے، اس اشکال کے مختلف جوابات دیئے گئے ہیں:

شارحین حدیث نے عام طور پر اس کا یہ جواب دیا ہے کہ باغی اور داعی الی النار کا اگرچہ ان حضرات پر اطلاق کیا گیا ہے اور واقعتاً ان سے یہ بات صادر بھی ہوئی، لیکن ان لوگوں کا عذر یہ ہے کہ وہ مجتہدین تھے اور ان کا ظن یہ تھا کہ نہ وہ بغاوت کر رہے ہیں اور نہ جہنم کی دعوت دے رہے ہیں، ان کا ظن یہ تھا کہ وہ قصاص واجب کا مطالبہ کر رہے ہیں اور جنت کی دعوت دے رہے ہیں اور مجتہد پر اپنے ظن کے مطابق عمل کرنا ضروری ہے، اس لیے یہ حضرات اپنے اس عمل میں معذور قرار دیئے جائیں گے؛ بلکہ مجتہد ہونے کی بنا پر انھیں خطأ اجتہادی والا ثواب ملے گا۔

**حضرت گنگوہیؒ کا ارشاد** حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ نے اسی مضمون کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ کسی فعل کا فی نفسہ موجب عقاب ہونا اس بات کے منافی نہیں ہے کہ گناہ کسی عارض کی بنا پر ختم کر دیا گیا ہو، یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی فعل بذات خود عقاب کا موجب ہو، لیکن کسی عارض کی وجہ سے عذاب کا حکم اس پر مرتب نہ کیا جائے۔ یہاں ایسا ہی ہے کہ حضرت معاویہ اور ان کے رفقاء سے فعل تو وہی سرزد ہوا جس پر عقوبت کا تذکرہ کیا گیا ہے، لیکن گناہ ساقط کر دیا گیا کہ یہ فعل ان سے خطأ اجتہادی کے طور پر صادر ہوا تھا، حضرت گنگوہی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی اس آیت سے اس مضمون کی تائید ہوتی ہے۔ ارشاد ہے: "لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ اَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ" اگر اللہ ہی کا ایک قانون پہلے سے نہ ہوتا، تو جو امر تم نے اختیار کیا اس کے بارے میں تم پر کوئی سخت سزا نازل ہوتی۔

آیت کی تفسیریں تو متعدد کی گئی ہیں، مگر ان میں ایک قابل قبول تفسیر یہ بھی ہے جس کی طرف ترجمہ میں اشارہ کر دیا

گیا ہے کہ کتاب سے مراد قانون ہے اور وہ قانون یہ ہے: "ان لا یعذب احدا علی العمل بالاجتهاد و کان هذا اجتهاد ا منهم" (مدارک) یعنی اللہ تعالی کسی شخص کو جسے اجتہاد کا حق ہو اجتہاد پر عمل کرنے کی وجہ سے عذاب نہیں دیتا۔

معلوم ہوا کہ جب حضرت معاویہ اور ان کے شریک کار صحابہ کرام خطأ اجتہادی کے طور پر ایک موقف اختیار کئے ہوئے تھے، تو ان کا فعل بظاہر بغاوت اور عقاب کا سبب سہی، لیکن حقیقت میں وہ عقاب کا سبب نہیں ہوگا۔

**حضرت علامہ کشمیریؒ کی تعبیر** حضرت علامہ کشمیریؒ نے ارشاد فرمایا کہ حضرت معاویہ کی جماعت پر "تقتله الفِئَة البـاغِيَة" تو صادق ہے اور اس کی توجیہ یہی ہے کہ یہ فعل ان حضرات سے خطأ اجتہادی کے طور پر صادر ہوا تھا، لیکن آگے جو ارشاد فرمایا جا رہا ہے: "يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار" اس کا تعلق حضرت معاویہ اور ان کی جماعت سے نہیں ہے، بلکہ یہ جملہ مستانفہ ہے اور ایک دوسری بات مشرکین کے بارے میں حضرت عمار کے تذکرے میں فرمائی گئی ہے، یعنی پہلے جملہ میں تو حضرت عمار کے بارے میں یہ فرمایا گیا کہ ان کی حالت قابل رحم ہے کہ ان کو ایک باغی جماعت شہید کرے گی اور دوسرے جملہ میں فرمایا گیا کہ ان کا معاملہ مشرکین کے ساتھ بھی بڑا قابل رحم رہا، مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹتے رہے، والدہ تک شہید کر دی گئیں، جب کہ حضرت عمار ان مشرکین کو جنت کی طرف دعوت دیتے تھے اور مشرکین انھیں جہنم کی طرف دعوت دیتے تھے۔

حضرت علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ ہم اس دوسرے جملہ "يدعونه الى النار" کو حضرت معاویہ اور ان کی جماعت پر اس لئے منطبق نہیں کرتے کہ بعینہ یہی بات قرآن کریم میں کفار کے بارے میں کہی گئی ہے، کفار کے ساتھ ازدواجی تعلقات کی ممانعت کے بعد ارشاد فرمایا گیا:

| | |
|---|---|
| أُولٰئِكَ يَدْعُوْنَ إِلَى النَّارِ وَاللّٰهُ يَدْعُوْ إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ (سورۃ البقرہ، آیت: ۲۲۱) | یہ لوگ (کافر) جہنم کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ جنت اور مغفرت کی طرف بلا رہا ہے۔ |

نیز فرعون کے ساتھ ایک مرد مومن کے مکالمہ کے دوران نقل فرمایا گیا ہے:

| | |
|---|---|
| يٰقَوْمِ مَالِيْ أَدْعُوْكُمْ إِلَى النَّجَاةِ وَتَدْعُوْنَنِيْ إِلَى النَّارِ (سورۃ غافر آیت ۴۰) | اے میری قوم! مجھے کیا ہے کہ میں تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے جہنم کی طرف بلا رہے ہو۔ |

تو جو بات کفار کے لیے کہی گئی ہو اس کو بعینہ صحابہ کرام پر منطبق کرنا درست نہیں ہے، اور اچھی توجیہ یہی ہے کہ "يدعونه الى النار" مشرکین کے بارے میں فرمایا گیا ہے، حافظ ابن حجر عسقلانی نے بھی "يدعوهم الى الجنة ويدعونه الى النار" والے جملے کو حضرت معاویہ اور ان کے رفقاء کے بارے میں تسلیم کرنے سے تامل کا اظہار کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ جملے حمیدی کی کتاب "الجمع بين الصحيحين" میں نہیں ہے اور حمیدی نے یہ بھی دعوی کیا ہے کہ امام بخاریؒ نے ان جملوں کا ذکر نہیں کیا ہے، نیز حافظ ابن حجر نے از روئے نقل ان جملوں کے بخاری میں ہونے سے انکار کی

کوشش کی ہے، مگر علامہ کشمیری فرماتے ہیں کہ یہ توجیہ قوی نہیں ہے، اس لیے کہ یہ جملے دوسرے مضبوط طرق سے ثابت ہیں، بہتر توجیہ یہی ہے کہ یہ جملے تو ثابت ہیں مگر ان کا تعلق حضرت معاویہؓ اور ان کی جماعت سے نہیں، بلکہ یہ مشرکین کے بارے میں ہیں۔ واللہ اعلم

نیز یہ کہ حضرت علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے ان جملوں کی جمہور کے ذوق کے مطابق توضیح فرماتے ہوئے کہا کہ باغی اور جہنم کے داعی ہونے کا اطلاق کرنے کی توجیہ یہ ہے کہ ان حضرات سے جن افعال کا صدور ہوا ان افعال کا حکم تو یہی ہے، لیکن افعال کا ارتکاب کرنے والوں کا کیا حکم ہے کہ وہ گناہ گار قرار دیئے جائیں گے، یا معذور سمجھے جائیں گے، یا ان افعال پر انھیں ثواب عطا کیا جائے گا؟ تو یہ دوسرے دلائل پر موقوف ہے۔ گویا کسی فعل کا سبب جہنم ہونا اور بات ہے، اور اسکے فاعل کا جہنمی ہونا دوسری بات ہے، سبب کے اوپر مسبب کا ترتب اس بات پر موقوف ہے کہ تمام شرائط پائے جائیں اور موانع نہ ہوں، کیوں کہ ایسا ہوتا ہے کہ سبب وجود میں آجاتا ہے، مگر مسبب وجود میں نہیں آتا، یہاں بھی ایسا ہی ہے کہ حضرت علیؓ کی خلافت راشدہ سے مقابلہ آرائی بغاوت ہے اور خلیفۂ راشد کی حمایت دعوت الی الجنۃ اور ان کے علی الرغم کوشش دعوت الی النار ہے، لیکن جو جماعت یہ کام کر رہی ہے اس میں مجتہدین صحابہؓ و تابعینؒ ہیں، اس لیے خطأ اجتہادی کی بنیاد پر نہ صرف یہ کہ وہ معذور ہیں؛ بلکہ انھیں ایک ثواب سے بھی نوازا جائے گا۔ واللہ اعلم

ان تمام تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ اگرچہ روایت میں حضرت معاویہؓ اور ان کے رفقاء پر باغی اور داعی الی النار کا اطلاق کیا گیا ہے، لیکن یہ بغاوت اور دعوت الی النار کا مضمون ان حضرات پر صرف صورۃً صادق آتا ہے، حقیقۃً نہیں، اس لیے عام امت کے لیے ان حضرات پر ان کا اطلاق جائز نہیں اور نہ علماء اہل سنت والجماعت میں سے کسی نے ان الفاظ کا ان لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے۔ واللہ اعلم

## [ ٦٤ ] بَابُ الْاِسْتِعَانَةِ بَالنَّجَّارِ وَالصُّنَّاعِ فِيْ اَعْوَادِ الْمِنْبَرِ وَالْمَسْجِدِ

(۴۴۸) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ عَنْ اَبِيْ حَازِمٍ عَنْ سَهْلٍ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم اِلَى امْرَأَةٍ: مُرِيْ غُلَامَكِ النَّجَّارَ يَعْمَلُ لِيْ اَعْوَادًا اَجْلِسُ عَلَيْهِنَّ. (گذشتہ:۳۷۷)

(۴۴۹) حَدَّثَنَا خَلَّادُ بْنُ يَحْيٰى قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ بْنُ اَيْمَنَ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَابِرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ اَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ يَا رَسُوْلَ اللهِ اَلَا اَجْعَلُ لَكَ شَيْئًا تَقْعُدُ عَلَيْهِ فَاِنَّ لِيْ غُلَامًا نَجَّارًا قَالَ اِنْ شِئْتِ فَعَمِلَتِ الْمِنْبَرَ. (آئندہ:۹۱۸، ۲۰۹۵، ۳۵۸۴، ۳۵۸۵)

**ترجمہ** باب، منبر کی لکڑیوں کو بنوانے اور مسجد کی تعمیر میں بڑھئی اور دوسرے کاریگروں سے مدد لینے کا بیان۔ حضرت سہل بن سعدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو کہلا بھیجا کہ تم اپنے اس غلام سے جو بڑھئی کا کام

جانتا ہے میرے لئے لکڑی کا (منبر) بنوادو جس پر بیٹھ کر میں خطبہ دیا کروں۔ حضرت جابر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ایک عورت نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ کیا میں آپ کے لیے ایک ایسی چیز نہ بنوادوں جس پر آپ بیٹھ جایا کریں؟ اس لیے کہ میرا ایک غلام بڑھئی کا کام کرتا ہے، آپ نے فرمایا کہ اگر تم چاہتی ہو (تو مضائقہ نہیں) چنانچہ اس نے منبر بنوادیا۔

**مقصد ترجمہ** مسجد کی تعمیر اور اس کے متعلقات کی تیاری میں مختلف کاریگروں سے مدد لینے کی ضرورت ہوتی ہے: معمار، مزدور، بڑھئی اور لوہار وغیرہ، امام بخاریؒ نے ترجمہ منعقد کر کے بتادیا کہ مسجد کی تعمیر میں ہر طرح کے کاریگروں سے مدد لینا جائز ہے، اگر یہ کاریگر حضرات خود توجہ کریں تو بہت اچھا ہے، خود متوجہ نہ ہوں تو توجہ دلائی جائے، بلا معاوضہ یا معاوضہ دے کر کام لیا جائے، مسلمان کاریگر مہیا نہ ہوں تو غیر مسلموں سے کام لیا جائے وغیرہ، گویا یہ سب جائز ہے۔

**تشریح حدیث** پہلی روایت میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت سے یہ کہلوایا کہ تم اپنے بڑھئی کا کام جاننے والے غلام سے ایک منبر بنوادو جس پر بیٹھ کر میں خطبہ دیا کروں، دوسری روایت میں یہ آیا کہ عورت نے خود حضور پاک ﷺ سے عرض کیا کہ میرا ایک غلام بڑھئی کا کام جانتا ہے، آپ فرمائیں تو میں اس سے آپ کے لیے منبر تیار کرادوں جس پر آپ بیٹھ سکیں، آپ نے ان کی پیش کش کو قبول فرمایا اور کہا کہ اگر تم چاہتی ہو تو بنوادو۔

پہلی اور دوسری روایت میں تعارض ہے کہ پہلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمائش کی اور دوسری سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت نے خود پیش کش کی تھی، دونوں میں تطبیق کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ جب عورت نے پیش کش کی تھی، اس وقت ضرورت نہیں تھی، پھر بھی آپ نے منبر کی تیاری کو ان کی مرضی پر محمول فرمادیا تھا، ابھی تیار نہیں ہوسکا تھا کہ ضرورت محسوس ہوئی تو آپ نے منبر کی تیاری کے لیے کہلا بھیجا، یہ توجیہ اس طرح بھی کی جاسکتی ہے کہ پہلے اس عورت نے خود درخواست کی تو آپ نے فرمادیا " ان شئت " کہ اگر تمہاری رائے ہو تو ٹھیک ہے، چنانچہ تیاری میں تاخیر ہوئی تو یاد دہانی کے طور پر آپ نے کہلوایا۔

بہر حال روایت سے یہ ثابت ہوگیا کہ مسجد اور اسکے متعلقات کی تیاری میں کاریگروں سے مدد لی جاسکتی ہے، روایت میں ذکر صرف بڑھئی کا ہے، لیکن بڑھئی اور دوسرے کاریگروں میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لیے ہر طرح کے کاریگروں سے کام لینے کا جواز معلوم ہوگیا، مسند احمد کی روایت میں گارا بنانے کے سلسلے میں حضرت طلق بن علی یمامی کا تذکرہ ہے کہ مسجد نبوی کی تعمیر کے موقع پر آپ نے فرمایا کہ " قربوا الیمامی من الطین " گارا بنانے کا کام طلق یمامی سے لیا جائے، بعض روایات میں یہ ہے کہ حضرت طلق نے عرض کیا کہ کیا دوسرے حضرات کی طرح مجھے بھی اینٹیں منتقل کرنے کا حکم ہے؟ تو فرمایا کہ نہیں، تم گارا بناؤ، یہ کام تم اچھا جانتے ہو۔

روایت میں ایک لفظ " اجلس علیھن " آیا ہے کہ میں اس منبر پر بیٹھوں گا، اس تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ خطبہ کے لیے قیام شرط نہیں اور یہ بات ان لوگوں کے مذہب کے مطابق ہے جن کے یہاں خطبہ میں قیام شرط نہیں، حنفیہ

کا مذہب یہی ہے، جن لوگوں کے یہاں خطبہ میں قیام شرط ہے وہ یہ تاویل کریں گے کہ خطبہ سے پہلے یا دو خطبوں کے درمیان بیٹھنے کا ذکر ہے، مگر یہ تاویل ظاہر کے خلاف ہے۔ واللہ اعلم

## [٦٥] بابُ مَنْ بَنٰى مَسْجِداً

(۴۵۰) حَدَّثَنَا يَحْيٰى بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عَمْرٌو اَنَّ بُكَيْراً حَدَّثَهٗ اَنَّ عَاصِمَ بْنَ عُمَرَ بْنِ قَتَادَةَ حَدَّثَنَا اَنَّهٗ سَمِعَ عُبَيْدَ اللّٰهِ الْخَوْلَانِيَّ اَنَّهٗ سَمِعَ عُثْمَانَ ابْنَ عَفَّانَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ يَقُوْلُ عِنْدَ قَوْلِ النَّاسِ فِيْهِ حِيْنَ بَنٰى مَسْجِدَ الرَّسُوْلِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّكُمْ اَكْثَرْتُمْ وَاِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ مَنْ بَنٰى مَسْجِداً قَالَ بُكَيْرٌ حَسِبْتُ اَنَّهٗ قَالَ يَبْتَغِيْ بِهٖ وَجْهَ اللّٰهِ بَنَى اللّٰهُ لَهٗ مِثْلَهٗ فِي الْجَنَّةِ.

**ترجمہ** باب، اس شخص کی فضیلت کا بیان جس نے کوئی مسجد تعمیر کی۔ حضرت عبید اللہ خولانی سے روایت ہے کہ جب حضرت عثمان غنیؓ نے مسجد نبوی کی تعمیر فرمائی اور لوگوں نے ان کے بارے میں مختلف باتیں کہیں، تو انھوں نے حضرت عثمانؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ بے شک تم لوگ (میرے بارے میں) بہت کچھ کہہ رہے ہو اور میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس نے کوئی مسجد تعمیر کی، بکیر کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ بھی فرمایا کہ رضائے خداوندی حاصل کرنے کے لیے مسجد تعمیر کی تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں مسجد کے مثل گھر بنائے گا۔

**مقصد ترجمہ** چند ابواب پہلے ایک عنوان آیا تھا "باب بنیان المسجد" وہاں بیان کیا گیا ہے کہ امام بخاری مسجد کی تعمیر کے سلسلہ میں چند اصولی باتیں بیان کرنا چاہتے ہیں، اب یہ دوسرا عنوان ہے "باب من بنی مسجدا" یہ عنوان الفاظ کے اعتبار سے اس کے بہت قریب ہے، مگر یہاں امام بخاری کا مقصد ہے مسجد تعمیر کرنے والے کی فضیلت کا بیان اور یہ کہ مسجد کی تعمیر کی جہاں یہ صورت ہے کہ اس کو ابتداءً تعمیر کیا جائے، وہیں یہ بھی ہے کہ اس کی تجدید یا توسیع وغیرہ کی جائے، دونوں ہی صورتوں میں بانی کو مسجد کی تعمیر کی فضیلت حاصل ہوگی اور روایت باب میں فضیلت کے سلسلے میں جو فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت میں اسی کے مثل تعمیر فرمائے گا، بانی ہر صورت میں اس کا مستحق ہوگا۔

**تشریح حدیث** جب حضرت عثمان غنیؓ خلیفہ مقرر کر دیئے گئے تو لوگوں نے مسجد نبوی میں تنگی کی شکایت کی چنانچہ مشہور روایت کے مطابق ۳۰ھ میں یعنی اپنی خلافت کے چھٹے سال مسجد نبوی میں توسیع فرمائی اور ہر اعتبار سے اس کو شاندار بنوا دیا، تو ان تغیرات کی وجہ سے حضرت عثمان غنیؓ پر مختلف اعتراضات کئے جانے لگے، تارک دنیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بھی مسجد نبوی کی شاندار تعمیر سے اتفاق نہ تھا، مسلم شریف میں محمود بن الربیعؓ انصاری سے روایت ہے:

لما اراد عثمانؓ بناء المسجد کره الناس ذلك واحبوا ان یدعه علی هیئته ۔ (مسلم ص:۲۰۱/ ج:۱)

جب حضرت عثمانؓ نے مسجد نبوی کی تعمیر (جدید) کا ارادہ کیا تو لوگوں نے اس کو پسند نہیں کیا اور یہ چاہا کہ وہ اس کو سابق ہیئت کے مطابق باقی رکھیں۔

محض ناپسندیدگی ہی کی بات نہیں تھی، بلکہ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے جواب میں ایک شکایت کا جملہ ہے "انکم اکثرتم" کہ آپ حضرات مسجد نبوی کی تعمیر کے سلسلے میں میرے عمل پر بہت زیادہ نکیر کررہے ہیں، یہ بہت زیادہ نکیر کیا تھی؟ تاریخ میں موجود ہے کہ کسی نے کہا کہ عثمان غنیؓ کی اختیار کردہ صورت بہتر ہوتی تو خود پیغمبر علیہ السلام اور ان کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ اس کے زیادہ حقدار تھے، ابتداء ہی میں خیال کیا جاتا کہ مسجد کو اس شکل پر بنایا جائے، پیغمبر علیہ السلام نے تو سادگی کا لحاظ فرمایا تھا اور "عریش کعریش موسی" حضرت موسیٰ کے چھپر کی طرح ایک چھپر فرمایا تھا، کسی نے یہ تبصرہ کیا کہ بیت المال کی رقم ہے، یعنی یہ بیت المال کی رقم میں بیجا تصرف ہے، جس میں عام مسلمانوں کی اجازت کے بغیر اس طرح کا تصرف درست نہیں، کسی نے اس سے بھی بڑا الزام دیا کہ یہ کام نام ونمود اور شہرت پسندی کے لیے ہورہا ہے، پہلے خلفاء کے پیش نظر نام ونمود کی بات نہیں تھی وغیرہ۔

جب اس طرح کے تبصرے سنتے سنتے کان پک گئے تو ایک دن حضرت عثمان منبر پر تشریف لائے اور حقیقت کو واضح فرمایا اور تمام اعتراضات کے جواب میں پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی ایک روایت سنادی، جس میں کیے جانے والے تمام اعتراضات کا جواب موجود ہے۔

## روایت باب سے تمام اعتراضات کا جواب

پہلی بات یہ تھی کہ اگر مسجد نبوی میں کیے جانے والے تغیرات مستحسن ہیں تو یہ کام ان پچھلے لوگوں نے کیوں نہیں کیا جو ان سے بہتر تھے؟ روایت باب سے اس تبصرہ کا جواب اس طرح بنتا ہے کہ میں نے یہ سب کام پیغمبر علیہ السلام کی اجازت سے کیے، کیوں کہ روایت میں یہ فرمادیا گیا کہ اگر کوئی شخص اللہ کی رضا کے لئے مسجد تعمیر کرے گا تو اللہ اسے جنت میں اس کا مماثل عطاء فرمائے گا، تو اس سے صراحت کے ساتھ یہ بات معلوم ہوئی کہ جنت میں مماثل جزا حاصل کرنے کے لیے مسجد کو شاندار بنانے کی اجازت ہے۔

سب جانتے ہیں کہ دنیا وآخرت میں بالکلیہ مماثلت نہیں ہے، کیونکہ دنیا کی اعلی سے اعلی تعمیر، جنت کے ادنی سے ادنی مکان کے برابر نہیں ہوسکتی، اس لیے "مثلہ" کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالی "کم" اور "کیف" کے اعتبار سے مماثل جزا عطا کرے گا، "کیف" کے اندر مماثلت کے معنی ہوئے نیت اور اخلاص کے بقدر، یا مسجد کی حیثیت کے بقدر، یعنی دنیا کی معمولی مسجد ہے تو جنت کا معمولی گھر، یہ الگ بات ہے کہ وہاں کا معمولی گھر بھی دنیا ومافیہا سے افضل ہوگا۔

اسی طرح مسجد شاندار ہے تو آخرت میں بھی شاندار گھر عطا کیا جائے گا۔ اور "کم" میں مماثلت کے معنی یہ ہوئے کہ مسجد چھوٹی بنائی ہے تو جنت کا چھوٹا مکان اور مسجد بڑی بنائی ہے تو جنت کا بڑا مکان عطا کیا جائے گا۔

"مثلہ" کے یہ معنی اس لیے مراد لیے گئے ہیں کہ بعینہ مماثلت اول تو دنیا اور آخرت میں ہو ہی نہیں سکتی، دوسرے یہ کہ روایات سے یہ فرق ثابت ہے، کیوں کہ طبرانی اور ابونعیم میں اس طرح کے الفاظ موجود ہیں:

| | |
|---|---|
| لایبنی احد مسجد الله الا بنی الله له بیتا فی الجنة اوسع منه . | اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مسجد تعمیر نہیں کرے گا، مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں اس سے زیادہ کشادہ مکان عطا فرمائے گا۔ |
| (بحوالہ عمدۃ القاری ص:۲۱۲/ ج:۴) | |

بعض روایات میں "بنی الله له بیتا فی الجنة افضل منه" کے الفاظ ہیں، بعض روایات میں "بنی الله له بیتا فی الجنة من الدر والیاقوت" کے الفاظ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کو موتیوں اور یاقوت کا گھر عطا فرمائے گا، یہ افضل اوسع اور موتیوں کے مکان کی تعبیر یہ واضح کرنے کے لیے کافی ہے کہ مسجد کے عوض جو مکان جنت میں عطا کیا جائے گا، وہ بعینہ مسجد جیسا نہیں ہوگا، بلکہ "مثلہ" کے معنی یہ ہوئے کہ "کیف" و "کم" کے لحاظ سے جس شان کی مسجد اخلاص کے ساتھ دنیا میں بنائی جائے گی، پروردگار عالم آخرت میں "کیف" و "کم" کے اسی معیار کا جنت کا مکان عطا کرے گا، اور جب روایت کا یہ مضمون ہے تو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی جانب سے جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ مسجد کے "کیف" و "کم" کے مطابق جنت کے مکان کا معیار مقرر کیا جائے گا تو دنیا میں عمدہ کیفیت اور بڑی مساحت رکھنے والی مسجد کی تعمیر کی اجازت معلوم ہوگئی۔

دوسرا تبصرہ یہ تھا کہ بیت المال کی رقم خرچ ہو رہی ہے، اس کا جواب اس روایت سے اس طرح دیا کہ جنت میں مکان کی بشارت اس شخص کو دی گئی ہے جو خود مسجد بنائے، میں یہ کام جنت کے لئے کر رہا ہوں، تو بیت المال کی رقم سے مسجد کی تعمیر کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ اور یہ کام حضرت عثمانؓ اس سے پہلے بھی کر چکے تھے، جب رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی کی توسیع کے لیے ترغیب دی تھی، حضرت عثمان نے خلافت کے آخری ایام میں شورش پسندوں کے محاصرے کے دوران جو خطاب فرمایا تھا، اس میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے:

| | |
|---|---|
| انشدکم بالله والاسلام هل تعلمونَ ان المسجدَ ضاق باهله فقال رسول الله ﷺ من یشتری بقعة آل فلان فیزیدها فی المسجد بخیر له منها فی | میں تم سے اللہ اور اسلام کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ مسجد نبوی نمازیوں کے لیے تنگ ہوگئی تھی تو رسول اللہ ﷺ نے اعلان فرمایا تھا کہ تم میں سے کوئی فلاں خاندان کی زمین خرید کر مسجد میں اضافہ کردے، جنت میں اس کو اس سے بہتر ملے گا، تو میں نے اس |

الجنة فاشتریتها من صلب مالی وانتم الیوم تمنعوننی ان اصلی فیها رکعتین قالوا اللّٰھم نعم ۔ (ترمذی شریف ص:۲۱۱/ج:۲)

زمین کو اپنی ذاتی رقم سے خرید کر مسجد میں شامل کیا تھا اور تم آج مجھے اس مسجد میں دو رکعت نماز پڑھنے سے روک رہے ہو، اس پر سب سامعین نے کہا تھا کہ ہاں آپ کا ارشاد صحیح ہے۔

تو جو شخص عہد رسالت سے اپنی ذاتی رقم سے مسجد نبوی کی خدمت کر رہا ہو، وہ آج بھی اپنی ہی رقم سے مسجد نبوی کی توسیع وتجدید کر رہا ہے۔

تیسرے اعتراض یعنی نام ونمود کے لیے کام کرنے کا جواب اس روایت سے اس طرح ہوا کہ روایت میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جس نے رضائے خداوندی کے حصول کے لیے مسجد تعمیر کی تو اس کو جنت میں اس کا مثل عطا کیا جائے گا، میں اسی مقصد سے یہ کام کر رہا ہوں، تمہیں نیت پر حملہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

## حضرت عثمانؓ کے جواب کا خلاصہ

حضرت عثمان غنیؓ کے جواب کا خلاصہ یہ ہوا کہ میں نے یہ تمام کام حدیث پاک کے مطابق کئے ہیں، جہاں تک مسجد نبوی میں تغیرات کا معاملہ ہے تو وہ عہد رسالت سے ہوتے رہے ہیں، پہلے رقبہ کم تھا، پھر زیادہ کیا گیا اور پیغمبر علیہ السلام نے یہ ہدایت بھی نہیں فرمائی کہ اس سے زیادہ نہ کیا جائے؛ بلکہ پیغمبر علیہ السلام سے ایک روایت یہ بھی ہے کہ اگر میری مسجد صنعاء ویمن تک وسیع کر دی جائے تو میری ہی مسجد کہلائے گی، پھر بار بار ستونوں کی تبدیلی جو عہد ابو بکر میں کی گئی اور عہد فاروق میں تو کئی بار کی گئی، اس کا مقصد ہی احکام واستحکام تھا، اب مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہو رہی ہے، تو ضرورت کی تکمیل کے لیے توسیع بھی کی جائے گی اور استحکام کی نیت سے اگر ایسا ساز وسامان استعمال کر لیا گیا کہ بار بار کی تبدیلی کا خطرہ ٹل گیا، تو اس میں کیا مضائقہ ہے؟ غرض یہ کہ حضرت عثمانؓ نے ایک ہی روایت سنا کر تمام تبصروں کا شافی اور مدلل جواب دے دیا۔ واللہ اعلم

## مسجد کے استحکام اور تزئین کا حکم

چند ابواب پہلے حضرت عمرؓ کا ارشاد گذرا ہے کہ انھوں نے مسجد نبوی میں رنگ استعمال کرنے سے منع فرمایا اور اس باب میں بھی صحابہ کرامؓ کی جانب سے مسجد نبوی میں کئے گئے تغیرات پر اشکال، پھر حضرت عثمانؓ کی جانب سے جواب اور پھر صحابہ کرام کی خاموشی وغیرہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ اختلاف حلال وحرام یا جواز اور عدم جواز کا اختلاف نہیں ہے، بلکہ امر مباح کے اندر توسع اختیار کرنے اور نہ کرنے کا اختلاف ہے، اور اس کی تفصیل یہ ہے کہ جہاں تک مسجد کے اندر استحکام اور مضبوطی، نمازیوں کے لیے آرام وسکون اور زینت کے بغیر اس کے شاندار اور پرشکوہ ہونے کا تعلق ہے، تو وہ سب کے نزدیک مستحسن ہے، قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَائِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ . (سورۃ الحج آیت:۳۲)

اور جو اللہ کے نام سے منسوب چیزوں کی تعظیم کرے تو وہ دل کی پرہیز گاری کی بات ہے۔

آیت پاک میں شعائر اللہ سے خاص طور پر قربانیاں مراد ہیں، لیکن فقہاء نے لفظ کے عموم سے ان تمام چیزوں کی عظمت پر استدلال کیا ہے جنھیں اللہ کے نام سے نسبت حاصل ہے، مسجدیں یقیناً اللہ کے نام سے منسوب ہونے کی بناء پر تعظیم اور تکریم کی مستحق ہیں، اسی طرح دوسری آیت میں فرمایا گیا: "فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ" (سورۃ النور آیت ۳۶) گھروں (مسجدوں) کے بارے میں اللہ نے اجازت دی ہے کہ انھیں بلند کیا جائے۔

بلندی جس طرح معنوی ہوتی ہے اور دراصل وہی یہاں مراد بھی ہے، اسی طرح بلندی مادی اور حسی بھی ہوتی ہے، اور آیت پاک ہی سے بہر حال اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح مساجد کی تزئین کا مسئلہ ہے۔ اس میں فقہاء نے یہ وضاحت کی ہے کہ اگر تزئین ایسی ہو کہ اس سے نمازیوں کی توجہ نماز کی بجائے نقش ونگار میں الجھ کر رہ جائے، تو اس کو مکروہ قرار دیا گیا، اس انداز کی نہ ہو تو اس کی اباحت ہے، بلکہ زین الدین بن المنیر نے تو آگے بڑھ کر یہ فرمایا کہ اس دور میں جب کہ لوگ اپنے گھروں میں استحکام اور تزئین وغیرہ کا اہتمام کرنے لگے ہیں، تو مسجدوں کے احترام کو باقی رکھنے کے لیے مسجدوں میں اس کا اہتمام کرنا مناسب ہے۔

جہاں تک حضرت عمر کی رنگوں کے استعمال سے ممانعت اور صحابہ کرام کی حضرت عثمانؓ کے تغیرات پر اشکال کی حقیقت ہے، تو اس کا تعلق عدم جواز سے نہیں تھا؛ بلکہ اس کی روح یہ تھی کہ یہ حضرات دنیوی تکلفات اور زیب وزینت کی چیزوں سے طبعاً بہت دور تھے، ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ پیغمبر علیہ السلام نے مومنین کے لیے فرمایا ہے:

كن في الدنيا كانك غريب او عابر سبيل . (بخاری ص:۹۴۹/ ج:۲)

دنیا میں اس طرح رہو جیسے تم کوئی اجنبی مسافر ہو یا راستہ عبور کرنے والے ہو۔

ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ پیغمبر علیہ السلام نے خود اپنے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

مالي وللدنيا وما انا والدنيا الا كراكب استظل تحت شجرة ثم راح وتركها . (مشکوۃ ص:۴۴۲/ ج:۲)

میرا دنیا سے کیا تعلق؟ میرا اور دنیا کا تعلق صرف اس طرح کا ہے، جیسے کسی مسافر نے کسی درخت کے نیچے آرام کیا پھر اسے چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔

ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے تعمیرات کے سلسلہ میں بلندی اور پختگی کو علامات قیامت میں سے قرار دیا ہے، اس لیے یہ تارک دنیا حضرات اپنے مزاج کے اعتبار سے ان چیزوں سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے تھے، لیکن جب حضرت عثمان غنیؓ نے وضاحت فرمائی اور حدیث پاک کی رو سے اپنے موقف کی صحت ان پر واضح فرمادی،

توسب نے سکوت اختیار فرمایا؛ جس کا مفہوم یہ ہوا کہ ان بزرگوں نے بھی حضرت عثمانؓ کے عمل کی توثیق فرمادی۔ واللہ اعلم

## [٦٦] بَابٌ يَاخُذُ بِنُصُوْلِ النَّبْلِ اِذَا مَرَّ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۵۱) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيْدٍ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ قَالَ قُلْتُ لِعَمْرٍو اَسَمِعْتَ جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ يَقُوْلُ مَرَّ رَجُلٌ فِي الْمَسْجِدِ وَمَعَهُ سِهَامٌ فَقَالَ لَهُ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اَمْسِكْ بِنِصَالِهَا. (آئندہ: ۷۰۷۳، ۷۰۷۴)

**ترجمہ** باب، جب کوئی مسجد میں جائے تو تیر کے پیکان کو ہاتھ میں لے لے۔ حضرت سفیان بن عیینہ سے روایت ہے کہ میں نے عمرو بن دینار سے کہا کہ تم نے حضرت جابر بن عبداللہؓ کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایک شخص مسجد میں آیا اور اس کے پاس تیر تھے، تو اس سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم تیر کے پھل کو اپنے ہاتھ سے پکڑلو۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مسجد سے ضرورۃً گزر رہا ہو اور اس کے پاس کوئی ایسی چیز موجود ہو جس کے کھلا رہنے میں دوسروں کی تکلیف کا خطرہ ہو تو ضرورۃً گوگذرنا جائز ہے، مگر یہ احتیاط ضروری ہے کہ تیر، نیزہ یا کسی نقصان رساں چیز کو کھلا ہوا لے کر نہ جائیں، بلکہ تیر کے پھل وغیرہ کو ہاتھ میں پکڑ لینا چاہئے۔

**تشریح حدیث** حدیث کا مضمون وہی ہے جو ترجمۃ الباب میں دیا گیا ہے، سفیان بن عیینہ نے عمرو بن دینار سے پوچھا کہ آپ نے حضرت جابر بن عبداللہ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایک شخص تیر لیے ہوئے مسجد سے گذرا تو رسول اللہ ﷺ نے اس سے فرمایا کہ اس کے پیکان یعنی پھل کو ہاتھ میں لے لو، یعنی ایسا نہ ہو کہ کھلا ہونے کے سبب کسی کو زخم آجائے، اس کے بعد یہ مضمون نہیں ہے کہ عمرو بن دینار نے اس کی تصدیق کی یا نہیں؟ اس روایت میں ان کی جانب سے سکوت ہے، دوسرے طریق میں نعم کی تصریح ہے، خود بخاری ہی میں کتاب الفتن میں علی بن عبداللہ کی روایت سفیان بن عیینہ سے ہے اور اس میں صراحت ہے: "فقال نعم" کہ عمرو بن دینار نے فرمایا کہ ہاں! مگر بخاری نے اس کو یہاں نقل نہیں کیا کیوں کہ ایسے موقع پر جب کہ کوئی شاگرد کسی استاذ سے کوئی بات دریافت کررہا ہو اور شیخ سن کر سکوت اختیار کرے تو امام بخاری کی تحقیق اور اکثر محققین کا راجح مسلک یہی ہے کہ اگر شیخ متیقظ ہے، غافل نہیں ہے اور جو کچھ پیش کیا جارہا ہے، اس کو توجہ سے سن رہا ہے، لیکن اس کے باوجود سکوت اختیار کئے ہوئے ہے تو شیخ کا یہ سکوت بیان کے حکم میں ہے، یعنی وہ تصدیق کررہا ہے، گویا روایت باب میں اگر نعم کی تصریح نہ بھی ہوتی تب بھی معنی یہی ہیں کہ ہاں حضرت جابر کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا فرمایا۔ واللہ اعلم

## [٦٧] بَابُ الْمُرُوْرِ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۵۲) حَدَّثَنَا مُوْسَى بْنُ اِسْمَاعِيْلَ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ بُرْدَةَ بْنُ

عَبْدِ اللهِ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا بُرْدَةَ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ مَنْ مَرَّ فِيْ شَيْئٍ مِنْ مَسَاجِدِ نَا اَوْ اَسْوَاقِنَا بِنَبْلٍ فَلْيَاخُذْ عَلٰى نِصَالِهَا لَا يُعْقِرُ بِكَفِّهٖ مُسْلِماً. (آئندہ: ۷۰۷۵)

**ترجمہ** باب، مسجد میں سے گذرنے کا بیان۔ حضرت ابو بردہ اپنے والد ابوموسیٰ اشعری سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص تیر لے کر ہماری مسجدوں یا بازاروں میں سے گذرے، تو اسے ان کے پھل کو ہاتھ میں پکڑ لینا چاہئے، ایسا نہ ہو کہ اس کے ہاتھ سے کسی مسلمان کو زخم پہنچ جائے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ ضرورت کے وقت مسجد سے گزرنا جائز ہے، مگر اس کو گزرگاہ اور باقاعدہ راستہ بنالینا مسجد کی شان کے منافی ہے، اس لیے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی، پھر یہ کہ مسجد ہو یا عام اجتماع کی جگہ یا بازار وغیرہ وہاں سے گزرتے وقت اس کا خیال رکھا جائے کہ کسی کو تکلیف نہ پہنچے، یعنی اگر گذرنے والے کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے کھلا رکھنے سے دوسروں کو نقصان کا اندیشہ ہے تو اسے بند کر لینا چاہئے، تیر وغیرہ ہو تو اس کے پھل کو ہاتھ میں لے لینا چاہئے وغیرہ۔

گویا مقصد یہ ہوا کہ مسجد سے اتفاقاً گذرنے کی نوبت آجائے تو اس کی اجازت ہے اور اس میں ان آداب کی رعایت ضروری ہے کہ دوسروں کو تکلیف نہ ہو، رہا یہ کہ امام بخاری ہر حال میں مسجد سے گذرنے کا جواز ثابت کرنا چاہیں جیسا کہ امام شافعیؒ نے جنبی تک کو مسجد سے گزرنے کی اجازت دی ہے، تو ظاہر ہے کہ روایت باب سے اس کو ثابت نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ روایت میں ہر حالت میں گزرنے کی اجازت کا بیان نہیں ہے۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** روایت باب سابق میں گذر چکی ہے، اس سے جہاں ترجمۃ الباب کا ثبوت ہو رہا ہے کہ مسجد سے گذرنا جائز ہے وہیں یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مومنین کی جان اور ان کی حرمت کا تحفظ بہت ضروری ہے، مسجدوں میں چونکہ جماعت کے اوقات میں اجتماع ہوتا ہے، اس لیے اہمیت کے ساتھ یہ بیان فرمایا گیا کہ اگر کسی کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس سے دوسرے کو نقصان پہنچ سکتا ہے، تو اسے دوسروں کی تکلیف کا پورا لحاظ رکھنا چاہئے۔

## [۶۸] بَابُ الشِّعْرِ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۵۳) حَدَّثَنَا اَبُوْ الْيَمَانِ الْحَكَمُ بْنُ نَافِعٍ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ اَخْبَرَنِيْ اَبُوْسَلَمَةَ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمَانِ بْنِ عَوْفٍ اَنَّهٗ سَمِعَ حَسَّانَ بْنَ ثَابِتٍ الْاَنْصَارِيَّ يَسْتَشْهِدُ اَبَا هُرَيْرَةَ اَنْشُدُكَ اللهَ هَلْ سَمِعْتَ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ يَا حَسَّانُ اَجِبْ عَنْ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ اَللّٰهُمَّ اَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ، نَعَم. (آئندہ: ۳۲۱۲، ۶۱۵۲)

**ترجمہ** باب، مسجد میں شعر پڑھنے کا بیان۔ حضرت ابوسلمہ بن عبدالرحمانؒ بن عوف سے روایت ہے کہ انھوں نے حضرت حسان بن ثابتؓ انصاری سے سنا جب کہ وہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کو ان الفاظ میں گواہ بنا رہے تھے کہ میں تم کو اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم نے رسول اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اے حسان! رسول اللہ کی جانب سے کافروں کو جواب دو، اے اللہ! حسان کی روح القدس (حضرت جبرئیل) کے ذریعہ مدد فرما، اس پر حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ ہاں (میں نے ایسا سنا ہے یا میں شہادت دیتا ہوں)۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ مسجد میں اشعار پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ بعض حضرات سے مطلقاً جواز بھی منقول ہے، لیکن فقہاء کی ایک جماعت نے مطلقاً ممانعت کی ہے اور ان کا مستدل وہ روایات ہیں جن میں مسجد میں اشعار پڑھنے سے منع کیا گیا ہے، صحیح ابن خزیمہ، ترمذی، ابوداؤد وغیرہ میں یہ روایات موجود ہیں، حضرت حکیم بن حزام سے ترمذی کی روایت کے الفاظ یہ ہیں:

| | |
|---|---|
| نهی النبی علیہ وسلم ان یستقاد فی المسجد وان تنشد فیه الاشعار وان تقام فیه الحدود . | رسول اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا کہ مسجد میں قصاص لیا جائے اور یہ کہ مسجد میں اشعار پڑھے جائیں اور یہ کہ مسجد میں شرعی حدود (سزائیں) قائم کی جائیں۔ |
| (عمدۃ القاری ص:۱۱۸/ ج:۴) | |

لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس سلسلہ میں مطلقاً جواز یا عدم جواز کا حکم لگانا درست نہیں ہے، بلکہ اس سلسلہ میں تفصیل کرنی ہوگی، امام بخاری بھی غالباً ان ہی لوگوں کے ساتھ ہیں جو مسجد میں اشعار پڑھنے کے سلسلے میں تفصیل کے قائل ہیں، اس سلسلہ میں اصل یہ ہے کہ شعر بھی کلام کا ایک حصہ اور کلام کی ایک نوع ہے اور جس طرح کلام کی تقسیم حسن اور قبیح یعنی اچھے اور برے کی طرف ہوتی ہے، اسی طرح اشعار میں بھی اچھے اور برے دونوں ہی طرح کے اشعار ہوں گے، پھر ظاہر ہے کہ قبیح اشعار کا پڑھنا اور سننا جب مسجد کے باہر بھی قبیح ہوگا تو مسجد کے اندر اس کی قباحت اور بڑھ جائے گی، اور اشعار حسنہ کا پڑھنا سنانا مسجد سے باہر مستحسن ہوگا تو مسجد میں اس کے جواز میں شبہ نہ ہوگا۔

رہا یہ کہ حسن وقبح کا مدار کیا ہے؟ اہل ادب اور شعراء کے یہاں تو وہ اشعار اچھے کہلاتے ہیں جن میں فصاحت وبلاغت ہو، بندش عمدہ ہو، الفاظ پرشکوہ ہوں، خیالات نرالے ہوں؛ لیکن اہل علم کے یہاں معیار اور ہے، مضامین صحیح اور علمی ہوں، اشعار حمد وثنا یا پیغمبر علیہ السلام کی نعت پر مشتمل ہوں، حدیث اور فقہ کے مضامین کو ادبی اسلوب میں پیش کیا گیا ہو، اسلام کی خوبیاں بیان کی گئی ہوں، یا مخالفین اسلام کے حملوں کا جواب دیا گیا ہو، تو اہل علم کے نزدیک ان اشعار کو مستحسن قرار دیا جائے گا، اور اگر مضامین لغو ہوں، کفر یا شرک پر مشتمل ہوں، اسلام پر حملے کئے گئے ہوں، یا دشمنان اسلام کی مدح کی گئی ہو، یا کسی بھی شخص کی مدح میں مبالغہ اور غلو سے اتنا کام لیا گیا ہو کہ وہ اشعار ناجائز حدود میں داخل ہو گئے

ہوں، یا ان میں فحاشی اور عریانی ہو، یا کسی باعزت انسان کی عزت پامال کرنے کی کوشش کی گئی ہو تو اس طرح کے تمام اشعار کو ناجائز قرار دیا جائے گا۔

البتہ اگر زبان وادب کی خاطر عہد جاہلیت کے اشعار مسجد میں یاد کئے جائیں اور زبان وادب کا مقصد بھی یہ ہو کہ اس سے قرآن وحدیث میں مدد لی جائے گی تو مقصد کے درست ہونے کے سبب اس کی اجازت دی جائے گی، حضرت عمرؓ کے ارشادات میں ہے کہ جاہلیت کے دیوان یاد کرو کہ ان میں قرآن کریم کی تفسیر ملے گی، قرآن کریم کے الفاظ کے بارے میں اگر کوئی حضرت ابن عباس سے پوچھتا کہ " هل تعرفه العرب ؟ "کیا عرب کے یہاں یہ لفظ معروف ہے؟ تو وہ فوراً کوئی شعر استشہاد میں پیش فرماتے، اس بنیاد پر مسجد میں بیٹھ کر سبعہ معلقہ، دیوان الحماسہ اور عرب کے عہد جاہلیت یا اس کے بعد کے دواوین یاد کرنا درست ہے۔

**تشریح حدیث** روایت میں آیا کہ حضرت حسان بن ثابت انصاریؓ نے حضرت ابو ہریرہؓ کو قسم دے کر ان سے یہ شہادت لینا چاہی کہ کیا تم نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حسان! رسول اللہ ﷺ کی جانب سے جواب دو، اے اللہ! روح القدس کے ذریعہ ان کی مدد فرما، تو حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ ہاں یہ بات صحیح ہے، روایت باب میں اس کا تذکرہ نہیں ہے کہ حضرت حسان نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے مسجد میں اشعار پڑھے تھے؛ لیکن بخاری ہی میں حضرت سعید بن المسیب کی روایت بدء الخلق میں موجود ہے جس میں یہ تذکرہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسانؓ سے اجب عنی (میری طرف سے جواب دو) مسجد میں فرمایا تھا اور یہ کہ حضرت حسانؓ نے مسجد ہی میں مشرکین کو اشعار میں جواب دیا تھا اور یہ بات امام بخاری کے ذوق کے مطابق ہے کہ وہ ترجمۃ الباب کے الفاظ میں روایت کے دوسرے طرق کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ترجمۃ الباب کو محض رسول اللہ ﷺ کی دعاء سے ثابت کیا جائے کہ جب آپ نے اچھے اشعار پر حضرت حسان کو دعائیں دیں اور فرمایا "اللّٰهم ايده بروح القدس" تو اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ جو کلام پیغمبر علیہ السلام کی دعاؤں کا مستحق ہے اس کا مسجد میں پڑھنا درست ہے۔ واللہ اعلم

حضرت حسان کو حضرت ابو ہریرہؓ کی شہادت لینے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ایک دن حضرت حسان مسجد میں اشعار پڑھ رہے تھے، حضرت عمرؓ کا ادھر سے گذر ہوا تو انھوں نے گھور کر دیکھا یا کسی اور طرح ناگواری کا اظہار کیا، تو حضرت حسان نے پہلے تو یہ فرمایا" كنت انشد فيه وفيه من هو خير منك" (بخاری باب بدء الخلق) میں مسجد نبوی میں اشعار سنایا کرتا تھا جب کہ مسجد میں وہ ذات اقدس تھی جو تم سے زیادہ خیر تھی۔ پھر حضرت ابو ہریرہؓ کی طرف التفات کر کے فرمایا کہ کیا آپ گواہی دیں گے کہ پیغمبر علیہ السلام نے اسی مسجد میں منبر پر بٹھا کر مشرکین کے جواب کا امر فرمایا تھا اور دعا بھی دی تھی: اللّٰهم ايده بروح القدس ؟ حضرت عائشہؓ سے بھی ترمذی شریف میں مسجد میں اشعار سنانے کے بارے میں روایت مذکور ہے:

قالت کان رسول اللہ ﷺ ینصب لحسان منبرا فی المسجد فیقوم علیه یهجوا لکفار .
(بحوالہ فتح الباری ص:۹۵/ ج:۲)

حضرت عائشہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ حضرت حسان بن ثابتؓ کے لیے مسجد نبوی میں منبر نصب کراتے تھے، جس پر کھڑے ہوکر وہ مشرکین کی ہجو (جواباً) کریں۔

غرض یہ ہے کہ حضرت حسان نے جب حضرت ابو ہریرہ کی گواہی پیش کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہوگئے، ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ کی رائے یہی ہو کہ مسجد میں اشعار پڑھنا، آداب مسجد کے منافی ہے اور اسی لئے انھوں نے حضرت حسان کے عمل کو ناپسندیدہ سمجھا ہو، ان کے پیش نظر یہ رہا ہوگا کہ اول تو قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

وَالشُّعَرَاءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاؤٗنَ .
(سورۃ الشعراء آیت:۲۲۵)

اور شعراء تو ان کا اتباع وہی لوگ کرتے ہیں جو بدراہ ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ صحاح کی روایت میں حضرت عمر اور حضرت سعد بن ابی وقاص سے شعر یاد کرنے کی مذمت منقول ہے، مسلم شریف کے الفاظ ہیں:

لأن یمتلی جوف احدکم قیحا یریه خیر من ان یمتلی شعرا .
(بحوالہ عمدۃ القاری ص:۲۱۹/ ج:۲)

یہ بات کہ تم میں سے کسی کے پیٹ میں پیپ بھری ہو اس سے بہتر ہے کہ اس میں اشعار بھرے ہوں۔

ان دلائل کی بنیاد پر ہوسکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے تو یہی ہو کہ مسجد میں شعر پڑھنا آداب مسجد کے منافی ہے، پھر جہاں تک عہد رسالت میں حضرت حسان کے برسر منبر اشعار پڑھنے کی روایت کا تعلق ہے تو وہ صحیح ہے، لیکن حضرت عمر کے ذہن میں اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ عہد رسالت میں اس کی ضرورت تھی، کفار کا مشغلہ ہی یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کی عزت پر حملہ کریں، عورتوں کا مذاق اڑائیں، اہل اسلام پر اشعار میں پھبتیاں کسیں، اس لیے ان کی جواب دہی ضروری تھی اور حضرت حسان بن ثابت کو اس سلسلہ میں خاص ملکہ تھا وہ ایسا تیز وتند اور برمحل جواب دیتے کہ کفار کے دانت کھٹے کردیتے، لیکن حضرت عمر کے دور میں یہ ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی، اس لیے حضرت عمر یہ سمجھے ہوں گے کہ اب مسجد میں اشعار پڑھنا صحیح نہیں ہے، لیکن جب حضرت حسانؓ نے عہد رسالت کا تذکرہ کیا اور حضرت ابو ہریرۃ کی شہادت سے اپنے عمل کی اباحت ثابت فرمادی، تو ممکن ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کی بات کو قبول فرمالیا ہو اور ممکن ہے کہ حدیث پاک کے سامنے آنے کے بعد ادب واحترام کے طور پر، یا صورۃً معارضہ سے بچنے کے لیے سکوت اختیار فرمایا ہو۔　واللہ اعلم

بہر حال حدیث باب سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ مسجد میں اچھے اور نا قابل اعتراض اشعار پڑھنے کی اجازت ہے، اگرچہ ایسا کرنا بھی مسجد کی شان کے منافی ہے۔　واللہ اعلم

## [۶۹] بَابُ اَصْحَابِ الْحِرَابِ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۵۴) حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ سَعْدٍ عَنْ صَالِحِ بْنِ كَيْسَانَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ اَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ لَقَدْ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَوْمًا عَلٰى بَابِ حُجْرَتِيْ وَالْحَبْشَةُ يَلْعَبُوْنَ فِي الْمَسْجِدِ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَسْتُرُنِيْ بِرِدَآئِهٖ اَنْظُرُ اِلٰى لَعِبِهِمْ.

(آئندہ: ۴۵۵، ۹۵۰، ۹۸۸، ۲۹۰۶، ۳۵۲۹، ۳۹۳۱، ۵۱۹۰، ۵۲۳۶)

(۴۵۵) زَادَ اِبْرَاهِيْمُ ابنُ الْمُنْذِرِ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ وَهْبٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ يُوْنُسُ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ رَأَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ وَالْحَبْشَةُ يَلْعَبُوْنَ بِحِرَابِهِمْ.

(گذشتہ: ۴۵۴)

**ترجمہ** باب، مسجد میں نیزے والوں کے آنے (اور مظاہرۂ فن) کا بیان۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ میں نے ایک دن رسول اللہ ﷺ کو اپنے حجرے کے دروازے پر دیکھا جب کہ حبشہ کے کچھ لوگ مسجد میں کھیل کا مظاہرہ کررہے تھے، اور رسول اللہ ﷺ اپنی چادر سے میرا پردہ کئے ہوئے تھے، جب کہ میں ان کے کھیل کو دیکھ رہی تھی، ابراہیم بن المنذر نے اپنی سند کے ساتھ یہ اضافہ کیا کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا، جب کہ حبشہ کے لوگ اپنے نیزوں سے کھیل رہے تھے۔

**مقصد ترجمہ** حِرابٌ، حَربۃٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں چھوٹا نیزہ، اس کو خاص انداز میں چکر دے کر پھینکنا، فنون حربیہ میں ایک کامیاب طریقہ ہے، اہل حبشہ کو اس میں خاص مہارت حاصل تھی، یہاں امام بخاری کا مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ مسجد کے اندر نیزے کا کھیل کیسا ہے؟ بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ مسجد عبادت کی جگہ ہے؛ اس لیے جو چیزیں عبادت سے متعلق ہوں انھیں مسجد میں جائز ہونا چاہئے اور جو چیزیں اس سے متعلق نہ ہوں انھیں جائز نہ ہونا چاہیے، چنانچہ جن علماء نے مسجد میں عبادت کے علاوہ دوسرے کاموں کی اجازت نہیں دی، انھوں نے روایت باب کے بارے میں یہ تاثر ظاہر کیا ہے کہ اس کھیل کا مظاہرہ مسجد میں نہیں بلکہ مسجد کے متعلقات میں کیا جارہا تھا، جسے مجازاً مسجد کے اندر بیان کردیا گیا؛ لیکن امام بخاری اس کو داخل مسجد سمجھ رہے ہیں اور اس معاملہ میں توسع کا اظہار کرنا چاہتے ہیں کہ اسلحہ کی نمائش اور فنون حرب کا مظاہرہ بہ نیت جہاد داخل عبادت ہے اور جب یہ چیزیں عبادت میں داخل ہیں، تو غیر اوقات صلوۃ میں مسجد کے اندر یہ عمل جائز ہونا چاہیے تاکہ دیکھنے والوں کو ترغیب ہو۔

البتہ یہ فرق ملحوظ رکھنا ہوگا کہ اگر مقصد جہاد نہ ہو، بلکہ محض بدن میں توانائی پیدا کرنے کے لیے کسرت وغیرہ

کا عمل ہو، یا سیاسی اغراض کے لیے فنون حرب اور آلات حرب کی نمائش ہو تو اس کو عبادت قرار نہیں دیا جا سکتا اور اس کی مسجد کے اندر اجازت نہ ہوگی، لیکن مقصد جہاد کی تیاری ہو اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے یہ کام کیا جا رہا ہو تو اس میں امام بخاری کے ترجمۃ الباب سے توسع معلوم ہوتا ہے۔

**تشریح حدیث**

یہی روایت بخاری شریف کی کتاب العیدین اور مسلم شریف کی کتاب العیدین میں بھی موجود ہے کہ عید کا دن تھا، نبی کریم ﷺ تشریف فرما تھے، نماز کے بعد حبشہ کے لوگوں نے مسجد کے اندر نیزہ کا کھیل دکھانا شروع کیا، یعنی چلت، پھرت، اتار چڑھاؤ، کود پھاند، داؤ پیچ اور طرح طرح کے پینترے دکھانے شروع کیے، رسول اکرم ﷺ تشریف لائے اور ان کی ہمت افزائی اور ان کے کام کی تحسین کے طور پر کھڑے ہو گئے، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ کہیں سے حضرت عمر بھی آ نکلے اور انھوں نے زمین سے سنگریزہ اٹھا کر منع کرنے کے لیے مارنے کا ارادہ کیا تو آپؐ نے منع فرما دیا کہ **"دعهم یا عمر"** کہ اے عمر رہنے دو۔

اس موقع پر حضرت عائشہؓ نے بھی رسول اللہ ﷺ کی اجازت سے اس مجاہدانہ کھیل کا مشاہدہ کیا، بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حضور پاک ﷺ نے حضرت عائشہؓ کی خواہش کے بغیر اپنے طور پر حضرت عائشہ کو بلایا اور فرمایا کہ دیکھنا چاہو تو دیکھ لو، چنانچہ حضرت عائشہؓ رسول اکرم ﷺ کی چادر کے پردے میں آپ کے کاندھے پر اپنا منہ رکھ کر دیکھتی رہیں، جب دیکھتے دیکھتے اکتا گئیں اور پیغمبر علیہ السلام نے محسوس فرمایا کہ اب تھک گئی ہیں تو فرمایا "حسبك" کہ بس، مقصد یہ رہا ہوگا کہ بچوں کی تربیت چونکہ عورتوں کی گود میں ہوتی ہے اور بچے عورتوں سے مانوس بھی زیادہ ہوتے ہیں؛ اس لیے اس طرح کی مجاہدانہ سرگرمیاں ان کے علم میں ہوں گی تو وہ بچوں کو جہاد کے لیے زیادہ آسانی کے ساتھ تیار کر سکیں گی، کسی فن سے خود واقفیت ہوتی ہے، تو دوسروں کو اس سے واقف کرانا اور تعلیم دینا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

**عورت کے اجنبی مرد پر نظر ڈالنے کا حکم**

حضرت عائشہؓ کا مقصد کھلاڑیوں کو دیکھنا نہیں، کھیل کو دیکھنا تھا، عمر بھی بہت کم تھی خود اسی روایت میں ارشاد فرماتی ہیں: **فاقدروا قدر الجارية الحديثة السن الحريصة على اللهو** . (مسلم ص ۲۹۲/ ج ۱) کہ آپ خود اندازہ کریں کہ ایک نو عمر اور لہو کی حریص لڑکی کتنی دیر تک دیکھ سکتی ہے، عمر بدلتی ہے تو مذاق بھی بدل جاتا ہے، لیکن بہر حال اتنا معلوم ہو گیا کہ پردے کے ساتھ عورت مرد پر نظر ڈال سکتی ہے، حنفیہ کے یہاں اصل مسئلہ یہی ہے کہ مرد کا عورت کی طرف دیکھنا شہوت کے ساتھ یا بغیر شہوت کے دونوں صورتوں میں ناجائز ہے، لیکن عورت کا مرد کو شہوت کے ساتھ دیکھنا ناجائز اور بغیر شہوت کے دیکھنا مباح ہے، اگر چہ بعض فقہا نے سداً للباب اس کی بھی اجازت نہیں دی، جن فقہاء کے مذہب میں اس کی گنجائش نہیں وہ تاویل کریں! حنفیہ کو ضرورت نہیں ہے، نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ گھر کے دروازے پر اگر مباح کھیلوں میں سے کوئی کھیل ہو رہا ہو اور پردے کے ساتھ اس کو دیکھا جا سکتا ہو تو اس میں تنگی نہیں ہے، لیکن غیر مباح اور ناجائز قسم کے کھیلوں کو دیکھنے کے لیے

مستورات کا ارادۃً نکلنا کسی بھی حال میں مباح نہیں ہے۔

**ابراہیم ابن المنذر کا اضافہ** بخاری کی اصل روایت میں تو یہ وضاحت تھی کہ حضرت عائشہ نے جس کھیل کو دیکھا وہ مسجد میں ہو رہا تھا، لیکن اس کی وضاحت نہیں تھی کہ یہ کھیل نیزہ کی فنی مشق سے متعلق تھا، جب کہ ترجمۃ الباب "اصحاب الحراب فی المسجد" (مسجد میں نیزہ کھیلنے والوں کے داخلے اور مشق کا بیان) منعقد کیا گیا ہے، اس کے لیے امام بخاری نے ابراہیم ابن المنذر کی روایت ذکر کی جس میں "یلعبون بحرابھم" کی تصریح موجود ہے۔

## [۷۰] بَابُ ذِكْرِ الْبَيْعِ وَالشِّرَآءِ عَلَى الْمِنبَرِ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۵۶) حَدَّثَنَا عَلِيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْيٰنُ عَنْ يَحْيٰى عَنْ عَمْرَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَتَتْهَا بَرِيْرَةُ تَسْأَلُهَا فِيْ كِتَابَتِهَا فَقَالَتْ اِنْ شِئْتِ اَعْطَيْتُ اَهْلَكِ وَيَكُوْنُ الْوَلَآءُ لِيْ وَقَالَ اَهْلُهَا اِنْ شِئْتِ اَعْطَيْتِهَا مَابَقِيَ وَقَالَ سُفْيَانُ مَرَّةً اِنْ شِئْتِ اَعْتَقْتِهَا وَيَكُوْنُ الْوَلَآءُ لَنَا فَلَمَّا جَآءَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ذَكَرْتُهُ ذٰلِكَ فَقَالَ ابْتَاعِيْهَا فَاَعْتِقِيْهَا فَاِنَّمَا الْوَلَآءُ لِمَنْ اَعْتَقَ ثُمَّ قَامَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَلَى الْمِنبَرِ وَقَالَ سُفْيَانُ مَرَّةً فَصَعِدَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ عَلَى الْمِنْبَرِ فَقَالَ مَا بَالُ اَقْوَامٍ يَشْتَرِطُوْنَ شُرُوْطاً لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللهِ؟ مَنِ اشْتَرَطَ شَرْطاً لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللهِ فَلَيْسَ لَهٗ وَاِنْ اشْتَرَطَ مِائَةَ مَرَّةٍ وَرَوَاهُ مَالِكٌ عَنْ يَحْيٰى عَنْ عَمْرَةَ اَنَّ بَرِيْرَةَ وَلَمْ يَذْكُرْ صَعِدَ الْمِنْبَرَ قَالَ عَلِيٌّ قَالَ يَحْيٰى وَعَبْدُ الْوَهَّابِ عَنْ يَحْيٰى عَنْ عَمْرَةَ نَحْوَهٗ وَقَالَ جَعْفَرُ بْنُ عَوْنٍ عَنْ يَحْيٰى سَمِعْتُ عَمْرَةَ قَالَتْ سَمِعْتُ عَائِشَةَ. (آئندہ: ۱۴۹۳، ۲۱۵۵، ۲۱۶۸، ۲۵۳۶، ۲۵۶۰، ۲۵۶۱، ۲۵۶۳، ۲۵۶۴، ۲۵۶۵، ۲۵۷۸، ۲۷۱۷، ۲۷۲۶، ۲۷۲۹، ۲۷۳۵، ۵۰۹۷، ۵۲۷۹، ۵۲۸۴، ۵۴۳۰، ۶۷۱۷، ۶۷۱۵، ۶۷۵۴، ۶۷۵۸، ۶۷۶۰)

**ترجمہ** باب، مسجد میں منبر پر بیع وشراء کے ذکر کا بیان۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ ان کے پاس حضرت بریرہؓ اپنے بدل کتابت کی ادائیگی کے سلسلہ میں سوال کرنے (مدد مانگنے) آئیں، اس پر حضرت عائشہ نے فرمایا کہ تم اگر چاہو تو میں تمہارے آقا کو بدل کتابت ادا کروں اور ولاء (آزاد کردہ غلام کی وراثت) کا حق میرے لیے ہوگا، ان کے مالکوں نے حضرت عائشہ سے کہا کہ تم اگر چاہو تو بقیہ بدل کتابت ادا کردو؛ اور سفیان نے ایک مرتبہ روایت اس طرح بیان کی کہ مالکوں نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو آزاد کردیں اور ولاء کا حق ہمارا ہوگا، پھر جب رسول اکرم ﷺ تشریف لائے تو حضرت عائشہ نے ان سے یہ بات ذکر کی، اس پر آپ نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ تم ان کو خرید لو اور

آزاد کردو، اس لیے کہ ولاء کا حق اسی شخص کو ہوتا ہے جو آزاد کرے، پھر رسول اللہ ﷺ منبر پر کھڑے ہوئے (اور مسئلہ کی وضاحت فرمائی) اور ایک مرتبہ سفیان نے روایت اس طرح بیان کی کہ پھر رسول اللہ ﷺ منبر پر چڑھے اور فرمایا کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ معاملات میں ایسی شرطیں رکھتے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں، جو کسی معاملہ میں ایسی شرط لگائے گا جو کتاب اللہ میں نہیں ہے، تو اس شرط کا اس کو کوئی فائدہ نہ ہوگا، خواہ وہ ایسی سو شرطیں لگالے، امام مالک نے اس روایت کو یحییٰ سے اور یحییٰ نے عمرہ سے (مرسلاً) نقل کیا ہے کہ حضرت بریرہ الخ، اس روایت میں حضور ﷺ کے منبر پر چڑھنے کا ذکر نہیں ہے، اس روایت کو علی بن عبداللہ نے یحییٰ بن سعید القطان اور عبدالوہاب بن عبدالمجید سے اور ان دونوں نے یحییٰ بن سعید انصاری سے اور انھوں نے عمرہ سے اسی طرح (یعنی مرسلاً اور بدون ذکر منبر) روایت کیا ہے، اسی روایت کو جعفر بن عون نے یحییٰ سے نقل کیا ہے کہ میں نے عمرہ سے سنا، انھوں نے کہا کہ انھوں نے حضرت عائشہ سے سنا۔

**مقصد ترجمہ** امام بخاری کیا کہنا چاہتے ہیں؟ علامہ عینی اور حافظ ابن حجر دونوں کا رجحان یہ ہے کہ امام بخاری یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ مسجد دینی کاموں کے لیے ہوتی ہی ہے، اس لیے مسائل واحکام شرعیہ کی وضاحت موضوعِ مسجد کے منافی نہیں، علامہ سندھیؒ نے بھی تقریباً یہی ارشاد فرمایا کہ امام بخاری متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ مسجد میں جس بیع وشراء سے منع کیا گیا ہے، اس کا تعلق عقد بیع سے ہے، رہا مسائل کا بیان اور علمی افادہ تو اس کی ممانعت نہیں ہے، لیکن حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ امام بخاری نفس عقد کا جواز بیان کرنا چاہتے ہیں یعنی مسجد میں اگر مبیع موجود نہ ہو مبیع مثلاً گھر یا کسی اور جگہ ہو اور ایجاب وقبول مسجد میں کرلیا جائے، مبیع گھر سے دلوادی جائے تو امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ ایسا کرنا جائز ہے، حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے بھی امام بخاری کا مقصد یہی قرار دیا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ کی عبارت کا ترجمہ یہ ہے:

''ترجمہ کا مقصد یہ ہے کہ مبیع کو مسجد میں لائے بغیر ایجاب وقبول کے الفاظ کا زبان سے ادا کرنا جائز ہے؛ کیوں کہ بیع کے لئے ایجاب وقبول کے کلمات کی ادائیگی بھی تکلم کی مباح قسم میں داخل ہے، لیکن ترجمہ کے ذیل میں جو روایت دی گئی ہے وہ اس مضمون کو ثابت کرنے میں ایک گونہ خفا رکھتی ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں حکم شرعی بیان کرنے کے لیے بیع وشراء کا ذکر کیا تھا اور یہ ایک علمی افادہ تھا وہ عقد بیع وشراء نہیں تھا، مگر امام بخاری نے یہ خیال کرتے ہوئے کہ رسول اللہ ﷺ نے برسر منبر بیع وشراء کا ذکر فرمایا اور مبیع کو مسجد میں لائے بغیر ایجاب وقبول کرنے میں محض بیع وشراء کا ذکر ہی ہوتا ہے، اس لیے اس کو جائز ہونا چاہئے، اگرچہ دونوں میں نوعیت کا فرق ضرور ہے، مگر امام بخاری کے یہاں اس طرح کے استدلال بکثرت پائے جاتے ہیں''۔

حضرت شاہ ولی اللہ نے نوعیت کا جو فرق بیان کیا ہے وہ بہت اہم ہے، کیوں کہ بخاری میں سب سے پہلی روایت ''انما الاعمال بالنیات'' آئی تھی، اس کے ذیل میں یہ بحثیں گذر چکی ہیں کہ اس کے ذیل میں ایمانیات، عبادات، اعمال اور معاملات، سب ہی چیزیں آجاتی ہیں، اب غور کیجئے کہ منبر پر مسائل کی تعلیم اور مسجد میں ایجاب وقبول

کے درمیان کتنا بڑا فرق ہے؛ کیوں کہ ایک مسائل کی تعلیم دے رہا ہے، جائز اور ناجائز صورتوں کی تفصیل کر رہا ہے کار نبوت یعنی علم کی اشاعت کا فریضہ انجام دے رہا ہے، اس کا مقصد تعلیم اور تعلیم کا مقصد رضاء خداوندی کا حصول ہے اور دوسرا مسجد میں ایجاب وقبول کر رہا ہے جس کا مقصد کاروبار، انتقال ملکیت جائز نفع وغیرہ ہے، تو دونوں میں بہت بڑا فرق ہے، لیکن امام بخاری نے دونوں میں ظاہری اور صورۃً یکسانیت کی بنیاد پر ترجمۃ الباب کو ثابت کر دیا، کیوں کہ دونوں ایجاب وقبول کے کلمات زبان سے ادا کرنے میں بظاہر برابر ہیں۔

**تشریح حدیث** حضرت بریرہؓ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں آیا کرتی تھیں، یہ ایک یہودی کی ملکیت میں تھیں، ایک دن انھوں نے حضرت عائشہ سے عرض کیا کہ میں نے اپنے مولی سے ۳۶۰ درہم پر عقد کتابت کرلیا ہے، جس کو ۹ سال میں ۴۰ درہم سالانہ کے حساب سے ادا کرنا ہوگا، آپ اس سلسلہ میں میری مدد فرمائیں، حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ ہاں میں تیار ہوں کہ تمہارے موالی کو یکمشت رقم ادا کر کے تمھیں اپنی طرف سے آزاد کردوں اور قاعدہ میں ولاء کا حق (یعنی آزاد کردہ غلام یا باندی کی وراثت) مجھے ملے گا، حضرت بریرہ نے اپنے مولی سے اس کا ذکر کیا تو ان کی طرف سے یہ کہا گیا کہ وہ آزاد تو کرسکتی ہیں لیکن ولاء کا حق ان کا نہیں بلکہ ہمارا ہوگا، ان کی اس شرط پر حضرت عائشہ نے آزاد کرنے کا خیال چھوڑ دیا، نبی اکرم ﷺ تشریف لائے تو ان سے ذکر ہوا، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کو اس واقعہ کا علم ہوگیا تھا کہ حضرت عائشہ، بریرہ کو خرید کر آزاد کرنا چاہتی ہیں، پھر آپ ﷺ نے حضرت عائشہ کی خاموشی دیکھی تو معلوم فرمایا کہ معاملہ کیا رہا؟ تو حضرت عائشہ نے بتلایا کہ ان کے موالی یہ کہتے ہیں، اس پر حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ خرید لو اور آزاد کردو، ولاء تو آزاد کرنے والے ہی کا حق ہے، اس کے بعد حضور پاک ﷺ منبر پر تشریف لے گئے، اور اعلان فرمایا کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ معاملات کے اندر ایسی شرطیں رکھتے ہیں جو اللہ کی کتاب یعنی اللہ کے لکھے ہوئے اور فرض قرار دیئے ہوئے احکام میں نہیں ہیں، اگر کوئی ایسی شرط لگا کر معاملہ کرے گا تو شرط لغو اور خدا کا فیصلہ نافذ ہوگا۔

اس روایت سے مختلف اشکالات پیدا ہوتے ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے ایک ایسی باندی کو خریدا جس کا اپنے مولی سے عقد کتابت ہو چکا تھا، جب کہ مکاتب کی بیع حنفیہ کے یہاں جائز نہیں، دوسرے یہ کہ حضرت بریرہ کے موالی نے یہ شرط رکھی تھی کہ ولاء ان کو ملے گی، نیز یہ کہ حضرت عائشہ نے اس شرط کے ساتھ خریدا کہ وہ بریرہ کو آزاد کردیں گی، پہلی شرط بائع کے نفع کی ہے، اور دوسری شرط میں مبیع یا معقود علیہ کا فائدہ ہے اور ایسی شرطیں حنفیہ کے یہاں عقد کو فاسد کر دیتی ہیں، اس لیے حضور اکرم ﷺ نے حضرت عائشہ کو خریداری کی اجازت دے کر نعوذ باللہ عقد فاسد کی اجازت دی، تیسرا اشکال یہ ہے کہ بائع کی جانب سے ولاء کی شرط کے باوجود حضرت بریرہ کو خرید لیا تو گویا معاملہ کے وقت ایک چیز کو قبول کرلیا یعنی بائع کو مطمئن کر دیا، پھر اس کے بعد اس کو وہ چیز نہ دی جائے تو یہ غدر ہوگیا معاذ اللہ من ذلک۔

لیکن یہ سب اشکالات غلط فہمی پر مبنی ہیں، روایت میں جو باتیں مذکور ہیں ان کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو کوئی

اشکال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ مکاتب اگر بدل کتابت کی ادائیگی سے عاجز ہو جائے تو اس کا فروخت کرنا درست ہے، اسی طرح حضرت عائشہؓ نے بریرہ کو اس شرط کے ساتھ نہیں خریدا تھا کہ وہ انھیں آزاد کردیں گی، بلکہ صورت یہ تھی کہ حضرت بریرہؓ نے ظاہر کیا کہ وہ آزادی کی خواہش مند ہیں، حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ اگر تمہارے آقا اس کے لیے تیار ہوں کہ میں خرید کر آزاد کردوں تو ایسا کرسکتی ہوں، ہمارے نزدیک آزاد کرنے کی شرط متعاقدین کے درمیان نہ ہونے کے سبب صلب عقد میں داخل نہیں ہے، بلکہ عقد بیع متعاقدین کے درمیان الگ ہے، اور آزاد کرنے کا وعدہ معقود علیہ سے الگ ہے، خریدنے والا اس وعدہ پر قائم بھی رہ سکتا ہے، اور چھوڑ بھی سکتا ہے، کہ وعدہ کا ایفاء اس کے ذمہ قضاءً واجب نہیں ہے، جہاں تک موالی کی جانب سے ولاء کی شرط کا تعلق ہے تو یہ شرط قبول ہی نہیں کی گئی بلکہ رسول اللہ ﷺ نے برسرِ منبر وضاحت فرمادی کہ یہ شرط احکام خداوندی کے خلاف ہونے کی بنیاد پر قابل قبول نہیں ہے، ایسا نہیں ہے کہ پہلے بائعین کو مطمئن کردیا گیا ہو کہ ولاء ان کو ملے گی، پھر اس کی خلاف ورزی کی گئی ہو۔

**ترجمہ کا ثبوت** ترجمہ کے الفاظ ہیں مسجد میں منبر پر بیع وشراء کا ذکر۔ اس کا منشاء مسائل بیع کی تعلیم کا جواز ثابت کرنا ہو یا مسجد میں عقد بیع کا جواز بیان کرنا ہو، لیکن حدیث باب میں رسول اللہ ﷺ نے برسرِ منبر جو ارشاد فرمایا ہے اس میں بیع وشراء کا تذکرہ نہیں ہے، اس لیے ترجمہ کو حدیث باب سے ثابت کرنے میں دشواری پیش آرہی ہے، اس کے لیے شارحین نے جو توجیہات کی ہیں ان میں عمدۃ القاری میں سب سے زیادہ واضح بات ارشاد فرمائی گئی ہے کہ حدیث باب کی ترجمہ سے مطابقت "مابال اقوام یشترطون الخ" سے معلوم ہوسکتی ہے، اس لیے کہ یہ بات آپ نے بیع وشراء اور عتق وولاء کے قضیہ کے بعد ارشاد فرمائی ہے، کیونکہ منبر پر جانے سے پہلے آپ حضرت عائشہ سے ارشاد فرما چکے تھے "ابتاعیها فاعتقیها فان الولاء لمن اعتق" کہ تم ان کو خریدلو اور آزاد کردو، ولاء تو آزاد کرنے والے ہی کا حق ہے، پھر جب آپ منبر پر ارشاد فرماتے ہیں کہ لوگوں کو کیا ہوگیا ہے کہ وہ معاملات میں ایسی شرطیں لگاتے ہیں جو احکام خداوندی کے خلاف ہیں، تو آپ گویا اسی گذرے ہوئے قضیہ کی طرف اشارہ فرمارہے ہیں اور منبر پر اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنا، منبر پر اس کو بیان کرنے کے مرادف ہے۔　　واللہ اعلم

**حدیث باب کی متعدد سندیں** حدیث باب کو امام بخاری نے متعدد طرق سے ذکر کیا ہے، منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ روایت امام بخاری کے شیخ علی بن عبد اللہ المدینی اپنے چار شیوخ سے نقل کرتے ہیں، یہ چاروں شیوخ اپنے شیخ یحیٰی بن سعید انصاری سے روایت کرتے ہیں، ان میں سے امام مالک کی سند یہاں مرسلاً ذکر کی گئی ہے اور اس میں "صعد المنبر" کی تصریح نہیں ہے، نیز یحیٰی بن سعید القطان اور عبد الوہاب ثقفی والی سند بھی مرسلاً دی گئی ہے اور جعفر بن عون والی سند میں یحیٰی بن سعید انصاری کے عمرہ سے سماع کی تصریح ہے، اصل متن میں سفیان بن عیینہ کی روایت دی گئی اور بتلایا گیا ہے کہ انھوں نے ایک بار ایک طرح سے اور دوسری بار دوسری طرح سے ذکر

کیا اور چونکہ ان کی روایت سے منبر کا تذکرہ ہونے کے سبب ترجمۃ الباب ثابت ہوتا ہے؛ اس لیے اس روایت کو اصل قرار دے کر متن میں لے لیا، اور بقیہ اساتذہ کی روایت کا حوالہ دے دیا۔ واللہ اعلم

## [۷۱] بَابُ التَّقَاضِيْ وَالْمُلاَزَمَةِ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۵۷) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ عُمَرَ قَالَ اَخْبَرَنِيْ يُوْنُسُ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ عَنْ كَعْبٍ اَنَّهٗ تَقَاضٰى ابْنُ اَبِيْ حَدْرَدٍ دَيْناً كَانَ لَهٗ عَلَيْهِ فِي الْمَسْجِدِ فَارْتَفَعَتْ اَصْوَاتُهُمَا حَتّٰى سَمِعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ فِيْ بَيْتِهٖ فَخَرَجَ اِلَيْهِمَا حَتّٰى كَشَفَ سِجْفَ حُجْرَتِهٖ فَنَادٰى يَا كَعْبُ! قَالَ لَبَّيْكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! قَالَ ضَعْ مِنْ دَيْنِكَ هٰذَا وَاَوْمَأَ اِلَيْهِ اَيِ الشَّطْرَ قَالَ لَقَدْ فَعَلْتُ يَارَسُوْلُ اللّٰهِ! قَالَ قُمْ فَاقْضِهٖ.

(آئندہ: ۴۷۱، ۲۴۱۸، ۲۴۲۴، ۲۷۰۶، ۲۷۱۰)

**ترجمہ** باب، مسجد میں کسی قرضدار سے اپنا قرض مانگنے اور قرضدار کے پیچھا کرنے کا بیان۔ حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے مسجد میں عبداللہ بن ابی حدرد پر اپنے قرض کا تقاضا کیا اور ان دونوں کی آوازیں بلند ہوگئیں، یہاں تک کہ اس کو رسول اللہ ﷺ نے اپنے حجرے میں سنا اور آپ باہر تشریف لائے حتی کہ اپنے حجرے کا پردہ ہٹادیا، پھر آپ نے آواز دی اے کعب! انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنے قرض میں سے اتنا چھوڑ دو اور اشارہ سے بتلایا کہ نصف چھوڑ دو، حضرت کعب نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! بے شک میں نے آپ کے ارشاد کے مطابق آدھا چھوڑ دیا، پھر آپ نے ابن ابی حدرد سے فرمایا کہ جاؤ ان کا قرض ادا کردو۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ مسجد میں کسی قرضدار پر قرض کا تقاضا کرنا اور اس کا پیچھا گھیرنا جائز ہے، یہ ثابت کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ مسجد عبادت کے لیے بنائی جاتی ہے، اور قرض داروں پر تقاضا وغیرہ کرنا موضوع مسجد کے منافی معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ اس میں جھگڑا ہوتا ہے، آوازیں بلند ہوتی ہیں وغیرہ، اس لیے بخاری نے ثابت کردیا کہ اگر قرض خواہ معمولی طور پر مدیون سے مسجد میں مطالبہ کرے یا پکڑ کر بیٹھ جائے تو اس کی گنجائش ہے، خصوصاً اس صورت میں جب کہ مدیون مسجد سے باہر نظر ہی نہ آتا ہو۔

**تشریح حدیث** روایت میں مذکور ہے کہ حضرت کعبؓ بن مالک کا حضرت عبداللہ بن ابی حدرد پر کچھ قرض تھا، حضرت کعبؓ نے مسجد ہی میں ان پر تقاضا شروع کردیا، ان کے تقاضے اور حضرت ابن ابی حدرد کے جواب میں آوازیں اس قدر بلند ہوئیں کہ آپ کا حجرۂ مبارک میں جھگڑنے کی آوازیں پہنچیں، آپ نے حجرے کا پردہ اٹھایا اور باہر تشریف لائے اور مقدمہ اپنے ہاتھ میں لے کر ارشاد فرمایا کہ کعب! ان کا آدھا قرضہ معاف کردو، انھوں نے

فوراً حکم کی تعمیل کی اور عرض کیا کہ حضرت! منظور ہے، پھر آپ نے حضرت ابن ابی حدرد سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ جاؤ اب پس وپیش کی گنجائش نہیں ہے، نصف معاف ہو گیا ہے، بقیہ مطالبہ فوراً ادا کر دو۔

**ترجمہ کا ثبوت** ترجمۃ الباب میں دو جز ہیں، ایک تقاضی یعنی تقاضا کرنا اور دوسرے ملازمت یعنی پیچھا کرنا، روایت باب میں تقاضا کرنے کا تو ذکر ہے، لیکن ملازمت یعنی پیچھا گھیرنے کا تذکرہ نہیں ہے، شارحین نے اس دوسرے جزء کو ثابت کرنے کے لیے عام طور پر اس روایت کے دوسرے طرق کا سہارا لیا ہے کہ بخاری ہی میں باب الصلح میں یہ روایت آئی ہے، جس کے الفاظ ہیں:

عن عبداللّٰه بن کعب عن ابیه انه کان له علی عبداللّٰه ابن ابی حدرد الا سلمی مال فلقیه فلزمه فتکلما حتی ارتفعت اصواتهما. (فتح الباری ص ۹۸/ ج ۲)

حضرت کعبؓ سے روایت ہے کہ ان کا حضرت عبداللہ بن ابی حدرد کے ذمہ کچھ مالی مطالبہ تھا، تو وہ ان سے ملے اور ان کو گھیر لیا، پھر ان دونوں کے درمیان گفتگو ہوئی اور دونوں کی آوازیں بلند ہو گئیں۔

اس روایت میں "فلزمه" کی صراحت ہے، اس طرح ترجمہ کے دونوں جز تقاضا اور ملازمت ثابت ہو جاتے ہیں۔

اور اس سے زیادہ آسان اور واضح بات یہ ہے کہ ترجمہ کے دونوں جز اسی روایت سے ثابت ہیں، کیوں کہ اول تو تقاضا، ملازمت یعنی پیچھا گھیرنے ہی سے ہوتا ہے، دوسرے یہ کہ روایت میں مضمون یہی ہے کہ حضرت کعب نے مسجد میں حضرت عبداللہ بن ابی حدرد سے جو گفتگو کی اس میں بات اتنی تیز ہو گئی کہ پیغمبر علیہ السلام کو حجرے سے باہر آ کر معاملہ کا فیصلہ کرنا پڑا، اس سے صرف تقاضا ہی نہیں، دوسرا جز بھی پوری طرح ثابت ہو رہا ہے۔ واللہ اعلم

## [۷۲] بَابُ كَنْسِ الْمَسْجِدِ وَالتِقَاطِ الْخِرَقِ وَالْقَذٰى وَالعِيْدَان

(۴۵۸) حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بنُ حَرْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ اَبِىْ رَافِعٍ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَجُلاً اَسْوَدَ اَوِ امْرَأَةً سَوْدَآءَ كَانَ يَقُمُّ الْمَسْجِدَ فَمَاتَ فَسَأَلَ النَّبِىُّ ﷺ عَنْهُ فَقَالُوْا مَاتَ فَقَالَ اَفَلاَ كُنْتُمْ اٰذَنْتُمُوْنِىْ بِهٖ، دُلُّوْنِىْ عَلٰى قَبْرِهٖ اَوْقَالَ قَبْرِهَا فَصَلّٰى عَلَيْهَا. (آئندہ: ۴۶۰، ۱۳۳۷)

**ترجمہ** باب، مسجد میں جھاڑو دینے کا اور پھٹے پرانے کپڑے، تنکے اور لکڑی کا چورا چننے اور اٹھانے کا بیان۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ایک سیاہ فام مرد یا سیاہ فام عورت مسجد میں جھاڑو دینے کی خدمت کرتی تھی، ان کا انتقال ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے ان کے بارے میں معلوم کیا، تو لوگوں نے بتلایا کہ ان کا انتقال ہو گیا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ پھر تم لوگوں نے اس کی اطلاع مجھے کیوں نہیں دی؟ مجھے ان کی قبر بتلاؤ، چنانچہ آپ ان کی قبر پر تشریف

لے گئے اوران کی نماز جنازہ پڑھی۔

**مقصد ترجمہ** ابوداؤد شریف میں روایت ہے کہ صحابہ کرام باہم یہ کہا کرتے تھے کہ مسجد سے سنگریزوں کو نکالا جائے، تو نکالنے والے کو اللہ کا واسطہ دے کر یہ کہتے کہ انھیں مسجد سے نہ نکالا جائے۔روایت کے الفاظ یہ ہیں

کان یقال ان الرجل اذا أخرج الحصی من المسجد یناشدہ. (ابوداؤد ص۶۶/ج۱)

یہ بات مشہور تھی کہ انسان جب سنگریزے کو مسجد سے باہر نکالتا ہے تو سنگریزہ اسے خدا کا واسطہ دے کر اس سے سوال کرتا ہے (کہ اسے مسجد سے نہ نکالے)۔

یہ بات چونکہ صحابۂ کرام کے درمیان مشہور تھی اور عقل سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے، اس لیے محدثین کے اصول کے مطابق یہ حکماً مرفوع ہے کہ سنگریزے کو مسجد سے باہر نکالا جائے گا تو وہ نکالنے والے سے خدا کا واسطہ دے کر نہ نکالنے کے لیے کہے گا، لیکن امام بخاریؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسجد کو صاف ستھرا رکھنے کا حکم ہے، ہر وہ چیز جو کوڑا سمجھی جاتی ہو اس کو مسجد سے دور کرنا اہل مسجد کی ذمہ داری ہے، سنگریزے ہوں، تنکے ہوں، یا لکڑی کا چورا ہو، یا کپڑے کی دھجیاں ہوں، ان تمام چیزوں کو جھاڑو دے کر مسجد سے ہٹا دیا جائے، یا ان کو چن چن کر مسجد سے پھینک دیا جائے، اس باب میں امام بخاری یہی مضمون بیان کرنا چاہتے ہیں۔

**حضرت گنگوہیؒ کا ارشاد** حضرت گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا کہ امام بخاریؒ اس باب میں مسجد میں جھاڑو دینے اور اس کی صفائی کا اہتمام کرنے کی فضیلت بیان کرنا چاہتے ہیں، کہ اس خدمت کو حقیر نہ سمجھنا چاہئے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس خدمت کے انجام دینے والے کو اتنی اہمیت دی کہ اس کی قبر پر پہنچ کر نماز جنازہ ادا کی، شارحین بخاری میں ابن بطال نے تقریباً یہی بات کہی ہے۔

**تشریح حدیث** ایک عورت مسجد نبوی کی خدمت کیا کرتی تھی، یہاں راوی نے شک کا صیغہ استعمال کیا ہے کہ وہ عورت تھی، یا یہ خادم مرد تھا، لیکن بعض روایات میں عورت کا تعین ہے، اور بعض روایات میں ان کا نام ام محجن بتلایا گیا ہے، کام تھا جھاڑو لگانا، وہ مسجد ہی میں رہتی تھی، بیمار ہوئی اور انتقال ہو گیا، نبی کریم ﷺ کو مطلع نہیں کیا گیا، بلکہ رات ہی میں دفن کر دیا گیا، آپ صبح کو تشریف لائے تو پوچھا کہاں ہے؟ جواب میں عرض کیا گیا کہ دفن بھی کر دیا گیا، آپ نے باز پرس فرمائی کہ مجھے کیوں خبر نہیں کی؟ پھر آپ قبر پر تشریف لے گئے اور نماز پڑھی، بعض روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ آپ کے باز پرس فرمانے پر یہ معذرت کی گئی کہ آرام کا وقت تھا، ہم لوگوں نے خیال کیا کہ آپ کو بیدار کرنے میں آپ کو زحمت ہوگی اس لیے اطلاع نہیں دی گئی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ رات تاریک تھی، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حادثہ کو اہمیت نہیں دی گئی، مسلم شریف میں ہے: ''قال کانھم صغروا امرھا'' (مسلم ص:۳۱۰/ج:۱) گویا ان حضرات نے اس معاملہ کو معمولی سمجھا کہ ایک بے سروسامان مسجد کی خادمہ کا انتقال ہو گیا، اس

کا کوئی خویش وقریب بھی نہیں ہے؛ اس لیے حضور پاک ﷺ کو اس کی کیا اطلاع کی جائے، لیکن آپ نے قبر پر جا کر نماز پڑھی، گویا یہ واضح فرمایا کہ مسجد میں جھاڑو دینے کی خدمت کو معمولی کام نہیں سمجھنا چاہئے۔

**ترجمہ کا ثبوت** امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں چند چیزیں ذکر کی ہیں، مسجد میں جھاڑو دینا اور پھٹے ہوئے کپڑے، تنکے اور لکڑی کا چورا چننا۔ بخاری کی روایت میں ان چیزوں کی گو تفصیل نہیں، لیکن "کان یقم المسجد" کی تعبیر ان تمام چیزوں کو شامل ہے، جو مسجد کی شان کے منافی ہوں، کیوں کہ "یقم" کے معنی ہیں کہ وہ مسجد میں جاروب کشی کی خدمت کرتی تھیں۔ "مقمّہ" جھاڑو کو کہتے ہیں اور "قمامۃ" ہر قسم کے کوڑا کرکٹ کو، اس لیے مطلب یہ ہوا کہ وہ مسجد نبوی کا تمام کوڑا کرکٹ یعنی کہ پرانے کپڑے، لکڑی کا چورا، تنکے اور گرد وغبار سب ہی چیزوں کو جھاڑو سے صاف کیا کرتی تھیں، نیز علامہ عینی نے کنس اور التقاط میں بھی فرق کیا ہے کہ کنس جھاڑو دینے کا عمل ہے جس کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کا کوڑا صاف کیا جائے، اور التقاط کا مطلب یہ ہے کہ کوئی چیز نظر پڑ گئی تو اس کو اٹھا لیا، یہ باقاعدہ کام نہیں ہے، بلکہ اتفاقی چیز ہے، اس لیے امام بخاری کا ترجمۃ الباب صرف "کان یقم المسجد" سے ثابت ہے، کیوں کہ اس کا مفہوم ہی یہ ہے کہ ان کا مستقل کام مسجد نبوی سے ایسی تمام چیزوں کو جھاڑو کے ذریعہ صاف کرنا تھا جو مسجد میں نہ ہونی چاہئیں۔

نیز یہ کہ بعض شارحین نے امام بخاری کی عادت کے مطابق اس روایت کے دیگر طرق میں آنے والے الفاظ سے بھی ترجمۃ الباب کے تفصیلی اجزاء کو ثابت کیا ہے، چنانچہ بعض روایت میں "کانت مولعۃ بلقط القذی من المسجد" کے الفاظ ہیں کہ وہ مسجد سے خس وخاشاک چننے میں خصوصی شغف رکھتی تھی۔ ابن خزیمہ کی روایت میں اور زیادہ صراحت ہے: "کانت تلتقط الخرق والعیدان من المسجد" (عمدۃ القاری ص۲۳۰/ج۴) وہ مسجد سے بوسیدہ کپڑے اور لکڑی کا چورا چنتی رہتی تھی۔

چونکہ روایت کے دوسرے طرق میں ان تمام چیزوں کی صراحت ہے جو امام بخاری کے ترجمۃ الباب میں مذکور ہیں، اس لیے امام بخاری نے اپنے ذوق کے مطابق ترجمہ کو اس انداز سے ثابت کر دیا۔

**قبر پر نماز جنازہ کا مسئلہ** روایت میں آیا کہ رسول اللہ ﷺ نے قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی۔ نبی کریم ﷺ کے قبر پر نماز جنازہ پڑھنے کا ذکر متعدد روایات میں آیا ہے، بعض محدثین نے ایسی روایات کی تعداد نو تک بیان کی ہے، مگر فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، داؤد ظاہری اور کچھ فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ جو لوگ نماز جنازہ میں شرکت نہیں کر سکے ہیں وہ قبر پر نماز جنازہ پڑھ سکتے ہیں، البتہ اجازت دینے والے ان فقہاء کے درمیان بھی اس کی مدت میں اختلاف ہے، بعض حضرات نے تدفین سے دوسرے دن، بعض نے تین دن تک اور بعض فقہاء نے زیادہ سے زیادہ ایک ماہ تک اجازت دی ہے، ان کے برخلاف ابراہیم نخعی،

امام ابوحنیفہ اور امام مالک رحمہم اللہ نے قبر پر نماز جنازہ ادا کرنے سے انکار کیا ہے''بدایۃ المجتہد''میں ہے کہ امام مالک سے سوال کیا گیا کہ حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک عورت کی قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی، تو انھوں نے فرمایا کہ روایت میں آیا ہے لیکن اس پر صحابہ کرام کا عمل نہیں ہے، امام ابوحنیفہ کا مسلک یہ ہے کہ اگر نماز جنازہ کے بغیر تدفین کر دی گئی ہے، تو قبر پر نماز جنازہ پڑھی جائے گی، نیز یہ کہ اگر نماز جنازہ تو ہوئی لیکن ولی میت نے شرکت نہیں کی تو دفن کے بعد قبر پر ولی میت نماز پڑھ سکتا ہے، اس میں یہ بھی قید ہے کہ یہ اسی وقت تک پڑھی جا سکتی ہے، جب تک نعش کے محفوظ ہونے کی امید ہو، اس کے لیے فقہاء نے تین دن کے اندر اندر کی تعیین کی ہے۔

حدیث باب میں رسول اللہ ﷺ کے قبر پر نماز پڑھنے کے بارے میں فرمایا گیا ہے، اس سلسلہ میں حنفیہ یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بلا شک تمام مومنین کے ولی ہیں اور آپ کی شرکت کے بغیر اس کی نماز جنازہ ہوئی تھی، اس لیے بحیثیت ولی میت آپ نے قبر پر نماز ادا کی۔ اس طرح حنفیہ کا مسلک اس روایت کے خلاف نہیں ہے، گویا آپ نے جو قبر پر نماز جنازہ پڑھی تو وہ قبر پر نماز جنازہ کے جواز کا مسئلہ نہیں بلکہ حق ولی کی رعایت کا مسئلہ ہے، نیز یہ کہ جلال الدین سیوطی نے''خصائص''میں بعض حنفیہ کی جانب سے یہ نقل کیا ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے زمانے میں کسی کا انتقال ہوتا اور جنازہ میں آپ کی شرکت ممکن ہوتی تو آپ کی شرکت کے بغیر نماز جنازہ کا کسی کو حق نہیں تھا، گویا یہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی خصوصیت تھی، پھر یہ کہ آپ کو چوں کہ اس عورت کے جنازہ کی اطلاع ہی نہیں دی گئی اور آپ نماز جنازہ میں شریک نہیں ہو سکے، اس لیے آپ نے قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی، آپ کی اس خصوصیت کے لیے متعدد فقہاء نے مسلم شریف کی اس روایت کو بھی دلیل کے طور پر پیش کیا ہے:

| | |
|---|---|
| ثم قال ان هذه القبور مملوءة ظلمة على اهلها و ان الله ينورها لهم بصلاتي عليهم. (مسلم شریف ص: ۳۱۰/ ج:۱) | (قبر پر نماز جنازہ پڑھنے کے بعد) آپ نے فرمایا کہ ان قبروں میں اہل قبر پر تاریکی چھائی رہتی ہے، اور بے شک اللہ تعالیٰ ان پر میرے نماز جنازہ پڑھنے کے بعد ان کو اہل قبر کے لیے منور فرما دیتا ہے۔ |

آپ ﷺ کا یہ ارشاد فرمانا آپ کی خصوصیت کی واضح دلیل ہے کیوں کہ آپ کے بعد کون یہ دعوی کر سکتا ہے کہ اس کے نماز جنازہ پڑھنے سے قبریں منور ہو جاتی ہیں، نیز یہ کہ آپ نے قبروں کی اس تنویر کا سبب مطلق نماز جنازہ کو نہیں بلکہ اس نماز جنازہ کو قرار دیا ہے جو آپ نے پڑھائی ہو، روایت کے الفاظ میں "بالصلاة عليهم" نہیں، بلکہ "بصلاتي عليهم" ہے اور امام مالک نے جو یہ فرمایا کہ اس پر صحابہ کرام کا عمل نہیں ہے، اس کا بھی مفہوم یہی ہے کہ امام مالک قبر پر نماز جنازہ کو رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت سمجھ رہے ہیں یعنی یہ کہ اگرچہ روایت میں قبر پر نماز جنازہ کا ثبوت ہے، لیکن صحابہ کرام کا

اس پر عمل نہ کرنا بتلا رہا ہے کہ یہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی خصوصیت تھی، امت کے دوسرے افراد کو ہر صورت میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ واللہ اعلم

## [۷۳] بَابُ تَحْرِيمِ تِجَارَةِ الْخَمْرِ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۵۹) حَدَّثَنَا عَبْدَانُ عَنْ اَبِيْ حَمْزَةَ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ مُسْلِمٍ عَنْ مَسْرُوْقٍ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ لَمَّا اُنْزِلَتِ الآيَاتُ مِنْ سُوْرَةِ الْبَقَرَةِ فِي الرِّبٰوا خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ اِلَى الْمَسْجِدِ فَقَرَأَهُنَّ عَلَى النَّاسِ ثُمَّ حَرَّمَ تِجَارَةَ الْخَمْرِ. (آئندہ: ۲۰۸۴، ۲۲۲۶، ۴۵۴۰، ۴۵۴۱، ۴۵۴۲، ۴۵۴۳)

**ترجمہ** مسجد میں شراب کی تجارت کی حرمت بیان کرنے کا ذکر۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ جب ربوا (سود) کے سلسلے میں سورۂ بقرہ کی آیات نازل ہوئیں تو رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور آپ نے وہ آیتیں پڑھ کر سنائیں، پھر آپ نے شراب کی تجارت کی حرمت کا اعلان کیا۔

**مقصد ترجمہ** امام بخاریؒ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسجدیں چونکہ عبادت کے لیے بنائی جاتی ہیں، اس لیے بہ ظاہر یہ شبہ ہوتا ہے کہ شراب، سود اور خنزیر جیسی گندی چیزوں کا ذکر مسجد کی شان تقدیس کے منافی ہے، لیکن ان چیزوں کا ذکر احکام شرعیہ کے بیان کے سلسلہ میں آئے تو امام بخاری کہتے ہیں کہ یہ جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے، کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے آیات ربوا کی تلاوت کے بعد مسجد ہی میں شراب کی تجارت کی حرمت کا اعلان کیا۔

عام طور پر شارحین بخاری نے مقصد ترجمہ کی وضاحت میں یہی بات کہی ہے، اور امام بخاری کے ذوق کے مطابق یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے، مگر علامہ عینی فرماتے ہیں کہ بخاری کا یہ مقصد نہیں کیوں کہ مسجد میں ان چیزوں کے تذکرے کا جواز ثابت کرنے میں کوئی فائدہ نہیں معلوم ہوتا، بلکہ بخاری یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ شراب کی تجارت کی حرمت کا اعلان مسجد میں کیا گیا ہے، اور یہی بات حدیث باب میں صراحت سے موجود ہے، بہ ظاہر علامہ عینی کے ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ وہ تجارت شراب کی شناعت بیان کرنے پر زور دے رہے ہیں، یعنی یہ کہ حضور پاک ﷺ نے اس اعلان کے لیے کسی اور جگہ کے بجائے مسجد نبوی کے منبر کا انتخاب کیا اور سود کی حرمت کے ساتھ کیا، ان باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجارت نہایت قبیح اور اس کی حرمت نہایت غلیظ ہے۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** حضرت عائشہؓ ارشاد فرماتی ہیں کہ جب سورۂ بقرہ کی وہ چار آیتیں نازل ہوئیں جن میں سود کی حرمت بیان کی گئی ہے، تو رسول اللہ ﷺ مسجد نبوی میں تشریف لائے اور آپ نے آیات کریمہ کو پڑھ کر سنایا، یہ آیتیں ''اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا'' سے ''لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ''، تک ہیں، یعنی جو لوگ سود لیتے ہیں

وہ قیامت کے دن اپنی قبروں سے اس طرح مخبوط الحواس ہو کر اٹھیں گے، جیسے دنیا میں وہ لوگ ہوتے ہیں جنھیں شیطان نے اپنے اثرات سے مجنون اور خبطی بنا دیا ہو، یہ سزا اس لیے ہوگی کہ ان بدنصیب لوگوں نے یہ کہا کہ سود بھی تو بیع ہی کی طرح ہے، حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور سود کو حرام، الی آخر الآیات۔

پہلے رسول اللہ ﷺ نے مسجد نبوی میں سود سے متعلق یہ آیات پڑھ کر سنائیں، پھر آپ نے فرمایا کہ شراب کی تجارت ربوا ہی کی طرح حرام ہے، وجہ ظاہر ہے کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ جس طرح شراب انسان کے ہوش وحواس کو ختم کر کے اسے بالکل دیوانہ بنا دیتی ہے، سود کی لعنت اس سے بھی کہیں زیادہ ہے، دنیا میں سود کا کاروبار کرنے والوں کی دیوانگی اور دولت کی حرص میں ان کا جنون اس درجہ کا ہوتا ہے، جیسے انھیں کوئی بھوت یا جن چمٹ گیا ہے، ہر وقت دنیا کی طمع انھیں بے قرار رکھتی ہے اور انسانیت کے اوصاف حمیدہ سے ان کا دور کا بھی واسطہ باقی نہیں رہتا۔ رہا آخرت کا معاملہ تو ان کا مخبوط الحواس ہو کر اٹھنا تو قرآن کی نص قطعی سے معلوم ہو رہا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ سود کو اسی لیے تو اللہ نے حرام کیا ہے کہ اس میں برائیاں ہیں، یہ عقد ربوا چند در چند مفاسد کی بنیاد پر حرام قرار دیا گیا ہے، شراب کی تجارت میں بھی طرح طرح کی خرابیاں اور برائیاں ہیں، اس لیے آیات ربوٰا سنانے کے بعد شراب کی تجارت کی حرمت کا اعلان کر دیا گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اپنے تراجم میں اس دوسری وجہ کو ذکر فرمایا ہے۔

امام بخاریؒ کا ترجمۃ الباب ثابت ہو گیا یعنی عام شارحین کے رجحان کے مطابق تو بات ثابت ہو گئی کہ سود اور شراب جیسی ناپاک چیزوں کا تذکرہ مسجد میں ہوا، لیکن احکام شرعیہ کے بیان کے سلسلہ میں ہوا، اس لیے یہ مسجد کے تقدس کے منافی نہیں۔ اور علامہ عینی کے رجحان کے مطابق یہ کہ حضور پاک ﷺ نے شراب کی تجارت کی حرمت کے لیے کسی مجمع یا کسی دوسری جگہ کا انتخاب نہیں کیا، بلکہ آپ نے اس کی حرمت کی اہمیت بیان کرنے کے لیے مسجد نبوی کے منبر سے اس کا اعلان فرمایا۔

بعض حضرات نے یہاں یہ بحث بھی کی ہے کہ آیات ربوٰا کا نزول، رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے بالکل آخری زمانہ میں ہوا ہے، جب کی شراب کی حرمت کا حکم اس سے کئی سال پہلے آچکا تھا، پھر مسجد نبوی میں آیات ربوا پڑھ کر سنانے کے بعد تجارت شراب کی حرمت کے اعلان کی کیا وجہ ہے؟ چنانچہ کسی نے یہ کہا کہ شراب کی حرمت تو پہلے ہی آ گئی تھی، مگر آپ نے دوبارہ ربوٰا کے ساتھ اس کو بیان فرمایا، کسی نے کہا کہ شراب کی حرمت کا حکم تو آ گیا تھا، لیکن اس موقع پر آپ نے اس کی تجارت کی بھی ممانعت فرمادی، مگر ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جب کسی چیز کی حرمت کا حکم آتا ہے تو اس سے انتفاع کی بھی ممانعت کر دی جاتی ہے، اس لیے یہ توجیہ محل نظر ہے، البتہ یہ توجیہ بالکل صاف اور بے غبار ہے کہ جب آپ نے آیات ربوٰا پڑھ کر سنائیں، تو ربوٰا اور شراب میں متعدد چیزوں میں مماثلت کی بنیاد پر آپ نے ربوٰا کے ساتھ شراب کی تجارت کی حرمت کا اعلان بھی کر دیا۔ واللہ اعلم

## [ ۷۴ ] بَابُ الْخَدَمِ لِلْمَسْجِدِ

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّراً مُحَرَّراً لِلْمَسْجِدِ يَخْدِمُهُ. (آل عمران:۳۵)

(۴۶۰) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ وَاقِدٍ حَدَّثَنَا حَمَّادٌ عَنْ ثَابِتٍ عَنْ اَبِي رَافِعٍ عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ اَنَّ امْرَأَةً اَوْ رَجُلًا كَانَتْ تَقُمُّ الْمَسْجِدَ وَلَا اُرَاهُ اِلَّا امْرَأَةً فَذَكَرَ حَدِيْثَ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهُ صَلّٰى عَلٰى قَبْرِهَا. (گذشتہ:۴۵۸)

**ترجمہ** باب، مسجد کی خدمت کے لیے خادموں کے مقرر کرنے کا بیان۔ حضرت ابن عباس نے آیت: "نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّراً" (اے پروردگار! میں نے اس بچہ کے بارے میں جو میرے پیٹ میں ہے تیرے لیے نذر مانی ہے کہ وہ آزاد رہے گا) کے بارے میں فرمایا کہ وہ مسجد اقصیٰ کی خدمت کے لیے آزاد رہے گا۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ ایک عورت یا مرد سے مسجد میں جھاڑو دینے کی خدمت متعلق تھی، راوی کہتا ہے کہ میرا گمان یہ ہے کہ وہ عورت ہی تھی، اس کے بعد انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی حدیث بیان کی کہ آپ نے اس کی قبر پر جا کر نماز جنازہ ادا کی۔

**مقصد ترجمہ** مقصد اس بات کی وضاحت ہے کہ مسجد کی خدمت کے لیے کسی خادم کا باقاعدہ تقرر جائز ہے یا نہیں؟ شبہ کی بنیاد یہ ہے کہ ہر مسجد، مسلمانوں کا مشترک عبادت خانہ ہوتی ہے اور سب ہی اس کے خادم ہوتے ہیں، اس صورت میں اگر کسی شخص کو خدمت کے لیے مقرر کر دیا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ دوسرے مسلمانوں کو اس کی خدمت سے محروم کر دیا گیا، اس لیے یہ سوال پیدا ہو گیا کہ مسجد میں خادم کے تقرر کا کیا حکم ہے؟ بخاری نے اس باب میں یہ بیان کیا ہے کہ مسجد کے لیے خادم کا تقرر درست اور جائز ہے، بلکہ اس کا رواج امم سابقہ سے چلا آرہا ہے، جس کو اسلام میں بھی باقی رکھا گیا۔

**ترجمہ کا ثبوت** اس مقصد کو ثابت کرنے کے لیے امام بخاری نے ایک تعلیق اور ایک روایت پیش کی ہے، روایت وہی ہے جو ایک باب سے پہلے گذر چکی ہے کہ مسجد نبوی میں جاروب کشی کی خدمت کے لیے ایک عورت مقرر تھی، اس کا انتقال ہو گیا تو پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کی قبر پر جا کر نماز جنازہ پڑھی، معلوم ہوا کہ مسجد کی کسی بھی خدمت کے لیے کسی کا نامزد کرنا درست ہے۔

تعلیق میں امام بخاری نے سورۂ آل عمران کی ایک آیت کے سلسلہ میں حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر نقل کی ہے، حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ ماجدہ (حنّہ) نے نذر مانی تھی کہ ان کے بطن سے جولڑکا پیدا ہوگا وہ اس کو دنیا کے تمام کاموں سے آزاد کر کے بیت المقدس کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گی، ارشاد فرمایا گیا ہے:

اِذْ قَالَتِ امْرَاَةُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّي — (وہ وقت یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے عرض کیا، اے

نَذَرْتُ لَكَ مَا فِيْ بَطْنِيْ مُحَرَّراً. (آل عمران آیت ۳۵)

پروردگار! میں نے اس بچہ کے بارے میں جو میرے پیٹ میں ہے یہ نذر مانی ہے کہ وہ آزاد رکھا جائے گا۔

اس آیت میں لفظ آیا ہے" محررا " آزاد کیا ہوا، حضرت ابن عباسؓ اس کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں "محررا للمسجد یخدمه" یعنی وہ دنیا کے تمام کاموں سے آزاد ہو کر مسجد کی خدمت کے لیے وقف رہے گا، گویا امم سابقہ میں یہ رواج تھا کہ وہ لڑکوں کے بارے میں عبادت خانوں کے لیے خادم ہونے کی نذر مانا کرتے تھے، اور اس نذر کو پروردگار قبول کرتا تھا، امراۃ عمران، یعنی حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کی نذر میں یہ ہوا کہ انھوں نے نذر مانی، تو لڑکے کے بجائے لڑکی یعنی حضرت مریم پیدا ہوئیں، تو انھوں نے بارگاہ خداوندی میں معذرت کے ساتھ عرض کیا: " رَبِّ اِنِّيْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰى " اے پروردگار! میرے یہاں تو لڑکی تولد ہوئی ہے، یعنی نذر کیسے پوری ہوگی، لیکن رب العالمین نے اس کو قبول فرمالیا۔ ارشاد ہوتا ہے: " فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَاَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا " پروردگار نے اس کو بطریق احسن قبول فرمایا اور اس کو اچھے نشو ونما سے نوازا۔

بہر حال امام بخاریؒ کا مدعا ثابت ہو گیا کہ مسجدوں کی خدمت کے لیے کسی خادم کا تقرر دوسرے مسلمانوں کی حق تلفی کے سبب ناجائز یا غیر مستحسن نہیں ہے، گویا جس شخص کی ذمہ داری ہے وہ تو خدمت کرے ہی گا، لیکن دوسرے حضرات اگر خدمت کرنا چاہیں تو ان کے لیے ممانعت نہیں ہے، جو یہ سعادت حاصل کرنا چاہے اپنے طور پر کرتا رہے، دوسرے یہ کہ جس شخص کا اس خدمت کے لیے تقرر ہوگا تو وہ تمام مسلمانوں کی جانب سے نائب کے طور پر کام کرے گا، کیوں کہ اہل محلّہ مل کر اس کی خدمت کریں گے، اس لیے اس کی جانب سے کی جانے والی خدمت اہل محلّہ کی جانب سے شمار ہوگی اور سب ثواب میں حصہ دار ہوں گے۔

## [۷۵] بَابُ الْاَسِيْرِ اَوِ الْغَرِيْمِ يُرْبَطُ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۶۱) حَدَّثَنَا اِسْحٰقُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ اَنَا رَوْحٌ وَمُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ زِيَادٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ اِنَّ عِفْرِيْتاً مِّنَ الْجِنِّ تَفَلَّتَ عَلَيَّ الْبَارِحَةَ اَوْ كَلِمَةً نَحْوَهَا لِيَقْطَعَ عَلَيَّ الصَّلٰوةَ فَاَمْكَنَنِيَ اللّٰهُ مِنْهُ وَاَرَدْتُ اَنْ اَرْبِطَهٗ اِلٰى سَارِيَةٍ مِّنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ حَتّٰى تُصْبِحُوْا وَتَنْظُرُوْا اِلَيْهِ كُلُّكُمْ فَذَكَرْتُ قَوْلَ اَخِيْ سُلَيْمٰنَ رَبِّ هَبْ لِيْ مُلْكاً لَّايَنْبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِيْ. قَالَ رَوْحٌ فَرَدَّهٗ خَاسِئاً. (آئندہ: ۱۲۱۰، ۳۲۸۴، ۳۴۲۳، ۴۸۰۸)

ترجمہ | باب، قیدی اور قرض دار کو مسجد میں باندھنے کا بیان۔ حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جنات میں کا ایک سرکش جن کل رات اچانک میرے سامنے آیا، یا آپ نے اس

طرح کی بات فرمائی، تا کہ وہ میری نماز درمیان میں خراب کردے، پھر اللہ تعالی نے اس پر مجھے قابو عطا فرمادیا اور میں نے یہ چاہا کہ اس کو مسجد کے ستونوں میں سے کسی ستون سے باندھ دوں تا کہ تم صبح کو مسجد میں آؤ اور سب اس کو دیکھ سکو، پھر مجھے اپنے بھائی حضرت سلیمان علیہ السلام کی وہ دعاء یاد آئی جس میں انھوں نے پروردگار سے عرض کیا کہ اے پروردگار! مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کو نہ دی جائے۔ راوی کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ دعا یاد آنے کے بعد اس جن کو رسوا کر کے واپس کر دیا۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ کسی مقروض کو عبرت کے لیے یا کسی کافر کو دینی مصلحت کے سبب مسجد کے ستون سے باندھ دینا جائز ہے اور اس میں مسجد کی حرمت کی خلاف ورزی نہیں ہے، عہد رسالت میں اس طرح کے کام مسجد نبوی میں انجام دیئے جاتے تھے، کیوں کہ عہد نبوی میں جیل خانہ الگ نہیں تھا، حضرت ابوبکر صدیقؓ کے زمانہ میں بھی یہ کام اسی طرح چلتا رہا، حضرت عمرؓ کے عہد میں "دار الحبس" یعنی جیل خانہ تعمیر کیا گیا، عہد رسالت میں مسجد نبوی میں نماز تو ہوتی ہی تھی اور اس کے ساتھ وہ تعلیم گاہ بھی تھی، دار المشورہ، دار القضاء اور دار الافتاء کا کام بھی وہیں انجام دیا جاتا تھا۔ مقروض کو مسجد میں قید کرنے میں مثلاً مصلحت یہ ہے کہ جب تمام مسلمان پانچوں وقت نماز میں حاضر ہوں گے تو دیکھیں گے کہ ایک صاحب پابہ زنجیر ہیں، معلوم کریں گے تو بتایا جائے گا کہ قرض کے سلسلہ میں ایسا کیا جارہا ہے، اس صورت حال میں جلد از جلد قرض ادا کرنے کی کوشش کرے گا، یہ اس صورت میں ہے جب کہ گنجائش کے باوجود نہ دے رہا ہو، اور اگر یہ معلوم ہو کہ غریب ونادار ہے اور اس کے پاس کچھ نہیں ہے تو شریعت نے اس موقع پر دوسری ہدایت دی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

| | |
|---|---|
| وان کان ذوعسرة فنظرة الی میسرة وان تصدقوا خیر لکم" (سورۃ البقرہ آیت: ۲۸۰) | اگر (مقروض) تنگدست ہے تو اس کو آسودہ حالی تک کے لیے مہلت دی جائے اور اگر معاف کردو تو تمہارے لیے اور بہتر ہے۔ |

نیز غیر مسلم کو مسجد میں قید کرنے میں متعدد مصلحتیں ہیں، وہ مسلمانوں کے معاملات کو دیکھے گا، ان کی عبادت کے طور طریق اور اس کی خوبیوں سے واقف ہوگا اور اس طرح اسے اسلام کی صداقت قبول کرنے اور ایمان لانے میں مدد ملے گی۔

بہر حال بخاری کا مدعا یہ ہے کہ اگر شرعی مصلحت کا تقاضہ ہو تو مسجد میں مقروض اور غیر مسلم کو قید کیا جاسکتا ہے، جمہور کے نزدیک اس مسئلہ میں اتنی گنجائش نہیں ہے، مگر امام بخاری ان تمام چیزوں میں توسع کی طرف مائل ہیں، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں تو انھوں نے متعلقات مسجد کو مسجد قرار دے کر ابواب و تراجم منعقد فرمادیئے ہیں۔ واللہ اعلم

## تشریح حدیث

حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کل رات ایک سرکش جن اچانک میرے سامنے آیا، اس کا مقصد یہ تھا کہ سامنے کی جانب سے نماز میں خلل اندازی کرے یعنی وہ تعلق جو نمازی اور خدا کے درمیان نماز میں قائم ہوتا ہے اس کو توڑ دے، بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ جن بلی کی صورت میں سامنے آیا تھا، مسلم شریف میں حضرت ابوالدرداء سے روایت ہے کہ اس نے آگ کا شعلہ نبی کریم ﷺ کے چہرۂ مبارک پر ڈالنے کی کوشش کی، جب یہ صورت پیش آئی تو اللہ نے آپ کو اس پر قابو دے دیا اور آپ نے اس کو پکڑ لیا اور نہ صرف یہ کہ پکڑ لیا بلکہ نسائی شریف میں حضرت عائشہ کی روایت میں ہے کہ آپ نے اس کو پکڑ لیا، پھر پٹک دیا اور اتنی زور سے اس کا گلا دبادیا کہ اس کا لعاب دہن آپ کے ہاتھوں پر گرا اور آپ نے اس کی ٹھنڈک محسوس کی۔ آپ فرماتے ہیں کہ میرا ارادہ تھا کہ اس کو مسجد کے ستون سے باندھ دوں تاکہ تم سب لوگ صبح کو دیکھ سکو کہ جن کو باندھ دیا گیا ہے، پھر خیال آیا کہ ایسا کرنا مناسب نہیں، ممکن ہے کہ لوگ اس کو دیکھ کر حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعاء کے بارے میں تردد میں مبتلا ہو جائیں، حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعاء فرمائی تھی: "رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَهَبْ لِیْ مُلْكاً لَا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍمِّنْ بَعْدِیْ" (سورہ ص آیت ۳۰) اور مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی کے لیے مناسب نہ ہو۔ آپ نے فرمایا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعاء کے احترام میں مناسب نہ سمجھا کہ جن کو باندھ کر تماشہ بنایا جائے، ہوسکتا ہے کہ کسی کوتاہ فہم کو یہ خیال گزرے کہ حضرت سلیمانؑ کی دعاء بارگاہ خداوندی میں مقبول نہیں ہوئی۔

## حضرت سلیمانؑ کی دعاء اور ایک جن کی گرفتاری

رسول اکرم ﷺ نے جس عفریت کو گرفتار فرمالیا تھا، اگر آپ اس کو ستون سے باندھ بھی دیتے اور مدینہ طیبہ کے بچے اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی لیتے تو اس کا حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعاء سے تعارض نہیں تھا، لیکن حضور پاک ﷺ نے کمال احتیاط اور انبیاء کرام کے حقوق کی مکمل رعایت اور تعظیم کی وجہ سے اس کو بھی مناسب نہیں سمجھا، حضرت سلیمانؑ کی دعا اور آپ ﷺ کے اس ایک جن کو مقید کرنے کے عمل میں تعارض نہ ہونے کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعاء کے الفاظ قرآن کریم میں یہ نقل فرمائے گئے ہیں: " وَهَبْ لِیْ مُلْكاً لَا یَنْبَغِیْ لِاَحَدٍ مِّنْ بَعْدِیْ " اس آیت میں اگر من بعدی کو تاخر زمانی کے معنی میں لیں تو اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ مجھے ایسی حکومت عطا فرما جو میرے بعد کسی اور کو میسر نہ ہو، لیکن آیت کے تاخر زمانی والے یہی معنی متعین نہیں ہیں، بلکہ "بعد" علاوہ اور سوا کے معنی میں بھی آتا ہے، قرآن مجید میں دوسری جگہ "من بعدی" علاوہ اور سوا کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسے " فَمَنْ یَهْدِیْهِ مِنْ بَعْدِ اللّٰهِ" (سورۃ الجاثیہ آیت: ۲۳)۔ پھر ایسے شخص کو اللہ کے علاوہ اور کون ہدایت دے سکتا ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعا میں بھی "من بعدی" کے یہ معنی مفسرین نے مراد لیے ہیں کہ اے اللہ مجھے ایسی سلطنت عطا کر جو میرے علاوہ (یعنی میرے زمانے میں) کسی اور کو میسر نہ ہو۔ اس کے علاوہ

دعاء کا یہ مطلب بھی لیا گیا ہے کہ مجھے ایسی سلطنت عطا کر کہ کسی کو مجھ سے چھین لینے کا حوصلہ نہ ہو، یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ میں ایسی سلطنت چاہتا ہوں کہ میری زندگی میں وہ مجھ سے الگ نہ ہو، یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ مجھ سے کم درجہ کے انسان کو ایسی حکومت نہ ملے، وغیرہ۔

خلاصہ یہ ہے کہ اول تو کلمات دعاء میں متعدد معانی کے احتمالات ہیں جن کی رو سے حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد والے زمانوں میں دوسروں کے لیے اس طرح کی حکومت کی گنجائش نکل سکتی ہے، لیکن ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ تاریخ عالم میں کسی کو بھی حضرت سلیمان جیسی حکومت عطا کی گئی ہو، کیونکہ حضرت سلیمان کی حکومت صرف انسانوں پر نہیں تھی، جنات اور ہواؤں تک پر ان کی حکومت عام تھی، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيحَ تَجْرِي بِأَمْرِهِ رُخَاءً حَيْثُ أَصَابَ وَالشَّيَاطِينَ كُلَّ بَنَّاءٍ وَغَوَّاصٍ وَآخَرِينَ مُقَرَّنِينَ فِي الْأَصْفَادِ. (سورہ ص آیت: ۳۸)

پھر ہم نے ہوا کو ان کے زیر نگیں کر دیا کہ وہ ان کے حکم سے جس جگہ وہ چاہتے نرمی سے چلتی اور شیاطین یعنی سرکش جنوں کو ان کے تابع کر دیا یعنی تعمیر کرنے والے اور غوطہ خوری کرنے والے جنات کو اور دوسروں کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔

ان جنات سے حضرت سلیمان علیہ السلام جس طرح کی خدمت چاہتے لے لیتے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی یہ حکومت وسلطنت ان تمام مخلوقات پر عام تھی، اس لیے اگر حضور اکرم ﷺ ایک جن کو قید کر کے مسجد کے ستون سے باندھ دیتے تو اس کا حضرت سلیمان کی دعاء سے کوئی تعارض نہ تھا، لیکن چونکہ پیغمبران عالی مقام ایک دوسرے کا احترام کرتے آئے ہیں، اس لیے آپ نے قاصر الفہم انسانوں کے اس وسوسہ کی بھی رعایت فرمائی تا کہ کسی کو حضرت سلیمان علیہ السلام کی دعاء کی قبولیت میں شک نہ ہو۔

## جنات کے بعض احکام

روایت میں ایک جن کی گرفتاری کا تذکرہ آیا ہے، جنات اللہ کی پیدا کی ہوئی وہ ناری مخلوق ہیں جو انسان کی پیدائش سے پہلے اس دنیا میں آباد تھے، ناری ہونے کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ اب بھی آگ کا ایک شعلہ ہیں، یا ان کا وجود آگ اور اس کے خواص کا حامل ہے، بلکہ جس طرح انسان کو مٹی سے پیدا کیا گیا، لیکن مٹی دیگر عناصر کے ساتھ مل کر ایک بالکل نئی صورت اور جداگانہ خواص میں تبدیل ہوگئی، اسی طرح جنات کے وجود کا عنصر اصلی تو آگ ہی ہے، لیکن روایت باب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عنصر اپنے خواص کے ساتھ باقی نہیں ہے، کیوں کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ جن آگ کا شعلہ لے کر آیا اور اسے میرے منہ پر ڈالنا چاہا، اگر یہ خود آگ ہوتا تو اسے آگ کا شعلہ لانے کی کیا ضرورت تھی، بلکہ خود اس کا جسم یا اس کا کوئی بھی عضو جلانے کے لیے کافی تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ دیگر عناصر سے مل کر نئی چیز بن گئی، بلکہ اسی روایت کے بعض طرق میں " وجدت برد لسانه على

یدی" آیا ہے، کہ مجھے اپنے ہاتھ پر اس کے لعاب کی ٹھنڈک محسوس ہوئی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ نے اپنے خواص ترک کردیئے ہیں اور وہ ٹھنڈک میں تبدیلی ہوگئی ہے۔

نیز اسی روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جنات کو اللہ نے یہ قدرت عطا کی ہے کہ وہ اپنی اصلی صورت کے علاوہ انسان، حیوان، سانپ، بچھو، اور دوسری تمام شکلوں میں متشکل ہوسکتے ہیں، اسی روایت کے بعض طرق میں یہ ہے کہ جن بلی کی صورت میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے آیا تھا، اور اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے یہ ہدایت فرمائی ہے کہ گھروں میں اگر سانپ وغیرہ نظر آئیں، تو انھیں فوراً نہ مارا جائے، انھیں تین مرتبہ متنبہ کیا جائے، اس کے بعد بھی وہ نظر آئیں، تو ماردینے میں مضائقہ نہیں، ترمذی شریف میں حضرت ابوسعید خدری سے روایت ہے:

| | |
|---|---|
| ان لبیوتکم عمارا فحرجوا علیهن ثلاثا فان بدالكم بعد ذلك منهن شئی فاقتلوه . (ترمذی ص:۱۷۹/ ج:۱) | بے شک تمہارے گھروں میں کچھ جنات بھی رہتے ہیں (وہ کسی سانپ وغیرہ کی شکل میں نظر آئیں) تو انھیں تین بار متنبہ کرو کہ تم کو تنگی ہوسکتی ہے، اس کے بعد بھی ظاہر ہوں تو انھیں قتل کردو۔ |

معلوم ہوا کہ جنات اپنی شکل تبدیل کر کے انسان کے سامنے آسکتے ہیں، نیز یہ کہ جب وہ کسی دوسرے قالب میں ظاہر ہوتے ہیں، تو پھر وہ اسی قالب کے احکام قبول کرنے پر مجبور ہوتے ہیں، انھیں گرفتار بھی کیا جاسکتا ہے، وغیرہ۔

خطابی اور دوسرے شارحین نے اس روایت سے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ جنات کو ان کی اصلی صورت میں بھی دیکھا جاسکتا ہے، کیوں کہ حضور ﷺ نے اس جن کو دیکھا اور گرفتار کیا، رہی قرآن کریم کی وہ آیت جس میں جنات کو اصلی صورت میں دیکھنے کی نفی کی گئی ہے، یعنی: "اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ" (سورۃ الاعراف آیت:۲۷) بے شک شیطان اور اس کی جماعت (جنات) تم کو اس طرح دیکھتے ہیں کہ تم انھیں نہیں دیکھتے۔

تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ عمومی حالات میں وہ نظر نہ آنے والی مخلوق ہے، لیکن اس میں یہ نہیں فرمایا گیا ہے کہ انسان جنات کو اصلی صورت میں دیکھنے پر قادر نہیں ہے۔

**ترجمۃ الباب کا ثبوت** روایت میں جن کی گرفتاری کا تذکرہ آیا تو چند باتیں ذکر میں آگئیں، ورنہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ امام بخاری نے مسجد میں مقروض یا غیر مسلم کو قید کرنے کا جواز بیان کیا ہے کہ اس میں مسجد کے احترام کی خلاف ورزی نہیں ہے، اور اس عنوان کے تحت جو روایت ذکر فرمائی ہے اس میں جن کی گرفتاری اور اس کو باندھنے کے ارادے کا ذکر ہے، پیغمبر علیہ السلام کا ارادہ بھی چونکہ اسی فعل سے متعلق ہوسکتا ہے، جو فی نفسہ جائز اور مباح ہو، اس لیے روایت سے اسیر کو مسجد میں قید کرنے کے جواز پر تو استدلال کیا جاسکتا ہے، لیکن مقروض کا اس میں ذکر ہی نہیں ہے، اس کے لیے شارحین نے قیاس کا سہارا لیا ہے، علامہ عینی فرماتے ہیں کہ مقروض کا روایت میں ذکر تو نہیں ہے؛ لیکن مقروض

بھی قرض خواہ کے حق میں اسیر ہی کی طرح ہوتا ہے، اس لیے اس کو بھی روایت سے ثابت ہی سمجھنا چاہئے۔ واللہ اعلم

## [۷۶] بَابُ الْاِغْتِسَالِ اِذَا اَسْلَمَ وَرَبْطِ الْاَسِيْرِ اَيضاً فِي الْمَسْجِدِ

وَكَانَ شُرَيْحٌ يَأمُرُ الْغَرِيْمَ اَنْ يُحْبَسَ اِلٰى سَارِيَةِ الْمَسْجِدِ

(۴۶۲) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ ابْنُ يُوْسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ قَالَ حَدَّثَنِيْ سَعِيْدُبْنُ أبي سعيدٍ اَنَّهُ سَمِعَ اَبَا هُرَيْرَةَ قَالَ بَعَثَ النَّبِيُّ عَلَيْهِ خَيْلًا قِبَلَ نَجْدٍ فَجَاءَتْ بِرَجُلٍ مِّنْ بَنِيْ حَنِيْفَةَ يُقَالُ لَهُ ثُمَامَةُ بْنُ اُثَالٍ فَرَبَطُوْهُ بِسَارِيَةٍ مِّنْ سَوَارِي الْمَسْجِدِ فَخَرَجَ اِلَيْهِ النَّبِيُّ عَلَيْهِ فَقَالَ اَطْلِقُوْا ثُمَامَةَ فَانْطَلَقَ اِلٰى نَخْلٍ قَرِيْبٍ مِنَ الْمَسْجِدِ فَاغْتَسَلَ ثُمَّ دَخَلَ الْمَسْجِدَ فَقَالَ اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَاَنَّ مُحَمَّداً رَّسُوْلُ اللهِ. (آئندہ: ۴۶۹، ۲۴۲۲، ۲۴۲۳، ۴۳۷۲)

**ترجمہ** باب، جب کافر اسلام قبول کرے تو اس کے غسل کرنے کا بیان، نیز قیدی کو مسجد میں مقید کرنے کا بیان۔ قاضی شریح قرض دار کے بارے میں حکم دیتے تھے کہ اس کو مسجد کے ستون سے باندھ دیا جائے۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور علیہ نے ایک گھوڑا سوار دستہ نجد کی طرف روانہ کیا، وہ بنی حنیفہ کے ایک شخص کو گرفتار کر کے لائے جنھیں ثمامہ بن اثال کہا جاتا تھا اور انھیں مسجد کے ایک ستون سے باندھ دیا، پھر رسول اللہ علیہ تشریف لائے اور فرمایا کہ ثمامہ کو چھوڑ دو، پھر وہ مسجد کے قریب کھجور کے ایک باغ میں گئے، وہاں غسل کیا، پھر مسجد میں آئے اور یہ کہا کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور یہ کہ محمد علیہ اللہ کے رسول ہیں۔

**مقصد ترجمہ** اس ترجمہ کے دو جز ہیں، ایک اسلام لانے کے وقت غسل کرنا اور دوسرے مسجد میں اسیر کو قید کرنا، اور ترجمہ لایا گیا ہے ابواب مسجد کے درمیان، اس لیے اشکال یہ ہو رہا ہے کہ ترجمہ کا پہلا جزء یعنی غسل کا ابوابِ مساجد سے کوئی ربط نہیں ہے اور ترجمہ کا دوسرا جز یعنی اس کو مسجد میں قید کرنا یہ جزء مکرر ہے، جو امام بخاری کی عادت کے خلاف ہے، پہلے جز کے بے ربط اور دوسرے جز کے مکرر ہونے کے سبب بعض شارحین نے تو یہ راہ اختیار کی کہ اصل میں امام بخاری نے یہاں ترجمہ رکھا ہی نہیں تھا، باب کے بعد بیاض چھوڑ دیا تھا اور اسی لئے بخاری کے متعدد نسخوں میں ترجمہ کے الفاظ منقول نہیں ہیں۔ ان حضرات کا خیال ہے کہ مصنف کے چھوڑے ہوئے بیاض کو بعد کے لوگوں نے اپنی رائے سے پر کر دیا ہے، لیکن ہم یہ سمجھ رہے ہیں کہ امام بخاری نے باب سابق میں ''ربط الاسیر'' کا ترجمہ رکھا تھا اور اس کے ذیل میں جو روایت دی گئی تھی اس میں ربط اسیر کا عمل مذکور نہیں تھا، بلکہ پیغمبر علیہ السلام نے اس کا صرف ارادہ فرمایا تھا، آپ کے ارادہ سے گو مضمون ثابت تھا کہ پیغمبر علیہ السلام کسی جائز امر ہی کا ارادہ فرما سکتے ہیں، لیکن امام بخاری کے پاس اس سلسلہ میں پیغمبر علیہ السلام کے صریح عمل پر مشتمل بھی ایک روایت تھی جو ربط اسیر کے مضمون کو ثابت کرنے کے لیے

نص صریح کا درجہ رکھتی ہے، امام بخاری نے جب اس روایت کو ذکر کرنا چاہا تو انھیں خیال گذرا کہ اس سے ایک اور نیا مسئلہ بھی نکل رہا ہے کہ غیر مسلم اگر اسلام قبول کرے تو اس کو غسل بھی کرنا چاہئے، چنانچہ انھوں نے ترجمہ سابق کے لیے نص کا درجہ رکھنے والی روایت ذکر کی، تو اس پر جدید ترجمہ "الاغتسال اذا اسلم" منعقد فرمادیا، اس کے ساتھ ترجمہ سابق ''وربط الاسیر ایضاً'' کا اضافہ کر کے ابواب مساجد سے ربط بھی قائم فرمادیا، گویا مسئلہ تو مسجد میں اسیر کو قید کرنے ہی کا چل رہا ہے لیکن اس روایت سے اس نئے مضمون کا ثبوت بھی ملحوظ رہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ امام بخاریؒ کے اس انداز کے ابواب کو "باب فی الباب" کے قبیل سے قرار دیتے ہیں یعنی یہ باب اوپر والے باب ہی کا شاخسانہ ہے، اسی باب سے ایک اور شاخ پھوٹ نکلی ہے۔ حضرۃ الاستاذ علامہ کشمیریؒ اس طرز کے ابواب کو انجاز کی تعبیر سے یاد فرماتے تھے ''انجاز'' کے معنی ہیں نقد ادا کرنا، ناجز کہتے ہیں نقد کو، گویا مسئلہ تو وہی چل رہا ہے، لیکن مزید ایک فائدہ سامنے آیا تو ارادہ ہوا کہ اس کو کیوں مؤخر کیا جائے، اس کو بھی نقد یہیں ادا کر دیا جائے۔

حضرت گنگوہیؒ یہ فرماتے ہیں کہ اس طرح کے ابواب بمنزلہ تنبیہ کے ہوتے ہیں کہ آنے والی روایت سے در اصل مسئلہ تو وہی ثابت ہوتا ہے جو باب سابق میں مذکور تھا، لیکن یہ تنبیہ پیش نظر ہوتی ہے کہ مذکورہ روایت ترجمہ سابق کے مضمون کے علاوہ دوسرے فوائد پر بھی مشتمل ہے۔

اس تفصیل کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہے کہ "باب الاغتسال اذا اسلم" میں یہ بات متعین نہیں ہے کہ اس کا ابواب مساجد سے کوئی ربط ہی نہیں ہے، بلکہ امام بخاری کی عمیق نظر کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ وہ غالباً یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ مشرک اگرچہ نجس اور ناپاک ہے اور اسلام لاتے وقت غسل کی تاکید اسی نجاست کے سبب کی گئی ہے، لیکن اس کے باوجود اس کا مسجد میں داخل ہونا، بلکہ کسی مصلحت سے اس کو مسجد میں قیدی بنا کر تادیر روکے رکھنا جائز اور درست ہے، اس طرح مشرک کے غسل کا ابواب مساجد سے تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ واللہ اعلم

### قاضی شریح کا عمل

ترجمہ کے ایک جز یعنی مدیون کو مسجد میں قید کرنے کے ثبوت میں امام بخاریؒ نے قاضی شریح کا عمل پیش کیا ہے، کہتے ہیں کہ قاضی شریح کا یہ عمل تھا کہ وہ مدیون کو مسجد کے ستون سے بندھوا دیتے تھے، کبھی یہ سزا عدالت کی برخاستگی تک کے لیے ہوتی اور کبھی قرض کی ادائیگی تک کے لیے کہ تا برخاستگی عدالت مسجد کے ستون سے بندھوا دیا، اگر رقم ادا کر دی تو چھوڑ دیا، رقم ادا نہ کی تو جیل خانہ میں بند کرا دیا، مقصد یہی ہوتا تھا کہ مسجد میں آنے جانے والوں کی کثرت رہتی ہے، اس لیے مدیون کو بڑی شرمندگی اٹھانا پڑتی اور وہ جلد از جلد ادائیگی کی صورت نکالتا۔

قاضی شریح کے عمل سے ثابت ہوا کہ مسجد میں مدیون کو محبوس کر دینا جائز ہے، قاضی شریح فارسی النسل ہیں اور جلیل القدر تابعین میں ہیں، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں تھے، لیکن صحابیت کا شرف حاصل نہ ہو سکا، حضرت عمر فاروقؓ کے عہد

میں کوفہ کے قاضی بنائے گئے، اور تقریباً ساٹھ سال تک اس اہم منصب پر فائز رہے ۸۰ھ میں انتقال فرمایا۔

**تشریح حدیث** ترجمہ کے دونوں اجزاء یعنی اسیر کے مسجد میں محبوس کرنے اور مشرک کے قبول اسلام کے وقت غسل کے ثبوت کے لیے امام بخاری نے حضرت ثمامہ ابن اثال والی روایت پیش کی ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ محرم ۶ھ میں رسول اللہ ﷺ نے تیس صحابہ کرام پر مشتمل ایک دستہ نجد کی جانب حضرت محمد بن مسلمہ انصاری کی زیر سرکردگی روانہ کیا، اس کو ارباب سیر کی اصطلاح میں سریہ قرطاء کہتے ہیں، قرطاء بنوابوبکر بن کلاب کی ایک جماعت کا نام ہے، محمد بن مسلمہ نے دیکھا کہ کچھ لوگ مدینہ طیبہ کی طرف جارہے ہیں، انھوں نے راستہ روک کران کے سردار ثمامہ بن اثال کو گرفتار کرلیا، پھر ثمامہ مدینہ لائے گئے، اور انھیں مسجد کے ستون سے باندھ دیا گیا، رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو آپؐ نے ثمامہ سے پوچھا **"ماعندك ياثمامه"** ثمامہ کیا کہتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا: **"ان تقتل تقتل ذادم وان تنعم تنعم علي شاكر وان ترد المال نُعطِكَ منه ماشئت"** (ابن خزیمہ بحوالہ عمدۃ القاری ص: ۲۳۷/ ج: ۴) اگر آپ قتل کرتے ہیں تو واقعتاً قتل کا حق ہے، اگر احسان فرماتے ہیں، تو شکر گزار پر احسان ہوگا اور اگر مال چاہیں تو جو آپ کہیں پیش کردیا جائے۔

حضور ﷺ ان کا جواب سن کر واپس ہو گئے، دوسرے دن پھر یہی سوال و جواب ہوا، تیسرے دن بھی یہی سوال وجواب ہوا، لیکن آپ نے محسوس فرمایا کہ اب اسلام نے ان کے دل میں اپنی جگہ بنالی ہے، تو آپ نے حکم دیا کہ ثمامہ کو چھوڑ دیا جائے، چنانچہ رہا کردیئے گئے، وہ فوراً مسجد کے قریب ایک باغ میں گئے، غسل کیا اور آکر اسلام قبول فرمالیا۔

امام بخاریؒ کے ترجمہ کے دونوں اجزاء ثابت ہو گئے کہ کسی غیر مسلم کو مسجد میں قید کرنا درست ہے اور یہ احترام مسجد کے منافی نہیں ہے، نیز یہ کہ اسلام قبول کرنے سے پہلے غسل کرلینا چاہئے، رہا یہ کہ قبول اسلام کے وقت غسل کرنا واجب ہے یا سنت؟ تو امام بخاری نے اس کی وضاحت نہیں کی اور نہ ان کی یہ عادت ہے۔

**قبول اسلام کے وقت غسل کرنے کا مسئلہ** امام احمدؒ کا مسلک یہ ہے کہ کافر پر اسلام قبول کرنے کی وجہ سے غسل کرنا واجب ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ اگر کفر کے زمانہ میں موجبات غسل میں سے کوئی چیز پائی جائے تو غسل کرنا واجب ہے، ورنہ مستحب ہے، امام مالک کا مشہور مذہب بھی یہی ہے، حنفیہ کہتے ہیں کہ اگر موجبات غسل میں سے کوئی چیز پیش آئی اور اس نے غسل بھی کرلیا تو اسلام لانے کے بعد غسل کرنا ضروری نہیں اور زمانہ کفر کا غسل معتبر ہے؛ کیوں کہ حنفیہ کے یہاں وضو اور غسل میں نیت ضروری نہیں البتہ موجبات غسل میں سے کوئی چیز پائی جائے اور اس نے غسل نہ کیا ہو تو اسلام لانے کے بعد غسل کرنا واجب ہوگا۔

امام بخاری نے اس سلسلہ میں اپنا رجحان تو ظاہر نہیں کیا، لیکن روایت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت ثمامہ نے پہلے غسل کیا اور اس کے بعد کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہوئے اس سے حنفیہ کے مسلک کی تائید ہوتی ہے کہ زمانۂ کفر میں کیا ہوا غسل معتبر ہے۔ واللہ اعلم

## [۷۷] بَابُ الْخَيْمَةِ فِيْ الْمَسْجِدِ لِلْمَرْضٰى وَغَيْرِهِمْ

(۴۶۳) حَدَّثَنَا زَكَرِيَّا بْنُ يَحْيىٰ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ نُمَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اُصِيْبَ سَعْدٌ يَوْمَ الْخَنْدَقِ فِيْ الْاَكْحَلِ فَضَرَبَ النَّبِيُّ ﷺ خَيْمَةً فِيْ الْمَسْجِدِ لِيَعُوْدَهُ مِنْ قَرِيْبٍ فَلَمْ يَرُعْهُمْ وَفِيْ الْمَسْجِدِ خَيْمَةٌ مِنْ بَنِيْ غِفَارٍ اِلَّا الدَّمُ يَسِيْلُ اِلَيْهِمْ فَقَالُوْا يَا اَهْلَ الْخَيْمَةِ مَا هٰذَا الَّذِيْ يَاْتِيْنَا مِنْ قِبَلِكُمْ فَاِذَا سَعْدٌ يَغْذُو جُرْحُهُ دَمًا فَمَاتَ مِنْهَا. (آئندہ: ۲۸۱۳، ۳۹۰۱، ۴۱۱۷، ۴۱۲۲)

**ترجمہ** باب، مسجد میں بیماروں اور دوسرے لوگوں کے لیے خیمہ لگانے کا بیان۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ خندق کے دن، حضرت سعد بن معاذ کی ہاتھ کی رگ (رگ ہفت اندام) میں تیر لگ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے مسجد میں خیمہ لگوا دیا تا کہ وہ نزدیک سے ان کی عیادت کرتے رہیں۔ مسجد میں قبیلہ بنوغفار کے لوگوں کا بھی ایک خیمہ لگا ہوا تھا، پھر وہ لوگ اس وقت گھبرا گئے جب خون بہہ کر ان کے خیمہ میں آنے لگا، انھوں نے کہا کہ اہل خیمہ! یہ کیا چیز ہے، جو تمہاری جانب سے ہمارے خیمہ میں بہہ کر آرہی ہے، دیکھا تو حضرت سعد کے زخم سے خون تیزی سے بہہ رہا ہے، پھر حضرت سعد کا اسی کے سبب انتقال ہو گیا۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ مسجد کے خالی حصہ میں بیماروں کے لیے یا کسی دوسری مصلحت سے مسافروں وغیرہ کے لیے خیمہ لگانا جائز ہے، گویا ترجمۃ الباب کے دو جز ہیں، ایک بیماروں کے لیے خیمہ، دوسرے دیگر ضروریات کے لیے خیمہ، روایت میں آیا کہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی رگ ہفت اندام میں زخم آ گیا تھا، یہ ایک رگ ہے، جو جسم کے ہر حصہ میں موجود ہے، عربی زبان میں ہر حصۂ جسم کی رگ کا الگ نام ہے، ہاتھ کی رگ کا نام اکحل ہے، پیر کے حصہ میں پائی جانے والی اس رگ کا نام نسا ہے، اردو میں اس کو رگ ہفت اندام کہتے ہیں، غزوۂ خندق کے موقع پر حضرت سعد کی اس رگ میں زخم آ گیا تھا، آپ نے ان کی دیکھ بھال اور عیادت کی آسانی کے لیے ان کا خیمہ مسجد میں لگوا دیا، اس وقت مسجد میں ایک دوسرا خیمہ بھی لگا ہوا تھا، جس میں بنوغفار کی رفیدہ نام کی ایک صحابیہ اپنے متعلقین کے ساتھ مقیم تھیں، اس سے امام بخاری کے ترجمہ کے دونوں جز ثابت ہو گئے کہ بیماروں کے لیے خیمہ لگانے کا جواز حضرت سعدؓ کے خیمہ سے معلوم ہوا اور دیگر ضروریات کے لیے خیمہ کی گنجائش رفیدہؓ کے خیمہ سے نکل آئی۔

**خیمہ کس مسجد میں لگایا گیا تھا؟** امام بخاریؒ نے روایت کے الفاظ سے توسع کے طور پر اپنا ترجمۃ الباب ثابت کر دیا، روایت کے الفاظ سے بظاہر یہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ خیمے مسجد نبوی میں لگائے گئے تھے، امام بخاری اور شارحین بخاری نے بھی یہاں یہ بات واضح نہیں کی کہ یہ کونسی مسجد کا واقعہ ہے، لیکن ارباب

سیر کی نشاندہی یہ ہے کہ یہ مسجد نبوی کا واقعہ نہیں ہے، اس کے علاوہ کوئی اور مسجد ہے، حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ کا رجحان یہ ہے کہ رسول پاک ﷺ کی عادت تھی کہ غزوات کے دوران کسی جگہ قیام فرماتے تو میدان کو صاف ستھرا کر کے نماز کے لیے جگہ مقرر فرما دیتے تھے، اہل سیر اس کو بھی مسجد ہی کے لفظ سے یاد کرتے ہیں، اس لیے کیا بعید ہے کہ یہاں مسجد سے مراد وہ جگہ ہو، جو بنوقریظہ کے محاصرے کے دوران آپ نے نماز کے لیے متعین فرمائی تھی، پھر بعد میں ولید بن عبدالملک کے زمانہ میں اس جگہ ایک مسجد، مسجد بنوقریظہ کے نام سے تعمیر کی گئی، لیکن جس وقت حضرت سعد اور رفیدہ اسلمیہ کے خیمے وہاں لگائے گئے ہیں اس وقت وہ میدان میں نماز کے لیے مقرر کردہ جگہ ہے، جس کو اصطلاحی مسجد قرار دینا محل نظر ہے۔ مسجد نبوی نہ ہونے کا واضح قرینہ خود اسی روایت میں موجود ہے کہ مسجد میں حضرت سعد کا خیمہ لگانے کی وجہ یہ بیان کی جارہی ہے کہ آپ نے ان کو قریب رکھنے کی وجہ سے ان کا خیمہ مسجد میں لگوایا اور ظاہر ہے کہ محاصرہ کے دوران جو تقریباً پچیس دن تک جاری رہا رسول اللہ ﷺ کا قیام، بنوقریظہ کے محلّہ میں ہے جو مسجد نبوی سے کم از کم پانچ چھ میل کے فاصلہ پر ہے، اس لیے حضرت سعد کے لیے لگایا گیا خیمہ مسجد نبوی میں مانا جائے تو وہ رسول اللہ ﷺ سے کئی میل دور ہو جاتے ہیں اور عیادت نیز دیکھ بھال کی جس سہولت کے لیے آپ نے انھیں قریب رکھنا چاہا تھا، وہ سہولت حاصل نہیں ہوئی۔ اس لیے ظاہر یہی ہے کہ یہ خیمے مسجد نبوی میں نہیں لگائے گئے تھے، لیکن امام بخاری اس کو مسجد نبوی کا واقعہ خیال کر رہے ہیں، ان کے پیش نظر غالباً یہ بات ہے کہ محاصرے سے پہلے آپ غزوۂ خندق کی مہم میں مشغول تھے، جس دن صبح کے وقت غزوۂ خندق سے فراغت ہوئی اسی دن ظہر کے وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے پروردگار کی طرف سے بنوقریظہ کی طرف روانگی کا حکم دیا، غزوۂ خندق کے دوران چونکہ قیام مدینہ طیبہ میں رہا اور حضرت سعد کے زخم اسی غزوۂ خندق میں آیا تھا، اس لیے ہوسکتا ہے کہ حضرت سعد کے لیے خیمہ مسجد نبوی میں لگایا گیا ہو، چنانچہ بخاری شریف کی روایت میں یہ بات بھی مذکور ہے کہ جب یہود بنوقریظہ نے حضرت سعد بن معاذ کو حکم بنانا منظور کرلیا تو آپ نے حضرت سعد کو بلانے کے لیے بھیجا، پھر حضرت سعد حمار پر سوار ہو کر تشریف لائے، جب ان کی سواری مسجد کے قریب آئی تو آپ نے انصار سے کہا "قوموا الی سیدکم" اس روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ زخمی ہونے کے بعد حضرت سعد کا قیام بنوقریظہ کے محلّہ میں نہیں تھا، ان کو دور سے سواری پر آنا پڑا اور جب وہ بنوقریظہ کے محلّہ کی یعنی میدان محاصرہ کی مسجد کے قریب آئے تو آپ نے صحابہ کرام سے ان کے استقبال کے لیے کہا، یہ سب قرائن اس کے ہیں کہ حضرت سعد کا خیمہ مسجد نبوی میں تھا۔　　واللہ اعلم

**تشریح حدیث** غزوۂ خندق جسے "احزاب" بھی کہتے ہیں شوال ۵ھ میں ہوا، اس میں مسلمانوں کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا جس کی تفصیل کتاب المغازی میں آئے گی، اس غزوہ میں حضرت سعدؓ بن معاذ کے ہاتھ کی رگ میں زخم آ گیا، جس سے خون بند نہ ہوتا تھا، اس وقت حضرت سعدؓ بن معاذ نے بارگاہ خداوندی میں دعاء کی:

اللّٰھم انك تعلم انه ليس احد احب الی ان اجاھدھم فيك من قوم کذبوا رسولك واخرجوه، اللّٰھم فانی اظن انك قدوضعت الحرب بيننا وبينهم ،فان کان قد بقی من حرب قريش شیٔ فابقنی لهم،حتی اجاھدھم فيك. وان کنت وضعت الحرب فافجرھا واجعل موتتی فيها. (بخاری شریف جلد:۲/ص:۵۹۱)

اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میرے لیے اس قوم سے جہاد کرنا سب سے زیادہ محبوب ہے جس نے تیرے رسول کو جھٹلایا اور انھیں وطن سے نکالدیا، اے اللہ! میں یہ گمان کرتا ہوں کہ اب تو نے ہمارے اور ان مشرکین کے درمیان جنگ کو ختم کردیا ہے، پس اگر قریش کی جنگ میں سے کوئی حصہ باقی ہو تو مجھے زندہ رکھ تاکہ میں ان سے تیرے لئے جہاد کروں اور اگر جنگ ختم ہوگئی تو میرے زخم کا منھ کھولدے اور اسی کے سبب سے میری موت (شہادت کا ثواب والی) مقدر فرمادے۔

اللہ تعالیٰ نے دعاء قبول فرمائی کہ وہ غزوۂ بنوقریظہ میں فیصلہ کے وقت تک حیات رہے، غزوۂ بنوقریظہ غزوۂ خندق کا تتمہ تھا، کیوں کہ غزوۂ خندق میں کفار مکہ اور ان کے ساتھ دیگر قبائل کی دس ہزار کی جمعیت نے مدینہ طیبہ پر حملہ کیا تھا، اور مسلمانوں نے خندق کھود کر اپنی حفاظت کا انتظام کیا تھا، مسلمانوں کی پریشانی کا قرآن کریم میں ان الفاظ میں ذکر کیا گیا ہے:

اِذْ جَاءُوْکُمْ مِنْ فَوْقِکُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْکُمْ وَاِذْزَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا، هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُوْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْازِلْزَالًا شَدِيْدًا.

(سورۃ الاحزاب آیت:۱۱)

جب دشمن شہر کے اوپر اور نیچے کی جانب سے آگئے اور جب آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منھ کو آنے لگے اور تم لوگ اللہ کے ساتھ طرح طرح کے گمان کرنے لگے، اس موقع پر مسلمانوں کی سخت آزمائش کی گئی اور ان کو بہت طاقت کے ساتھ جھنجھوڑا گیا۔

بالآخر ایک ماہ کے شدید محاصرہ کے بعد نصرت خداوندی نے دشمنوں کو ناکام واپس کردیا، یہود بنوقریظہ نے چونکہ غزوۂ خندق کے موقع پر مسلمانوں سے عہد شکنی کی تھی؛ اس لیے خندق سے فراغت کے بعد ان کا محاصرہ کیا گیا۔ یہود نے تنگ آکر حضرت سعد بن معاذ کو حکم بنایا، حضرت سعدؓ نے تورات کے حکم کے مطابق فیصلہ دیا کہ لڑنے والے یعنی مردوں کو قتل کردیا جائے، عورتوں اور بچوں کو گرفتار کرلیا جائے اور اموال غانمین کے درمیان تقسیم کردیئے جائیں۔

حضرت سعد بن معاذ کے اس فیصلے کے بعد، ان کی دعاء کی قبولیت کا وقت آگیا، کیونکہ خندق اور قریظہ کے بعد کفار مکہ کے دم ختم ہوگئے تھے اور وہ مسلمانوں سے معرکہ آرائی کے قابل نہیں رہ گئے تھے؛ چنانچہ حضرت سعد بن معاذ کو اکحل

یا وہ زخم کھل گیا جو وقتی طور پر بند ہو گیا تھا اور اسی زخم کے سبب حضرت سعد بن معاذ کو شہادت کی وفات کا شرف میسر آیا۔
روایت میں ہے کہ ان کی وفات پر عرش الٰہی ہل گیا، یا جھوم اٹھا، آسمانوں کے تمام دروازے ان کے لیے کھول دیے گئے، ستر ہزار فرشتوں نے ان کے جنازہ میں شرکت کی وغیرہ، اس سلسلہ کی تفصیلات اپنے اپنے مواقع پر آئیں گی۔
امام بخاریؒ کا مقصد اس روایت سے یہاں صرف یہ ہے کہ حضرت سعد بن معاذؓ کے لیے مسجد میں خیمہ لگایا گیا تھا، اس لیے ثابت ہوا کہ مریض کی ضرورت کے لیے مسجد کے خالی حصہ میں خیمہ لگانا جائز ہے۔

## [۷۸] بَابُ اِدْخَالِ الْبَعِيْرِ فِي الْمَسْجِدِ لِلْعِلَّةِ

وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ طَافَ النَّبِيُّ ﷺ عَلٰى بَعِيْرِهٖ

(۴۶۴) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَنَا مَالِكٌ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ نَوْفَلٍ عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ زَيْنَبَ بِنْتِ اَبِيْ سَلَمَةَ عَنْ اُمِّ سَلَمَةَ قَالَتْ شَكَوْتُ اِلٰى رَسُوْلِ اللهِ ﷺ اَنِّيْ اَشْتَكِيْ قَالَ طُوْفِيْ مِنْ وَرَآءِ النَّاسِ وَاَنْتِ رَاكِبَةٌ فَطُفْتُ وَرَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُصَلِّيْ اِلٰى جَنْبِ الْبَيْتِ يَقْرَأُ بِالطُّوْرِ وَكِتَابٍ مَّسْطُوْرٍ. (آئندہ: ۱۶۱۹، ۱۶۲۶، ۱۶۳۳، ۴۸۵۳)

**ترجمہ** باب، بیماری (مجبوری) کے سبب اونٹ کو مسجد میں داخل کرنے کا بیان۔ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹ پر بیٹھ کر طواف کیا۔ حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں بیمار ہوں، آپ نے فرمایا کہ سوار ہو کر اور لوگوں کے پیچھے رہ کر طواف کر لو، چنانچہ میں نے اسی طرح طواف کیا، اس وقت رسول اللہ ﷺ خانۂ کعبہ کے پہلو میں نماز ادا کر رہے تھے اور ''والطور وکتاب مسطور'' پڑھ رہے تھے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ ضرورت پڑ جائے اور مجبوری لاحق ہو تو اونٹ کو مسجد میں لے جانے کی گنجائش ہے، ترجمہ میں لفظ استعمال کیا ہے، ''للعلة'' یہاں علت کا لفظ عام ہے کہ بیماری کی صورت ہو یا کوئی اور مجبوری ہو، مثلاً سوار ہو کر پہنچا ہے اور اترنے کا موقع نہیں ہے، یا کمزوری کے سبب پیدل چلنا ممکن نہیں ہے اور مسجد میں داخل ہونا ضروری ہے، جیسے طواف کی ضرورت کے لیے مطاف میں جانا ضروری ہوتا ہے، تو ان صورتوں میں بخاری کہتے ہیں کہ سوار مع سواری کے مسجد میں جا سکتا ہے۔

**تشریحات** تشریح اس مقصد کے ثبوت میں بخاری نے پہلے ابن عباسؓ کا ایک ارشاد پیش کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اونٹ پر سوار ہو کر بیت اللہ کا طواف کیا، اس ارشاد کو امام بخاری نے کتاب الحج میں بسند متصل ذکر کیا ہے:

| عن ابن عباس قال طاف النبی ﷺ فی | ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے |
|---|---|

حجة الوداع علی بعیرہ (بخاری ص:۲۱۸/ج:۱) حجۃ الوداع میں اپنے اونٹ پر سوار ہوکر طواف کیا۔

معلوم ہوا کہ حجۃ الوداع میں فتح مکہ کے موقع پر آپ ﷺ نے اونٹ پر سوار ہوکر طواف کیا ہے، ابوداؤد کی روایت میں یہ مزید وضاحت ہے کہ: '' ان النبی ﷺ قدم مکة وهو یشتکی '' کہ جب آپ مکہ معظمہ میں تشریف فرما ہوئے تو طبیعت ناساز تھی، اس سے معلوم ہوا کہ سوار ہوکر طواف کرنے کی وجہ بیماری تھی، جب کہ بعض شارحین نے سوار ہونے کی دوسری توجیہات کی ہیں کہ سوار ہونے میں مصلحت تحفظ تھا کہ مشرکین میں سے کوئی نقصان نہ پہنچا سکے، یا یہ مقصد تھا کہ آپ دوسرے تمام حضرات کو نظر آتے رہیں تاکہ ضرورت مند فوراً مسئلہ وغیرہ معلوم کرنے کے لیے رجوع کرسکے وغیرہ۔

مقصد ترجمہ ثابت کرنے کے لیے امام بخاری نے دوسری روایت حضرت ام سلمہؓ کی پیش کی ہے کہ انھوں نے حجۃ الوداع میں رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں بیمار ہوں اور پیدل چل کر طواف نہیں کرسکتی تو آپؐ نے فرمایا کہ سوار ہوکر طواف کرلو، مگر سب سے پیچھے چلنا کیوں کہ آگے رہوگی، تو دوسرے حضرات کے لیے پریشانی ہوگی، درمیان میں رہو گی تو دوسروں کو بھی پریشانی کا سامنا ہوگا، اور خود تمھیں بھی دشواری ہوگی، چنانچہ حضرت ام سلمہ نے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق سوار ہوکر طواف کیا۔

امام بخاری سمجھ رہے ہیں کہ ان دونوں روایتوں سے ان کا مدعا ثابت ہوگیا، کیوں کہ دونوں روایتوں میں بیت اللہ کا طواف سوار ہوکر کیا گیا اور خانۂ کعبہ مسجد حرام کے صحن مین ہے اس لیے طواف کرنے والا مسجد کے صحن میں داخل ہوکر خانۂ کعبہ کے چاروں طرف طواف کرتا ہے، لیکن یہ استدلال بہ ایں معنیٰ محل نظر ہے کہ عہد رسالت میں مسجد حرام کی یہ صورت نہیں تھی، بخاری میں ہے:

لم یکن علی عهد النبی ﷺ حول البیت حائط کانوا یصلون حول البیت حتی کان عمر فبنی حوله حائطاً .
(بخاری ص:۵۴۰/ ج:۱)

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں خانۂ کعبہ کے چاروں طرف کوئی دیوار نہیں تھی، مسلمان (کھلی زمین میں) بیت اللہ کے چاروں طرف نمازیں پڑھا کرتے تھے، یہاں تک کہ جب حضرت عمر کا دور آیا تو انھوں نے بیت اللہ کے چاروں طرف دیوار تعمیر کی۔

جب کہ بعض حضرات کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں خود مسجد حرام کا تو احاطہ نہیں تھا، لیکن ہر طرف مکانات اور آبادی کی بنا پر خانۂ کعبہ کے چاروں طرف مسجد حرام کی حدود متعین تھیں، پھر حضرت عمر نے تنگی محسوس کی تو توسیع فرما کر چاروں طرف دیواریں تعمیر کردیں، پھر حضرت عثمان نے مزید توسیع کی، پھر ابن زبیر نے مزید توسیع کی، موجودہ عمارت کا نقش اول خلیفہ مہدی عباسی کا قائم کردہ اور موجودہ ہیئت سلطان سلیم ثانی (المتوفی ۱۵۷۷ء) کے زمانہ

سے استوار ہے، اس کے بعد متعدد سلاطین نے جو اضافے کئے ہیں وہ عمارت میں بالکل ممتاز رکھے گئے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ عہد رسالت میں اگر مسجد حرام صرف خانہ کعبہ کا نام تھا، تو امام بخاری کا استدلال محل نظر ہے اور اگر اس کی کچھ حدود مقرر ہوگئی تھیں تو امام بخاری کا مدعا ثابت ہے، کہ مجبوری کی صورت میں سواری کو مسجد میں لے جایا جاسکتا ہے، مگر اس کے ساتھ یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ ایک تو مجبوری شدید ہو کہ اس کے علاوہ کوئی دوسری صورت ممکن نہ ہو، دوسرے یہ کہ مسجد کے آلودہ اور ناپاک ہونے کی جانب سے اطمینان کرلیا جائے، جانور پر سوار ہے تو وہ جانور ایسا سدھایا ہوا ہو کہ اس کی طرف سے مسجد کے ملوث ہونے کا اندیشہ نہ ہو، کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت ام سلمہ کی اونٹنی 'مــــدربة' یعنی باقاعدہ سدھائی ہوئی تھی۔

بعض شارحین نے اس موقع پر ماکول اللحم کے پیشاب، لید اور گوبر کی طہارت ونجاست کا مسئلہ بھی چھیڑ دیا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کا یہاں کوئی تعلق نہیں۔ واللہ اعلم

## [۷۹] بَابٌ

(۴۶۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُبْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ حَدَّثَنَا مَعَاذُ بْنُ هِشَامٍ قَالَ حَدَّثَنِیْ اَبِیْ عَنْ قَتَادَةَ قَالَ حَدَّثَنَا اَنَسٌ اَنَّ رَجُلَیْنِ مِنْ اَصْحَابِ النَّبِیِّ ﷺ خَرَجَا مِنْ عِنْدِ النَّبِیِّ ﷺ اَحَدُهُمَا عَبَّادُ بْنُ بِشْرٍ وَاَحْسِبُ الثَّانِیَ اُسَیْدَ بْنَ حُضَیْرٍ فِیْ لَیْلَةٍ مُظْلِمَةٍ وَمَعَهُمَا مِثْلُ الْمِصْبَاحَیْنِ یُضِیْئَانِ بَیْنَ اَیْدِیْهِمَا فَلَمَّا افْتَرَقَا صَارَ مَعَ كُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا وَاحِدٌ حَتّٰى اَتٰى اَهْلَهٗ۔

(آئندہ: ۳۶۳۹، ۳۸۰۵)

**ترجمہ** باب، حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ میں سے دو صحابی، ایک اندھیری رات میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے نکلے، ایک حضرت عباد بن بشر اور دوسرے کے بارے میں گمان یہ ہے کہ حضرت اسید بن حضیر تھے۔ وہ نکلے تو جیسے دو چراغ ان کے ساتھ ہوگئے جو ان کے آگے روشنی دے رہے تھے، پھر جب وہ دونوں الگ الگ ہوئے تو ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک چراغ رہا یہاں تک کہ وہ اپنے گھر پہنچ گئے۔

**مقصد ترجمہ** باب مذکور ہے، لیکن ترجمہ اور عنوان مذکور نہیں ہے، شارحین نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق مقصد کا تعین کیا ہے، حافظ ابن حجر نے فرمایا کہ بعض حضرات کا یہ فرمانا کہ جب امام بخاری باب بلاترجمہ ذکر کریں تو اس کو "کالفصل من الباب السابق" یعنی باب سابق کا تتمہ سمجھنا چاہئے، یہ ایک اچھی توجیہ ہے، لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب باب سابق اور باب بلاترجمہ کے درمیان کوئی مناسبت ہو، یہاں بظاہر باب سابق سے کوئی مناسبت نہیں ہے، البتہ ابواب مساجد سے اس باب کو اس طرح مربوط کیا جاسکتا ہے کہ دونوں صحابۂ کرام کو اندھیری

رات میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عشاء کی نماز کے انتظار میں مسجد نبوی میں دیر ہوئی تھی، اس لیے ابواب مساجد کے مطابق ترجمۂ جدید یہ ہوسکتا ہے: "باب المشی الی المسجد فی اللیلة المظلمة" یعنی اندھیری رات میں مسجد جانے کا بیان۔

**علامہ عینیؒ کی رائے** علامہ عینی کہتے ہیں کہ یہ توجیہ درست نہیں ہے کیوں کہ حدیث باب اس مضمون پر بالکل دلالت نہیں کرتی، حدیث باب میں یہ ہے کہ یہ دونوں حضرات اندھیری رات میں رسول اللہ ﷺ کے پاس سے واپس ہوئے ہیں، اس میں مسجد جانے کا سرے سے تذکرہ نہیں ہے، پھر عینی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک زیادہ اچھی بات یہ ہے کہ چونکہ یہ دونوں حضرات مسجد نبوی میں رسول اکرم ﷺ کی معیت میں تھے، اس لیے ابواب مساجد سے ربط قائم ہوگیا اور اس حیثیت سے روایت باب کا یہاں ذکر کردینا مناسب ٹھہرا۔

**حضرت شاہ ولی اللہؒ کا ارشاد** حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے ابواب مساجد سے ایک اور ربط قائم کیا ہے فرماتے ہیں کہ یہ دونوں صحابہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دیر تک مسجد میں رہے گویا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مسجد میں گفتگو کرتے رہے، اس لیے حدیث باب سے یہ نیا مضمون مستنبط ہوتا ہے کہ مسجد میں بات چیت اور گفتگو کرنے کی اجازت ہے۔

**حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد گرامی** حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ یہ باب "کالفصل من الباب السابق" نہیں ہے، بلکہ امام بخاری نے اپنی عادت کے مطابق ترجمہ حذف کیا ہے اور باب کا لفظ لکھ کر حدیث پیش کردی ہے، تاکہ پڑھنے اور سمجھنے والے اپنے ذہن کو کام میں لائیں اور کوئی مناسب ترجمہ نکالیں، یہاں کہا جاسکتا ہے کہ ابوداؤد وغیرہ میں روایت ہے:

عن بریرة عن النبی ﷺ قال بشر المشائین فی الظلم الی المساجد بالنور التام یوم القیامة۔ (ابوداؤد ص:۸۳/ ج:۱)

حضرت بریدة سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تاریکیوں میں مسجد کی طرف جانے کا اہتمام کرنے والوں کو قیامت کے دن نور تام کی بشارت سنادو۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریکی کے باوجود مسجد میں حاضر ہونا بڑی فضیلت کی چیز ہے، ایسے لوگوں کو قیامت میں پل صراط وغیرہ پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے مکمل روشنی عطا کی جائے گی تاکہ وہ اطمینان سے اپنی راہ طے کرسکیں، اس روایت سے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ فضیلت خاص ان لوگوں کے لیے ہے، جو تاریکی میں جانے کے عادی ہوں، روشنی، یا شمع لے کر جانے سے یہ فضیلت ختم ہوجائے گی اور جس اجر وثواب کا تاریکی میں جانے پر وعدہ کیا گیا تھا، اس سے محرومی ہوجائے گی، امام بخاری اس باب میں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اس روایت کے یہ معنی نہیں ہیں جو بظاہر سمجھ میں آتے ہیں، اگر اجر وثواب کا ترتب محض تاریکی میں جانے آنے پر ہوتا تو پیغمبر علیہ السلام ان دونوں صحابہ کے لیے لوٹتے

وقت روشنی کا معجزہ ظاہر نہ فرماتے کیوں کہ اس سے ان کے اجر وثواب میں کمی ہو جاتی، بلکہ امام بخاری کی وضاحت کے مطابق اس روایت کے معنی یہ ہیں کہ جو لوگ ظلمت لیل کو ترک جماعۃ کا عذر نہ بنائیں اور تاریکی میں دی گئی رخصت سے استفادہ نہ کریں، بلکہ ہر حال میں مسجد میں حاضری کو اہمیت دیں، خواہ تاریکی میں، راستہ کے خطرات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے چل کھڑے ہوں یا روشنی کا انتظام کرلیں، ہر صورت میں اللہ تعالی نماز باجماعت کا ایسا اہتمام کرنے والوں کو قیامت کے دن نور تام سے نوازے گا۔ اس لیے امام بخاری کے ذوق کے مطابق اس روایت پر جدید ترجمہ یہ لگایا جاسکتا ہے: "باب الذهاب الى المساجد بالمصباح فى الليالى المظلمة"

حقیقت یہ ہے کہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ کا ارشاد آب زر سے لکھنے کے قابل ہے، شارحین کی طویل بحثیں دیکھو تو اس کی قدر معلوم ہو، بس زیادہ سے زیادہ اشکال یہ ہوسکتا ہے کہ آپ تو مسجد میں جاتے وقت روشنی ساتھ رکھنے کا حکم مستنبط کررہے ہیں اور روایت میں مسجد سے واپسی میں روشنی کا انتظام ہوا ہے، لیکن یہ سرسری اشکال ہے کیونکہ مسجد میں جانا اور لوٹنا دونوں کا ایک ہی حکم ہے، جیسا کہ مجاہد فی سبیل اللہ کا جہاد کے لیے جانا اور واپس آنا دونوں ہی میں اجر ہے، بلکہ طلب علم جسے جہاد فی سبیل اللہ کی طرح قرار دیا گیا ہے، اس کا بھی یہی حکم ہے، ترمذی شریف میں ہے: "من خرج فى طلب العلم فهو فى سبيل الله حتى يرجع" (بحوالہ مشکوۃ ص ۳۴/ ج ۱) جو علم طلب کرنے کے لیے سفر کرے تو وہ مجاہد فی سبیل اللہ کی طرح ہے، یہاں تک کہ واپس آجائے۔

مسلم اور ابوداؤد شریف وغیرہ میں حضرت ابی ابن کعبؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک صحابی کو جو بہت پابند جماعت تھے، اور ان کا گھر بھی بڑی دوری پر واقع تھا یہ مشورہ دیا کہ آپ مسجد آنے جانے کے لیے سواری خرید لیں، انھوں نے جواب دیا: "ما احب ان منزلى بحنب المسجد" میں مسجد کے برابر میں اپنا گھر بنانا پسند نہیں کرتا، ان الفاظ میں چونکہ ابہام تھا اور ان کا ایک مفہوم ان کے شایان شان نہ تھا، اس لیے رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ نے ان سے معلوم فرمایا کہ مسجد کے قریب رہنے کو ناپسند کرنے کا کیا مطلب ہے؟ تو انھوں نے عرض کیا:

" اردت يا رسول الله ! ان يكتب لى اقبالى الى المسجد ورجوعى الى اهلى اذا رجعت، فقال اعطاك الله ذلك كله" (ابوداؤد شریف ص: ۸۲/ ج: ۱)

میری نیت یا رسول اللہ! یہ تھی کہ میرا مسجد میں آنا بھی میرے نامۂ اعمال میں کار ثواب بن کر لکھا جائے اور میرا اپنے اہل وعیال میں لوٹنا بھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی نے آپ کو یہ سب چیزیں عطا کیں۔

معلوم ہوا کہ جس طرح مسجد میں نماز کے لیے جانا کار ثواب ہے اسی طرح نماز پڑھ کر لوٹنا بھی کار ثواب ہے۔ اور جن روایات میں ہر ہر قدم پر گناہوں کی معافی اور درجات کا وعدہ کیا گیا ہے، اس میں جانے کے قدم بھی شمار کیے جاتے ہیں اور واپسی کے قدم بھی۔

**تشریح حدیث** حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ عباد بن بشر اور اسید بن حضیر رضی اللہ عنہما مسجد نبوی میں رسول اللہ ﷺ سے ایک تاریک رات میں دیر تک گفتگو کرتے رہے، جب واپس ہونے لگے تو اللہ نے روشنی کا یہ انتظام فرمایا کہ ان میں سے ایک کا عصاء روشنی دینے لگا، دونوں اطمینان کے ساتھ راستہ طے کرتے رہے، چلتے چلتے جب ایسے موڑ پر پہنچے جہاں سے دونوں کا راستہ الگ الگ ہو رہا تھا، تو دوسرے کا عصا بھی چراغ کی طرح منور ہو گیا اور دونوں اپنے اپنے گھر پہنچنے تک اس روشنی سے مستفید ہوتے رہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کے متعین کردہ مقصد ترجمہ کے مطابق تشریح اس طرح کی جائے گی کہ جماعت میں شرکت ایک امر محبوب ہے، جو لوگ تاریکیوں سے بے پرواہ ہو کر جماعت کا اہتمام کریں گے تو قیامت میں یہ تاریکی نور تمام سے بدل جائے گی، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ روشنی موجود ہو تب بھی اس کو ساتھ نہ لیں اور اندھیرے ہی میں خطرات کو انگیز کرتے ہوئے راستہ طے کریں، بلکہ روشنی ساتھ رکھنا دنیا کی تاریکی کو آخرت میں نور تمام سے بدلنے میں مانع نہیں ہے۔ واللہ اعلم

روایت باب سے اولیاء کرام کی کرامت کے ثبوت پر بھی استدلال کیا گیا ہے، شرح عقائد میں بھی لکھا ہوا ہے کہ "کرامات الاولیاء حق" کہ اولیاء کی کرامت کا ثبوت ہے، تاریک راستوں ہی کو منور کرنے کے سلسلے میں اولیاء امت کی کتنی ہی کرامتیں منقول ہیں۔

## [۸۰] بَابُ الْخَوْخَةِ وَالْمَمَرِّ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۶۶) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سِنَانٍ قَالَ نَا فُلَيْحٌ قَالَ نَا اَبُو النَّضْرِ عَنْ عُبَيْدِ بْنِ حُنَيْنٍ وَعَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِيْدٍ عَنْ اَبِيْ سَعِيْدِ الْخُدْرِيِّ قَالَ خَطَبَ النَّبِيُّ ﷺ فَقَالَ اِنَّ اللّٰهَ سُبْحَانَهٗ خَيَّرَ عَبْدًا بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ مَاعِنْدَهٗ فَاخْتَارَ مَاعِنْدَ اللّٰهِ فَبَكٰى اَبُوْبَكْرٍ فَقُلْتُ فِيْ نَفْسِيْ مَايُبْكِيْ هٰذَا الشَّيْخَ اِنْ يَّكُنِ اللّٰهُ خَيَّرَ عَبْدًا بَيْنَ الدُّنْيَا وَبَيْنَ مَا عِنْدَهٗ فَاخْتَارَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ فَكَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ هُوَ الْعَبْدَ وَكَانَ اَبُوْ بَكْرٍ اَعْلَمَنَا فَقَالَ يَا اَبَا بَكْرٍ لَا تَبْكِ اِنَّ اَمَنَّ النَّاسِ عَلَيَّ فِيْ صُحْبَتِهٖ وَمَالِهٖ اَبُوْبَكْرٍ وَلَوْكُنْتُ مُتَّخِذًا مِنْ اُمَّتِيْ خَلِيْلًا لَاتَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ وَلٰكِنْ اُخُوَّةُ الْاِسْلَامِ وَمَوَدَّتُهٗ لَا يُبْقَيَنَّ فِي الْمَسْجِدِ بَابٌ اِلَّا سُدَّ اِلَّا بَابَ اَبِيْ بَكْرٍ. (آئندہ: ۳۶۵۴، ۳۹۰۴)

(۴۶۷) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ مُحَمَّدٍ الْجُعْفِيُّ قَالَ نَا وَهْبُ ابْنُ جَرِيْرٍ قَالَ نَا اَبِيْ قَالَ سَمِعْتُ يَعْلَى بْنَ حَكِيْمٍ عَنْ عِكْرِمَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ خَرَجَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ فِيْ مَرَضِهِ الَّذِيْ مَاتَ فِيْهِ عَاصِبًا رَاْسَهٗ بِخِرْقَةٍ فَقَعَدَ عَلَى الْمِنْبَرِ فَحَمِدَ اللّٰهَ وَاَثْنٰى عَلَيْهِ ثُمَّ قَالَ اِنَّهٗ

لَيْسَ مِنَ النَّاسِ اَحَدٌ اَمَنَّ عَلَيَّ فِيْ نَفْسِهٖ وَمَالِهٖ مِنْ اَبِيْ بَكْرِ بْنِ اَبِيْ قُحَافَةَ وَلَوْ كُنْتُ مُتَّخِذًا مِّنَ النَّاسِ خَلِيْلًا لَا تَّخَذْتُ اَبَا بَكْرٍ خَلِيْلًا وَلٰكِنْ خُلَّةُ الْاِسْلَامِ اَفْضَلُ سُدُّوْا عَنِّيْ كُلَّ خَوْخَةٍ فِيْ هٰذَا الْمَسْجِدِ غَيْرَ خَوْخَةِ اَبِيْ بَكْرٍ. (آئندہ:۳۶۵۶، ۳۶۵۷، ۶۷۳۸)

**ترجمہ** باب، مسجد میں کھڑکی اور گذرگاہ رکھنے کا بیان۔ حضرت ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ بے شک اللہ سبحانہ تعالی نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا ہے، خواہ وہ دنیا میں رہنے کو اختیار کر لے، خواہ ان نعمتوں کو اختیار کر لے جو اللہ کے یہاں ہیں۔ چنانچہ اس بندے نے ان چیزوں کو پسند کرلیا ہے، جو اللہ کے یہاں ہیں۔ یہ سن کر حضرت ابو بکر رونے لگے، حضرت ابو سعید خدری کہتے ہیں کہ میں نے اپنے دل ہی دل میں کہا کہ ان بزرگوار پر گریہ کیوں طاری ہے؟ اگر اللہ نے اپنے بندے کو دنیا و آخرت کے درمیان اختیار دیا اور اس بندے نے آخرت کو اختیار کرلیا (پھر بعد میں معلوم ہوا کہ) اس بندے سے مراد خود حضور ﷺ کی ذات تھی، اور حضرت ابو بکرؓ ہم میں سب سے زیادہ علم رکھنے والے تھے، پھر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اے ابو بکر! روؤ نہیں! بے شک حق رفاقت اور مال کے اعتبار سے مجھ پر سب سے زیادہ احسان کرنے والے ابو بکر ہیں اور اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا تو ابو بکر کو بناتا، لیکن اسلامی اخوت اور محبت کے اعتبار سے ابو بکر سب سے افضل ہیں، مسجد میں کوئی دروازہ ہرگز باقی نہ رہے، مگر یہ کہ بند کر دیا جائے، علاوہ حضرت ابو بکر کے دروازے کے۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اس مرض میں جس میں آپ کی وفات ہوئی ہے سر پر پٹی باندھے ہوئے (مسجد میں) تشریف لائے اور منبر پر بیٹھ گئے، پھر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کے بعد ارشاد فرمایا کہ بے شک جان و مال کے ذریعہ میرے اوپر ابو بکر سے زیادہ احسان کرنے والا کوئی نہیں ہے، اور اگر میں انسانوں میں سے کسی کو اپنا دلی دوست بناتا تو ابو بکر کو بناتا، لیکن اسلام کی دوستی سب سے افضل ہے (جو ابو بکر کو حاصل ہے) اس مسجد میں جتنی کھڑکیاں ہیں ان سب کو بند کردو، علاوہ ابو بکر کی کھڑکی کے (کہ وہ کھلی رہے گی)۔

**مقصد ترجمہ** "خوخہ" کے معنی ہیں بڑے پھاٹک میں یا دیوار میں لگائی ہوئی چھوٹی کھڑکی اور "مَمَرّ" مصدر میمی بھی ہوسکتا ہے گذرنے کے معنی میں اور اسم ظرف بھی ہوسکتا ہے بمعنی گذرگاہ، یہاں دونوں معنی مراد ہوسکتے ہیں لیکن دوسرے معنی راجح ہیں۔ امام بخاری یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ مسجد کے قریب میں جو مکانات ہوتے ہیں اگر ان مکانات سے مسجد میں آنے جانے کے لیے کھڑکی لگائی جائے جس سے گذر کر آسانی کے ساتھ مسجد میں حاضری ممکن ہو تو اس کا کیا حکم ہے؟ روایت سے یہ بات ثابت ہوئی کہ کھڑکی سے گذر کر آنا، مسجد میں حاضری کی غرض سے ہو تو اہل علم و فضل کے لیے خصوصی طور پر اس کی اجازت ہے، کیوں کہ ابتداءً مسجد نبوی میں متعدد صحابہ کرام کے مکانات کے دروازے تھے، حضرت ابو بکر صدیقؓ کا مکان بھی مسجد نبوی سے متصل تھا اور اس کا اصل دروازہ مغرب کی جانب تھا، لیکن

ان کے مکان کی پشت کی دیوار میں مسجد نبوی میں آنے کے لیے ایک کھڑکی تھی جس سے وہ بوقت ضرورت مسجد نبوی میں آمدورفت رکھتے تھے، رسول اکرم ﷺ نے مرض الوفات میں بحکم خداوندی ان تمام دروازوں کو بند کردینے کا حکم دیا، اور فرمایا کہ ابوبکر کی کھڑکی کے علاوہ تمام دروازے بند کردیئے جائیں۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ مکان مسجد نبوی کے قریب تھا، اور باب السلام و باب الرحمۃ کے درمیان واقع تھا، تاریخی کتابوں میں مذکور ہے کہ مکان حضرت ابوبکر نے چار ہزار درہم میں حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو فروخت فرمادیا تھا اوراس کی قیمت کو مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت پر صرف کیا تھا، لیکن اس کے بعد بھی وہ مکان حضرت ابوبکر ہی کے نام سے مشہور رہااور اب وہاں مسجد نبوی کا ایک مستقل دروازہ باب ابوبکر کے نام سے تعمیر کردیا گیا ہے اور اس کھڑکی کی جگہ "ھذہ خوخة ابی بکر" لکھ دیا گیا ہے۔

**تشریح احادیث** اس باب کے تحت امام بخاریؒ نے دوروایات ذکر کی ہیں: پہلی روایت حضرت ابوسعید خدریؓ سے ہے اور دوسری حضرت ابن عباس سے، دونوں روایتوں سے یہ معلوم ہوا کہ یہ واقعہ آپ کے مرض الوفات میں پیش آیا تھا اور آپ سر پر پٹی باندھ کر تشریف لائے تھے، یہ واقعہ آپ کی وفات سے پانچ رات اور چار دن پہلے کا ہے، مسلم شریف میں حضرت جندبؓ سے منقول ہے: "سمعت النبی ﷺ یقول قبل ان یموت بخمس لیالٍ" گویا آپ کی وفات سے چاردن پہلے جو جمعرات تھی اس کی صبح کو واقعۂ قرطاس پیش آیا تھا کہ آپ کچھ تحریر لکھوانا چاہتے تھے، لیکن لوگوں کے باہمی اختلاف اور شوروشغب کی وجہ سے آپ نے ارشاد فرمایا کہ سب لوگ میرے پاس سے اٹھ جائیں، پیغمبر کے سامنے اختلاف اور شور درست نہیں ہے، چنانچہ تمام حضرات رخصت ہوگئے، اس کے بعد آپ نے آرام فرمایا اور ظہر کے وقت جب مرض الوفات کی شدت میں کمی محسوس فرمائی تو ارشاد فرمایا کہ پانی کی سات مشکیں میرے سر پر ڈالو، شاید کچھ سکون ہو اور میں لوگوں کو کچھ وصیت کرسکوں، حکم کی تعمیل کی گئی تو قدرے سکون ہوا، پھر آپ حضرت عباس اور حضرت علی کا سہارا لے کر مسجد نبوی میں آئے، ظہر کی نماز پڑھائی اور اس کے بعد خطبہ دیا، یہ گویا آپ کی زندگی کا آخری خطبہ ہے اور واقعۂ قرطاس صبح کو پیش آیا تھا اور اسی دن ظہر کے بعد آپ خطبہ دے رہے ہیں، ظاہر ہے کہ اس خطبہ میں وہی مضمون ہوگا جو آپ تحریر فرمانا چاہتے تھے۔

**آخری خطبہ کے چند مضامین** سیرت اور حدیث پاک کی کتابوں میں اس خطبہ کے مضامین موجود ہیں کہ آپ نے حسب عادت حمدوثنا سے خطبہ شروع کیا، پھر سب سے پہلے اصحاب احد کا ذکر فرمایا اوران کے لیے دعاء مغفرت کی، پھر مہاجرین کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تمہاری تعداد زیادہ ہوگی اور انصار کی کم، یادرکھو کہ انصار نے مجھے ٹھکانہ دیا ہے، ان میں جو محسن اور نکوکار ہیں ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنا اور جو غلطی کر گذرے اس سے درگذر کرنا۔

اس کے بعد وہ بات بیان کی جو روایت باب میں ہے، اے لوگو! اللہ نے اپنے ایک بندے کو اختیار دیا ہے، وہ چاہے تو دنیا میں رہ سکتا ہے اور اگر چاہے تو اللہ تعالی کے یہاں جو آخرت کی نعمتیں ہیں ان کو پسند کر سکتا ہے اور اس کے بندے نے اللہ کے یہاں کی نعمتوں کو پسند کر لیا ہے، گویا یہ پیغمبر علیہ السلام کو اللہ تعالی کا دیا ہوا اختیار تھا کہ وہ اگر چاہیں تو یک عرصہ تک دنیا میں مزید قیام کر سکتے ہیں تا کہ اللہ کے وعدے کو پورا ہوتا ہوا دیکھ لیں اور اس کے بعد آ جائیں اور اگر اسی وقت آنا چاہیں تو اس کا بھی اختیار ہے۔

روایت میں آپ نے جس بندے کو اختیار دینے کا ذکر فرمایا اس کی تعیین نہیں کی بلکہ اس بات کو مبہم رکھا؛ لیکن حضرت صدیق اکبرؓ نے یہ بات سنی تو سمجھ گئے کہ آپ اپنے بارے میں فرما رہے ہیں اور اپنی وفات کی اطلاع دے رہے ہیں، دل پر چوٹ لگی اور بے اختیار رونے لگے، حضرت ابو سعید خدری فرماتے ہیں کہ مجھے بڑی حیرت ہوئی، اللہ نے اگر کسی بندے کو اختیار دیا تھا اور اس نے آخرت کو اختیار کر لیا تو اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ یہ بزرگوار کیوں رو رہے ہیں؟ لیکن جب وفات ہوگئی تو حضرت ابو سعید خدری کی سمجھ میں آیا کہ ''عبد مخیّر'' سے مراد آپ کی ذات اقدس تھی اور صدیق اکبر ہم میں سب سے زیادہ علم والے ثابت ہوئے۔

رسول پاک ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیق کا یہ حال دیکھا تو آپ نے فرمایا "یا ابابکر !لاتبك" ابو بکر! رونا بند کرو۔ اور یہ کہ جان و مال اور مشکل اوقات میں صحبت و رفاقت کے لحاظ سے مجھ پر سب سے زیادہ احسان کرنے والے ابو بکر ہیں۔

ترمذی شریف میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت میں یہ مضمون زیادہ واضح ہے کہ میرے اوپر جتنے لوگوں کے احسانات تھے، میں ان کا بدلہ دے چکا ہوں علاوہ حضرت ابو بکر صدیق کے، اس لیے کہ ان کا احسان باقی ہے، اور اس کا بدلہ قیامت کے دن پروردگار ہی عطا فرمائے گا، اس کے بعد آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر میں اپنی امت میں سے کسی کو اپنا خلیل یعنی دل کی گہرائیوں سے اپنا دوست بناتا تو ابو بکر اس کے مستحق تھے، لیکن خلت خاص پیغمبر علیہ السلام کے دل میں صرف اللہ کے لئے ہے اور جب خلت کا معاملہ خداوند کریم سے ہے تو کسی دوسرے کی گنجائش نہیں؛ لیکن دوسرا درجہ اخوت اسلامی اور مودت اسلامی کا ہے اور اس میں صدیق اکبر سب سے اعلی و افضل ہیں، ان کے برابر نہ کسی کی مؤدت ہے نہ اخوت، ان الفاظ میں حضرت ابو بکر صدیق کی جو منقبت ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ پوری امت میں ان کے درجہ کا کوئی نہیں ہے۔

حضرت ابو بکرؓ کے احسان کی قدر افزائی کے بعد آپ نے مسجد میں آنے کے لیے صحابہ کے گھروں سے جتنی کھڑکیاں یا دروازے کھلے ہوئے تھے ان سب کی طرف ہاتھ سے اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ سب دروازے بند کر دیئے جائیں اور صرف ایک حضرت ابو بکر کی کھڑکی کو کھلا رہنے دیا جائے، کیوں کہ انھیں پیغمبر علیہ السلام کی جانشینی کے سبب مسجد

میں آنے جانے کی ضرورت ہوگی اور اس خصوصیت میں دوسروں کی شرکت سے حقیقت حال واضح نہ ہو سکے گی، اس لیے ابوبکر کی کھڑکی کے علاوہ تمام دروازے بند کر دیئے جائیں۔

**حضرت ابوبکر کی خلافت کا ثبوت** وفات سے چار یوم پہلے واقعۂ قرطاس والے دن ظہر کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ کے منفرد اوصاف وکمالات اور خصوصی فضائل ومناقب کا بیان جس میں امت کا کوئی فرد شریک نہیں ہے، پھر اسی کے ساتھ حضرت ابوبکر کی کھڑکی کے علاوہ مسجد نبوی کے تمام دروازوں کے بند کر دینے کا حکم، حضرت ابوبکر کی خلافت کے لیے واضح اشارہ ہے۔ پھر یہ کہ آپ نے انہی دنوں میں نماز کی امامت بھی حضرت ابوبکرؓ ہی کے سپرد فرمائی، چنانچہ بعض علماء نے یہاں تک دعوی کیا ہے کہ: ''لایُبقیَنَّ فی المسجد باب اِلَّا سُدَّ'' میں ''باب'' خلافت سے کنایہ ہے اور ''سدّ'' کے معنی یہ ہیں کہ آپ حضرت ابوبکر کے علاوہ تمام مسلمانوں کو خلافت کی طلب سے روکنا چاہتے ہیں، ابن حبان نے اس روایت کو ذکر کرنے کے بعد یہ تشریح کی ہے:

في هذا الحديث دليل على انه الخليفة بعد النبي ﷺ، لانه حسم بقوله سدوا عني كل خوخة في المسجد اطماع الناس كلهم على ان يكونوا خلفاء بعده. (فتح الباری ص:۱۴/ ج:۸)

یہ حدیث حضور ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر کے خلیفہ ہونے کی دلیل ہے، کیوں کہ حضور ﷺ نے یہ کہہ کر کہ ''مسجد میں سے ابوبکر کے علاوہ سب کھڑکیاں بند کر دی جائیں'' تمام لوگوں کی خلافت کی دلچسپی کو یکسر ختم فرما دیا۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے بھی یہی ارشاد فرمایا کہ طبع سلیم رکھنے والوں کے لیے اس روایت میں حضرت ابوبکر کی خلافت کے لیے استدلال بالکل واضح ہے۔

**مسجد نبوی میں حضرت علی کے دروازے کا ذکر** یہاں اس بات کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ مسجد میں دروازہ باقی رہنے کی یہ فضیلت، حضرت علیؓ کے بارے میں بھی منقول ہے کہ آپ نے حضرت علی کے دروازے کے علاوہ تمام دروازوں کو بند کرنے کا حکم دیا، ارشاد ہے:

سدو ا ابو اب المسجد غير باب علي (مسند احمد ص:۳۳۱/ ج:۱)

مسجد کے تمام دروازے، علی کے دروازے کے علاوہ بند کر دیئے جائیں۔

بلکہ حضرت علیؓ کے لیے مسجد کے احکام میں سے ایک خصوصیت بھی منقول ہے کہ انھیں جنابت کی حالت میں مسجد سے گذرنے کی اجازت تھی، ارشاد ہے:

يا علي لايحل لاحد ان يجنب في هذاالمسجد غيري وغيرك . (ترمذی شریف ص:۲۱۴/ ج:۲)

اے علی! اس مسجد نبوی میں جنابت کی حالت میں میرے اور تمہارے علاوہ کسی کا گذرنا جائز نہیں۔

حضرت علیؓ کے لیے بحالت جنابت مسجد نبوی سے گذر کر جانے کی اباحت اسی مجبوری کی بنیاد پر تھی کہ ان کے گھر کا دروازہ مسجد نبوی میں کھلتا تھا، ترمذی شریف میں بھی حضرت علی کے دروازے کے علاوہ تمام دروازوں کو بند کر دینے کی روایت ہے: "امر بسد الابواب الا باب علي" (ترمذی ص:۲۱۴/ ج:۲) لیکن ابن جوزی نے اس روایت کو موضوع قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ روافض نے حضرت ابوبکر کی فضیلت میں آنے والی روایت سے معارضہ کے لیے اس کو وضع کیا ہے، لیکن اس معاملہ میں ابن جوزی کا تشدد اہل علم کے درمیان مشہور ہے، اسی لئے حافظ ابن حجر نے اس روایت پر کلام کرتے ہوئے بتلایا ہے کہ حضرت علی کی منقبت میں وارد روایت متعدد طرق سے ثابت ہے اور ان سندوں میں کچھ سندیں درجہ حسن کی بھی ہیں، اس لیے اس کو موضوع قرار دینا درست نہیں، رہا روایت کا تعارض تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک وقت کی بات نہیں ہے، دوبارا لگ الگ اوقات میں دروازے بند کرنے کے واقعات پیش آئے ہیں، حضرت علی کے دروازے کا کھلا رہنا بہت پہلے کی بات ہے، اور اس کا سبب یہی تھا کہ ان کے گھر کا دروازہ ہی ایک تھا اور وہ مسجد میں کھلتا تھا، اسی مجبوری کے سبب جب پہلی بار دروازے بند کرائے گئے تو حضرت علی کا دروازہ کھلا رہا اور بقیہ دروازے بند کر دیئے گئے، لیکن مسجد نبوی میں آتے وقت فاصلہ کم کرنے کے لیے کھڑکیاں باقی رکھیں گئیں، لیکن جب وفات سے چند یوم پہلے آپ تشریف لائے تو ان تمام کھڑکیوں کو بھی بند کر دیا گیا اور صرف حضرت ابوبکر کی کھڑکی کھول دی گئی تاکہ نماز پڑھانے کی جو خدمت انھیں رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد انجام دینی ہے، اس میں سہولت رہے اور حضرت ابوبکر کی خلافت کے لیے واضح ہدایت ہو جائے، علامہ ابن حجرؒ نے دونوں روایات کے درمیان تطبیق کے اس مضمون کو ابوبکر کلابازی اور امام طحاوی کی طرف منسوب کر کے بیان فرمایا ہے۔ (فتح الباری مختصرص:۱۶/ ج:۸)

## [۸۱] بَابُ الْاَبْوَابِ وَالْغَلَقِ لِلْكَعْبَةِ وَالْمَسَاجِدِ

قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللهِ وَقَالَ لِيْ عَبْدُ اللهِ بْنُ مُحَمَّدٍ حَدَّثَنَا سُفْيَانُ عَنِ ابْنِ جُرَيْجٍ قَالَ قَالَ لِيْ ابْنُ مُلَيْكَةَ يَاعَبْدَ الْمَلِكِ! لَوْ رَأَيْتَ مَسَاجِدَ ابْنِ عَبَّاسٍ وَابْوَابَهَا

(۴۶۸) حَدَّثَنَا اَبُوْ النُّعْمَانِ وَقُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيْدٍ قَالَا نَاحَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ اَيُّوْبَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَدِمَ مَكَّةَ فَدَعَا عُثْمَانَ بْنَ طَلْحَةَ فَفَتَحَ الْبَابَ فَدَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ وَبِلَالٌ وَاُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ وَعُثْمَانُ بْنُ طَلْحَةَ ثُمَّ اَغْلَقَ الْبَابَ فَلَبِثَ فِيْهِ سَاعَةً ثُمَّ خَرَجُوْا قَالَ ابْنُ عُمَرَ فَبَدَرْتُ فَسَأَلْتُ بِلَالًا فَقَالَ صَلّٰى فِيْهِ فَقُلْتُ فِيْ اَيٍّ فَقَالَ بَيْنَ الْاُسْطُوَانَتَيْنِ قَالَ ابْنُ عُمَرَ فَذَهَبَ عَلَيَّ اَنْ اَسْاَلَهُ كَمْ صَلّٰى؟ (گذشتہ:۳۹۷)

**ترجمہ** باب، خانہ کعبہ اور مسجدوں میں دروازے بنانے اور ان کو بند کرنے کا بیان ابن جریج کہتے ہیں کہ مجھ سے ابن ابی ملیکہ نے کہا کہ اے عبدالملک! (یہ ابن جریج کا نام ہے) اگر تم ابن عباس کی تعمیر کردہ مسجدوں اور ان کے

دروازوں کو دیکھتے (تو تعجب کرتے) حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ مکہ مکرمہ تشریف لائے تو آپ نے عثمان ابن ابی طلحہ کو بلایا اور انھوں نے بیت اللہ کا دروازہ کھولا، پھر رسول اللہ ﷺ، حضرت بلال، حضرت اسامہ بن زید اور حضرت عثمان بن ابی طلحہ خانہ کعبہ کے اندر داخل ہو گئے، پھر آپ نے دروازہ بند کر لیا اور وہاں اندر کچھ دیر رہے، پھر سب باہر آ گئے، حضرت ابن عمر فرماتے ہیں کہ (میں یہ خبر سن کر) تیزی کے ساتھ حاضر ہوا اور حضرت بلال سے پوچھا (کہ آپ نے خانہ کعبہ کے اندر کیا کیا؟) تو حضرت بلال نے بتلایا کہ آپ نے اندر نماز پڑھی، پھر میں نے پوچھا کس طرف؟ تو انھوں نے بتلایا کہ دوستونوں کے درمیان، ابن عمر کہتے ہیں کہ میں یہ بات پوچھنا بھول گیا کہ کتنی رکعتیں پڑھی ہیں۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ خانہ کعبہ، مسجد حرام اور دوسری مسجدوں میں دروازے لگانا اور بوقت ضرورت انتظامی مصلحت سے انکا بند کرنا جائز ہے، اس مسئلہ کو مدلل کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ مسجد خانۂ خدا ہے اور عبادت کے لئے بنائی جاتی ہے، اس لیے اس میں دروازہ لگانے اور اس کو بند کرنے کے یہ معنی ہوں گے کہ ان اوقات میں نمازیوں کو نماز سے روک دیا گیا، جب کہ قرآن پاک وحدیث شریف میں مسجدوں کو آباد رکھنے اور ان میں کسی کے داخلے کو روکنے کی ممانعت آئی ہے، قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا:

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسَاجِدَ اللّٰہِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ . (البقرۃ آیت: ۱۱۴) اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ کی مسجدوں میں اس بات سے منع کرے کہ وہاں اللہ کا نام لیا جائے۔

یہی مضمون قرآن کریم کی دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے: "أَرَأَيْتَ الَّذِیْ يَنْهٰى عَبْداً اِذَا صَلّٰى" (سورۃ العلق آیت: ۹) کیا تم نے اس شخص کو دیکھا جو اللہ کے ایک بندے کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے، ان آیات کا ظاہر یہ ہے کہ ذکر خداوندی اور نماز کے لیے مسجدوں کو ہر وقت کھلا رکھا جائے۔

حدیث پاک میں بھی یہ مضمون آیا ہے کہ آپ نے بنی عبد مناف کو خطاب کر کے فرمایا کہ بیت اللہ کے طواف اور وہاں نماز وغیرہ کے لیے کسی وقت ممانعت نہ کی جائے، خاندان عبد مناف کے مکانات بیت اللہ کے چاروں طرف تھے اور ان کے درمیان سے گزر کر ہی بیت اللہ میں پہنچنا ممکن تھا، وہ اگر اپنا راستہ بند کر دیتے تو بیت اللہ کا راستہ بھی بند ہو جاتا تھا، آپ نے ان سے خطاب کر کے فرمایا، حضرت جبیر بن مطعم روایت کرتے ہیں: "یا بنی عبد مناف! لا تمنعوا احدا طاف بھذا البیت، صلی ایة ساعة شاء من لیل او نھار" (ترمذی ص ۲۶۰/ ج ۱) ان آیات اور روایات کا تقاضہ یہ ہے کہ مسجدوں کو ہمہ وقت کھلا رہنا چاہئے اور انتظام کی مصلحت یہ تقاضا کرتی ہے کہ نمازوں کے علاوہ دیگر اوقات میں انھیں بند کیا جائے، ورنہ نہ مسجد کا سامان محفوظ رہے گا اور نہ اس کا احترام باقی رہے گا کہ کھلے دروازے میں انسان اور غیر انسان سب داخل ہو سکیں گے۔

امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب سے ثابت فرمایا کہ مسجدوں میں دروازہ لگانا اور ان کا نمازوں کے علاوہ دیگر

اوقات میں بند کرنا دونوں جائز ہیں۔

**تشریح حدیث** ترجمہ کے ثبوت میں امام بخاریؒ نے دو چیزیں پیش کی ہیں: پہلی بات تو حضرت ابن عباسؓ کا عمل ہے، ابن ابی ملیکہ نے ابن جریج سے کہا کہ اگر تم ابن عباسؓ کی بنوائی ہوئی مسجدیں اوران کے دروازوں کو دیکھتے (جزامحذوف ہے) توتمہیں ان کی خوبصورتی اور پختگی وغیرہ پر حیرت ہوتی۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں یہ بات کہی جارہی ہے، اس وقت ان کی حالت میں خستگی اور شکستگی پیدا ہوگئی تھی، بہرحال یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ ابن عباس نے جو مسجدیں بنوائی تھیں، ان میں دروازے تھے اور جب دروازے تھے تو ضرورت کے وقت ان کو بند بھی کیا جاتا ہوگا۔

دوسرا ثبوت امام بخاری نے ایک روایت کے ذریعہ پیش کیا کہ فتح مکہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ مکہ معظمہ تشریف لائے تو کلید بردار خانۂ کعبہ حضرت عثمان بن ابی طلحہ کو بلایا، ان سے چابی طلب فرمائی اور خانۂ کعبہ کو کھول کر اندر داخل ہوئے اور وہاں نماز پڑھی۔

روایت کا ایک حصہ باب ’’**قول اللہ واتخذوا من مقام ابراهيم مصلى**‘‘ کے تحت (حدیث نمبر ۳۹۷) میں گذر چکا ہے، یہاں امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ جب آپ بیت اللہ کے اندر تشریف لے گئے تو ہجوم کے خیال سے دروازہ بند کرلیا، بخاری کے ترجمہ کے دونوں جز ثابت ہو گئے کہ خانہ کعبہ میں دروازہ بھی تھا اور اس کو ضرورت کے سبب بند بھی کیا گیا۔

**خانۂ کعبہ کی کلید برداری کا ذکر** ایام جاہلیت میں قریش کے دس خاندانوں میں عزت وشرافت کے کام تقسیم تھے، جن میں بنو ہاشم سے سقایۃ الحاج یعنی بیت اللہ آنے والوں کو پانی پلانے کی خدمت متعلق تھی۔ بنوعبدالدار کے پاس خانہ کعبہ کی کلید برداری اور دربانی کا کام تھا، حضرت عثمان بن طلحہ انہی عبدالدار کی اولاد میں سے تھے، پورا نام ہے عثمان بن طلحہ بن ابی طلحہ بن عثمان بن عبدالدار الحجبی، جب فتح مکہ کے موقع پر آپ مسجد حرام میں داخل ہوئے تو حضرت عثمان بن طلحہ کو بلایا، حضرت عثمان صلح حدیبیہ کے موقع پر اسلام قبول کر چکے تھے، آپ ﷺ نے حضرت عثمان سے خانہ کعبہ کی چابی طلب کی انھوں نے پیش کردی، آپ نے بیت اللہ کو کھولا، دیکھا تو اس میں تصویریں تھیں، آپ نے ان سب کو مٹا دینے کا حکم دیا اور آب زمزم سے دھونے کی ہدایت کی، جب یہ کام مکمل ہوگیا تو آپ اندر داخل ہوئے، پھر باب کعبہ پر آکر خطبہ دیا، خطبہ دیتے وقت کلید آپ کے ہاتھ میں تھی، خطبہ سے فارغ ہوکر آپ مسجد میں بیٹھ گئے، حضرت علیؓ نے عرض کیا کہ چابی ہمیں مرحمت فرمائی جائے تاکہ سقایۂ زمزم کے ساتھ کلید برداری کا شرف بھی حاصل ہوجائے؛ لیکن آیت پاک نازل ہوئی: ’’**اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰی اَھْلِھَا**‘‘ (سورۃ النساء آیت: ۵۸) اللہ تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے کہ تمام امانتیں ان کے اہل کو ادا کی جائیں۔ چنانچہ آپ نے حضرت

علی کو چابی عنایت نہیں کی، بلکہ حضرت عثمان بن طلحہ کو بلایا اور فرمایا: "یا آل ابی طلحة ! خالدة تالدة لاینزعها منکم الا ظالم" (عمدۃ القاری ص:۲۴۸/ ج:۴) اے آل ابی طلحہ! ہمیشہ ہمیشہ کے لیے یہ چابی لے لو، تم سے ظالم اور غاصب کے علاوہ کوئی نہیں چھین سکے گا۔ چنانچہ یہ چابی آج تک اسی خاندان میں چلی آتی ہے۔

## [۸۲] بَابُ دُخُوْلِ الْمُشْرِكِ فِيْ الْمَسْجِدِ

(۴۶۹) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ نَا اللَّيْثُ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ اَبِيْ سَعِيْدٍ اَنَّهُ سَمِعَ اَبَاهُرَيْرَةَ يَقُوْلُ بَعَثَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ خَيْلاً قِبَلَ نَجْدٍ فَجَآءَ تْ بِرَجُلٍ مِنْ بَنِيْ حَنِيْفَةَ يُقَالُ لَهُ ثُمَامَةُ بْنُ اُثَالٍ فَرَبَطُوْهُ بِسَارِيَةٍ مِنْ سَوَارِيْ الْمَسْجِدِ. (گذشتہ:۴۶۲)

**ترجمہ** باب، مسجد میں مشرک کے داخل ہونے کا بیان۔ حضرت سعید بن ابو سعید کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابو ہریرہؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ رسول اللہ ﷺ نے گھوڑے سواروں کا ایک دستہ نجد کی جانب روانہ کیا، وہ لوگ بنو حنیفہ کے ایک شخص کو جن کا نام ثمامہ بن اثال تھا گرفتار کر کے لائے اور انھیں مسجد کے ستونوں میں سے ایک ستون کے ساتھ باندھ دیا۔

**مقصد ترجمہ** امام بخاری کا یہ ترجمۃ الباب احناف کے مسلک کے عین مطابق ہے، وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ مسجد میں مشرکین کا داخل ہونا جائز اور درست ہے، مسجدوں میں مشرکین کے داخل ہونے کا مسئلہ ائمہ کے درمیان اختلافی ہے امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ مشرکین کا کسی مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے، شوافع کہتے ہیں کہ مسجد حرام کے علاوہ دیگر مساجد میں داخل ہونا جائز ہے، امام احمدؒ بھی مسجد حرام میں داخلہ کو ناجائز کہتے ہیں، بقیہ مسجدوں کے بارے میں ان سے دو روایتیں ہیں، ایک روایت عدم جواز کی ہے اور دوسری روایت میں امام اور امیر کی اجازت کے بعد داخل ہونے کی اجازت ہے، حنفیہ نے تمام مسجدوں میں مشرکین کے داخل ہونے کو جائز قرار دیا ہے؛ البتہ امام محمدؒ کی رائے "سیر کبیر" میں اس کے مطابق نہیں ہے، شامی نے بھی امام محمد کا اختلاف نقل کیا ہے اور اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

امام شافعی کا مستدل ہے: "اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا" (سورہ توبہ آیت:۲۸) کہ مشرکین بالکل ناپاک ہیں، اس لیے سال رواں ۹ھ کے بعد وہ مسجد حرام کے پاس بھی نہ آنے پائیں، امام مالک نے اسی آیت کے پہلے حصے یعنی "اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ" سے تمام مسجدوں میں داخلہ کو ممنوع فرما دیا کہ جب مشرکین قطعاً ناپاک ہیں تو ان آلودۂ نجاست انسانوں کو داخلہ کی اجازت دے کر مسجد کے تقدس اور اس کی حرمت کو پامال کرنا جائز نہیں۔

لیکن حنفیہ نے مطلقاً ہر مسجد میں داخل ہونے کی اجازت دی ہے، وہ یہ کہتے ہیں کہ "اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ

ـجــس" میں نجاست سے مراد ظاہری نجاست نہیں؛ بلکہ اعتقاد کی خرابیاں اور خبث باطن مراد ہے اور آیت میں آگے بوسال رواں کے بعد مسجد کے قریب آنے کی ممانعت مذکور ہے، اس میں سال رواں سے مراد تو ۹ھ ہے جس میں رسول للہ ﷺ نے حضرت ابو بکر کو امیر الحج بنا کر روانہ فرمایا تھا اور یہ اعلان کرایا تھا کہ اگلے سال یعنی ۱۰ھ سے مشرکین کے سجد حرام میں داخلہ پر پابندی لگا دی گئی ہے، گویا ۹ھ کے ایام حج سے ۱۰ھ کے ایام حج کے درمیان ان کے داخلہ کی جازت ہے، یہیں سے فقہاء احناف نے یہ سمجھا ہے کہ مطلقاً حدود حرم میں داخلہ پر پابندی مراد نہیں، بلکہ مراد یہ ہے کہ اب شرکین بیت اللہ کا طواف یا حج وغیرہ کے ارادے سے نہیں آسکیں گے، اسی لئے حضرت ابو بکر نے جو اعلان فرمایا وہ بھی یہی تھا کہ "ان لا یحج بعد العام مشرك" یعنی سال رواں کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع فرمایا تو کوئی مشرک شریک نہیں تھا، گویا آیت کی مراد حج اور طواف سے روکنا ہے، مسجد میں داخلہ کی ممانعت نہیں۔ حنفیہ کے مسلک پر استدلال کرتے ہوئے ابو بکر جصاص (المتوفی ۳۷۰ھ) نے ''احکام القرآن'' (ص:۸۸/ ج:۳ میں حضرت عثمان بن ابی العاص کی ایک روایت بھی پیش کی ہے کہ بنو ثقیف کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے ان کے لیے مسجد میں قبہ لگوا دیا، صحابہ نے عرض کیا کہ (قومٌ انجاسٌ) یہ ناپاک لوگ ہیں تو آپ نے ارشاد فرمایا:'' انـه ليس على الارض من انجاس الناس شئى انما انجاس الناس على انفسهم" (احکام القرآن ص:۸۸/ ج:۳) بے شک انسانوں کی باطنی نجاست کا زمین پر (خارج) میں کوئی اثر نہیں ہوتا، ان کی نجاست سے تو ان کے نفوس متاثر ہوتے ہیں۔

مراد یہی تھی کہ انسانوں کو نجس قرار دینے کے معنی یہی ہیں کہ ان کی نجاست معنوی ہے حسی نہیں۔ اور یہی بات حضرات احناف نے سمجھی ہے۔

**تشریح حدیث** روایت چند صفحات پہلے گذر چکی ہے، مشرک کے مسجد میں داخل ہونے کا جواز اس سے ثابت ہے کہ حضرت ثمامہ بن اثال کو بحالت شرک مسجد میں ستون سے باندھ دیا گیا، یہ مسجد میں مشرک کو داخل کرنا ہوا جس سے داخل ہونے کا جواز خود بخود معلوم ہو گیا۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ جب تین دن تک مشرک مسجد میں محبوس رہا تو اس کا وہاں قیام ثابت ہوا، جس سے دخول کا جواز درجہ اولیٰ میں سمجھا گیا، یہ معلوم ہو چکا ہے حضرت ثمامہ اسی موقع پر مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔

## [۸۳] بَابُ رَفْعِ الصَّوْتِ فِيْ الْمَسْجِدِ

(۴۷۰) حَـدَّثَـنَـا عَـلِـيُّ بْنُ عَبْدِ اللهِ بْنِ جَعْفَرِ بْنِ نُجَيْحِ الْمَدِيْنِي قَالَ نَا يَحْيىٰ بْنُ سَعِيْدِ الْـقَـطَّـانُ قَـالَ نَـا الْجُعَيْدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ حَدَّثَنِيْ يَزِيْدُ بْنُ خُصَيْفَةَ عَنِ السَّائِبِ بْنِ

يَزِيْدَ قَالَ كُنْتُ قَائِماً فِي الْمَسْجِدِ فَحَصَبَنِيْ رَجُلٌ فَنَظَرْتُ إِلَيْهِ فَإِذَا عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ اذْهَبْ فَأْتِنِيْ بِهٰذَيْنِ فَجِئْتُهُ بِهِمَا فَقَالَ مِمَّنْ أَنْتُمَا أَوْ مِنْ أَيْنَ أَنْتُمَا؟ قَالَا مِنْ أَهْلِ الطَّائِفِ قَالَ لَوْ كُنْتُمَا مِنْ أَهْلِ الْبَلَدِ لَأَوْجَعْتُكُمَا تَرْفَعَانِ أَصْوَاتَكُمَا فِيْ مَسْجِدِ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم .

(۴۷۱) حَدَّثَنَا أَحْمَدُ بْنُ صَالِحٍ قَالَ نَا ابْنُ وَهْبٍ قَالَ أَخْبَرَنِيْ يُوْنُسُ بْنُ يَزِيْدَ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ حَدَّثَنِيْ عَبْدُ اللهِ ابْنُ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ كَعْبَ بْنَ مَالِكٍ أَخْبَرَهُ أَنَّهُ تَقَاضٰى ابْنَ أَبِي حَدْرَدٍ دَيْناً كَانَ لَهُ عَلَيْهِ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم فِي الْمَسْجِدِ فَارْتَفَعَتْ أَصْوَاتُهُمَا حَتّٰى سَمِعَهَا رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم وَهُوَ فِيْ بَيْتِهِ فَخَرَجَ إِلَيْهِمَا رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم حَتّٰى كَشَفَ سِجْفَ حُجْرَتِهِ وَنَادٰى كَعْبَ بْنَ مَالِكٍ فَقَالَ يَا كَعْبُ! فَقَالَ لَبَّيْكَ يَا رَسُوْلَ اللهِ! فَأَشَارَ بِيَدِهِ أَنْ ضَعِ الشَّطْرَ مِنْ دَيْنِكَ قَالَ كَعْبٌ قَدْ فَعَلْتُ يَا رَسُوْلَ اللهِ! قَالَ رَسُوْلُ اللهِ صلی اللہ علیہ وسلم قُمْ فَاقْضِهِ . (گذشتہ: ۴۵۷)

**ترجمہ** باب، مسجد میں آواز بلند کرنے کا بیان۔ حضرت سائب بن یزید سے روایت ہے کہ میں مسجد نبوی میں کھڑا ہوا تھا کہ کسی نے میرے ایک کنکری ماری، میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ حضرت عمر بن الخطاب تھے، پھر انھوں نے مجھ سے فرمایا کہ جاؤ اور ان دونوں آدمیوں کو بلا کر لاؤ، چنانچہ میں ان دونوں کو بلا کر لایا، حضرت عمر نے ان سے پوچھا کہ تم کس قبیلہ کے ہو، یا کس جگہ کے رہنے والے ہو ان دونوں نے بتلایا کہ ہم طائف کے رہنے والے ہیں، حضرت عمر نے فرمایا کہ اگر تم شہر مدینہ کے رہنے والے ہوتے تو میں تمہیں سزا دیتا، تم رسول اللہ علیہ السلام کی مسجد میں اپنی آواز بلند کر رہے ہو (کہ شور وغل ہو گیا) حضرت کعب بن مالکؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے مسجد نبوی میں، ابن ابی حدرد پر اپنے قرض کی ادائیگی کا تقاضہ کیا جو عہد رسالت میں ان کے ذمہ تھا اور اس سلسلہ میں ان دونوں کی آوازیں بلند ہوئیں، یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آوازوں کو اپنے حجرے میں سنا، پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کمرہ کا پردہ اٹھا دیا اور باہر تشریف لائے اور کعب بن مالک کو آواز دی، اے کعب! حضرت کعب نے جواب میں عرض کیا یا رسول اللہ! میں حاضر ہوں، پھر آپ نے اپنے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ اپنے قرض میں سے آدھا چھوڑ دو، حضرت کعبؓ نے کہا یا رسول اللہ! میں نے حکم کی تعمیل کی، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن ابی حدرد سے فرمایا کہ جاؤ اور ان کا قرض ادا کر دو۔

**مقصد ترجمہ** مقصد ترجمہ کی وضاحت میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ امام بخاریؒ مسجد میں آواز بلند کرنے کی کراہت بیان کرنا چاہتے ہیں کہ یہ عمل اہل تقوی کے شایان شان نہیں ہے، امام مالکؒ نے مسجد میں آواز بلند کرنے کی ہر حال میں ممانعت فرمائی ہے، مذاکرہ علم کے لیے بھی اس کی اجازت نہیں ہے، امام ابوحنیفہ

اور دوسرے حضرات نے مذاکرۂ علم اور دوسری دینی و دنیوی ضروریات جیسے عقد نکاح وغیرہ کے لیے شور و غوغا نہ ہونے کی حد تک اجازت دی ہے۔

امام بخاری کے طرزِ عمل سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ میں بھی تفصیل و تجزیہ کی طرف مائل ہیں، کیوں کہ انھوں نے باب کے تحت دو روایتیں دی ہیں اور دونوں سے دو متضاد باتیں سمجھ میں آتی ہیں، پہلی روایت سے ممانعت معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمر نے آواز بلند کرنے پر سخت تنبیہ کی۔ اور دوسری روایت سے اباحت معلوم ہوتی ہے کہ حضور پاک ﷺ نے آواز بلند کرنے والوں کو اس بات پر تنبیہ نہیں کی، بلکہ جلد از جلد معاملہ کا تصفیہ کر کے بات کو ختم کر دیا، اس لیے بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری یہ تفصیل کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کسی دینی یا دنیوی ضرورت سے آواز بلند ہوگئی ہو لیکن شور و غل تک نوبت نہ پہنچی ہو تو اس کی اجازت ہے، جیسا کہ دوسری روایت سے معلوم ہوا۔ اور اگر شور و غوغا اور چیخ و پکار کی صورت ہو جائے تو اس کی اجازت نہیں دی جائے گی، جیسا کہ پہلی روایت سے معلوم ہوا۔

## علامہ سندھی کا ارشاد

علامہ سندھیؒ کا بھی یہی ارشاد ہے، فرماتے ہیں کہ ہو سکتا ہے امام بخاریؒ نے دونوں روایتیں ذکر کر کے تفصیل کی طرف اشارہ کیا ہو کہ اگر آواز کا بلند کرنا بلا ضرورت ہے تو جائز نہیں اور ضرورت کے تحت ہے تو جائز ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ضرورت ہو یا نہ ہو، ہر حال میں ممانعت کی طرف اشارہ ہو؛ کیوں کہ جس روایت میں آواز بلند کرنے پر رسول اللہ ﷺ کی جانب سے انکار نہ کرنے کی بات معلوم ہو رہی ہے، اس میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جھگڑا ختم کرنے کے لیے فوراً مسئلہ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور وہ جھگڑا ختم فرما دیا، جس کے سبب مسجد میں آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ نے اپنے عمل کے ذریعہ یعنی مسئلہ کو ختم کرنے کے لیے فوری مداخلت فرما کر مسجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت واضح فرما دی۔

ہم یہ سمجھتے ہیں کہ علامہ سندھیؒ کا بیان کردہ پہلا احتمال زیادہ راجح ہے کہ امام بخاری تفصیل کرنا چاہتے ہیں اس میں امام بخاری رحمہ اللہ کے ذوق کی رعایت بھی ہے، وہ دونوں روایات جمع کر کے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ مسجد میں آواز بلند کرنے کی ضرورت ہو اور اعتدال قائم رہے تو اس کی اجازت ہے، ضرورت نہ ہو یا آواز حد اعتدال سے اونچی ہو جائے اور شور و غوغا کی صورت پیدا ہو جائے تو اس کی اجازت نہیں۔

## پہلی حدیث کی تشریح

پہلی روایت میں مذکور ہے کہ سائب بن یزید مسجد میں کھڑے تھے کہ کسی نے ان پر ایک کنکر پھینکی، مڑ کر دیکھا تو حضرت عمر تھے، حضرت عمر نے کنکر پھینک کر اس لیے متوجہ کیا کہ حضرت سائب فاصلہ پر تھے، اگر آواز دیتے تو بلند آواز سے پکارنا ضروری ہوتا، جو رسول اللہ ﷺ کے قرب کی وجہ سے درست نہیں تھا اس لیے کنکر پھینک کر متوجہ کیا، پھر فرمایا کہ ان دونوں کو بلا کر لاؤ، دونوں لائے گئے، تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ کہاں کے رہنے والے ہو؟ انھوں نے بتلایا کہ ہم باہر یعنی ''طائف'' کے رہنے والے ہیں، یہ سن کر حضرت

عمر نے کہا جاؤ، تم کو اس لیے چھوڑ رہا ہوں کہ باہر کے ہو اور مسئلہ سے واقف نہیں ہو، اگر تم مدینہ کے رہنے والے ہوتے تو سزا دیتا، بعض روایات میں ہے " لاوجعتکما جلدا " یعنی کوڑے لگانے کی سزا دیتا، تم رسول اللہ ﷺ کی مسجد میں بے باکی کے ساتھ اور بے ضرورت شور وغل کر رہے ہو۔

**مزار اقدس کے احترام میں صحابہ کا عمل**　حضرت عمر کا ارشاد "ترفعان اصواتکما الخ" احترام مسجد کے ساتھ قرآن کی آیت " لَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوا لَهُ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ " (الحجرات ۲) سے بھی ماخوذ ہے کہ اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو پیغمبر علیہ السلام کی آواز سے بلند نہ کرو اور نہ ان کے سامنے اس طرح زور سے بولو جیسے آپس میں بولتے ہو، پیغمبر علیہ السلام کی زندگی میں بھی یہی حکم تھا اور وفات کے بعد بھی یہی حکم ہے، کیوں کہ آپ قبر شریف میں بھی حیات سے متصف ہیں، حضرت عمر کی رائے تو روایات باب سے معلوم ہوگئی کہ وہ وفات کے بعد بھی قبر شریف کے قریب بلند آواز سے بولنے پر تنبیہ فرما رہے ہیں۔

حضرت ابوبکر کے بارے میں بھی یہی منقول ہے کہ وہ مسجد نبوی میں بلند آواز سے بولنے پر نکیر فرماتے اور کہتے کہ تم نے رسول اللہ ﷺ کو قبر شریف میں اذیت پہنچائی، حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنے دروازے کے لیے کواڑ بنوائے تو حکم دیا کہ انھیں اتنی دور بیٹھ کر بنایا جائے کہ ان کی آواز مسجد نبوی میں نہ آئے اور حضور ﷺ کو قبر مبارک میں تکلیف نہ ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے منقول ہے کہ اگر حجرۂ اطہر کے قریب کسی دیوار میں کیل ٹھوکنے کی آواز آتی تو فوراً کسی قاصد کو بھیج کر منع کرا دیتی تھیں: لا تـؤذوا رسـول الله ﷺ کہ رسول اللہ ﷺ کو تکلیف مت پہنچاؤ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے یہ تمام اقوال وافعال تقی الدین سبکی کی ''شفاء السقام'' میں موجود ہیں۔ حیات انبیاء کے مسئلہ پر تفصیلی گفتگو کسی اور موقع پر کی جائے گی۔ ان شاء اللہ

**دوسری روایت کی تشریح**　پہلی روایت سے مسجد میں آواز بلند کرنے کی ممانعت معلوم ہوئی، اور دوسری روایت سے گنجائش معلوم ہوئی، روایت چند صفحات پہلے گذر چکی ہے۔ زیر بحث مسئلہ سے اتنی بات متعلق ہے کہ قرض کے تقاضے میں جھگڑے کی نوبت آئی اور فریقین کی آواز اتنی بلند ہوگئی کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کو باہر تشریف لا کر فیصلہ کرنا پڑا، آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ آواز اتنی بلند کیوں ہوئی؟ بلکہ خوش اسلوبی سے جھگڑا نمٹانے کی صورت تجویز فرما دی، جس کی بنیاد صلح اور رواداری پر تھی، اگر شور قابل اعتراض اور قابل ممانعت تھا تو یہ تنبیہ کا موقع تھا، تنبیہ نہ فرمانے سے معلوم ہوا کہ ایک حد تک اس کی گنجائش ہے۔　واللہ اعلم

## [۸۴] بَابُ الْحَلَقِ وَالْجُلُوْسِ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۷۲) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ نَا بِشْرُ بْنُ الْمُفَضَّلِ عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ

سَأَلَ رَجُلٌ النَّبِیَّ ﷺ وَهُوَ عَلَی الْمِنبرِ مَاتَرٰی فِیْ صَلوٰةِ اللَّیْلِ؟ قَالَ مَثْنٰی مَثْنٰی فَاِذَا خَشِیَ اَحَدُکُمْ الصُّبْحَ صَلّٰی وَاحِدَةً فَاَوْتَرَتْ لَهٗ مَا صَلّٰی وَاِنَّه کَانَ یَقُوْلُ اِجْعَلُوْا اٰخِرَ صَلَاتِکُمْ بِاللَّیْلِ وِتْراً فَاِنَّ النَّبِیَّ ﷺ اَمَرَ بِه. (آئندہ:۴۷۳، ۹۹۰، ۱۱۳۷)

(۴۷۳) حَدَّثَنَا اَبُوْ النُّعْمَان حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَیْدٍ عَنْ اَیُّوْبَ عَنْ نَافِعٍ عَنْ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَجُلاً جَآءَ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ وَهُوَ یَخْطُبُ فَقَالَ کَیْفَ صَلوٰةُ اللَّیْلِ؟ فَقَالَ مَثْنٰی مَثْنٰی فَاِذَا خَشِیْتَ الصُّبْحَ فَاَوْتِرْ بِوَاحِدَةٍ تُوْتِرُ هٗ لَکَ مَا قَدْ صَلَّیْتَ وَقَالَ الْوَلِیْدُ بْنُ کَثِیْرٍ حَدَّثَنِیْ عُبَیْدُ اللهِ ابْنُ عَبْدِ اللهِ اَنَّ ابْنَ عُمَرَ حَدَّثَهُمْ اَنَّ رَجُلاً نَادٰی النَّبِیَّ ﷺ وَهُوَ فِی الْمَسْجِدِ.

(گذشتہ:۴۷۲)

(۴۷۴) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ یُوْسُفَ قَالَ اَنَامَالِکٌ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ اَبِیْ طَلْحَةَ اَنَّ اَبَا مُرَّةَ مَوْلٰی عَقِیْلِ بْنِ اَبِیْ طَالِبٍ اَخْبَرَهٗ عَنْ اَبِیْ وَاقِدِ اللَّیْثِی قَالَ بَیْنَمَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ فِی الْمَسْجِدِ فَاَقْبَلَ نَفَرٌ ثَلٰثَةٌ فَاَقْبَلَ اِثْنَانِ اِلٰی رَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَذَهَبَ وَاحِدٌ. فَاَمَّا اَحَدُهُمْ فَرَاٰی فُرْجَةً فِی الْحَلْقَةِ فَجَلَسَ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَجَلَسَ خَلْفَهُمْ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَاَدْبَرَ ذَاهِباً فَلَمَّا فَرَغَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ قَالَ اَلَا اُخْبِرُکُمْ عَنِ النَّفَرِ الثَّلٰثَةِ اَمَّا اَحَدُهُمْ فَاَوٰی اِلَی اللهِ فَاٰوَاهُ اللهُ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَاسْتَحْیٰی فَاسْتَحْیٰی اللهُ مِنْهُ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَاَعْرَضَ فَاَعْرَضَ اللهُ عَنْهُ. (گذشتہ:۶۶)

**ترجمہ** باب، مسجد میں حلقے بنانے اور بیٹھنے کا بیان۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا اور آپ اس وقت منبر پر بیٹھے تھے کہ آپ رات کی نماز یعنی تہجد کی نماز کے بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ دو دو رکعت پڑھو، پھر جب تم میں سے کوئی آدمی صبح کے طلوع ہونے کا خطرہ محسوس کرے تو ایک رکعت پڑھ لے، وہ اس کی پوری نماز کو طاق عدد میں تبدیل کردے گی، حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رات کے وقت اپنی آخری نماز وتر کو بناؤ؛ اس لیے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس وقت آپ خطبہ دے رہے تھے، اس شخص نے عرض کیا کہ رات کی نماز کس طرح پڑھی جائے؟ آپ نے فرمایا کہ دو رکعت، پھر جب تمہیں طلوع صبح کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت ملا کر وتر (طاق) پڑھ لو، وہ تمہاری پڑھی ہوئی پوری نماز کو طاق عدد میں تبدیل کردے گی۔ ولید بن کثیر اپنی سند سے بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابن عمر نے یہ بیان کیا کہ ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ کو اس وقت پکارا جب مسجد میں آپ تشریف فرما تھے۔ حضرت واقد لیثی سے روایت ہے کہ جس وقت رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، اس وقت تین آدمی آئے، ان میں سے دو تو رسول

اللہ ﷺ کے پاس مسجد میں آگئے اور ایک چلا گیا، ان دو آنے والوں میں سے ایک نے حلقہ میں کچھ خالی جگہ دیکھی اور اس جگہ بیٹھ گیا اور دوسرا تمام لوگوں کے پیچھے جا بیٹھا، رہا تیسرا تو وہ پہلے ہی مڑ کر چلا گیا تھا، جب رسول اللہ ﷺ فارغ ہوگئے تو فرمایا کہ کیا تم لوگوں کو ان تینوں آدمیوں کے بارے میں نہ بتلاؤں؟ رہا ان میں سے ایک، تو اس نے اللہ کے قریب جگہ تلاش کی تو اللہ نے اس کو جگہ مرحمت فرمادی، رہا دوسرا انسان تو وہ اللہ سے شرما گیا تو اللہ تعالی نے بھی اس سے شرم کی، رہا تیسرا تو اس نے منہ پھیر لیا تو اللہ تعالی نے بھی اس سے منہ پھیر لیا۔

**مقصد ترجمہ** ترجمہ میں دو لفظ ہیں ایک ''حلق'' اور ایک ''جلوس'' یعنی حلقہ بنانا اور بیٹھنا یہ دونوں باتیں الگ الگ بھی ہوسکتی ہیں کہ امام بخاری اس ترجمہ میں ان دونوں باتوں کا الگ الگ جواز ثابت کرنا چاہتے ہیں، اور اس صورت میں کہا جائے گا کہ پہلی دو روایتوں سے مسجد میں بیٹھنے کا جواز ثابت ہے جس میں آپ کے خطبہ دینے کا ذکر ہے، اور صحابہ کرام کا بیٹھ کر سننا ثابت ہے اور تیسری روایت میں دوسرے جز یعنی حلق کا ذکر ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ دونوں باتیں الگ الگ نہ ہوں، بلکہ یہ ایک ہی مضمون ہو اور بخاری حلقہ بنا کر بیٹھنے کا جواز بیان کرنا چاہتے ہوں، کیوں کہ بعض روایات میں حلقہ بنا کر بیٹھنے سے ممانعت معلوم ہوتی ہے، مسلم شریف کی کتاب الصلوۃ اور ابوداؤد کی کتاب الادب میں حضرت جابرؓ بن سمرہ سے روایت ہے: ''قَالَ دخَلَ رَسُولُ اللهِ ﷺ الْمَسْجِدَ وَهم حلق فَقَالَ مالي اراكم عزين'' (مسلم، وابوداؤد ص:۳۰۸/ ج:۲) رسول اللہ ﷺ مسجد میں تشریف لائے اور صحابہ اس وقت حلقوں میں بیٹھے تھے، تو آپ نے فرمایا کہ کیا بات ہے، میں تمہیں الگ الگ ٹکڑوں میں دیکھ رہا ہوں۔

اس روایت میں تو محض ناگواری کا اظہار ہے کہ مختلف حصوں میں حلقہ بنا کر بیٹھنا آپ کو پسند نہیں آیا، لیکن باقاعدہ ممانعت فرمانا بھی بعض روایات میں آیا ہے: ''نهى عن التحلق قبل الصلوة يوم الجمعة'' (ابوداؤد ص:۱۵۴/ ج:۱) آپ ﷺ نے جمعہ کے دن، نماز سے پہلے حلقہ بنا کر بیٹھنے سے ممانعت فرمائی۔

حلقہ بنا کر بیٹھنے کی ممانعت پر مشتمل روایات کی وجہ سے امام بخاری کو ترجمۃ الباب میں یہ وضاحت کرنا پڑی اور یہ ثابت کیا کہ روایات ہی سے حلقہ بنا کر بیٹھنے کا جواز ثابت ہے اور جن روایات میں ممانعت آئی ہے، وہ یا تو جمعہ کے دن کے ساتھ خاص ہیں، کیوں کہ جمعہ کے دن بڑا اجتماع ہوتا ہے، اگر لوگ حلقے بنا بنا کر الگ الگ بیٹھیں گے تو آنے والوں کو بھی پریشانی ہوگی اور صف بندی میں بھی دشواری ہوگی، اس لیے جمعہ کے دن احتیاط کی جائے، بقیہ دنوں اور اوقات میں یہ دشواریاں نہیں ہیں اس لیے اجازت ہے، یا پھر یہ کہا جائے گا کہ جن روایات میں ممانعت آئی ہے، وہ بے ضرورت اور بلا فائدہ حلقہ کی صورت میں بیٹھنے کے بارے میں ہے، لیکن حلقہ بنا کر بیٹھنے میں اگر کوئی مصلحت ہو جیسے تعلیم کے لیے دائرہ کی صورت میں بیٹھنا، یا خطیب کا خطبہ دینا اور سامعین کا صف بندی کے بجائے اس کے سامنے دائرہ کی صورت میں بیٹھنا تو اس کی اجازت ہے، اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حلقہ سے مراد کوئی اصطلاحی حلقہ نہیں، بلکہ دائرہ کی صورت میں بیٹھنا ہے۔

امام بخاریؒ کا یہ مدعا اس طرح ثابت ہوگا کہ تیسری روایت میں تو حلقہ کا ذکر موجود ہی ہے، لیکن پہلی اور دوسری روایت سے بھی یہ مضمون اس طرح ثابت ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ خطبہ دے رہے تھے اور صحابہ کرام آپ کے ارشادات کو سننے کے لیے آپ کے چاروں طرف یا سامنے کی سمت میں دائرے کی صورت میں بیٹھے ہوئے تھے۔

**شرح حدیث اول ودوم** اس باب کے تحت امام بخاری نے تین روایات ذکر کی ہیں: پہلی اور دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ہے، دونوں روایتوں کا مضمون بھی تقریباً ایک ہی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں خطبہ دے رہے تھے اور صحابہ کرام خطبہ کی طرف متوجہ تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے کچھ پوچھا۔

امام بخاری کا ترجمۃ الباب اسی سے ثابت ہوگیا کہ صحابہ کرام مجلس میں بیٹھے تھے، نیز یہ کہ جب آپ ﷺ خطبہ دے رہے تھے تو ظاہر ہے کہ صحابہ کرام ہر طرف سے آپ کی جانب رخ کئے ہوئے ہوں گے یعنی یہ ایک قسم کا حلقہ اور دائرہ ہوگیا، گویا بیٹھنے کا ثبوت تو صراحت کے ساتھ ہے اور حلقہ بنا کر بیٹھنے کا مضمون دلالۃً نکلتا ہے۔ واللہ اعلم

**رات کی نماز میں دو دو رکعت کا مسئلہ** ترجمۃ الباب سے تو صرف وہی مضمون متعلق تھا جو بیان کر دیا گیا، لیکن آنے والے نے جو باتیں معلوم کیں ان میں دو مسئلے ہیں: ایک نوافل کے دو دو رکعت پڑھنے کا مسئلہ ہے اور دوسرے وتر کی ایک رکعت ہونے کا۔ ان مسائل پر خود امام بخاری ابواب منعقد کریں گے، نوافل کا مسئلہ کتاب التہجد میں آئے گا اور وتر کا بیان ابواب الوتر میں کیا جائے گا، لیکن اتنی وضاحت یہاں بھی مناسب معلوم ہوتی ہے کہ آنے والے نے رات کی نماز یعنی تہجد کے بارے میں سوال کیا، تو آپ نے فرمایا "مثنی مثنی"، یعنی دو دو، جس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ آپ نے پوچھنے والے کو دو دو رکعت پڑھنے کی ہدایت کی۔

دن اور رات کی نفلوں میں دو دو رکعت پڑھنا افضل ہے، یا چار چار؟ تو اس سلسلہ میں امام مالک اور امام شافعی اور امام احمد بن حنبل کا مسلک یہ ہے کہ دو دو رکعت پڑھنا افضل ہے، امام اعظم کے نزدیک ایک نیت اور سلام سے چار رکعت پڑھنا افضل ہے، امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک دن کی نوافل میں ایک سلام کے ساتھ چار رکعت اور رات میں دو رکعت پڑھنا افضل ہے، رہا دو رکعت کی نیت باندھنا تو وہ بھی صحیح ہے اور روایات سے ثابت ہے، جیسا کہ زیر بحث باب میں مذکور روایت "مثنی مثنی" ہے، متعدد علماء احناف نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ "مثنی مثنی" میں جہاں یہ احتمال ہے کہ ہر دو رکعت پر سلام پھیر دیا جائے، وہیں یہ بھی احتمال ہے کہ ہر دو رکعت پر تشہد پڑھ کر دوسرے شفعہ کے لیے کھڑا ہو جائے، لیکن یہ تو احتمال ہوا، امام صاحب کا اصل مستدل حضرت عائشہؓ کی وہ روایت ہے جس میں رات کی نوافل میں چار چار رکعت کی صراحت ہے، بخاری شریف کے الفاظ یہ ہیں: "**یصلی اربعا فلا تسأل عن حسنهن وطولهن ثم یصلی اربعا فلا تسأل عن حسنهن وطولهن ثم یصلی ثلاثاً**" (بخاری ص ۱۵۴/ ج ۱)

یعنی رسول اللہ ﷺ چار رکعت پڑھتے تھے، اور تم ان کے طول اور حسن کے بارے میں نہ پوچھو کہ وہ کیسا تھا، پھر

چار رکعت پڑھتے تھے اور تم ان کے حسن اور طول کے بارے میں نہ پوچھو، پھر تین رکعت (وتر) پڑھتے تھے۔

اس روایت کے بارے میں بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے رات کی نوافل میں دو رکعت پر سلام پھیرنے کی وضاحت موجود ہے، مگر ہمیں یہ تکلف معلوم ہوتا ہے۔ ایک سلام سے دو رکعت پڑھنا بھی ثابت ہے اور حضرت عائشہ خود بیان فرما رہی ہیں کہ چار رکعت پڑھتے تھے، اور ان کا طول اور حسن نا قابل بیان ہے، تو ہم یہی سمجھتے ہیں کہ آپ نے ایک سلام سے چار رکعت بھی پڑھی ہیں، اور امام اعظم فرماتے ہیں کہ چار ہی پڑھنا افضل ہے روایت سے ثابت ہونے کے ساتھ، اس میں مشقت بھی زائد ہے اور ''اجر کم علی قدر نصبکم '' یعنی ثواب بقدر مشقت ایک قاعدۂ کلیہ ہے۔

## وتر کی ایک رکعت کا مسئلہ

روایات زیر بحث میں یہ بھی آیا کہ رسول اللہ ﷺ نے نوافل کے دو دو رکعت پڑھنے ہدایت کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ جب فجر کے طلوع کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت پڑھ کر رات کی پوری نماز کو طاق عدد میں تبدیل کر دینا، جہاں تک وتر کی رکعتوں کی تعداد میں ائمہ کے مسلک کا تعلق ہے، تو امام اعظم کے یہاں ان کی تعداد تین رکعت متعین ہے، ایک رکعت کا وتر مستقل سلام کے ساتھ جائز نہیں، امام مالک کے یہاں ایک رکعت پڑھنا جائز ہے، مگر تین رکعت پڑھنا موکد ہے، موطا امام مالک میں ایک رکعت کے وتر کی روایت کے بعد امام مالک نے فرمایا ہے:

''ولیس علی ھذا العمل عندنا ولکن ادنی الوتر ثلاث'' (موطا امام مالک) اس (یعنی وتر کی ایک رکعت پر ہمارے یہاں عمل نہیں ہے، وتر کی کم سے کم رکعتیں تین ہیں، امام احمد بن حنبل سے دو روایتیں ہیں: ایک روایت شوافع کے مطابق اور ایک احناف کے، البتہ امام شافعی کے یہاں وتر کی صرف ایک رکعت کے جواز پر زور دیا گیا ہے اور تین رکعت یا اس سے زیادہ رکعتیں طاق عدد کے مطابق پڑھنا بھی جائز ہے۔

روایت باب سے بظاہر ایک رکعت کا جواز معلوم ہوتا ہے، لیکن چند سطر پہلے جو بخاری کے حوالہ سے حضرت عائشہؓ کی روایت ذکر کی گئی ہے: '' ثم یصلی ثلاثا'' نیز دسیوں صحابہ کرام سے یہ بات منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ وتر کی تین رکعت پڑھتے تھے، جس میں سلام آخر میں ہوتا تھا، بعض حضرات نے تو اجماع کا دعوی کر دیا ہے کہ ایک سلام سے وتر کی تین رکعتوں پر مسلمانوں کا اجماع ہے، امام بخاری بھی ابواب وتر میں تین رکعت کی روایت ذکر کریں گے، اس لیے روایت باب: ''فاذا خشیت الصبح فاوتر بواحدۃ'' کا مطلب یہ لیا گیا ہے کہ جب طلوع فجر کا اندیشہ ہو تو آخر شفعہ میں تشہد پر بیٹھ کر سلام پھیرنے سے پہلے اٹھ جاؤ اور تیسری رکعت اس شفعہ میں ملا کر تین رکعت کا وتر پڑھ لو، گویا امام شافعیؒ کے یہاں ''فاوتر بواحدۃ'' میں باء الصاق کے لیے ہے اور ترجمہ یہ ہے کہ ایک رکعت کا وتر پڑھ لو اور ہمارے یہاں یہ باء استعانت کے لیے ہے اور ترجمہ ہے کہ ایک رکعت کے ذریعہ پڑھے ہوئے شفعہ کو وتر میں تبدیل کر دو۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث سوم** اس باب کے ذیل میں تیسری روایت حضرت ابوواقد لیثی رضی اللہ عنہ کی دی گئی ہے، یہ روایت نمبر ۶۶ پر "باب من قعد حیث ینتهی به المجلس" کے تحت گذر چکی ہے، یہاں امام بخاری یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کے مسجد میں تشریف فرما ہونے کے درمیان جو تین شخص آئے تھے، ان میں سے ایک واپس چلا گیا اور بقیہ دو آپ کی مجلس میں حاضر ہوئے، جن میں ایک نے دیکھا کہ آپ کے پاس حلقے میں گنجائش ہے تو وہ حلقہ میں آکر بیٹھ گئے، دوسرے کو حیا دامن گیر ہوئی اور وہ مجلس کے پیچھے بیٹھ گئے، امام بخاری کا مقصد ثابت ہو گیا کہ آپ کے پاس آپ کے صحابہ دائرے اور حلقے کی شکل میں بیٹھتے تھے؛ معلوم ہوا کہ تعلیم وغیرہ کے لیے مسجد میں دائرے کی صورت میں بیٹھنا جائز ہے۔

## [۸۵] بَابُ الْاِسْتِلْقَآءِ فِي الْمَسْجِدِ

(۴۷۵) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عَبَّادِ بْنِ تَمِيْمٍ عَنْ عَمِّهٖ اَنَّهٗ رَأَىٰ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ مُسْتَلْقِياً فِي الْمَسْجِدِ وَاضِعاً اِحْدٰى رِجْلَيْهِ عَلَى الْاُخْرٰى وَعَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ الْمُسَيَّبِ كَانَ عُمَرُ وَ عُثْمَانُ يَفْعَلَانِ ذٰلِكَ .

(آئندہ: ۵۹۶۹، ۶۲۸۷)

**ترجمہ** باب، مسجد میں چت لیٹنے کا بیان۔ حضرت عباد بن تمیم اپنے چچا (عبداللہ بن زید) سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو مسجد میں اس طرح چت لیٹے ہوئے دیکھا کہ آپ نے اپنا ایک پیر، دوسرے پیر پر رکھا تھا۔ ابن شہاب زہری حضرت سعید بن مسیب سے نقل کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی ایسا کیا کرتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ مسجد میں چت لیٹنے کا کیا حکم ہے؟ اسی کے ساتھ بعض نسخوں میں دوسرا جز بھی مذکور ہے "ومد الرجل"، یعنی چت لیٹنا اور پیر پھیلا کر یا پیر پر پیر رکھ کر لیٹنا درست ہے یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ مسجد عبادت کی جگہ ہے، سونے کی اور لیٹنے کی جگہ نہیں ہے، دوسرے یہ کہ چت لیٹنے اور پیر پر پیر رکھنے کے بارے میں روایات میں ممانعت بھی آئی ہے: مسلم کتاب اللباس اور ابوداؤد کتاب الادب وغیرہ میں موجود ہے: "لایستلقین احدکم ثم یضع احدی رجلیه علی الاخری" (مسلم کتاب اللباس ص: ۱۹۸/ ج: ۲) تم میں سے کوئی چت نہ لیٹے، پھر یہ (بھی نہ کرے) کہ وہ اپنا ایک پیر دوسرے پیر پر رکھے۔

چنانچہ متعدد حضرات نے اس کی ممانعت کی ہے، حضرت ابن عباس، کعب بن عجرہ، محمد بن سیرین اور طاؤس وغیرہم سے منقول ہے کہ پیر پر پیر رکھ کر لیٹنا مکروہ ہے، لیکن بخاری یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح بعض خاص

حالات میں مسجد میں سونے کی اجازت دی گئی ہے، اسی طرح نمازی کو دور سے آنے میں تعب ہو جائے، یا مثلاً بیماری وضعف وغیرہ کے سبب ضرورت ہو تو اگر نمازیوں کے لیے تنگی پیدا نہ ہوتی ہو تو اس کی گنجائش ہے کہ پیر پر پیر رکھ کر لیٹ جائے یا چت لیٹ جائے۔ حسن بصری، شعبی، ابن مسیّب اور صحابہ کرام میں حضرت ابو بکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت اسامہ بن زید اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم اجمعین کراہت کے قائل نہیں ہیں۔

گویا بخاری یہ وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ جن روایات میں اس کیفیت سے لیٹنے کی ممانعت ہے، ان کا محمل اور محل اور ہے اور جن روایات سے اجازت معلوم ہوتی ہے ان کا محمل دوسرا ہے، ممانعت اس صورت میں ہے کہ مثلاً کپڑا چھوٹا ہو اور اس طرح لیٹنے سے ستر کھل جانے کا اندیشہ ہو۔ اور اگر کپڑا گنجائش دار ہے اور کسی قسم کا اندیشہ نہ ہو تو اس طرح لیٹنا بلا کراہت جائز ہے۔

**تشریح حدیث** حضرت عبداللہ بن زید فرماتے ہیں کہ انھوں نے رسول پاک ﷺ کو مسجد میں چت لیٹے ہوئے دیکھا اور اس وقت آپ ﷺ نے اپنا ایک پائے مبارک دوسرے پیر پر رکھ رکھا تھا، معلوم ہوا کہ اس طرح لیٹنے میں مضائقہ نہیں، نہ یہ مسجد کے احترام کے منافی ہے اور نہ یہ ہیئت قابل اعتراض ہے، رہا یہ احتمال کہ یہ پیغمبر علیہ السلام کی خصوصیت نہ ہو، تو اس کے لیے بخاری نے خلفاء راشدین میں سے حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کا عمل بھی پیش کر دیا، حمیدی نے حضرت ابو بکرؓ کا نام بھی اس میں شامل کیا ہے، معلوم ہوا کہ اس طرح مسجد میں لیٹنا پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی درست ہے۔

## [۸۶] بَابُ الْمَسْجِدِ يَكُوْنُ فِيْ الطَّرِيْقِ مِنْ غَيْرِ ضَرَرٍ بِالنَّاسِ فِيْهِ

وَبِهٖ قَالَ الْحَسَنُ وَاَيُّوْبُ وَمَالِكٌ

(۴۷۶) حَدَّثَنَا يَحْيٰى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ نَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ اَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ ﷺ قَالَتْ لَمْ اَعْقِلْ اَبَوَيَّ اِلَّا وَهُمَا يَدِيْنَانِ الدِّيْنَ وَلَمْ يَمُرَّ عَلَيْنَا يَوْمٌ اِلَّا يَأْتِيْنَا فِيْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ طَرَفَيِ النَّهَارِ بُكْرَةً وَعَشِيَّةً ثُمَّ بَدَا لِاَبِيْ بَكْرٍ فَابْتَنٰى مَسْجِدًا بِفِنَاءِ دَارِهٖ فَكَانَ يُصَلِّيْ فِيْهِ وَيَقْرَأُ الْقُرْاٰنَ فَيَقِفُ عَلَيْهِ نِسَاءُ الْمُشْرِكِيْنَ وَاَبْنَاءُ هُمْ يَعْجَبُوْنَ مِنْهُ وَيَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ وَكَانَ اَبُوْبَكْرٍ رَجُلًا بَكَّاءً وَلَا يَمْلِكُ عَيْنَيْهِ اِذَا قَرَأَ الْقُرْاٰنَ فَاَفْزَعَ ذٰلِكَ اَشْرَافَ قُرَيْشٍ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔

(آئندہ: ۲۱۳۸، ۲۲۶۳، ۲۲۶۴، ۲۲۹۷، ۳۹۰۵، ۴۰۹۳، ۵۸۰۷، ۶۰۷۹)

ترجمہ: باب، اگر اس میں لوگوں کا کوئی نقصان نہ ہو تو راستہ میں مسجد بنانے کا بیان۔ حسن بصری، ایوب سختیانی اور امام مالک بھی یہی کہتے ہیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زوجۂ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا، اسی وقت سے میں نے یہ دیکھا کہ میرے والدین دین اسلام قبول کر چکے تھے اور ہم پر کوئی دن ایسا نہ گذرتا تھا جس میں رسول اللہ ﷺ ہمارے یہاں دن کے دونوں حصوں میں صبح و شام نہ آتے ہوں، پھر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں ایک بات آئی اور انھوں نے اپنے گھر کے سامنے کی کھلی جگہ میں ایک مسجد بنالی اور وہ اسی میں نماز پڑھتے تھے، قرآن پڑھتے تھے، پھر مشرکین کی عورتیں اور ان کے بچے ان کے پاس کھڑے ہو جاتے، حضرت ابوبکر کی حالت پر تعجب کرتے اور ان کو غور سے دیکھتے اور حضرت ابوبکر بڑے گریہ وزاری کرنے والے انسان تھے اور جب قرآن پڑھتے تو اپنی آنکھوں پر انھیں قابو نہیں رہتا تھا، مشرکین قریش کے اشراف کو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ (کے اس طرز عمل) نے بڑی گھبراہٹ میں مبتلا کر دیا تھا۔

مقصد ترجمہ: راستہ میں مسجد بنانے کا حکم بیان کرنا چاہتے ہیں، راستہ سے ایسا راستہ مراد ہے جو کسی کی ملکیت میں نہ ہو اور اس میں عام انسانوں کا حق مشترک ہو، کیوں کہ جس زمین پر مسجد بنائی جارہی ہے، اس میں کئی صورتیں ممکن ہیں، اگر کوئی شخص اپنی مملوکہ زمین میں مسجد بنانا چاہتا ہے، تو یہ نہایت مبارک کام ہے، شوق سے بنائے اور کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ اگر دوسرے کی مملوکہ زمین میں بنانا چاہتا ہے تو اس کی اجازت نہیں۔ اور اگر ایسی جگہ مسجد بنا رہا ہے، جس میں سب کا حق مشترک ہے اور کسی کی ملکیت نہیں تو بعض حنفیہ نے اس میں قاضی اور امیر کی اجازت کی شرط لگائی ہے، جیسے بنجر زمین قابل کاشت بنانے میں امیر کی اجازت شرط ہے، ربیعۃ الرائے سے ایسی زمین پر مسجد بنانے کی ممانعت منقول ہے، حضرت علی اور حضرت ابن عمر سے بسند ضعیف ایسی زمین پر مسجد تعمیر کرنے کی ممانعت منقول ہے، امام بخاریؒ اس باب میں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اگر ایسی جگہ پر اس طرح مسجد بنائی جائے کہ لوگوں کا حق طریق متاثر نہ ہو، یعنی وہاں لوگوں کے لیے پیدل آمد و رفت ہی کا نہیں، بلکہ گاڑی کے گزرنے کا راستہ بھی کھلا رہے، تو کوئی اعتراض کی بات نہیں، مسجد بنانا جائز ہے۔ یہی بات حسن بصری، ایوب سختیانیؒ اور امام مالکؒ سے منقول ہے، بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ جمہور کی رائے یہی ہے، لیکن ان تین حضرات کی رائے صراحت اور صحیح نقل کے ساتھ امام بخاری تک پہنچی تھی، اس لیے انھوں نے تین نام ذکر کر دیئے، مسجد بنانے کی اجازت اس لیے ہے کہ راستہ بھی عوام کا حق تھا اور ان کی ضرورت سے متعلق تھا، اور مسجد بھی تمام مسلمانوں کی عام ضرورت سے متعلق ہے اور جو اس جگہ کا فائدہ تھا یعنی گذرگاہ کے طور پر استعمال وہ بھی متاثر نہیں ہوا۔

حضرت گنگوہیؒ کا ارشاد: حضرت گنگوہیؒ نے ارشاد فرمایا کہ امام بخاری یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح راستہ اور اس پر گذرنے کی اجازت عام انسانوں کا مشترک حق ہے، اسی طرح مسجد بھی انہی

لوگوں کا مشترک حق ہے، اس لیے اگر کوئی شخص اس کے بعض حصے کو کسی دوسرے کام میں صرف کرنا چاہے مثلاً مسجد بنانا چاہے تو دو شرطوں کے ساتھ اس کی اجازت ہے: ایک شرط تو یہ ہے کہ راستہ متاثر نہ ہو، اور دوسری شرط یہ ہے کہ کسی کو اعتراض نہ ہو، کیوں کہ عوامی حقوق میں یہی بات ہوتی ہے کہ جس طرح ہر شخص کو اس میں تصرف کا حق ہوتا ہے، اسی طرح ہر شخص کو روکنے کا بھی حق ہوتا ہے۔

**تشریح حدیث** امام بخاری نے اپنے مقصد کے ثبوت میں حضرت ابو بکر صدیقؓ کا واقعہ ذکر کیا ہے، اس کی تفصیلات بخاری ہی میں دوسرے مقامات پر آئیں گی، یہاں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا مختصر بیان فرما رہی ہیں ہیں کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا اپنے والدین یعنی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت ام رومان رضی اللہ عنہا کو دین اسلام پر پایا اور پیغمبر علیہ السلام کو حضرت ابو بکر سے ایسا تعلق تھا کہ آپ روزانہ صبح وشام ہمارے یہاں تشریف لاتے تھے، پھر ایک ایسا وقت آیا کہ کفار مکہ کی ایذا رسانیوں سے تنگ آ کر حضرت ابو بکر نے حبشہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کر لیا، مکہ مکرمہ سے نکل کر کچھ دور تک گئے تھے کہ ابن الدغنہ مل گئے، انھوں نے معلوم کیا، کہاں جا رہے ہیں؟ حضرت ابو بکر نے جواب دیا کہ میری قوم رہنے نہیں دیتی؛ اس لیے مجبوراً جا رہا ہوں، ابن الدغنہ نے کہا کہ آپ جیسے انسان کہاں جا سکتے ہیں، آپ ناداروں کی مدد کرتے ہیں، صلہ رحمی فرماتے ہیں، دوسروں کا بوجھ برداشت کرتے ہیں، مہمان نوازی فرماتے ہیں اور حوادث میں مبتلا انسانوں کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہیں، آپ میری ذمہ داری پر واپس چلیں، حضرت ابو بکر واپس آ گئے، ابن الدغنہ نے اشراف قریش میں گشت کیا کہ میں ابو بکر کو اپنی ذمہ داری پر واپس لے آیا ہوں، ان جیسے اوصاف حمیدہ رکھنے والے انسان سے محروم ہو جانا سب کے لیے نقصان کی بات ہے، وہ تو بہت قابل قدر انسان ہیں، قریش نے ابن الدغنہ کی بات منظور کی، مگر یہ قید لگا دی کہ ابو بکر صرف اپنے گھر میں اپنے معبود کی عبادت کریں، کھلے بندوں نہ کریں، ہمیں ان کی عبادت اور تلاوت وغیرہ سے خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ ہمارے بچوں اور عورتوں پر اثر انداز نہ ہو جائے، ابن الدغنہ نے حضرت ابو بکر کو بتلا دیا اور وہ کچھ دنوں تک اپنے گھر کے اندر اپنے معمولات پورے کرتے رہے، لیکن کب تک اس کیفیت کو نبھاتے، کچھ دنوں کے بعد اپنے گھر سے باہر ایک چبوترا بنا لیا، وہیں نماز پڑھتے، عبادت کرتے، تلاوت فرماتے، خوش آواز تھے، بلکہ آواز میں درد تھا، رقیق القلب تھے، تلاوت کرتے تو گریہ طاری ہو جاتا۔ مشرکین کے بچے اور عورتیں ان کی قراءت سننے کے لیے کھڑے ہو جاتے، اشراف قریش کو خطرہ محسوس ہوا کہ یہ تو اچھی تبلیغ شروع ہو گئی، انھوں نے ابن الدغنہ کو مطلع کیا کہ ابو بکر قرارداد کے خلاف کر رہے ہیں، اس لیے آپ یا انھیں پابند کیجئے یا اپنا ذمہ واپس لیجئے، ابن الدغنہ نے حضرت ابو بکر سے بات کی تو انھوں نے ذمہ داری واپس کر دی، اس واقعہ کے کچھ دنوں کے بعد ہجرت کا واقعہ پیش آیا، وہاں ان شاء اللہ تفصیلات آ جائیں گی۔

**ترجمہ کا ثبوت** بخاری کا مدعا ثابت ہو گیا کہ حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے مکان کے سامنے مسجد بنالی تھی اور اس پر پیغمبر علیہ السلام نے انکار نہیں فرمایا، البتہ راستہ بند نہیں ہوا تھا، کیونکہ مشرکین کی عورتیں اور بچے اسی گذرگاہ سے گذرتے ہوئے رک جاتے تھے اور اس پر مشرکین کو خیال ہوا کہ بچہ تو بچہ ہوتا ہی ہے، کہیں عورتیں بھی مسحور اور متاثر نہ ہو جائیں، اس لیے حضرت ابوبکر کے واقعہ اور پیغمبر علیہ السلام کے انکار نہ فرمانے سے یہ مسئلہ ثابت ہے کہ مباح جگہوں پر راستہ بند نہ ہوتا ہو تو وہاں مسجد بنانا درست ہے۔　　　واللہ اعلم

## [۸۷] بَابُ الصَّلٰوةِ فِيْ مَسْجِدِ السُّوْقِ

وَصَلّٰى ابْنُ عَوْنٍ فِيْ مَسْجِدٍ فِيْ دَارٍ يُغْلَقُ عَلَيْهِمُ الْبَابُ

(۴۷۷) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ نَا اَبُوْ مُعَاوِيَةَ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ اَبِيْ صَالِحٍ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ قَالَ صَلٰوةُ الْجَمِيْعِ تَزِيْدُ عَلٰى صَلٰوتِهٖ فِيْ بَيْتِهٖ وَصَلٰوةٍ فِيْ سُوْقِهٖ خَمْسًا وَّعِشْرِيْنَ دَرَجَةً فَاِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ وَاَتَى الْمَسْجِدَ لَا يُرِيْدُ اِلَّا الصَّلٰوةَ لَمْ يَخْطُ خَطْوَةً اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ بِهَا دَرَجَةً اَوْ حَطَّ عَنْهُ بِهَا خَطِيْئَةً حَتّٰى يَدْخُلَ الْمَسْجِدَ وَاِذَا دَخَلَ الْمَسْجِدَ كَانَ فِيْ صَلٰوةٍ مَا كَانَتْ تَحْبِسُهٗ وَتُصَلِّي الْمَلٰٓئِكَةُ عَلَيْهِ مَادَامَ فِيْ مَجْلِسِهِ الَّذِيْ يُصَلِّيْ فِيْهِ اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لَهٗ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْهُ مَالَمْ يُؤْذِ يُحْدِثْ فِيْهِ۔　　(گذشتہ: ۱۷۶)

**ترجمہ** باب، بازار کی مسجد میں نماز پڑھنے کا بیان۔ ابن عون نے گھر کی ایسی مسجد میں نماز پڑھی جس کا دروازہ بند کر دیا جاتا تھا۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جماعت کی نماز، انسان کی اپنے گھر کی، یا اپنے بازار میں ادا کی ہوئی نماز سے پچیس درجہ زیادہ ثواب رکھتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں ایک انسان جب وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے اور مسجد میں آتا ہے اور مسجد میں بھی صرف نماز کے لیے آتا ہے، تو وہ کوئی قدم نہیں اٹھاتا مگر اللہ تعالیٰ اس قدم کی وجہ سے اس کا ایک درجہ بلند کرتا ہے اور ایک گناہ معاف کر دیتا ہے، یہاں تک کہ وہ مسجد میں داخل ہو جائے۔ اور جب وہ مسجد میں داخل ہو جاتا ہے تو نماز ہی میں داخل شمار کیا جاتا ہے، جب تک کہ نماز اس کو مسجد میں روکے رکھتی ہے اور جب تک وہ اس جگہ رہتا ہے جہاں اس نے نماز پڑھی تھی اس وقت تک فرشتے برابر اس کے لیے دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے اللہ! اس کی مغفرت فرما دے، اے اللہ اس پر رحم فرما، جب تک وہ مسجد میں کسی کو تکلیف نہ پہنچائے اور اس کا وضو نہ ٹوٹ جائے۔

**مقصد ترجمہ** ترجمۃ الباب کے الفاظ ہیں ''مسجد سوق میں نماز پڑھنے کا بیان'' اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ مسجد سوق سے مراد، بازار میں دوکان وغیرہ کے سامنے نماز کے لیے مقرر کردہ جگہ یعنی غیر اصطلاحی مسجد ہے،

یا وہ اصطلاحی اور شرعی مسجد ہے جس کا محل وقوع بازار ہو؟ اس سلسلے میں شارحین اور ترجمۃ الباب کا مقصد متعین کرنے والوں کے رجحانات میں اتفاق نہیں ہے۔

**حضرت شاہ ولی اللہ کا ارشاد** حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ کا رجحان یہ ہے کہ مسجد سے اصطلاحی مسجد مراد نہیں ہے، کیوں کہ باب سابق میں راہ گذر پر مسجد بنانے کا ذکر تھا، امام بخاری نے خیال کیا کہ بازار میں نماز کے لیے جو جگہ بنائی جاتی ہے، وہاں بھی نماز کا جواز بیان کردیں، بہرحال وہ مسجد محلہ مراد نہیں ہے جو ابد الآباد کے لیے مسجد بن جاتی ہے۔

حضرت گنگوہی قدس سرہ کا رجحان بھی یہی ہے کہ بازار میں نماز کے لیے بنائی ہوئی جگہ جو مسجد شرعی کے حکم میں نہیں ہوتی، امام بخاری ان جگہوں میں نماز کا جواز بیان کرنا چاہتے ہیں۔ اور مسجد سوق سے مسجد شرعی مراد نہ ہونے کا قرینہ یہ ہے کہ روایت باب میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ گھر کی اور بازار کی نماز سے جماعت کی نماز کا ثواب ۲۵/ گنا زیادہ ہوتا ہے، اگر بازار میں تعمیر کردہ مسجد شرعی مراد ہوتی تو ثواب کم نہ ہوتا، بلکہ اس مسجد میں بھی ثواب کا یہی تناسب ہوتا جیسا کہ ظاہر ہے۔

**دیگر شارحین کے رجحانات** شارحین بخاری میں علامہ کرمانی کا رجحان بھی یہی ہے کہ ترجمۃ الباب میں مذکور مسجد سے شرعی مسجد مراد نہیں ہے، بلکہ بازار میں نماز کے لیے مقرر کردہ جگہ ہے، لیکن علامہ ابن حجر نے کرمانی کی بات نقل کرکے یہ تبصرہ کیا کہ یہ دور از کار بات ہے، علامہ عینی نے تبصرہ کیا کہ یہ بے جا تکلف ہے اور بلاضرورت حقیقت سے گریز کرکے مجاز اختیار کرنے کے مرادف ہے، خود ابن حجر کی رائے یہ ہے کہ امام بخاری نے مسند بزاز وغیرہ میں مذکور روایت: "ان الا سواق شر البقاع و ان المساجد خیر البقاع" یعنی بازار سب سے بدترین جگہ ہے اور مسجدیں سب سے بہتر مقامات ہیں کے پیش نظر ترجمہ منعقد کیا ہے، منشاء یہ ہے کہ یا تو وہ روایت امام بخاری کے نزدیک سند صحیح سے نہیں آئی ہے اور اگر سند بھی صحیح ہو تو بخاری یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ بازار میں مسجد نہ بنائی جائے، کیونکہ مسجد بننے کے بعد وہ جگہ خیر کی جگہ بن جائے گی، مگر علامہ عینی اس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ یہ رائے ظاہر کرنے والے کو یہ کیسے اور کہاں سے معلوم ہوا کہ بخاری اس روایت کے پیش نظر ترجمہ منعقد کررہے ہیں؟ گویا علامہ عینی کے نزدیک علامہ ابن حجر کی رائے محض ان کا اپنا تخیل ہے، پھر اس میں یہ بھی اضافہ کرلیا جائے کہ جس روایت کو وہ مسند بزاز وغیرہ کے حوالہ سے ذکر کررہے ہیں، وہ مسلم شریف میں بھی ان الفاظ میں بہ سند صحیح مذکور ہے: "عن ابی هریرة ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال احب البلاد الی الله مساجدها و ابغض البلاد الی الله اسواقها" (مسلم ص ۲۳۶/ ج ۱)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مقامات میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے پسندیدہ جگہ مسجدیں ہیں اور سب سے ناپسندیدہ مقامات بازار ہیں۔

**علامہ عینیؒ کا ارشاد** علامہ عینی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سب سے اچھی یہ بات ہے کہ امام بخاری ترجمۃ الباب کے ذیل میں جو روایت لارہے ہیں، اس میں تین طرح کی نماز کا ذکر ہے، گھر کی نماز، بازار کی نماز، مسجد شرعی کی نماز اور تینوں جگہ نماز پڑھنا جائز ہے، امام بخاری اس روایت کا ذکر کرنے کے لیے تینوں ترجمے رکھ سکتے تھے، مگر انھوں نے اس خیال سے بازار کی مسجد میں نماز کا جواز ترجمۃ منعقد کردیا کہ بازار شور وشغب، بیع وشراء کی مشغولیت اور جھوٹی سچی قسموں کی جگہ ہے، اس وجہ سے یہ وہم ہوسکتا ہے کہ نماز یہاں درست بھی ہوگی یا نہیں؟ اس لیے امام بخاری نے اس کا جواز ثابت کردیا، بقیہ دو جگہوں میں نماز کا درست ہونا ایک واضح بات ہے۔

**ابن بطالؒ کی رائے** ابن بطال شارح بخاری کہہ رہے ہیں کہ بخاری کو بازار کے بارے میں واردشدہ روایت ''شر البقاع'' کی وجہ سے یہ اندیشہ ہوا کہ کہیں اس روایت کے پیش نظر بازار میں نماز کے ناجائز ہونے کا واہمہ نہ ہو، اس لیے انھوں نے حضرت ابو ہریرہ کی روایت ذکر کرکے جواز ثابت کردیا؛ کیوں کہ اس میں بازار میں پڑھنے کا جواز مذکور ہے، اس کے بعد ابن بطال ترقی کرکے فرماتے ہیں کہ جب بازار میں انفرادی نماز کا جواز معلوم ہوا تو بازار میں مسجد شرعی تعمیر کرنے کا جواز بدرجہ اولی معلوم ہوگیا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن بطال نے ''مسجد السوق'' سے تو شرعی مسجد مراد نہیں لی، لیکن درجہ اولی میں لاکر بازار کی شرعی اور غیر شرعی دونوں مسجدوں میں نماز کا جواز ثابت کردیا، علامہ سندھیؒ نے بھی یہی ارشاد فرمایا ہے کہ: ''صلوته في سوقه'' یعنی مسجد کی نماز کو بازار کی نماز پر فضیلت دینے کا مفہوم یہی ہے کہ بازار میں بھی نماز پڑھنا جائز ہے اور جب بازار میں نماز جائز ہے تو بازار کی شرعی مسجد میں بھی بدرجہ اولی جائز ہے۔

**حضرت الاستاذؒ کا ارشاد** اور ہمارا خیال یہ ہے کہ بازار اور مسجد کی خصوصیات الگ الگ ہیں، ان کے احوال متضاد ہیں، بازار غفلت کی جگہ ہے، وہاں شور وغل رہتا ہے، باہمی نزاع پیش آتے ہیں، سکون کا وہاں نام نہیں ہوتا، جھوٹ، مکر وفریب، جھوٹی قسمیں، بے حیائی کے اسباب اس درجہ ہوتے ہیں کہ اسے شیاطین کا مستقر اور خرافات کا مرکز سمجھنا چاہئے، اسی لئے روایت میں اس کو ''شر البقاع'' یعنی سب سے بدترین جگہ قرار دیا گیا ہے، جب کہ مسجد میں سکون واطمینان میسر ہوتا ہے، وہ ذکر وشغل اور عبادت خداوندی کی جگہ ہے، وہاں فرشتوں کا اجتماع رہتا ہے، وہاں رحمت خداوندی کا نزول ہوتا ہے، اس کو خیر وبرکت اور تقدس کا مرکز سمجھنا چاہئے، اسی لیے اس کو ''خیر البقاع'' قرار دیا گیا ہے، بازار اور مسجد کے ان متضاد حالات کی بنا پر یہ خیال ہوسکتا ہے کہ بازار میں نماز جائز ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ اگر بازار میں شرعی مسجد بنائی جائے تو اس میں نماز کا وہ اجر ہے یا نہیں، جو محلّہ کی شرعی مسجدوں میں ہوتا ہے؟ یعنی انفرادی نماز سے ۲۵/ گنا یا ۲۷/ گنا زیادہ۔

امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب ''باب الصلوة في مسجد السوق'' اور اس کے ذیل میں حضرت ابو ہریرہ کی روایت ذکر کرکے ثابت کردیا کہ بازار میں انفرادی نماز پڑھ لی جائے تو وہ بھی جائز ہے اور اگر بازار میں مسجد شرعی تعمیر کرلی جائے

تو اس میں ثواب کا وہی اجر ہے جو دوسری مسجدوں میں ہوتا ہے، پہلی بات یعنی بازار میں انفرادی نماز کا جواز تو اس طرح ثابت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں گھر اور بازار میں نماز کا تقابل مسجد شرعی کی نماز سے کیا گیا ہے کہ مسجد میں ان دونوں سے ۲۵/ گنا ثواب زیادہ ملتا ہے، معلوم ہوا کہ گھر کی اور بازار کی نماز بھی درست ہے۔ اور دوسری بات یعنی بازار میں اگر مسجد شرعی تعمیر کر لی جائے تو اس میں بھی ۲۵/ گنا ثواب ملتا ہے، یہ اس طرح ثابت ہے کہ تقابل کی بنیاد پر روایت میں مذکور: ''صلوة الجمیع'' کے معنی ''صلوة فی المسجد الشرعی'' کے ہیں اور مسجد شرعی محلہ میں بنائی جائے یا بازار میں، دونوں کا حکم یکساں ہے؛ گویا مسجد بازار میں بنالی جائے تو وہ مسجد ہی ہے، بازار نہیں، اس طرح بازار کی انفرادی نماز اور بازاروں میں تعمیر شدہ مسجد میں نماز کا جواز بھی ثابت ہوگیا اور دونوں کے درمیان ثواب کے تناسب کا فرق بھی معلوم ہوگیا۔ واللہ اعلم

**ابن عونؒ کا اثر** ترجمۃ الباب کے ساتھ امام بخاری نے ابن عون کا اثر ذکر کیا ہے کہ انھوں نے اپنے گھر کی ایسی مسجد میں نماز پڑھی جس کا دروازہ بند ہوجاتا تھا۔ اس اثر کے ترجمۃ الباب سے تعلق کے بارے میں بھی شارحین کے خیالات میں تنوع ہے: شیخ نورالحقؒ دہلوی (شارح فارسی صاحب تیسیر القاری) نے تو یہ فرمادیا کہ یہ ترجمۃ الباب کا جز ہے، ترجمۃ الباب کی دلیل نہیں ہے، مطلب یہ ہوا کہ جس طرح ''الصلوۃ فی مسجد السوق'' کو حضرت ابوہریرہ کی روایت سے ثابت کیا، اسی طرح ابن عون کا یہ عمل کہ انھوں نے گھر کی مسجد میں نماز پڑھی یہ بھی روایت سے ثابت ہے، کیوں کہ روایت میں آتا ہے، کہ گھر کی اور بازار کی نماز سے مسجد کی جماعت کی نماز میں ۲۵/ گنا ثواب زائد ہوتا ہے، معلوم ہوا کہ عذر شرعی کی بنیاد پر گھر میں نماز پڑھے تو نماز ہوجائے گی، ثواب کم ہوجائے گا، جیسا کہ ابن عون نے گھر کی مسجد میں نماز پڑھی۔

حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے ترجمہ کا مقصد یہ مقرر فرمایا تھا کہ بازار کی غیر شرعی مسجد میں نماز کا جواز بیان کرنا چاہتے ہیں، اور ابن عون کے اثر کی مناسبت یہ ہے کہ انھوں نے مسجد شرعی کے علاوہ دوسری جگہ نماز پڑھی، اس لیے بازار کی نماز کا تو ثبوت نہیں ہوا، لیکن مسجد شرعی کے علاوہ دوسری جگہ پڑھنے کا جواز تو معلوم ہوا، اور چوں کہ یہ بھی مسجد ہی تھی، اس لیے کوئی اشکال کی بات نہیں۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ مناسبت تو بہت معقول ہے، امام بخاری تو اس سے بھی معمولی نسبت پر تعلیقات ذکر کرنے کے عادی ہیں۔

علامہ ابن حجرؒ نے امام بخاری کے ترجمۃ الباب کا مقصد یہ بیان کیا تھا کہ وہ بازار میں مسجد شرعی کا جواز بیان کرنا چاہتے ہیں، اس لیے وہ ابن عون کے اس اثر کو ذکر کرنے کا مطلب یہ سمجھ رہے ہیں کہ اندرون بازار کی مسجد میں نماز کے جواز پر یہ واہمہ ہوسکتا ہے کہ بازار میں بے ضرورت جانا چونکہ امر ممنوع ہے، تو کہیں اندرون بازار کی مسجد میں نماز بھی ممنوع نہ ہو، ابن عون کا اثر لاکر بتلادیا کہ کسی جگہ کا ممنوع ہونا نماز سے مانع نہیں، دیکھیے ابن عون نے گھر کی ایسی مسجد میں نماز

پڑھی جس کا دروازہ بند ہو جاتا تھا، گویا وہاں صرف مخصوص لوگ آ سکتے ہیں، دیگر حضرات کا آنا ممنوع تھا، لیکن اس مسجد میں بھی نماز جائز تھی، معلوم ہوا کہ جانے پر پابندی یا جانے کی ممانعت، جواز صلوۃ سے مانع نہیں ہے۔

پھر علامہ ابن حجرؒ نے علامہ کرمانی کی رائے نقل کی ہے کہ امام بخاری ابن عون کا اثر ذکر کر کے حنفیہ کی تردید کرنا چاہتے ہیں، اس لیے کہ احناف کے یہاں مسجد شرعی بنانے کے لیے عام اجازت کا ہونا شرط ہے، عام اجازت نہ ہو تو مسجد شرعی نہیں بنتی، پھر کرمانی کی رائے پر تبصرہ کرتے ہیں کہ حنفیہ کی کتابوں میں حرام ہونے کا ذکر نہیں کراہت کا ہے، گویا وہ اس بات سے متفق ہیں کہ عام اجازت کے بغیر کراہت کی رائے رکھنے کے سبب، ابن عون کا یہ اثر حنفیہ کی تردید ہے، لیکن یہ ان کا مسلک احناف سے ناواقفیت کی دلیل ہے، کیوں کہ ہمارے یہاں گھر اور مسجد کا راستہ مشترک اور ایک ہو اور دروازہ بند کرنے سے مسجد اور گھر دونوں بند ہو جاتے ہوں تب تو مسجد، مسجد شرعی نہیں ہو سکتی، لیکن اگر کوئی گھیر یا احاطہ ہو جس میں گھر بھی ہو اور مسجد بھی، گھر کا راستہ الگ ہو اور مسجد کا الگ، البتہ احاطہ کا پھاٹک بند کرنے سے مسجد اور گھر دونوں بند ہو جاتے ہوں، تو یہ صورت مسجد کی شرعی حیثیت پر اثر انداز نہیں ہوتی، ابن عون نے اگر گھر کی ایسی مسجد میں نماز پڑھی ہے جس کا دروازہ علیحدہ تھا، جسے فقہ کی اصطلاح میں کہتے ہیں "مفرز" تھا تو اس سے حنفیہ کی تردید کا مضمون نکالنا خیال خام ہے۔

ہم تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ بخاری ابن عون کا اثر ذکر کر کے یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ جس طرح بازار کی مسجد میں نماز، محلہ کی مسجد کے برابر ثواب رکھتی ہے، اسی طرح اگر مسجد دار کے اندر ہو مگر شرعی ہو، تو اس میں بھی ثواب کا یہی تناسب ہے، رہا دروازہ کا بند ہونا تو اگر یہ احاطہ کا پھاٹک ہے تو اس کا بند ہونا مسجد کے شرعی ہونے کے لیے مانع نہیں ہے۔ اور اگر واقعی اس کا راستہ علیحدہ نہیں تھا، تو اس سے معلوم ہوا کہ وہ مسجد شرعی نہیں تھی، یعنی مسجد کی جماعت کا ثواب تو اس میں نہ ہوگا، لیکن نماز با جماعت کا ثواب ضرور ملے گا۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** حدیث پاک میں یہ ہے کہ مسجد شرعی میں جماعت کی نماز، گھر کی انفرادی اور بازار کی انفرادی نماز سے پچیس گنا زائد ثواب رکھتی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ جب ایک انسان پورے آداب کی رعایت کے ساتھ اچھی طرح وضو کر کے محض نماز جیسی پاکیزہ عبادت کی خاطر مسجد کے لیے گھر سے نکلتا ہے تو پروردگار عالم ہر قدم پر اس کے گناہ معاف کرتا ہے، ہر قدم پر درجات میں ترقی عطا فرماتا ہے، پھر مسجد میں پہنچتا ہے تو نماز کے انتظار میں بھی اس کو نماز ہی کا ثواب ملتا رہتا ہے۔ اور نماز سے فراغت کے بعد بھی جب تک حدث لاحق نہ ہو اس وقت تک فرشتے برابر اس کے لیے مغفرت اور رحمت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں، اس سبب سے اس کی مسجد کی نماز با جماعت کا ثواب گھر اور بازار کی انفرادی نماز سے پچیس گنا زائد ہے۔

ترجمۃ الباب سے تو اس کا یہ تعلق ہے کہ گھر اور بازار کی انفرادی نماز کو صحیح قرار دیا گیا ہے، یعنی اگر عذر ہو اور ایک شخص ان مقامات پر نماز پڑھ لے تو نماز ہو جائے گی، البتہ ثواب کم ہوگا، دوسرے یہ کہ مسجد شرعی محلہ میں واقع ہو یا بازار

میں ہر صورت میں ثواب ۲۵/ گنا زائد ہے، امام بخاری کا ترجمۃ الباب ثابت ہوگیا کہ بازار میں نماز بھی صحیح ہے اور بازار میں مسجد ہو تو اس کا ثواب بھی مسجد محلہ کے برابر ہے۔

## ثواب کے مضاعف ہونے کی وجہ

روایت میں یہ آیا ہے کہ مسجد شرعی میں نماز با جماعت کا اجر پچیس گنا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ گھر وضو کر کے جانے پر ہر قدم حط سیئات اور رفع درجات کا ذریعہ بنتا ہے، اور مسجد میں رہنا نماز میں شرکت کے مرادف اور فرشتوں کی دعاؤں کا سبب ہے، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ثواب کے اضافہ میں مسجد کی جماعت اصل موثر ہے، یا یہ بیان کردہ اسباب؟ بعض حضرات نے اس روایت کے ساتھ یہ سوال پیدا کیا، اور پھر یہ کہا کہ جب روایت میں ثواب کے اضافہ کے لیے ان اسباب کو بیان کیا گیا ہے، تو یہ وہ مضبوط علت ہے، جسے اصطلاح میں علت منصوصہ کہتے ہیں اور اس سے صرف نظر کر کے حکم لگانا درست نہیں، اس لیے جس جماعت کی شرکت میں مذکورہ بالا چیزوں کی رعایت کی گئی ہو کہ گھر سے وضو کر کے چلے، مسجد میں جا کر انتظار کرے، نماز سے فراغت کے بعد بیٹھا رہے، اس پر یہ ثواب مرتب ہونا چاہئے؛ لیکن متعدد روایات میں انفرادی نماز کے مقابلہ پر جماعت کی نماز کا یہ ثواب ان اسباب کے بغیر مذکور ہے، خود بخاری ہی میں حضرت ابن عمر کی روایت میں ۲۵/ گنا اور حضرت ابو سعید خدری کی روایت میں ۲۷/ گنا ثواب کا ذکر ہے: "عن ابی سعید انه سمع النبی ﷺ یقول صلوۃ الجماعة تفضل صلوۃ الفذ بخمس وعشرین درجة" (بخاری ص: ۸۹/ ج: ۱) حضرت ابو سعیدؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا کہ جماعت کی نماز منفرد کی نماز پر پچیس گنا فضیلت رکھتی ہے۔

اس لئے ان حضرات کی رائے یہ ہے کہ اس مطلق روایت کو بھی مقید کر دیا جائے، لیکن یہ رائے معقول نہیں ہے، ہم تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ جماعت ہی اجر کے اضافہ میں اصل موثر ہے اور جن روایات میں انفرادی نماز کے مقابلہ پر جماعت کی نماز کی فضیلت بلا کسی قید کے ذکر کی گئی ہے، وہی اصل ہیں اور جن روایات میں اجر کے اضافہ کے لیے ان اسباب کو شمار کیا گیا ہے، ان کا مفہوم یہ ہے کہ مقصود بالذات تو نماز با جماعت ہے اور اس پر ثواب پچیس گنا کر دیا جاتا ہے، اور اس اجر و ثواب کی وجہ سمجھنا چاہو تو اس پر غور کرلو کہ پروردگار نے اس اہم عبادت کے لیے جانے والے کے ہر قدم پر نیکی مرحمت کی ہے، انتظار کو نماز میں شمار فرمایا ہے، فرشتوں کی دعاؤں کا مستحق گردانا ہے، تو جس چیز کے متعلقات کی یہ شان ہے خود اس چیز کے ثواب کا کیا درجہ ہوگا؟ گویا ہمارے نزدیک یہ بیان کردہ اسباب اضافہ اجر کی علت منصوصہ نہیں ہیں، بلکہ اضافۂ اجر کی وضاحت ہیں کہ یہ اتنی اہم عبادت ہے کہ اس کے متعلقات کو بھی خداوند رحمٰن و رحیم نے ترقی درجات، حط سیئات، مغفرت ذنوب، وغیرہ کا ذریعہ بنا دیا ہے، جیسے مثلاً جہاد کے بارے میں ہے کہ اصل جہاد تو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کفار کے مقابل ہوتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلقات پر بھی ثواب کا وعدہ فرمایا ہے کہ مجاہد جب سے گھر سے نکلتا

ہے تاواپسی اس کو فی سبیل اللہ شمار کیا جاتا ہے اور قدم قدم پر حط سیئات اور رفع درجات کی بشارت دی جاتی ہے وغیرہ، رہا ثواب کا ۲۵/ گنا یا ۲۷/ گنا کیا جانا، تو یہ بحث اپنی جگہ یعنی ابواب جماعت میں انشاء اللہ ذکر کی جائے گی۔

## [۸۸] بَابُ تَشْبِيْكِ الْاَصَابِعِ فِى الْمَسْجِدِ وَغَيْرِهٖ

(۴۷۸،۴۷۹) حَدَّثَنَا حَامِدُ بْنُ عُمَرَ عَنْ بِشْرٍ نَا عَاصِمٌ نَا وَاقِدٌ عَنْ اَبِيْهِ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَوِ ابْنِ عَمْرٍو قَالَ شَبَّكَ النَّبِىُّ ﷺ اَصَابِعَهٗ. (آئندہ:۴۸۰)

(۴۸۰) وَقَالَ عَاصِمُ ابْنُ عَلِيٍّ نَا عَاصِمُ بْنُ مُحَمَّدٍ قَالَ سَمِعْتُ هٰذَا الْحَدِيْثَ مِنْ اَبِىْ فَقَوَّمَهٗ لِىْ وَاقِدٌ عَنْ اَبِيْهِ قَالَ سَمِعْتُ اَبِىْ وَهُوَ يَقُوْلُ قَالَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عَمْرٍو قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَا عَبْدَ اللهِ ابْنَ عَمْرٍو! كَيْفَ بِكَ اِذَا بَقِيْتَ فِىْ حُثَالَةٍ مِّنَ النَّاسِ بِهٰذَا . (گذشتہ:۴۷۹)

**ترجمہ** باب، مسجد اور غیر مسجد میں انگلیوں کو قینچی کرنے (یعنی انگلیوں میں انگلیاں ڈالنے) کا بیان۔ حامد بن عمر، بشر بن المفضل سے روایت کرتے ہیں کہ ہم سے عاصم بن محمد نے بیان کیا کہ ہم سے واقد بن محمد نے اپنے والد محمد بن زید سے روایت کیا کہ ان سے حضرت عبداللہ بن عمر یا عبداللہ بن عمرو بن العاص نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلیوں کو قینچی کیا۔ عاصم بن علی کہتے ہیں کہ ہم سے عاصم بن محمد نے بیان کیا کہ میں نے یہ حدیث اپنے والد محمد بن زید سے سنی، پھر وہ مجھے محفوظ نہ رہی، میرے بھائی واقد بن محمد نے اس کو اپنے والد سے ٹھیک ٹھیک اور صحیح طریقہ پر بیان کیا کہ وہ یہ فرماتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے عبداللہ بن عمرو! اس وقت تیرا کیا حال ہوگا جب تو کوڑا کرکٹ جیسے انسانوں کے درمیان باقی رہ جائے گا، پھر یہ حدیث بیان کی۔

**مقصد ترجمہ** تشبیک یعنی انگلیوں میں انگلیاں ڈالنا، جسے اردو میں انگلیوں میں قینچی کرنا یا انگلیوں کا جال بنانا کہتے ہیں، اس سے بعض روایات میں ممانعت آئی ہے، حضرت کعب بن عجرہ سے ترمذی اور ابو داؤد میں روایت موجود ہے: "ان رسول اللہ ﷺ قال اذا توضا احدکم فاحسن وضوءہ ثم خرج عامداً الی المسجد فلا یشبکن بین اصابعہ فانہ فی صلوۃ" (ترمذی ص:۵۱/ ج:۱) کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں کوئی جب وضو کرتا ہے اور اچھی طرح وضو کرتا ہے، پھر مسجد کے ارادے سے نکلتا ہے تو وہ انگلیوں کو قینچی نہ کرے کیوں کہ وہ نماز کے اندر ہے۔

بلکہ بعض روایات میں "فانّ التشبیک من الشیطان" کے الفاظ ہیں کہ تشبیک کا عمل شیطان کے اثر سے ہوتا ہے، پھر یہ کہ اہل عرب کے نزدیک انگلیوں میں جال ڈالنے کا عمل خصومت اور لڑائی کے موقع پر کیا جاتا تھا، یا پھر بے کاری اور سستی کے موقع پر انسان اسطرح کی حرکت کرتا ہے، روایت میں مذکور ممانعت اور ان دیگر وجوہ کی بنیاد پر یہ خیال ہوسکتا ہے کہ شاید یہ

کام بہر صورت بالخصوص مسجد میں درست نہ ہوگا، چنانچہ امام مالکؒ سے نماز میں انگلیوں میں جال ڈالنے کی کراہت منقول ہے، اور حضرت ابن عمرؓ اور سالمؒ سے مصنف ابن ابی شیبہ میں نماز کے دوران، انگلیوں میں جال ڈالنے کا عمل منقول ہے۔

امام بخاریؒ ترجمۃ الباب میں فیصلہ کرتے ہیں کہ تشبیک اگر نماز کی حالت میں ہو، یا خصومت کے مظاہرہ کے لیے ہو، یا فعل عبث کے طور پر ہو تو اس کی اجازت نہیں ہے، بلکہ اس کو ممنوع قرار دیا جائے گا، لیکن اگر کسی صحیح مقصد کے لیے ہو جیسے متعدد روایات میں مختلف مقاصد کے لیے رسول اللہ ﷺ کا عمل نقل کیا گیا ہے، تو یہ تشبیک مسجد اور غیر مسجد دونوں میں درست ہے، ایک روایت میں تشبیک کا عمل تفہیم کے لیے تمثیل کے طور پر معنویات کو محسوسات میں تبدیل کرنے کے لیے کیا گیا ہے اور ایک روایت میں گہرے غور وفکر کی بنیاد پر بے اختیار صادر ہو گیا ہے، تو ظاہر ہے کہ اس میں مضائقہ نہیں ہے۔

**تشریح حدیث اول** یہ روایت بخاری کے تمام نسخوں میں نہیں ہے، لیکن ہمارے ہندوستانی نسخوں میں یہ بخاری کے شاگرد فربری اور حماد بن شاکر سے ابو مسیح کی نقل کے مطابق ہے، جس کو ابو مسعود دمشقی نے اپنی کتاب ''الاطراف'' میں ذکر کیا ہے، واقد اپنے والد محمد بن زید سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے عبداللہ بن عمرؓ، یا عبداللہ بن عمرو بن العاص سے روایت کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی انگلیوں کا جال بنایا، ابن عمر یا ابن عمرو کے بارے میں یہ شک غالباً واقد کو ہوا، پھر امام بخاری نے اس شک کو ختم کرنے کے لیے نیز یہ ابہام دور کرنے کے لیے کہ آپؐ نے تشبیک کیوں کی تھی؟ ایک تعلیق ذکر کی کہ عاصم بن علی نے یہ بیان کیا کہ عاصم بن محمد نے یہ بتلایا کہ انھوں نے یہ روایت اپنے والد محمد بن زید سے سنی تھی، لیکن وہ یاد نہ رہی، پھر اس کے بعد ان کے بھائی واقد بن محمد نے ٹھیک طریقہ پر محمد بن زید ہی سے یہ روایت بیان کی کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ اے عبداللہ! اس وقت تم کیا کرو گے جب تم ایسے لوگوں کے درمیان رہ جاؤ گے جو بالکل حثالہ (یعنی پھٹکن اور کوڑے کی طرح) ہوں گے۔

یہ تعلیق امام بخاری اپنے استاذ عاصم بن علی سے نقل کر رہے ہیں، امام بخاری اگر اپنے شیوخ سے صیغۂ حدثنا کے بجائے قال کے ساتھ نقل کریں تو اس کو شارحین تعلیق کہتے ہیں، کیوں کہ جو روایات امام بخارری نے اپنے شیوخ سے تحدیث کے عام طریقہ کے مطابق حاصل نہیں کی ہیں، بلکہ انھیں مذاکرہ یا عرض یا مناولہ کے طور پر حاصل ہوئی ہیں، وہ ان روایات کو ''حدثنا'' کے بجائے ''قال'' کہہ کر ذکر کرتے ہیں اور شارحین اس کو تعلیق قرار دیتے ہیں، یہ حدیث پاک کے بیان میں ان کی مکمل احتیاط کی بات ہے۔

اس تعلیق سے دونوں باتیں معلوم ہو گئیں: ایک تو یہ کہ واقد کی جانب سے صحابی کے نام کے بارے میں جو شک تھا وہ ختم ہو گیا، معلوم ہو گیا کہ یہ روایت حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے ہے، ابن عمر سے نہیں، دوسرے یہ کہ تشبیک

کی وجہ معلوم ہوگئی کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مضمون کو سمجھانے کے لیے تمثیل کے طور پر انگلیوں کو انگلیوں میں داخل کیا تھا، یہ روایت حمیدی کی کتاب "الجمع بین الصحیحین" میں ان الفاظ کے ساتھ نقل کی گئی ہے اور بخاری کے متداول حاشیہ میں بحوالہ عینی مذکور ہے: "قال کیف انت یا عبداللہ ! اذا بقیت فی حثالةٍ من الناس قد مرجت عھودھم وأماناتھم واختلفوا فصاروا ھکذا وشبك بین اصابعه قال فکیف افعل یارسول اللہ ! قال تاخذ ما تعرف وتدع ماتنکر وتقبل علیٰ خاصتك وتدعھم وعوامھم" (عمدۃ القاری ص ۲۶۰ / ج ۱)۔

حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے عبداللہ! اس وقت تم کیا کرو گے جب ایسے ردی اور بے کار لوگوں کے درمیان رہ جاؤ گے کہ ان کے عہد و پیمان اور ان کی امانتیں تباہ ہو چکی ہونگی اور ان میں اختلاف رونما ہو چکا ہوگا اور وہ اس طرح ہو گئے ہوں گے اور اس طرح کی وضاحت کے لیے آپ نے اپنی انگلیوں کا جال بنا کر دکھایا۔ ابن عمر نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مجھے کیا کرنا چاہیے؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ دین میں جو چیزیں معروف ہیں انھیں اختیار کرنا، منکر کو چھوڑ دینا، اپنی امت کے خواص کے دامن سے وابستہ رہنا، عوام سے کنارہ کر لینا۔

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آپ ﷺ نے انگلیوں میں انگلیاں اس لیے ڈالی تھیں کہ آپ ﷺ آنے والے خراب زمانے میں لوگوں کے باہمی اختلاط اور زمانہ کی گڑبڑ اور اچھے برے کی تمیز ختم ہو جانے کی منظر کشی کر کے مضمون کو سمجھانا چاہتے تھے اس سے ثابت ہوا کہ تشبیک کا منشاء تعلیم و تفہیم ہو تو مسجد اور خارج مسجد دونوں میں اس کا جواز ہے، روایت کا مضمون عصر حاضر کے مسلمانوں کے لیے رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے کہ جب صورت حال اتنی ابتر ہو جائے کہ عہد و پیمان کی پابندی اور امانت و دیانت کی پاسداری معاشرے سے رخصت ہو جائے اور لوگ باہمی اختلافات کا شکار ہو کر اچھے برے کی تمیز کھو دیں، تو اس صورت حال میں رسول اللہ ﷺ کی ہدایت یہ ہے کہ دین میں جو چیزیں معروف اور نیکی کی حیثیت رکھتی ہیں مضبوطی کے ساتھ ان پر عمل کیا جائے اور منکرات اور برائیوں سے بچنے کی کوشش کی جائے اور یہ کہ عوام سے دامن بچا کر خواص سے وابستگی اختیار کی جائے اور ظاہر ہے کہ خواص سے مراد متبع سنت، اولیاء امت اور وہ علماء کرام ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے نقش قدم پر چلتے ہیں اور دنیا پر آخرت کو ترجیح دیتے ہیں، اللہ تمام مسلمانوں کو اس زریں نصیحت پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

یہ روایت الفاظ کے قدرے تغیر کے ساتھ ابن ماجہ میں "باب مایکرہ من الفتن" (ص: ۲۹۳/ یر) اور ابوداؤد کتاب الملاحم "باب الامر والنھی" کے تحت (ص: ۲۴۱/ ج: ۱) پر اور مسند احمد بن حنبل میں (ص: ۱۶۲/ ۲۲۰/ ج: ۲) پر بھی مذکور ہے۔

(۴۸۱) حَدَّثَنَا خَلَّادُ بْنُ يَحْيٰى قَالَ نَا سُفْيٰنُ عَنْ اَبِىْ بُرْدَةَ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ بُرْدَةَ عَنْ جَدِّهٖ عَنْ اَبِىْ مُوْسٰى عَنِ النَّبِىِّ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ اِنَّ الْمُؤْمِنَ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضاً وَشَبَّكَ اَصَابِعَهٗ. (آئندہ: ۲۴۴۶، ۶۰۲۶)

**ترجمہ** حضرت ابوموسی اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ مومن، مومن کے لیے ایک عمارت کی طرح ہوتا ہے کہ اس کا ایک حصہ، اس کے دوسرے حصہ کو قوت پہنچاتا ہے اور (یہ مضمون سمجھانے کے لیے) آپ ﷺ نے اپنی انگلیوں کا جال بنایا۔

**تشریح حدیث دوم** حدیث پاک کا مضمون یہ ہے کہ تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی کی طرح رہنا چاہئے، ہر مسلمان، دوسرے مسلمان کے لیے زور بازو اور پشت پناہ ہونا چاہئے، وہ سب آپس میں شیر و شکر ہو کر رہیں، جیسے تعمیر ہوتی ہے، تعمیر سے پہلے جب اینٹیں الگ الگ تھیں، تو ان سے کوئی خاص فائدہ نہیں تھا، انھیں دیوار کی صورت میں تبدیل کیا گیا تو ایک خاص انداز اور ترتیب سے انھیں جوڑا گیا، دیوار جب بناتے ہیں، تو ایک اینٹ کو دوسرے اینٹ پر اوپر نیچے یوں ہی نہیں رکھتے، بلکہ دوسرا ردا رکھتے وقت معمار یہ خیال رکھتا ہے کہ ہر اینٹ پہلی اینٹ کے آدھے حصے پر آئے تاکہ اندرون تعمیر کہیں خلا باقی نہ رہے اور دیوار مستحکم ہو جائے، پھر جب ایک دیوار کو دوسری دیوار سے ملاتے ہیں تو دڑا ملانے کی طرف پوری توجہ کی جاتی ہے، تاکہ تمام دیواریں ایک دوسرے سے مدغم ہو جائیں، اگر دیواریں الگ الگ ہوں گی تو تعمیر کمزور رہ جائے گی، گویا تعمیر میں اس کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے کہ اس کی ہر چیز ایک دوسرے سے پیوست رہے، تاکہ اس اتحاد تام سے استحکام پیدا ہو جائے، آپ نے اس مثال کے استحکام کو انگلیوں میں تشبیک دے کر اور ذہن نشین فرما دیا کہ جس طرح انگلیاں ایک دوسرے میں مدغم ہو کر یکجان ہو جاتی ہیں اور تمام انگلیوں کی قوت یکجا ہو کر بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، اسی طرح ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان کے لیے قوت دست اور پشت پناہ ہونا چاہئے۔

امام بخاری کے ترجمۃ الباب کا ثبوت واضح ہے کہ آپ نے ایک معنوی چیز کو مخصوص انداز میں ذہن نشین کرنے کے لیے مسجد کے اندر تشبیک کا عمل کیا، معلوم ہوا کہ مقصد تعلیم وتفہیم ہو تو مسجد کے اندر اور باہر اس کی گنجائش ہی نہیں؛ بلکہ یہ ایک امر مستحسن ہے۔ واللہ اعلم

(۴۸۲) حَدَّثَنَا اِسْحَاقُ قَالَ نَا ابْنُ شُمَيْلٍ قَالَ اَنَا ابْنُ عَوْنٍ عَنِ ابْنِ سِيْرِيْنَ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ صَلّٰى بِنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِحْدٰى صَلٰوتَيِ الْعَشِيِّ قَالَ ابْنُ سِيْرِيْنَ قَدْ سَمَّاهَا اَبُوْ هُرَيْرَةَ وَلٰكِنْ نَسِيْتُ اَنَا قَالَ فَصَلّٰى بِنَا رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ سَلَّمَ فَقَامَ اِلٰى خَشَبَةٍ مَعْرُوْضَةٍ فِى الْمَسْجِدِ فَاتَّكَأَ عَلَيْهَا كَاَنَّهٗ غَضْبَانُ وَوَضَعَ يَدَهُ الْيُمْنٰى عَلَى الْيُسْرٰى وَشَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ وَوَضَعَ خَدَّهُ الْاَيْمَنَ عَلٰى ظَهْرِ كَفِّهِ الْيُسْرٰى وَخَرَجَتِ السَّرْعَانُ مِنْ اَبْوَابِ الْمَسْجِدِ فَقَالُوْا قُصِرَتِ الصَّلٰوةُ وَفِى الْقَوْمِ اَبُوْبَكْرٍ وَعُمَرُ فَهَابَاهُ اَنْ يُكَلِّمَاهُ وَفِى الْقَوْمِ رَجُلٌ فِىْ يَدَيْهِ طُوْلٌ يُقَالُ لَهٗ ذُو الْيَدَيْنِ قَالَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! اَنَسِيْتَ اَمْ قُصِرَتِ الصَّلٰوةُ؟ قَالَ لَمْ اَنْسَ وَلَمْ تُقْصَرْ فَقَالَ اَكَمَا يَقُوْلُ ذُو الْيَدَيْنِ فَقَالُوْا نَعَمْ فَتَقَدَّمَ فَصَلّٰى مَا تَرَكَ ثُمَّ سَلَّمَ ثُمَّ كَبَّرَ وَسَجَدَ مِثْلَ

سُجُوْدِہٖ اَوْ اَطْوَلَ ثُمَّ رَفَعَ رَاْسَهٗ وَكَبَّرَ ثُمَّ كَبَّرَ وَسَجَدَ مِثْلَ سُجُوْدِہٖ اَوْ اَطْوَلَ ثُمَّ رَفَعَ رَاْسَهٗ وَكَبَّرَ فَرُبَّمَا سَاَلُوْهُ ثُمَّ سَلَّمَ فَيَقُوْلُ نُبِّئْتُ اَنَّ عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ قَالَ ثُمَّ سَلَّمَ.

(آئندہ: ۷۱۴، ۷۱۵، ۱۲۲۷، ۱۲۲۹، ۶۰۵۱، ۷۲۵۰)

**ترجمہ** حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے شام کی دو نمازوں (ظہر اور عصر) میں سے ایک نماز پڑھائی، ابن سیرین کہتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہ نے تو نماز کو متعین فرمایا تھا، لیکن میں بھول گیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ آپ نے ہمیں دو رکعتیں پڑھائیں، اور سلام پھیر دیا، پھر مسجد میں پڑی ہوئی ایک لکڑی کی جانب تشریف لے گئے اور اس سے ٹیک لگا کر اس طرح کھڑے ہو گئے جیسے آپ غضبناک ہوں اور آپ نے اپنا داہنا ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھا اور انگلیوں کا جال بنایا اور اپنے داہنے رخسار مبارک کو بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ لیا اور عجلت پسند لوگ مسجد کے دروازوں سے باہر نکل گئے، پھر لوگوں نے آپس میں یہ گفتگو کی کہ کیا نماز میں کمی ہو گئی ہے؟ اور لوگوں میں حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی تھے، مگر ان دونوں پر رسول اللہ ﷺ سے گفتگو کرنے میں ہیبت مانع رہی، انھی لوگوں میں ایک شخص تھے جن کے دونوں ہاتھ کچھ لمبے تھے، جنھیں ذو الیدین کہا جاتا تھا انھوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! کیا آپ بھول گئے ہیں یا نماز میں کمی کر دی گئی ہے؟ آپ نے فرمایا کہ نہ میں بھولا ہوں اور نہ نماز میں کمی ہوئی ہے، پھر آپ نے لوگوں سے پوچھا، کیا ایسا ہی ہوا ہے جو ذو الیدین کہتے ہیں؟ صحابہ کرام نے عرض کیا، جی ہاں! یہ معلوم کر کے آپ آگے بڑھے اور جو رکعتیں باقی رہ گئی تھیں وہ پڑھیں، پھر سلام پھیرا، پھر اللہ اکبر کہا اور عام سجدہ کی طرح یا اس سے کچھ طویل سجدہ کیا، پھر سر اٹھایا اور اللہ اکبر کہا، پھر اللہ اکبر کہا اور عام سجدہ کی طرح یا اس سے کچھ طویل سجدہ کیا، پھر سر اٹھایا اور اللہ اکبر کہا، لوگوں نے ابن سیرین سے پوچھا کہ پھر سلام پھیرا یا نہیں؟ تو ابن سیرین نے کہا کہ مجھے یہ خبر دی گئی ہے کہ حضرت عمران بن حصین نے فرمایا کہ پھر آپ نے سلام پھیرا۔

**تشریح حدیث سوم** یہ اس باب کی تیسری روایت ہے، حضرت ابو ہریرہؓ بیان فرماتے ہیں کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ظہر یا عصر کی چار رکعت والی نماز میں دو رکعت پر سلام پھیر دیا اور اس کے بعد مسجد کے اندر عرض میں پڑی ہوئی ایک لکڑی کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے، چہرۂ مبارک سے غصہ کے آثار نمایاں تھے، اس تفکر کی حالت میں دو عمل آپ سے صادر ہوئے، بہ ظاہر یہ دونوں عمل الگ الگ ہیں، ایک یہ کہ آپ نے داہنے ہاتھ کو بائیں ہاتھ پر رکھا اور انگلیوں کا جال بنایا، تشبیک کا یہ عمل ختم ہوا تو داہنے رخسار کو بائیں ہاتھ کی پشت پر رکھ کر خشبۂ معروضہ کے سہارے کھڑے ہو گئے، یہ سب کیفیات اس لیے ظاہر ہو رہی ہیں کہ نماز میں قبل از وقت سلام پھیر دیا گیا تھا اور اگرچہ حضور پاک ﷺ نماز کو تمام سمجھ رہے تھے، لیکن اس کے باوجود اندرونی طور پر ایک احساس پیدا ہوا اور غیر اختیاری طور پر مختلف کیفیات کا ظہور ہونے لگا، کبھی انگلیوں میں تشبیک فرما رہے ہیں، کبھی خشبۂ معروضہ کے سہارے کھڑے ہیں

اور رخسار مبارک کو ہاتھ پر رکھے ہوئے ہیں وغیرہ، اسی کے ساتھ چہرۂ مبارک پر جلال کے آثار نمایاں ہیں، صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ جیسے سمجھدار اور مزاج شناس اس انداز کو دیکھ کر کچھ عرض کرنے کی ہمت نہیں کر رہے ہیں اور جو جلد بازی کے خوگر ہیں وہ مسجد سے باہر جانے لگے ہیں، شاید ان لوگوں نے یہ خیال کیا ہوگا کہ نماز میں کمی کر دی گئی ہے، اسی دوران جماعت میں شریک ایک صحابی آگے بڑھے، ان کے ہاتھوں میں طول تھا اور اسی وجہ سے ان کو ذوالشمالین کہتے تھے، لیکن ذوالشمال میں چونکہ بدفالی ہے اس لیے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے ان کا لقب، ذوالشمالین سے بدل کر ذوالیدین کر دیا تھا، یہ صحابی آگے بڑھے اور عرض کیا کہ آپ بھول گئے ہیں یا نماز کی رکعتوں میں کمی کر دی گئی ہے؟ چونکہ رکعتوں میں بھی کمی نہیں ہوئی تھی اور نہ آپ کو اپنے بھول جانے کا علم تھا؛ اس لیے آپ نے دونوں باتوں سے انکار فرمایا اور کہا کہ کچھ نہیں ہوا، اب ذوالیدین کو یقین ہو گیا کہ قصر تو ہوا نہیں ہے لیکن نسیان ہوا ہے، مگر صورت حال یہ ہے کہ نسیان کا بھی نسیان ہو رہا ہے، اس لیے انھوں نے یقین کے ساتھ عرض کیا کہ کچھ تو ضرور ہوا ہے، اس کے بعد آپ نے حاضرین سے معلوم کیا ''أصدق ذوالیدین؟'' کیا ذوالیدین صحیح کہتے ہیں؟ جواب ملا جی ہاں! جب تصدیق ہوگئی تو پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام مصلی پر تشریف لے گئے اور باقی ماندہ نماز کی رکعتیں ادا کیں، سلام پھیرا اور اس کے بعد سہو کے دو سجدے کیے اور پھر سلام پھیر دیا۔

امام بخاری یہاں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے اندرونی تفکرات اور ذہنی غور وفکر کے سبب، بے اختیار مسجد کے اندر تشبیک کا عمل کیا، پہلی دو روایتوں سے معلوم ہوا تھا کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے معنوی حقائق کو سمجھانے کے لیے تمثیل کے طور پر تشبیک کا عمل کیا تھا، بخاری کا مدعا ثابت ہو گیا کہ ضرورت ہو تو یہ عمل مسجد اور بیرون مسجد دونوں میں درست ہے۔

**نماز میں کلام کا مسئلہ** امام بخاری یہاں کلام کے مسئلہ سے بحث نہیں کر رہے ہیں، اس کے لیے وہ آگے مستقل ترجمہ "باب ماینھی من الکلام في الصلوة" (ص ۱۶۰/ ج ۱) منعقد کریں گے، وہیں معلوم ہوگا کہ امام بخاریؒ کا رجحان اس مسئلہ میں کیا ہے؟ اسی موقع پر اس مسئلہ میں فریقین کے دلائل اور ان سے بحث کرنا مناسب ہوگا، لیکن چونکہ ذوالیدین ہی کی روایت نماز میں کلام کی اجازت دینے والوں کا مستدل ہے اور یہ روایت بخاری وہاں ذکر نہیں کریں گے، اس لیے اسی موقع پر کچھ بیان کر دینا مناسب ہے۔

احناف کا مذہب یہ ہے کہ نماز میں کسی بھی طرح کے کلام کی اجازت نہیں، کلام عمداً ہو یا ناسیاً، اصلاح صلوۃ سے متعلق ہو یا غیر متعلق، ہر صورت میں ممنوع اور مفسد صلوۃ ہے، امام شافعیؒ کے یہاں کلام سہواً ہو اور مختصر ہو تو مفسد صلوۃ نہیں ہے، امام مالک سے ایک روایت میں اور امام اوزاعی سے منقول ہے کہ کلام اصلاح صلوۃ کے لیے ہو تو اس کی گنجائش ہے اور مفسد صلوۃ نہیں، امام احمدؒ سے کئی روایتیں ہیں جن میں کلام کی بعض صورتیں مفسد صلوۃ نہیں ہیں۔

ان تمام حضرات کا مستدل حضرت ذوالیدین کی یہی روایت ہے جس میں حضور پاک ﷺ نے دو رکعت پر سلام پھیر دیا تھا، پھر حضرت ذوالیدین کی عرض معروض اور سوال و جواب یعنی گفتگو کے بعد باقی ماندہ رکعتیں پڑھا کر سجدہ سہو کیا، معلوم ہوا کہ نماز میں گفتگو ہو سکتی ہے، اس مسئلہ میں بڑی طویل گفتگو کی گئی ہے اور ائمہ کے مسلک کی تشریح میں بھی تفصیلات ہیں، لیکن یہ چند باتیں سب کے نزدیک مسلم ہیں:

۱　یہ بات سب کے نزدیک تسلیم شدہ ہے کہ ابتداء میں نماز میں گفتگو اور سلام و کلام کی اجازت تھی۔

۲　یہ بات بھی مسلمات میں سے ہے کہ بعد میں یہ اجازت منسوخ ہوگئی۔

۳　یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ عمداً کلام کرنا سب کے نزدیک مفسد صلوۃ ہے۔

نماز میں گفتگو کی ممانعت کرنے والے یہ سمجھ رہے ہیں کہ حضرت ذوالیدین کی روایت اس زمانہ کی ہے، جب نماز میں گفتگو کی اجازت تھی، جب اجازت منسوخ ہوگئی تو حکم بدل گیا، اس لیے ذوالیدین کی روایت کلام فی الصلوۃ کے سلسلہ میں منسوخ ہے، غالباً بخاری بھی یہی سمجھ رہے ہیں کیوں کہ تشبیک کے ثبوت میں تو روایت پیش کر دی اور جب کلام فی الصلوۃ کا مسئلہ آئے گا تو وہاں زید بن ارقمؓ اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کی روایات لائیں گے جن میں ہر طرح کی ممانعت ہے۔

مگر نماز میں کلام کی کسی بھی صورت میں گنجائش دینے والے یہ سمجھ رہے ہیں کہ نماز میں کلام کی اجازت مکی زندگی میں تھی پھر منسوخ ہوگئی تھی اور حضرت ذوالیدینؓ کا واقعہ کلام فی الصلوۃ کی ممانعت کے بعد کا ہے، گویا ان حضرات کے یہاں نماز میں کلام کرنا تو ممنوع ہے، لیکن ممانعت کے بعد ہی چونکہ ذوالیدین کا واقعہ پیش آیا ہے، اس لیے جتنی بات ذوالیدین کے واقعہ سے ثابت ہے اتنی گفتگو کی اجازت ہے، اس لیے کسی کے یہاں اصلاح صلوۃ کے لیے کئے گئے کلام کی اجازت ہے، کسی کے یہاں مختصر اور سہواً کی اجازت ہے وغیرہ۔ ان فقہاء کا سارا زور استدلال اس بات پر صرف ہوتا ہے کہ نماز میں کلام کی اجازت اور اس کا منسوخ ہونا، یہ دونوں حکم بالکل ابتداء میں ثابت ہو جائیں اور حضرت ذوالیدین کی روایت کو جتنا بھی موخر کیا جا سکے اتنا ہی ان کے حق میں ہے، تاکہ یہ ثابت ہو سکے کہ ذوالیدین کی روایت سے ثابت ہونے والا حکم منسوخ نہیں ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ نماز میں سلام و کلام کی اجازت مکی زندگی میں تھی اور یہ اتنی پرانی بات ہے کہ ابن عمر جن کی پیدائش آپ کے اعلان نبوت سے ایک سال پہلے کی ہے ان کو بھی یاد نہیں ایک روایت میں ہے کہ ابن عمر نے حضرت بلالؓ یا حضرت صہیب سے معلوم کیا کہ نماز میں سلام کا جواب دینے کا کیا طریقہ تھا؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ اشارے سے جواب دیا جاتا تھا، معلوم ہوا کہ ابن عمر کے بالکل بچپن کی بات ہے کہ وہ قدیم الاسلام صحابہ کرام سے معلوم کر رہے ہیں، نیز یہ کہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم حبشہ سے واپس آئے تو سلام کی اجازت منسوخ ہو چکی تھی، جب کہ ابن مسعود کی حبشہ سے واپسی ۵ھ نبوت مکی زندگی میں ہوئی ہے، یہ تو ہوا

سلام وکلام کی اجازت اور اس کے منسوخ ہونے کا تقدم، اب رہے ذوالیدین کی روایت تو یہ حضرات کہتے ہیں کہ ذوالیدین کا واقعہ مدنی زندگی کا ہے اور مدنی زندگی میں بھی چونکہ حضرت ابو ہریرہ راوی ہیں جو ۷ھ میں اسلام لائے ہیں اور وہ کہہ رہے ہیں (صلّٰی بنا) کہ ہمیں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی اس کا مطلب یہ ہوا کہ ذوالیدین والے واقعہ میں حضرت ابو ہریرہؓ خود نماز میں شریک ہیں، اس لیے یہ واقعہ بہت بعد کا ہے۔ مگر حنفیہ کہتے ہیں کہ سلام وکلام کی اجازت مکی زندگی میں تو تھی ہی، مدنی زندگی کی ابتداء میں بھی یہ اجازت باقی تھی کیوں کہ حضرت زید بن ارقم جو مکہ معظمہ میں ہجرت سے پہلے گئے ہی نہیں اور وہ بھی حضرت ابن عمر ہی کے ہم عمر ہیں، وہ روایت کرتے ہیں: ”عن زيد بن ارقم انا كنا نتكلم في الصلوة على عهد النبي ﷺ يكلم احدنا صاحبه بحاجته حتى نزلت: حَافِظُوْا عَلَى الصَّلٰوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ فَاُمِرْنَا بِالسُّكُوْتِ“ (بخاری ص:۱۶۰/ ج:۱)

زید بن ارقم سے روایت ہے کہ ہم لوگ عہد رسالت میں نماز میں گفتگو کرلیا کرتے تھے، ہم میں سے کوئی بھی اپنے ساتھی سے ضرورت کی بات کر لیتا تھا یہاں تک کہ یہ آیت نازل ہوئی کہ سب نمازوں کی خصوصاً درمیانی نماز کی پابندی کرو اور ”قُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ“ اللہ کے سامنے عاجزی اور خاموشی کے ساتھ کھڑے رہو، چنانچہ اس کے بعد ہمیں خاموش رہنے کا حکم دے دیا گیا۔ (بخاری ص:۱۶۰/ ج:۱)

جب حضرت زید بن ارقمؓ نے نماز میں گفتگو کا زمانہ پایا تو یقیناً یہ اجازت مدنی زندگی کی ابتداء میں باقی تھی، اس لیے کہ مکی زندگی سے حضرت زید بن ارقمؓ کا کوئی تعلق نہیں رہا، اور اسی روایت سے طے ہوا کہ مدنی زندگی کی ابتداء میں ممانعت ہوئی، کیوں کہ یہ آیت بالاتفاق مدنی ہے، رہا ابن مسعود کا حبشہؓ سے واپسی کا معاملہ تو وہ بھی مدنی زندگی کی ابتداء کا واقعہ ہے، کیوں کہ ابن مسعودؓ ۵ نبوت میں حبشہ سے واپس آئے ضرور تھے، مگر چند روز قیام کر کے پھر حبشہ چلے گئے تھے، اور دوبارہ غزوۂ بدر کے موقع پر مدینہ طیبہ میں حاضر ہوئے تھے۔

نیز حنفیہ کہتے ہیں کہ حضرت ذوالیدین کی روایت میں خود اس کے مدینہ طیبہ کے ابتدائی زمانہ کا واقعہ ہونے کے دلائل موجود ہیں، کیوں کہ ذوالیدین غزوۂ بدر کے شہداء میں ہیں، معلوم ہوا کہ یہ واقعہ غزوۂ بدر سے پہلے کا ہے، دوسرے یہ کہ اس میں جس خشبۂ معروضہ کے سہارے کھڑے ہونے کا تذکرہ ہے حضرت علامہ کشمیری کی تحقیق کے مطابق وہ اسطوانۂ حنّانہ تھا، جس سے سہارا لے کر حضور ﷺ خطبہ دیا کرتے تھے، پھر جب منبر ۲ھ میں یا اس سے پہلے تیار کیا گیا تو اس کو ہٹا دیا گیا، حضرت علامہ کشمیریؒ کی تحقیق کے مطابق منبر ۲ھ میں یا اس سے پہلے تیار کیا گیا تھا اور اس کے لیے وہ مختلف روایتوں سے مختلف طور پر استدلال فرماتے تھے، جب کہ ابن حجر کی تحقیق کے مطابق منبر ۷ھ یا ۸ھ میں تیار ہوا ہے۔

حضرت ذوالیدین کے غزوۂ بدر میں شہید ہونے کے سلسلہ میں شوافع یہ کہتے ہیں کہ یہاں دو شخصیتیں

ہیں، ایک ذوالیدین اور دوسرے ذوالشمالین، ایک غزوۂ بدر میں شہید ہوئے تھے، لیکن دوسرے بعد تک حیات رہے، لیکن نسائی کی روایت میں یہ دونوں نام ایک ہی شخصیت کے ہیں، اس لیے حنفیہ کا یہ کہنا ہی صحیح ہے کہ یہ روایت غزوۂ بدر سے پہلے کی ہے، اور اس وقت کی ہے جب نماز میں گفتگو کی اجازت تھی، بعد میں یہ حکم منسوخ ہو گیا اور اب نماز میں کسی بھی طرح کی گفتگو کی اجازت نہیں ہے۔

رہا یہ جز کہ حضرت ابوہریرہؓ نے "صلی بنا" فرمایا جس کا بظاہر مفہوم یہ ہے کہ وہ خود اس نماز میں شریک تھے، تو اس کے لیے امام طحاویؒ نے "مشکل الآثار" میں اور جصاصؒ رازی نے "احکام القرآن" میں متعدد نظیریں پیش کر کے ثابت کیا ہے کہ اس کے معنی "صَلّٰی بالمُسْلِمِیْنَ" کے ہیں اور ان الفاظ سے حضرت ابوہریرہؓ کی بہ نفس نفیس شرکت کا مضمون ثابت ہونا ضروری نہیں ہے، امام طحاوی نے "باب الکلام فی الصلوۃ" میں اس کی وضاحت فرمائی ہے کہ از روئے لغت یہ جائز ہے کہ حضرت ابوہریرہ "صلی بنا، صلّٰی بالمُسْلِمینَ" کے معنی میں استعمال فرمائیں، جیسا کہ مثلاً حضرت نزال بن سبرہ فرماتے ہیں "قال لنا رسول اللہ ﷺ انا وایاکم کنا ندعی بنی عبد مناف الخ" یعنی ہم سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہمیں اور تمہیں 'بنی عبد مناف' کہا جاتا تھا اور چونکہ حضرت نزال بن سبرہ نے رسول اللہ ﷺ کو دیکھا ہی نہیں اس لیے ان کے 'قال لنا' فرمانے کے معنی ہیں 'قال لقومنا' کہ رسول اللہ ﷺ نے ہماری قوم سے فرمایا تھا، پھر امام طحاوی دوسری مثال دیتے ہیں کہ حضرت طاؤس نے کہا "قدم علینا معاذ بن جبل" کہ معاذ بن جبل ہمارے یہاں آئے، جب کہ حضرت معاذ عہد رسالت میں یمن گئے تھے اور اس وقت حضرت طاؤس پیدا بھی نہیں ہوئے تھے، اس لیے ان کے "قدم علینا" کے یہی معنی ہوں گے "قدم علی قومنا" اس کے علاوہ بھی نظیریں پیش کی ہیں، مطلب یہ ہے کہ ذوالیدین کی روایت میں حضرت ابوہریرہؓ کا "صلّٰی بنا" یا "صلّٰی لنا" فرمانا جب کہ حضرت ذوالیدین غزوۂ بدر میں شہید ہو گئے تھے، اور اس وقت تک حضرت ابوہریرہؓ اسلام نہیں لائے تھے، اس معنی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں یعنی مسلمانوں کو نماز پڑھائی۔

نماز میں کلام کی اجازت اور ممانعت کا مسئلہ بہت مفصل اور طویل ہے اور اس پر حنفیہ کے دلائل اسی موقع پر مذکور ہوں گے جہاں یہ مسئلہ آئے گا، لیکن چونکہ اجازت دینے والوں کا مستدل یہی حضرت ذوالیدین کی روایت تھی، اس لیے اس پر مختصر گفتگو کی گئی۔ واللہ اعلم بالصواب

## [۸۹] بَابُ الْمَسَاجِدِ الَّتِیْ عَلٰی طُرُقِ الْمَدِیْنَةِ وَالْمَوَاضِعِ الَّتِیْ صَلّٰی فِیْهَا النَّبِیُّ ﷺ

(۴۸۳) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اَبِیْ بَکْرِ الْمُقَدَّمِیُّ قَالَ ثَنَا فُضَیْلُ بْنُ سُلَیْمَانَ قَالَ نَامُوْسٰی بْنُ عُقْبَةَ قَالَ رَأَیْتُ سَالِمَ بْنَ عَبْدِ اللّٰهِ یَتَحَرّٰی اَمَاکِنَ مِنَ الطَّرِیْقِ فُیُصَلِّیْ فِیْهَا وَیُحَدِّثُ اَنَّ اَبَاهُ

كَانَ يُصَلِّيْ فِيْهَا وَانَّهُ رَأَى النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّيْ فِيْ تِلْكَ الْاَمْكِنَةِ قَالَ وَحَدَّثَنِيْ نَافِعٌ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّهُ كَانَ يُصَلِّيْ فِيْ تِلْكَ الْاَمْكِنَةِ وَسَأَلْتُ سَالِماً فَلَا اَعْلَمُهُ اِلَّا وَافَقَ نَافِعاً فِي الْاَمْكِنَةِ كُلِّهَا اِلَّا اَنَّهُمَا اخْتَلَفَا فِيْ مَسْجِدٍ بِشَرَفِ الرَّوْحَاءِ. (آئندہ: ۱۵۳۵، ۲۳۳۶، ۷۳۴۵)

**ترجمہ** باب، ان مسجدوں کا بیان جو مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کے راستہ پر واقع ہیں اور اسی راستہ کی ان جگہوں کا بیان جہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی ہے۔ موسیٰ بن عقبۃ کہتے ہیں کہ حضرت سالمؒ بن عبداللہ بن عمر مکہ سے مدینہ کے راستہ پر ان مقامات کو تلاش وتجسس سے متعین کرتے تھے، (جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی تھی) پھر وہاں نماز پڑھتے تھے اور یہ بیان کرتے تھے کہ ان کے والد (حضرت ابن عمرؓ) ان جگہوں پر نماز پڑھا کرتے تھے اور یہ کہ ابن عمرؓ نے رسول اللہ ﷺ کو ان جگہوں میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ موسیٰ بن عقبہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ مجھ سے حضرت نافع رحمہ اللہ نے بھی بیان کیا کہ حضرت ابن عمرؓ ان جگہوں پر نماز پڑھتے تھے اور میں نے اس سلسلے میں سالم سے معلوم کیا تو انھوں نے وہی تمام مقامات بتلائے جو حضرت نافعؒ نے بتائے تھے، مگر یہ کہ شرف الروحاء کی مسجد کے بارے میں دونوں کا اختلاف رہا۔

**مقصد ترجمہ** مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ جانے کے لیے زمانہ قدیم میں متعدد راستے تھے اور ان کی مسافت اتنی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا سفر ہجرت سات دن میں پورا ہوا تھا، آپ جمعرات کے دن مکہ مکرمہ سے نکلے، تین دن تک غار میں اقامت پذیر رہے، اور دوشنبہ کو غار سے نکل کر مدینہ طیبہ کے لیے روانہ ہو گئے، اگلے دوشنبہ کو مدینہ طیبہ پہنچ گئے، اسی طرح حجۃ الوداع میں مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ تک کا سفر آٹھ دن میں طے فرمایا، روایت میں جن مقامات پر نماز پڑھنے کا تذکرہ ہے، یہ حجۃ الوداع کے سفر سے متعلق ہیں، اگر سفر سات ایام میں طے ہوا تو پینتیس نمازوں کا وقت آیا اور آٹھ دن صرف ہوئے تو چالیس نمازیں پڑھیں گئیں، لیکن جہاں قیام کیا جاتا ہے، وہاں کئی کئی وقت کی نمازیں ادا کی جاتی ہیں، اس لیے راوی روایات میں چند مقامات کا تذکرہ کرتے ہیں، ان اسفار میں جن جن مقامات پر اتر کر حضور پاک ﷺ نے نمازیں پڑھی ہیں، ان میں بعض جگہوں پر باقاعدہ مسجد شرعی تعمیر کر دی گئی ہے، اور بعض مقامات پر مسجد تعمیر نہیں ہوئی، چنانچہ امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب کے الفاظ میں اس کی رعایت کی اور انھوں نے دو لفظ استعمال کیے ”المساجد اور المواضع۔“ مساجد سے مراد وہ مقامات ہیں جہاں بعد میں مسجد تعمیر ہو گئی ہے، اور مواضع وہ جگہ ہیں جہاں مسجد تعمیر نہیں ہوئی لیکن ابن عمرؓ ان مقامات کو تلاش کر کے وہاں نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے۔

امام بخاریؒ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جن مقامات پر پیغمبر علیہ السلام نے نمازیں پڑھی ہیں ان مقامات کو خاص شرف اور تقدس حاصل ہو گیا، اس لیے اگر کوئی ان جگہوں سے گذرے اور وہاں نماز پڑھنے کا اہتمام کرے تو یہ عمل باعث خیر و برکت اور باعث ترقی درجات ہوگا، بلکہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ان مآثر کو دیکھنے کے لیے اور وہاں کے فیوض و برکات

سے استفادے کے لیے جانے کا بھی اہتمام کرے تو ہمارے یہاں اس میں بھی تنگی نہیں، بلکہ یہ ایک مستحسن بات ہوگی۔
پھر یہاں بحث یہ ہے کہ جو افعال رسول اکرم ﷺ نے بر سبیل اتفاق کئے ہیں، ان کو اہتمام کے ساتھ عمل میں لانے کا کیا حکم ہے؟ جیسے رسول اللہ ﷺ سفر کے دوران کسی مقام پر نماز پڑھنے کے لیے اترے تو یہ ایک اتفاقی بات تھی، اب کسی شخص کا باقاعدہ اسی جگہ اتر کر نماز پڑھنے کا اہتمام کرنا کیا حکم رکھتا ہے؟ امام بخاریؒ اس ترجمہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے عمل سے اس کا استحسان ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ابن عمر اس کا باقاعدہ اہتمام فرماتے تھے۔

رہا ان کے والد محترم حضرت عمرؓ کا ذوق تو وہ بظاہر ان کے ساتھ معلوم نہیں ہوتا، کیوں کہ فتح الباری وعمدۃ القاری وغیرہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک سفر میں یہ دیکھا کہ لوگ ایک جگہ کی طرف دوڑے چلے جارہے ہیں، معلوم فرمایا کیا بات ہے؟ بتلایا گیا کہ یہ وہ جگہ ہے جہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی تھی، تو حضرت عمرؓ نے ارشاد فرمایا کہ جہاں نماز کا وقت ہوجائے وہاں نماز پڑھ لینی چاہئے، ورنہ آگے بڑھ جانا چاہئے، اہل کتاب اسی وجہ سے ہلاکت میں مبتلا ہوئے کہ انھوں نے انبیاء کرام کے آثار کو تلاش کر کے وہاں عبادت گاہیں تعمیر کیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں تعارض نہیں ہے، کیونکہ حضرت عمرؓ لوگوں کو اس دوڑ دھوپ پر نکیر فرما رہے ہیں، جس میں مستحبات کو واجبات کی طرح اہمیت دی جارہی ہے اور ظاہر ہے کہ نوافل کو فرائض یا مستحبات کو واجبات کی طرح خیال کیا جانے لگے، یا اس کا اندیشہ پیدا ہو جائے، تو لامحالہ اس سے منع کیا جائے گا، ہمارے نزدیک حضرت عمرؓ کے انکار کی وجہ ہی یہ ہے کہ انھوں نے اس درجہ اہتمام اچھا نہیں سمجھا جس سے غلط فہمی کو راہ ملے۔

ابن تیمیہؒ کا مزاج بھی اس سلسلہ میں تنگی کی طرف مائل ہے، وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ جو چیزیں اتفاقی طور پر پیغمبر علیہ السلام نے کی ہیں، اگر بالکل اتفاقی طور پر ان پر عمل کرنے کی نوبت آئے تو مضائقہ نہیں ہے، یعنی سفر کر رہے ہیں اور اتفاق سے ایسی جگہ نماز کا وقت آجائے جہاں پیغمبر علیہ السلام نے نماز پڑھی ہے تو نماز پڑھ لے، لیکن اس کا باقاعدہ اہتمام کرنا ان کے نزدیک پسندیدہ نہیں، لیکن ان کی یہ تنگی انھیں مبارک، ہمارے اکابر کا یہ مزاج نہیں ہے۔

امام بخاریؒ بھی اس ترجمہ میں حضرت ابن عمرؓ کے طرز عمل اور ذوق کی تائید فرما رہے ہیں کہ جن مقامات پر رسول اللہ ﷺ نے سفر کے دوران نزول فرمایا اور وہاں نمازیں پڑھیں، ان مقامات کو خاص اہمیت، تقدس اور بابرکت ہونے کی حیثیت حاصل ہے اور ان کو متبرک سمجھتے ہوئے وہاں نماز پڑھنا امر مستحسن ہے، گویا اس باب میں امام بخاریؒ نے اصولی طور پر صالحین کے تبرکات سے برکت حاصل کرنے کا جواز اور استحسان ثابت کیا ہے، حافظ ابن حجرؒ اور دیگر شارحین نے لکھا ہے کہ ملت اسلامیہ صالحین کی یادگاروں سے برابر تبرک حاصل کرتی رہی ہے، ابھی چند ابواب پہلے حضرت عتبان بن مالکؓ کی روایت گذری ہے کہ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے گھر میں نماز پڑھنے کی درخواست کی تا کہ وہ اس کو گھر

کی مسجد بنالیں، اور آپ نے ان کی درخواست کو قبول فرمایا، جو آثار صالحین کے تبرک سمجھنے کے سلسلے میں مضبوط دلیل ہے، نیز یہ کہ قرآن کریم کی بھی بعض آیات سے ضمنی طور پر اس کا ثبوت ملتا ہے، ارشاد فرمایا گیا: ''وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هَارُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ'' (سورہ البقرہ آیت ۲۴۸) اور ان (بنی اسرائیل) سے ان کے نبی نے کہا کہ اس (طالوت) کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق (خود) آجائے گا جس میں تمہارے پروردگار کی طرف سے (سامان) تسکین ہے اور آل موسی اور آل ہارون کی بچی ہوئی چیزیں (تبرکات) ہیں، فرشتے اس کو لے کر آئیں گے۔

ظاہر ہے کہ آیت میں ''بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوْسٰى وَآلُ هَارُوْنَ'' سے مراد آل موسیٰ و آل ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات ہیں، جس میں مفسرین کے بیان کے مطابق تورات کے اصل نسخے کے علاوہ، حضرت موسی کا عصا، ان کے کپڑے، نعلین وغیرہ تھے، اکثر یہود کا خیال ہے کہ تبرکات کا یہ صندوق ہیکل سلیمانی کی بنیادوں میں دفن کر دیا گیا تھا۔ واللہ اعلم

بہر حال صالحین کے تبرکات کے جواز واستحسان کے سلسلے میں امام بخاریؒ نے ایک ترجمہ منعقد فرمادیا اور اس سلسلہ میں دوروایتیں ذکر کی ہیں جن میں مکہ سے مدینہ کے راستہ کی مسجدوں اور ان مقامات کا ذکر ہے جہاں حضور پاک ﷺ نے نماز پڑھی اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ یہاں نماز پڑھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔

## تشریح حدیث

حضرت عبداللہ بن عمر کے صاحبزادے حضرت سالمؒ مکہ سے مدینہ کے راستہ پر چند جگہوں کو اہمیت کے ساتھ تلاش کرتے اور وہاں نماز ادا کرتے اور یہ فرماتے کہ میرے والد ابن عمر بھی ان جگہوں کو تلاش کر کے یہاں نماز پڑھتے تھے۔ اور حضرت ابن عمرؓ کا یہ عمل اس بنیاد پر تھا کہ انھوں نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کو ان مقامات پر نماز پڑھتے دیکھا تھا۔ ''وحدثنی نافع الخ'' جس طرح حضرت ابن عمرؓ کے صاحبزادے، حضرت سالم، ابن عمر کی یہ روایات بیان کرتے ہیں، اسی طرح ان کے آزاد کردہ غلام حضرت نافعؒ بھی نقل کرتے ہیں، یہاں ان دونوں کے شاگرد موسی بن عقبہ بیان کرتے ہیں کہ ان متبرک مقامات کے بارے میں حضرت نافع نے بیان کیا تھا کہ حضرت ابن عمرؓ وہاں نماز پڑھتے تھے، پھر میں نے حضرت سالمؒ سے اس سلسلہ میں معلوم کیا تو انھوں نے نافع کے بیان کے مطابق ہی تفصیلات بیان کیں، مگر یہ کہ شرف الروحاء کی مسجد سے متعلق بیانات مختلف ہو گئے۔

''شرف روحاء'' شرف کے معنی ہیں بلندی اور اونچائی، اور روحاء ایک جگہ کا نام ہے، مراد یہ ہے کہ روحاء سے متصل جو اونچی جگہ ہے، وہاں کی مسجد کی تعیین کے سلسلہ میں نافعؒ اور سالمؒ کے بیانات مختلف ہو گئے، یا ان دونوں میں یہ اختلاف تھا کہ نافع نے اس کو ذکر کیا اور سالم نے ذکر نہیں کیا، روحاء کے بارے میں کوئی کہتا ہے کہ مدینہ طیبہ سے دودن کی

مسافت پر ایک آبادی کا نام ہے، کسی نے کہا ۳۶/میل ہے، کسی نے کہا ۴۱/میل ہے، بعض روایات میں اس کو جنت کی وادی فرمایا گیا ہے، اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ مجھ سے پہلے یہاں ستر پیغمبروں نے نماز پڑھی ہے اور یہ بھی مذکور ہے کہ بنو اسرائیل کے ستر ہزار افراد کے ساتھ حضرت موسیٰ بن عمران حج یا عمرہ کے لیے یہاں سے گذرے ہیں، بہرحال یہ وادی پہلے ہی سے متبرک تھی، پھر پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے نماز پڑھنے کی بنیاد پر اس کے تقدس اور اس کی اہمیت میں مزید اضافہ ہوگیا۔

(۴۸۴) حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ الْمُنْذِرِ الْحِزَامِيُّ قَالَ نَا اَنَسُ بْنُ عِيَاضٍ قَالَ نَا مُوْسَى بْنُ عُقْبَةَ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ اَخْبَرَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كَانَ يَنْزِلُ بِذِى الْحُلَيْفَةِ حِيْنَ يَعْتَمِرُ وَفِيْ حَجَّتِهٖ حِيْنَ حَجَّ تَحْتَ سَمُرَةٍ فِيْ مَوْضِعِ الْمَسْجِدِ الَّذِىْ بِذِى الْحُلَيْفَةِ وَكَانَ اِذَا رَجَعَ مِنْ غَزْوَةٍ وَكَانَ فِيْ تِلْكَ الطَّرِيْقِ اَوْ حَجٍّ اَوْ عُمْرَةٍ هَبَطَ بَطْنَ وَادٍ فَاِذَا ظَهَرَ مِنْ بَطْنِ وَادٍ اَنَاخَ بِالْبَطْحَآءِ الَّتِىْ عَلٰى شَفِيْرِ الْوَادِى الشَّرْقِيَّةِ فَعَرَّسَ ثَمَّ حَتّٰى يُصْبِحَ لَيْسَ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الَّذِىْ بِحِجَارَةٍ وَلَا عَلَى الْاَكَمَةِ الَّتِيْ عَلَيْهَا الْمَسْجِدُ كَانَ ثَمَّ خَلِيْجٌ يُصَلِّىْ عَبْدُ اللهِ عِنْدَهٗ فِيْ بَطْنِهٖ كُثُبٌ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثَمَّ يُصَلِّىْ فَدَحَافِيْهِ السَّيْلُ بِالْبَطْحَآءِ حَتّٰى دُفِنَ ذٰلِكَ الْمَكَانُ الَّذِىْ كَانَ عَبْدُ اللهِ يُصَلِّىْ فِيْهِ . (آئندہ:۱۵۳۲،۱۵۳۳،۱۷۹۹)

(۴۸۵) وَاَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ حَدَّثَهٗ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى حَيْثُ الْمَسْجِدُ الصَّغِيْرُ الَّذِىْ دُوْنَ الْمَسْجِدِ الَّذِىْ بِشَرَفِ الرَّوْحَآءِ وَقَدْ كَانَ عَبْدُ اللهِ يُعْلِمُ الْمَكَانَ الَّذِىْ كَانَ صَلّٰى فِيْهِ النَّبِيُّ ﷺ يَقُوْلُ ثَمَّ عَنْ يَمِيْنِكَ حِيْنَ تَقُوْمُ فِي الْمَسْجِدِ تُصَلِّىْ وَذٰلِكَ الْمَسْجِدُ عَلٰى حَافَّةِ الطَّرِيْقِ الْيُمْنٰى وَاَنْتَ ذَاهِبٌ اِلٰى مَكَّةَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْمَسْجِدِ الْاَكْبَرِ رَمْيَةٌ بِحَجَرٍ اَوْ نَحْوُ ذٰلِكَ.

(۴۸۶) وَاَنَّ ابْنَ عُمَرَ كَانَ يُصَلِّىْ اِلَى الْعِرْقِ الَّذِىْ عِنْدَ مُنْصَرَفِ الرَّوْحَآءِ وَذٰلِكَ الْعِرْقُ اِنْتَهٰى طَرَفُهٗ عَلٰى حَافَّةِ الطَّرِيْقِ دُوْنَ الْمَسْجِدِ الَّذِىْ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْمُنْصَرَفِ وَاَنْتَ ذَاهِبٌ اِلٰى مَكَّةَ وَقَدِ ابْتُنِىَ ثَمَّ مَسْجِدٌ فَلَمْ يَكُنْ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ يُصَلِّىْ فِيْ ذٰلِكَ الْمَسْجِدِ كَانَ يَتْرُكُهٗ عَنْ يَسَارِهٖ وَوَرَآءِهٖ وَيُصَلِّىْ اَمَامَهٗ اِلَى الْعِرْقِ نَفْسِهٖ وَكَانَ عَبْدُ اللهِ يَرُوْحُ مِنَ الرَّوْحَآءِ فَلَا يُصَلِّى الظُّهْرَ حَتّٰى يَاْتِىَ ذٰلِكَ الْمَكَانَ فَيُصَلِّىْ فِيْهِ الظُّهْرَ وَاِذَا اَقْبَلَ مِنْ مَكَّةَ فَاِنْ مَرَّبِهٖ قَبْلَ الصُّبْحِ بِسَاعَةٍ اَوْ مِنْ اٰخِرِ السَّحَرِ عَرَّسَ حَتّٰى يُصَلِّىَ بِهَا الصُّبْحَ .

(۴۸۷) وَاَنَّ عَبْدَاللهِ حَدَّثَهُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَنْزِلُ تَحْتَ سَرْحَةٍ ضَخْمَةٍ دُوْنَ الرُّوَیْثَةِ عَنْ یَمِیْنِ الطَّرِیْقِ وَوِجَاهَ الطَّرِیْقِ فِیْ مَکَانٍ بَطْحٍ سَهْلٍ حتّٰی یُفْضِیَ مِنْ اَکَمَةٍ دُوَیْنَ بَرِیْدِ الرُّوَیْثَةِ بِمِیْلَیْنِ وَقَدِ انْکَسَرَ اَعْلَاهَا فَانْثَنٰی فِیْ جَوْفِهَا وَهِیَ قَائِمَةٌ عَلٰی سَاقٍ وَفِیْ سَاقِهَا کُثُبٌ کَثِیْرَةٌ.

(۴۸۸) وَاَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ حَدَّثَهُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ صَلّٰی فِیْ طَرَفِ تَلْعَةٍ مِنْ وَرَآءِ الْعَرْجِ وَ اَنْتَ ذَاهِبٌ اِلٰی هَضْبَةٍ عِنْدَ ذٰلِكَ الْمَسْجِدِ قَبْرَانِ اَوْ ثَلٰثَةٌ علی الْقُبُوْرِ رَضْمٌ مِنْ حِجَارَةٍ عَنْ یَمِیْنِ الطَّرِیْقِ عِنْدَ سَلِمَاتِ الطَّرِیْقِ بَیْنَ اُولٰئِكَ السَّلِمَاتِ کَانَ عَبْدُ اللهِ یَرُوْحُ مِنَ الْعَرْجِ بَعْدَ اَنْ تَمِیْلَ الشَّمْسُ بِالْهَاجِرَةِ فَیُصَلِّیْ الظُّهْرَ فِیْ ذٰلِكَ الْمَسْجِدِ .

(۴۸۹) وَاَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ حَدَّثَهُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ نَزَلَ عِنْدَ سَرَحَاتٍ عَنْ یَسَارِ الطَّرِیْقِ فِیْ مَسِیْلٍ دُوْنَ هَرْشٰی ذٰلِكَ الْمَسِیْلُ لَاصِقٌ بِکُرَاعِ هَرْشٰی بَیْنَهُ وَبَیْنَ الطَّرِیْقِ قَرِیْبٌ مِنْ غَلْوَةٍ وَکَانَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ یُصَلِّیْ اِلٰی سَرْحَةٍ هِیَ اَقْرَبُ السَّرَحَاتِ اِلَی الطَّرِیْقِ وَهِیَ اَطْوَلُهُنَّ .

(۴۹۰) وَاَنَّ عَبْدَاللهِ بْنَ عُمَرَ حَدَّثَهُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ کَانَ یَنْزِلُ فِی الْمَسِیْلِ الَّذِیْ فِیْ اَدْنٰی مَرِّ الظَّهْرَانِ قِبَلَ الْمَدِیْنَةِ حِیْنَ تَهْبِطُ مِنَ الصُّفْرَاوَاتِ یَنْزِلُ فِی بَطْنِ ذٰلِكَ الْمَسِیْلِ عَنْ یَسَارِ الطَّرِیْقِ وَاَنْتَ ذَاهِبٌ اِلٰی مَکَّةَ لَیْسَ بَیْنَ مَنْزِلِ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَبَیْنَ الطَّرِیْقِ اِلَّا رَمْیَةٌ بِحَجَرٍ .

(۴۹۱) وَاَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ حَدَّثَهُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ یَنْزِلُ بِذِیْ طُوًی وَیَبِیْتُ حَتّٰی یُصْبِحَ یُصَلِّی الصُّبْحَ حِیْنَ یَقْدَمُ مَکَّةَ وَمُصَلّٰی رَسُوْلِ اللهِ ﷺ ذٰلِكَ عَلٰی اَکَمَةٍ غَلِیْظَةٍ لَیْسَ فِی الْمَسْجِدِ الَّذِیْ بُنِیَ ثَمَّه وَلٰکِنْ اَسْفَلَ مِنْ ذٰلِكَ عَلٰی اَکَمَةٍ غَلِیْظَةٍ .

(آئندہ:۱۷۶۷،۱۷۶۹)

(۴۹۲) وَاَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ حَدَّثَهُ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ اِسْتَقْبَلَ فُرْضَتَیِ الْجَبَلِ الَّذِیْ بَیْنَهُ وَبَیْنَ الْجَبَلِ الطَّوِیْلِ نَحْوَ الْکَعْبَةِ فَجَعَلَ الْمَسْجِدَ الَّذِیْ بُنِیَ ثَمَّ یَسَارَ الْمَسْجِدِ بِطَرَفِ الْاَکَمَةِ وَمُصَلَّی النَّبِیِّ ﷺ اَسْفَلَ مِنْهُ عَلَی الْاَکَمَةِ السَّوْدَآءِ تَدَعُ مِنَ الْاَکَمَةِ عَشَرَةَ اَذْرُعٍ اَوْ نَحْوَهَا ثُمَّ تُصَلِّی مُسْتَقْبِلَ الْفُرْضَتَیْنِ مِنَ الْجَبَلِ الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَ الْکَعْبَةِ .

**ترجمہ** حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے نافعؒ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ جب عمرہ کے لیے سفر فرماتے، اسی طرح جب آپ نے حجۃ الوداع کا سفر فرمایا تو آپ کیکر کے درخت کے نیچے اس جگہ نزول فرماتے جس جگہ اب ذوالحلیفہ کی مسجد ہے، اور جب آپ کسی غزوہ (سفر جہاد) سے یا حج یا عمرہ سے واپس آتے اور اس ذوالحلیفہ والے راستے میں ہوتے تو وادیٔ (عقیق) کے نشیب میں اترتے، پھر جب وادی کے نشیب سے اوپر چڑھتے تو اپنی اونٹنی کو بطحاء (بطحاء اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی کی رو سے سنگریزے جمع ہوجائیں) میں بٹھاتے جو وادی کے مشرقی کنارے پر واقع ہے، چنانچہ آخر شب میں وہاں اتر کر صبح تک آرام کرتے، یہ جگہ اس مسجد کے پاس نہیں ہے، جو پتھروں سے بنی ہوئی ہے اور نہ یہ اس ٹیلہ پر ہے، جہاں (دوسری) مسجد بنی ہوئی ہے، وہاں ایک خلیج یعنی گہری وادی تھی، وہاں عبداللہ بن عمرؓ نماز پڑھتے تھے، اس وادی کے نشیب میں ریت کے تودے تھے جہاں رسول اللہ ﷺ نماز پڑھتے تھے، پھر پانی کی رو نے اس کو سنگریزوں سے پاٹ دیا، یہاں تک کہ اس جگہ کو چھپا دیا جہاں عبداللہ بن عمرؓ نماز پڑھا کرتے تھے، اور یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس جگہ نماز پڑھی جہاں اب وہ چھوٹی مسجد ہے جو شرف الروحاء کی مسجد کے قریب ہے اور حضرت عبداللہ ابن عمرؓ اس جگہ کو معین فرماتے تھے جہاں حضور ﷺ نے نماز پڑھی، فرماتے کہ جب تم مسجد میں نماز پڑھنے کے لئے کھڑے ہوگے تو وہ جگہ تمہارے داہنے ہاتھ کی طرف پڑے گی اور یہ (چھوٹی) مسجد مکہ کی طرف جاتے ہوئے راستہ کے کنارے پر واقع ہے اور اس چھوٹی مسجد اور بڑی مسجد کے درمیان کم وبیش اتنا فاصلہ ہے کہ ایک مسجد سے پتھر پھینکا جائے تو دوسری مسجد میں گرے اور یہ کہ حضرت ابن عمرؓ اس چھوٹی پہاڑی کی طرف نماز پڑھتے تھے جو روحاء کے نکال پر واقع ہے، اس پہاڑی کا کنارہ راستہ کے کنارے سے ملا ہوا ہے، اس مسجد کے قریب ہے جو مکہ کو جاتے ہوئے پہاڑی اور روحاء کے نکال کے درمیان ہے اور اب اس جگہ ایک مسجد بنا دی گئی ہے، مگر عبداللہ بن عمرؓ اس مسجد میں نماز نہیں پڑھتے تھے، بلکہ اس کو اپنے بائیں اور پیچھے چھوڑ دیتے تھے، اور مسجد کے سامنے خود پہاڑی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ زوال کے بعد روحاء سے روانہ ہوتے اور ظہر کی نماز نہ پڑھتے یہاں تک اس جگہ پہنچ جاتے اور یہیں ظہر کی نماز پڑھتے اور جب وہ مکہ سے (مدینہ) واپس آتے تو اگر صبح سے ایک ساعت پہلے یا آخر شب میں وہاں سے گزرتے تو اتر جاتے یہاں تک کہ فجر کی نماز یہیں پڑھتے۔ اور یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے نافعؒ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ ایک بڑے درخت کے نیچے نزول فرماتے جو راستہ کے داہنی طرف اور راستے کے سامنے کشادہ اور نرم ہموار جگہ میں مقام رویثہ کے قریب واقع ہے یہاں تک کہ آپ رویثہ کی ڈاک چوکی سے بالکل متصل ٹیلے سے دو میل آگے نکل جاتے، جس درخت کے نیچے آپ نزول فرماتے اس کا اوپر کا حصہ ٹوٹ گیا ہے اور ٹوٹ کر اپنے جوف (کھوکھلے تنے) میں آگیا ہے اور وہ اپنے تنے پر کھڑا ہے اور اس کے تنے کے پاس ریت کے بہت سے تودے ہیں اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے نافعؒ سے یہ بھی بیان کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مقام عرج کے آگے یا اس طرف پانی گرنے کی جگہ

کے کنارے پر نماز پڑھی جب کہ تم ہضبہ کی پہاڑی کی طرف جا رہے ہو اس مسجد کے پاس دو یا تین قبریں ہیں، ان قبروں پر پتھر کی سلیں رکھی ہوئی ہیں، یہ راستے میں کیکر کے درختوں (یا راستہ کے پتھروں) کے پاس راستہ کے داہنی طرف واقع ہیں، ان کیکر کے درختوں (یا بڑے پتھروں) کے درمیان، حضرت ابن عمرؓ، دو پہر کا سورج ڈھلنے کے بعد چلتے اور اس مسجد میں ظہر کی نماز پڑھتے۔ اور یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے نافعؒ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ان بڑے درختوں کے پاس نزول فرمایا جو راستہ کے بائیں طرف اس مسیل یعنی نشیبی حصہ میں واقع ہیں جو ''ہرشی'' پہاڑی کے قریب ہے، یہ مسیل جس میں حضور ﷺ نے نزول فرمایا ''ہرشی'' کے کنارے سے ملی ہوئی ہے، اس میں اور راستہ میں ایک تیر پھینکنے کے بقدر فاصلہ ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس درخت کی طرف نماز پڑھتے جو راستہ سے سب سے زیادہ قریب ہے اور سب سے اونچا ہے۔ اور یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے نافع سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ پانی کی گذرگاہ کے اس نشیبی حصہ میں نزول فرماتے جو مرالظہر ان کے پاس ہے، مدینہ کے سامنے پڑتا ہے، جب تم صفراوات کی وادیوں (یا پہاڑیوں) سے نیچے آؤ گے تو اسی پانی کی گذرگاہ کے نشیب میں اترو گے، یہ مکہ کو جاتے ہوئے راستہ کے بائیں طرف ہے، رسول اللہ ﷺ کے نزول کی جگہ اور راستہ کے درمیان صرف ایک پتھر کے پھینکنے کی مسافت کے برابر فاصلہ ہے۔ اور یہ کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے نافعؒ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ مقام ذی طوی میں نزول فرماتے تھے اور رات سے صبح تک وہیں قیام کرتے اور مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے وقت فجر کی نماز یہیں پڑھتے اور رسول اللہ ﷺ کے نماز پڑھنے کی یہ جگہ ایک بڑے ٹیلے پر تھی یہ وہ جگہ نہیں ہے، جہاں اب مسجد بنادی گئی ہے، لیکن یہ اس سے نیچے اتر کر ایک بڑے ٹیلے پر ہے۔ اور یہ کہ حضرت ابن عمرؓ نے نافعؒ سے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے اس پہاڑ کے دونوں جھکے ہوئے کناروں کو سامنے کی طرف لیا جو پہاڑ آپ ﷺ کے اور اس اونچے پہاڑ کے درمیان ہے جو سمت کعبہ میں واقع ہے، پھر ابن عمرؓ نے اس مسجد کو جو وہاں بنائی گئی ہے، اس مسجد کے بائیں طرف لے لیا جو ٹیلے کے کنارے پر ہے اور آنحضرت ﷺ کے نماز پڑھنے کی جگہ سیاہ رنگ کے ٹیلے پر اس سے نیچے ہے، تم اس ٹیلے سے کم و بیش دس ہاتھ چھوڑ دو، پھر اس پہاڑ کے جو تمہارے اور کعبہ کے درمیان ہے دونوں جھکے ہوئے کناروں کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو۔

**تشریحات** اس روایت میں نافعؒ نے حضرت ابن عمرؓ کے متعین کردہ ان چند مقامات کی تفصیل پیش کی ہے، جو مکہ اور مدینہ کے درمیان واقع ہیں، جہاں رسول اللہ ﷺ سفر کے دوران نزول فرماتے تھے اور نماز پڑھتے تھے، اس روایت سے یہاں دو باتیں متعلق ہیں: ایک وہ مقصد جس کے لیے امام بخاریؒ نے یہ روایت پیش کی کہ جو چیزیں صالحین سے انتساب کا شرف حاصل کر لیتی ہیں ان میں تقدس کی شان پیدا ہو جاتی ہے، حدود شرعیہ کے اندر رہتے ہوئے ان کے تقدس سے برکت حاصل کرنا درست ہے، یہ مقصد ثابت ہے، کیوں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ان مقامات کو اہمیت کے ساتھ یاد رکھا اور وہاں نماز پڑھنے کا اہتمام کیا، اپنے شاگردوں کو واقف کرایا، وغیرہ۔

دوسری بات جو اس روایت سے متعلق ہے وہ ان مقامات کا تعین ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ مقامات کا صحیح طور پر تعین دیکھنے والا ہی کرسکتا ہے، الفاظ وعبارت کے ذریعہ جگہ کا متعین کرنا بہت دشوار ہے، حضرت ابن عمرؓ نے الفاظ کے ذریعہ بھی جگہ کی نشاندہی کی تھی اور عملی طور پر اپنے متعلقین کو مشاہدہ بھی کرادیا تھا، اس لیے حضرت نافعؒ ان جگہوں کو سمجھے ہوئے تھے اور حضرت سالمؒ حضرت ابن عمرؓ کی طرح ان جگہوں کو تلاش کر کے نماز پڑھتے تھے، لیکن بعد میں یہ جگہیں محفوظ اور متعین نہ رہیں، امام بخاریؒ نے اتنی تفصیلی روایت بھی پیش کی، لیکن مقامات کی تعیین کے سلسلہ میں ان کی محنت کارآمد نہ رہی، شارحین نے تابمقدور شرح کی، لیکن وہ بھی الفاظ کی تشریح کی حد تک ہے، ہمیں جب حضرت شیخ الہند قدس سرہٗ نے یہ روایت پڑھائی تو برکت کے لیے ایک ہی مرتبہ میں پوری روایت پڑھوادی اور ترجمہ بھی نہیں فرمایا کیوں کہ جگہوں کی تعیین کے سلسلہ میں اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔

مگر میری عادت ہے کہ تابمقدور تفصیل کرتا ہوں، اس لیے ہر منزل کی الگ الگ وضاحت کروں گا، اس تفصیلی روایت میں رسول اللہ ﷺ کے نماز پڑھنے کی جگہیں سات سے زائد ہیں، اور جہاں رسول اللہ ﷺ کے منزل فرمانے کا ذکر ہے، ان کو عام طور پر راوی نے بھی مستقل ''وان عبدالله بن عمر حدثه'' کہہ کر بیان کیا ہے۔

**پہلی منزل** پہلی منزل ''ذوالحلیفہ'' کے نام سے ذکر کی گئی ہے کہ رسول پاک ﷺ جب مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے تو ذوالحلیفہ میں منزل کرتے، ذوالحلیفہ مدینہ طیبہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ہے، یہ اہل مدینہ کا میقات ہے، یعنی اہل مدینہ حج کے لیے جائیں تو انھیں یہیں سے احرام باندھنا ہوتا ہے، یہ جگہ ''بیر علی'' کے نام سے مشہور ہے۔

حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مدینہ سے مکہ تشریف لے جاتے ہوئے آپ ذوالحلیفہ میں ایک کیکر کے درخت کے نیچے نزول فرماتے تھے جس جگہ اب ذوالحلیفہ میں مسجد بن گئی ہے، گویا ابن عمرؓ یہ فرمارہے ہیں کہ مکہ جاتے ہوئے جس کیکر کے نیچے آپ کے نماز پڑھنے کی جگہ تھی ٹھیک اسی جگہ مسجد ہے۔

''وكان اذا رجع الخ'' حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب آپ مکہ مکرمہ سے ذوالحلیفہ کے راستہ سے واپس ہوتے تب بھی یہاں نزول فرماتے، مگر واپسی میں نماز کی جگہ دوسری تھی، اس کی تفصیل وہ اس طرح فرماتے ہیں کہ واپسی میں پہلے آپ کی سواری وادی عقیق کے نشیب میں اترتی، پھر جب وادی کے نشیب سے اوپر چڑھتے تو آپ اپنی اونٹنی کو وادی عقیق کے مشرقی کنارے پر بطحاء میں بٹھاتے، بطحاء وہ جگہ کہلاتی ہے، جہاں پانی کے بہاؤ سے چھوٹے چھوٹے سنگریزے پھیل گئے ہوں، یہیں آپ رات گذراتے اور صبح تک یہیں قیام پذیر رہتے، حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ یہاں دو مسجدیں ہیں: ایک مسجد پتھروں سے بنی ہوئی ہے اور دوسری ایک ٹیلے پر بنی ہوئی ہے، مگر یہ دونوں مسجدیں حضور پاک ﷺ کی نماز کی جگہوں کے علاوہ بنی ہیں، آپ کی نماز کی جگہ اس کے قریب ایک گہری وادی (خلیج) تھی، جس کی

ایک علامت یہ تھی کہ اس کے اندر ریت کے تودے تھے، حضرت ابن عمرؓ اسی بیان کردہ جگہ پر نماز پڑھتے تھے۔

''کان رسول اللہ ﷺ یصلی ثم الخ'' یہ حضرت نافع کا بیان ہے، جسے مرسل کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بھی اسی جگہ نماز پڑھتے تھے، لیکن چونکہ یہ جگہ نشیب میں تھی اور برسات کے پانی کی گذرگاہ تھی، اس لیے پانی کے بہاؤ کے ساتھ جو سنگریزے آتے رہے ان سے یہ جگہ ہموار ہوگئی اور رسول اللہ ﷺ کے نماز پڑھنے کی جگہ چھپ گئی، پہلی منزل کے بارے میں حضرت ابن عمرؓ نے جو بیان فرمایا تھا، اس کی وضاحت ہوگئی، ابن حجرؒ نے تحریر فرمایا ہے کہ ان میں سے ذوالحلیفہ کی دو مسجدیں محفوظ ہیں۔

**دوسری منزل** دوسری منزل شرف الروحاء کے نام سے ذکر کی گئی ہے، روحاء ایک جگہ کا نام ہے، جس کا تعارف گذر چکا ہے، مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے پہلے آبادی کا ایک بالائی حصہ آتا ہے، جسے شرف الروحاء کے نام سے ذکر کیا گیا ہے اور آبادی سے باہر نکلتے ہوئے جو حصہ آتا تھا اس کو منصرف الروحاء کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔

حضرت ابن عمرؓ اس منزل میں حضور پاک ﷺ کی نماز جگہ کی تعیین کے سلسلہ میں یہ فرماتے ہیں کہ یہاں دو مسجدیں ہیں ایک چھوٹی مسجد ہے اور اسی کے قریب ایک دوسری بڑی مسجد ہے، بڑی مسجد تو شرف روحاء میں رہنے والے مسلمانوں کی ہے اور یہ چھوٹی مسجد رسول اللہ ﷺ کی نماز کی جگہ ہونے کی بنیاد پر بنائی گئی ہے، مگر یہ صحیح جگہ پر نہیں بن سکی ہے۔

یہ چھوٹی مسجد مکہ جاتے ہوئے راستہ کے داہنے کنارے پر واقع ہے اور اس کا بڑی مسجد سے فقط اتنا فاصلہ ہے کہ اگر ایک مسجد سے پتھر پھینکا جائے تو وہ دوسری مسجد میں گرے گا، رسول اللہ ﷺ کی نماز کی صحیح جگہ کی تعیین اس طرح ہوگی کہ آپ اس چھوٹی مسجد کو اپنی بائیں طرف اور پیچھے کی طرف لے لیں یعنی رسول اللہ ﷺ کی نماز کی جگہ پر نماز پڑھی جائے تو چھوٹی مسجد پیچھے رہ جائے گی اور نمازی کے بائیں طرف آجائے گی۔ اور اگر اس چھوٹی مسجد میں قبلہ رو کھڑے ہوں تو رسول اللہ ﷺ کی نماز کی جگہ کھڑے ہونے والے کی داہنی سمت میں آگے کی طرف واقع ہوگی۔

پھر اس جگہ کی مزید نشاندہی کرتے ہیں کہ روحاء کے نکال پر ایک چھوٹی پہاڑی ہے، اس چھوٹی پہاڑی کا ایک کنارہ راستہ کے کنارہ سے ملا ہوا ہے اور چھوٹی پہاڑی کا یہ کنارہ اس مسجد کے قریب ہے یا اس مسجد سے نیچے ہے، جو پہاڑی اور منصرف روحاء کے درمیان واقع ہے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس مسجد میں نماز نہیں پڑھتے کیوں کہ یہ ان کی تحقیق کے مطابق درست جگہ پر نہیں بنی ہے، بلکہ وہ مسجد کو اپنے بائیں اور پیچھے چھوڑ کر پہاڑی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔

اس دوسری منزل میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کی ایک ہی جگہ تھی اور ابن عمرؓ روحاء سے دوپہر کے ڈھلنے کے بعد چلتے مگر ظہر اسی جگہ آ کر پڑھتے، اسی طرح مکہ مکرمہ سے واپسی میں اگر آخر شب میں ادھر سے گذرتے تو یہیں قیام کرتے اور فجر کی نماز اسی جگہ ادا کرتے۔

روحاء کی مسجدوں کے بارے میں ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ یہ باقی ہیں اور انھیں اس علاقہ کے لوگ جانتے ہیں اور روحاء وذوالحلیفہ کی مسجدوں کے علاوہ کوئی مسجد محفوظ نہیں ہے۔

**تیسری منزل** تیسری منزل ''رُوَیْثَه'' کے نام سے ذکر کی گئی ہے۔ ''رویثہ'' مدینہ طیبہ سے ۱۷/فرسخ یعنی ۵۱/میل کے فاصلہ پر ایک آبادی کا نام ہے، یہ روحاء سے ۱۴/میل ہے، اس منزل میں رسول اللہ ﷺ کہاں نماز پڑھتے تھے؟ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رویثہ کے قریب ایک بہت بڑا درخت ہے جس کے نیچے آپ ؐ نزول فرماتے تھے، یہ درخت مکہ جانے والے راستہ کے داہنی طرف اور سامنے ہے، یہ تعبیر بتلا رہی ہے کہ یہاں سڑک سیدھی نہیں تھی، بلکہ وہاں ایسا گھوم تھا کہ درخت داہنی طرف ہونے کے باوجود سامنے معلوم ہوتا تھا، پھر ایک اور علامت ذکر کرتے ہیں کہ یہ درخت ایک کشادہ اور نرم وہموار زمین میں واقع ہے، پھر ایک اور علامت ذکر کرتے ہیں کہ رویثہ کی ڈاک چوکی سے قریب جو پہاڑی ہے یہ درخت اس سے دومیل کی مسافت پر واقع ہے، پھر مزید وضاحت کرتے ہیں کہ اب یہ درخت اوپر سے ٹوٹ گیا ہے، لیکن ٹوٹ کر گرا نہیں ہے، بلکہ اپنے ہی جوف اور خول میں مڑ کر ٹھہر گیا ہے اور اس کا تنا پوری طرح کھڑا ہوا ہے اور اس تنے کے قریب یا نیچے ریت کے تودے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

یہ واقعہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے درخت کے بارے میں اتنی علامتیں بیان فرمادی تھیں کہ جب تک وہ درخت رہا ہوگا جگہ کا متعین کرنا آسان رہا ہوگا، لیکن جب وہ درخت اسی زمانہ میں ٹوٹ گیا تھا تو ظاہر ہے کہ کتنے دن باقی رہا ہوگا، اب اس جگہ کا تلاش کر کے متعین کرنا ممکن معلوم نہیں ہوتا، خلاصہ یہ ہے کہ مدینہ طیبہ سے مکہ مکرمہ جاتے ہوئے حضور پاک ﷺ رویثہ کے قریب ایک درخت کے نیچے نزول فرماتے تھے، اس درخت کی یہ علامتیں تھیں۔

**چوتھی منزل** چوتھی منزل ''عرج'' کے نام سے ذکر کی گئی ہے۔ ''عرج'' بھی ایک آبادی کا نام ہے جو رویثہ سے ۱۴/میل کے فاصلے پر ہے، اس منزل میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کی جگہ کی تعیین کے سلسلہ میں ابن عمرؓ فرماتے ہیں ''**صلی فی طرف تلعة من وراء العرج**'' ''**تلعه**'' کے متعدد معانی ہیں:

(۱) اوپر سے نیچے گرنے والے پانی کے بہنے کی جگہ۔

(۲) وہ اونچی اور پھیلی ہوئی جگہ جہاں پانی کی آمد ورفت ہو۔

(۳) نشیبی زمین اور اونچی زمین۔

(۴) اونچی زمین سے بہہ کر نیچی زمین میں آنے والے پانی کی گذرگاہ وغیرہ، اسی طرح حضرت ابن عمرؓ کی وضاحت میں دوسرا لفظ ہے وراء اس کے بھی کئی معنی ہیں، یہ لفظ پیچھے کے معنی میں کثیر الاستعمال ہے، لیکن کبھی آگے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے، جگہ کو دیکھے بغیر یہاں معنی کا تعین ممکن نہیں، اس لیے شارحین بھی مراد متعین نہیں کر رہے ہیں، ہم یہاں تلعة کے پہلے معنی اور وراء کے کثیر الاستعمال معنی کے مطابق ترجمہ کریں گے کہ حضرت ابن عمرؓ نے فرمایا کہ

رسول اللہ ﷺ نے مقام عرج کے پیچھے اوپر سے نیچے اترنے والے پانی کے کنارے پر کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور پانی کے اترنے کی جگہ اس وقت سامنے آتی ہے جب تم وہاں واقع ایک پہاڑ کی طرف جاؤ گے، پھر اس کی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ اس مسجد کے قریب جہاں آپ نے نماز پڑھی ہے دو، یا تین قبریں ہیں، ان قبروں پر پتھر کی سلیں رکھی ہوئی ہیں، یہ قبریں راستہ کے داہنی جانب واقع ہیں۔

اس کے بعد ایک اور نشاندہی ''عند سلمات الطریق''۔ ''سلمۃ'' اگر سین کے فتح اور لام کے فتحہ کے ساتھ ہوگا تو اس کا ترجمہ ہے کیکر کا درخت۔ اور اگر لام کے کسرہ کے ساتھ ہو تو ترجمہ ہے پتھر، یا بڑا پتھر، اس لیے پہلے احتمال کے مطابق ترجمہ ہوگا کہ یہ قبریں راستہ میں کیکر کے درختوں کے پاس ہیں اور دوسری صورت میں ترجمہ ہوگا کہ یہ قبریں راستہ کے پتھروں کے نزدیک ہیں۔ اس کے بعد نافع کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ انہی کیکر کے درختوں یا پتھروں کے درمیان دوپہر کو دھوپ ڈھلنے کے بعد عرج سے چلتے اور اس مسجد میں ظہر کی نماز ادا کرتے، اس چوتھی منزل کے جو نشانات اور علامتیں بیان کی گئی ہیں ان سے آج جگہ کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

**پانچویں منزل**

پانچویں منزل ''ہرشی'' کے نام سے ذکر کی گئی ہے۔ ''ہرشی'' بروزن فعلی ایک پہاڑی کا نام ہے، جو مکہ کے راستہ میں آتی ہے اور ایسی جگہ واقع ہے جہاں شام اور مدینہ کے راستے ملتے ہیں، جھفہ کے قریب ہے، اس منزل میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کی جگہ تعیین کے سلسلہ میں ابن عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہرشی پہاڑی کے قریب جو پانی کی گذرگاہ اور نشیبی جگہ ہے وہاں راستے کے بائیں طرف بڑے بڑے سایہ دار درخت ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ان درختوں کے قریب نزول فرمایا، پھر ایک اور علامت ذکر کرتے ہیں کہ یہ نشیب کی جگہ اور مسیل جہاں آپ نے نزول فرمایا تھا، ہرشی پہاڑی کے کناروں سے ملی ہوئی ہے، اور اس مسیل اور راستہ کا فاصلہ ایک غلوہ کے بقدر ہے، یعنی اتنا فاصلہ ہے کہ تیر پھینکا جائے تو وہاں گرے، بعض حضرات نے اس کی مقدار چار سو ہاتھ بیان کی ہے، نافعؒ بیان کرتے ہیں کہ ہرشی کی اس منزل میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس درخت کے نیچے نماز پڑھتے تھے، جو راستہ سے سب سے زیادہ قریب تھا اور تمام درختوں میں سب سے اونچا تھا، مگر اب ظاہر ہے کہ نہ درخت موجود ہے اور نہ علامات کے ذریعہ معلوم کرنا ممکن ہے۔

**چھٹی منزل**

چھٹی منزل ''مرُّ الظھران'' کے نام سے ذکر کی گئی ہے۔ ''مرالظہر ان'' کو وہاں کے لوگ ''بطن مرو'' کہتے ہیں یہ ایک وادی ہے جہاں سے مکہ مکرمہ کا فاصلہ چودہ میل رہ جاتا ہے، اس منزل میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کی جگہ کی تعیین کے سلسلہ میں ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ مرالظہر ان کے قریب جو پانی کی گزرگاہ ہے، وہاں رسول اللہ ﷺ نزول فرماتے تھے، مزید نشاندہی کرتے ہیں کہ پانی کی اس گذرگاہ کا رخ مکہ مکرمہ کی طرف نہیں بلکہ مدینہ طیبہ کی جانب ہے، پھر مزید تفصیل کرتے ہیں کہ جب ''مرالظہر ان'' کے بعد مکہ جاتے وقت صفراوات نام کی

پہاڑیوں یا وادیوں سے تم نیچے اترو گے تو راستہ کے بائیں طرف اسی پانی کی گذرگاہ کے نشیب میں پہنچ جاؤ گے جس میں حضور ﷺ نے نزول فرمایا تھا، نیز یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے نزول کی جگہ اور راستہ کے درمیان صرف پتھر پھینکنے کی مسافت کے بقدر فاصلہ ہے۔

## ساتویں منزل

ساتویں منزل ''ذوطوی'' کے نام سے ذکر کی گئی ہے۔ ''ذوطوی'' مکہ مکرمہ سے تین میل سے کچھ کم فاصلہ پر ایک جگہ کا نام ہے، یہ آپ کے سفر کی آخری منزل ہے، ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ یہاں رات کو قیام فرماتے تھے، پھر فجر کی نماز یہاں پڑھنے کے بعد مکہ مکرمہ تشریف لے جاتے تھے۔

اس منزل میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کی جگہ کہاں تھی؟ اس کے بارے میں ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ آپ کے نماز پڑھنے کی جگہ ایک بڑے ٹیلے پر تھی اور اب اس جگہ ایک مسجد بنادی گئی ہے، مگر وہ ٹھیک آپ کی نماز کی جگہ پر نہیں بن سکی ہے، آپ کے نماز پڑھنے کی جگہ اس سے نیچے بڑے ٹیلے پر تھی، اس کے بعد ابن عمرؓ نے بیان کیا کہ اس جگہ کعبہ کی سمت میں ایک اونچا پہاڑ ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس پہاڑ کے اور اپنے درمیان جو پہاڑ کے دو کنگرے یا پہاڑ میں جانے کے دو راستے ہیں ان کا استقبال کر کے نماز پڑھی، پھر ابن عمر نے جگہ کی تعیین کے لیے یہ عمل کر کے دکھایا کہ وہاں مسجد بنی ہوئی تھی، اس کو ٹیلے کے کنارے بنی ہوئی دوسری مسجد کے بائیں طرف لیا اور بتلایا کہ حضور پاک ﷺ کی نماز پڑھنے کی جگہ اس سے نیچے کالے رنگ کے ٹیلے پر تھی، تم اگر رسول اللہ ﷺ کی جگہ نماز پڑھنا چاہتے ہو تو اس ٹیلے میں سے دس ہاتھ کے قریب جگہ چھوڑ دو اور اپنے اور کعبہ کے درمیان والے پہاڑ کے جو دو راستے یا جو دو آگے کو نکلے ہوئے کنگرے ہیں ان کا استقبال کر کے نماز پڑھو تو رسول اللہ ﷺ کی نماز کی جگہ نماز ہو جائے گی۔

## پیغمبر علیہ السلام سے منسوب مسجدوں کی اہمیت

حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے اس روایت میں مدینہ طیبہ سے مکہ معظمہ تک رسول اللہ ﷺ کی نماز پڑھنے کی جگہوں کی تفصیل بیان فرمائی ہے، اور اب ہی نہیں بلکہ قدیم زمانہ ہی سے ان میں سے اکثر مقامات کا پتہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی کچھ جگہیں متعین ہیں اور وہاں مسجد بنادی گئی ہے، لیکن مدینہ طیبہ اور اس کے قرب وجوار میں متعدد مسجدیں ہیں جن میں رسول اللہ ﷺ کا نماز پڑھنا ثابت ہے، جن میں مسجد قباء، مسجد بنو قریظہ، مسجد شمس، مسجد مشربہ ام ابراہیم، مسجد بغلہ، مسجد اجابہ، مسجد قبلتین اور مسجد فتح وغیرہ مشہور ہیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے طرز عمل اور امام بخاریؒ کے [illegible] الباب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مقامات کی خاص اہمیت ہے اور ان کی برکات سے استفادہ مخصوص سعادت ہے، حافظ ابن حجرؒ نے تو شوافع میں سے علامہ بغویؒ کی طرف یہ بات بھی منسوب کی ہے کہ جن مسجدوں میں رسول اللہ ﷺ سے نماز پڑھنا ثابت ہے، اگر کوئی ان میں سے کسی مسجد میں نماز پڑھنے کی نذر کرلے تو انہی مسجدوں میں نماز پڑھنا متعین ہو جائے گا، لیکن ہمارے یہاں اہمیت تو ثابت ہے اور ان مسجدوں میں نماز پڑھنا عین سعادت ہے، مگر نذر کا مسئلہ اس طرح نہیں ہے، کیوں کہ نمازوں

کے لیے کسی مسجد کا تعین عبادت مقصودہ نہیں، اس لیے فقہ کی کتابوں میں یہ جزئیہ موجود ہے، اگر کوئی یہ نذر مان لے کہ میں فلاں جگہ نماز پڑھوں گا تو اس جگہ کے علاوہ دوسری جگہ نماز پڑھنا جائز ہے۔ ابوداؤد میں حضرت جابرؓ سے روایت بھی موجود ہے کہ فتح مکہ کے دن ایک صحابی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے یہ نذر مانی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو مکہ کی فتح میں کامیابی عطا کر دے، تو میں بیت القدس میں دو رکعت پڑھوں گا، آپ نے فرمایا کہ اگر تم یہیں (یعنی مکہ میں) نماز پڑھ لو تو تمہاری نذر پوری ہو جائے گی۔

بہرحال نذر کا مسئلہ تو دوسری بات ہے، جہاں تک رسول اللہ ﷺ سے نسبت کی بنیاد پر کسی مسجد یا جگہ کی اہمیت کی بات ہے، تو وہ امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب سے ثابت ہے، اسی لیے امام بخاریؒ نے یہ باب منعقد فرمایا ہے اور اس کے تحت ایک طویل روایت ذکر کی ہے۔ واللہ اعلم

## [۹۰] بابٌ، سُتْرَةُ الْإِمَامِ سُتْرَةُ مَنْ خَلْفَهُ

(۴۹۳) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ نَامَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ عُتْبَةَ اَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عَبَّاسٍ اَنَّهُ قَالَ اَقْبَلْتُ رَاكِباً عَلٰى حِمَارٍ اَتَانٍ وَاَنَا يَوْمَئِذٍ قَدْ نَاهَزْتُ الْاِحْتِلَامَ وَرَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُصَلِّيْ بِالنَّاسِ بِمِنًى اِلٰى غَيْرِ جِدَارٍ فَمَرَرْتُ بَيْنَ يَدَيْ بَعْضِ الصَّفِ فَنَزَلْتُ وَاَرْسَلْتُ الْاَتَانَ تَرْتَعُ وَدَخَلْتُ فِي الصَّفِّ فَلَمْ يُنْكِرْ ذٰلِكَ عَلَيَّ اَحَدٌ. (گذشتہ: ۷۶)

**ترجمہ** باب، امام کا سترہ، ان لوگوں کا بھی سترہ ہے جو اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے ارشاد فرمایا کہ میں ایک گدھی پر سوار ہو کر (نماز کے لیے) آیا اور اس وقت میں جوانی کے قریب عمر کو پہنچا ہوا تھا، اس وقت رسول اللہ ﷺ منیٰ کے میدان میں دیوار کے علاوہ (کسی اور سترہ) کی طرف رخ کر کے لوگوں کو نماز پڑھا رہے تھے، تو میں نمازیوں کی صف کے ایک حصہ کے سامنے سے گذرا اور اتر گیا اور میں نے گدھی کو چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا اور خود نماز کی صف میں شامل ہو گیا، پھر کسی نے اس سلسلہ میں مجھ پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

**سابق سے ربط** بخاری شریف کے بعض نسخوں میں یہاں "باب سترۃ الامام الخ" سے پہلے "ابو اب سترۃ المصلی" بھی ہے، یعنی یہاں سے کھلے میدان میں نمازی کے لیے سترہ قائم کرنے کے احکام ذکر کیے جائیں گے، ابواب قبلہ سے ان کا ربط ظاہر ہے، علامہ عینیؒ نے لکھا ہے کہ ماقبل میں مسجد کے احکام بیان کیے جا رہے تھے، جن میں سترہ کی عام طور پر ضرورت نہیں ہوتی، اب یہاں یہ بیان کیا جائے گا کہ اگر مسجد کے علاوہ کھلے میدان میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہو تو سترہ قائم کر لینا چاہیے۔

**مقصد ترجمہ** "سُتْرَۃٌ "جمع" سُتَرٌ" اس روک یا آڑ کو کہتے ہیں جسے نمازی اپنے سامنے کی جانب گذرنے والوں سے نماز کی حفاظت کے لیے قائم کرلیتا ہے، تا کہ کسی کے سامنے گذرنے سے اس کی توجہ دوسری طرف مبذول نہ ہو اور اس کی نماز کا خشوع وخضوع متاثر نہ ہو، سترہ کے سلسلہ میں فقہاء نے یہ وضاحت کی ہے کہ اس کی اونچائی ایک ذراع اور اس کی موٹائی ایک انگلی کے بقدر ہو تو کافی ہے، اور اس کو ناک کی سیدھ میں نہ رکھنا چاہئے، بلکہ داہنی یا بائیں آنکھ کے محاذات میں کرلینا چاہئے۔

اس باب میں امام بخاریؒ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ جماعت کی نماز میں ہر شخص کو الگ الگ سترہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بلکہ امام کے لیے جو سترہ قائم کیا جائے گا وہی سترہ قوم کے لیے کافی ہوگا اور امام ومقتدی دونوں کا ایک ہی سترہ شمار کیا جائے گا، حنفیہ، شوافع اور حنابلہ سب کا یہی مسلک ہے، البتہ مالکیہ کے یہاں امام اور مقتدی کے لیے سترہ تو ایک ہی کافی ہے مگر وہ یہ تفصیل کرتے ہیں کہ مقتدیوں کا سترہ خود امام ہے، اور امام کا سترہ وہ چیز ہے جو امام کے سامنے قائم کی جائے، جمہور اور مالکیہ کے مسلک میں فرق اس طرح واضح ہوگا کہ اگر نماز سترہ کے بغیر ہو رہی ہو اور کوئی نماز کے سامنے سے گذر جائے تو اس سے امام کی نماز متاثر ہوگی، مقتدیوں کی نہیں ہوگی؛ کیوں کہ مقتدیوں کا سترہ خود امام ہے، یا نماز سترہ ہی کے ساتھ ہو رہی ہے، اور کوئی امام اور سترہ کے درمیان سے گذرے تو اس صورت میں بھی مالکیہ کے یہاں مقتدیوں کی نماز میں خلل واقع نہ ہوگا۔

امام بخاریؒ اس مسئلہ میں جمہور کے ساتھ ہیں کہ امام کا سترہ صرف امام ہی کا سترہ نہیں ہے، بلکہ مقتدیوں کا بھی سترہ ہے اور اس کے لیے انہوں نے ترجمۃ الباب میں "سترة الامام سترة من خلفه" کے الفاظ ذکر کئے ہیں، یہ الفاظ بھی طبرانی کی ایک روایت کے ہیں، لیکن روایت کے ضعیف ہونے کی بنیاد پر امام بخاری کوئی اشارہ بھی نہیں کرتے کہ یہ حدیث ہے، گویا امام بخاریؒ روایت کے ضعف کے سبب اسے قول رسول کہنا بھی مناسب نہیں سمجھتے لیکن مسئلہ چونکہ ان کے نزدیک بھی یہی ہے، اس لیے ترجمۃ الباب میں وہ الفاظ نقل کر دیئے اور بتلا دیا کہ امام کا سترہ قوم کے لیے بھی کافی ہے۔

**تشریح حدیث** اس باب کے تحت امام بخاریؒ نے تین روایتیں ذکر کی ہیں، پہلی روایت حضرت ابن عباسؓ سے ہے جو کتاب العلم میں " متى يصح سماع الصغير " کے تحت گذر گئی ہے، حضرت ابن عباسؓ بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک سواری پر سوار ہو کر منیٰ کے میدان میں پہنچا تو نماز ہو رہی تھی، میں نے نمازیوں کی صف کے سامنے سے بھی گذرا، نماز میں آپ ﷺ کے سامنے دیوار بھی نہیں تھی، میں نے سواری کی گدھی کو چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا، یعنی وہ نمازیوں کے سامنے آتی جاتی رہی اور میں صف کے کنارے پر نماز میں شریک ہوگیا اور میرے اس فعل پر کسی نے اعتراض بھی نہیں کیا، اعتراض تو جب ہوسکتا تھا کہ کسی کی نماز میں خلل واقع ہوتا، جب کسی کی نماز میں کوئی خلل واقع ہی نہیں ہوا، کیوں کہ یہ نماز امام بخاریؒ کے استنباط کے مطابق سترہ کے ساتھ ہو رہی تھی تو کسی کے اعتراض کا کوئی

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

**ترجمۃ الباب کا ثبوت** ترجمہ ہے کہ امام کا سترہ قوم کے لیے کافی ہے، اور اس کے تحت دی گئی پہلی روایت میں بظاہر سترہ کا کوئی ذکر نہیں، بلکہ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے کوئی دیوار نہیں تھی، جس کا بظاہر مفہوم یہ ہے کہ منی کے میدان میں یہ نماز سترہ کے بغیر ہو رہی تھی، چنانچہ ابن حجرؒ نے تبصرہ کیا ہے کہ اس روایت سے سترہ کے ثبوت پر استدلال کرنا محل نظر ہے، بلکہ اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ امام شافعیؒ نے " الی غیر جدار " کا مطلب " الی غیر سترة " متعین فرمایا ہے، پھر امام بیہقی نے امام بخاریؒ کے بالکل برخلاف اسی روایت پر جو ترجمہ منعقد کیا ہے، اس کے الفاظ ہیں " باب من صلي الى غير سترة " یعنی سترہ کے بغیر نماز پڑھنے کا بیان۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ باتیں نظر بہ ظاہر گو صحیح معلوم ہوتی ہیں، مگر دقت نظر امام بخاریؒ ہی کے ترجمہ میں ہے، کیونکہ روایت کے الفاظ ہیں " یصلي بالناس بمنى الى غير جدار " اور لفظ غیر ہمیشہ صفت واقع ہوتا ہے، اس لیے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی: " یصلي بالناس بمنى الى شئ غير جدار " اس صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ منی میں دیوار کے علاوہ کسی اور چیز کی طرف رخ کر کے نماز پڑھا رہے تھے، نیز یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا عام معمول بھی یہ تھا کہ آپ کھلی فضا میں نماز پڑھاتے تو سترہ قائم فرما لیتے تھے، اس لیے حضرت ابن عباسؓ کے الفاظ کا آپ کے عام معمول کے مطابق وہی مفہوم مراد لینا بہتر ہے، جو امام بخاریؒ نے سمجھا ہے، نیز یہ کہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میرے اس عمل پر کسی نے اعتراض بھی نہیں کیا، یہ بھی امام بخاریؒ ہی کی دلیل ہے کیوں کہ جب سترہ قائم تھا تو کسی کے لیے اعتراض کا موقع ہی نہیں تھا۔

بہر حال امام بخاریؒ کا اس روایت سے ترجمۃ الباب ثابت کرنا ان کی دقت نظر کی دلیل ہے۔ واللہ اعلم

(۴۹۴) حَدَّثَنَا اِسْحٰقُ قَالَ نَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ نُمَيْرٍ قَالَ نَا عُبَيْدُ اللّٰهِ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ اِذَا خَرَجَ يَوْمَ الْعِيْدِ اَمَرَ بِالْحَرْبَةِ فَتُوْضَعُ بَيْنَ يَدَيْهِ فَيُصَلِّيْ اِلَيْهَا وَالنَّاسُ وَرَآءَهٗ وَكَانَ يَفْعَلُ ذٰلِكَ فِي السَّفَرِ فَمِنْ ثَمَّ اتَّخَذَهَا الْاُمَرَاءُ .

(آئندہ: ۴۹۸، ۹۷۲، ۹۷۳)

**ترجمہ** حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب عید کے دن (نماز کے لیے) نکلتے تو (خادم کو) نیزہ لیجانے کا حکم دیتے، یہ نیزہ (نماز میں) آپ ﷺ کے سامنے گاڑ دیا جاتا اور آپ ﷺ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے اور دوسرے لوگ آپ ﷺ کے پیچھے نماز پڑھتے اور آپ ﷺ سفر میں بھی ایسا ہی کرتے تھے، پھر امراء نے اس کو یہیں سے اختیار کیا ہے۔

**تشریح حدیث** یہ اس باب کی دوسری روایت ہے، حضرت ابن عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کا معمول یہ تھا کہ جب آپ عید کی نماز کے لیے باہر تشریف لیجاتے تو ایک نیزہ آپ ﷺ کے ساتھ لیجایا جاتا، اس چھوٹے نیزے کے لیے حربۃ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، حربۃ اور رُمح میں فرق یہ ہے کہ رُمح کی پیکان چوڑی ہوتی ہے اور حربۃ کی پیکان مخروطی یعنی نوک نکلی ہوئی ہوتی ہے، جیسے شام دار چھڑی ہوتی ہے۔

حضرت سعد قرظؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حربہ حضور پاک ﷺ کو نجاشی نے ہدیہ میں بھیجا تھا، جسے آپ ﷺ نے اس طرح کی ضروریات کے لیے استعمال فرمایا، اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زبیر بن عوامؓ کو غزوۂ احد میں ایک مشرک سے یہ نیزہ ہاتھ لگا تھا، جس کو حضور ﷺ نے ان سے لیا، ابن حجرؒ نے دونوں روایتوں کے درمیان اس طرح تطبیق دی ہے کہ حضرت زبیرؓ والا نیزہ پہلے استعمال کیا جارہا تھا، پھر نجاشی کا ہدیہ کیا ہوا نیزہ استعمال ہونے لگا۔

**فتوضع بین یدیہ الخ** ۔ یہ حربہ آپ ﷺ کے ساتھ چلتا اور نماز میں یہ آپ ﷺ کے سامنے رکھا جاتا، نماز میں سامنے رکھنے کے لیے وضع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جس کے بظاہر معنی تو یہی ہیں کہ اس کو زمین میں گاڑ دیا جاتا تھا، لیکن وضع کی تعبیر میں گاڑا جانا ضروری نہیں، بلکہ اگر اس کو زمین پر رکھ دیا جائے، تب بھی وہ ''توضع بین یدیہ'' کا مصداق ہوگا۔ اور اس تعبیر کے پیش نظر زمین پر رکھا ہوا حربہ یا چھڑی سترہ کے طور پر کافی ہونا چاہئے ۔ اور امام احمدؒ کے نزدیک تو حضرت ابوہریرہؓ کی مسند احمد اور ابن ماجہ کی روایت کے مطابق نمازی کا اپنے سامنے خط کھینچ لینا بھی کافی ہے، روایت کے الفاظ یہ ہیں: ''**اذا صلی احدکم فلیجعل تلقاء وجھہ شیئا فان لم یجد فلینصب عصا فان لم یکن فلیخط خطاً**'' (مشکوۃ ص ۷۴) جب تم میں کوئی نماز پڑھے تو اس کو اپنے سامنے کچھ رکھ لینا چاہئے، اگر کوئی چیز نہ ملے تو وہ عصا کو کھڑا کرلے اور اگر یہ بھی نہ ملے تو خط کھینچ لینا چاہئے۔

اگرچہ اس روایت کی سفیان بن عیینہ اور امام شافعیؒ وغیرہ نے تضعیف کی ہے، لیکن ابن حبان اور ابن مدینی وغیرہ نے اس کو صحیح قرار دیا ہے، اس لیے اصل ضعف کا اعتبار کرتے ہوئے امام مالکؒ اور اکثر فقہاء احناف کے نزدیک اور امام شافعیؒ کے قول جدید میں سترہ کی جگہ خط کھینچنے کو بے حقیقت بات قرار دیا گیا ہے اور روایت کی تصحیح کو معتبر مانتے ہوئے امام احمدؒ امام شافعیؒ کے قول قدیم اور متاخرین احناف کے یہاں اس کو قبول کیا گیا ہے۔

امام بخاریؒ کا ترجمۃ الباب اس روایت سے اس طرح ثابت ہے کہ روایت سے یہ معلوم ہوگیا کہ آپ نماز کے لیے باہر نکلتے تو حربہ ساتھ ہوتا تھا اور اس کو امام کے سامنے نصب کردیا جاتا تھا اور قوم کے لیے بھی اس کو کافی سمجھا جاتا تھا۔ قوم کے لیے الگ سترہ کا ہونا کسی روایت سے معلوم نہیں ہوتا، نیز یہ تفصیل بھی کسی روایت میں مذکور نہیں کہ حربہ کو امام کے لیے سترہ مانا جائے اور امام کو قوم کے حق میں سترہ قرار دیا جائے۔

"من ثم اتخذ ها الامراء " یہ الفاظ حضرت ابن عمرؓ کے نہیں ہیں، بلکہ یہ آخری جملہ حضرت نافعؒ کا ہے، حافظ ابن حجرؒ اور علامہ عینیؒ نے اس کو حضرت نافعؒ کی طرف منسوب کیا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں حربہ اور نیزہ ساتھ رکھنے میں مختلف مصلحتیں تھیں، جن میں سے ایک بات سترہ کے طور پر استعمال کرنا بھی ہے، لیکن اس دور کے امراء بنو امیہ کے یہاں جو اس کا رواج ہوا ہے کہ باہر نکلتے ہیں تو حربہ ساتھ ہوتا ہے، حضرت نافعؒ کہتے ہیں کہ اس کی اصل یہی ہے۔

الفاظ سے یہ صاف معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت نافعؒ امراء کے اس عمل کی تائید کرنا چاہتے ہیں یا ان پر نکیر کر رہے ہیں، تائید تو اس طرح نکلتی ہے کہ امراء کے یہاں اس کا رواج درست ہے کہ اس کی اصل پیغمبر علیہ السلام سے ثابت ہے، اور نکیر اس طرح ہوسکتی ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے زمانہ میں اس حربہ کا استعمال ضرورۃً تھا اور اس کی مختلف مصلحتیں تھیں، اب اس میں حدود سے تجاوز ہو گیا اور اب یہ امراء کی ایک رسم بن گئی ہے۔ واللہ اعلم

(۴۹۵) حَدَّثَنَا اَبُوْ الْوَلِيْدِ قَالَ نَا شُعْبَةُ عَنْ عَوْنِ بْنِ اَبِيْ جُحَيْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ اَبِيْ يَقُوْلُ اِنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى بِهِمْ بِالْبَطْحَآءِ وَبَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةٌ الظُّهْرَ رَكْعَتَيْنِ وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ تَمُرُّ بَيْنَ يَدَيْهِ الْمَرْأَةُ وَالْحِمَارُ. (گذشتہ:۱۸۷)

**ترجمہ** حضرت ابو جحیفہ (وہب بن عبد اللہؓ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان لوگوں کو میدان بطحاء میں ظہر کی نماز دو رکعت اور عصر کی نماز دو رکعت پڑھائی اور اس وقت آپ ﷺ کے سامنے ایک چھوٹا نیزہ تھا اور آپ کے سامنے سے عورتیں اور گدھے گذر رہے تھے۔

**تشریح حدیث** یہ اس باب کی تیسری روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بطحاء کے میدان میں جو مکہ مکرمہ کے قریب واقع ہے، ظہر اور عصر کی نماز پڑھائی اور سفر کی بنیاد پر قصر کیا، روایت میں ہے عنزہ آپ کے سامنے گاڑ دیا گیا، عنزہ حرب سے چھوٹے نیزہ کو کہتے ہیں، یہ روایت امام بخاری نے مختلف مقامات پر ذکر کی ہے اور کتاب الوضو میں "باب استعمال فضل وضوء الناس " کے تحت تفصیل سے گذر چکی ہے۔

روایت میں آیا کہ عورتیں اور گدھے بھی سترہ کے سامنے سے گذرتے رہے مگر اس کی پرواہ نہیں کی گئی، امام احمدؒ کے نزدیک سترہ کے بغیر اگر نماز کے سامنے سے کلب اسود گذر جائے تو نماز ٹوٹ جاتی ہے اور گدھے اور عورت کے بارے میں انھوں نے فرمایا کہ مجھے شک ہے، لیکن شوافع اور احناف کے یہاں گذرنے سے نماز نہیں ٹوٹتی، یہ بحثیں آگے آرہی ہیں۔

باب مذکور سے تعلق ظاہر ہے کہ امام کے سترہ کو قوم کے لیے کافی سمجھا گیا، حضرت علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ امام کے سترہ کو قوم کے لیے کافی قرار دینے میں حضرات احناف کے مسلک کی تائید ہے کہ جماعت کی نماز کو ایک ہی نماز سمجھا گیا ہے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جماعت کی نماز منفرد کی نماز سے الگ مستقل ایک نوع ہے اور اس کے احکام منفرد کی

نماز سے بالکل مختلف ہیں کہ جماعت کی نماز میں امام کی قرأت اور امام کا سترہ سب مقتدیوں کے لیے کافی ہے۔

## [۹۱] بَابٌ قَدْرُ كَمْ يَنْبَغِي اَنْ يَكُوْنَ بَيْنَ الْمُصَلِّيْ وَالسُّتْرَةِ

(۴۹۶) حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ زُرَارَةَ قَالَ نَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ اَبِيْ حَازِمٍ عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ قَالَ كَانَ بَيْنَ مُصَلّٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَبَيْنَ الْجِدَارِ مَمَرُّ الشَّاةِ. (آئندہ: ۷۳۳۴)

(۴۹۷) حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ ابْنُ اِبْرَاهِيمَ قَالَ نَا يَزِيْدُ بْنُ اَبِيْ عُبَيْدٍ عَنْ سَلَمَةَ قَالَ كَانَ جِدَارُ الْمَسْجِدِ عِنْدَ الْمِنْبَرِ مَا كَادَتِ الشَّاةُ تَجُوزُهَا.

**ترجمہ** باب، نمازی اور سترہ کے درمیان کتنی مقدار کا فاصلہ ہونا چاہئے؟ حضرت سہل بن سعدؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کی نماز کی جگہ اور دیوار قبلہ کے درمیان بکری کے گزرنے کے بقدر فاصلہ تھا، حضرت سلمہ بن اکوع سے روایت ہے کہ مسجد نبوی کی دیوار، منبر سے اتنی قریب تھی کہ بمشکل بکری کے گذرنے کی گنجائش تھی۔

**مقصد ترجمہ** اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ سترہ مصلی سے قریب ہونا چاہئے، اس میں ایک فائدہ تو یہ ہے کہ نماز کی حدود متعین ہو جاتی ہیں، اور نشان نصب ہو جاتا ہے گویا نمازی نے سترہ نصب کر کے یہ واضح کر دیا کہ میری نماز کا تعلق اتنے حصے سے ہے، اگر کوئی اس کے درمیان سے گزرتا ہے تو وہ میرے اور رب العالمین کے درمیان تعلق کو توڑنے کا مجرم ہوگا اور مجھے یہ حق ہوگا کہ اس تعلق کو منقطع نہ ہونے دوں اور گذرنے والوں کو گذرنے نہ دوں۔ دوسرا فائدہ گذرنے والوں کے حق میں ہے کہ اگر وہ سترہ سے باہر گذرنا چاہتے ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، گویا گذرنے والوں کے لیے تنگی ختم ہوگئی اور آسانی پیدا ہوگئی اور ظاہر ہے کہ ان مقاصد کے لیے سترہ مقام سجود سے قریب ہونا چاہئے۔

اب دوسری بات یہ ہے کہ سترہ کو مقام سجود سے کتنا قریب ہونا چاہئے؟ تو اس کے لیے امام بخاریؒ نے دو روایتیں پیش کی ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ سترہ محل سجود سے بالکل متصل ہونا چاہئے، کیوں کہ پہلی روایت میں دیوار قبلہ اور سجدہ گاہ کے درمیان بکری کے گذرنے کے بقدر جگہ مذکور ہے اور دوسری روایت میں سجدگاہ اور دیوار قبلہ کے درمیان بکری کا گذرنا بھی بمشکل بیان کیا گیا ہے اور دیوار قبلہ ہی سترہ بنی ہوئی ہے، اس لیے معلوم ہوا کہ سترہ نمازی کے سجدہ کی جگہ سے قریب ہونا چاہئے۔

**تشریح حدیث** پہلی روایت میں حضرت سہلؓ بن سعد نے بیان فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے مصلی اور دیوار قبلہ کے درمیان بکری کے گذرنے کے بقدر فاصلہ تھا، یہاں مصلی سے مراد، جائے قیام نہیں بلکہ جائے سجود ہے؛ کیوں کہ دوسری روایت میں حضرت سلمہ بن اکوع بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے منبر اور دیوار قبلہ کے درمیان اتنا کم فاصلہ تھا کہ بکری بھی بمشکل گذر سکتی تھی، اور آپ کے منبر کا جو کنارہ دیوار قبلہ کے قریب تھا وہ آپ کی سجدہ گاہ

کے محاذات میں تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ مسجد نبوی میں محراب نہیں تھی، رسول اللہ ﷺ منبر کے برابر میں بائیں جانب کھڑے ہو کر نماز پڑھاتے تھے، گویا منبر جتنی دور میں پھیلا ہوا ہے اتنی جگہ آپ کے سامنے کی جانب میں موجود ہے، پھر منبر سے دیوار قبلہ تک بہت کم فاصلہ ہے، جس کو راوی نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اس میں بکری کا گذرنا بھی مشکل تھا۔

امام بخاریؒ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ان دونوں روایات میں دیوار قبلہ کا سجدہ گاہ سے جو فاصلہ بتلایا گیا ہے، بس وہی فاصلہ کھلے میدان میں نمازی کی سجدہ گاہ اور سترے کے درمیان ہونا چاہئے، کیوں کہ دیوار قبلہ ہی تو سترہ کا کام دے رہی ہے، اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سترہ کا فاصلہ سجدہ گاہ سے مقرر کرو تو بکری کی گذرگاہ کے بقدر ہوگا اور کھڑے ہونے کی جگہ سے مقرر کرو تو آپ کے منبر شریف کے پھیلاؤ کے بقدر، جس کو حضرت ابن عمرؓ نے چند ابواب کے بعد حضرت بلالؓ کے حوالہ سے خانہ کعبہ کے اندر پڑھی جانے والی نماز میں تین ذارع بیان کیا ہے: "بینه وبین الجدار الذی قبل وجهه قریبا من ثلثة اذرع" (بخاری ص:۷۲/ج:۱) آپ کے اور (خانہ کعبہ کی) دیوار کے درمیان جو سامنے کی جانب تھی تین ہاتھ کا فاصلہ تھا۔

یہ فاصلہ تین ذراع بیان کیا گیا ہے، ذراع کہنی سے بیچ کی انگلی تک فاصلہ کو کہتے ہیں، بس تین ہاتھ کے فاصلہ پر سترہ قائم کر کے نماز پڑھنی چاہئے۔

## [۹۲] بَابُ الصَّلٰوةِ اِلَى الْحَرْبَةِ

(۴۹۸) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ نَا يَحْيٰى عَنْ عُبَيْدِ اللّٰهِ قَالَ اَخْبَرَنِیْ نَافِعٌ عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ كَانَ يُرْكَزُ لَهُ الْحَرْبَةُ فَيُصَلِّی اِلَيْهَا. (گذشتہ:۴۹۴)

**ترجمہ** باب، نیزے کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا بیان۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لیے نیزہ گاڑ دیا جاتا تھا اور آپ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** ''حربۃ'' اس نیزے کو کہتے ہیں جس کا پیکان نوک دار ہو، امام بخاری نے ترجمہ منعقد کر دیا کہ حربہ کو سترہ بنا کر نماز پڑھنا جائز ہے، عام طور پر شارحین نے مقصد ترجمہ سے بحث نہیں کی، البتہ حضرت گنگوہی رحمہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ نماز میں بت پرستوں کے تشبہ سے بچنا شریعت کا ایک اصول ہے اور ہتھیار ایک ایسی چیز ہے جس کی بعض فرقوں کے یہاں تعظیم پائی جاتی ہے، اس لیے امام بخاری نے اس باب میں نیزہ وغیرہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا جواز ثابت کر دیا۔

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ امام بخاری اس باب میں سترہ کے طول وعرض کے بارے میں یہ وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ اس کی کوئی تحدید نہیں ہے، چھوٹا نیزہ یا بڑا نیزہ یا چھڑی وغیرہ اس کے لیے کافی ہے، گویا فقہاء نے جو ایک ذراع کی

مقدار بیان کی ہے وہ بھی تحدید کے طور پر نہیں ہے۔

ان سب احتمالات کے درست ہونے کے ساتھ ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ امام بخاری اس باب میں اور اس سے اگلے باب میں سترہ کے سلسلہ میں توسع اور تعمیم کا حکم بیان کرنا چاہتے ہیں کہ سترہ خواہ لکڑی کا ہو یا لوہے کا، نیزہ چھوٹا ہو یا بڑا، جس چیز کو بھی آپ اپنے سامنے نصب کرلیں گے سترہ بن جائے گی، بلکہ آئندہ ابواب میں یہ احکام بھی آئیں گے کہ درخت اور جانور کو بھی سترہ بنایا جاسکتا ہے، گویا سترہ کے سلسلہ میں نہ ذی روح اور بے جان کی قید ہے، نہ کسی مادہ کا ہونا شرط ہے، نہ اس کا از قسم مصنوعات ہونا ضروری ہے، بلکہ ہر وہ چیز جو نمازی کے سامنے کی جہت میں روک بن جائے وہ سترہ ہے، مثلاً کوئی درخت یا سامان، یا پتھر یا ستون یا جانور جو پہلے سے اپنی جگہ موجود ہے، اگر اس کو سترہ بنا کر نماز پڑھی جائے تو اس کو بحیثیت سترہ شرعاً معتبر سمجھا جائے گا، یعنی اس میں نہ مادہ کی قید ہے، نہ شکل وصورت کا تعین ہے، روایت گذر چکی ہے۔

## [۹۳] بَابُ الصَّلٰوةِ اِلَی الْعَنَزَةِ

(۴۹۹) حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ نَا شُعْبَةُ قَالَ نَا عَوْنُ بْنُ اَبِیْ جُحَیْفَةَ قَالَ سَمِعْتُ اَبِیْ قَالَ خَرَجَ اِلَیْنَا النَّبِیُّ ﷺ بِالْهَاجِرَةِ فَاُتِیَ بِوَضُوْءٍ فَتَوَضَّأَ فَصَلّٰی بِنَا الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَبَیْنَ یَدَیْهِ عَنَزَةٌ وَالْمَرْأَةُ وَ الْحِمَارُ یَمُرَّانِ مِنْ وَّرَائِهَا ۔ (گذشتہ:۱۸۷)

(۵۰۰) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ حَاتِمِ بْنِ بَزِیْعٍ قَالَ نَا شَاذَانُ عَنْ شُعْبَةَ عَنْ عَطَاءِ بْنِ اَبِیْ مَیْمُوْنَةَ قَالَ سَمِعْتُ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ ﷺ اِذَا خَرَجَ لِحَاجَتِهٖ تَبِعْتُهٗ اَنَا وَ غُلَامٌ وَمَعَنَا عُكَّازَةٌ اَوْ عَصاً اَوْ عَنَزَةٌ وَمَعَنَا اِدَاوَةٌ فَاِذَا فَرَغَ مِنْ حَاجَتِهٖ نَاوَلْنَاهُ الْاِدَاوَةَ ۔

(گذشتہ:۱۵۰)

**ترجمہ** باب، عنزہ، (چھوٹے نیزے) کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا بیان۔ حضرت ابو جحیفہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ دوپہر میں ہمارے پاس تشریف لائے تو آپ کے سامنے وضو کا پانی پیش کیا گیا، پھر آپ نے وضو کیا اور آپ نے ہمیں ظہر اور عصر کی نماز پڑھائی، جب کہ آپ کے سامنے چھوٹا نیزہ تھا اور عورتیں اور گدھے اس نیزے کے ادھر گذر رہے تھے۔

حضرت انس بن مالکؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ جب اپنی ضرورت کے لیے تشریف لے جاتے تو میں اور ایک لڑکا آپ کے پیچھے چلتے اور ہمارے ساتھ شام دار چھڑی یا لاٹھی یا چھوٹا نیزہ ہوتا تھا، اور ہمارے ساتھ پانی کا ایک برتن ہوتا تھا، پھر جب آپ اپنی ضرورت سے فارغ ہو جاتے تو ہم آپ کو برتن دیدیتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** جنس سترہ کی تعمیم سے متعلق یہ دوسرا باب ہے، پہلے باب میں بڑے نیزے کو سترہ بنانے کا بیان تھا، اس باب میں چھوٹے نیزے کو سترہ بنانے کا ذکر ہے، اس باب میں امام بخاری نے دو روایتیں ذکر کی ہیں، جن میں پہلی روایت تو چند ابواب پہلے گذری اور دوسری روایت کتاب الوضو میں گذر چکی ہے، پہلی روایت کا ترجمۃ الباب سے ربط ظاہر ہے، لیکن دوسری روایت کا ربط ظاہر نہیں ہے، کیوں کہ اس میں عصا اور عنزہ کے ساتھ لے جانے کا تذکرہ ہے، ان کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا ذکر نہیں ہے، مگر چونکہ ان چیزوں یا ان میں سے کسی چیز کے ساتھ لے جانے کا ایک اہم فائدہ، ان کا سترہ کے طور پر استعمال بھی رہا ہے۔ اس لیے امام بخاری نے اس سے اپنا ترجمۃ الباب ثابت کر دیا، دوسری بات اس دوسری روایت کے بارے میں یہ ہے کہ اس میں کلمہ ''او'' کے ذریعہ تین چیزیں مذکور ہیں، لوہا جڑی ہوئی چھڑی یا لاٹھی یا عنزہ، اگر کلمہ ''او'' کو راوی کے شک پر محمول کیا جائے تو ترجمۃ الباب کے ثابت کرنے میں تکلف سے کام لینا ہوگا، اور اگر کلمہ ''او'' شک کی بجائے ''تنویع'' کے لیے ہو تو ثبوت آسان ہو جائے گا، گویا راوی یہ کہنا چاہتا ہے کہ ان تینوں چیزوں میں سے کوئی ایک چیز ساتھ ہوتی تھی جس سے دیگر فوائد کے ساتھ سترہ کا کام بھی لیا جاتا تھا۔ واللہ اعلم

## [۹۴] بَابُ السُّتْرَةِ بِمَكَّةَ وَغَيْرِهَا

(۵۰۱) حَدَّثَنَا سُلَيْمَانُ بْنُ حَرْبٍ قَالَ نَا شُعْبَةُ عَنِ الْحَكَمِ عَنْ اَبِيْ جُحَيْفَةَ قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِالْهَاجِرَةِ فَصَلّٰى بِالْبَطْحَآءِ الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ رَكْعَتَيْنِ وَنَصَبَ بَيْنَ يَدَيْهِ عَنَزَةً وَتَوَضَّأَ فَجَعَلَ النَّاسُ يَتَمَسَّحُوْنَ بِوَضُوْءِهٖ. (گذشتہ: ۱۸۷)

**ترجمہ** باب، مکہ مکرمہ اور اس کے علاوہ دوسری جگہوں میں سترہ قائم کرنے کا بیان۔ حضرت ابو جحیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ دوپہر کو ہمارے سامنے تشریف لائے، اور آپ نے بطحاء میں ظہر اور عصر کی دو دو رکعتیں پڑھائیں اور اپنے سامنے ایک چھوٹا نیزہ کھڑا کر لیا، اور آپ نے وضو کیا تو لوگ آپ کے وضو کے پانی کو (تبرک کے طور پر) اپنے منھ پر ملنے لگے۔

**مقصد ترجمہ** امام بخاری یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سترہ جس مقصد کے لیے نصب کیا جاتا ہے، اس کے لحاظ سے کسی مقام کی خصوصیت نہیں ہے، جس طرح نمازی غیر مکہ میں کھلے میدان میں نماز کے لیے سترہ قائم کرتا ہے، اسی طرح اگر مکہ میں نماز ہو رہی ہو اور لوگوں کی آمد و رفت کا امکان ہو تو سترہ قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

اس باب کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ بعض حضرات نے مکہ مکرمہ میں سترہ کی ضرورت کا انکار کیا ہے، اور عجیب بات کہی ہے کہ سترہ پر قبلہ کا وہم ہوتا ہے، جب کہ مکہ مکرمہ میں قبلہ کعبۂ مقدسہ ہے، گویا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ایک

مقام پر دو قبلے نہیں ہو سکتے کہ ایک قبلہ تو سترہ ہوا اور دوسرا قبلہ خانۂ کعبہ، حالانکہ یہ خیال بالکل غلط ہے، ان حضرات نے سترہ کی حقیقت ہی نہیں سمجھی، سترہ کی مختصر حقیقت ہے حد بندی اور ربط خیال، حد بندی کا مطلب یہ ہے کہ نمازی نے جب سترہ قائم کر لیا تو گویا زبان حال سے اس نے گذرنے والے کو بتلایا کہ یہاں سے یہاں تک کی جگہ محفوظ ہے، یہاں رحمت خداوندی کا نزول ہو رہا ہے اور یہ میری توجہ کا مرکز ہے، اس میں گذرنا درست نہیں ہے، اسی طرح ربط خیال کا مطلب یہ ہے کہ اگر کھلے میدان میں سترہ کے بغیر نماز پڑھی جائے تو طبیعت میں انتشار کا پیدا ہونا لازمی ہے، اور انتشار ہوگا تو نماز میں خشوع وخضوع حاصل نہ ہو سکے گا، اس لیے خیالات کو انتشار سے بچانے کے لیے سترہ قائم کر لینے کی ضرورت ہے۔

امام بخاریؒ کا مقصد یہی ہے کہ سترہ کی حقیقت کے پیش نظر مکہ اور غیر مکہ دونوں برابر ہیں، اس میں مکہ اور غیر مکہ کی تفریق درست نہیں، حافظ ابن حجر کہتے ہیں کہ امام بخاری کے اس ترجمہ کا رخ مصنف عبدالرزاق میں مذکور باب کی تردید کی طرف ہے، مصنف میں ایک ترجمہ منعقد کیا ہے "باب لایقطع الصلوة بمكة شئ" کہ مکہ میں کسی چیز کے سامنے گزرنے سے نماز منقطع نہیں ہوتی، پھر اس کے تحت وہ روایت ذکر کی گئی ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کا مسجد حرام میں سترہ کے بغیر نماز پڑھنا مذکور ہے، حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام بخاری اس ترجمہ میں اس کی تردید کرنا چاہتے ہیں اور جس روایت سے "لایقطع الصلوة بمكة شئ" پر استدلال کیا گیا ہے، اس کے ضعیف ہونے کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، حدیث کے ضعف کے ساتھ یہ حقیقت بھی ملحوظ رہنی چاہئے کہ حدیث میں مسجد حرام میں بغیر سترہ کے نماز کا ذکر ہے اور مصنف میں استدلال مسجد حرام میں سترہ کے بغیر نماز پر نہیں بلکہ مکہ مکرمہ میں سترہ کے بغیر نماز پر کیا گیا ہے، جب کہ مسجد حرام اور مکہ میں بہت فرق ہے، مسجد حرام صرف اس مخصوص مسجد کا نام ہے، جس کے صحن میں خانہ کعبہ واقع ہے، اور مکہ پورا شہر ہے، اس لیے مکہ میں مسجد حرام کے علاوہ کسی اور میدان میں نماز ہو تو وہاں سترہ کی ضرورت ظاہر ہے، رہا مسجد حرام کا معاملہ تو اس میں تفصیل ہے کہ اگر مسجد حرام میں خانہ کعبہ سے اتنے قریب ہو کر نماز پڑھ رہا ہے کہ کسی کے سامنے سے گذرنے کا خطرہ نہیں تو سترہ کی ضرورت نہیں ہے، لیکن اگر دیوار کعبہ سے دور ہٹ کر ایسی جگہ نماز پڑھ رہا ہے کہ دوسروں کے گذرنے کا احتمال ہے تو ایسی صورت میں سترہ نصب کرنے کی ضرورت ہے؛ البتہ طواف کرنے والوں کو اس سے مستثنیٰ کرنا ہوگا کہ ان کے سامنے سے گذرنے سے کوئی خرابی لازم نہیں آتی؛ کیوں کہ احادیث میں بیت اللہ کے طواف کو بھی نماز ہی کا حکم دیا گیا ہے، اس لیے طواف کرنے والا نمازی کے سامنے گذرے تو غیر مصلی کا مصلی کے سامنے سے گذرنا لازم نہیں آتا، یہ استنباط امام طحاوی کی طرف منسوب ہے اور اس کو بعض فقہاء نے نادر استنباط قرار دیا ہے۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** روایت کئی بار گذر چکی ہے، یہاں امام بخاری مکہ مکرمہ میں نماز کی صورت میں سترہ کی ضرورت ثابت کرنا چاہتے ہیں اور وہ اس طرح ثابت ہے کہ روایت میں مذکور بطحاء سے مراد بطحاء مکہ ہے، بطحاء مکہ میں نماز ہو رہی تھی مگر دیکھئے پیغمبر علیہ السلام کے سامنے عنزہ کا سترہ نصب کر دیا گیا تھا، معلوم ہوا کہ مکہ میں کھلے میدان میں

نماز ہو تو وہاں بھی سترہ کی ضرورت ہے۔

## [۹۵] بَابُ الصَّلٰوةِ اِلَی الْاُسْطُوَانَةِ

وَقَالَ عُمَرُ اَلْمُصَلُّوْنَ اَحَقُّ بِالسَّوَارِیْ مِنَ الْمُتَحَدِّثِیْنَ اِلَیْھَا. وَرَأَی ابْنُ عُمَرَ رَجُلًا یُصَلِّیْ بَیْنَ اُسْطُوَانَتَیْنِ فَاَدْنَاهُ اِلٰی سَارِیَةٍ فَقَالَ صَلِّ اِلَیْھَا

(۵۰۲) حَدَّثَنَا الْمَکِّیُّ بْنُ اِبْرَاھِیْمَ قَالَ نَا یَزِیْدُ بْنُ اَبِیْ عُبَیْدٍ قَالَ کُنْتُ آتِیْ مَعَ سَلْمَةَ بْنِ الْاَکْوَعِ فَیُصَلِّیْ عِنْدَ الْاُسْطُوَانَةِ الَّتِیْ عِنْدَ الْمُصْحَفِ فَقُلْتُ یَا اَبَا مُسْلِمٍ! اَرَاکَ تَتَحَرَّی الصَّلٰوةَ عِنْدَ ھٰذِهِ الْاُسْطُوَانَةِ، قَالَ فَاِنِّیْ رَاَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یَتَحَرَّی الصلاۃَ عِنْدَھَا.

(۵۰۳) حَدَّثَنَا قَبِیْصَةُ قَالَ نَا سُفْیٰنُ عَنْ عَمْرِو بْنِ عَامِرٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ قَالَ لَقَدْ اَدْرَکْتُ کِبَارَ اَصْحَابِ النَّبِیِّ ﷺ یَبْتَدِرُوْنَ السَّوَارِیَ عِنْدَ الْمَغْرِبِ وَزَادَ شُعْبَةُ عَنْ عَمْرٍو عَنْ اَنَسٍ حَتّٰی یَخْرُجَ النَّبِیُّ ﷺ. (آئندہ: ۶۲۵)

**ترجمہ** باب، ستون کی طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا بیان۔ اور حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ باتیں کرنے والوں سے ستونوں پر نماز پڑھنے والوں کا زیادہ حق ہے۔ حضرت ابن عمرؓ نے ایک شخص کو دو ستونوں کے درمیان نماز پڑھتے دیکھا تو اسے (پکڑ کر) ایک ستون کے قریب کر دیا اور فرمایا کہ اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھو۔ حضرت یزید بن ابی عبیدؒ نے فرمایا کہ میں حضرت سلمہ بن اکوع کے ساتھ (مسجد نبوی میں) آتا تو وہ اس ستون کے پاس نماز پڑھتے جہاں قرآن شریف رکھا ہوا تھا، تو میں نے ان سے کہا کہ اے ابو مسلم! میں یہ دیکھتا ہوں کہ آپ کوشش کر کے اس ستون کے پاس نماز پڑھتے ہیں، تو حضرت سلمہ نے جواب دیا کہ ہاں میں نے رسول اللہ ﷺ کو کوشش کر کے اس ستون کے پاس نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے بڑے بڑے صحابہ کو دیکھا کہ وہ مغرب کی نماز کے وقت (مسجد نبوی کے) ستونوں کی طرف (نماز پڑھنے کے لیے) لپکتے تھے۔ شعبہ نے حضرت انسؓ سے بروایت عمرو بن العاص اس روایت میں یہ اضافہ کیا: یہاں تک رسول اللہ ﷺ (اپنے حجرے سے) باہر تشریف لائیں۔

**مقصد ترجمہ** جنس سترہ میں توسع اور تعمیم کی وضاحت کے لیے امام بخاری نے یہ ابواب منعقد فرمائے ہیں، اس باب میں یہ وضاحت پیش نظر معلوم ہوتی ہے کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ سترہ کے نام سے کوئی مستقل چیز بنوائی جائے جسے نماز کے وقت سامنے رکھا جائے یا گاڑ لیا جائے وغیرہ، بلکہ جو چیز بھی نمازی کے مرکز توجہ کی حد بندی اور اس کے ربط خیال کے لیے کام میں لائی جائے وہی سترہ ہے، اگر کوئی چیز وہاں پہلے سے موجود ہے جیسے مسجد میں ستون یا میدان میں

درخت وغیرہ اوراس کونمازی اپنی نماز میں سترہ کے طور پر استعمال کرلے تو یہ درست ہے اوراس میں کوئی تنگی نہیں ہے۔

یہ باب اسی اصول کا ایک جزئیہ ہے کہ مسجد کے ستون کو سترہ بنایا جائے، اسی لئے حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ جونماز کے بعد ستونوں سے کمر لگا کر بات چیت میں مشغول ہوجاتے تھے کہ ستونوں پر نمازیوں کا حق ہے کہ انھیں نماز میں سترہ بنانے کے لیے ستونوں کی ضرورت ہے، گویا انھوں نے یہ فرمایا کہ ایک شخص کو گفتگو کے لیے کمر لگانے کی ضرورت ہے، اور دوسرے شخص کو نماز کے لیے سترہ کی ضرورت ہے تو بتاؤ کس کا حق زیادہ ہوگا؟ دوسرا اثر امام بخاریؒ نے ابن عمرؓ سے نقل کیا کہ انھوں نے یہ دیکھا کہ ایک شخص دوستونوں کے درمیان نماز پڑھ رہا ہے، انھوں نے ہاتھ پکڑ کر اسے ستون کے پیچھے کھڑا کردیا، گویا یہ بتادیا کہ درمیان میں نماز پڑھنے سے گذرنے والوں کو بھی تکلیف ہوگی اور تمہارے قلب میں بھی تشویش ہی رہے گی، اس لیے نماز کے لیے یہ جگہ موزوں ہے جہاں ستون کا سترہ ہے۔

**تشریح حدیث** حضرت سلمہ بن اکوعؓ اس ستون کے پاس نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے جس کے نزدیک قرآن کریم رکھارہتا تھا، اس روایت میں "عند الاسطوانة التی عند المصحف" کے الفاظ ہیں اور مسلم شریف کی روایت میں "یصلی وراء الصندوق" کے الفاظ ہیں، جن کا بظاہر یہ مفہوم ہے کہ قرآن کریم کا نسخہ ایک صندوق میں کسی ستون کے پاس رکھارہتا تھا، یہ ستون بعد میں "اسطوانة المہاجرین" کے نام سے مشہور ہوگیا تھا۔

بہرحال جب سلمہ بن اکوع سے معلوم کیا گیا کہ آپ اسی ستون کے پاس نماز کا اہتمام فرماتے ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس ستون کے پاس نماز پڑھنے کا اہتمام کرتے ہوئے دیکھا ہے، ظاہر ہے کہ حضرت سلمہ ابن اکوع اس ستون سے سترہ کا کام لیتے ہوں گے۔

دوسری روایت میں آیا ہے کہ صحابہ کرام مغرب کی اذان کے ساتھ مسجد نبوی کے ستونوں کی طرف لپکتے تھے، تا کہ ان ستونوں کو سترہ بنا کر نماز پڑھیں، معلوم ہوا کہ مسجد کے ستون کو سترہ کے طور پر استعمال کرنا درست ہے اور صحابہ کرام کا معمول رہا ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ مغرب کی نماز سے پہلے بن نفلوں کا روایت میں تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے بارے میں فقہاء کا مسلک اور ان کا مستدل کیا ہے؟ تو یہ بحث انشاء اللہ اپنی جگہ آئے گی، امام بخاری نے اس کے لیے "باب الصلوٰة قبل المغرب" (ص:۱۵۷/ ج:۱) منعقد کیا ہے۔

## [۹۶] بَابُ الصَّلٰوةِ بَيْنَ السَّوَارِيْ فِيْ غَيْرِ جَمَاعَةٍ

(۵۰۴) حَدَّثَنَا مُوْسَى ابْنُ اِسْمَاعِيْلَ قَالَ نَا جُوَيْرِيَةُ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ الْبَيْتَ وَاُسَامَةُ بْنُ زَيْدٍ وَعُثْمَانُ بْنُ طَلْحَةَ وَبِلَالٌ فَاَطَالَ ثُمَّ خَرَجَ وَكُنْتُ اَوَّلَ

النَّاسِ دَخَلَ عَلٰی اَثرِہٖ فَسَأَلْتُ بِلالاً اَیْنَ صَلّٰی؟ فَقَالَ بَیْنَ الْعَمُوْدَیْنِ الْمُقَدَّمَیْنِ ۔
(گذشتہ:۳۹۷)

(۵۰۵) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ یُوْسُفَ قَالَ اَنَا مَالِکُ بْنُ اَنَسٍ عَنْ نَافِعٍ عَنْ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ دَخَلَ الْکَعْبَۃَ وَاُسَامَۃُ بْنُ زَیْدٍ وَبِلَالٌ وَعُثْمَانُ بْنُ طَلْحَۃَ الْحَجَبِیُّ فَاَغْلَقَھَا عَلَیْہِ وَمَکَثَ فِیْھَا فَسَأَلْتُ بِلالاً حِیْنَ خَرَجَ مَا صَنَعَ النَّبِیُّ ﷺ؟ قَالَ جَعَلَ عَمُوْداً عَنْ یَسَارِہٖ وَعَمُوْداً عَنْ یَمِیْنِہٖ وَثَلٰثَۃَ اَعْمِدَۃٍ وَرَاءَ ہٗ وَکَانَ الْبَیْتُ یَوْمَئِذٍ عَلٰی سِتَّۃِ اَعْمِدَۃٍ ثُمَّ صَلّٰی وَقَالَ لَنَا اِسْمَاعِیْلُ حَدَّثَنِیْ مَالِکٌ فَقَالَ عَمُوْدَیْنِ عَنْ یَمِیْنِہٖ ۔　(گذشتہ:۳۹۷)

**ترجمہ** باب، ستونوں کے درمیان جماعت کے بغیر (تنہا) نماز پڑھنے کا بیان۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور حضرت اسامہ بن زیدؓ اور حضرت عثمان بن طلحہؓ اور حضرت بلال خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوئے اور آپ دیر تک اندر رہے، پھر باہر نکلے اور میں آپ کے پیچھے لوگوں میں سے سب سے پہلے وہاں پہنچا اور میں نے حضرت بلال سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کہاں نماز پڑھی؟ تو انھوں نے جواب دیا کہ آگے کے دوستونوں کے درمیان۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت اسامہ بن زیدؓ، حضرت بلالؓ اور حضرت عثمانؓ بن طلحہ حجبی خانہ کعبہ کے اندر داخل ہوئے، پھر اندر سے حضرت عثمان بن طلحہ نے دروازہ بند کردیا، اور آپ کعبہ کے اندر ٹھہرے رہے، پھر جب آپ ﷺ باہر نکلے تو میں نے حضرت بلالؓ سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ نے کیا کام کیا؟ تو انھوں نے بتلایا کہ آپ نے بائیں ستون کو بائیں طرف لیا اور دوسرے ستون کو داہنی طرف لیا اور تین ستونوں کو اپنے پیچھے چھوڑا، اس زمانہ میں خانہ کعبہ چھ ستونوں پر قائم تھا، پھر آپ نے نماز پڑھی۔ امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ ہم سے اسماعیل نے بیان کیا کہ ہم سے امام مالکؒ نے بیان فرمایا کہ آپ نے اپنے داہنی طرف دوستون لئے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ نمازی اگر منفرداً نماز پڑھ رہا ہے جماعت میں نہیں ہے، تو ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اس باب کو منعقد کرنے یا اس مسئلہ کو بیان کرنے کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ باب سابق میں حضرت ابن عمرؓ کا یہ عمل نقل کیا گیا تھا کہ انھوں نے ایک شخص کو دوستونوں کے درمیان نماز پڑھتے دیکھا تو اس کو پکڑ کر ایک ستون کے پیچھے کھڑا کردیا، اس سے یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ شاید ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے میں تنگی ہے، نیز یہ کہ سنن کی روایات میں ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے سے ممانعت کی گئی ہے، ابن ماجہ اور ترمذی میں روایات موجود ہیں، ترمذی شریف میں ہے: "عن عبدالحمید بن محمود قال صلینا خلف امیر من الامراء، فاضطرنا الناس فصلینا بین الساریتین، فلما صلینا قال انس بن مالک کنا نتقی ھذا علی عھد رسول اللہ ﷺ وفی الباب عن قرۃ بن ایاس المزنی" (ترمذی ص:۳۱/ج:۱)

عبدالحمید بن محمود سے روایت ہے کہ ہم نے ایک امیر کے پیچھے نماز پڑھی اور لوگوں نے ہمیں مجبور کر دیا تو ہم نے دوستونوں کے درمیان نماز ادا کی، نماز کے بعد حضرت انس بن مالک نے فرمایا کہ ہم عہد رسالت میں اس سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور اس باب میں قرہ بن ایاس مزنی سے بھی روایت ہے۔ حضرت قرہ بن ایاس کی یہ روایت ابن ماجہ میں ہے: ''**عن معٰوية بن قرة عن ابيه قال كنا ننهى ان نصف بين السوارى على عهد رسو ل الله صلى الله عليه وسلم ونطر دعنها طردا**''. (ابن ماجہ ص: ۷۰)

معاویہ بن قرہ اپنے والد قرہ ابن ایاس سے روایت کرتے ہیں کہ ہم عہد رسالت میں ستونوں کے درمیان صف بنانے سے ممانعت کرتے تھے اور سختی کے ساتھ اس کام سے روکتے تھے۔

امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں ''**في غير جماعة**'' کی قید لگا کر واضح کر دیا کہ سنن کی روایات میں ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے سے جو ممانعت آئی ہے اس کا تعلق جماعت کی نماز سے ہے، اس لیے اگر منفرد ایسا کرے تو اس میں مضائقہ نہیں، پھر منفرد کے جواز کے لیے انہوں نے رسول اللہ ﷺ کا عمل پیش کر دیا کہ آپؐ نے خانۂ کعبہ کے اندر دوستونوں کے درمیان نماز پڑھی۔

## ستونوں کے درمیان نماز میں بیان مذاہب

یہ تو تھا امام بخاری کا رجحان کہ انھوں نے منفرد اور جماعت کی نماز میں فرق کر دیا۔ لیکن عہد صحابہؓ و تابعینؒ ہی سے یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود سے منقول ہے کہ ''**لا تصفوا بين الاساطين واتمو الصفوف**'' کہ ستونوں کے درمیان صف نہ بناؤ اور صفوں کو پورا کیا کرو، البتہ حضرت انس سے مطلقاً کراہت منقول ہے، مگر حسن بصری، ابن سیرین وغیرہ جواز کے قائل ہیں، سعید بن جبیر، ابراہیم تیمی اور سوید بن غفلہ نے ستونوں کے درمیان کھڑے ہو کر امامت کی ہے، امام مالکؒ سے ''مدونہ'' میں منقول ہے کہ اگر مسجد تنگ ہو تو ستونوں کے درمیان کھڑے ہونے میں مضائقہ نہیں ہے۔ یہ تمام مذاہب عینی ص: ۲۸۶/ ج: ۲ میں منقول ہیں۔

حنفیہ کا مذہب شیخ قوام الدین کاکی کی معراج الدرایہ شرح ہدایہ میں منقول ہے، جسے شامی نے مکروہات الصلوۃ میں نقل کیا ہے کہ امام کے لیے ستونوں کے درمیان یا مسجد کے کونے یا گوشے میں کھڑا ہونا مکروہ ہے، رہا مقتدیوں کا ستونوں کے درمیان نماز پڑھنا تو حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں حنفیہ کی کتابوں میں کوئی تصریح نہیں ملتی لیکن حافظ ابوالفتح بن سید الناس یعمری شافعی نے شرح ترمذی میں لکھا ہے کہ امام اور منفرد پر قیاس کرتے ہوئے امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی نے ستونوں کے درمیان صف قائم کرنے کی اجازت دی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حنفیہ کی کتابوں میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے، البتہ اس سلسلہ میں اتفاق رائے نہیں ہے کوئی مکروہ قرار دیتا ہے، کسی نے رخصت دی ہے، شمس الائمہ سرخسی کی مبسوط میں موجود ہے: ''**الاصطفاف بين الاسطوا نتين غير مكروه لانه**

صف فی حق کل فریق وان لم یکن طویلا وتخلل الاسطو انة بین الصف کتخلل متاع موضوع' یعنی ستونوں کے درمیان صفِ قائم کرنا مکروہ نہیں ہے، اس لیے کہ وہ ہر جماعت کے حق میں مستقل صف ہے، اگر چہ یہ (ساریتین کے درمیان) طویل صف نہیں ہے، رہا ستون کا درمیان میں آنا تو وہ (مضر نہیں ہے) ایسا ہی ہے جیسے کوئی سامان درمیان میں رکھا جائے۔

بہرحال مناسب تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ اگر ستونوں کے درمیان صف کی مجبوری نہ ہو تو اس سے احتیاط کرنا ہی مناسب ہے، لیکن اگر ضرورت پڑ جائے جیسے نمازی زیادہ ہوں اور مسجد تنگ ہو تو رخصت پر عمل کر لینے میں مضائقہ نہیں، یہ تھی مقتدی کے بارے میں تفصیل، جہاں تک منفرد کا معاملہ ہے تو اس کے لیے ستونوں کے درمیان نماز پڑھنا سب کے نزدیک بلا کراہت درست ہے۔

## ستونوں کے درمیان نماز میں ممانعت کے اسباب

ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے کے مسئلہ میں امام، مقتدی اور منفرد کے لیے تو الگ الگ تفصیل ہے، لیکن یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ممانعت کرنے والے حضرات نے ممانعت کے بھی مختلف اسباب ذکر کئے ہیں اور ان کا خلاصہ یہی نکلتا ہے کہ مسئلہ میں تنگی نہیں ہے، ایک سبب یہ ذکر کیا گیا ہے کہ مسجد نبوی کے ستون خط استواء پر قائم نہ تھے، اس لیے ستونوں کے درمیان صف بندی کرتے تو صف ٹیڑھی ہو جاتی تھی اس لیے منع کیا گیا تھا، اس کا حاصل یہ نکلے گا کہ کسی مسجد کے ستون ہموار ہوں تو وہاں ستونوں کے درمیان صفِ بندی میں مضائقہ نہیں، ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ ستونوں کے درمیان صف بنانے سے صف میں انقطاع لازم آتا ہے کہ اگر چہ صفؑ تو ایک ہی ہے، لیکن چند آدمی یہاں کھڑے ہیں، درمیان میں ستون حائل ہو گیا، پھر چند آدمی وہاں کھڑے ہیں، اس کا ایک جواب تو اوپر شمس الائمہ سرخسی کی مبسوط سے نکلا کہ اگر چہ ستونوں کے درمیان والی صف طویل صف نہیں، لیکن جہاں بھی چند آدمی کھڑے ہیں وہ مستقل صف کے حکم میں ہے، دوسرے یہ کہ اگر ستون کے حائل ہونے کی بات تسلیم کر لی جائے تو یہ ان بڑے اور موٹے ستونوں پر صادق آئے گی جو واقعی حیلولت پیدا کر دیتے ہیں، اور اگر ستون ایسے ہوں جن سے حیلولت متحقق نہ ہو جیسے بعض مسجدوں میں لوہے کے یا لکڑی کے باریک ستون لگائے جاتے ہیں، تو ظاہر ہے کہ اس سے صف میں انقطاع لازم نہیں آئے گا، تیسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ عہد رسالت میں مسجد نبوی میں جنات نماز پڑھتے تھے، اور پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے ستونوں کے درمیان کا حصہ جنات کے لیے مخصوص فرما دیا تھا، اس لیے عام مقتدیوں کو وہاں نماز پڑھنے سے منع کر دیا گیا، اس سبب کا حاصل بھی یہی نکلتا ہے کہ یہ حکم عام نہیں ہے، بلکہ یہ عہد رسالت میں مسجد نبوی کی خصوصیت تھی، اب مساجد میں نہ جنات کی آمد کا علم ہوتا ہے نہ اس کا کوئی ثبوت ہے، اس لیے ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے میں مضائقہ نہ ہونا چاہئے۔ واللہ اعلم

**ترجمۃ الباب کا ثبوت** امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں یہ رجحان ظاہر کیا ہے کہ ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے سے جو ممانعت وارد ہوئی ہے، اس کا تعلق جماعت کی نماز سے ہے، منفرد اگر نماز پڑھے تو اس میں تنگی نہیں ہے، چنانچہ اس کے لیے انھوں نے وہ روایت پیش کی ہے، جو پہلے باب "واتخذوا من مقام ابراهیم مصلی" اور ابھی چند ابواب پہلے "باب الابواب والغلق للكعبة" کے تحت گزر چکی ہے، اس روایت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے خانہ کعبہ کے اندر داخل ہو کر ستونوں کے درمیان کھڑے ہو کر نماز ادا فرمائی، یعنی آپ نے منفرد ہونے کی حالت میں اس طرح نماز ادا کی، معلوم ہوا کہ ستونوں کے درمیان نماز سے ممانعت کا تعلق جماعت کی حالت میں ہے۔

**بیت اللہ کے اندورنی ستونوں کی تعداد** یہاں شارحین نے بیت اللہ کے اندورنی ستونوں کی تعداد سے بھی بحث کی ہے کیوں کہ اس باب کے تحت دو روایتیں دی گئی ہیں، پہلی روایت میں حضور پاک ﷺ کی نماز کے بارے میں فرمایا گیا ہے: "بين العمودين المقدمين" یعنی اگلے دو ستونوں کے درمیان، اس سے بظاہر معلوم ہوا کہ بیت اللہ میں آگے کی سمت میں دو ہی ستون تھے۔ دوسری روایت میں آیا "جعل عمودا عن يساره وعمودا عن يمينه وثلاثة أعمدة وراءه" کہ آپ نے ایک ستون داہنی طرف لیا، دوسرا ستون بائیں طرف لیا، اور تین ستون پیچھے لیے، اس کا بظاہر مفہوم ہوا کہ ستون پانچ تھے، مگر اسی روایت میں آگے آرہا ہے "وكان البيت يومئذ على ستة اعمدة" کہ بیت اللہ کے اس وقت چھ ستون تھے، اور شاید اسی تعارض کو ختم کرنے کے لیے امام بخاری نے، امام مالک سے بہ روایت اسمعیل نقل کیا "عمودين عن يمينه" یعنی داہنی طرف دو ستون تھے، لیکن راوی نے اختصار سے کام لیتے ہوئے صرف ایک کا تذکرہ کیا، لیکن ایک مشکل یہ ہے کہ مسلم شریف میں یحییٰ بن یحییٰ کی روایت میں امام مالک کی روایت کے برعکس یہ منقول ہے: "جعل عمودين عن يساره وعمودا عن يمينه" یعنی بائیں طرف دو ستون لیے اور داہنی طرف ایک۔

گویا روایات میں دو باتوں میں تعارض ہے، ایک تو یہ کہ صف مقدم میں کتنے ستون تھے؟ بعض روایات سے دو ستون معلوم ہوتے ہیں، اور بعض سے تین، دوسرے یہ کہ کعبہ میں کل کتنے ستون تھے، بعض روایات سے پانچ معلوم ہوتے ہیں اور بعض سے چھ، چنانچہ اس تعارض کو ختم کرنے کے لیے شارحین نے مختلف راستے اختیار کیے ہیں:

ایک توجیہہ یہ بیان کی گئی ہے کہ آپ ﷺ نے بیت اللہ کے اندر دو بار نماز ادا کی، ایک بار ایک جگہ اور دوسری بار دوسری جگہ، دوسری توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ صف مقدم کے تینوں ستون ایک سمت میں نہیں تھے، دو ستون ایک سمت میں تھے، اور تیسرا ستون سمت سے کچھ ہٹا ہوا تھا، راوی نے سمت سے ہٹے ہوئے ستون کا تذکرہ نہیں کیا، تیسری توجیہہ یہ کی گئی ہے کہ عہد رسالت میں تو پانچ ہی ستون تھے؛ لیکن راوی کے بیان کے وقت ستونوں کی تعداد چھ ہوگئی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام توجیہات اگرچہ بڑے لوگوں نے کی ہیں مگر ان کا تسلیم کرنا تاریخی شہادتوں پر موقوف ہے، اس لیے ہماری سمجھ میں تو

یہ آتا ہے کہ راوی کے پیش نظر ستونوں کی تعداد کا بیان کرنا نہیں ہے، راوی کے نزدیک اصل بات یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ بیان کرنا چاہتا ہے کہ آپ نے ستونوں کے درمیان کھڑے ہو کر نماز پڑھی اور یہ کہ آپ نے دیوار قبلہ کو سترہ بنایا، ان دونوں باتوں کی وضاحت کے لیے ستونوں کی تعداد کا بیان کرنا ضروری نہیں ہے، یعنی یہ بیان کرنا کہ داہنی جانب یا بائیں طرف کتنے ستون تھے؟ یہ مقصد راوی سے زائد بات ہے، اس لیے وہ کسی موقع پر اس کا ذکر کر دیتے ہیں اور کسی موقع پر ذکر نہیں کرتے، باقی شارحین کی توجیہات میں تکلف معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

## [۹۷] بَابٌ

(۵۰۶) حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ بْنُ الْمُنْذِرِ قَالَ نَا اَبُوْ ضَمْرَةَ قَالَ نَا مُوْسَى بْنُ عُقْبَةَ عَنْ نَافِعٍ اَنَّ عَبْدَ اللهِ بْنَ عُمَرَ كَانَ اِذَا دَخَلَ الْكَعْبَةَ مَشٰى قِبَلَ وَجْهِهٖ حِيْنَ يَدْخُلُ وَجَعَلَ الْبَابَ قِبَلَ ظَهْرِهٖ فَمَشٰى حَتّٰى يَكُوْنَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِدَارِ الَّذِيْ قِبَلَ وَجْهِهٖ قَرِيْباً مِنْ ثَلٰثَةِ اَذْرُعٍ صَلّٰى يَتَوَخَّى الْمَكَانَ الَّذِيْ اَخْبَرَهٗ بِهٖ بِلَالٌ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى فِيْهِ قَالَ وَلَيْسَ عَلٰى اَحَدِنَا بَاْسٌ اَنْ صَلّٰى فِيْ اَيِّ نَوَاحِي الْبَيْتِ شَآءَ. (گذشتہ: ۳۹۷)

**ترجمہ** باب، حضرت نافع سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر جب کعبہ کے اندر داخل ہوتے تو داخل ہوتے وقت سامنے کی جانب بڑھتے چلے جاتے اور خانہ کعبہ کے دروازے کو اپنی پشت کی طرف لے لیتے اور آگے بڑھتے یہاں تک کہ جب ان کے درمیان اور اس دیوار کے درمیان جو سامنے کی سمت میں تھی قریب تین ہاتھ کا فاصلہ رہ جاتا تو نماز پڑھتے۔ اس طرح ابن عمر اسی جگہ نماز پڑھنے کا قصد کرتے تھے، جس کے بارے میں انھیں حضرت بلال نے یہ اطلاع دی تھی کہ وہاں رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی ہے۔

حضرت ابن عمر نے یہ فرمایا کہ ہم میں سے کسی کے لیے اس بات میں مضائقہ نہیں ہے کہ وہ بیت اللہ کے جس گوشہ میں چاہے نماز پڑھے۔

**مقصد ترجمہ** اصیلی کی روایت میں یہاں لفظ باب بھی نہیں ہے، بقیہ حضرات کی روایت میں باب بلا ترجمہ ہے، اگر لفظ باب نہ ہو تو روایت کو باب اول ہی سے متعلق مانا جائے گا، تعلق اس طرح ہے کہ اگر چہ روایت میں ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے کی تصریح نہیں ہے، لیکن آپ ﷺ نے دیوار کعبہ سے تین ذراع کے فاصلہ پر نماز پڑھی ہے، اور یہ جگہ ستونوں کے درمیان ہی واقع تھی، اور اگر باب بلا ترجمہ تسلیم کریں، جیسا کہ اکثر حضرات کی روایت میں ہے، تو پھر اس کو کالفصل من الباب السابق کہیں گے، جیسا کہ اکثر شارحین کا خیال ہے، علامہ عینی اور حافظ ابن حجر کا رجحان بھی یہی ہے، جدید ترجمہ کی ضرورت نہیں ہے، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے بھی یہی فرمایا ہے کہ اس کو باب اول کی

فصل سمجھنا چاہئے، کیوں کہ اس روایت میں رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بارے میں جو جگہ بیان کی گئی ہے وہ دیوار قبلہ سے تین ہاتھ کے فاصلہ پر تھی، اس سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ آپ نے ستونوں کے درمیان نماز پڑھی ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس روایت میں باب اول کے اندر ذکر کردہ مضمون سے زائد بات بھی ہے، یعنی ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے کی اگرچہ صراحت نہیں مگر اس کا ثبوت موجود ہے، اور اس سے زائد بات یہ ہے کہ نمازی اور ستر ے کے درمیان کا فاصلہ یعنی تین ذراع بھی مذکور ہے، اس لیے یہ باب ایک اعتبار سے باب اول سے متعلق ہے اور دوسرے اعتبار سے نئے مضمون پر مشتمل ہے، ایسے مواقع پر امام بخاری جب باب بلا ترجمہ ذکر کریں تو اس کو باب اول کی فصل قرار دیا جاتا ہے، مگر شیخ الہند قدس سرہ کے ابواب وتراجم میں جدید ترجمہ منعقد کرنے کا اشارہ دیا گیا ہے، جدید ترجمہ دیا جا سکتا ہے "باب یصلی فی ایّ نواحی البیت شاء" یعنی بیت اللہ کے اندر جہاں چاہے نماز پڑھ سکتا ہے اور یہ مضمون حضرت ابن عمرؓ کے ارشاد سے ثابت ہے۔　　واللہ اعلم

**تشریح حدیث** پہلے باب کی روایت میں تصریح ہے کہ آپ ﷺ نے خانہ کعبہ کے اندر ستونوں کے درمیان نماز ادا کی، مگر اس میں یہ صراحت نہیں تھی کہ آپ کے اور دیوار کعبہ کے درمیان کتنا فاصلہ تھا؟ اس روایت میں ستونوں کے درمیان نماز پڑھنے کی تصریح نہیں ہے، لیکن اس کی صراحت ہے کہ آپ ﷺ کے اور دیوار کعبہ کے درمیان تین ہاتھ کی مسافت تھی، پھر حضرت ابن عمرؓ کی جانب سے اس کی بھی تصریح ہے کہ خانہ کعبہ کے اندر ہر جگہ نماز پڑھنا درست ہے، گویا یہ روایت اپنے مضمون کے اعتبار سے، باب سابق سے ایک گونہ مربوط ہے اور ایک گونہ مغائر ہے، اس لیے عام شارحین کا رجحان یہ ہے کہ یہ باب کالفصل من الباب السابق، یعنی باب سابق ہی کا تتمہ ہے۔

## [۹۸] بَابُ الصَّلٰوةِ اِلَى الرَّاحِلَةِ وَالْبَعِيْرِ وَالشَّجَرِ وَالرَّحْلِ

(۵۰۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ اَبِیْ بَكْرِ الْمُقَدَّمِیُّ الْبَصْرِیُّ قَالَ نَا مُعْتَمِرُ بْنُ سُلَيْمٰنَ عَنْ عُبَيْدِ اللهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهُ كَانَ يُعَرِّضُ رَاحِلَتَهُ فَيُصَلِّی اِلَيْهَا قُلْتُ اَفَرَاَيْتَ اِذَا هَبَّتِ الرِّكَابُ قَالَ كَانَ يَاخُذُ الرَّحْلَ فَيُعَدِّلُهُ فَيُصَلِّی اِلٰى اٰخِرَتِهٖ اَوْ مُؤَخَّرِهٖ وَكَانَ ابْنُ عُمَرَ يَفْعَلُهُ.　　(گذشتہ: ۴۳۰)

**ترجمہ** باب، سواری (کی اونٹنی) اور اونٹ اور درخت اور کجاوے کی پچھلی لکڑی کی طرف نماز پڑھنے کا بیان۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنی سواری کی اونٹنی کو عرض (چوڑائی) میں بٹھا لیتے، پھر اس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ نافع کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا اچھا یہ بتائیے کہ سواری کے اونٹ اگر اپنی جگہ سے اٹھ جاتے تو آپ کیا کرتے تھے؟ ابن عمر نے فرمایا کہ ایسی صورت میں آپ کجاوے کو لے کر اس کو اپنے سامنے سیدھا کھڑا

کر لیتے اور اس کی پچھلی لکڑی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے، نافع کہتے ہیں کہ حضرت ابن عمرؓ بھی ایسا کرتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ سترہ کے معاملہ میں نمازی کے لیے پورا توسع ہے، سترہ کے لیے نہ کسی مادہ کی شرط ہے، نہ کسی شکل وصورت کی قید ہے، اس معاملہ میں نمازی پوری طرح آزاد ہے، وہ ہر چیز کو سترہ بنا سکتا ہے، وہ چیز خواہ از قسم حیوان ہو، یا غیر حیوان ہو، یعنی درخت ہو یا اونٹ ہو، وہ جانور خواہ ماکول اللحم یا غیر ماکول اللحم ہو، غرض ہر چیز کو سترہ کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

حیوان کو سترہ بنانے کے سلسلے میں امام شافعیؒ اور امام مالک سے کراہت منقول ہے، کیوں کہ سترہ کا مقصد ہے نماز کا تحفظ اور حیوان کا کیا بھروسہ ہے کب اٹھ کر چل دے؟ لیکن حنابلہ اور حنفیہ کے یہاں حیوان کو سترہ بنانے میں مضائقہ نہیں ہے، ابوداؤد میں حضرت ابن عمر سے منقول ہے: "ان النبی ﷺ **کان یصلی الی بعیرہ** " (عمدۃ القاری ص: ۲۸۶/ ج: ۴) کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اونٹ کی طرف رخ کر کے نماز ادا فرماتے تھے۔

امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں چار چیزیں اونٹنی، اونٹ، درخت اور کجاوہ کا ذکر کر کے توسع کا اظہار فرما دیا، گویا حنفیہ اور حنابلہ کی تائید اور مالکیہ اور شوافع کی تردید فرما دی، روایت باب میں راحلہ یعنی سواری کی اونٹنی اور رحل یعنی کجاوے کا ذکر ہے، درخت اور اونٹ کا تذکرہ نہیں ہے، لیکن اونٹنی اور اونٹ تو ایک ہی جنس کے دو نام ہیں، جب اونٹنی کو سترہ بنانا درست ہے، تو اونٹ کا حکم بھی معلوم ہو گیا، رہا درخت کا معاملہ تو وہ اس طرح ثابت ہے کہ جب رحل یعنی کجاوے کو سترہ بنانا درست ہے اور کجاوہ لکڑی کا ہوتا ہے، تو گویا لکڑی کی ہر جنس کا حکم معلوم ہو گیا۔

اور اگر امام بخاریؒ کی عادت کے مطابق نظر کو اور زیادہ وسیع کریں تو ممکن ہے کہ بخاری ان روایات کی طرف اشارہ کر رہے ہوں جن میں ان تمام چیزوں کا صراحت کے ساتھ تذکرہ ہے، جیسا کہ ابوداؤد کی مذکورہ بالا روایت میں "بعیر" کا تذکرہ ہے اور نسائی کی روایت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بسند حسن "شجر" کا ذکر موجود ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں: "**لقد رأیتنا یومَ بدر و ما فینا انسان الانام الا رسول اللہ** ﷺ **فانہ کان یصلی الی شجرۃ یدعو حتی اصبح**"۔ (عمدۃ القاری ص: ۲۸۶/ ج: ۴) میں نے غزوہ بدر والی رات میں دیکھا کہ ہم میں سے ہر انسان سو گیا تھا، مگر رسول اللہ ﷺ ایک درخت کو سترہ بنا کر نماز پڑھ رہے تھے اور آپ صبح تک دعاء میں مشغول رہے۔ اس لیے بہت ممکن ہے کہ امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں ان چیزوں کا اضافہ کر کے ان روایات کی طرف اشارہ کیا ہو، جن میں صراحت کے ساتھ ان چیزوں کا تذکرہ ہے۔　　　واللہ اعلم

**تشریح حدیث** حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ حضور پاک ﷺ اپنی سواری کو عرض میں لے کر نماز پڑھتے تھے، حضرت نافع نے حضرت ابن عمرؓ سے پوچھا کہ اگر سواری کا جانور قابو میں ہو تو یہ صورت درست ہے، لیکن اگر وہ بے قابو ہو، اٹھ کر چل دے، یا ہیجانی کیفیت میں ہو تو اس کو سترہ نہیں بنایا جا سکتا، ابن عمر نے جواب دیا کہ ایسی

صورت ہوتی تو کجاوے کو سامنے رکھ کر نماز پڑھ لیتے۔ روایت کے الفاظ میں ''یصلی الی اخرتہ'' کجاوے کی وہ لکڑی ہے جس سے سوار اپنی کمر لگاتا ہے، کجاوے میں دو لکڑیاں ہوتی تھیں، ایک آگے جسے سوار پکڑ کر بیٹھتا تھا اور دوسری پیچھے جس سے کمر لگالیتا تھا ''آخرۃ'' کی جگہ ''موخرۃ'' کا لفظ بھی مذکورہ ہے، اس کے بھی یہی معنی ہیں۔ مسند عبدالرزاق میں ہے کہ ابن عمرؓ کے کجاوے کی اس لکڑی کی اونچائی ایک ذراع کے بقدر تھی۔

حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ فرماتے تھے کہ یہیں سے حنفیہ نے تنقیح مناط کے طور پر یہ استخراج کیا ہے کہ ہر وہ چیز جس کی اونچائی ایک ذارع اور اس کی موٹائی ایک انگلی کے بقدر ہو اس کو سترہ بنانا درست ہے، البتہ سترہ کے طور پر خط کھینچنے کے بارے میں حنفیہ سے اختلاف منقول ہے، ''ہدایہ'' میں خط کو نا قابل اعتبار قرار دیا گیا ہے، لیکن ''فتح القدیر'' میں صاحبین کی طرف خط کے قابلِ اعتبار ہونے کی بات منسوب ہے، حضرت علامہ فرماتے ہیں کہ یہی بات زیادہ صحیح ہے، کیونکہ خط کھینچنے کی بات جس روایت میں مذکور ہے امام احمد نے اس کو قابل عمل قرار دیا ہے، نیز یہ کہ خط حصار وغیرہ کے سلسلہ میں یقیناً مؤثر ہے، رسول پاک علیہ السلام نے لیلۃ الجن میں حضرت ابن مسعودؓ کو ایک خط کا حصار کھینچ کر اس کے اندر رہنے کی ہدایت کی تھی۔ عملیات کرنے والوں کا تجربہ اور مشاہدہ ہے کہ وہ حصار کر کے عمل پڑھتے ہیں تو خود محفوظ رہتے ہیں، یا جنات کا حصار کرا دیتے ہیں تو ان کے حملہ سے محفوظ رہتے ہیں۔

## [۹۹] بابُ الصَّلٰوةِ اِلَى السَّرِيْرِ

(۵۰۸) حَدَّثَنَا عُثْمَانُ بْنُ اَبِىْ شَيْبَةَ قَالَ نَا جَرِيْرٌ عَنْ مَنْصُوْرٍ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ عَنِ الْاَسْوَدِ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ اَعْدَلْتُمُوْنَا بِالْكَلْبِ وَالْحِمَارِ لَقَدْ رَاَيْتُنِىْ مُضْطَجِعَةً عَلَى السَّرِيْرِ فَيَجِيْئُ النَّبِىُّ صلی اللہ علیہ وسلم فَيَتَوَسَّطُ السَّرِيْرَ فَيُصَلِّىْ فَاَكْرَهُ اَنْ اَسْنَحَهُ فَاَنْسَلُّ مِنْ قِبَلِ رِجْلَىِ السَّرِيْرِ حَتّٰى اَنْسَلَّ مِنْ لِحَافِىْ . (گذشتہ: ۳۸۲)

**ترجمہ** باب، تخت (یا چارپائی) کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا بیان۔ اسود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا کہ تم لوگوں نے ہم (عورتوں) کو کتے اور گدھے کے برابر کر دیا۔ بے شک مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں تخت پر لیٹی رہتی تھی اور رسول اللہ علیہ السلام تشریف لاتے اور تخت کو بیچ میں لیتے اور نماز پڑھتے، پھر میں اس کو ناپسند سمجھتی کہ آپ کے سامنے رہوں تو میں تخت کی پائینتی کی جانب کھسک جاتی، تا کہ (پائینتی کی طرف آ کر) لحاف کے اندر ہی سے باہر نکل سکوں۔

**مقصد ترجمہ** مقصد ہے سترے کے سلسلہ میں مزید توسع اور عموم کا بیان، کہتے ہیں کہ گھر کے استعمال کی چیزوں کو بھی سترہ بنایا جاسکتا ہے، یا یہ کہ جو چیزیں زمین پر منصوب ہوں تو وہ سترہ بن سکتی ہیں اور وہ چیزیں بھی سترہ

بن سکتی ہیں جو نمازی کے سامنے زمین سے اٹھی ہوئی ہوں، جیسے چار پائی یا تخت کو درمیان میں لے کر نماز پڑھنا کہ نمازی کے سامنے جو پٹی آئے گی وہ زمین سے اوپر اٹھی ہوئی ہوگی۔

**تشریح حدیث** حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ان راویوں کی شکایت کر رہی ہیں جنھوں نے تین چیزوں: کتے، گدھے اور عورت کے سامنے سے گذرنے کو قاطع صلوٰۃ کہا ہے، بعض حضرات کا خیال ہے کہ شکایت کی بنیاد ان لوگوں کی تردید ہے، جنھوں نے الفاظ کے ظاہری معنی کے مطابق ان چیزوں کے سامنے آنے کو مفسد صلوٰۃ قرار دیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شکایت طرز ادا کی ہے کہ تمہارا انداز بیان ایسا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عورت، گدھا اور کتا سب برابر ہیں، کیوں کہ تم نے تینوں چیزوں کو ایک ہی سلسلہ میں ذکر کر دیا ہے، حالانکہ عورت میں اور ان دونوں میں زبردست فرق ہے، بیان کرتے وقت اس نزاکت کو ملحوظ رکھنا چاہئے تھا، اس فرق کی وضاحت چند ابواب کے بعد آرہی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ''**لقدر أیتنی الخ**'' میں خوب دیکھ رہی ہوں یعنی کل کی سی بات ہے کہ میں تخت پر سامنے لیٹی ہوتی تھی، آپ مجھے میری جگہ سے ہٹاتے نہیں تھے، بلکہ وسط سریر میں نماز پڑھ لیتے تھے، پھر مجھے آپ کی نماز کے درمیان اٹھنے کی ضرورت ہوتی تو میں اس طرح نہ اٹھتی کہ بالکل مواجہت اور سامنا ہو جائے، بلکہ میں لیٹے ہی لیٹے، لحاف کے اندر اندر، سریر کی پائینتی کی طرف کھسک جاتی اور پھر اٹھتی تھی۔

**ترجمہ اور حدیث کی مطابقت** ترجمۃ الباب ہے'' **الصلوۃ الی السریر**'' سریر کو سترہ بنا کر نماز پڑھنا اور روایت میں آرہا ہے''**یتوسط السریر**'' سریر کے بیچ میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنا، کیوں کہ توسط لازم ہے اور السریر اس کا مفعول فیہ ہے، گویا روایت ترجمۃ الباب کے مطابق نہیں ہے، چنانچہ اسمٰعیلی نے یہ اعتراض کیا ہے کہ روایت سریر یعنی تخت کو سترہ بنا کر نماز پڑھنے پر دلالت نہیں کرتی، بلکہ تخت کے اوپر نماز پڑھنے کا مضمون بیان کرتی ہے، چنانچہ کرمانی نے اس اعتراض کا یہ جواب دیا کہ حروف جر ایک دوسرے کی جگہ استعمال ہوتے ہیں، یہاں بھی ترجمۃ الباب میں''**الصلوۃ الی السریر**، **الصلوۃ علی السریر**'' کے معنی میں ہے، پھر انھوں نے یہ بھی دعوی کیا کہ بعض روایات میں علی السریر آیا بھی ہے، علامہ عینی کی رائے بھی یہی ہے کہ ترجمۃ الباب میں الی علی کے معنی میں ہے۔

**علامہ سندھیؒ کا ارشاد** علامہ سندھیؒ کی رائے بھی یہی ہے کہ حدیث باب کی مناسبت سے تو ترجمۃ الباب ''**الصلوۃ علی السریر**'' ہی ہونا چاہئے، کیوں کہ روایت میں ''**فیتوسط السریر**'' کے الفاظ ہیں جس کے معنی یہ ہیں کہ آپ سریر کے وسط میں نماز پڑھتے تھے۔ توسط باب تفعل سے ہے، جو لازم ہے اور سریر اس کا مفعول فیہ ہے، اس لیے معنی یہ ہوں گے کہ آپ سریر کے اوپر وسط میں کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے۔ علامہ سندھی فرماتے ہیں کہ اس بنا پر ترجمۃ الباب میں ''**الصلوۃ الی السریر**'' بھی ہو تو یہ کہنا ہوگا کہ الی، علی کے معنی میں ہے، مگر اس توجیہ کو مدلل کرنے کے باوجود، علامہ سندھی اعتراف فرماتے ہیں کہ ابواب السترۃ سے ربط باقی نہیں رہتا۔

**اسماعیلی کا جواب** علامہ عینی، کرمانی، سندھی نے تو اسماعیلی کے اعتراض سے بچنے کے لیے ترجمۃ الباب کے وہ معنی بیان کئے جن سے یہ باب، ابواب السترہ سے متعلق نہیں رہتا، لیکن اصل جواب وہی ہے، جو خود اسماعیلی نے دیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اگر چہ امام بخاری نے "باب الصلوۃ الی السریر" کو ثابت کرنے کے لیے "اسود عن عائشۃ" والی روایت ذکر کی ہے، جس میں "فیتوسط السریر" کے الفاظ ہیں، لیکن چند ابواب کے بعد جو مسروق عن عائشۃ والی روایت آ رہی ہے اس کے الفاظ ہیں:

"لقد رایت النبی ﷺ یصلی وانی لبینہ وبین القبلۃ وانا مضطجعۃ علی السریر" (بخاری ص:۷۳/ ج:۱) میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے کہ میں آپ کے اور قبلہ کے درمیان سریر (تخت) کے اوپر لیٹی رہتی تھی۔

ان الفاظ سے روایت باب کے الفاظ "فیتوسط السریر" کے یہی معنی متعین ہو جاتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ جس تخت پر لیٹی ہوتی تھیں، اس پر آپ نماز نہیں پڑھتے تھے، بلکہ وہ تخت سترہ کے طور پر آپ ﷺ کے اور قبلہ کے درمیان رہتا تھا، اور چونکہ سترہ تخت کے پائے نہیں بنتے تھے، بلکہ دونوں پایوں کے درمیان جو خشبۂ معروضہ یعنی پٹی ہوتی تھی اس سے سترہ کا کام لیا جاتا تھا، بس اسی سے ترجمۃ الباب ثابت ہو گیا کہ سترہ کا زمین پر نصب ہونا ضروری نہیں، بلکہ اگر کوئی چیز سترہ کا کام دے جو گھر کے استعمال کی ہو، یا جو زمین سے متصل نہ ہو تو یہ بھی درست ہے۔ واللہ اعلم

## [۱۰۰] بَابٌ لِيَرُدَّ الْمُصَلِّيْ مَنْ مَرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ

وَرَدَّ ابْنُ عُمَرَ فِي التَّشَهُّدِ وَفِي الْكَعْبَةِ وَقَالَ اِنْ اَبٰى اِلَّا اَنْ يُقَاتِلَهُ قَاتَلَهُ.

(۵۰۹) حَدَّثَنَا اَبُوْمَعْمَرٍ قَالَ نَا عَبْدُ الْوَارِثِ قَالَ نَا يُوْنُسُ عَنْ حُمَيْدِ بْنِ هِلَالٍ عَنْ اَبِيْ صَالِحٍ اَنَّ اَبَاسَعِيْدٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ ح وَحَدَّثَنَا اٰدَمُ بْنُ اَبِيْ اِيَاسٍ نَا سُلَيْمَانُ بْنُ الْمُغِيْرَةِ قَالَ نَا حُمَيْدُ بْنُ هِلَالٍ الْعَدَوِيُّ قَالَ نَا اَبُوْصَالِحِ السَّمَّانُ قَالَ رَاَيْتُ اَبَا سَعِيْدِ الْخُدْرِيَّ فِيْ يَوْمِ جُمْعَةٍ يُصَلِّيْ اِلٰى شَيْءٍ يَسْتُرُهُ مِنَ النَّاسِ فَاَرَادَ شَابٌّ مِنْ بَنِيْ اَبِيْ مُعَيْطٍ اَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ فَدَفَعَ اَبُوْسَعِيْدٍ فِيْ صَدْرِهِ فَنَظَرَ الشَّابُّ فَلَمْ يَجِدْ مَسَاغاً اِلَّا بَيْنَ يَدَيْهِ فَعَادَ لِيَجْتَازَ فَدَفَعَهُ اَبُوْسَعِيْدٍ اَشَدَّ مِنَ الْاُوْلٰى فَنَالَ مِنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ ثُمَّ دَخَلَ عَلٰى مَرْوَانَ فَشَكَا اِلَيْهِ مَا لَقِيَ مِنْ اَبِيْ سَعِيْدٍ وَدَخَلَ اَبُوْ سَعِيْدٍ خَلْفَهُ عَلٰى مَرْوَانَ فَقَالَ مَالَكَ وَلِابْنِ اَخِيْكَ يَا اَبَا سَعِيْدٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِيَّ ﷺ يَقُوْلُ اِذَا صَلّٰى اَحَدُكُمْ اِلٰى شَيْءٍ يَسْتُرُهُ مِنَ النَّاسِ فَاَرَادَ اَحَدٌ اَنْ يَجْتَازَ بَيْنَ يَدَيْهِ فَلْيَدْفَعْهُ فَاِنْ اَبٰى فَلْيُقَاتِلْهُ فَاِنَّمَا هُوَ شَيْطَانٌ. (آئندہ: ۳۷۴:۳)

**ترجمہ** باب، اگر کوئی سامنے سے گذرتا ہے تو نمازی کو اسے روک دینا چاہئے۔ حضرت ابن عمرؓ نے التحیات پڑھتے وقت اور کعبہ میں (گذرنے والے کو) روکا اور فرمایا کہ اگر گذرنے والا لڑائی کے بغیر باز نہ آئے تو اس سے لڑنا چاہئے۔ ابو صالح السمان کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابو سعید خدریؓ کو جمعہ کے دن دیکھا کہ وہ لوگوں سے بچنے کے لیے ایک چیز کو سترہ بنا کر نماز پڑھ رہے ہیں کہ ابو معیط کی اولاد میں سے ایک جوان نے ان کے سامنے سے گذرنا چاہا تو حضرت ابوسعید نے سینے پر ہاتھ مار کر اس کو روک دیا، اس پر جوان نے دیکھا مگر اس کو سامنے سے گذرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہ ملا تو اس نے دوبارہ گذرنا چاہا تو حضرت ابوسعید خدری نے پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ دھکا دیا، تو اس نے حضرت ابوسعید کی شان میں نامناسب بات کہی، پھر مروان کے پاس پہنچا اور حضرت ابوسعید کی جانب سے پیش آمدہ صورت حال کی شکایت کی، حضرت ابوسعید بھی اس کے پیچھے ہی مروان کے پاس پہنچ گئے، مروان نے کہا، اے ابوسعید! آپ کے اور آپ کے بھتیجے کے درمیان کیا بات پیش آئی؟ تو حضرت ابوسعید نے کہا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب تم میں سے کوئی کسی چیز کو سترہ بنا کر نماز پڑھ رہا ہو اور کوئی تمہارے سامنے سے گذرنا چاہے تو وہ اس کو روک دے اور اگر وہ باز نہ آئے تو اس سے قتال کرے، کیوں کہ وہ گذرنے والا شیطان ہے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ جب آپ نے اپنی نماز کی حفاظت کے لیے سترہ قائم کرلیا، اب اگر کوئی ازراہ نادانی آپ کے اور سترہ کے درمیان سے گذرنا چاہے تو آپ کو کیا کرنا چاہئے، اس کو گذرنے دیں یا روک دیں؟ امام بخاری بیان کرتے ہیں کہ "لیرد الخ" یعنی نمازی کو چاہئے کہ گذرنے والے کو گذرنے سے روک دے، تاکہ نمازی ہونے کی حیثیت سے جو تعلق بندے اور خدا کے درمیان قائم ہوا ہے کوئی اس کو ختم نہ کرسکے، یہ حکم نماز کی ابتداء میں بھی ہے، اور نماز کے خاتمہ پر بھی یہی حکم ہے، اور خانہ کعبہ والی مسجد حرام میں یہی حکم ہے اور کسی دوسری جگہ بھی یہی حکم ہے، البتہ خانہ کعبہ میں یہ حکم طواف کرنے والوں کے بارے میں نہیں ہے کیوں کہ طواف خود نماز کے حکم میں ہے اور طواف کرنے والوں کو گذرنے کی اجازت ہے، حضرت ابن عمرؓ نے تشہد کی حالت میں بھی گذرنے والوں کو روکا اور کعبہ کے اندر بھی، اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ گذرنے والے کو روکنے کے سلسلہ میں اول صلوۃ اور آخر صلوۃ کا حکم یکساں ہے اور کعبہ وغیر کعبہ میں بھی کوئی فرق نہیں ہے، نمازی کسی جگہ بھی ہو اگر کوئی سامنے سے گذرنا چاہے تو یہی کرنا ہوگا، کہ جب تک سلام نہ پھیرا ہو روک دیں، نرمی سے کام نہ چلے تو سختی سے کام لیں، فلیقاتلہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر گذرنے والا نرمی سے باز نہ آئے تو سختی سے پیش آنے کی اجازت ہے، یعنی اگر وہ اشارہ سے نہ مانے تو دھکا دے کر روک دیا جائے، رہا یہ کہ دھکا دینے میں عمل کثیر کی صورت بن جائے یا مار پیٹ کی نوبت آجائے تو نماز باقی رہے گی یا ختم ہوجائے گی؟ تو ظاہر ہے کہ جو اعمال، نماز کے منافی ہیں ان کے وجود میں آنے سے نماز ختم ہوجائے گی، اس لیے نماز کے تحفظ کے ساتھ جو صورت گذرنے سے روکنے کی ممکن ہو وہ عمل میں لائی جائے؛ چنانچہ موطا امام محمدؒ میں حضرت ابو

سعید خدری ہی کی روایت کے تحت وضاحت کی گئی ہے کہ " فلیقاتله " کے معنی نماز کے تحفظ کے ساتھ تا بمقدور روکنے کی کوشش کے ہیں، کیوں کہ سترہ کا اصل مقصد بھی نماز ہی کا تحفظ تھا، گذرنے والے کو روکنا بھی اسی حد تک درست ہے کہ نماز کا نقصان نہ ہو، اگر نمازی نے وہ کام کرڈالا جس سے فساد لازم آگیا تو اس نے گویا نماز کی حفاظت کی کوشش میں اصل نماز ہی کو ختم کر دیا، امام محمدؒ کے الفاظ ہیں: " فان یقاتله کان مایدخل علیه فی صلا ته من قتاله ایاه اشد علیه من ممر هذابین یدیه " (موطاامام محمد ص:۱۴۹) پس اگر نمازی قتال کرتا ہے تو نماز میں قتال سے جو نقصان پیدا ہوگا وہ سامنے گذرنے سے پیدا ہونے والے نقصان سے زیادہ ہوگا۔

گویا گذرنے والے کو روکنا، نماز کی حفاظت کے لیے تھا، اگر روکنے میں نماز ہی فاسد ہو رہی ہو تو گذرنے دیا جائے اور نماز کے تحفظ کے ساتھ روکنا ممکن ہو تو روکنے کی کوشش کی جائے۔

## علامہ تقی الدین کی تفصیل

علامہ تقی الدین ابن دقیق العید نے، بعض فقہاء مالکیہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے گذرنے والے اور نمازی کے احوال سے متعلق کچھ تفصیل کی ہے، وہ اصولی طور پر ہمارے یہاں بھی معتبر ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ گذرنے والے اور نمازی کے مختلف احوال ہیں اور ان کے پیش نظر احکام بھی الگ الگ ہیں، پہلی صورت یہ ہے کہ نمازی راستہ سے ہٹ کر اور سترہ قائم کر کے نماز پڑھ رہا ہے اور گذرنے والے کے لیے گذرنے کی دوسری بھی جگہ موجود ہے تو اس صورت میں نمازی اور سترے کے درمیان گذرنے والا مجرم اور خطا کار ہے، اس کو روکا جائے گا، نمازی پر کوئی گناہ یا ذمہ داری نہیں ہے، دوسری صورت یہ ہے کہ نمازی راستہ اور گذرگاہ پر سترہ قائم کئے بغیر نماز شروع کر دے اور گذرنے والے کے لیے اس کے علاوہ کوئی دوسری گذرگاہ بھی نہ ہو اور ضرورت کے سبب گذرنا بھی ضروری ہو تو اس صورت میں تمام تر ذمہ داری نمازی کی ہے، گذرنے والے پر کوئی گناہ نہیں، تیسری صورت یہ ہے کہ نمازی گذرگاہ اور راستہ پر بغیر سترہ کے نماز شروع کر دے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور راستہ بھی موجود ہو، تو جس طرح نمازی راستہ پر بغیر سترہ کے نماز شروع کرنے کی وجہ سے گناہ گار ہے اسی طرح دوسرا راستہ ہونے کی وجہ سے گذرنے والا بھی گناہ گار ہے، گویا اس صورت میں دونوں مجرم ہیں، چوتھی صورت یہ ہے کہ نمازی نے راستہ سے ہٹ کر اور سترہ قائم کر کے نماز شروع کی لیکن گذرنے والے کے لیے گذرنے کی کوئی دوسری جگہ موجود نہیں، مثلاً جو اصل گذرگاہ ہے وہاں اس سے بھی زیادہ رکاوٹ ہے، تو ایسی صورت میں نہ نمازی گناہ گار ہے نہ گذرنے والا، نمازی تو اس لیے گناہ گار نہیں کہ اس نے سترہ قائم کرلیا تھا اور گذرنے والا یوں گناہ گار نہیں کہ اس کے سامنے اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں۔

## تشریح حدیث

واقعہ نقل کرتے ہیں کہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ جمعہ کے دن سترہ قائم کر کے نماز ادا کر رہے تھے، کہ ابومعیط کے خاندان کے ایک نوجوان نے سامنے سے گذرنا چاہا، حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ نے سینہ پر ہاتھ مار کر روک دیا، وہ رک گیا، لیکن پھر اس نے ادھر ادھر دیکھا اور وہ یہ سمجھا کہ اس کے علاوہ راستہ نہیں

ہے اس لیے اس نے دوبارہ گذرنے کا ارادہ کیا، حضرت ابوسعید نے پہلے سے بھی زیادہ سختی کے ساتھ روک دیا۔ معلوم ہوا کہ حضرت ابوسعید نے اپنے سترے کے مابین گذرنے کی اجازت نہیں دی، سختی سے پیش آئے اور اس کو رکنے پر مجبور کر دیا، لیکن وہ مروان حاکم کا رشتہ دار تھا، اس کو غرہ تھا کہ حکومت ہماری ہے، حکومت کا نشہ بھی عجیب ہوتا ہے، متعلقین بھی اپنے آپ کو حاکم تصور کرنے لگتے ہیں، چنانچہ وہ جوان حضرت ابوسعید کی شان میں نامناسب کلمات کہتا ہوا مسجد سے نکلا اور سیدھا مروان کے پاس پہنچا، حضرت ابوسعید بھی پیچھے پیچھے پہنچ گئے، مروان نے کہا کہ آپ نے اپنے بھتیجے کے ساتھ کیا طرز عمل اختیار کیا، مطلب یہ تھا کہ بھتیجا ہونے کا تقاضہ تو نرمی کے ساتھ پیش آنا تھا؟ حضرت ابوسعیدؓ نے جواب دیا کہ جناب! میں بھتیجے کے ساتھ سختی سے کیوں پیش آتا؟ میں نے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی ہدایت کے مطابق عمل کیا ہے اور شیطان کو دفع کیا ہے، کیوں کہ پیغمبر علیہ السلاۃ والسلام نے فرمایا" فان ابی فلیقاتله فانما هو شیطان"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوسعید نے پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے ارشاد کو ظاہر پر محمول کیا ہے اور وہ اس سلسلہ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتے، وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ سترہ قائم کرنے کے بعد نمازی کو یہ حق ہے کہ وہ گذرنے والے کو کسی بھی حالت میں گذرنے نہ دے، اس معاملہ میں وہ مجبوری کی بنیاد پر استثناء یا کسی طرح کی تفصیل کے قائل نہیں ہیں، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خاندان ابومعیط کے اس نوجوان کا یہ گذر، ان کے نزدیک بلاضرورت ہو اور وہ یہی سمجھ رہے ہوں کہ حاکم وقت کا عزیز ہونے کی بنیاد پر گذرنا چاہتا ہے، ورنہ نمازی کے سامنے سے گذرنے کی صورت میں اہل مذہب نے وہ تفصیل کی ہے، جو ابن دقیق العید کے حوالہ سے گذری۔ واللہ اعلم

## [۱۰۱] بَابُ اِثْمِ الْمَارِّبَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّيْ

(۵۱۰) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَنَا مَالِكٌ عَنْ اَبِي النَّضْرِ مَوْلٰى عُمَرَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ عَنْ بُسْرِ بْنِ سَعِيْدٍ اَنَّ زَيْدَ بْنَ خَالِدٍ اَرْسَلَهُ اِلٰى اَبِيْ جُهَيْمٍ يَسْاَلُهُ مَاذَا سَمِعَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِي الْمَارِّبَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّيْ فَقَالَ اَبُوْجُهَيْمٍ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّبَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّيْ مَاذَا عَلَيْهِ لَكَانَ اَنْ يَقِفَ اَرْبَعِيْنَ خَيْراً لَهُ مِنْ اَنْ يَمُرَّبَيْنَ يَدَيْهِ. قَالَ اَبُو النَّضْرِ لَا اَدْرِيْ قَالَ اَرْبَعِيْنَ يَوْماً اَوْ شَهْراً اَوْسَنَةً.

**ترجمہ** باب، نمازی کے سامنے سے گذرنے والے کے گناہ کا بیان۔ بسرؓ بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت زید بن خالدؓ نے انھیں حضرت ابوجہیم انصاریؓ کی خدمت میں بھیجا کہ وہ ابوجہیمؓ سے یہ پوچھیں کہ انھوں نے نمازی کے سامنے سے گذرنے کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ سے کیا سنا ہے؟ تو ابوجہیمؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

اگر نمازی کے سامنے سے گذرنے والا یہ جانتا کہ اس کو کتنا گناہ ہوگا تو البتہ یہ بات کہ وہ چالیس- تک کھڑا رہے اس کے نزدیک گذرنے کے مقابلہ پر بہتر ہوتی، ابوالنضرؒ کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں رہا کہ بسر بن سعیدؒ نے چالیس دن کہا تھا، یا چالیس مہینہ یا چالیس سال۔

**مقصد ترجمہ** باب سابق میں کہا گیا ہے کہ نمازی کو سترہ قائم کرنے کے بعد، اپنی نماز کی حفاظت کے لیے گذرنے والے کو پہلے نرمی اور پھر سختی سے روکنے کا مکلف کیا گیا ہے، اب اس باب میں گذرنے والے کو متنبہ کر کے دوسرا رخ واضح کیا جارہا ہے کہ اس عمل کا نتیجہ نہایت خطرناک ہے، اگر کوئی غلطی سے نمازی کے سامنے سے گذر رہا ہو اور نمازی اس کو روک دے تو ناراضگی یا سخت سست کہنے کے بجائے اس کو ممنون ہونا چاہئے، کہ اس نے متنبہ کر کے مجھے گناہ اور عذاب آخرت سے بچالیا، جیسے راہ چلنے والے کسی غافل یا نابینا کو اگر راستہ میں پائی جانے والی کسی خطرناک چیز کی اطلاع دے دی جائے تو وہ اس خیر خواہی پر شکر گذار اور ممنون ہوتا ہے۔

**تشریح حدیث** حضرت زید بن خالدؓ نے بسر بن سعیدؒ کو حضرت ابوجہیم انصاریؓ کی خدمت میں بھیجا کہ جاؤ اور یہ معلوم کر کے آؤ کہ انھوں نے نمازی کے سامنے سے گذرنے والے کے سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا سنا ہے؟ ابوجہیم نے فرمایا کہ آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو اس عمل پر ہونے والے گناہ اور عذاب کا علم ہو جائے تو وہ چالیس- تک کھڑے رہنے کو گذرنے سے بہتر سمجھے، یہاں علم سے مراد یا تفصیلی علم ہے، کہ اگر اس کو اپنے عمل کے گناہ اور عذاب کی تفصیلات معلوم ہو جائیں، یا پھر علم سے مراد علم مشاہدہ ہے یعنی اگر چہ اس کو پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام پر ایمان لانے کے سبب اس کا تو یقین ہے کہ نمازی کے سامنے سے گذرنا بہت بڑا گناہ ہے، مگر یہ علم اگر مشاہدہ بن جائے تو وہ نمازی کے سامنے سے گذرنے کی کبھی جرأت نہ کرے، گویا گذر جانے کی جرأت یا تو اس بنیاد پر ہوتی ہے کہ اس گناہ اور عذاب کی تفصیلات سامنے نہیں، یا اس بنیاد پر ہے کہ علم اگر چہ حاصل ہے، مگر مشاہدہ نہیں ہے، بہر حال روایت سے معلوم ہوا کہ نمازی کے سامنے سے گذرنا بہت بڑا گناہ ہے، نووی نے فرمایا کہ روایت سے معلوم ہوا کہ نمازی کے سامنے سے گذرنا حرام ہے اور حدیث پاک میں جو تاکید کے ساتھ وعید شدید وارد ہوئی ہے اس کا تقاضہ یہ ہے کہ نمازی کے سامنے سے گذرنے کو گناہ کبیرہ قرار دیا جائے۔

**قال ابو النضر الخ:** ابوالنضر جو بسر بن سعید کے شاگرد ہیں وہ کہتے ہیں کہ مجھے یہ محفوظ نہیں کہ اربعین یعنی چالیس کے بعد دن، مہینہ یا سال میں سے کیا چیز مذکور تھی، بظاہر اس کا مفہوم یہ ہے کہ بسر بن سعید نے اس کو ذکر کیا تھا مگر یاد نہیں رہا، اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ابہام اصل روایت میں نہیں تھا، چنانچہ مسند بزار میں ''لکان ان یقف اربعین خریفاً'' (فتح الباری ص:۱۳۲/ ج:۲) آیا ہے، فصل خریف سال میں ایک بار آتی ہے، اس لیے مطلب یہ ہوگا کہ چالیس سال کھڑا رہنا گذرنے سے بہتر سمجھے، نیز ابن حبان اور ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مائۃ عام کے الفاظ منقول

ہیں، ابن ماجہ میں ہے: عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ لو يعلم احدكم ماله في ان يمر بين يدی اخيه معترضا في الصلوة كان لان يقيم مائة عام خير له من الخطوة التي خطاها۔ (ابن ماجہ ص: ۶۷)۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم میں سے کوئی یہ جان لے کہ اس کو اپنے بھائی کے سامنے سے نماز میں گذرنے پر کیا گناہ ہوتا ہے؟ تو اس کے لیے اس ایک قدم چلنے کے مقابلہ پر سو سال تک کھڑا رہنا بہتر ہوگا۔

مطلب یہ ہوا کہ نمازی کے سامنے سے گذرنا گناہ ہے اور اتنا بڑا گناہ ہے کہ اگر نمازی کو اس کا ادارک ہو جائے تو وہ مدتوں کھڑا رہنا گذرنے سے بہتر خیال کرے۔　　واللہ اعلم

## [۱۰۲] بَابُ اِسْتِقْبَالِ الرَّجُلِ الرَّجُلَ وَهُوَ يُصَلِّي

وَكَرِهَ عُثْمَانُ اَنْ يَسْتَقْبِلَ الرَّجُلُ وَهُوَ يُصَلِّيْ. وَهٰذَا اِذَا اشْتَغَلَ بِهٖ فَأَمَّا اِذَا لَمْ يَشْتَغِلْ بِهٖ فَقَدْ قَالَ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ مَا بَالَيْتُ اَنَّ الرَّجُلَ لَا يَقْطَعُ صَلَاةَ الرَّجُلِ

(۵۱۱) حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ خَلِيْلٍ قَالَ اَنَا عَلِيُّ بْنُ مُسْهِرٍ عَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ مُسْلِمٍ عَنْ مَسْرُوْقٍ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهُ ذُكِرَ عِنْدَهَا مَا يَقْطَعُ الصَّلٰوةَ فَقَالُوْا يَقْطَعُهَا الْكَلْبُ وَالْحِمَارُ وَالْمَرْأَةُ فَقَالَتْ لَقَدْ جَعَلْتُمُوْنَا كِلَابًا لَقَدْ رَاَيْتُ النَّبِيَّ ﷺ يُصَلِّيْ وَاِنِّيْ لَبَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ وَاَنَا مُضْطَجِعَةٌ عَلَى السَّرِيْرِ فَتَكُوْنُ لِيَ الْحَاجَةُ وَاَكْرَهُ اَنْ اَسْتَقْبِلَهٗ فَانْسَلُّ اِنْسِلَالًا. وَعَنِ الْاَعْمَشِ عَنْ اِبْرَاهِيْمَ عَنِ الْاَسْوَدِ عَنْ عَائِشَةَ نَحْوَهٗ.　　(گذشتہ: ۳۸۲)

**ترجمہ** باب، نماز کی حالت میں ایک شخص کے دوسرے شخص کی طرف منہ کرنے کا بیان اور حضرت عثمانؓ نے نماز کی حالت میں ایک شخص کے دوسرے کی طرف منہ کرنے کو مکروہ قرار دیا، امام بخاری فرماتے ہیں کہ یہ کراہت اس صورت میں ہے کہ نمازی کا دل اس میں مشغول ہو جائے، لیکن اگر اس کا دل مشغول نہ ہو تو حضرت زید بن ثابت نے فرمایا کہ میں اس کی پروا نہیں کرتا کیوں کہ مرد کا سامنے آنا، مرد کے لیے قاطع نماز نہیں ہے، حضرت مسروق، حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہؓ کے سامنے ان چیزوں کا تذکرہ ہوا جن سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، تو لوگوں نے کہا کہ کتے، گدھے اور عورت کے سامنے آنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، اس پر حضرت عائشہ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے ہم عورتوں کو تو کتوں کی طرح بنا دیا، میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس طرح نماز پڑھتے دیکھا ہے کہ میں آپ ﷺ کے اور قبلہ کے درمیان تخت پر لیٹی ہوتی تھی، پھر اگر مجھے کوئی ضرورت ہوتی اور میں نماز میں آپ ﷺ کے سامنے پڑنے کو ناپسند سمجھتی تو آہستہ سے کھسک کر نکل جاتی۔ اعمش بھی ابراہیم عن اسود کی سند سے حضرت عائشہ سے اسی طرح

کی روایت کرتے ہیں۔

**مقصد ترجمہ** پچھلے باب میں بتلایا گیا کہ نمازی کے سامنے سے گذرنا جائز نہیں، اب بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی گذرا تو نہیں، لیکن نمازی کے سامنے رخ کر کے بیٹھا رہے یا کھڑا رہے تو اس کا کیا حکم ہے؟ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے اس صورت کو مکروہ قرار دیا ہے اور حضرت زید بن ثابتؓ نے فرمایا ہے کہ مجھے اس کی پرواہ نہیں اس لیے کہ کسی مرد کے نماز میں کسی مرد کے سامنے پڑنے سے نقصان واقع نہیں ہوتا، امام بخاری اس سلسلہ میں اپنا رجحان ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت عثمان اور حضرت زید کے ارشادات اپنی اپنی جگہ درست اور دو الگ الگ حالات سے متعلق ہیں، اگر سامنے آنے سے نمازی کی طبیعت میں انتشار پیدا ہو اور جمعیت خاطر متاثر ہو جائے تو مکروہ ہے، لیکن اگر اطمینان قلب پر کوئی فرق نہیں پڑتا تو سامنے رخ کر کے بیٹھنا یا کھڑے ہونا مکروہ نہیں ہے۔

**تشریح حدیث** دوسری سند سے وہی روایت ذکر کی گئی ہے، جو چند ابواب پہلے "الصلوة الی السریر" میں گذری جس میں حضرت عائشہ نے راویوں کے طرز ادا اور تعبیر کی شکایت کی ہے، یہ روایت بعد میں آئے گی وہیں کچھ بیان کیا جائے گا، یہاں ترجمۃ الباب سے متعلق یہ بات ہے کہ حضرت عائشہؓ نے یہ فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے اور قبلہ کے درمیان لیٹی رہتی تھی، پھر کوئی ضرورت ہوتی اور مجھے اٹھنا ہوتا تو میں آپ کے سامنے پڑنے کو ناپسند سمجھتی تھی، اور آہستہ سے کھسک کر پائینتی کی طرف آتی پھر اٹھتی، حضرت عائشہؓ کی جانب سے استقبال اور مواجہت کا طریقہ چھوڑ کر، آہستہ سے کھسک جانے کا طریقہ اختیار کرنا ترجمۃ الباب کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے، مگر یہاں دو اشکال ہیں: ایک تو یہ کہ ترجمۃ الباب ہے "استقبال الرجل الرجل" مرد کا مرد کے سامنے ہونا اور روایت میں آیا "استقبال الرجل المرأة" عورت کا مرد کے سامنے ہونا، دوسرے یہ کہ امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں یہ وضاحت کی کہ اس کا مدار انتشار طبیعت پر ہے، اگر طبیعت میں انتشار پیدا ہو تو مکروہ ورنہ مکروہ نہیں، اور یہ وضاحت روایت میں نہیں ہے، مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں روایت سے آسانی کے ساتھ ثابت ہیں، کیونکہ پہلی بات تو اس طرح ثابت ہے کہ جب عورت کے سامنے آنے سے نماز میں کوئی کراہت نہیں آتی، تو مرد کے سامنے آنے سے بدرجہ اولی نہیں آئے گی، گویا امام بخاری نے دلالت النص کے طریقہ پر یہ بات ثابت کی، دوسری بات یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا استقبال کے طریقہ سے بچ کر، انسلال یعنی آہستگی کے ساتھ کھسک جانے کا طریقہ اختیار کرنا اسی لیے تو تھا کہ نماز میں طبیعت میں انتشار نہ ہو، اگرچہ پیغمبر علیہ السلام کے بارے میں انتشار طبیعت کا ادنی احتمال تسلیم کرنا بھی درست نہیں، لیکن حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا احتیاط فرمانا ہی ترجمۃ الباب کو ثابت کر رہا ہے۔

## [۱۰۳] بَابُ الصَّلٰوةِ خَلْفَ النَّائِمِ

**(۵۱۲) نَا مُسَدَّدٌ قَالَ نَا يَحْيٰى قَالَ نَا هِشَامٌ قَالَ حَدَّثَنِىْ اَبِىْ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ**

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْ وَاَنَا رَاقِدَةٌ مُعْتَرِضَةٌ عَلٰى فِرَاشِهٖ فَاِذَا اَرَادَ اَنْ يُوْتِرَ اَيْقَظَنِيْ فَاَوْتَرْتُ. (گذشتہ:۳۸۲)

**ترجمہ** باب، سونے والے شخص کے پیچھے نماز پڑھنے کا بیان۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس حالت میں نماز پڑھا کرتے تھے، کہ میں آپ ﷺ کے بچھونے پر (جنازے کی طرح) سوئی ہوئی رہتی تھی، پھر جب آپ وتر پڑھنے کا ارادہ کرتے تو مجھے بیدار کردیتے اور میں وتر پڑھتی۔

**مقصد ترجمہ** ابوداؤد اور ابن ماجہ وغیرہ کی روایت میں سوتے ہوئے انسان کے پیچھے، یعنی نمازی کے سامنے کی جانب میں کوئی سورہا ہو تو ممانعت وارد ہوئی ہے: عن ابن عباس قال نهى رسول الله ﷺ ان يصلى خلف المتحدث و النائم " (ابن ماجہ ص:۶۸) ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس چیز سے منع فرمایا ہے کہ باتیں کرنے والے اور سونے والے انسان کے پیچھے نماز پڑھی جائے۔

چنانچہ امام مالکؒ سے سونے والے شخص کے پیچھے کھڑے ہوکر نماز پڑھنے کی کراہت منقول ہے، مگر امام بخاری کے ترجمۃ الباب سے معلوم ہوتا ہے کہ یا تو وہ اس روایت کے ضعیف ہونے کی بنیاد پر اس کو قابل اعتناء نہیں سمجھتے، یا پھر وہی تاویل کررہے ہیں جو "باب استقبال الرجل الرجل" میں گذری ہے یعنی اگر کوئی سامنے سورہا ہو تو بذات خود اس میں کوئی خرابی نہیں ہے، لیکن یہ ممکن ہے کہ اس کے خراٹوں کی آواز سے بے اطمینانی کی صورت پیدا ہوجائے، اور نماز کا خشوع متاثر ہو، یا وہ مثلاً کروٹ لے اور سجدہ کی جگہ میں آجائے یا کوئی اور ناگوار بات پیش آئے اور نمازی کی طبیعت میں انتشار پیدا ہوجائے، لیکن اگر کسی کی عادت معلوم ہوجائے کہ وہ سوتا ہے تو ایک ہی کروٹ پر پڑا رہتا ہے، خراٹوں کی آواز بھی نہیں آتی اور دوسری کوئی ناگواری بھی پیش نہیں آتی، تو اس کے سامنے لیٹا رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں، گویا ممانعت کی بنیاد ہے نمازی کی طبیعت کا انتشار، اس سے اطمینان ہے تو ممانعت نہیں۔

**تشریح حدیث** حضرت عائشہؓ ہی کی روایت ہے کہ میں نماز میں رسول اللہ ﷺ کے بچھونے پر لیٹی رہتی اور آپ میرے سامنے لیٹا رہنے اور سونے کے باوجود نماز پڑھتے رہتے، وتر کا ارادہ فرماتے تو مجھے جگادیتے اور میں بھی وتر پڑھتی، بہ ظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوسرا واقعہ ہے، کیونکہ باب سابق کی روایت میں آیا تھا کہ میں سامنے تخت پر لیٹی رہتی اور اس میں آیا کہ میں بچھونے پر سوتی رہتی، نیز یہ کہ پچھلی روایت میں یہ مذکور ہے کہ مجھے ضرورت پیش آتی تو میں کھسک کر کنارے آجاتی اور اٹھ کر چلی جاتی، جس کا بظاہر مطلب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ سامنے تخت پر بیداری کی حالت کا تذکرہ کررہی ہیں اور اس روایت میں وہ اپنے آپ کو "راقدۃ" فرمارہی ہیں، نیز روایت سے یہ معلوم ہوا کہ وتر کا معاملہ زیادہ اہم ہے، کیونکہ آپ ﷺ ان کو تہجد کے لیے بیدار نہ فرماتے، وتر کے لیے بیدار کرتے۔ واللہ اعلم

## [ ۱۰۴ ] بَابُ التَّطَوُّعِ خَلْفَ الْمَرْأَةِ

(۵۱۳) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَنَا مَالِكٌ عَنْ اَبِي النَّضْرِ مَوْلٰى عُمَرَ بْنِ عُبَيْدِ اللّٰهِ عَنْ أبي سَلَمَةَ بنِ عَبْدِ الرحمٰنِ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهَا قَالَتْ كُنْتُ اَنَامُ بَيْنَ يَدَيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَرِجْلَايَ فِيْ قِبْلَتِهٖ فَإِذَا سَجَدَ غَمَزَنِيْ فَقَبَضْتُ رِجْلَيَّ فَإِذَا قَامَ بَسَطْتُهَا قَالَتْ وَالْبُيُوتُ يَوْمَئِذٍ لَيْسَ فِيْهَا مَصَابِيْحُ. (گذشتہ: ۳۸۲)

**ترجمہ** باب، عورت کے پیچھے کھڑے ہوکر نافلہ نماز ادا کرنے کا بیان۔ حضرت عائشہؓ ام المومنین سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس طرح سویا کرتی تھی کہ میرے پاؤں آپ کے قبلہ کی جگہ میں ہوتے، پھر جب آپ سجدہ میں جاتے تو میرے پاؤں کو چھودیتے اور میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی، پھر جب آپ کھڑے ہوتے تو میں پاؤں پھیلا لیتی، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ ان دنوں گھر میں چراغ نہ ہوتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** تطوع خلف المرأۃ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عورت کو امام بنایا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ عورت سامنے لیٹی یا بیٹھی ہو اور کوئی نماز پڑھنا چاہے، تو ایسا کرنا جائز ہے، نیز تطوع کی تصریح کا بھی یہ مطلب نہیں کہ اس طرح فریضہ پڑھنے کی اجازت نہ ہوگی، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ فریضہ تو چونکہ رسول اللہ ﷺ مسجد میں ادا فرماتے تھے، گھر میں نوافل وسنن ہی پڑھتے تھے، اس لیے ثبوت تطوع کا تھا بس اسی کی تصریح کردی، حکم فریضہ کا بھی یہی ہے، مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ جس طرح نمازی کے سامنے مرد کے بیٹھا یا لیٹا رہنے سے کوئی نقصان واقع نہیں ہوتا، اسی طرح اگر طبیعت میں انتشار یا خشوع نماز پر کوئی فرق نہ پڑتا ہو تو عورت کے سامنے بیٹھا رہنے یا لیٹا رہنے سے کوئی نقصان نہ ہوگا، مسئلہ محاذاۃ سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ابواب سترہ سے، اس باب اور پچھلے دو ابواب کا تعلق یہ ہے کہ جس طرح کسی جانور کو بٹھا کر سترہ بنایا جاسکتا ہے اسی طرح مرد کے بھی سترہ کی جگہ بیٹھنے یا لیٹنے سے نماز درست رہے گی، پھر یہ ضروری نہیں کہ وہ جاگ رہا ہو بلکہ سونے کی حالت میں بھی سترہ کا کام لیا جاسکتا ہے، اسی طرح سونے والی اگر عورت ہو تو یہ بھی درست ہے، گویا مرد اور عورت کو سونے اور جاگنے کی دونوں حالتوں میں سترہ بنانا درست ہے، یعنی ان ابواب میں متحرک چلتی پھرتی ذی روح چیزوں کو سترہ کے طور پر استعمال کرنے کی چند جزئیات کا بیان ہے، مگر امام بخاری نے ان سب چیزوں میں یہ بتلایا ہے کہ اگر فتنوں کا اندیشہ ہو یا اطمینانی کیفیت باقی نہ رہتی ہو تو سترہ نہ بنایا جائے اور اگر اطمینان قلب حاصل رہے اور ہر فتنہ سے مامون رہنے کا اعتماد ہو تو ان چیزوں سے سترہ کا کام لیا جاسکتا ہے۔

**تشریح حدیث** وہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ واقعہ ایک ہو، بلکہ یہاں پیر کو ہاتھ چھونے کا مضمون بظاہر یہ بتلا رہا ہے کہ یہ کوئی اور واقعہ ہے فرماتی ہیں۔ کہ میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے اس طرح سوتی رہتی تھی کہ میرے پاؤں آپ کے سجدہ کی جگہ ہوتے تھے، جب آپ سجدہ میں جاتے تو پاؤں کو چھو کر متنبہ فرما دیتے، اور میں اپنے پاؤں سمیٹ لیتی، معلوم ہوا کہ عورت کے نمازی کے سامنے سترہ کی جگہ لیٹے رہنے میں کوئی مضائقہ نہیں، نیز عورت کے پیر کو ہاتھ سے چھو دینے سے حنفیہ کے اس مسئلہ کی بھی تائید ہوتی ہے کہ مس مرأۃ ناقض وضو نہیں ہے۔ واللہ اعلم

## [۱۰۵] بَابُ مَنْ لَا یَقْطَعُ الصَّلٰوۃَ شَیٌٔ

(۵۱۴) حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ حَفْصِ بْنِ غِیَاثٍ ثنا اَبِیْ قَالَ نَا الْاَعْمَشُ قَالَ نَا اِبْرَاھِیْمُ عَنِ الْاَسْوَدِ عَنْ عَائِشَۃَ ح قَالَ الْاَعْمَشُ وَحَدَّثَنِیْ مُسْلِمٌ عَنْ مَسْرُوْقٍ عَنْ عَائِشَۃَ ذُکِرَ عِنْدَھَا مَا یَقْطَعُ الصَّلٰوۃَ الْکَلْبُ وَالْحِمَارُ وَالْمَرْأَۃُ فَقَالَتْ شَبَّھْتُمُوْنَا بِالْحُمُرِ وَالْکِلَابِ وَاللّٰہِ لَقَدْ رَأَیْتُ النَّبِیَّ ﷺ یُصَلِّیْ وَاِنِّیْ عَلَی السَّرِیْرِ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْقِبْلَۃِ مُضْطَجِعَۃٌ فَتَبْدُوْلِیَ الْحَاجَۃُ فَاَکْرَہُ اَنْ اَجْلِسَ فَاُوْذِیَ النَّبِیَّ ﷺ فَانْسَلُّ مِنْ عِنْدِ رِجْلَیْہِ. (گذشتہ: ۳۸۲)

(۵۱۵) حَدَّثَنِیْ اِسْحَاقُ بْنُ اِبْرَاھِیْمَ قَالَ انا یَعْقُوْبُ بْنُ اِبْرَاھِیْمَ قَالَ نَا ابْنُ اَخِیْ ابْنِ شِھَابٍ اَنَّہٗ سَأَلَ عَمَّہٗ عَنِ الصَّلٰوۃِ یَقْطَعُھَا شَیٌٔ قَالَ لَا یَقْطَعُھَا شَیٌٔ اَخْبَرَنِیْ عُرْوَۃُ بْنُ الزُّبَیْرِ اَنَّ عَائِشَۃَ زَوْجَ النَّبِیِّ ﷺ قَالَتْ لَقَدْ کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ یَقُوْمُ فَیُصَلِّیْ مِنَ اللَّیْلِ وَاِنِّیْ لَمُعْتَرِضَۃٌ بَیْنَہٗ وَبَیْنَ الْقِبْلَۃِ عَلٰی فِرَاشِ اَھْلِہٖ. (گذشتہ: ۳۸۲)

**ترجمہ** باب، ان لوگوں (کی دلیل) کا بیان جو یہ کہتے ہیں کہ نماز کسی چیز سے نہیں ٹوٹتی۔ اسود اور مسروق، حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ ان کے سامنے ان چند چیزوں کا ذکر کیا گیا جن سے نماز ٹوٹ جاتی ہے یعنی کتا، گدھا اور عورت، تو حضرت عائشہ نے فرمایا کہ تم لوگوں نے ہم (عورتوں) کو گدھوں اور کتوں سے مشابہ قرار دیا جب کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس حال میں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا کہ میں آپ کے اور قبلہ کے درمیان چارپائی (یا تخت) پر لیٹی رہتی تھی، پھر مجھے کوئی ضرورت پیش آتی اور میں اس بات کو پسند نہ کرتی کہ سامنے بیٹھوں اور رسول اللہ ﷺ کے لیے اذیت کا سبب بنوں تو میں آپ کے پیروں کی جانب کھسک کر نکل جاتی۔ ابن شہاب کے بھتیجے (محمد بن عبداللہ) نے بیان کیا کہ انھوں نے اپنے چچا ابن شہاب زہری سے پوچھا کہ کیا نماز کو کوئی چیز توڑ دیتی ہے؟ تو انھوں نے فرمایا کہ نماز کو کوئی چیز نہیں توڑتی، مجھ سے عروہ بن زبیر نے بیان کیا کہ آنحضرت ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

نے بیان کیا کہ رسول اللہ علیہ رات کو کھڑے ہو کر نماز پڑھتے تھے، جب کہ میں آپؐ کے اور قبلہ کے درمیان آپ کے گھر کے بچھونے پر عرض میں (یعنی جنازے کی طرح) لیٹی رہتی تھی۔

**مقصد ترجمہ** ایک باب پہلے گذر چکا ہے اور کئی ابواب آگے آ رہے ہیں جن میں نماز کے دوران عورت کا مختلف انداز سے تعلق مذکور ہے، پچھلے باب میں آیا تھا کہ عورت سامنے سو رہی ہو تو سترے کے طور پر اس کو سامنے بر قرار رکھنا درست ہے، اب اسی پر نتیجہ کے طور پر دوسرا باب منعقد کر رہے ہیں: ''من قال لا يقطع الصلوة شئ'' یعنی ان لوگوں کی تائید کا بیان جو یہ کہتے ہیں کہ نماز میں کسی بھی چیز کا سامنے آ جانا قاطع صلوۃ نہیں، حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے فرمایا کہ یہاں سے ابواب سترہ کے آخر تک کے ابواب منعقد کرنے کا مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ عورت نماز کے لیے قاطع نہیں ہے، یعنی عورت کے سامنے آنے سے نماز ختم نہیں ہوتی، قسطلانی شارح بخاری نے یہ وضاحت کی ہے کہ جب عورت کے سامنے آنے سے نماز ختم نہیں ہوتی جب کہ عورتوں کی جانب مردوں کا میلان ایک فطری بات ہے، تو کتے اور گدھے جیسی قابل نفرت چیزوں کے سامنے آنے سے بدرجہ اولی نماز ختم نہ ہونی چاہئے، گویا امام بخاری نے یہ ترجمہ جمہور کی تائید میں منعقد فرمادیا جن کے نزدیک سترہ ہو یا نہ ہو کسی بھی چیز کے سامنے گذرنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، البتہ امام احمدؒ کی طرف منسوب ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ گدھے اور عورت کے بارے میں تو مجھے شرح صدر نہیں ہے، لیکن کتے کے سامنے آنے سے نماز ختم ہو جائے گی، ابن دقیق العید نے امام احمد کے ارشاد کی یہ وضاحت کی ہے کہ امام احمد کو کلب اسود کے بارے میں کوئی متعارض روایت نہیں ملی، جب کہ گدھے اور عورت کے بارے میں روایت میں تعارض ہے، گدھے کے بارے میں حضرت ابن عباس کی روایت ہے کہ منی میں ان کی گدھی رسول اللہ علیہ کے سامنے گھومتی رہتی اور عورت کے بارے میں حضرت عائشہ کی روایت باب ہے۔

مذکورہ بالا تین چیزوں یا ان میں سے بعض چیزوں کے سامنے آنے کی وجہ سے نماز کے فساد، قطع یا ختم ہونے پر جس دلیل سے استدلال کیا جا سکتا ہے وہ مسلم شریف میں حضرت ابوذر کی روایت سے موجود ہے کہ تم میں جب کوئی نماز کے لیے کھڑا ہو تو اسے کجاوے کی کمر لگانے کی لکڑی کی طرح سترہ قائم کر لینا چاہئے، اگر سترہ نہ ہوگا تو ''فانه يقطع صلوته الحمار والمرأة والكلب الاسود'' (مسلم ص ۱۹۷/۱) تو بے شک اس کی نماز کو گدھا، عورت، اور کالا کتا توڑ دے گا۔

لیکن امام بخاریؒ اور جمہور جو ان چیزوں کے سامنے آنے سے نماز کے ختم ہونے کے قائل نہیں ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلم شریف کی روایت میں قطع صلوۃ سے مراد نماز کا فساد یا ختم ہونا نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ ان چیزوں کے سامنے آنے سے وہ تعلق متاثر ہو جاتا ہے، جو نماز میں بندے اور پروردگار کے درمیان قائم ہے، یعنی ان چیزوں سے نماز نہیں بلکہ خشوع صلوۃ متاثر ہوتا ہے، پھر قطع صلوۃ کی یہ مراد متعین کرنے کے لیے ان حضرات کے پاس خود اسی

مسلم شریف کی روایت میں یہ قرینہ ہے کہ راوی نے حضرت ابوذرؓ سے یہ معلوم کیا کہ سرخ اور زرد رنگ کے کتے کے مقابلہ پر کالے کتے کی کیا خصوصیت ہے؟ تو حضرت ابوذرؓ نے فرمایا کہ عزیزم! میں نے بھی رسول اللہ علیہ السلام سے یہی سوال کیا تھا جو تم مجھ سے کر رہے ہو، تو آپ نے فرمایا تھا ''**الکلب الاسود شیطان**'' یعنی کالا کتا شیطان کے حکم میں ہے، فساد صلوۃ کا قول نہ کرنے والے کہتے ہیں کہ کالے کتے کو شیطان کہا گیا ہے، جب کہ یہ طے اور محقق ہے کہ خود شیطان کے سامنے آنے سے نماز فاسد نہیں ہوتی، جیسا کہ روایت سے ثابت ہے ''**ان الشیطان قد عرض لی**'' یعنی حضور پاک علیہ السلام نے فرمایا کہ شیطان نماز میں میرے سامنے آیا اور اس نے نماز کو قطع کرنا چاہا، لیکن اللہ تعالی نے مجھے اس پر قابو دے دیا اور میں نے اس کو گرفتار کر لیا، پھر جب خود شیطان کے سامنے آنے کے باوجود نماز باقی رہتی ہے تو کلب اسود کے سامنے آنے سے بدرجہ اولی باقی رہنی چاہئے۔

**تشریح حدیث** اس باب کے تحت امام بخاری نے دو روایتیں ذکر کی ہیں، دونوں روایتوں کا مضمون ایک ہی ہے، جن میں حضرت عائشہ اپنا واقعہ ذکر فرما رہی ہیں، لیکن دوسری روایت میں ابن شہاب زہری کی جانب سے ''**لایقطع الصلوۃ شیٔ**'' کی صراحت ہے، اسی طرح کے الفاظ طحاوی اور مسند ابن ابی شیبہ میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حذیفہؓ بن الیمان اور دوسرے صحابہ کرام سے منقول ہیں کہ نماز کسی چیز کے سامنے آنے سے نہیں ٹوٹتی۔

روایت میں آیا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے یہ ذکر ہوا کہ نماز میں کتے، گدھے اور عورت کے سامنے آنے سے نماز ٹوٹ جاتی ہے، تو حضرت عائشہؓ نے شکایت کے انداز میں فرمایا کہ تم لوگوں نے تو کمال کر دیا کہ کتے، گدھے اور عورت کو ایک ہی خانہ میں رکھ دیا، حالانکہ ان میں زبردست فرق ہے، چند ابواب پہلے: ''**باب الصلوۃ الی السریر**'' میں یہ وعدہ کیا گیا تھا کہ آئندہ اس فرق کی وضاحت کی جائے گی، آج وعدہ کے مطابق چند باتیں عرض کی جائیں گی۔

سب سے پہلے تو یہ بات ملحوظ رہنی چاہئے کہ جب حضرت ابوذر کی صحیح روایت میں ''**یقطع صلوته الحمار والمرأۃ والکلب الاسود**'' موجود ہے، تو حضرت عائشہ کی شکایت یا نکیر کے کیا معنی ہوں گے؟ احتمال کی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ شاید انھیں روایت نہ پہنچی ہو اور انھیں یہ اشکال ہو کہ ایک طرف تو یہ حضرات کتے، گدھے اور عورت کے گذرنے سے نماز ٹوٹ جانے کا مضمون نقل کر رہے ہیں اور دوسری طرف میرا مشاہدہ ہے کہ میں سامنے لیٹی رہتی تھی اور رسول اللہ علیہ السلام نماز میں مشغول رہتے تھے، اس تضاد کی بنا پر وہ نکیر فرماتی ہیں، لیکن اس مضمون کی تردید خود اس قرینہ سے ہو جاتی ہے کہ اسی روایت میں یہ مذکور ہے ''**اکرہ ان اجلس**'' میں نماز کی حالت میں حضور علیہ السلام کے سامنے بیٹھنے کو پسند نہ کرتی، سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کے علم میں حضرت ابوذر والی روایت یا اس کا مضمون نہیں تھا، تو انھیں نماز میں حضور علیہ السلام کے سامنے بیٹھنے میں تامل کیوں تھا؟ جس کی رعایت سے وہ انسلال کا عمل کرتی ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ کچھ نہ کچھ ان کے علم میں ہے، یہ احتمال تو ختم ہوا کہ وہ اس مضمون پر نکیر فرما رہی ہیں۔

**حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد** دوسری بات جو حضرت شیخ الہند قدس سرہ کی پسندیدہ ہے یہ ہے کہ حضرت عائشہ کو اصل مسئلہ سے انکار نہیں ہے، بلکہ لب ولہجہ پر اعتراض ہے، حضرت شیخ الہندؒ نے یہی جملہ ارشاد فرمایا تھا، اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عائشہ نے کتے، گدھے اور عورت کو ایک فہرست میں شمار کرنے والوں سے یہ شکایت کی کہ اس مضمون کو بیان کرنے کے لیے تمہارا طرز بیان اور طریق ادا اچھا نہیں ہے، تعبیر مثلاً یوں بھی تو ہو سکتی ہے کہ کتے اور گدھے کے سامنے سے گذرنے پر نماز قطع ہو جاتی ہے اور اسی طرح عورتوں کا بھی یہی حکم ہے، نیز یہ کہ قطع صلوۃ کے جو معنی تم سمجھ رہے ہو کم از کم عورت کے بارے میں تو میرا مشاہدہ اس کے خلاف ہے کہ میں حضور ﷺ کے سامنے لیٹی رہتی اور آپ نماز ادا فرما لیتے، مجھے سامنے سے ہٹنے کا حکم نہ دیتے تھے، اس لیے عورت کے حق میں تو قطع صلوۃ کے معنی فساد صلوۃ نہیں، قطع خشوع صلوۃ ہو سکتے ہیں اور چونکہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے خشوع کے متاثر ہونے کا بھی احتمال نہیں تھا، آپ اس حال میں نماز پڑھ لیتے تھے، اس لیے بیان کرنے والے کا تینوں چیزوں کو ایک سلسلہ میں منسلک کر کے بیان کر دینا قابل اعتراض ہے۔

**حضرۃ الاستاذؒ کی تشریح** حضرت شیخ الہند قدس سرہ کے جملہ کی یہ تشریح بھی ہو سکتی ہے اور یہی زیادہ بہتر ہے کہ حضرت عائشہ کتے، گدھے اور عورت کے مسئلہ میں فرق کر رہی ہیں کہ خشوع صلوۃ کو ختم یا کمزور کرنے کے سلسلے میں کتے، گدھے اور عورت تینوں چیزوں کو شیطان سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر موثر مان لیا جائے، تب بھی عورت کے بارے میں عموم کی بات کہنا درست نہ ہوگا، مثلاً کتے کے بارے میں آیا: "الکلب الاسود شیطان" یا گدھے کے بارے میں آیا: "اذا سمعتم نهيق الحمار فتعوذوا بالله من الشيطان الرجيم فانه رأى شيطانا" اگر تم گدھے کی آواز سنو تو شیطان رجیم سے اللہ کی پناہ طلب کرو اس لیے کہ وہ شیطان کو دیکھ کر آواز نکالتا ہے، گویا دونوں کا شیطان سے تعلق ہے، اور اس میں فرق نہیں کیا جا سکتا کہ کتا یا گدھا اپنا ہو یا کسی دوسرے کا بلکہ کسی بھی طرح کے کتے یا گدھے کا سامنے آنا ہر حال میں طبیعت پر اثر انداز ہوگا، جب کہ عورت کا یہ معاملہ نہیں ہے، اگرچہ عورتوں کے بارے میں بھی "النساء حبالة الشيطان" (عورتیں شیطان کا جال اور پھندا ہیں) فرمایا گیا ہے، مگر یہ تفصیل تو کرنا ہوگی کہ سب عورتوں کا یہی حکم ہے یا اس میں فرق ہے؟ ظاہر ہے کہ محرم عورتیں، یا اپنی بیویاں اس حکم میں نہیں ہیں، اس لیے حضرت عائشہ کی شکایت کی بنیاد میرے خیال کے مطابق یہ ہے کہ وہ راویوں کے ہر حال میں عورت کو قاطع قرار دینے اور اس کو کتوں اور گدھوں کے ساتھ عموم میں شریک کرنے کی بنیاد پر نکیر فرما رہی ہیں، وہ یہ نہیں فرما رہی ہیں کہ عورت کسی حال میں کسی مرد کے لیے قاطع صلوۃ نہیں ہے۔

کتے، گدھے اور عورت کے درمیان فرق اس طرح بھی کیا جا سکتا ہے کہ کتے اور گدھے سے انسان کو نفرت ہوتی ہے اور ان کے سامنے آنے سے طبیعت میں انقباض اور گھٹن پیدا ہوتی ہے اور عورت کی طرف رغبت ہوتی ہے،

اس لیے اس کے سامنے آنے سے انشراح وانبساط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، اگر چہ انقباض وانبساط دونوں ہی کیفیتیں خشوع صلوۃ پر اثر انداز ہوتی ہیں، مگر یہ فرق تو کرنا ہوگا کہ ماؤں، بہنوں اور بیویوں کے سامنے آنے سے تو اس طرح کا انبساط طاری نہیں ہوگا کہ اس سے نماز میں نمازی اور پروردگار کے درمیان قائم ہونے والا رشتہ متاثر ہو جائے، اس لیے کتے اور گدھے کا حکم عام ہے اور عورتوں کے بارے میں تفصیل، راویوں نے چونکہ اس فرق کو نظر انداز کر دیا تھا، اس لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے شکایت فرمائی کہ تم نے اچھی تعبیر اختیار نہیں کی۔ واللہ اعلم

**ترجمۃ الباب اور حدیث کا ربط** ترجمۃ الباب ہے کہ کسی چیز کے سامنے سے گذرنے سے نماز نہیں ٹوٹتی، اور حدیث باب میں گذرنے کا ذکر نہیں، بلکہ پہلی روایت میں صرف عورت کے بیٹھنے کو ناپسند کرنے اور راستہ سے کھسک کر سامنے سے ہٹ جانے کا تذکرہ ہے، دوسری روایت میں عورت کے سامنے لیٹنے کا بیان ہے، گویا دعوی یہ ہے کہ کسی شئ کا مرور قاطع صلوۃ نہیں اور دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں سامنے لیٹی رہتی تھی، یہاں دو باتوں میں فرق ہے، ایک تو یہ کہ کئی چیزوں کے تذکرے کے بجائے ذکر صرف ایک چیز یعنی عورت کا ہے، دوسرے یہ کہ مرور کا تو سرے سے ذکر نہیں، شارحین حیران ہیں کیا توجیہ کریں؟ امام بخاری کے مذاق کے مطابق کہا جائے گا کہ تذکرہ تو صرف عورت کا ہے، لیکن نمازی کے خشوع وخضوع پر اثر انداز ہونے میں وہی تو اصل ہے، اس لیے جب عورت کے سامنے آنے کے باوجود نماز باقی رہتی ہے، تو بقیہ چیزیں کس حساب میں ہیں؟ نیز یہ کہ مرور کا تذکرہ تو واقعۃً نہیں ہے، مگر کہا جاسکتا ہے کہ جب با قاعدہ لیٹا رہنا جائز ہے جس میں تسلسل کے ساتھ نظر پڑتی ہے تو یکبارگی سامنے آنے اور فوراً نکل جانے کا معاملہ تو اس سے کہیں اہون اور معمولی ہے، اس لیے دونوں ہی باتیں فقہاء کرام کے محتاط اور محکم اسلوب کے مطابق تو نہیں، مگر امام بخاری کے انداز کے مطابق ثابت کی جاسکتی ہیں۔ واللہ اعلم

## [۱۰۶] بَابٌ اِذَا حَمَلَ جَارِيَةً صَغِيْرَةً عَلٰى عُنُقِهٖ فِي الصَّلٰوةِ

(۵۱۶) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَنَا مَالِكٌ عَنْ عَامِرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ ابْنِ الزُّبَيْرِ عَنْ عَمْرِو بْنِ سُلَيْمٍ الزُّرَقِيِّ عَنْ اَبِيْ قَتَادَةَ الْاَنْصَارِيِّ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّيْ وَهُوَ حَامِلٌ اُمَامَةَ بِنْتَ زَيْنَبَ بِنْتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَلِاَبِي الْعَاصِ ابْنِ رَبِيْعَةَ بْنِ عَبْدِ شَمْسٍ فَاِذَا سَجَدَ وَضَعَهَا وَاِذَا قَامَ حَمَلَهَا۔ (آئندہ: ۵۹۹۶)

**ترجمہ** باب، جب نمازی نماز میں چھوٹی بچی کو اپنی گردن پر اٹھالے (تو اس کا حکم کیا ہے؟) حضرت ابو قتادہ انصاری سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ حضرت امامہ کو جو زینب بنت رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو العاص بن ربیعہ بن عبد الشمس کی صاحب زادی تھیں، اٹھائے ہوئے یعنی کاندھے پر بٹھائے ہوئے نماز پڑھتے تھے، چنانچہ جب

آپ سجدے میں جاتے تو نیچے اتار دیتے اور جب کھڑے ہوتے تو پھر اٹھا لیتے۔

**مقصد ترجمہ** ترجمۃ الباب کے الفاظ میں تو کسی حکم کی یعنی جواز یا عدم جواز کی وضاحت نہیں، لیکن روایت سے یہ معلوم ہوا کہ چھوٹی بچی کو کاندھے پر بٹھا کر نماز پڑھنا جائز ہے، ابن بطال شارح بخاری فرماتے ہیں کہ اس باب میں امام بخاریؒ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جب بچی کو کاندھے پر بٹھا کر نماز پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں تو عورت کے نمازی کے سامنے سے گذرنے پر تو کوئی اشکال ہی نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ محض گذرنا، کاندھے پر بٹھانے سے کہیں معمولی بات ہے، امام شافعیؒ نے بھی اس استنباط کی طرف اشارہ کیا ہے۔

**تشریح حدیث** حضرت ابوقتادہؓ روایت بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ حضرت امامہؓ کو لئے ہوئے نماز پڑھتے تھے، ابوداؤد کی روایت میں "**یحملها علی عاتقه**" کاندھے پر بٹھا کر، یا "**امامة علی عنقه**" امامہ کے گردن پر بیٹھا رہنے کی تصریح ہے، امامہ رسول اللہ ﷺ کی نواسی ہیں یعنی آپؐ کی حضرت خدیجہ سے سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینب کی لڑکی ہیں، حضرت زینب کی پیدائش کے وقت رسول اللہ ﷺ کی عمر مبارک ۳۰/ سال تھی حضرت زینب کا نکاح مکہ مکرمہ میں حضرت خدیجہ کی زندگی میں ابوالعاص ابن الربیع کے ساتھ ہوگیا تھا، حضرت ابو العاص کی والدہ ہالہ بنت خویلد حضرت خدیجہ کی حقیقی بہن تھیں، حضرت ابوالعاص کا حضرت زینب سے تعلق ہر دور میں بہت بہتر رہا۔ کفار مکہ نے ایام نبوت کے ابتداء میں انھیں حضرت زینبؓ کو طلاق دینے کے لیے بہت آمادہ کرنے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے ہمیشہ انکار کیا، رسول اللہ ﷺ نے ان کے اس تعلق خاطر کی تعریف فرمائی ہے، غزوۂ بدر کے موقع پر وہ کفار مکہ کے ساتھ گرفتار ہوگئے تھے، حضرت زینب نے زرفدیہ کے طور پر ان کی رہائی کے لیے وہ ہار بھیجا جو انھیں حضرت خدیجہ نے بوقت عقد دیا تھا، مگر مسلمانوں نے حضور ﷺ کے ایماء کے مطابق اسے واپس کردیا، حضرت ابوالعاص نے رہائی کے وقت رسول اللہ ﷺ سے وعدہ کرلیا تھا کہ وہ حضرت زینبؓ کو ہجرت کی اجازت دے دیں گے، چنانچہ وعدہ کے مطابق انھوں نے ہجرت کی اجازت دیدی اور حضرت زینبؓ ہجرت کرکے مدینہ طیبہ آگئیں اور حضرت ابوالعاص مشرکین مکہ کے ساتھ رہے، فتح مکہ سے کچھ پہلے انھوں نے شام کا تجارتی سفر کیا، اموال تجارت لے کر آرہے تھے، کہ راستہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت نے تمام سامان لے لیا، حضرت ابوالعاص بھاگ نکلے اور سیدھے مدینہ طیبہ پہنچے، اور حضرت زینب سے پناہ طلب کی، صبح فجر کی نماز کے بعد حضرت زینبؓ نے آواز بلند کہا "**ایها الناس !انی قد اجرت ابا العاص بن الربیع**" کہ اے لوگو! میں نے ابوالعاص بن الربیع کو پناہ دیدی ہے، چنانچہ ان کی پناہ کو قبول کیا گیا اور رسول اللہ ﷺ کی سفارش پر ان کے اموال واپس کئے گئے، ابوالعاص مال واسباب لے کر مکہ مکرمہ گئے، لوگوں تک ان کے اموال پہنچا کر مشرف بہ اسلام ہوگئے اور مدینہ طیبہ آکر قیام فرمالیا، ۱۲ھ میں وفات ہوئی۔

حضرت زینبؓ کا انتقال رسول اللہ ﷺ کی حیات طیبہ میں ۸ھ میں ہوگیا تھا، یہ امامہ انھیں کی صاحبزادی

ہیں، جو رسول اللہ ﷺ سے بہت مانوس تھیں اور رسول اللہ ﷺ نے ان کو کاندھے پر بٹھا کر نماز پڑھی ہے، صحیح طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس وقت حضرت امامہ کی کیا عمر تھی، نماز کی حالت میں ان کو کاندھے پر بٹھائے رکھنے کی بنیاد کوئی مجبوری تھی یا بیان جواز کے لیے ایسا کیا گیا تھا، لیکن جو بات روایت سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے ان کو نماز کی حالت میں کاندھے پر نہ صرف یہ کہ بٹھائے رکھا، بلکہ رکوع اور سجدے میں جاتے وقت ان کو اتار دیتے اور جب دوسری رکعت کے لیے کھڑے ہوتے تو پھر اٹھا لیتے، اس سے نماز میں عمل کثیر کی ممانعت والے اصول سے بظاہر تعارض معلوم ہوتا ہے، اس لیے شارحین حدیث نے اس روایت کے بارے میں متعدد باتیں ارشاد فرمائی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ کچھ حضرات نے اس عمل کو رسول اللہ ﷺ کی خصوصیت قرار دیا ہے، بعض حضرات نے اس کو منسوخ کہا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ نسخ یا خصوصیت کے دعوے کے لیے کسی دلیل کی ضرورت ہے اور وہ یہاں موجود نہیں، بعض حضرات نے اس طرح کے عمل کی نوافل کے بارے میں اجازت دی ہے، لیکن فریضہ میں اس کو ناجائز سمجھا ہے، مگر یہ تاویل بھی قابل قبول نہیں؛ کیونکہ ابوداؤد میں حضرت ابوقتادہ کی روایت میں یہ تصریح ہے کہ ہم لوگ عصر یا ظہر کی نماز میں حضور ﷺ کا انتظار کر رہے تھے، آپ حضرت امامہ کو کاندھے پر بٹھائے ہوئے تشریف لائے اور نماز پڑھائی۔

بعض حضرات نے یہ تاویل کی ہے کہ یہ عمل مجبوری کی صورت میں کیا گیا تھا، کیوں کہ امامہ رسول اللہ ﷺ سے بہت مانوس تھیں اور اس وقت ان کو سنبھالنے والا کوئی نہ تھا، بعض مالکیہ نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ ان کو کاندھے پر نہ بٹھاتے تو ان کے رونے کی بنیاد پر نماز میں، کاندھے پر بٹھانے سے زیادہ مشغولیت ہوتی، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر بچہ کو کوئی سنبھالنے والا نہ ہو تو اس کو گود میں یا کاندھے پر بٹھا کر نماز پڑھنے کی اجازت ہے، مگر یہ تاویل بھی ظاہر ہے کہ اسی وقت قابل قبول ہو سکتی ہے جب اس کے لیے کوئی دلیل یا کم از کم قرینہ ہو، محض احتمال کی بنیاد پر تاویل کا قبول کرنا اہل تحقیق کی شان کے خلاف ہے۔

اس لیے سب سے بہتر بات جو اکثر اہل علم کے نزدیک قابل قبول ہے یہ ہے کہ کاندھے پر بٹھانے اور اتارنے میں عمل کثیر کا تحقق ضروری نہیں ہے، کیوں کہ عمل کثیر کی جو تعریفیں کی گئی ہیں ان میں ایک تعریف یہ ہے کہ جس عمل میں دونوں ہاتھوں سے کام لینا پڑے، یا جس میں ایک رکن کے دوران پے در پے کام کرنا پڑے جسے عمل متوالی کہتے ہیں، اور کاندھے پر سے اتارنے یا بٹھانے میں نہ دونوں ہاتھوں کا استعمال ضروری ہے اور نہ ایک رکن میں ایک سے زائد بار ہاتھ کو کام میں لانا ضروری ہے، چنانچہ نووی نے لکھا ہے کہ یہ روایت شوافع اور ان کے ہم خیال فقہاء کی دلیل ہے، جو بچے، بچی یا کسی جوان کو اٹھائے ہوئے نماز ادا کرنے کے جواز کے قائل ہیں اور ایسا کرنا امام، مقتدی اور منفرد سب کے لئے جائز ہے۔ علامہ عینیؒ نے لکھا ہے کہ فقہ حنفی میں مسئلہ یہی ہے، کیوں کہ "بدائع" میں عمل کثیر کے بیان میں جو جزئیات مذکور ہیں، ان میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر بچہ کو گود میں لے کر یا کاندھے پر بٹھا کر نماز پڑھی جائے تو اس میں

فساد کی کوئی وجہ نہیں، پھر اسی حضرت ابوقتادہ کی روایت سے استدلال کیا گیا ہے، البتہ یہ لکھا ہے کہ اگر ماں بچے کو گود میں لے کر نماز پڑھے اور اسے دودھ بھی پلائے تو نماز فاسد ہو جائے گی، کیوں کہ دودھ پلانا عمل کثیر ہے، فقہ حنفی کی دوسری کتابوں میں بھی مسئلہ اسی طرح لکھا گیا ہے۔

رہا یہ کہ جو بچہ نمازی سے نماز میں آ کر لپٹ گیا ہے، اگر اس کے کپڑے ناپاک ہوں تو اس میں یہ وضاحت ہے کہ اگر نمازی کے کپڑے یا بدن پر اس ناپاکی کا اثر نہ آئے تو مضائقہ نہیں، مسئلہ یہ ہے کہ اگر نمازی کے سر پر نماز کے دوران کوئی پرندہ آ کر بیٹھ جائے اور اس کے پیروں میں گندگی لگی ہو اور نمازی کے اوپر اس کا کوئی اثر نہ پہنچے، تو اس میں کوئی خرابی نہیں، کیوں کہ حامل نجاست پرندہ ہے، نمازی نہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ روایت میں جو یہ مذکور ہے کہ جب آپ سجدہ میں جاتے تو وضعھا، امامہ کو اتار دیتے اور جب دوسری رکعت کے لیے اٹھتے تو ان کو پھر بٹھا لیتے، اس میں عمل کثیر نہیں، یا تو یہ کہا جائے کہ بچی چونکہ سمجھدار ہے، اس لیے جب آپ اس کو اترنے کا اشارہ کرتے ہیں اتر جاتی ہے، جب بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہیں بیٹھ جاتی ہے، اس لیے وضع اور حمل دراصل بچی کا کام ہے، مگر اس کو منسوب حضور پاک ﷺ کی طرف کر دیا گیا ہے، یا اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ آپ خود یہ کام کر رہے تھے، تو اس میں چونکہ عمل ایک ہی ہاتھ سے ہے، یا ایک رکن میں ایک ہی بار ہاتھ کا یا دونوں ہاتھوں کا استعمال ہے، اس لیے عمل کثیر نہیں اور ایسا کرنا بالکل درست ہے، لیکن حضرت علامہ کشمیری فرمایا کرتے تھے کہ یہ عمل بوقت ضرورت جائز تو ہے، مگر اس دور کے علماء کو احتیاط کرنی چاہئے، کیوں کہ جو چیزیں عام مسلمانوں کی نظر میں قابل اعتراض ہوں ان کو عام طور پر بلا ضرورت اختیار کر لینے سے الجھن پیدا ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

## [۱۰۷] بَابٌ اِذَا صَلّٰى اِلىٰ فِرَاشٍ فِيْهِ حَائِضٌ

(۵۱۷) حَدَّثَنَا عَمْرُوبْنُ زُرَارَةَ قَالَ نَا هُشَيْمٌ عَنِ الشَّيْبَانِيْ عَنْ عَبْدِاللهِ بْنِ شَدَّادِ بْنِ الْهَادِ قَالَ اَخْبَرَتْنِيْ خَالَتِيْ مَيْمُوْنَةُ بِنْتُ الْحَارِثِ قَالَتْ كَانَ فِرَاشِيْ حِيَالَ مُصَلَّى النَّبِيِّ ﷺ فَرُبَّمَا وَقَعَ ثَوْبُهٗ عَلَيَّ وَاَنَا عَلٰى فِرَاشِيْ. (گذشتہ: ۳۳۳)

(۵۱۸) حَدَّثَنَا اَبُو النُّعْمَانِ قَالَ نَا عَبْدُ الْوَاحِدِ بْنُ زِيَادٍ قَالَ نَا الشَّيْبَانِيُّ سُلَيْمَانُ قَالَ نَا عَبْدُ اللهِ بْنُ شَدَّادِ بْنُ الْهَادِ قَالَ سَمِعْتُ مَيْمُوْنَةَ تَقُوْلُ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْ وَاَنَا عَلٰى جَنْبِهٖ نَائِمَةٌ فَاِذَا سَجَدَ اَصَابَنِيْ ثَوْبُهٗ وَاَنَا حَائِضٌ. (گذشتہ: ۳۳۳)

**ترجمہ** باب، جب ایسے بستر پر نماز پڑھی جائے جس پر حائضہ لیٹی ہو تو یہ جائز ہے۔ ام المومنین حضرت میمونہؓ بنت الحارث سے روایت ہے کہ میرا بستر رسول اللہ ﷺ کے نماز پڑھنے کی جگہ کے برابر میں یا پہلو میں ہوتا، پھر

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ آپ کا کپڑا میرے بدن پر پڑ جاتا جب کہ میں اپنے بستر پر ہوتی تھی۔ حضرت میمونہؓ بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ اس طرح نماز پڑھتے تھے کہ میں آپ کے برابر میں سوئی ہوتی، پھر جب آپ سجدہ میں جاتے تو آپ کا کپڑا میرے جسم پر آ پڑتا جب کہ میں حیض کی حالت میں ہوتی تھی۔

**مقصد ترجمہ** پہلے باب سے اور زیادہ ترقی کر رہے ہیں کہ وہاں بچی کا معاملہ تھا اور پاکی، ناپاکی کا ذکر نہیں تھا، اس باب میں بالغ عورت کا معاملہ ہے اور بحالت حیض نمازی سے اس کے قرب کا مسئلہ ہے، بیان کرتے ہیں کہ اگر بالغہ اسی فرش پر لیٹی ہوئی ہو جس پر نمازی نماز پڑھ رہا ہے، تو عورت سامنے ہو یا برابر میں، حالت حیض ہو یا حالت طہر، نمازی کی نماز میں کوئی نقصان نہیں آئے گا، بلکہ روایت سے یہ معلوم ہوا کہ اگر نمازی کے کپڑوں کا اتصال بھی عورت سے ہو جائے تو اس میں بھی مضائقہ نہیں۔

امام بخاریؒ نے ترجمہ میں ''الی فراش فیه حائض'' کی بھی وضاحت کردی اور روایت بھی پیش کردی جس میں ''اصابنی ثوبه وانا حائضة'' کی تصریح ہے، ان چیزوں سے ابوداؤد وغیرہ میں مذکور حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کی تشریح بھی ہوگئی جس میں حائضہ کے مرور سے نماز کے قطع ہونے کا مضمون آیا ہے: ''یقطع الصلوة المراة الحائض والکلب'' (ابوداؤد ص:۱۰۲/ ج:۱) کہ حائضہ عورت اور کتے کا سامنے آنا نماز کو ختم کر دیتا ہے۔

امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب اور روایت سے معلوم ہو گیا کہ نماز کو ختم کر دینے کے معنی فساد صلوٰۃ نہیں اور عورت کے قریب ہونے میں ایسی کوئی بات نہیں ہے، جیسا کہ بعض حضرات نے سمجھا ہے کہ سامنے آئی اور نماز ختم ہوئی۔

**تشریح حدیث** ام المومنین حضرت میمونہؓ ارشاد فرماتی ہیں کہ میرا بچھونا، حضور پاک ﷺ کی نماز گاہ کے سامنے ہوتا تھا، پہلی روایت میں '' حیـــال'' کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں، مقابل اور سامنے، لیکن دوسری روایت میں اسی مضمون کو ادا کرنے کے لیے لفظ ''جنب'' آیا ہے جس کے معنی ہیں ''پہلو'' میں؛ اس لیے ''حیال'' کا مفہوم بھی بالکل مقابل اور سامنے ہونا ضروری نہیں، بلکہ اگر ترچھی ہو کر لیٹی ہیں اور کچھ حصہ سامنے ہے تو اس پر لفظ ''حیـال'' بھی منطبق ہے اور ''انا علی جنبه نائمة'' بھی صادق آ جائے گا، پھر فرماتی ہیں کہ میں اس قدر قریب ہوتی تھی کہ آپ کا کپڑا بھی میرے جسم سے نماز کی حالت میں مس کرتا تھا، معلوم ہوا کہ عورت حالت حیض میں ہو یا طہر میں، بالکل محاذات میں ہو یا برابر میں کسی بھی صورت، نمازی کی نماز کے لیے نقصان دہ نہیں ہے۔ واللہ اعلم

## [۱۰۸] بَابٌ هَلْ يَغْمِزُ الرَّجُلُ اِمْرَأَتَهُ عِنْدَ السُّجُوْدِ لِكَيْ يَسْجُدَ

(۵۱۹) حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَلِيٍّ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى قَالَ نَا عُبَيْدُ اللهِ قَالَ نَا الْقَاسِمُ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ بِئْسَمَا عَدَلْتُمُوْنَا بِالْكَلْبِ وَالْحِمَارِ لَقَدْ رَأَيْتُنِيْ وَرَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُصَلِّيْ وَاَنَا

مُضْطَجِعَةٌ بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْقِبْلَةِ فَإِذَا اَرَادَ اَنْ يَسْجُدَ غَمَزَ رِجْلَيَّ فَقَبَضْتُهُمَا. (گذشتہ:۳۸۲)

**ترجمہ** باب، کیا یہ جائز ہے کہ مرد اپنی بیوی کے پیروں کو (متنبہ کرنے کے لیے) ٹٹول کر دبائے تاکہ سجدہ کر سکے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ تم لوگوں نے بہت برا کیا کہ ہم (عورتوں) کو کتے اور گدھے کے برابر کر دیا، بے شک میں نے رسول اللہ ﷺ کو اس حالت میں نماز پڑھتے دیکھا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے اور قبلہ کے درمیان لیٹی رہتی، پھر جب سجدہ کرنا چاہتے تو میرے پاؤں کو ٹٹول کر دبا دیتے اور میں ان کو سمیٹ لیتی۔

**مقصد ترجمہ** تدریجی طور پر ارترتیب کے ساتھ ترقی کرتے جا رہے ہیں، پچھلے باب میں نمازی کا کپڑا عورت سے مس کر رہا تھا، اس باب میں ہے کہ اگر خود نمازی عورت کے بدن کو چھو دے تو اس میں بھی کوئی نقصان نہیں ہوتا۔

**تشریح حدیث** روایت کئی بار گذر چکی ہے، اور مقصد ترجمہ کا اس سے ثبوت بھی واضح ہے کہ حضرت عائشہ سامنے لیٹی رہتیں، روشنی کا انتظام نہیں تھا، رسول اللہ ﷺ سجدے میں جاتے تو ٹٹول کر پیروں کو چھو دیتے، حضرت عائشہ اپنے پیر سمیٹ لیتیں، تو آپ سجدے میں جاتے، نماز کی حالت میں رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پیر پر پڑا، شوافع اس غمز کو حیلولت کے ساتھ تسلیم کریں گے، لیکن امام بخاری مس مرأۃ کے مسئلہ میں شوافع کے ساتھ نہیں ہیں، وہ اس غمز کو حیلولت کے بغیر سمجھ رہے ہیں، جیسا کہ ظاہر ہے اور ان حضرات پر تعریض کر رہے ہیں، جنھوں نے عورت کے معاملہ میں تشدد سے کام لیا ہے، وہ اصحاب ظاہر ہوں، یا شوافع، کیوں کہ روایت میں بالکل صراحت کے ساتھ مذکور ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے پیروں کو ٹٹول کر دبا دیا، تاکہ حضرت عائشہ سجدہ کی جگہ خالی کر دیں اور آپ آسانی کے ساتھ سجدہ کر سکیں۔

## [۱۰۹] بَابُ الْمَرْأَةِ تَطْرَحُ عَنِ الْمُصَلِّيْ شَيْئاً مِّنْ الْاَذٰى

(۵۲۰) حَدَّثَنَا اَحْمَدُ بْنُ اِسْحَاقَ السَّرْمَارِيُّ قَالَ نَا عُبَيْدُاللهِ بْنُ مُوْسٰى قَالَ نَا اِسْرَائِيلُ عَنْ اَبِيْ اِسْحٰقَ عَنْ عَمْرِو بْنِ مَيْمُوْنٍ عَنْ عَبْدِاللهِ قَالَ بَيْنَمَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ قَائِمٌ يُصَلِّيْ عِنْدَالْكَعْبَةِ وَجَمْعُ قُرَيْشٍ فِيْ مَجَالِسِهِمْ اِذْ قَالَ قَائِلٌ مِنْهُمْ اَلَا تَنْظُرُوْنَ اِلٰى هٰذَا الْمُرَائِيْ اَيُّكُمْ يَقُوْمُ اِلٰى جَزُوْرِ اٰلِ فُلَانٍ فَيَعْمِدُ اِلٰى فَرْثِهَا وَدَمِهَا وَسَلَاهَا فَيَجِيْئُ بِهٖ ثُمَّ يُمْهِلُهٗ حَتّٰى اِذَا سَجَدَ وَضَعَهٗ بَيْنَ كَتِفَيْهِ فَانْبَعَثَ اَشْقَاهُمْ فَلَمَّا سَجَدَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ وَضَعَهٗ بَيْنَ كَتِفَيْهِ وَثَبَتَ النَّبِيُّ ﷺ سَاجِدًا فَضَحِكُوْا حَتّٰى مَالَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنَ الضَّحْكِ فَانْطَلَقَ مُنْطَلِقٌ اِلٰى فَاطِمَةَ وَهِيَ جُوَيْرِيَّةٌ فَاَقْبَلَتْ تَسْعٰى وَثَبَتَ النَّبِيُّ ﷺ سَاجِداً حَتّٰى

اَلْقَتْهُ عَنْهُ وَاَقْبَلَتْ عَلَيْهِمْ تَسُبُّهُمْ فَلَمَّا قَضٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الصَّلٰوةَ قَالَ اللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِقُرَيْشٍ ثُمَّ سَمّٰى اَللّٰهُمَّ عَلَيْكَ بِعَمْرِو بْنِ هِشَامٍ وَعُتْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ وَشَيْبَةَ بْنِ رَبِيْعَةَ وَالْوَلِيْدِ بْنِ عُتْبَةَ وَاُمَيَّةَ بْنِ خَلْفٍ وَعُقْبَةَ بْنِ اَبِيْ مُعَيْطٍ وَعُمَارَةَ بْنِ الْوَلِيْدِ قَالَ عَبْدُاللّٰهِ فَوَاللّٰهِ لَقَدْ رَاَيْتُهُمْ صَرْعٰى يَوْمَ بَدْرٍ ثُمَّ سُحِبُوْا اِلَى الْقَلِيْبِ قَلِيْبِ بَدْرٍ ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاُتْبِعَ اَصْحَابُ الْقَلِيْبِ لَعْنَةً ۔ (گذشتہ:۲۴۰)

**ترجمہ** باب، عورت کا نمازی کے بدن سے ناپاک چیزوں کو ہٹا کر پھینکنے کا بیان۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ کے پاس کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے اور کفار قریش کی ایک جماعت اپنی مجلسوں میں بیٹھی تھی کہ ان میں سے ایک کہنے والے نے یہ کہا کہ کیا تم اس ریا کار کو نہیں دیکھتے؟ کیا تم میں سے کوئی ایسا ہے جو فلاں کی اولاد کی ذبح کی ہوئی اونٹنی کے ارادے سے جائے اور اس کی لید، خون اور بچہ دانی کو اٹھا کر لے آئے، پھر ان صاحب کا انتظار کرے یہاں تک کہ جب وہ سجدہ میں جائیں تو ان چیزوں کو ان کے مونڈھوں کے بیچ میں رکھ دے، چنانچہ اس جماعت کا سب سے بدبخت انسان اس کام کے لیے اٹھ کھڑا ہوا اور جب رسول اللہ ﷺ سجدہ میں گئے تو اس نے یہ سب آپ کے دونوں شانوں کے درمیان رکھ دیا اور رسول اللہ ﷺ سجدہ ہی کی حالت میں ٹھہرے رہے اور کافر اس حالت پر بری طرح ہنستے رہے، یہاں تک کہ ہنسی کے سبب بعض بعض پر گرے جاتے تھے، اسی حالت میں کسی جانے والے نے جا کر حضرت فاطمہ کو اطلاع دی، حضرت فاطمہ اس وقت کم عمر بچی تھیں، پھر وہ دوڑتی ہوئی آئیں اور آپ اس وقت تک سجدہ ہی کی حالت میں تھے، یہاں تک کہ انھوں نے یہ چیزیں حضور ﷺ کے کاندھے سے گرادیں، پھر حضرت فاطمہ نے کفار کی طرف رخ کر کے انھیں برا بھلا کہا، پھر جب حضور ﷺ نماز سے فارغ ہو گئے تو آپ نے پروردگار سے عرض کیا کہ اے اللہ! قریش کو اپنی گرفت میں لے لے، اے اللہ! قریش کو اپنی گرفت میں لے لے، اے اللہ قریش کو اپنی گرفت میں لے لے۔ پھر آپ نے نامزد کر کے کہا، اے اللہ! عمرو بن ہشام (ابوجہل)، عتبہ بن ربیعہ، شیبہ بن ربیعہ، ولید بن عتبہ، امیہ بن خلف، عقبہ بن ابی معیط اور عمارہ بن الولید کو اپنی گرفت میں لے لے، حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ بخدا! میں نے ان نامزد تمام لوگوں کو غزوۂ بدر والے دن مردہ حالت میں پڑے دیکھا، پھر ان کی لاشوں کو کھینچ کر بدر کے کنوئیں میں ڈال دیا گیا، پھر حضور ﷺ نے ان لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ جو لوگ بدر کے کنویں میں ڈالے گئے ہیں ان پر اللہ کی طرف سے لعنت مسلط کر دی گئی۔

**مقصد ترجمہ** ایک قدم اور بڑھایا ہے کہ صرف ہاتھ سے چھو دینا ہی نہیں بلکہ اگر عورت کو مرد کے اوپر سے کوئی بھاری چیز ہٹانے کی نوبت آئے، تو عورت مرد کے کسی بھی جانب آسکتی ہے اور اگر وزن بہت زیادہ ہے تو دور رہ کر ہٹانا ممکن نہ ہوگا، بلکہ ممکن ہے کہ بدن کو بدن سے ملا کر طاقت صرف کرنے کی ضرورت ہو، امام بخاری اشارہ

کرتے ہیں کہ ضرورت ہو تو اس میں بھی مضائقہ نہیں ہے، ابن بطال شارح بخاری فرماتے ہیں کہ یہ ترجمۃ الباب، پچھلے تراجم سے قریب ہی ہے اس لیے کہ عورت، نمازی کی کمر سے کوئی چیز ہٹائے گی تو جس جانب سے ہٹانے میں آسانی ہوگی عورت کو اس طرف جانا ہوگا، اس لیے نمازی کی کمر سے بوجھ ہٹانے کا مضمون سامنے گزرنے کے مضمون سے اگر زیادہ اہم نہیں ہے، تو اس سے کم بھی نہیں ہے۔

**ابواب سترہ سے ربط** مساجد کے ابواب سے فراغت کے بعد امام بخاری نے سترہ کے ابواب منعقد کئے ہیں اور ان میں متعدد مضامین کے ساتھ "باب التطوع خلف المرأۃ" میں یہ بیان کیا کہ عورت نماز میں سترہ کی جگہ سامنے ہو تو اس میں مضائقہ نہیں، پھر اس کے بعد چند ابواب کا مضمون بظاہر سترہ کے عنوان سے مربوط نہیں ہے، لیکن غور کیا جائے تو بات واضح ہے، عورت سے متعلق چند ابواب منعقد کر کے بخاری ایک طرف تو عورت کے معاملہ میں تشدد کی راہ اختیار کرنے والوں پر تعریض کر رہے ہیں اور دوسری طرف یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ جب عورت کا سامنے سے گذرنا نقصان دہ نہیں، جب اس کو چھونے میں مضائقہ نہیں اور جب اتصالِ جسمانی سے بھی نماز ختم نہیں ہوتی، تو سترہ بنانے میں بدرجۂ اولیٰ کوئی نقصان نہیں ہونا چاہئے۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** روایت گذر چکی ہے، خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ خانہ کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے، کہ منصوبہ کے تحت کفار قریش نے اونٹنی کی بھاری بچہ دانی لاکر مع خون و دیگر آلائشوں کے پشت مبارک پر ڈالدی اور مذاق بنانا شروع کیا، ہنس رہے ہیں، اچھل رہے ہیں، ایک دوسرے کو الزام دے رہے ہیں، لوٹ پوٹ ہو کر ایک دوسرے پر گرے جا رہے ہیں، اسی دوران کسی نے حضرت فاطمہ کو اطلاع دی، حضرت فاطمہ بچی تھیں دوڑ کر آئیں اور طاقت صرف کر کے پشت مبارک سے اس بھاری گندگی کو ہٹایا، امام بخاری کا ترجمۃ الباب یہیں سے ثابت ہے، کیوں کہ اتنا بھاری بوجھ دور سے نہیں ہٹایا جا سکتا، انھیں قریب آ کر اور جسم کو جسم سے متصل کر کے، طاقت صرف کرنے کے بعد ہٹا دینا ممکن ہوا ہوگا، نماز سے فراغت کے بعد آپ نے بددعا دی، پہلے مجمل، پھر نام بہ نام، اس کا اثر یہ ہوا کہ کافروں کے چھکے چھوٹ گئے اور انھیں یقین ہو گیا کہ اب ان کی موت آ گئی ہے، چنانچہ راوی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اس دن جن بدبختوں کو نامزد کیا تھا، وہ سب غزوہ بدر والے دن واصل جہنم ہوئے اور ان کی لاشوں کو کھینچ کر بدر کے کنویں میں ڈال دیا گیا۔ واللہ اعلم

❁❁❁❁❁

بسم اللہ الرحمن الرحیم

# [۹] ﴿کتابُ مواقیتِ الصلٰوۃِ﴾

## [۱] بَابُ مَوَاقِيتِ الصَّلٰوةِ وَفَضْلِهَا

وَقَوْلِهٖ تَعَالٰى اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتَاباً مَّوْقُوْتًا (النساء:۱۰۳) وَقَّتَهُ عَلَيْهِمْ.

(۵۲۱) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ قَالَ قَرَأْتُ عَلٰى مَالِكٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ اَنَّ عُمَرَ بْنَ عَبْدِ الْعَزِيْزِ اَخَّرَ الصَّلٰوةَ يَوْماً فَدَخَلَ عَلَيْهِ عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ فَاَخْبَرَهٗ اَنَّ الْمُغِيْرَةَ بْنَ شُعْبَةَ اَخَّرَ الصَّلٰوةَ يَوْماً وَهُوَ بِالْعِرَاقِ فَدَخَلَ عَلَيْهِ اَبُوْ مَسْعُوْدٍ الْاَنْصَارِيُّ فَقَالَ مَا هٰذَا يَامُغِيْرَةُ اَلَيْسَ قَدْ عَلِمْتَ اَنَّ جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ نَزَلَ فَصَلّٰى فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثُمَّ صَلّٰى فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثُمَّ صَلّٰى فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثُمَّ صَلّٰى فَصَلّٰى رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثُمَّ صَلّٰى، فَصَلّٰى رسولُ اللهِ ﷺ ثُمَّ قَالَ بِهٰذَا اُمِرْتُ فَقَالَ عُمَرُ لِعُرْوَةَ اِعْلَمْ مَا تُحَدِّثُ بِهٖ اَوَ اِنَّ جِبْرِئِيلَ هُوَ اَقَامَ لِرَسُوْلِ اللهِ ﷺ وَقْتَ الصَّلٰوةِ قَالَ عُرْوَةُ كَذٰلِكَ كَانَ بَشِيْرُ بْنُ اَبِيْ مَسْعُوْدٍ يُحَدِّثُ عَنْ اَبِيْهِ. (آئندہ:۳۲۲۱، ۴۰۰۷)

(۵۲۲) قَالَ عُرْوَةُ وَلَقَدْ حَدَّثَتْنِيْ عَائِشَةُ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ كَانَ يُصَلِّي الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ فِيْ حُجْرَتِهَا قَبْلَ اَنْ تَظْهَرَ. (آئندہ:۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۳۱۰۳)

**ترجمہ** اوقات صلوۃ کا بیان۔ باب، نماز کے اوقات اوران کی فضیلت کا بیان اور باری تعالیٰ کے اس ارشاد کی تفسیر کہ بے شک نماز اہل ایمان کے ذمہ ایسا فریضہ ہے کہ جو پابندی وقت کے ساتھ مقرر کیا گیا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے اس کا وقت مقرر فرما دیا ہے۔ حضرت ابن شہاب زہریؒ سے روایت ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے نماز میں ایک دن تاخیر کردی تو حضرت عروہ بن الزبیر ان کی خدمت میں پہنچے اور ان سے یہ فرمایا کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ نے عراق میں قیام کے دوران ایک دن نماز میں دیر کردی تو حضرت ابو مسعود انصاری ان کی خدمت میں پہنچے، ان سے کہا کہ مغیرہ! یہ کیا صورت حال ہے؟ کیا تمھیں معلوم نہیں کہ جبرئیل علیہ السلام (آسمان) سے نازل ہوئے اور انھوں نے نماز پڑھائی تو رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی، پھر (دوسری) نماز پڑھائی تو رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی، پھر (تیسری) نماز پڑھائی تو رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی، پھر (چوتھی) نماز پڑھائی تو رسو اللہ ﷺ نے نماز پڑھی، پھر

پانچویں) نماز پڑھائی تو رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی، پھر حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے ایسا ہی حکم ہوا ہے۔اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز نے عروہ سے کہا کہ جس چیز کو تم بیان کررہے ہو اس کو تحقیق کے بعد اور سوچ سمجھ کر بیان کیا کرو، کیا حضرت جبرئیل ہی وہ ذات ہیں جنھوں نے رسول اللہ ﷺ کے لیے نماز کا وقت مقرر کیا تھا؟ عروہ نے جواب دیا کہ بشیر بن ابی مسعود تو اپنے والد حضرت ابو مسعود انصاریؓ سے اسی طرح بیان کرتے تھے۔عروہ نے بیان کیا کہ مجھ سے حضرت عائشہؓ نے روایت بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے، کہ دھوپ ان کے حجرے میں ہوتی اوپر نہ چڑھتی تھی۔

**مقصد ترجمہ** استقبال قبلہ کے ابواب کے بعد سترہ کے ابواب ذکر کئے تھے، استقبال قبلہ نماز کی ایک شرط ہے، اب اس سے فراغت کے بعد نماز کی دوسری شرط یعنی اوقات صلوۃ کا بیان کیا جارہا ہے۔ بخاری شریف کے نسخوں میں اس موقعہ پر اختلاف ہے، کسی میں بسم اللہ الرحمان الرحیم ہے کسی میں نہیں ہے، کسی میں "کتاب مواقیت الصلوۃ وفضلھا " ہے، اس کے بعد "باب مواقیت الصلوۃ" ہے، کسی میں کسی اور طرح ہے، ہمارے ہندوستانی نسخوں میں جو مستملی کی روایت کے مطابق ہیں "کتاب مواقیت الصلوۃ" اور اس کے بعد "باب مواقیت الصلوۃ وفضلھا" ہے۔ مصنفین کی عادت ہے کہ وہ پہلے کتاب ذکر کرتے ہیں، پھر اس کے تحت فصل اور باب وغیرہ لاتے ہیں، اس لیے کتاب مواقیت الصلوۃ کا مطلب یہ ہوا کہ یہاں سے اوقات صلوۃ سے متعلق ابواب ذکر کئے جائیں گے۔

اس کے بعد کتاب کے تحت جو پہلا باب دیا گیا ہے اس کا عنوان ہے "باب مواقیت الصلوۃ وفضلھا " فضلھا کی ضمیر مواقیت کی طرف بھی راجع ہوسکتی ہے، اور صلوۃ کی طرف بھی، پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ نماز کے اوقات اور ان کی فضیلت کا بیان، اور دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ نماز کے اوقات اور نماز کی فضیلت کا بیان، یہ دونوں معنی ہوسکتے ہیں، مگر فضلھا کی ضمیر کا مواقیت کی طرف راجع کرنا زیادہ بہتر معلوم ہوتا ہے اور اس کے مطابق امام بخاری کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نماز کے سلسلہ میں اوقات کی فرضیت اور اہمیت بیان کرنا چاہتے ہیں۔

اس عنوان کے بعد امام بخاری نے ایک آیت ذکر کی ہے: "وقولہ ان الصلوۃ کانت علی المومنین کتاباً موقوتاً" باری تعالیٰ نے مومنین کے ذمہ، پابندیٔ وقت کے ساتھ نماز فرض کی ہے "موقوتاً" کا ترجمہ امام بخاری نے کیا ہے: "وقتہ علیھم" جس کا مفہوم یہ ہے کہ پروردگار نے اوقات پر تقسیم کرکے اور پابندیٔ وقت کو لازم قرار دیتے ہوئے نماز فرض کی ہے، اس آیت سے دونوں باتیں معلوم ہوئیں کہ نماز بھی فرض ہے اور اوقات کی رعایت بھی فرض ہے۔

آیت پاک سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نماز کا معاملہ نہایت اہم ہے، جب اس کو فرض کیا گیا تو اس کی یہ صورت تجویز نہیں کی گئی کہ دن رات میں جب چاہیں عدد مفروض کو پورا کرلیا کریں، یا تمام نمازوں کو ایک ہی وقت میں پڑھ لیا کریں، یا فرصت کے مطابق اس کو نمازی کی رائے پر چھوڑ دیں وغیرہ، بلکہ پروردگار نے نمازوں کو اس طرح فرض کیا ہے

کہ اپنی طرف سے اوقات مقرر کردیئے ہیں اور نمازی کو اس کا پابند بنایا ہے، کہ وہ مقررہ اوقات ہی کے اندر ادائیگی کا مکلف ہے، خدا تعالی کی طرف سے ان اوقات کا تعین اس بات کی بھی دلیل ہے کہ یہ اوقات دوسرے تمام اوقات سے افضل واعلی تھے، کیونکہ نماز جیسی فضیلت والی عبادت کے لیے ان اوقات کا انتخاب فضیلت ہی کی بنیاد پر کیا گیا ہے، اس طرح آیات قرآنی سے اوقات صلوۃ کی فرضیت واہمیت اور ان کی فضیلت دونوں ہی باتیں ثابت ہوگئیں۔

**تشریح حدیث** حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز جب ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں مدینہ طیبہ کے امیر تھے، اور اس وقت تک خلیفہ نہیں بنائے گئے تھے، اس زمانہ میں ایک بار ایسا اتفاق ہوا کہ ان سے عصر کی نماز میں معمول سے زیادہ تاخیر ہوگئی تو عروہ بن زبیر نے، عمر بن عبدالعزیز کے اس عمل پر انکار کیا کہ دیکھئے ایک بار حضرت مغیرہ بن شعبہ نے جو حضرت معاویہؓ کی جانب سے عراق کے امیر تھے، نماز میں تاخیر کردی تھی، تو فوراً حضرت ابومسعود انصاریؓ ان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا "ماھذا یامغیرۃ ؟" کہ مغیرہ یہ کیا عمل ہے؟ یعنی یہ نماز عبادت ہے یا کچھ اور چیز ہے، اگر یہ عبادت کا عمل ہوتا تو اس کے لیے خدا نے جو وقت مقرر فرمایا ہے اس میں ہونا چاہئے تھا، کیوں کہ اس میں انسان کو تقدیم و تاخیر کا اختیار نہیں ہے، پھر فرمایا کہ "الیس قد علمت الخ" کیا تم کو یہ معلوم نہیں کہ خدا تعالی نے نمازوں کے لیے اوقات کی تحدید وتعیین کی غرض سے جبرئیل علیہ السلام کو پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی خدمت میں بھیجا اور حضرت جبرئیل کے ذریعہ اوقات نماز کی ابتداء وانتہاء بیان کرائی گئی، یعنی خدا کے نزدیک اوقات صلوۃ کے بیان کا اس قدر اہتمام ہے کہ اس کام کے لیے حضرت جبرئیل کو بھیجا گیا، پھر یہ کہ دیگر احکام کے اندازِ بیان یعنی قولی طور پر تعلیم دینے پر اکتفاء نہیں کیا گیا، بلکہ حضرت جبرئیل کو عملی طور پر اس کی ابتداء وانتہاء کی تعیین وتحدید پر مامور فرمایا گیا، جبرئیل آئے اور انھوں نے نماز پڑھائی اور اس چیز کو اتنی اہمیت دی گئی کہ جبرئیل آئے اور دن میں پانچ مرتبہ الگ الگ عمل کرکے تعلیم دیتے رہے۔

روایت باب میں ہر دو نمازوں کے درمیان "ثم صلّٰی فصلی رسو ل اللہ ﷺ" آرہا ہے، ثم تراخی مع الفصل کے لیے آتا ہے، اس لیے مطلب یہ ہوگا کہ تمام نمازوں کو ایک وقت میں نہیں پڑھا گیا، اور نہ دو دو کو جمع کیا گیا، بلکہ دن رات میں پانچ مرتبہ نزول ہے اور ہر نماز کو الگ وقت میں پڑھا گیا ہے، روایت میں اگرچہ تفصیل کے ساتھ اوقات کی تعیین نہیں ہے، لیکن اجمال سے ہر نماز کا الگ اور مستقل وقت میں پڑھنا بالکل واضح ہے، حضرت ابومسعود انصاری جو حضرت مغیرہ کے عمل پر انکار فرمارہے ہیں، اس کے لیے اتنا کافی ہے کہ اوقات کا احترام کرایا گیا تھا جو تمہارے عمل میں موجود نہیں ہے۔

فصلی رسو ل اللہ الخ "فاء" تعقیب مع الوصل کے لیے آتی ہے، اس لیے مفہوم یہ ہوگا کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نماز میں شامل ہوئے، یہ مطلب نہیں کہ پہلے حضرت جبرئیل نے نماز ادا کرکے دکھلائی اور اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھی، کیوں کہ بعض روایات میں صراحت ہے کہ حضرت جبرئیل نے امامت کی اور رسول اللہ ﷺ نے ان

کی اقتداء میں نماز ادا کی، نیز اس موقع پر حضور پاک ﷺ کا جبرئیل کی اقتداء میں نماز پڑھنا، حنفیہ کے اس اصول سے بھی متعارض نہیں ہے کہ فرض پڑھنے والے کی نماز، نفل پڑھنے والے کے پیچھے درست نہیں، کیوں کہ اس موقع پر حضرت جبرئیل کو نماز پڑھانے کے لیے مامور کر کے بھیجا گیا ہے، اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جبرئیل مکلّف نہیں ہیں۔

بہر حال روایت میں جبرئیل کی آمد کو کلمۂ "ثم" سے ذکر کیا گیا ہے اور پیغمبر علیہ السلام کے عمل کو بیان کرنے کے لیے "فاء" استعمال کی گئی ہے، اس لیے مفہوم یہ نکلتا ہے کہ جبرئیل کی آمد اور نماز میں فاصلہ ہے اور ہر نماز کے لیے مستقل نزول ہوا ہے اور پیغمبر علیہ السلام نے جبرئیل کے ساتھ شریک ہو کر نماز ادا کی ہے۔

روایت باب میں اس بات کا تذکرہ نہیں ہے، کہ حضرت جبرئیل کی یہ آمد دو دن ہوئی ہے، کیوں کہ حضرت جبرئیل کی آمد کی تفصیلات اور اوقات صلوۃ کی تفصیل کے ساتھ تحدید، اس وقت راوی کے پیش نظر نہیں ہے، راوی کا مقصد یہاں صرف اس قدر ہے کہ اوقات صلوۃ کی اتنی اہمیت ہے کہ اس کی تعیین کے لیے جبرئیل امین کو بار بار بھیجا گیا ہے۔

"ثم قال بھذا امرت" لفظ "امرت" کو بصیغہ متکلم اور بصیغہ خطاب دونوں طرح پڑھا گیا ہے، اور دونوں صورتوں میں مجہول ہے، متکلم کا ترجمہ یہ ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے نماز کی عملی تعلیم کے بعد فرمایا کہ مجھے پروردگار نے اس طرح عمل کرنے کا حکم دیا تھا، یعنی میرا عمل یہ خدا کے حکم کے تحت ہے، اس ترجمہ کے مطابق حضرت جبرئیل کو غیر مکلّف کہنا صحیح نہ ہوگا، بلکہ مفہوم یہ ہوگا کہ میں نے حکم خداوندی کی تعمیل میں ایسا کیا ہے اور مکلّف اسی کو کہتے ہیں جو خدا کی طرف سے مامور ہو۔ اور بصیغہ خطاب پڑھیں تو ترجمہ یہ ہوگا کہ نماز پڑھانے کے بعد حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے کہ اس طرح نماز ادا کریں۔

"فقال عمر لعروۃ اعلم ماتحدث الخ" جب حضرت عروہ بن زبیر نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے تاخیر صلوۃ کے عمل پر انکار کیا اور امامت جبرئیل والی روایت کے اجمال سے اوقات کی اہمیت ثابت کی تو حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا کہ عروہ! ذرا سوچ کر اور سمجھ کر بیان کرو، یعنی جو بیان کرنا چاہتے ہو کہ حضرت جبرئیل تحدید اوقات اور تعیین اوقات کے لیے مامور ہوئے تھے، یہ بڑی ذمہ داری کی بات ہے، کیا تمہارے پاس اس کی کوئی سند ہے؟ شارحین نے حضرت عمر بن عبد العزیز کے اس قول کے مختلف مطلب سمجھے ہیں، یہ مطلب بھی سمجھا گیا ہے کہ حضرت عمرؒ کے پاس امامت جبرئیل والی روایت نہیں تھی، ہو سکتا ہے کہ روایت ان تک پہنچی ہی نہ ہو، یا ہو سکتا ہے کہ روایت پہنچنے کے بعد بھول گئے ہوں، اس لیے وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جب حدیث بیان کر رہے ہو تو اس کی سند بھی بیان کرو، گویا انکار کا حاصل یہ ہوا کہ اتنا بڑا دعوی اور بے سند؟ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ عروہ! تم نے اپنی بات پر غور بھی کیا؟ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کو عملی تعلیم کی ضرورت تھی؟ تصویریں تو بچوں کو دکھائی جاتی ہیں، پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام تو تمام مخلوق میں سب سے زیادہ فہم و عقل رکھنے والے تھے، یا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جبرئیل علیہ السلام تو مفضول تھے اور پیغمبر علیہ السلام افضل، عروہ! تم

یہ کیا کہہ رہے ہو کہ جبرئیل امین نے امامت کی، گویا اشکال کی وضاحت کسی طرح بھی کی جائے بنیادیہی معلوم ہوتی ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز کو امامت جبرئیل والی روایت معلوم نہیں تھی، اور انھوں نے تنبیہ کے طور پر یا حیرت کے ساتھ ع سے کہا کہ آپ اس کی سند بھی بیان کریں، چنانچہ حضرت عروہ نے سند بیان کردی اور سند بیان کرنے کے بعد مزید فر "لقد حدثتني عائشة" گویا تحدید اوقات کے سلسلے میں امامت جبرئیل کی روایت سے اہمیت ثابت کرنے کے بعد ا خصوصیت کے ساتھ عصر کی نماز کی اہمیت بیان کرتے ہیں، کیوں کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز سے عصر ہی کی نماز میں تاخ ہوئی تھی، فرماتے ہیں کہ مجھ سے حضرت عائشہؓ نے بیان کیا کہ نبی کریم ﷺ عصر کی نماز سے ایسے وقت میں فارغ جایا کرتے تھے کہ دھوپ حجرہ سے نکل کر دیوار پر نہ چڑھنے پاتی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ عصر کی نماز میں چونکہ وقت مکر بھی شامل ہے اور تاخیر میں وقت مکروہ کے داخل ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، اس لیے عصر کی نماز میں خصوصیت کے ساتھ ا کا بہت لحاظ رہتا تھا کہ وقت مکروہ داخل نہ ہونے پائے۔

حضرت عائشہؓ کی اس روایت سے جس میں عصر کی نماز کے وقت سورج کی دھوپ کا کمرے میں ہونا معلو ہوتا ہے، وقت مکروہ سے احتیاط کرنے کی حد تک تو استدلال بالکل درست ہے، لیکن چونکہ مکان اور موسم کے تبدیل ہو۔ سے دھوپ کی حالت تبدیل ہوتی رہتی ہے، مثلاً مکان کی دیواریں نیچی اور اس کا دروازہ مغرب کی طرف ہو اور موسم گرم ہ تو دھوپ آخر تک کمرے میں رہے گی، اس لیے روایت سے کسی خاص وقت کی تعیین کے لیے استدلال تام نہیں ہے۔

## [۲] بَابُ قَوْلِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ. (روم:۳۱)

(۵۲۳) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ بْنُ سَعِيْدٍ قَالَ نَا عَبَّادٌ وَهُوَ ابْنُ عَبَّادٍ عَنْ اَبِىْ جَمْرَةَ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ قَدِمَ وَفْدُ عَبْدِ الْقَيْسِ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالُوْا اِنَّا هٰذَا الْحَىُّ مِنْ رَبِيْعَةَ وَلَسْنَا نَصِلُ اِلَيْكَ اِلَّا فِى الشَّهْرِ الْحَرَامِ فَمُرْنَا بِشَىْءٍ نَاخُذُهُ عَنْكَ وَنَدْعُوْا اِلَيْهِ مَنْ وَرَآءَ نَا فَقَالَ آمُرُكُمْ بِاَرْبَعٍ وَاَنْهَاكُمْ عَنْ اَرْبَعٍ اَلْاِيْمَانُ بِاللّٰهِ ثُمَّ فَسَّرَهَا لَهُمْ شَهَادَةُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاِقَامُ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءُ الزَّكَاةِ وَاَنْ تُؤَدُّوْا اِلَىَّ خُمُسَ مَاغَنِمْتُمْ وَاَنْهَاكُمْ عَنِ الدُّبَّاءِ وَالْحَنْتَمِ وَالْمُقَيَّرِ وَالنَّقِيْرِ. (گذشتہ:۵۳)

**ترجمہ** | باب، اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا بیان (جو مسلمانوں کے لیے ہے) کہ اسی اللہ کی طرف رجوع ہو اور اس سے ڈرتے رہو اور نماز کی پابندی رکھو اور مشرکین میں سے مت بنو۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ قبیلہ

عبدالقیس کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان لوگوں نے عرض کیا کہ ہم لوگ قبیلہ ربیعہ کی شاخ ہیں اور ہم آپ کی خدمت میں صرف حرمت والے مہینوں میں پہنچ سکتے ہیں، اس لیے آپ ہمیں کوئی ایسی اہم بات بتلا دیں جس کو ہم بھی اپنا معمول بنالیں اور جو لوگ ہمارے پیچھے (وطن میں) رہ گئے ہیں، ان کو بھی اس کی دعوت دیں، آپ نے ارشاد فرمایا کہ میں تم کو چار باتوں کا حکم دیتا ہوں اور چار باتوں سے منع کرتا ہوں۔ جن باتوں کا حکم دیتا ہوں وہ اللہ پر ایمان لانے سے متعلق ہیں، پھر آپ ﷺ نے ان لوگون کے سامنے ان کی وضاحت کی کہ اس بات کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں اور نمازوں کو قائم رکھنا اور زکوۃ ادا کرنا اور حاصل کردہ مال غنیمت میں سے پانچواں حصہ میرے پاس داخل کرنا۔ اور میں تم کو منع کرتا ہوں کدو کے تونبے سے، لاکھ کے سبز مرتبان سے، روغنی برتن سے اور لکڑی کے کرید کر بنائے ہوئے برتن سے (کہ ان برتنوں میں شراب بنانے کا رواج تھا)۔

**مقصد ترجمہ** مقصد ہے کہ نماز کی اہمیت اور اوقات نماز کی اہمیت کا بیان، کیوں کہ نماز اسلام کا شعار اور کفر اور اسلام کے درمیان حد فاصل ہے، اس لیے امام بخاری نے ترجمہ میں آیت پیش کردی، امام بخاری نے آیت کا جز ذکر کیا ہے، وہ ذوالحال مقدر کا حال ہے اور حالت نصب میں ہے، یہ آیت سورۂ روم میں ہے، پوری آیت یہ ہے: "فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفاً، فِطْرَتَ اللهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللهِ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ مُنِيْبِيْنَ اِلَيْهِ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" (سورۃ الروم آیت ۳۱)

سوتم یکسو ہو کر دین حق کی طرف اپنا رخ قائم رکھو، اللہ کی بنائی ہوئی اس فطرت کا اتباع کرو جس پر اس نے انسانوں کو پیدا کیا ہے، اللہ کی پیدا کردہ فطرت میں کوئی تبدیلی نہیں، یہ اللہ کا سیدھا دین ہے، لیکن اکثر لوگ نہیں سمجھتے، دین حق کی طرف اس حال میں رخ رکھو کہ اسی کی طرف رجوع کرنے والے رہو اور اس سے ڈرتے رہو اور نمازوں کو قائم رکھو اور مشرکین میں سے مت بنو۔

"منیبین الیہ" حال ہے کہ خدا کی طرف سے رجوع کرنے والے بنو اور خدا سے ڈرو، نماز کو قائم کرو، مشرک نہ بنو، گویا یہاں دو چیزوں کا امر ہوا، ایک انابت الی اللہ یعنی اللہ کی طرف رجوع کرنے کا اور دوسرے اتقاء یعنی اللہ سے ڈرنے کا، ان دونوں باتوں کی تفسیر بھی لف ونشر مرتب کے طور پر یہ ہوئی کہ انابت الی اللہ کا طریقہ تو بتلایا نمازوں کو قائم رکھنا اور تقوی کا طریقہ یہ بیان کیا کہ نماز کو چھوڑ کر مشرکین والا کام نہ کرنا، مطلب یہ ہوا کہ نمازوں کو قائم رکھنا انابت الی اللہ کی صورت ہے یعنی ہر نماز کو شرائط وآداب کے ساتھ اس کے وقت مقررہ میں ادا کرنے کا اہتمام کرو، اس سے نماز کی بھی اہمیت معلوم ہوگئی اور اوقات نماز کی بھی، پھر آگے دوسرا حکم دیا کہ اللہ سے ڈرتے رہو اس کی تفسیر کی گئی کہ مشرکین جیسا کام نہ کرو، مسلمان کی شان یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمہ وقت اللہ سے ڈرتا رہتا ہے اور مشرک اس کے بالکل برخلاف ہوتا ہے، اس لیے نماز چھوڑ کر اپنے اندر مشرکین جیسی حالت پیدا نہ ہونے دو، کیونکہ حدیث میں آتا ہے کہ بندے اور کفر کے درمیان

حد فاصل نماز ہے یعنی نماز بندے کو کفر تک یا کفر کو بندے تک پہنچنے سے روکتی ہے، اگر نماز کو چھوڑ دیا جائے تو بندے کے کفر تک پہنچنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے، اس دوسری بات سے بھی نماز اور اوقات نماز دونوں ہی کی اہمیت معلوم ہو گئی اور یہی امام بخاری کا مقصد ہے۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** وفد عبد القیس والی روایت پیش کی ہے، یہ روایت کتاب الایمان میں گذر چکی ہے اور وہاں تفصیلات کا بیان ہو چکا ہے، یہاں امام بخاری کا مقصد یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اس وفد کو اللہ پر ایمان لانے کا حکم دیا اور ایمان کی تشریح میں آپ نے اولیت کے ساتھ نماز کا ذکر کیا، گویا ایمانیات میں نماز کو اولیت کا مقام حاصل ہے۔

مقصد ترجمہ کے مطابق تشریح اس طرح کی جائے گی کہ اگر انابت الی اللہ کے حکم کی تعمیل چاہتے ہو تو اس کی صورت یہ ہے کہ ایمان قبول کرنے کے بعد نماز کا حکم ہے، اس لیے مومن کے لیے نماز کا پڑھنا ضروری ہے، اور یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو پورے شرائط و آداب اور اوقات کی رعایت کے ساتھ پڑھے، اگر نماز نہیں پڑھے گا تو ترجمہ میں آیا تھا "ولا تکونوا من المشرکین" کہ وہ دائرہ توحید سے نکل کر دائرہ شرک میں داخل ہو جائے گا، یہ ایسا ہی ہے جیسے حج کی استطاعت رکھنے والا حج نہ کرے تو اس کے لیے روایتوں میں یہ وعید آئی ہے: "فلا علیہ ان یموت یھودیا او نصرانیا" (مشکوۃ ص:۲۲۲/ج:۱) یعنی اس کی کوئی پوچھ نہیں ہے کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔

بہر حال ترجمۃ الباب میں پیش کردہ آیت اور اس کے ذیل میں پیش کردہ روایت سے نماز اور اس کے اوقات دونوں کی اہمیت و عظمت معلوم ہو گئی۔ واللہ اعلم

## [۳] بابُ الْبَيْعَةِ عَلٰى اِقَامِ الصَّلٰوةِ

(۵۲۴) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْمُثَنّٰى قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى قَالَ حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ قَالَ حَدَّثَنَا قَيْسٌ عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ بَايَعْتُ النَّبِيَّ ﷺ عَلٰى اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَاءِ الزَّكٰوةِ وَالنُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ. (گذشتہ:۵۷)

**ترجمہ** باب، نمازوں کے قائم رکھنے پر بیعت لینے کا بیان، حضرت جریر بن عبد اللہ بجلیؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے نمازوں کے قائم رکھنے، زکوۃ کے ادا کرنے اور ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی کرنے پر بیعت کی۔

**مقصد ترجمہ** عنوان بدل کر نماز اور اوقات نماز کی اہمیت بیان کر رہے ہیں، پچھلے دو باب کا حاصل یہ ہے کہ نماز اور اس کے اوقات کا معاملہ اس قدر اہم ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھیج کر وقت کی تعیین کرائی گئی، پھر

اہمیت کے پیش نظر قرآن کریم میں صلوا نہیں بلکہ اقیموا الصلوٰۃ فرمایا گیا تاکہ تمام شرائط وآداب کی رعایت کے ساتھ نماز کی ادائیگی کا حکم دیا جائے، اب اس باب میں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ نماز اس قدر اہم اور ضروری عبادت ہے کہ اسلام پر بیعت لینے کے بعد، خصوصیت کے ساتھ نماز کی باقاعدہ ادائیگی کے لیے بیعت لی گئی، اس سے اہمیت واضح ہوگئی کیونکہ بیعت میں ہاتھ میں ہاتھ دیا جاتا ہے، عرب میں ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیع وشراء کے موقع پر معاملہ کو پختہ کیا جاتا تھا، اس لیے ہر مضبوط معاہدہ پر بیعت کا لفظ بولا جانے لگا، روایت میں جو بیعت مذکور ہے اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر پختہ عہد لیا گیا اور چونکہ رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر صحابہ کرامؓ نے اسلام پر بھی بیعت کی ہے اور نمازوں کے قائم رکھنے پر بھی، اس لیے اس کی اہمیت واضح ہوگئی۔

**تشریح حدیث** حضرت جریر بن عبداللہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کی تو آپ نے اس میں تین چیزیں ذکر فرمائیں، ایک نمازوں کو قائم رکھنا، دوسرے زکوۃ ادا کرنا اور تیسرے ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرنا، اس سے معلوم ہوا کہ ایمان واسلام اور توحید پر بیعت لینے کے بعد، ان چیزوں کی اہمیت ہے اور ان میں سب سے پہلے ذکر کیا گیا ہے نماز کا، اس لیے کہ وہ تمام بدنی عبادتوں میں اصل ہے، دوسرے درجہ میں زکوۃ کا ذکر آیا ہے کہ وہ مالی عبادات میں اصل ہے، پھر چونکہ حضرت جریرؓ اپنی قوم کے سردار تھے، اس لیے انہیں تمام مسلمانوں کے ساتھ خیر خواہی کی تاکید فرمائی گئی، جیسا کہ پچھلے باب کی روایت میں وفد عبدالقیس کو مال غنیمت میں سے خمس ادا کرنے کی تاکید کی گئی تھی، کیوں کہ یہ قوم مجاہدین کی تھی اور کفار مضر سے ان کے معرکے رہا کرتے تھے۔

روایت سے معلوم ہوا کہ مشائخ کو اپنے مریدین سے بیعت میں جہاں عمومی احکام پر پختگی سے عمل کرنے کا عہد لینا چاہئے، وہیں مریدین کے حالات کے مطابق کچھ خصوصی احکام پر بھی معاہدہ کرنا چاہئے، عام طور پر مشائخ طریقت اس کا لحاظ بھی کرتے ہیں۔ واللہ اعلم

## [ ٤ ] بَابُ اَلصَّلٰوةُ كَفَّارَةٌ

(۵۲۵) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنِ الْاَعْمَشِ قَالَ حَدَّثَنِىْ شَقِيْقٌ قَالَ سَمِعْتُ حُذَيْفَةَ قَالَ كُنَّا جُلُوْساً عِنْدَ عُمَرَ رَضِىَ اللهُ عَنْهُ فَقَالَ اَيُّكُمْ يَحْفَظُ قَوْلَ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ فِىْ الْفِتْنَةِ قُلْتُ اَنَا كَمَا قَالَهُ، قَالَ اِنَّكَ عَلَيْهِ اَوْ عَلَيْهَا لَجَرِئٌ. قُلْتُ فِتْنَةُ الرَّجُلِ فِىْ اَهْلِهٖ وَمَالِهٖ وَوَلَدِهٖ وَجَارِهٖ تُكَفِّرُهَا الصَّلٰوةُ وَالصَّوْمُ وَالصَّدَقَةُ وَالْاَمْرُ وَالنَّهْىُ قَالَ لَيْسَ هٰذَا اُرِيْدُ وَلٰكِنَّ الْفِتْنَةَ الَّتِىْ تَمُوْجُ كَمَا يَمُوْجُ الْبَحْرُ قَالَ لَيْسَ عَلَيْكَ مِنْهَا بَأْسٌ يَا اَمِيْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِنَّ بَيْنَكَ وَبَيْنَهَا لَبَاباً مُغْلَقاً قَالَ اَيُكْسَرُ اَمْ يُفْتَحُ قَالَ يُكْسَرُ قَالَ اِذاً لَا يُغْلَقُ

اَبداً قُلْنا اَكَانَ عُمَرُ يَعْلَمُ البَابَ قَالَ نعَمْ كَمَا اَنَّ دُوْنَ الْغدِ اللَّيْلَةَ اِنِّیْ حَدَّثْتُهٗ بِحَدِيْثٍ لَيْسَ بِالْاَغَالِيْطِ فَهِبْنَا اَنْ نَسْأَلَ حُذَيْفَةَ فَاَمَرنَا مَسْرُوقاً فَسَأَلَهٗ فَقَالَ الْبَابُ عُمَرُ.

(آئندہ: ۱۴۳۵، ۱۸۹۵، ۳۵۸۶، ۷۰۹۶)

(۵۲۶) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا يَزِيْدُ بْنُ زُرَيْعٍ عَنْ سُلَيْمٰنَ التَّيمِیِّ عَنْ اَبِیْ عُثْمَانَ النَّهْدِیِّ عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ اَنَّ رَجُلاً اَصَابَ مِنْ اِمْرَأةٍ قُبْلَةً فَاَتَى النَّبِیَّ ﷺ فَاَخْبَرَهٗ فَاَنْزَلَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَیِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِّنَ اللَّيْلِ اِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ فَقَالَ الرَّجُلُ يَارَسُوْلَ اللهِ اَلِیْ هٰذَا؟ قَالَ لِجَمِيْعِ اُمَّتِیْ كُلِّهِمْ.     (آئندہ: ۴۶۸۷)

**ترجمہ** باب، نماز گناہوں کا کفارہ ہے، حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے فرمایا کہ تم میں سے کس کو فتنہ کے بارے میں فرمایا ہوا رسول اللہ ﷺ کا قول یاد ہے؟ حضرت حذیفہ نے کہا کہ مجھے اسی طرح یاد ہے جس طرح کہ آپ نے فرمایا تھا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بے شک تم حضور ﷺ (کی بات بیان کرنے) پر یا اس روایت کے بیان کرنے پر جری ہو، حذیفہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ آپ نے فرمایا کہ انسان جو اپنے اہل وعیال، مال، اولاد اور پڑوسی کے بارے میں مبتلائے فتنہ ہوتا ہے، تو نماز، روزہ، صدقہ، اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر اس کا کفارہ بن جاتے ہیں، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میرا مقصد اس فتنہ کے بارے میں معلوم کرنا نہیں ہے، میں اس فتنہ کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں جو سمندر کی موج کی طرح امنڈ آئے گا، حذیفہ نے کہا امیر المومنین! آپ کو اس فتنہ سے کوئی خطرہ نہیں ہے، بے شک آپؓ کے اور اس فتنہ کے درمیان ایک بند دروازہ ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بتلاؤ، وہ دروازہ توڑا جائے گا یا کھولا جائے گا، حضرت حذیفہ نے کہا توڑا جائے گا، اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ پھر کبھی بند نہ کیا جاسکے گا، شقیق (راوی کہتے ہیں) کہ ہم نے حضرت حذیفہ سے پوچھا کہ کیا حضرت عمرؓ اس دروازے (کے مصداق) کو جانتے تھے، حضرت حذیفہؓ نے کہا کہ ہاں اسی طرح جانتے تھے جیسا کہ کل کے آنے سے پہلے رات کا یقین ہے، میں نے خود ان سے یہ روایت بیان کی تھی جو کوئی پہیلی نہیں ہے، شقیق کہتے ہیں کہ ہمیں حضرت حذیفہؓ سے دروازے (کے مصداق) کو معلوم کرنے میں ڈر لگا، تو ہم نے مسروقؒ سے پوچھنے کو کہا، مسروق نے حضرت حذیفہ سے معلوم کیا تو انھوں نے فرمایا کہ وہ دروازہ خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ ایک شخص نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا، پھر وہ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے اپنے گناہ سے باخبر کیا، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: دن کے دونوں کناروں (صبح وشام) میں نمازوں کو قائم رکھو، اور رات کے کچھ حصوں میں بھی، بے شک نیکیاں برائیوں کو مٹا دیتی ہیں، اس شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! یہ حکم خاص میرے لئے ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا میری تمام امت کے لیے یہی حکم ہے۔

**مقصد ترجمہ** نماز کی ضرورت اور اہمیت بیان کرنے کے بعد اب اس کا فائدہ یعنی خاصہ بیان کرتے ہیں کہ نماز فرض ہو یا نفل، اس کا خاصہ یہ ہے کہ اس عمل سے گناہوں کا کفارہ ہو جاتا ہے اور اگر کسی کے گناہ نہیں ہیں تو ان شاء اللہ ترقیٔ درجات نصیب ہوگی، گویا نماز کے بارے میں یہ بیان کیا گیا کہ نماز نہ صرف یہ کہ اپنی عبدیت کا اظہار ہے بلکہ عبدیت کے اظہار کے ساتھ اس میں گناہوں کو محو کر دینے کی خاصیت بھی رکھی گئی ہے، اور اگر چہ نماز کے علاوہ دوسری عبادتوں میں بھی کفارۂ سیأت بننے کی شان ہے مگر ان تمام عبادتوں میں نماز کو اولیت کا مقام حاصل ہے، اس لیے یہ کہا جائے گا کہ اس عمل میں کفارۂ سیئات بننے کی سب سے زیادہ صلاحیت ہے۔

**کفارۂ سیئات بننے کی تفصیل** لیکن کفارۂ سیأت بننے کے سلسلے میں یہ بات ملحوظ رہے کہ مسلم شریف کی روایت میں "اذا اجتنبت الکبائر" کی قید مذکور ہے، اس لیے اہل سنت والجماعت نے مطلق کو مقید پر محمول کرتے ہوئے سمجھا ہے کہ اگر کبیرہ گناہوں سے اجتناب کیا جائے تو نماز کے ذریعہ صغیرہ گناہوں کا کفارہ ہوتا رہتا ہے، جب کہ مرجیہ نے مطلق روایتوں کو ظاہر پر محمول کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ نماز اور دیگر اعمال صالحہ، گناہ صغیرہ اور کبیرہ دونوں کا کفارہ بن جاتے ہیں، مگر یہ کج فہمی کی بات ہے، جب مسلم شریف کی روایت میں قید مذکور ہے، نیز یہ کہ وہ قید قرآن کریم میں بھی صراحت کے ساتھ موجود ہے، ارشاد فرمایا گیا: ''اِنْ تَجْتَنِبُوْا کَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ'' (سورۃ النساء آیت: ۳۱) اگر تم ان بڑے گناہوں سے بچو گے جن سے تمہیں روکا گیا ہے تو ہم تمہارے چھوٹے گناہوں کو ختم کر دیں گے۔

نیز دوسری جگہ توبہ کا صریح حکم دیا گیا جس سے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ بڑے گناہوں کی معافی اور مغفرت کے لیے باقاعدہ توبہ کی ضرورت ہے، ارشاد فرمایا گیا: ''يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا تُوْبُوا اِلَى اللهِ تَوْبَةً نَصُوحًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ'' (سورۃ التحریم آیت: ۹) اے ایمان والو! بارگارہِ خداوندی میں سچی اور مخلصانہ توبہ کرو، شاید کہ تمہارا پروردگار (اس توبہ سے) تمہارے گناہوں کو محو فرما دے۔

تو یہ ماننا ہوگا کہ کبائر کے لیے توبہ کی ضرورت ہے اور اعمال صالحہ سے خود بخود صرف صغیرہ گناہ ختم ہوتے ہیں، البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کبیرہ گناہوں کے معاملہ میں بھی تخفیف ممکن ہے، یا یہ کہ نماز کا عمل اگر اپنے ساتھ دل کی ندامت اور توبہ لیے ہو تو ہو سکتا ہے کہ توبہ کے سبب کبائر کا بھی کفارہ ہو جائے، اس کی صورت یہ ہے کہ جب بندۂ مومن شرائط و آداب کی رعایت کے ساتھ نماز کا ارادہ کرے گا تو وہ اپنے قلب کا بھی جائزہ لے گا اور سوچے گا کہ مالک حقیقی کے سامنے حاضر ہونا ہے اور اس سے مناجات کے ساتھ اپنی ضروریات بھی پیش کرنی ہیں، جب وہ یہ سوچے گا تو اسے اپنے قلب پر گناہوں کے اثر سے ندامت ہوگی۔ وہ یقیناً غور کرے گا کہ ایسے دل کو لے کر بارگاہ خداوندی میں کیسے حاضری دے، ہو سکتا ہے کہ اس کے دل کی یہ ندامت، اس کے گناہوں کی کثافت کو پگھلا دے، اور ہو سکتا ہے کہ خشیت الٰہی کے سبب

انابت الی اللہ اور توبہ کی توفیق ہو جائے اور صغیرہ کے ساتھ کبیرہ بھی ختم کر دیئے جائیں۔

**تشریح حدیث اول** حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ انہوں نے یہ سوال کیا کہ رسول پاک ﷺ نے فتنہ کے بارے میں جو ارشاد فرمایا تھا وہ تم میں سے کس کو یاد ہے؟ حضرت حذیفہؓ نے جو رسول اللہ ﷺ کے صاحب السر کہلاتے ہیں، جنھیں رسول اللہ ﷺ نے منافقین کے بارے میں مطلع فرما دیا تھا اور ان کو فتنوں سے بھی آگاہ کر دیا تھا، فرمایا کہ وہ ارشاد مجھے بعینہ یاد ہے، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ واقعی ان چیزوں میں خصوصی علوم کی وجہ سے تم بہت باہمت ہو، چنانچہ انہوں نے وہ ارشاد سنایا کہ آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ انسان کی اہل وعیال، مال اور پڑوس وغیرہ کے سلسلے میں جو آزمائش ہوتی ہے، یعنی ان چیزوں کی وجہ سے دین کے احکام پر عمل کرنے میں جو کوتاہی ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ نماز، روزہ، صدقہ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعہ ان کوتاہیوں کی معافی کا سامان کر دیتا ہے۔ امام بخاری کا مقصد اسی جز سے متعلق ہے کہ نماز، سیئات کا کفارہ بن جاتی ہے، دیگر اعمال صالحہ میں بھی یہ بات ہے مگر نماز کو اس سلسلے میں اولیت اور اہمیت حاصل ہے۔

**بڑے فتنے کا ذکر** حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ میں اس فتنہ کے بارے میں معلوم نہیں کر رہا ہوں، میں اس فتنہ کے متعلق پوچھ رہا ہوں جس کی موجیں سمندر کی طرح اٹھیں گی، اس پر حضرت حذیفہ نے جواب دیا کہ امیر المومنین! وہ فتنے آپ کے زمانہ میں ظاہر ہونے والے نہیں ہیں، ان فتنوں کے اور آپ کے درمیان دروازہ بند ہے، حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اچھا بتلاؤ کہ وہ دروازہ توڑ دیا جائے گا یعنی فتنے اس دروازے کو توڑ ڈالیں گے یا وہ دروازہ کھولا جائے گا؟ مطلب یہ تھا کہ اگر فتنے اس دروازے کو توڑ دیں گے تو فتنہ غالب رہے گا اور ان کا سلسلہ پیہم ہو جائے گا۔ اور اگر توڑنے کی صورت نہیں بلکہ کھولنے کی صورت ہوگی، تو جو کھول سکتا ہے، وہ بند بھی کر سکتا ہے، یہ مضمون مسند احمد کی روایت میں موجود ہے، الفاظ یہ ہیں: "فلو انه فتح كان لعله ان يعاد فيغلق" (مسند احمد ص: ۴۰۵/ ج: ۵) پس اگر وہ دروازہ کھولا گیا ہوتا تو شاید پھر دوبارہ بند ہو سکتا تھا۔

حضرت حذیفہ نے جواب دیا کہ یہ دروازہ کھولا نہیں بلکہ توڑا جائے گا، حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ تب تو دوبارہ بند نہ کیا جا سکے گا۔

شقیقؒ جو حضرت حذیفہؓ کے شاگرد ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت حذیفہؓ سے یہ معلوم کیا کہ آیا حضرت عمرؓ اس دروازہ کے مصداق سے باخبر تھے، تو حضرت حذیفہ نے جواب دیا، یقیناً باخبر تھے اور وہ اسی طرح جانتے تھے، جیسے کل کے ہونے سے پہلے آج کی رات کا علم ہوتا ہے، پھر حضرت حذیفہؓ نے اس علم کی وجہ بھی بتلائی کہ میں نے حضرت عمرؓ کو پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی جو حدیث سنائی تھی وہ کوئی پہیلی تو نہیں تھی، یعنی اس میں کوئی ابہام واجمال یا اپنی رائے اور اجتہاد وغیرہ کا کوئی دخل نہیں تھا، بلکہ وہ تو پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کا واضح ارشاد تھا، اس لیے حضرت عمرؓ یقیناً اس کے

مصداق سے باخبر تھے۔

شقیق کہتے ہیں کہ ''باب'' کا مصداق معلوم کرنے میں ہمیں خوف ہوا تو ہم نے مسروقؒ سے جو وہاں موجود تھے اور ہمارے مقابلہ پر حضرت حذیفہؓ سے زیادہ بے تکلف تھے یہ کہا کہ تم حضرت حذیفہؓ سے یہ بات معلوم کرلو، چنانچہ مسروقؒ نے معلوم کیا تو حضرت حذیفہؓ نے بتلایا کہ وہ دروازہ حضرت عمر کی ذات تھی، چنانچہ حضرت عمرؓ کی شہادت سے جو فتنوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے تو امت آج تک ان فتنوں سے دوچار ہے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے عافیت عطا فرمائے۔ آمین

**امت محمدیہ میں فتنوں کے تسلسل کی وجہ** حضرت علامہ کشمیریؒ قدس سرہ فرماتے ہیں کہ امت محمدیہ میں بہ کثرت پائے جانے والے فتنوں اور ان کے تسلسل کے بارے میں، میں برابر غور کرتا رہتا تھا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ بالآخر یہ سمجھ میں آیا کہ پچھلی امتوں کو تو چونکہ ہمیشہ دنیا میں رہنا نہیں تھا، اس لیے جب وہ کلیۃً مبتلائے زیغ وضلال ہو جاتی تھیں تو ان کو عذاب کے ذریعہ ہلاک کر دیا جاتا تھا، کسی امت کو غرق کر دیا گیا، کسی پر پتھروں کی بارش ہوئی وغیرہ، لیکن امت محمدیہ کو تو دنیا میں آخر تک باقی رہنا ہے، اس لیے یہ امت کلیۃً تو غلط روش اختیار نہیں کرے گی، بلکہ اس کا ایک بڑا طبقہ صراط مستقیم پر گامزن رہے گا اور کچھ لوگ غلط کار بھی ہوں گے، اس لیے مخلص ومنافق، نیک وبد اور اچھے برے کی تمیز کے لیے اللہ تعالیٰ نے طرح طرح کی آزمائشوں کا سلسلہ جاری فرمایا ہے۔　واللہ اعلم

**تشریح حدیث دوم** نماز کے کفارۂ سیآت ہونے کے سلسلے میں امام بخاریؒ حضرت عبداللہ بن مسعود سے دوسری روایت پیش فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے ایک عورت کا بوسہ لے لیا، اس کے بعد تنبہ ہوا اور خشیت خداوندی کا اس قدر غلبہ ہوا کہ دربار رسالت میں حاضر ہو کر صورت حال عرض کی اور تدارک کی درخواست کی، بخاری اور مسلم ہی کی دوسری روایتوں میں آتا ہے کہ انھوں نے اپنے اس گناہ کو بڑا گناہ اور کسی طرح کی شرعی سزا کا مستحق سمجھ کر عرض کیا: ''فقال یارسول اللہ! انی أصبت حدا فاقمه علي'' (بخاری ص ۱۰۰۸/ ج ۲) عرض کیا یارسول اللہ! مجھ سے ایسا گناہ ہو گیا جس پر حد (شرعی سزا) آتی ہے، آپ اس کو مجھ پر قائم فرمادیں۔

رسول اللہ ﷺ نے ان سے تفصیلات معلوم نہیں کیں، نماز کا وقت ہو گیا، رسول اللہ ﷺ نے نماز پڑھائی، یہ صحابی بھی شریک جماعت ہوئے، نماز کے بعد پھر انہوں نے وہی بات کہی ''انی اصبت حداً فاقمه علي'' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''أليس قد صليت معنا ؟'' کیا تم نے ہمارے ساتھ نماز نہیں پڑھ لی؟ عرض کیا کہ جی ہاں! پڑھ لی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا'' قد غفر الله لك ذنبك'' کہ بس اللہ نے تمہارے گناہ کو بخش دیا، پھر آپ ﷺ نے قرآن پاک کی آیت پڑھ کر سنائی کہ ان اوقات میں نماز کی پابندی کرو اور یہ یاد رکھو کہ حسنات سے سیآت محو ہو جاتی ہیں، اس شخص نے

عرض کیا کہ یہ حکم بہ طور خاص میرے لیے ہے؟ آپ نے فرمایا: نہیں بلکہ میری تمام امت کے لیے قانون یہی ہے کہ اعمال صالحہ کی برکت سے صغائر خود بخود محو ہو جاتے ہیں۔

**صحابہ کرامؓ کی شان** روایت میں جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے اس کے بارے میں شارحین نے متعدد نام ذکر کئے ہیں، علامہ عینی نے چھ نام ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ سب سے زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ واقعہ ابو یسرؓ کا ہے، لیکن واقعہ کسی کا بھی ہو ہمارے لیے اس سے یہ معلوم کر لینا آسان ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی شان کیا تھی؟ اگر بہ تقاضائے بشریت ان سے کبھی گناہ سرزد ہو جاتا تھا تو وہ اس کو انابت الی اللہ، توبہ اور استغفار کے ذریعہ ثواب کے اضافہ کا سبب بنا لیتے تھے۔ روایت میں آیا کہ ایک گناہ کا صدور ہوا تو وہ بے قرار ہو کر حاضر خدمت ہو گئے، بلکہ بعض روایات میں یہ آیا ہے کہ پہلے انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے، پھر حضرت عمرؓ سے اپنی اس غلطی کا ذکر کیا، دونوں حضرات نے یہی کہا کہ آپ پریشان نہ ہوں، جس بات پر اللہ تعالی نے پردہ پوشی فرمائی ہے اس کو پردہ ہی میں رہنے دیں یعنی کسی سے ذکر نہ کریں، اپنے طور پر استغفار کر لیں، لیکن ان بزرگوں کے مشورے کے بعد بھی بے قراری کم نہیں ہوئی اور اس غلطی کے تدارک کے لیے بارگاہ نبوت میں عرض کیا اور آپ نے اپنے ساتھ نماز میں شریک فرما کر پھر قرآن کریم کی ایک آیت پڑھ کر انہیں مطمئن فرما دیا کہ حسنات سے سیئآت ختم ہو جاتی ہی۔

**آیت مذکورہ سے حنفیہ کی تائید** رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر جس آیت کے ذریعہ اپنی بات سمجھائی ہے، اس کے کلمات ہیں "اَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِنَ اللَّيْلِ" (سورۂ ہود آیت ۱۱۴)
دن کے دونوں کناروں اور رات کے چند حصوں میں نماز قائم رکھو۔

اس میں دو لفظ آئے ہیں: ایک "طرفي النهار" یعنی دن کے دونوں کنارے اور دوسرے "زلف" رات کے چند حصے، ان میں پہلے لفظ سے فجر میں اسفار اور عصر میں تاخیر کا اشارہ ملتا ہے جو حنفیہ کی تائید میں ہے، نیز "زلف" جمع کا صیغہ ہے، اور اس سے وتر کے وجوب کی تائید ہوتی ہے۔

پہلے مسئلہ کی وضاحت یہ ہے کہ طرفین تثنیہ کا صیغہ ہے اور نہار کا اطلاق طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک کے وقت پر ہوتا ہے، اس لیے دن کے دونوں کناروں کا اصل مصداق تو طلوع شمس کا ابتدائی وقت اور غروب آفتاب کا ابتدائی وقت ہے، لیکن اس بات پر امت کا اجماع ہے کہ ان دونوں اوقات میں نماز پڑھنا مکروہ تحریمی ہے، اس لیے ظاہر آیت پر عمل کرنا تو ممکن نہیں رہا، اس لیے حقیقت کے متعذر ہونے کی بنیاد پر معنی مجازی مراد لیے جائیں گے اور وہ وقت مراد لیا جائیگا جو دن کے دونوں کناروں سے قریب ہو، یعنی فجر کی نماز طلوع شمس سے پہلے ایسے وقت میں جو بیاض نہار کے قریب ہو اور عصر کی نماز غروب آفتاب سے پہلے ایسے وقت میں کہ اصفرار کی وجہ سے کراہت نہ آئی ہو، اس طرح فجر کی نماز دن کے ایک کنارے پر آجائے گی اور عصر کی نماز دن کے دوسرے کنارے پر، یہ مضمون دیگر آیتوں میں بالکل

صاف ہے: "وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا" (سورۂ طٰہٰ آیت:۱۳۰) طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھا کیجئے۔ سورۂ قٓ میں بھی "وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ" (قٓ آیت:۳۹) فرمایا گیا ہے، اس لیے حنفیہ نے اس آیت سے فجر میں اسفار کے مستحب ہونے پر اور عصر میں وقت مکروہ سے پہلے تک تاخیر کرنے کے استحباب پر استدلال کیا ہے۔

نیز آیت مذکور میں دوسرا لفظ ہے "زلفا" یہ زلفۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں رات کا ایک حصہ "زلف" چونکہ جمع کا صیغہ ہے، اس لیے رات میں تین وقت ایسے ہونے چاہئیں جن میں نماز قائم کی جائے، چنانچہ حنفیہ کے نزدیک ایک مغرب ہے، دوسرے عشاء اور تیسرے وتر جو "ان اللّٰہ امدکم بصلوۃ ھی خیر لکم من حمر النعم" کی بنیاد پر بہت موکد یعنی واجب ہے، اگر وتر کو واجب نہ مانا جائے تو "زلفٌ" کے صیغۂ جمع کے تقاضے میں رات کے تین حصوں میں واجب نمازیں واقع نہیں ہوں گی، اس لیے اس آیت سے حنفیہ کے وجوب وتر کے مسئلہ کی بھی تائید ہوتی ہے۔

## [۵] بَابُ فَضْلِ الصَّلٰوةِ لِوَقْتِهَا

(۵۲۷) حَدَّثَنَا اَبُوْ الْوَلِيْدِ هِشَامُ بْنُ عَبْدِ الْمَلِكِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ الْوَلِيْدُ بْنُ الْعَيْزَارِ اَخْبَرَنِي قَالَ سَمِعْتُ اَبَا عَمْرٍو الشَّيْبَانِيَّ يَقُوْلُ حَدَّثَنَا صَاحِبُ هٰذِهِ الدَّارِ وَ اَشَارَ اِلٰى دَارِ عَبْدِ اللّٰهِ قَالَ سَاَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ اَيُّ الْعَمَلِ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ؟ قَالَ الصَّلٰوةُ عَلٰى وَقْتِهَا قَالَ ثُمَّ اَيٌّ؟ قَالَ ثُمَّ بِرُّ الْوَالِدَيْنِ قَالَ ثُمَّ اَيٌّ؟ قَالَ الْجِهَادُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنِيْ بِهِنَّ وَلَوِ اسْتَزَدْتُهُ لَزَادَنِيْ. (آئندہ:۲۷۸۲، ۵۹۷۰، ۷۵۳۴)

**ترجمہ** باب، نماز کو اپنے وقت پر پڑھنے کی فضیلت کا بیان۔ حضرت ابو عمرو سعید بن ایاس شیبانی نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے گھر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم سے اس گھر کے مالک نے بیان کیا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سوال کیا کہ کونسا عمل اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ ہے؟ تو انہوں نے فرمایا، نماز کو اپنے وقت پر پڑھنا، پھر معلوم کیا، پھر اس کے بعد؟ ارشاد فرمایا کہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، پھر پوچھا کہ پھر اس کے بعد؟ ارشاد ہوا کہ اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ یہ تین باتیں مجھے رسول اللہ ﷺ نے بتلائیں اور اگر میں اس سے زیادہ پوچھتا تو آپ مزید ارشاد فرماتے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ باب سابق میں نماز کے بارے میں جو یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہے، یہ وہ نماز ہے جو وقت پر ادا کی جائے، اگر بے وقت ادا کی جائے گی تو اس پر فضیلت اور

انعام تو در کنار، اس پر استغفار کی ضرورت ہوگی۔

نیز یہ کہ امام بخاریؒ نے "الصلوة لوقتها" کے الفاظ استعمال کئے ہیں، اس کا منشاء یہ ہے کہ ہر نماز کو اس کے مناسب وقت میں ادا کرنا مطلوب ہے، جب کہ امام ترمذیؒ نے امام شافعیؒ کی رائے کے مطابق ہر نماز کے لیے اول وقت کو افضل قرار دیا ہے اور اس کے لیے مستقل باب "باب ما جاء في الوقت الاول من الفضل" (ص:۲۶/ج:۱) منعقد فرمایا ہے، اور اس کے لیے ایک روایت "الصلوة لاول وقتها" اور دوسری روایت "الوقت الاول من الصلوة رضوان الله والوقت الآخر عفو الله" (ص۲۶/ج۱) ذکر کی ہے، لیکن اول تو ان روایتوں میں کلام ہے، دوسرے یہ کہ اول وقت سے مراد وہ نمازیں ہوں گی جن کا اول وقت میں پڑھنا مطلوب ہے، ورنہ جن نمازوں میں صحیح روایات کی بنیاد پر تاخیر کرنا مستحب ہے ان میں تاخیر ہی کو افضل قرار دیا گیا جائے گا۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ نمازوں کے لیے افضل وقت کے سلسلے میں روایات میں تعارض ہے، کسی روایت میں اول وقت میں نماز پڑھنے کو افضل قرار دیا گیا ہے اور کسی روایت سے آخر وقت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے، جیسے فجر میں اسفار یا ظہر میں گرمی کی شدت کے موقع پر ٹھنڈے وقت کا انتظار، اس لیے روایتوں کے تعارض کو ختم کرنے کے لیے تاویل کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں اصل یہ ہے کہ روایات میں تعارض ہو تو محدثین اور بعض فقہاء کا مزاج یہ ہے کہ وہ "اصح ما فی الباب" یعنی روایات میں سب سے زیادہ صحیح روایت کو ترجیح دیتے ہیں، احناف ان تمام روایات کے درمیان تطبیق کی کوشش کرتے ہیں، یہاں تطبیق کی آسان صورت یہ ہے کہ اول وقت سے مراد مطلق وقت کا اول نہ لیا جائے، بلکہ وقت مستحب کا اول مراد لیا جائے۔

نیز یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ افضلیت کی متعدد وجہیں ہو سکتی ہیں، بعض وجوہ سے اول وقت میں پڑھنا افضل معلوم ہوتا ہے، جیسے حکم خداوندی کی تعمیل میں عجلت ممکنہ اختیار کرنا، یا تا دیر قراءت وغیرہ میں مشغول رہنا، لیکن بعض وجوہ سے آخر وقت میں نماز پڑھنا افضل معلوم ہوتا ہے، جیسے تکثیر جماعت وغیرہ، اور جب ایسی صورت ہو کہ روایات میں بھی اختلاف ہو اور وجوہ ترجیح میں بھی، تو ہر مجتہد اپنے اصول کے مطابق جس جانب کو راجح قرار دے گا وہ درست ہوگا، چنانچہ امام بخاریؒ نے یہاں جو الفاظ استعمال کئے ہیں ان سے اول وقت میں نماز افضل ہونے کے بجائے، مناسب وقت میں پڑھنا افضل معلوم ہوتا ہے، تفصیلات آگے ابواب میں آرہی ہیں۔

**تشریح حدیث** حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے یہ سوال کیا کہ کونسا عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہے؟ آپ ﷺ نے جواب دیا کہ اپنے وقت پر نماز پڑھنا، مطلب یہ ہوا

کہ ایمان کے بعد سب سے زیادہ پسندیدہ عمل نماز ہے، مگر وہ نماز جس میں مناسب وقت کی رعایت کی جائے، کیونکہ نماز میں غایت تخشع کا اظہار ہے اور جس میں خشوع خضوع کی صفت ہوگی وہی مناسب اوقات میں پابندی کیساتھ نماز کو جاری رکھے گا، حضرت ابن مسعودؓ نے پوچھا کہ اس کے بعد دوسرے درجہ میں سب سے زیادہ پسندیدہ عمل کیا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک، کیونکہ خداوند تعالی نے جس طرح اپنی عبادت کا حکم دیا ہے، اسی طرح والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بھی تاکید کی ہے اور والدین کے ساتھ یہ طرز عمل بھی وہی اختیار کرسکتا ہے، جس کی طبیعت میں تواضع وانکساری ہو، گویا پروردگار کے سامنے عاجزی کا اظہار سب سے زیادہ پسندیدہ عمل ہے اور والدین کے ساتھ تواضع اختیار کرنا دوسرے درجہ کا پسندیدہ عمل ہوا، پھر حضرت عبداللہ نے معلوم کیا کہ اس کے بعد کونسا عمل اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے؟ تو فرمایا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا، یعنی وہ جہاد جس کا مقصد صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہو، کوئی دوسرا مقصد پیش نظر نہ ہو، کیوں کہ جہاد میں نفس کشی کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے، جس نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کردیا ہو اور اپنے آپ کو قتیل محبت بنالیا ہو۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ اگر میں اللہ کے نزدیک پسندیدہ اعمال کی درجہ بندی، یا دیگر چیزوں کے بارے میں معلوم کرتا تو آپ مزید ارشاد فرماتے، مگر میں نے اس سے زیادہ معلوم نہیں کیا۔　　واللہ اعلم

## [٦] بَابُ الصَّلٰوٰاتُ الْخَمْسُ كَفَّارَةٌ لِلْخَطَايَا اِذَا صَلَّاهُنَّ لِوَقْتِهِنَّ فِي الْجَمَاعَةِ وَغَيْرِهَا

(۵۲۸) حَدَّثَنِيْ اِبْرَاهِيْمُ بْنُ حَمْزَةَ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ اَبِيْ حَازِمٍ وَالدَّرَاوَرْدِيُّ عَنْ يَزِيْدَبْنِ عَبْدِ اللّٰهِ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ اَبِيْ سَلْمَةَ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَانِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّهُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ أَرَأَيْتُمْ لَوْاَنَّ نَهْراً بِبَابِ اَحَدِكُمْ يَغْتَسِلُ فِيْهِ كُلَّ يَوْمٍ خَمْساً مَاتَقُوْلُ ذٰلِكَ يُبْقِيْ مِنْ دَرَنِهٖ، قَالُوْا لَا يُبْقِيْ مِنْ دَرَنِهٖ شَيْئاً قَالَ فَذٰلِكَ مِثْلُ الصَّلٰوٰتِ الْخَمْسِ يَمْحُوا اللّٰهُ بِهَا الْخَطَايَا.

**ترجمہ** باب، پانچوں نمازوں کو اگر اپنے وقت پر جماعت کے ساتھ یا بغیر جماعت کے (یعنی عذر شرعی کے موقع پر) پڑھا جائے تو وہ گناہوں کا کفارہ ہوتی ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ تم لوگ کیا کہتے ہو اگر کسی دروازے پر ایک نہر ہو جس میں وہ روزانہ پانچ مرتبہ غسل کرتا ہو، کیا یہ غسل اس کے جسم کے میل کو باقی رہنے دے گا؟ صحابہؓ نے عرض کیا! جی نہیں، یہ غسل اس کے میل کو بالکل باقی نہیں رہنے دے گا، آپ نے فرمایا کہ بس یہی پانچوں نمازوں کی مثال ہے کہ اللہ ان کے ذریعے گناہوں کو مٹادیتا ہے۔

**مقصد ترجمہ** اس سے پہلے ایک باب گذرا ہے "الصلوۃ کفارۃ" وہاں مقصد کے تعین میں یہ کہا گیا تھا کہ نماز کے فائدے اور خاصہ کا بیان کیا گیا ہے، کہ نماز فرض ہو یا نفل، اس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ گناہ ہوں کو مٹا دیتی ہے، اب اس سے آگے بڑھ کر یہ وضاحت کرنا چاہتے ہیں کہ کفارہ سیآت ہونے کی جو خاصیت بیان کی گئی ہے، وہ فرائض میں بھی موجود ہے، بلکہ فرائض میں یہ شان زیادہ واضح ہے۔

اس مزید وضاحت کی ضرورت یہ پیش آئی کہ یہ پانچوں نمازیں، انسان کی عبدیت کے فرائض ہیں یعنی ان کے ذریعہ بندہ اپنی غلامی کا اظہار کرتا ہے، اور جو حکم اس کو دیا گیا ہے، اس کو بجالا کر آقا کے حقوق ادا کرتا ہے، اور جس طرح فرائض منصبی کی ادائیگی میں اجر ملتا ہے، انعام واجب نہیں ہوتا، اسی طرح فرائض صلوۃ کی ادائیگی میں عتاب سے بچانے کی صلاحیت یا اجر عطا کرانے کی بات تو قرین قیاس اور درست معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کے علاوہ کسی انعام واکرام یا دیگر کوتاہیوں کو محو کر دینے کی صلاحیت کا ہونا ضروری نہیں، یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کا کوئی غلام ہو تو وہ اپنے آقا کے احکام کی تعمیل کا پابند ہوگا، اگر احکام کی بجا آوری میں کوتاہی کرے گا تو عتاب کا مستحق ہوگا اور فرائض منصبی ادا کرے گا تو حق کی ادائیگی کے سبب مستحسن قرار دیا جائے گا، لیکن اس پر انعام واکرام غیر ضروری سمجھا جائے گا۔

امام بخاری نے اس باب میں یہ وضاحت کردی کہ فرائض کے بارے میں اس طرح کا اندیشہ درست نہیں، یہ فرض نمازیں تو دیگر اعمال صالحہ سے کہیں زیادہ کفارہ بننے کی صلاحیت رکھتی ہیں اور یہ ایسا ہی ہے جیسے زر خرید غلام کا احکام کی صحیح تعمیل کی بنیاد پر انعام دے کر حوصلہ بڑھاتے ہیں۔

"فی الجماعۃ وغیرھا" ترجمۃ الباب میں ایک لفظ اور ہے جس کا بہ ظاہر مطلب یہ ہے کہ یہ فرض نمازیں جماعت کے ساتھ ادا کی جائیں یا بغیر جماعت کے، ہر صورت میں گناہوں کا کفارہ ہو جاتی ہیں، اگر ان الفاظ کو ظاہر پر محمول کریں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امام بخاریؒ کے نزدیک جماعت واجب یا کمال ادائیگی کی شرط نہیں، حالانکہ انہوں نے اس مسئلہ کی وضاحت کے لیے جو باب منعقد کیا ہے، اس میں 'باب وجوب صلوۃ الجماعۃ" (۸۹/ج۱) کی تعبیر اختیار کی ہے، اس لیے ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ امام بخاری یہاں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کسی عذر شرعی کی بنیاد پر جماعت میں شریک نہ ہو سکے تو اس کی نماز بھی سیآت کا کفارہ ہوگی، اس قدر تعمیم کہ نمازوں کو جماعت سے پڑھو یا نہ پڑھو، کفارہ ہونے کی شان ہر حال میں باقی رہے گی، امام بخاریؒ کے رجحان اور ان کی شان کے منافی ہے۔

**تشریح حدیث** حدیث پاک میں تشبیہ کے ذریعہ فرض نمازوں کے کفارۂ سیئآت ہونے کا مضمون اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی کے بدن پر میل کچیل جما ہوا ہو اور اس کے دروازے پر ایک نہر ہو جس میں وہ دن میں پانچ مرتبہ نہایا کرے تو کیا آب رواں میں پانچ مرتبہ غسل کرنے کے بعد بھی اس کے جسم پر میل کچیل باقی رہ سکتا ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ بالکل نہیں رہے گا، تشبیہ مضمون کو واضح کرنے کے لیے اور معنویات

کو محسوسات و مشاہدات میں تبدیل کرنے کے لیے لائی جاتی ہے، چنانچہ نہر میں پانچ مرتبہ غسل کے ذریعہ جسم کا ظاہری میل صاف کرنے کا مضمون بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ پانچوں نمازوں کو بھی بالکل اسی طرح سمجھو کہ انسانوں سے گناہ ہوتے رہتے ہیں اور پیغمبروں کے علاوہ کوئی معصوم نہیں ہے، اللہ نے ان ہونے والے گناہوں کو ختم کرنے کے لیے نمازوں میں تاثیر رکھی ہے، جو نمازی باجماعت، یا عذر کی وجہ سے بلا جماعت، تمام آداب کی رعایت کرتے ہوئے قاعدہ میں نماز ادا کرتا ہے تو وہ پانچ وقت گناہوں کے میل کو صاف کرنے کے لیے نہر میں غوطہ لگاتا ہے اور میل کو صاف کر کے اپنے آپ کو پاک کر لیتا ہے۔

## کن گناہوں کی معافی ہوتی ہے؟

یہ بات دو باب پہلے گذر چکی ہے کہ جمہور کا فیصلہ یہ ہے کہ جن جن اعمال کے سلسلے میں کفارہ ہونے کا مضمون آیا ہے، اس سے صغائر کا کفارہ ہونا مراد ہے، کبائر کے لیے شریعت نے توبہ رکھی ہے، لیکن روایت باب میں تشبیہ کے ذریعہ جو مضمون بیان کیا گیا ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ آب رواں میں نہانے سے جس طرح جسم کا میل دور ہو جاتا ہے، اسی طرح پانچ وقت کی نمازوں سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے " لا يُبقِي من درنه شيئا " یہ غسل میل بالکل باقی نہیں رہنے دے گا، اس کا مفہوم بظاہر یہ ہے کہ تمام گناہ صغیرہ ہوں یا کبیرہ معاف ہو جائیں گے۔

## ابن بطال کی وضاحت

ابن بطال نے اس کی یہ وضاحت کی ہے کہ روایت باب ہی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ صغیرہ گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے، کبیرہ کا نہیں، کیونکہ روایت میں گناہوں کو درن یعنی جسم کے ظاہری میل سے تشبیہ دی گئی ہے، اور یہ درن بمقابلہ پھوڑے پھنسی اور زخم وغیرہ کے کمتر ہوتا ہے، اس لیے نمازوں سے جو درن محو ہوتا ہے، اس سے مراد گناہ صغیرہ ہی ہونا چاہئے، لیکن حافظ ابن حجر اور علامہ عینی دونوں ہی نے ابن بطال کی اس وضاحت پر یہ تنقید کی ہے کہ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ درن سے مراد بدن کے میل کے بجائے چھوٹی چھوٹی پھنسیاں اور دانے ہوں تب ہی زخم اور پھوڑے وغیرہ سے مقابلہ درست ہوگا، جب کہ حضرت ابوسعید خدری کی روایت میں درن کی جگہ وسخ کے الفاظ آئے ہیں، جن کی وجہ سے درن کا مفہوم دانے اور پھنسی وغیرہ نہیں، میل ہی متعین ہوتا ہے۔

مگر اکابر شارحین کی اس نوک جھونک سے قطع نظر، ہماری سمجھ میں تو یہ بات آتی ہے کہ ابن بطال بالکل صحیح بات کہہ رہے ہیں، زخم اور پھوڑے سے مقابلہ کی بنیاد پر درن کے ترجمہ میں تبدیلی کی ضرورت نہیں، مقابلہ میل کچیل سے بھی ہو سکتا ہے، یعنی ابن بطال یہ کہہ رہے ہیں کہ صحت مند جسم اور جلد پر جما ہوا میل تو صغیرہ گناہ ہے جو نہر میں غسل کرنے سے یعنی نماز پڑھنے سے صاف ہو جاتا ہے، رہے بڑے گناہ تو وہ جلد اور جسم کو صحت مند کب چھوڑتے ہیں، ان سے تو اندر تک زخم پیدا ہو جاتے ہیں، جن کے تدارک کے لیے غسل کافی نہیں، بلکہ ان کے اثرات کو ختم کرنے کے لیے باقاعدہ علاج یعنی توبہ کی ضرورت پڑتی ہے۔

**علامہ سندھیؒ کا ارشاد** علامہ سندھیؒ نے اس موقع پر نہایت عمدہ اور محققانہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ اہل سنت والجماعت نے جو صغائر کے کفارہ ہونے کی بات کہی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ صغیرہ کا اثر صرف ظاہر تک محدود رہتا ہے، کہتے ہیں کہ روایت میں جو یہ مضمون آیا ہے کہ وضو کے وقت پانی کے ساتھ صغیرہ گناہ ختم ہوتے چلے جاتے ہیں، یہ مضمون بھی ہماری اس بات کی تائید کرتا ہے کہ صغیرہ کا اثر صرف ظاہر تک محدود رہتا ہے، البتہ کبائر کا معاملہ بہت سنگین اور اہم ہے کہ اس سے ظاہر ہی نہیں باطن بھی متاثر ہوتا ہے۔ یہ مضمون بھی روایات میں موجود ہے کہ انسان جب کسی معصیت کا ارتکاب کرتا ہے، تو اس کے دل میں ایک سیاہ نکتہ پیدا ہو جاتا ہے، اگر انسان توبہ کر لیتا ہے، تو وہ مٹ جاتا ہے اور توبہ نہیں کرتا تو یہ نقطہ پھیلنا شروع ہو جاتا ہے اور پھیلتے پھیلتے پورے دل کا احاطہ کر لیتا ہے، یہ مضمون قرآن کریم میں بھی مذکور ہے:

"كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ" (سورۃ المطففین آیت:۱۴) ہرگز (ایسا) نہیں (کہ جزا وسزا نہ ہو) بلکہ ان کے دلوں پر ان کے برے اعمال کا زنگ چڑھ گیا ہے۔

اس لیے حدیث پاک کی تشبیہ کا مطلب یہ سمجھنا چاہئے کہ جس طرح نہر میں نہانے سے ظاہر جسم کا میل ختم ہو جاتا ہے، اسی طرح نماز کی برکت سے وہ گناہ ختم ہو جاتے ہیں جو باطن میں اثر انداز نہ ہوں، بلکہ ان کا اثر صرف ظاہر تک محدود رہتا ہو۔

**حضرت الاستاذؒ کی مزید وضاحت** ابن بطال اور علامہ سندھی کی تشریح کا حاصل یہ ہے کہ پانچوں نمازوں سے ان گناہوں کی معافی ہوتی ہے جو درن کے مشابہ ہیں اور درن سے مراد ان حضرات نے وہ گناہ لیے ہیں جن کا تعلق باطن سے نہیں، باطن پر اثر انداز ہونے والے کبیرہ گناہوں کی معافی کا طریقہ یہ ہے کہ قلب کو غسل دیا جائے اور اس کی صورت یہ ہے کہ تقوی اور خوف خدا پیدا ہو جو توبہ کی تحریک کرے، ہاں یہ ضرور ہے کہ جس طرح نہانے کا عمل بدن کا میل صاف کر کے، نہانے والے کی طبیعت کی گرانی دور کر دیتا ہے، اس میں بشاشت پیدا کر دیتا ہے، اسی طرح اگر نماز کا عمل قلب پر اثر انداز ہو کر توبہ کی صورت پیدا کر دے، تو صغائر کے ساتھ کبائر بھی معاف ہو جائیں گے، گویا اگر آداب وشرائط کی رعایت کے ساتھ نماز کا عمل کیا جائے گا تو اس کے ساتھ خشیت خداوندی ضرور پیدا ہوگی اور خشیت ہوگی تو سابقہ گناہوں پر ندامت کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور مستقبل میں گناہوں سے اجتناب کا عزم کرنے کی بھی توفیق ہوگی، اگر ایسا ہو گیا تو بس یہی توبہ کی حقیقت ہے۔ واللہ اعلم

## [۷] بَابٌ فِيْ تَضْيِيْعِ الصَّلٰوةِ عَنْ وَقْتِهَا

(۵۲۹) حَدَّثَنَا مُوْسَى بْنُ إِسْمَاعِيْلَ قَالَ حَدَّثَنَا مَهْدِيٌّ عَنْ غَيْلَانَ عَنْ أَنَسٍ قَالَ مَا أَعْرِفُ شَيْئًا مِمَّا كَانَ عَلٰى عَهْدِ النَّبِيِّ ﷺ قِيْلَ الصَّلٰوةُ، قَالَ أَلَيْسَ صَنَعْتُمْ مَا صَنَعْتُمْ فِيْهَا.

(۵۳۰) حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ زُرَارَةَ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ الْوَاحِدِ بْنُ وَاصِلٍ اَبُوْ عُبَيْدَةَ الْحَدَّادُ عَنْ عُثْمَانَ بْنِ اَبِيْ رَوَّادٍ اَخِيْ عَبْدِ الْعَزِيْزِ قَالَ سَمِعْتُ الزُّهْرِيَّ يَقُوْلُ دَخَلْتُ عَلٰى اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ بِدِمَشْقَ وَهُوَ يَبْكِيْ فَقُلْتُ مَا يُبْكِيْكَ؟ فَقَالَ لَا اَعْرِفُ شَيْئاً مِمَّا اَدْرَكْتُ اِلَّا هٰذِهِ الصَّلٰوةَ وَهٰذِهِ الصَّلٰوةُ قَدْ ضُيِّعَتْ وَقَالَ بَكْرُ بْنُ خَلَفٍ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَكْرٍ الْبَرْسَانِيُّ قَالَ اَخْبَرَنَا عُثْمَانُ بْنُ اَبِيْ رَوَّادٍ نَحْوَهُ ۔

**ترجمہ** | باب، نماز کو بے وقت کر کے ضائع کردینے کا بیان ۔ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جن چیزوں کو پایا تھا ان میں سے کوئی چیز محفوظ نہیں، ان سے عرض کیا گیا کہ نماز (تو محفوظ ہے) فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ نماز کے اندر بھی تم نے وہ چیزیں کر رکھی ہیں جو کر رکھی ہیں؟ حضرت عمرو بن زرارہ سے روایت ہے کہ ہم سے عبدالواحد بن واصل ابوعبیدہ حداد نے حدیث بیان کی اور ان سے عثمان بن ابی رواد نے جو عبدالعزیز بن رواد کے بھائی ہیں بیان کیا، انہوں نے کہا کہ میں نے زہری سے یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں دمشق میں حضرت انس بن مالک کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ رو رہے تھے، میں نے عرض کیا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں تو فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں جن چیزوں کو دیکھا تھا ان میں سے کوئی چیز محفوظ نہیں، بس ایک نماز ہے اور یہ نماز بھی برباد کردی گئی ہے، بکر بن خلف کہتے ہیں کہ ہم سے محمد بن بکر برسانی نے بیان کیا کہ ہم سے عثمان بن ابی رواد نے اسی طرح روایت بیان کی تھی۔

**مقصد ترجمہ** | نمازوں کے بروقت ادا کرنے کی فضیلت اور ان کے کفارۂ سیئات ہونے کی شان واضح کرنے کے بعد اب اس باب میں اس کی ضد یعنی دوسری صورت بیان کر رہے ہیں کہ اگر نمازوں کو وقت سے بے وقت کردیا جائے تو ان میں نہ صرف یہ کہ کفارہ کی شان باقی نہیں رہتی بلکہ ایسی نمازیں، نمازی کے حق میں انعام واکرام کے بجائے بازپرس کا سبب ہوں گی ۔ پھر یہ کہ بروقت ادا نہ کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ وقت مستحب سے موخر کردیا جائے، مگر امام بخاری کی یہ مراد نہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ نماز کا وقت بالکل ہی نکل جائے اور بعد از وقت نماز پڑھی جائے، امام بخاری یہاں اسی مسئلہ کی وضاحت کر رہے ہیں۔

**تشریح حدیث** | اس ترجمہ کے ذیل میں امام بخاری نے حضرت انسؓ کی دو روایتیں پیش کی ہیں، پہلی روایت میں یہ مذکور ہے کہ حضرت انسؓ نے اظہار افسوس کرتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جو چیزیں مسلمانوں کی شان امتیاز تھیں اب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ ان میں سے کوئی چیز بھی باقی نہیں ہے کہنے والے نے کہا کہ کوئی چیز باقی نہیں تو کیا نماز بھی باقی نہیں؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں! نماز کے معاملہ میں جو کوتاہیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ بھی تمہارے سامنے ہیں۔

یہاں روایت میں اختصار ہے، لیکن جن روایات میں تفصیل ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ کا یہ ارشاد

نمازوں کو وقت گذار کر پڑھنے سے متعلق ہے، مسند احمد کی روایت میں حضرت انسؓ سے سوال کرنے والے کا نام اور وقت گذار کر نماز پڑھنے والے کا نام مذکور ہے، سوال کرنے والے ابورافع ہیں اور بے وقت نماز پڑھنے والا حجاج ہے۔ الفاظ یہ ہیں: "سمعت انس بن مالك يقول ما أعرف مما عهدت مع رسول الله ﷺ اليوم، فقال ابو رافع يا ابا حمزة! ولا الصلوة فقال: اوليس قد علمت ماصنع الحجاج فى الصلوة" (مسند احمد ص ۲۰۸/ج ۳)۔

میں نے حضرت انسؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ میں آج ان چیزوں میں سے ایک چیز بھی محفوظ نہیں پاتا جنھیں رسول اللہ ﷺ کے عہد میں دیکھا تھا، ابورافع نے کہا کہ ابوحمزہ! اور نہ نماز کو؟ تو فرمایا: کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ حجاج نے نماز میں کیا کیا؟

طبقات ابن سعد اور دوسری کتابوں میں اور زیادہ تفصیل ہے کہ حجاج نے جمعہ کی نماز میں اتنا طویل خطبہ دیا کہ ظہر کا وقت ختم ہوگیا، حضرت انسؓ نے اس کو ٹوکنے کا ارادہ بھی کیا، لیکن متعلقین کے کہنے سے حجاج کے ظلم کی بنیاد پر خاموش ہوگئے، اسی موقع پر یہ فرمایا کہ عہد رسالت کی اب کوئی چیز باقی نہیں رہ گئی ہے، پوچھنے والے نے جب یہ کہا کہ نماز بھی کیا باقی نہیں ہے؟ تو فرمایا: "قد جعلتم الظهر عند المغرب" یعنی یہ بھی کوئی نماز ہے کہ ظہر کی نماز مغرب کے وقت میں پڑھی جارہی ہے۔

دوسری روایت میں یہ ہے کہ امام زہری، دمشق میں حضرت انسؓ سے ملنے گئے تو حضرت انسؓ رو رہے تھے، عرض کیا حضرت! کیا بات ہے؟ ارشاد فرمایا کہ عہد رسالت کی امتیازی چیزوں میں سے نماز رہ گئی تھی، اب وہ بھی برباد کردی گئی۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ حجاج، ولید بن عبدالملک کے عہد خلافت میں عراق کا امیر تھا، حضرت انسؓ نے اوقات کے بارے میں حجاج کا مذکورہ بالا طرز عمل دیکھا، تو خلیفہ سے شکایت کرنے کے ارادے سے دمشق پہنچے، وہاں جا کر دیکھا تو خود ولید اور اس کے دیگر امراء اوقات نماز کے بارے میں تساہل کا شکار ہیں، خصوصاً جمعہ کے دن خطبہ کو اتنا طول دیا جانے لگا تھا کہ ظہر کا وقت ختم ہوجاتا تھا اور اس کی وجہ سے کچھ لوگوں نے ان کے ساتھ نماز پڑھنا ترک کردیا تھا، اور کتنے ہی لوگ ایسے تھے کہ وہ اپنی نماز انفرادی پڑھ لیتے تھے، کتنے ہی لوگ مجمع میں بیٹھے بیٹھے اشارہ سے نماز پڑھتے تھے کہ ان امراء کے جور و ستم سے بھی محفوظ رہیں اور نماز بروقت ہوجائے، فتح الباری اور عینی میں اس طرح کے مختلف واقعات دئے ہیں، اس لیے حضرت انسؓ بہت زیادہ متاثر تھے، روتے تھے اور حالات کی خرابی کا گلہ وشکوہ فرماتے تھے۔

لیکن یہ ملحوظ رہے کہ اوقات نماز کے سلسلے میں خلفاء بنوامیہ کے اس طرز عمل سے سارا عالم اسلام متاثر نہیں ہوا تھا، مدینہ طیبہ میں نمازوں کے اوقات کی وہی رعایت تھی جو عہد رسالت سے چلے آتے تھے، مدینہ طیبہ کے بارے میں روایات میں موجود ہے کہ جب حضرت انسؓ شام کے سفر سے مدینہ واپس آئے تو ان سے مدینہ طیبہ کی نمازوں کے بارے میں پوچھا گیا تو اس موقع پر حضرت انسؓ نے صرف یہ فرمایا کہ تم سے صفوں کے سیدھا کرنے کے سلسلے میں کوتاہی

ہورہی ہے، یعنی اوقات نماز درست ہیں۔ اس کی وجہ فتح الباری میں یہ لکھی ہے کہ حضرت انسؓ جب مدینہ سے واپس ہوئے تو وہاں کے امیر حضرت عمر بن عبدالعزیز تھے اوران کے بارے میں "باب مواقیت الصلوۃ" میں گذر چکا ہے کہ ان سے بھی ایک دن قدرے تاخیر ہوگئی تھی، تو حضرت عروہ نے حضرت ابومسعودؓ انصاری کی روایت سنا کر اوقات کی طرف توجہ دلائی تھی، تو انھوں نے اس کو قبول کر کے اصلاح فرمادی تھی، اس لیے حضرت انس، اہل مدینہ کے بارے میں اوقات صلوۃ سے مطمئن تھے، البتہ تسویہ صفوف کی طرف توجہ دلائی۔ واللہ اعلم

## [۸] بَابُ الْمُصلِي يُنَاجِيْ رَبَّهُ

(۵۳۱) حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِنَّ اَحَدَكُمْ اِذَا صَلّٰى يُنَاجِيْ رَبَّهُ فَلاَ يَتْفُلَنَّ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَلٰكِنْ تَحْتَ قَدَمِهِ الْيُسْرٰى .

(۵۳۲) حَدَّثَنَا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ قَالَ حَدَّثَنَا يَزِيْدُبْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ حَدَّثَنَا قَتَادَةُعَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَنَّهُ قَالَ اِعْتَدِلُوْا فِيْ السُّجُوْدِ وَلاَ يَبْسُطْ اَحَدُكُمْ ذِرَاعَيْهِ كَالْكَلْبِ وَاِذَا بَزَقَ فَلاَ يَبْزُقَنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلاَ عَنْ يَمِيْنِهٖ فَاِنَّهُ يُنَاجِيْ رَبَّهُ. وَقَالَ سَعِيْدٌ عَنْ قَتَادَةَ لاَيَتْفُلُ قُدَّامَهُ اَوْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْتَحْتَ قَدَمِهٖ وَقَالَ شُعْبَةُ لاَيَبْزُقَنَّ بَيْنَ يَدَيْهِ وَلاَ عَنْ يَمِيْنِهٖ وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ قَدَمِهٖ (گذشتہ: ۲۴۱)

وَقَالَ حُمَيْدٌ عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ لاَيَبْزُقُ فِي الْقِبْلَةِ وَلاَعَنْ يَمِيْنِهٖ وَلٰكِنْ عَنْ يَسَارِهٖ اَوْ تَحْتَ قَدَمِهٖ . (گذشتہ: ۲۴۱)

**ترجمہ** باب، اس حقیقت کا بیان کہ نمازی، نماز میں اپنے پروردگار سے مناجات کرتا ہے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی انسان جب نماز پڑھتا ہے تو وہ اپنے پروردگار سے مناجات کرتا ہے، اس لیے اس کو اپنی داہنی طرف نہیں تھوکنا چاہئے، لیکن بائیں پیر کے نیچے تھوکنے میں مضائقہ نہیں۔ حضرت انسؓ رسول اللہ ﷺ سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ سجدہ کی حالت میں اعتدال اختیار کرو اور تم میں سے کوئی سجدہ میں اپنی کلائیوں کو زمین پر کتے کی طرح نہ پھیلائے اور جب تھوکنے کی مجبوری ہو تو اپنے سامنے کی جانب یا داہنی جانب ہرگز نہ تھوکے؛ اس لیے کہ وہ اس وقت اپنے پروردگار سے سرگوشی کررہا ہے، اسی روایت میں سعید بن ابی عروبہ نے حضرت قتادہ سے یہ الفاظ نقل کیے ہیں کہ نمازی کو اپنے آگے یا سامنے نہیں تھوکنا چاہئے، لیکن بائیں جانب یا پیروں کے نیچے تھوکنا چاہئے، نیز اسی روایت میں شعبہ نے حضرت قتادہ سے یہ نقل کیا ہے کہ نمازی اپنے سامنے یا داہنی طرف نہ تھوکے لیکن بائیں طرف یا پیروں کے نیچے تھوکنا چاہئے، نیز اسی روایت میں حمید نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے اس طرح نقل کیا

ہے کہ جانب قبلہ میں یا داہنی طرف نہ تھوکنا چاہئے، بلکہ بائیں طرف یا پیروں کے نیچے تھوکنا چاہئے۔

**مقصد ترجمہ** اوقات نماز اوران کی فضیلت کے ابواب کے درمیان ایک باب یہ مذکور ہے کہ نمازی، نماز کے دوران اپنے پروردگار سے مناجات اور سرگوشی کا شرف حاصل کرتا ہے، اس لیے مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاری یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ مناجات ہر وقت نہیں کی جاتی، بلکہ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وقت مقررہ پر حاضر ہوکر عرض معروض کی جائے، تب ہی مناجات مقبول اور کامیاب ہوتی ہے، اگر کوئی وقت گذرنے کے بعد پہنچے گا تو کامیاب ہونا تو درکنار عجب نہیں کہ سزا بھی دی جائے۔

یہ سمجھنا چاہئے کہ پچھلے ابواب میں اوقات مقررہ پر نماز پڑھنے کی اہمیت اور مدح، نیز وقت مقررہ سے مؤخر کرکے پڑھنے کی مذمت کا بیان تھا، اس باب کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ نماز اللہ کی بارگاہ میں باریابی حاصل کرکے مناجات کرنے کا نام ہے اس لیے اس کے لیے اوقات مقررہ کی پابندی کرنا ضروری ہے، ایسا عمل ہرگز پسندیدہ نہیں ہوسکتا کہ احکم الحاکمین کی بارگاہ میں جائیں اور اوقات کا لحاظ نہ کریں۔

**تشریح حدیث اور مناجات کی تفصیل** یہاں حضرت انسؓ کی روایت میں اتنا مذکور ہے کہ جب کوئی نماز پڑھتا ہے تو وہ اپنے پروردگار سے مناجات کرتا ہے، مگر یہاں اجمال ہے، دوسری روایات میں اس کی تفصیل کی گئی ہے کہ نماز میں جب بندہ سورہ فاتحہ کی تلاوت کرتا ہے تو پروردگار عالم ہر ہر جملہ کو سنتا ہے اور جواب مرحمت فرماتا ہے، صحاح کی روایت میں ہے:

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے نماز (سورۂ فاتحہ) کو اپنے اور بندے کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کردیا ہے اور بندہ کو وہ ملے گا جس کا وہ سوال کرے، چنانچہ جب بندہ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ'' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ جواب دیتا ہے کہ بندے نے میری حمد کی، جب بندہ ''اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ بندے نے میری ثنا کی، جب بندہ ''مَالِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ'' کہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ بندے نے میری عظمت کا اعتراف کیا، یا بندے نے معاملہ میرے سپرد کردیا، جب بندہ ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ'' کہتا ہے تو اللہ کہتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک ہے اور بندے کو اس کا سوال عطا کیا جائے گا اور جب بندہ ''اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ وَلَا الضَّالِّیْنَ'' کہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ اس کا تعلق میرے بندے سے ہے اور بندے کو اس کا سوال دیا جاتا ہے''۔ (مسلم شریف ص ۱۷۰/ ج ۱)

یہ ہے مناجات کی تفصیل کہ پروردگار عالم ہر آیت پر سننے کے بعد جواب مرحمت فرماتا ہے، اگرچہ اس تفصیل کے باوجود بعض حضرات نے اس کو مجاز پر محمول کیا ہے کہ یہ قرب الٰہی سے کنایہ ہے، یعنی یہ سمجھنا چاہئے کہ نماز میں نمازی پروردگار سے سرگوشی کررہا ہے، گویا نمازی اپنی بات کہہ رہا ہے اور پروردگار اس کا جواب دے رہا ہے، جیسے سرگوشی کرنے

والے کو اپنا منھ سننے والے کے کان کے قریب لاکر بات کہنی پڑتی ہے، اسی طرح یہاں بھی سمجھنا چاہئے کہ نماز اللہ تعالیٰ سے انتہائی تقرب کا عمل ہے، مجاز قرار دینے والوں کی بات کا حاصل یہ ہے کہ واقعۃً ایسا نہیں ہے، بلکہ یہ سمجھنا چاہئے مگر ہمارے خیال کے مطابق یہ مجاز نہیں، بلکہ حقیقت ہے کہ پروردگار عالم ہماری ہر بات کو جہراً ہو یا سراً سنتا ہے اور پھر اس کا وہ جواب دیتا ہے جس کی روایت میں تفصیل ہے۔

البتہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے صلاحیت عطا کی ہے وہ پوری بات سمجھ لیتے ہیں اور جن کے کانوں میں یہ صلاحیت نہیں ان کو پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی اطلاع پر یقین کر لینا چاہئے، جیسا کہ وحی پر ایمان لاتے ہیں اور پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی بیان کردہ تمام حقیقتوں کو تسلیم کرتے ہیں۔

**مناجات کے وقت کی ہدایتیں** جب نماز کی حالت، پروردگار سے مناجات اور عرض معروض کی حالت ہے تو اس کے لیے بہت اہتمام کی ضرورت ہے، اور نماز کے لیے جتنی ہدائتیں دی گئی ہیں ان میں یہی روح کارفرما ہے، روایت میں اس سلسلے کی دو ہدایتیں مذکور ہیں، ایک تھوکنے کی مجبوری کے وقت اور دوسری سجدے کی حالت میں۔

تھوکنے کی مجبوری ہو تو اس میں کیا کرنا چاہئے؟ یہ سب باتیں تفصیل کے ساتھ حدیث نمبر ۴۰۵ سے ۴۱۷ کے تحت گذر گئی ہیں، اس لیے یہاں بیان کی ضرورت نہیں، البتہ یہاں امام بخاری نے متعدد سندوں سے مختلف الفاظ نقل کئے ہیں، ان کا بہ ظاہر مقصد یہ ہے کہ وہ سمت قبلہ اور داہنی طرف تھوکنے کی ممانعت سے متعلق راویوں کے الفاظ کا اختلاف بیان کرنا چاہتے ہیں، ورنہ حکم تمام روایات میں ایک ہی مذکور ہے کہ سامنے کی جانب اور سمت قبلہ میں اور داہنی طرف تھوکنا منع ہے، نیز اس کی وجہیں روایات میں مختلف ہیں مگر ایک حکم کے کئی سبب ہو سکتے ہیں، اس لیے اس میں مضائقہ نہیں۔

دوسری ہدایت یہ دی گئی ہے کہ مناجات پروردگار سے قریب ہونے کی صورت ہے اور سب سے زیادہ تقرب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے، اس لیے سجدہ اعتدال اور پورے اطمینان کے ساتھ ادا کرنا چاہئے، ہتھیلیاں زمین پر رکھ کر کلائیاں اٹھا لینا، پیٹ کو ران سے الگ رکھنا، پیشانی کو زمین پر پوری طرح رکھ دینا وغیرہ، یہ سب سجدے کے آداب ہیں جن کی فقہاء نے درجہ بندی کر دی ہے، اگر اس طرح سجدہ کرو گے تو باری تعالیٰ کے سامنے تذلل کی پوری کیفیت حاصل ہو جائے گی۔

مطلب اور مقصود یہ ہے کہ نماز، نماز کی طرح ہونی چاہئے، جس میں تمام آداب وشرائط کی پوری رعایت ہو اور اوقات کی پابندی کی جائے، کیونکہ انسان کو اللہ نے شرف وکرامت سے نوازا ہے، اس لیے ایک شریف کا اپنے سب سے بڑے کے دربار میں حاضری کے لیے نہایت باادب ہونا ضروری ہے۔　　　واللہ اعلم

## [۹] بابُ الْاِبْرَادِ بِالظُّهْرِ فِیْ شِدَّةِ الْحَرِّ

(۵۳۳/۵۳۴) حَدَّثَنَا اَیُّوْبُ بْنُ سُلَیْمَانَ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْبَکْرٍ عَنْ سُلَیْمَانَ قَالَ صَالِحُ بْنُ کَیْسَانَ حَدَّثَنَا الْاَعْرَجُ عَبْدُالرَّحْمٰنِ وَغَیْرُهٗ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ وَنَافِعٌ مَوْلٰی عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ عَبْدِاللّٰهِ بْنِ عُمَرَ اَنَّهُمَا حَدَّثَاهُ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ اِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَاَبْرِدُوْا بِالصَّلٰوةِ فَاِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَیْحِ جَهَنَّمَ . (آئندہ:۵۳۶)

(۵۳۵) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ حَدَّثَنَا غُنْدَرٌ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنِ الْمُهَاجِرِ اَبِی الْحَسَنِ سَمِعَ زَیْدَ بْنَ وَهْبٍ عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ اَذَّنَ مُؤَذِّنُ النَّبِیِّ ﷺ الظُّهْرَ فَقَالَ اَبْرِدْ اَبْرِدْ اَوْ قَالَ انْتَظِرْ انْتَظِرْ وَقَالَ شِدَّةُ الْحَرِّ مِنْ فَیْحِ جَهَنَّمَ فَاِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَاَبْرِدُوْا عَنِ الصَّلٰوةِ حَتّٰی رَاَیْنَا فَیَّ التُّلُوْلِ . (آئندہ:۵۳۹،۶۲۹،۳۲۵۸)

(۵۳۶) حَدَّثَنَا عَلِیُّ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ الْمَدِیْنِیِّ قَالَ حَدَّثَنَا سُفْیَانُ قَالَ حَفِظْنَاهُ مِنَ الزُّهْرِیِّ عَنْ سَعِیْدِ بْنِ الْمُسَیَّبِ عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اَنَّهٗ قَالَ : اِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَاَبْرِدُوْا بِالصَّلٰوةِ فَاِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَیْحِ جَهَنَّمَ . (گذشتہ:۵۳۳)

(۵۳۷) قَالَ وَاشْتَکَتِ النَّارُ اِلٰی رَبِّهَا فَقَالَتْ یَارَبِّ اَکَلَ بَعْضِیْ بَعْضاً فَاَذِنَ لَهَا بِنَفَسَیْنِ : نَفَسٍ فِی الشِّتَاءِ وَنَفَسٍ فِی الصَّیْفِ وَهُوَ اَشَدُّ مَاتَجِدُوْنَ مِنَ الزَّمْهَرِیْرِ . (آئندہ:۳۲۶۰)

(۵۳۸) حَدَّثَنَا عُمَرُ بْنُ حَفْصٍ قَالَ حَدَّثَنَا اَبِیْ قَالَ حَدَّثَنَا اَعْمَشُ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْصَالِحٍ عَنْ اَبِیْ سَعِیْدٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَبْرِدُوْا بِالظُّهْرِ فَاِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَیْحِ جَهَنَّمَ، تَابَعَهٗ سُفْیٰنُ وَیَحْیٰی وَاَبُوْ عَوَانَةَ عَنِ الْاَعْمَشِ. (آئندہ:۳۲۵۹)

**ترجمہ** باب، گرمی کی شدت میں ظہر کی نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھنے کا بیان۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حدیث بیان کی کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب گرمی سخت ہو تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو، اس لیے کہ گرمی کی شدت جہنم کی حرارت کے بہت زیادہ انتشار کے سبب ہوتی ہے۔ حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے موذن نے ظہر کی نماز کے لیے اذان دینے کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ "ابرد ابرد" یعنی وقت کے ٹھنڈا ہونے کا انتظار کرو، یا فرمایا" انتظر انتظر "یعنی ابھی انتظار کرو اور یہ فرمایا کہ گرمی کی شدت جہنم کی حرارت کے انتشار سے ہوتی ہے، اس لیے جب گرمی زیادہ ہو تو نماز کو ٹھنڈے وقت کے انتظار میں مؤخر کر دیا کرو، (اور اس دن آپ نے اتنا

انتظار کیا کہ) یہاں تک کہ ہم نے دیکھا کہ ٹیلوں کا سایہ زمین پر پڑنے لگا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے ارشاد فرمایا کہ جب گرمی سخت ہو تو نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو، اس لیے کہ گرمی کی شدت جہنم کی حرارت کے انتشار سے ہوتی ہے، اور یہ کہ جہنم نے اپنے پروردگار سے شکایت کی اور کہا، اے پروردگار! میرے بعض حصے نے بعض حصے کو کھالیا تو اللہ نے اس کو دو سانس لینے کی اجازت عطا کی، ایک سانس جاڑے میں اور ایک سانس گرمی میں، یہی وہ سانس ہے جسے تم سخت سے سخت گرمی یا سخت سے سخت سردی کی صورت میں محسوس کرتے ہو۔ حضرت ابوسعیدؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ظہر کی نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھو اس لیے کہ گرمی کی شدت جہنم کی حرارت کے انتشار کے سبب ہوتی ہے، اس روایت کو اعمش سے بیان کرنے میں، سفیان ثوری، یحییٰ بن سعید القطان اور ابوعوانہ نے حفص بن غیاث کی متابعت کی ہے۔

**مقصد ترجمہ** یہاں سے امام بخاری نمازوں کے الگ الگ اوقات کا بیان شروع کر رہے ہیں، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ظہر کی نماز کا ذکر کیا ہے، اس لیے کہ امامت جبرئیل والی روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نمازوں کی ابتداء ظہر سے کی گئی تھی، چنانچہ امام بخاری نے ظہر کی نماز کے وقت اور اس کے متعلقات کی بحث سے یہ مضمون شروع کیا اور اگرچہ قاعدہ کا تقاضہ یہ تھا کہ پہلے ظہر کا وقت بیان کرتے اور ابراد یعنی ٹھنڈے وقت میں پڑھنے کی بحث کو مؤخر کرتے، لیکن اس سے پچھلے باب سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مناجات کے آداب وقوانین کا بیان بھی ان کے پیش نظر ہے، اس لیے یہی ترتیب مناسب معلوم ہوتی ہے جو امام بخاری نے قائم کی۔

مقصد یہ ہے کہ نماز جب پرودگار سے مناجات کا نام ہے تو اس کی رعایت اہم ہے کہ وہ اچھے اور مناسب وقت میں ہو اور اگر گرمی کا وقت ہوگا تو مناجات کرنے والا بے تابی پریشانی میں مبتلا ہونے کے سبب دل جمعی اور اطمینان خاطر کے ساتھ عرض معروض نہ کر سکے گا اور آقا کی بارگاہ میں بدحواسی و پریشانی خاطر کے ساتھ کی گئی مناجات بے وزن ہو کر رہ جائے گی۔ دوسری بات روایت میں یہ مذکور ہے اور وہی اہم ہے کہ یہ وقت احکم الحاکمین کے جلال وغضب کے اظہار کا ہے اور غضب کے موقع پر مناجات اور لب کشائی کا کام نہیں کرنا چاہئے، یعنی جب یہ معلوم ہو گیا کہ گرمی کی یہ شدت غضب الٰہی کا اثر ہے، تو اس موقع پر حاضر ہو کر مناجات کرنا بے محل ہے۔

**تشریح حدیث اول** اس باب کے تحت امام بخاری نے کئی روایتیں ذکر کی ہیں، پہلی روایت میں یہ حکم ہے کہ گرمی کی شدت ہو تو ظہر کی نماز کو تاخیر سے یعنی شدت ختم ہونے کے بعد ادا کیا جائے، کیوں کہ گرمی کی شدت جہنم کے اثر سے ہے، روایت میں لفظ استعمال کیا ہے: "فیح جھنم "فیح کے معنی کشادگی کے ہیں اور یہاں مراد ہے "سعة انتشارھا" یعنی جہنم کی حرارت کے بہت زیادہ پھیلنے کے سبب ایسا ہوتا ہے، گرمی کے شدید ہونے کے وقت نماز میں دو چیزیں ہیں کہ ایسی صورت میں سکون قلب میسر نہ ہوگا، جب کہ عبادت کے لیے دل لگا کر کام کرنے کی ضرورت

ہے، دوسری چیز یہ ہے کہ یہ جہنم کا اثر ہونے کی بنیاد پر غضب خداوندی کے مظاہرہ کا وقت ہے، اور ایسے وقت میں مناجات کرنا، آداب مناجات کے منافی ہے۔

حدیث شفاعت سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ غضب کے وقت لب کشائی کی ہمت صرف وہی کرسکتا ہے جسے اجازت دی گئی ہو، چنانچہ قیامت میں جب اہل ایمان بھی پریشان ہوں گے تو وہ طول انتظار سے گھبرا کر حضرت آدم علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے اور شفاعت کی درخواست کریں گے، لیکن سب عذر کردیں گے، بالآخر حضور پاک ﷺ کے پاس پہنچیں گے، آپ پروردگارِ عالم کی اجازت کے بعد شفاعت فرمائیں گے۔ اس لیے گرمی کی شدت کے سبب غضب خداوندی کا مظاہرہ ہورہا ہو تو اس وقت تاخیر کر کے ظہر کی نماز پڑھنا مستحب ہے اور یہی حنفیہ کا مذہب ہے۔

**تشریح حدیث دوم** دوسری روایت میں ایک سفر کا واقعہ ہے جس کی وضاحت اگلے باب کی روایت میں آرہی ہے، یہاں اتنا ہی مذکور ہے کہ آپ ﷺ کے مؤذن یعنی حضرت بلالؓ نے ظہر کی نماز کے لیے اذان دینے کا ارادہ کیا تو آپ نے ہدایت فرمائی کہ ابھی نہیں، ٹھنڈے وقت کا انتظار کرنا چاہئے، اسی وقت اذان دیتے ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم نے اسی گرمی کی شدت میں جمع ہونے کی دعوت دیدی اور اس وقت جمع ہونا دشوار ہوگا، اس لیے جب وقت میں گنجائش ہے تو نمازیوں کو مشقت میں مبتلا نہ کرنا چاہئے، گرمی کی شدت ختم ہوجائے تو اذان دینا تاکہ نماز کے لیے جمع ہونا دشوار نہ ہو۔

اس روایت میں "ابردوا عن الصلوۃ" کے الفاظ ہیں اور اس سے پہلے کی روایت میں "ابردوا بالصلوۃ" آیا تھا، اس سلسلہ میں یہ کہا گیا ہے کہ عن کبھی باء کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے " رمیت عن القوس، رمیت بالقوس" کے معنی میں ہے، یا پھر عن کا استعمال تاخیر کے معنی پر متضمن ہونے کی وجہ سے ہے، یعنی معنی ہیں "اخروا عن الصلوۃ مبردین" نماز ظہر کو ٹھنڈے وقت کا انتظار کرتے ہوئے موخر کرو، گویا اصل روایت تو بالصلوۃ ہے، جس میں عن ہے اس میں تاویل کرلی جائے گی۔

**تشریح حدیث سوم** تیسری روایت میں گرمی کی شدت کے فیح جہنم یعنی جہنم کی لپٹ کا اثر ہونے کی تفصیل کی گئی ہے، کہ جہنم نے بارگاہ خداوندی میں شکایت کی کہ میرے اندر گرمی بہت بڑھ گئی ہے اور میرے شعلے ایک دوسرے کو کھائے جارہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے شکایت کا یہ جواب دیا کہ تم دو سانس لے لیا کرو، ایک گرمی میں ایک سردی میں، چنانچہ دنیا میں گرمی اور سردی کی جو شدت محسوس کی جاتی ہے وہ جہنم کے انھیں دو سانسوں کا اثر ہے۔

**جہنم کے دو سانس کا مطلب** دو سانس لینے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جو گرمی جہنم کے اندر بڑھ گئی ہے اس کو ایک سانس کے ذریعہ باہر خارج کردیا جائے اور دوسرے سانس کا مطلب یہ ہے کہ جو

گرمی عالم میں پھیلی ہوئی ہے اس کو ایک سانس کے ذریعہ آہستہ آہستہ اندر سمیٹ لیا جائے، گویا گرمی کے زمانہ میں جب گرمی کی شدت بڑھ جاتی ہے تو سمجھنا چاہئے کہ جہنم باہر کا سانس لے رہی ہے، اسی طرح سردی کی شدت ہو تو سمجھنا چاہئے کہ جہنم اندر کا سانس لے رہی ہے۔

دو سانس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جہنم کے دو طبقے ہیں ایک نار کا اور ایک زمہریر کا، جہنم اپنے طبقۂ نار کے سانس سے گرمی پھینکتی ہے اور طبقۂ زمہریر کے سانس سے سردی، اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ جس طرح نار کو شکایت ہوگئی تھی اسی طرح طبقۂ زمہریر کو بھی سردی کی شدت کی شکایت ہوگئی تھی، اس لیے یہ کہا جائے گا کہ گرمی کے سانس سے گرمی بڑھ جاتی ہے اور سردی کے سانس سے سردی، اس دوسرے مطلب کے لیے روایات میں وجوہ ترجیح بھی ہیں، کیونکہ مشکوۃ شریف میں ہے: " **وفی روایة للبخاری فاشد ماتجدون من الحرفمن سمومها واشد ما تجدون من البرد فمن زمهریرها** " (مشکوۃ ص:۶۰/ ج:۱) یعنی بخاری ہی کی ایک روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ تم گرمی کی جو زیادہ سے زیادہ شدت محسوس کرتے ہو وہ جہنم کی گرم ہوا کی تاثیر ہے اور جو زیادہ سے زیادہ سردی محسوس کرتے ہو وہ اس کے طبقۂ زمہریر کا اثر ہے یہ الفاظ ابن ماجہ میں بھی ہیں: "**فشدة ماتجدون من البرد من زمهریر هاوشدة ماتجدون من الحرمن سمومها**" (ابن ماجہ:۳۲۰) پس سردی کی جو شدت تم محسوس کرتے ہو وہ جہنم کے طبقۂ زمہریر کا اثر ہے اور جو گرمی کی شدت محسوس کرتے ہو وہ اس کی گرم ہوا کی تاثیر ہے۔

گویا جہنم کے دو سانس کا ایک مطلب تو یہ ہوا کہ ایک سانس باہر گرمی پھینکنے کے لیے ہے اور دوسرا باہر سے گرمی کو اندر سمیٹنے کے لیے ہے، دوسرا مطلب یہ ہے کہ دونوں سانس باہر ہی کے ہیں، ایک طبقۂ نار اور دوسرا طبقۂ زمہریر کا۔ یہ دوسرا مطلب روایت کے مختلف الفاظ کی بنیاد پر راجح ہے۔

## گرمی وسردی کے ظاہری اسباب سے تعارض

روایت کی روشنی میں بہر صورت مطلب یہی نکلتا ہے کہ سردی اور گرمی کا اصل مرکز جہنم ہے، جب کہ عالم اسباب میں گرمی اور سردی کی شدت کا سبب سورج کا کرۂ ارض سے قریب یا بعید ہونا معلوم ہوتا ہے، مگر ان دونوں میں تطبیق کے لیے کہا جاسکتا ہے کہ حدیث پاک میں گرمی اور سردی کے اصل خزانہ کی نشاندہی کی گئی ہے، ہر چیز کے خزانے پروردگار کے پاس ہیں، قرآن کریم میں ارشاد ہے: "اِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَهَا خَزَائِنُهٗ" (سورۃ الحجر آیت:۲۱) دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے مگر یہ کہ ہمارے یہاں اس کے خزانے ہیں۔

اس لیے سردی اور گرمی کا اصل خزانہ تو جہنم ہی ہے، لیکن دنیا میں اس کی تقسیم سورج کے ذریعہ کی گئی ہے، سورج ایک آتشی شیشے کی طرح جہنم سے حرارت حاصل کرتا ہے اور اس کے قرب وبعد کے سبب دنیا میں گرمی کم اور زیادہ ہوتی رہتی ہے، گویا سورج جہنم کے اس سانس کو دنیا تک منتقل کرنے کا ایک راستہ ہے، نیز یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ظاہری سبب

تو آفتاب کا قرب و بعد ہے اور باطنی سبب وہ ہے جس کی حدیث پاک میں اطلاع دی گئی ہے۔

نیز ایک بات یہ بھی کہی جا سکتی ہے کہ اگر سردی اور گرمی جہنم کے سانس کا اثر ہے تو سردی اور گرمی کے معاملہ میں پوری دنیا کی ایک ہی کیفیت ہونی چاہئے، لیکن یہ بھی ایک سرسری اشکال ہے، کیوں کہ یہ اشکال عوارض سے قطع نظر کرنے کی بنیاد پر پیدا ہوا ہے، جب کہ عوارض کا اس سلسلہ میں دخل بالکل سامنے کی بات ہے، عوارض کی بنیاد پر کبھی اصل حالت کمزور پڑ جاتی ہے، کبھی طاقتور ہو جاتی ہے، کبھی اصلی حالت کے آثار معدوم ہو جاتے ہیں، عوارض میں بادل کا ہونا، بارش کا ہونا درختوں کا سایہ، تہہ خانے اور گرمی اور سردی کو ختم یا کمزور کرنے کے طبعی اور مصنوعی اسباب داخل ہیں، اس لیے ظاہر ہے کہ عوارض کی موجودگی میں اصلی کیفیت کا ظہور عوارض کے بقدر کمزور یا طاقتور ہو جائے گا۔

## جہنم کی شکایت حقیقت ہے یا مجاز

حدیث پاک میں ایک یہ لفظ آیا کہ جہنم نے پروردگار سے شکایت کی، یہاں یہ بات تشریح طلب ہے کہ یہ شکایت حقیقت ہے یا مجاز؟ یعنی جہنم نے زبان قال سے یہ شکایت کی یا زبان حال سے؟ تو اگرچہ قاضی بیضاوی تاویل کی طرف مائل ہیں، اور اس تعبیر کو مجاز قرار دیتے ہوئے یہ تشریح کرتے ہیں کہ جہنم کا شکوہ، جہنم کے بے پناہ کھولنے کی مجازی تعبیر ہے، اسی طرح بعض حصے کا بعض حصے کو کھا جانا، اجزاء جہنمی کے باہمی ازدحام کی تعبیر ہے اور سانس لینا اندرونی گرمی کے باہر پھینکنے کی مجازی تعبیر ہے، لیکن جمہور کے فیصلے کے مطابق جہنم کی شکایت حقیقی ہے، خدا کو قدرت ہے کہ وہ جہنم یا کسی بھی مخلوق کو قوت گویائی عطا کر دے، سورۃ النمل میں ہے کہ اللہ تعالی نے ہدہد کو زبان ہی نہیں فہم وادراک بھی عطا فرمایا تھا، جنت اور جہنم کے بارے میں اس کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی گفتگو کا مضمون آیا ہے۔ قرآن کریم میں سورۂ ق میں ہے: "يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ" (سورہ ق آیت: ۳۰) جس دن ہم جہنم سے کہیں گے کہ کیا تو پر ہو گئی ہے؟ وہ یہ کہے گی کہ کیا کچھ اور باقی ہے، جنت کے بارے میں آتا ہے کہ جب کوئی بندہ جنت کی دعاء مانگتا ہے تو جنت آمین کہتی ہے، جہنم کے بارے میں آتا ہے کہ جب مومن پل صراط سے گزرے گا تو جہنم اس کو آواز دے گی اور کہے گی "جزيا مومن! فقد اطفأ نورك لهبي" اے مومن جلدی سے گذر جا، تیرے نور سے میرے شعلے بجھے جاتے ہیں، نیز جنت و جہنم کے بارے میں گفتگو کے علاوہ سننے کا مضمون بھی آیا ہے: "ليس شيء اسمع من الجنة والنار" کہ جنت اور جہنم سب سے زیادہ سننے والی مخلوق ہیں وغیرہ۔

پھر یہ کہ آج کل تو جمادات کے بولنے پر کوئی اشکال نہیں، جب انسان غیر ذی حیات چیزوں میں قوت گویائی بھر سکتا ہے تو پروردگار کے لیے کیا مشکل ہے، اس لیے جمہور کی رائے یہ ہے کہ جہنم کی شکایت، پروردگار کا جواب، دو سانس لینے کی اجازت اور اس سے گرمی اور سردی کی شدت وغیرہ جو چیزیں روایات میں مذکور ہیں وہ سب حقیقت پر محمول ہیں۔

اس طرح کی تمام چیزوں میں اہل سنت والجماعت کے یہاں اصول یہ ہے کہ جب تک کوئی عقلی یا شرعی محذور

یعنی ممانعت کی دلیل قائم نہ ہو اس وقت تک معنی حقیقی مراد لیے جائیں گے، اہل سنت والجماعت کہتے ہیں کہ ہر وہ چیز جو ممکن عقلی ہو اور دلیل نقلی صحیح اس کا وقوع بیان کرتی ہو تو اس کا تسلیم کرنا اور ماننا ضروری ہے، روایت باب میں جہنم کی شکایت اور دوسری چیزوں کو حقیقت پر محمول کرنا ممکن ہے اور اس سے عقلاً یا شرعاً کوئی چیز مانع نہیں ہے، اس لیے حقیقت پر محمول کرنا ہی درست ہے۔ " اٰمَنَّا بِهٖ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا "۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** اس باب کے تحت امام بخاری نے چوتھی روایت حضرت ابوسعید خدری کی پیش کی ہے، اس میں تقریباً وہی الفاظ ہیں جو پہلی روایت میں تھے، بس یہ فرق ہے کہ اس میں "ابردوا بالصلوۃ" تھا اور اس میں "ابردوا بالظھر" ہے۔

اور اس روایت کے بعد امام بخاری نے چند متابعات بھی پیش کی ہیں، ان کا مقصد بھی یہی ہے کہ "ابردوا بالظھر" کے الفاظ نقل کرنے میں حضرت اعمشؒ سے حفص بن غیاث تنہا نہیں ہیں، بلکہ ان الفاظ کو سفیان ثوریؒ، یحییٰ بن سعید القطان اور ابوعوانہؒ بھی حضرت اعمشؒ سے نقل کرتے ہیں، یہ متابعات سند متصل کے ساتھ کہاں کہاں مذکور ہیں، اس کے لیے فتح الباری اور عمدۃ القاری کا مطالعہ کافی ہے۔

اس باب میں امام بخاری نے جتنی روایتیں ذکر کی ہیں ان سب میں گرمی کی شدت کے وقت نماز ظہر کو مؤخر کر کے ٹھنڈے وقت میں پڑھنے کی تاکید ہے، جب کہ مسلم شریف میں حضرت خبابؓ سے اس مضمون کے بالکل خلاف روایت بیان کی گئی ہے: "شكونا الى رسول الله ﷺ الصلوة فى الرمضاء فلم يشكنا" (مسلم ص:۲۲۵/ج:۱) ہم نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گرم ریت پر نماز پڑھنے کی شکایت کی تو آپ نے ہماری شکایت کا ازالہ نہیں فرمایا۔

شکایت کا ازالہ نہ فرمانے کا مطلب یہی ہوا کہ ہم گرمی کی شدت کے باوجود گرم ریت پر نماز پڑھتے رہے، ان روایات میں تعارض کی وجہ سے امام طحاوی اور بعض دوسرے محدثین کی رائے یہ ہے کہ حضرت خبابؓ والی روایت منسوخ ہے اور بعض حضرات نے یہ ارشاد فرمایا کہ حضرت خبابؓ کی روایت میں جو درخواست کی گئی ہے وہ ابراد سے بھی زیادہ تاخیر کی تھی، جس کو قبول نہیں کیا گیا، البتہ گرمی کی شدت ختم ہونے تک تاخیر کرنا مستحب ہے۔ واللہ اعلم

## [۱۰۱] بَابُ الْاِبْرَادِ بِالظُّهْرِ فِي السَّفَرِ

(۵۳۹) حَدَّثَنَا آدَمُ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا مُهَاجِرٌ اَبُو الْحَسَنِ مَوْلًى لِبَنِيْ تَيْمِ اللّٰهِ قَالَ سَمِعْتُ زَيْدَ بْنَ وَهْبٍ عَنْ اَبِيْ ذَرٍّ الْغِفَارِيِّ قَالَ كُنَّا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِيْ سَفَرٍ فَاَرَادَ الْمُؤَذِّنُ اَنْ يُّؤَذِّنَ لِلظُّهْرِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اَبْرِدْ ثُمَّ اَرَادَ اَنْ يُّؤَذِّنَ فَقَالَ لَهٗ اَبْرِدْ حَتّٰى رَاَيْنَا فَيْءَ التُّلُوْلِ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اِنَّ شِدَّةَ الْحَرِّ مِنْ فَيْحِ جَهَنَّمَ فَاِذَا اشْتَدَّ الْحَرُّ فَاَبْرِدُوْا

بِالصَّلٰوةِ . وَ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ يَتَفَيَّؤُ (نحل:۴۸) يَتَمَيَّلُ . (گذشتہ:۵۳۵)

**ترجمہ** باب، سفر میں ظہر کی نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھنے کا بیان۔ حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سفر میں تھے کہ مؤذن نے اذان کا ارادہ کیا، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ابھی ٹھنڈے وقت کا انتظار کرو، پھر (کچھ دیر کے بعد) موذن نے اذان کا ارادہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ ابھی ٹھنڈے وقت کا انتظار کرو، یہاں تک ہم نے ٹیلوں کا سایہ زمین پر دیکھا، پھر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ گرمی کی شدت جہنم کی حرارت کے انتشار سے ہوتی ہے، اس لیے جب گرمی سخت ہو تو نماز ٹھنڈے وقت میں پڑھو۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ "یتفیؤ" کا ترجمہ "یتمیّل" ہے یعنی ان کے سائے جھک جاتے ہیں۔

**مقصد ترجمہ** بخاری یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ گرمی کی شدت کے وقت تاخیر کے حکم اور ابراد یعنی ٹھنڈے وقت کا انتظار سفر وحضر دونوں میں برابر ہے، کیوں کہ جب مدار فیح جہنم ہے تو یہی حکم رہے گا، امام بخاری دراصل اس ترجمہ میں یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ ابراد کے سلسلے میں امام شافعیؒ کی تاویل سے متفق نہیں ہیں، امام ترمذی نے اس تاویل کو نقل کیا ہے، مگر امام ترمذی بھی اس سے متفق نہیں ہیں، بلکہ انھوں نے اپنی عادت کے خلاف اس موقع پر امام شافعیؒ کی تاویل کو نقل کرکے اس کو قبول کرنے سے انکار کردیا ہے، اور شاید یہی وہ موقع ہے جہاں انھوں نے اپنے امام کا نام صراحت سے ذکر کرکے اس کے خلاف دوسرے موقف کو ترجیح دی ہے، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت: "اذا اشتد الحر فابردوا عن الصلٰوة فان شدة الحر من فيح جهنم" پر انھوں نے "ماجاء فی تاخیر الظهر فی شدة الحر" کا عنوان لگایا، پھر روایت کے مطابق گرمی کی شدت کے موقع پر نماز ظہر موخر کرکے پڑھنے کا موقف اختیار کرنے والے فقہاء کا تذکرہ کیا، پھر اس کے بعد امام شافعیؒ کی تاویل نقل کی:

| | |
|---|---|
| وقال الشافعی انما الابراد بصلوٰة الظهر اذا كان مسجدا ينتاب اهله من البعد، فاما المصلی وحده والذی يصلی فی مسجد قومه فالذی احب له ان لايوخر الظهر فی شدة الحر . (ترمذی ص:۲۳/ ج:۱)۔ | اور امام شافعیؒ نے فرمایا کہ نماز ظہر کو ٹھنڈے وقت میں پڑھنے کی ہدایت صرف اس صورت میں ہے جب نمازیوں کو مسجد میں دور سے آنا پڑتا ہو، لیکن تنہا نماز پڑھنے والے اور اپنی قوم کی مسجد میں نماز پڑھنے والے کے بارے میں میں یہ پسند کرتا ہوں کہ وہ گرمی کی شدت میں بھی نماز کو موخر نہ کریں۔ |

امام شافعیؒ کی تاویل کا مطلب یہ ہے کہ گرمی کی شدت میں ظہر کی نماز کو موخر کرنے کا حکم عام نہیں ہے، بلکہ یہ صرف اس صورت میں ہے جب نمازیوں کو دشواری ہو اور انھیں دور سے مسجد میں آنا پڑتا ہو، منفرد کے لیے ہر صورت میں موخر نہ کرنا ہی افضل ہے، یا جماعت کے لیے اگر دور سے نہ آنا پڑتا ہو بلکہ مسجد قریب ہو، یا نماز پڑھنے والے ایک جگہ

مجتمع ہوں یا دور سے آنے کی صورت میں راستہ میں سایہ کا انتظام وغیرہ ہو تو تاخیر نہ کی جائے گی، بلکہ اول وقت نماز پڑھنا افضل ہوگا، مگر امام ترمذیؒ امام شافعیؒ کی اس تاویل سے متفق نہیں ہیں فرماتے ہیں:

| | |
|---|---|
| قال ابو عیسی معنی من ذهب الی تاخیر الظهر فی شدة الحر هو اولی واشبه بالاتباع واما ما ذهب الیه الشافعی ان الرخصة لمن ینتاب من البعد وللمشقة علی الناس فان فی حدیث ابی ذر ما یدل علی خلاف ما قال الشافعی، قال ابو ذر کنا مع النبی ﷺ فی سفر فاذن بلال بصلوة الظهر فقال النبی ﷺ یابلال ابرد ثم ابرد فلو کان الامر علی ماذهب الیه الشافعی لم یکن للابراد فی ذلک الوقت معنی لاجتماعهم فی السفر وکانوا لایحتاجون ان ینتابوا من البعد . (ترمذی ص:۲۳/ ج:۱) | ابو عیسیٰ (ترمذی) کہتے ہیں کہ گرمی کی شدت میں ظہر کو موخر کر کے پڑھنے کی رائے اختیار کرنے والوں کا مسلک زیادہ لائق اتباع ہے، رہی امام شافعی کی رائے کہ (تاخیر کی) رخصت دور سے آنے والے کے لیے ہے اور لوگوں کی مشقت کے سبب ہے تو حضرت ابوذرؓ کی روایت میں امام شافعیؒ کی رائے کے خلاف دلیل موجود ہے: حضرت ابوذر نے فرمایا کہ ہم لوگ سفر میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تھے کہ حضرت بلال نے ظہر کی اذان کا ارادہ کیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (دو مرتبہ)، بلال! ٹھنڈے وقت کا انتظار کرو، تو اگر بات وہ ہوتی جو امام شافعی کی رائے ہے تو اس وقت ٹھنڈے وقت کے انتظار کی کوئی ضرورت نہیں تھی، کیونکہ نمازی سفر کی وجہ سے جمع تھے اور انھیں نماز کے لئے دور سے چل کر آنے کی مجبوری نہیں تھی۔ |

امام شافعیؒ سے امام ترمذیؒ کے اختلاف کا خلاصہ یہ ہے کہ "ابردوا بالظهر" کے عام حکم کو امام شافعیؒ نے جو دور سے مسجد میں آنے والوں کے لیے خاص فرمایا ہے، حضرت ابوذرؓ کی روایت سے اس کی تائید نہیں بلکہ تردید ہوتی ہے، کیونکہ حضرت ابوذرؓ نے سفر کے دوران نماز ظہر کو موخر کر کے پڑھنے کا مضمون بیان کیا ہے اور سفر میں چونکہ تمام حضرات یکجا ہوتے ہیں انھیں دور سے آنا نہیں پڑتا، اس لیے حضرت ابوذر کی روایت سے امام شافعیؒ کی رائے کی تائید نہیں ہوتی۔

### امام ترمذیؒ کی رائے پر کرمانیؒ کا تبصرہ

مگر امام شافعیؒ کی رائے اتنی کمزور نہیں ہے کہ اس کو تقویت نہ دی جا سکے، کرمانی کہتے ہیں کہ امام ترمذی نے سفر میں سب نمازیوں کے یکجا ہونے کی بنیاد پر جو بات کہی ہے وہ محل نظر ہے، اگر مسافروں کی تعداد زیادہ ہو تو ان کا یکجا ہونا ضروری نہیں بلکہ چراگاہ کی تلاش، سایہ کی تلاش اور دیگر آسانیوں کی بنیاد پر ان کا مختلف ٹکڑوں میں تقسیم ہو جانا عام معمول ہے، پھر ابن حجر کہتے ہیں کہ اس زمانہ میں بڑے بڑے خیموں کو ساتھ رکھنے کا بھی رواج نہیں تھا، اس لیے سفر میں بھی انھیں یکجا ہونے میں دشواری تھی جو

دور سے آنے میں ہوتی ہے، اس لیے ابوذر کی روایت میں امام شافعیؒ کی تاویل کی صریح مخالفت نہیں ہے۔

یہ تو ایک ضمنی بحث تھی کہ امام ترمذی بھی امام شافعیؒ کی تاویل سے متفق نہیں ہیں، ورنہ اصل بات یہ تھی کہ امام بخاریؒ اس ترجمہ میں امام شافعیؒ کے مسلک پر تعریض کر رہے ہیں کہ ظہر کی نماز میں گرمی کی شدت کے موقع پر تاخیر کا حکم، سفر وحضر دونوں میں عام ہے اور اس میں کسی طرح کی تخصیص نہیں ہے۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** روایت میں آیا کہ حضرت بلالؓ نے اذان کا ارادہ کیا، ظاہر ہے کہ اذان کا ارادہ ظہر کا وقت داخل ہونے کے بعد کیا ہوگا، مگر حضور پاک ﷺ نے اذان سے روک دیا، پھر کچھ دیر کے بعد دوبارہ ارادہ کیا، مگر پھر منع فرمادیا یہاں تک کہ ٹیلوں کا سایہ زمین پر پڑنے لگا، تب اذان دی گئی اور نماز ظہر ادا کی گئی اس موقع پر آپ نے فرمایا کہ گرمی تیز ہو تو چونکہ یہ تیزی جہنم کی حرارت کے انتشار سے ہوتی ہے، اس لیے نماز کو مؤخر کر کے ٹھنڈے وقت میں پڑھنا چاہئے۔

اذان سے منع کرنے کی وجہ تو یہ تھی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عادت یہ تھی کہ وہ اذان سنتے ہی نماز کے لیے حاضر ہو جاتے تھے، اس لیے آپ نے حضرت بلالؓ کو منع کر دیا کہ تم اذان کہہ دوگے تو عادت کے مطابق سب آئیں گے اور اس وقت گرمی کی شدت کے سبب مشقت ہوگی، اس لیے جب وقت باقی ہے تو کیوں نہ ٹھنڈے وقت کا انتظار کرلیا جائے۔

امام بخاریؒ کا مدعا اس طرح ثابت ہے کہ جب سفر میں سب لوگ یکجا ہیں، کسی کو دور سے آنا نہیں ہے تو نماز کو اول وقت میں پڑھ لینے میں لوگوں کے جمع ہونے میں تو دشواری نہیں تھی، مگر آپ نے مؤخر کیا اور اس کا سبب بھی بیان فرمایا کہ جہنم کی حرارت کے انتشار کا وقت ہے، معلوم ہوا کہ ٹھنڈے وقت کا انتظار کا حکم سفر وحضر دونوں میں یکساں ہے اور ابراد حضر کے ساتھ مخصوص نہیں۔

"**حتی رأینا فیئ التلول**" یہاں تک کہ ہم نے ٹیلوں کا سایہ دیکھا، ٹیلے چونکہ پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، کھڑے نہیں ہوتے، اس لیے ان کا سایہ زوال کے بہت دیر کے بعد زمین پر نظر آتا ہے، حنفیہ تو اس کا مطلب یہ لیتے ہی ہیں کہ ٹیلوں کا سایہ مثل اول کا اکثر حصہ گزرنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے، لیکن شوافع کو بھی اس کے تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے، نووی شافعی لکھتے ہیں: "**ومعنی قوله رأینا فیئ التلول انه اخر تاخیرا کثیرا حتی صار للتلول فیئ والتلول منبطحة غیر منتصبة ولا یصیر لها فیئ فی العادة الا بعد زوال الشمس بکثیر**" (نووی بر مسلم ص:۲۲۴/ ج:۱)

"**حتی رأینا فیئ التلول**" کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے بہت زیادہ تاخیر فرمائی یہاں تک کہ ٹیلوں کا سایہ پڑنے لگا، ٹیلے چونکہ زمین پر پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، کھڑے نہیں ہوتے، اس لیے ان کا سایہ عادۃً زوال آفتاب کے بہت دیر کے بعد ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ روایت میں ٹیلوں کا سایہ نظر آنے ہی کی بات نہیں، بلکہ کتاب الاذان میں امام بخاری

نے حضرت ابوذر کی یہی روایت اس طرح ذکر کی ہے، کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال کو اذان دینے سے تین مرتبہ منع فرمایا ہے، اس کے بعد اذان کی جب اجازت دی تو اس روایت میں ''فی تلول'' کے بارے میں مذکور ہے: ''حتی ساوی الظل التلول'' (بخاری ص:۸۸/ج:۱) یعنی ٹیلوں کا سایہ ٹیلوں کے برابر ہو گیا تھا۔

جب سایہ مثل اول کے بالکل آخر میں ظاہر ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کو ٹیلوں کے برابر ہونے میں مزید تاخیر ہو گی اور مثل ثانی شروع ضرور ہو جائے گا، اس لیے روایت میں صراحت نہ سہی لیکن الفاظ سے صراحت کے قریب قریب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اس دن ظہر کی نماز مثل ثانی میں پڑھی گئی، اس لیے ان الفاظ سے حنفیہ نے امام اعظمؒ کے اس مسلک پر استدلال کیا ہے کہ ظہر کا وقت مثل اول کے بعد بھی باقی رہتا ہے۔ واللہ اعلم

''قال ابن عباس یتفیؤ یتمیل'' حدیث باب میں چونکہ ''فیء'' کا لفظ آیا ہے، اس لیے اس کی مناسبت سے قرآن کریم کی آیت میں آئے ہوئے لفظ ''یتفیؤ'' کے معنی بیان کرتے ہیں اور اس سے سایہ کو ''فیء'' کہنے کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے، قرآن کریم میں سورۂ نحل میں آیت ہے: ''اَلَمْ یَرَوْا اِلٰی مَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَیْءٍ یَتَفَیَّؤُ ظِلٰلُهٗ عَنِ الْیَمِیْنِ وَالشَّمَآئِلِ'' (سورۂ نحل آیت:۴۸) کیا انھوں نے خدا کی پیدا کی ہوئی ان چیزوں کو نہیں دیکھا جن کے سائے داہنی اور بائیں طرف جھکتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ ''یتفیؤ'' کے معنی ہیں کہ وہ سائے جھک جاتے ہیں، گویا سایہ کو ''فیء'' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک طرف سے دوسری طرف کو مائل ہوتا رہتا ہے۔

## [۱۱] بَابُ وَقْتِ الظُّهْرِ عِنْدَ الزَّوَالِ

### وَقَالَ جَابِرٌ كَانَ النَّبِیُّ ﷺ یُصَلِّی بِالْهَاجِرَةِ

(۵۴۰) حَدَّثَنَا اَبُو الْیَمَانِ قَالَ حَدَّثَنَا شُعَیْبٌ عَنِ الزُّهْرِیِّ قَالَ اَخْبَرَنِیْ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ خَرَجَ حِیْنَ زَاغَتِ الشَّمْسُ فَصَلَّی الظُّهْرَ فَقَامَ عَلَی الْمِنْبَرِ فَذَكَرَ السَّاعَةَ وَذَكَرَ اَنَّ فِیْهَا اُمُوْرًا عِظَامًا ثُمَّ قَالَ مَنْ اَحَبَّ اَنْ یَسْاَلَ عَنْ شَیْءٍ فَلْیَسْاَلْ فَلَا تَسْاَلُوْنِیْ عَنْ شَیْءٍ اِلَّا اَخْبَرْتُكُمْ مَادُمْتُ فِیْ مَقَامِیْ هٰذَا فَاَكْثَرَ النَّاسُ فِی الْبُكَاءِ وَاَكْثَرَ اَنْ یَّقُوْلَ سَلُوْنِیْ فَقَامَ عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ حُذَافَةَ السَّهْمِیُّ فَقَالَ مَنْ اَبِیْ قَالَ اَبُوْكَ حُذَافَةُ ثُمَّ اَكْثَرَ اَنْ یَّقُوْلَ سَلُوْنِیْ فَبَرَكَ عُمَرُ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُ عَلٰی رُكْبَتَیْهِ فَقَالَ رَضِیْنَا بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَبِیًّا فَسَكَتَ ثُمَّ قَالَ عُرِضَتْ عَلَیَّ الْجَنَّةُ وَالنَّارُ اٰنِفًا فِیْ عُرْضِ هٰذَا الْحَائِطِ فَلَمْ اَرَ كَالْخَیْرِ وَالشَّرِّ. (گذشتہ:۹۳)

(۵۴۱) حَدَّثَنَا حَفْصُ بْنُ عُمَرَ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ اَبِی الْمِنْهَالِ عَنْ اَبِی بَرْزَةَ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ ﷺ يُصَلِّی الصُّبْحَ وَاَحَدُنَا يَعْرِفُ جَلِيْسَهٗ وَيَقْرَأُ فِيْهَا مَابَيْنَ السِّتِّيْنَ اِلَى الْمِائَةِ وَ يُصَلِّی الظُّهْرَ اِذَا زَالَتِ الشَّمْسُ وَالْعَصْرَ وَاَحَدُنَا يَذْهَبُ اِلٰى اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ رَجَعَ وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ وَنَسِيْتُ مَاقَالَ فِی الْمَغْرِبِ وَلَا يُبَالِیْ بِتَاخِيْرِ الْعِشَاءِ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ ثُمَّ قَالَ اِلٰى شَطْرِ اللَّيْلِ وَقَالَ مُعَاذٌ قَالَ شُعْبَةُ ثُمَّ لَقِيْتُهٗ مَرَّةً فَقَالَ اَوْ ثُلُثِ اللَّيْلِ.

(آئندہ: ۵۴۷، ۵۶۸، ۵۹۹، ۷۷۱)

(۵۴۲) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللّٰهِ قَالَ حَدَّثَنَا خَالِدُ بْنُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ قَالَ حَدَّثَنِیْ غَالِبُ الْقَطَّانُ عَنْ بَكْرِ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ الْمُزَنِیِّ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كُنَّا اِذَا صَلَّيْنَا خَلْفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ بِالظَّهَائِرِ سَجَدْنَا عَلٰى ثِيَابِنَا اِتِّقَاءَ الْحَرِّ. (گذشتہ: ۳۸۵)

**ترجمہ** باب، وقت ظہر کے زوال کے بعد شروع ہونے کا بیان۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز دوپہر کی گرمی میں پڑھتے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ (ایک دن) رسول اللہ ﷺ آفتاب ڈھلنے کے وقت باہر تشریف لائے اور ظہر کی نماز پڑھائی پھر آپ منبر پر کھڑے ہوئے اور قیامت کا ذکر فرمایا اور یہ فرمایا کہ اس میں بہت بڑی اور اہم چیزیں پیش آئیں گی، پھر فرمایا کہ جسے کسی بھی چیز کے بارے مین پوچھنا ہو پوچھ لے، اس لیے کہ تم مجھ سے کسی چیز کے بارے میں نہیں پوچھو گے مگر یہ کہ میں جب تک اس جگہ ہوں اس وقت تک ہر بات کی اطلاع دوں گا، چنانچہ (آپ کے فرمانے کے بعد) لوگوں پر بہت زیادہ گریہ طاری ہوگیا اور آپ بار بار یہ فرماتے رہے کہ تم مجھ سے (جو چاہے) سوال کرو، چنانچہ عبداللہ بن حذافہ کھڑے ہوئے اور پوچھا میرے باپ کون ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ تمہارے باپ حذافہ ہیں، پھر آپ نے بار بار فرمایا کہ پوچھو پوچھو تو حضرت عمرؓ نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عرض کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے پروردگار ہونے سے راضی ہیں اور اسلام کے دین ہونے سے اور محمد ﷺ کے پیغمبر ہونے سے راضی ہیں، اس پر آپ خاموش ہوئے، پھر فرمایا کہ اس دیوار کے کونے میں ابھی جنت اور جہنم میرے سامنے پیش کی گئیں، تو میں نے (جنت کی طرح) بہتر اور (جہنم کی طرح) بدتر کوئی چیز نہیں دیکھی۔ حضرت ابو برزہ اسلمی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ ہم میں سے کوئی اپنے برابر میں بیٹھے ہوئے انسان کو پہچان لیتا تھا اور آپ اس میں ساٹھ سے لے کر سو تک آیتیں پڑھتے تھے اور ظہر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے جب آفتاب زوال کی طرف مائل ہو جاتا تھا اور عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ ہم میں سے کوئی مدینہ کے آخری کنارے تک چلا جاتا تھا، یعنی گھر لوٹ جاتا تھا اور آفتاب میں اس وقت تک کوئی تغیر نہ ہوتا تھا، راوی نے (ابوالمنہال نے) کہا کہ مغرب کے بارے میں میں بھول گیا کہ حضرت ابو برزہؓ نے کیا کہا تھا اور آپ عشاء کی نماز کو ایک تہائی رات تک موخر کرنے میں کوئی پرواہ نہیں کرتے تھے، پھر ابوالمنہال نے کہا کہ نصف

رات تک موخر کرنے میں پرواہ نہیں کرتے تھے، معاذ بن معاذ بصری نے کہا کہ شعبہ نے کہا کہ پھر ابوالمنہال سے ملا تو انھوں نے کہا تہائی رات تک موخر کرنے میں پرواہ نہ کرتے تھے۔ حضرت انسؓ بن مالک سے روایت ہے کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کے پیچھے دوپہروں میں نماز پڑھا کرتے تھے تو گرمی سے بچنے کے لیے اپنے کپڑوں پر سجدہ کرتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** پچھلے باب میں یہ بیان کیا گیا کہ گرمی کی شدت ہو تو ظہر کی نماز کو ٹھنڈے وقت میں پڑھنا چاہئے اور اس کی اتنی اہمیت مذکور ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے ابراد سے پہلے حضرت بلالؓ کو اذان سے بھی روک دیا، اس لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ظہر کا وقت کب سے شروع ہوتا ہے؟ آیا گرمیوں میں یہ ابراد کے قریب سے شروع ہوگا یا ابراد کا حکم وقت مستحب کی تعلیم کے لیے تھا؟ امام بخاریؒ نے اس باب میں یہ واضح کردیا کہ ظہر کا وقت ہر موسم میں زوال کے بعد شروع ہوجاتا ہے، زوال کے بعد سے ظہر کے وقت کے شروع ہونے پر سب کا اتفاق ہے اور جمعہ کا وقت بھی جمہور کے یہاں یہی ہے، البتہ بعض فقہاء نے جمعہ کے زوال سے پہلے ادا کرنے کی گنجائش سمجھی ہے، وہ مسئلہ اپنی جگہ آئے گا، نیز ظہر کے آخر وقت کے سلسلہ میں بھی امام اعظمؒ کا اختلاف ہے اور اس کی وضاحت اسی باب کے تحت کی جائے گی۔

**قال جابر الخ .** حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز ہاجرہ میں پڑھتے تھے، ہاجرہ دوپہر کے وقت کو کہتے ہیں جس میں لوگ گرمی کی شدت کے سبب راستہ چلنا چھوڑ دیتے ہیں۔ اس اثر سے معلوم ہوا کہ ظہر کی نماز دوپہر میں گرمی کی شدت کے وقت ہوتی تھی، پھر اس باب کے تحت جو روایتیں دی گئی ہیں ان میں ''اذا زاغت الشمس'' وغیرہ کے الفاظ آئے ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہر کی نماز زوال کے فوراً بعد پڑھی گئی، تیسری روایت سے معلوم ہوا کہ ظہر کی نماز میں گرمی کی اتنی شدت ہوتی تھی کہ اس سے بچنے کے لیے کپڑے پر سجدہ کیا جاتا تھا، اس لیے امام بخاری کا مدعا ثابت ہوگیا کہ ظہر کا وقت زوال کے بعد سے شروع ہوجاتا ہے، نیز چونکہ کسی روایت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ظہر کی نماز زوال سے پہلے پڑھی گئی ہو، اس لیے متعین ہوگیا کہ ظہر کا وقت زوال کے بعد ہی سے شروع ہوگا اور اس وقت میں مسجد نبوی میں نماز ظہر پڑھی گئی۔

البتہ اس باب کے اور پچھلے باب کے مضمون اور روایتوں میں تضاد ہے، کیوں کہ پچھلے باب میں ظہر کی نماز کو موخر کرکے اور ٹھنڈے وقت میں پڑھنے کا بیان تھا اور اس باب میں یہ مضمون ہے کہ ظہر کی نماز زوال آفتاب کے فوراً بعد پڑھی گئی، اس تضاد کے بارے میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں، علامہ عینیؒ کہتے ہیں کہ ظہر کی نماز کو اول وقت میں پڑھنے کی روایت صرف فعلی ہے کہ ایسا کیا گیا جب کہ موخر کرکے پڑھنے والی روایت فعلی بھی ہے اور قولی بھی، یعنی ایسا کیا بھی گیا اور آپ نے ٹھنڈے وقت میں پڑھنے کی تاکید بھی فرمائی، اس لیے ابراد والی روایت کو ترجیح دی جائے گی، اس سلسلہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اول وقت میں ظہر ادا کرنے کی روایتیں زمانہ کے اعتبار سے مقدم ہیں، اور تاخیر کرکے ادا کرنے کی روایتیں بعد کی ہیں، اس لیے بعد والی روایتوں کو ترجیح دی جائے گی، مگر ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ نماز کے لیے اوقات کے تعین کا معاملہ

واقعۃً اتنا نازک تھا کہ ایک دو مرتبہ عمل کر کے دکھلانے سے اس کا ذہن نشین ہونا مشکل تھا، اس لیے ایک عرصہ تک مسجد نبوی میں ظہر کی نماز اول وقت میں پڑھنے کا اہتمام کیا گیا اور جب یہ بات ذہن نشین ہوگئی تو گرمی کے موسم میں وقت مستحب کی رعایت کا سلیقہ سکھایا گیا، پھر یہ کہ عہد رسالت میں مدینہ طیبہ میں مختلف محلوں میں جو مسجدیں تعمیر ہوگئی تھیں، ان سب میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نمازیں مسجد نبوی کے بعد ادا کی جاتی تھیں، مسجد نبوی میں حصول برکت کے لیے مختلف محلوں سے صحابہ کرام آ کر شریک جماعت ہوتے تھے اور وہ آپس میں جا کر اپنے محلوں میں اطلاع کرتے تھے کہ ہم نماز پڑھ کر آئے ہیں، اب تم بھی نماز پڑھ لو، گویا مسجد نبوی کی حیثیت اس زمانہ میں اوقات کی تعلیم وتعین کے سلسلہ میں امام المساجد کی تھی، اس لیے مسجد نبوی میں نمازیں اوّل وقت میں پڑھی جاتی تھیں، پھر جب اوقات ذہن نشین ہوگئے تو نوعیت بدل گئی، اب خواہ نمازوں کے اول وقت میں ادا کرنے پر استدلال کرلیں جیسا کہ شوافع کا رجحان ہے اور خواہ اوسط وقت میں نمازیں ادا کرنے پر استدلال کرلیا جائے جیسا کہ احناف کہتے ہیں، ہر وقت کے سلسلہ میں مستحب اوقات کی تفصیلات اپنی اپنی جگہ آئیں گی۔

**تشریح حدیث اول** اس باب کے تحت امام بخاری نے تین روایات ذکر کی ہیں، پہلی روایت قدرے اختصار کے ساتھ حدیث نمبر ۹۳ پر "باب من برك علي ركبتيه الخ" میں گذر چکی ہے، روایت میں "خرج حين زاغت الشمس فصلي الظهر" مذکور ہے کہ زوال آفتاب کے فوراً بعد آپ نکلے اور ظہر کی نماز پڑھائی، امام بخاری کا مقصد اسی سے متعلق ہے کہ ظہر کی نماز کا وقت زوال آفتاب ہی سے شروع ہوجاتا ہے کیوں کہ روایت میں زاغ کا لفظ آیا ہے، جس کے معنی ہیں ترچھا ہونا، یعنی جوں ہی آفتاب مغرب کی طرف مائل ہوا ظہر کی نماز پڑھ لی گئی، لیکن دوسری روایت میں لفظ ہے زالت، زوال کے معنی ہیں آفتاب کا ڈھلنا، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ظہر کی نماز، زوال کے فوراً بعد نہیں بلکہ دوپہر میں آفتاب ڈھلنے کے بعد پڑھی جاتی تھی۔

پھر روایت میں آیا کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز پڑھانے کے بعد منبر پر تشریف لے گئے اور وعظ فرمایا، جس میں قیامت کے ہولناک حالات بیان فرمائے، پھر آپ نے فرمایا کہ آج جو پوچھنا ہو پوچھ لو، میں جب تک منبر پر کھڑا ہوں، ہر بات کا جواب دوں گا، پہلے گذر چکا ہے: "سئل النبي ﷺ عن اشياء كرهها" کہ حضور پاک ﷺ سے ایسی باتوں کا سوال کیا گیا جو آپ کو گراں گذرا، اصل بات یہ تھی کہ منافقین اس طرح کے سوالات کیا کرتے تھے، اور کبھی کبھی تو بھولے بھالے اہل ایمان بھی ان کے ساتھ شریک ہوجاتے تھے، گویا جب ناپسندیدہ سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو آپ نے غصہ میں فرمایا کہ اچھا آج جو پوچھنا ہو پوچھ لو، چونکہ آپ یہ بات غصہ کی حالت میں فرمارہے تھے اس لیے خاموشی طاری رہی، مگر "اكثر ان يقول سلوني" آپ بار بار ارشاد فرماتے رہے کہ پوچھو، چنانچہ حضرت عبداللہ بن حذافہ جنھیں کچھ لوگ نسب کے بارے میں متہم کرتے تھے، کھڑے ہوئے اور پوچھا من ابی؟ کہ حضرت یہ ارشاد فرمایئے کہ میرے باپ کا کیا نام ہے؟ آپ نے فرمایا حذافہ، چنانچہ آپ کے ارشاد فرمانے کے بعد نسب کے سلسلہ میں

طعنے دینے کا سلسلہ بند ہوگیا، دیگر روایتوں میں آتا ہے کہ ان کی والدہ نے، ان کے سوال پر بہت سرزنش کی، "قالت ام عبداللّٰہ بن حذافة ما سمعت بابن قط اعقَّ منك أ أمنت ان تكون امك قد قارفت بعض ماتقارف نساء اهل الجاهلية" (مسلم شریف ص:۲۶۳/ ج:۲) عبداللہ بن حذافہ کی والدہ نے کہا کہ میں نے تجھ جیسا نافرمان لڑکا نہیں دیکھا، تجھے کیا یقین تھا کہ تیری ماں نے جاہلیت کی عورتوں کی طرح کوئی غلطی نہیں کی تھی؟

والدہ کا منشا یہ رہا ہوگا کہ تم نے پیغمبر علیہ السلام سے بھرے مجمع میں یہ سوال کرلیا، اگر آپ کی زبان پر کسی اور کا نام آجاتا تو کتنی رسوائی کی بات ہوتی، تم نے مجمع عام میں ایسی بات پوچھ کر بڑی نادانی کا ثبوت دیا، حضرت عبداللہ نے جواب دیا "واللّٰه لو الحقني بعبدٍ اسود للحقته" کہ بخدا اگر آپ میرا نسب کسی کالے غلام سے ملادیتے تو میں اس کو قبول کرلیتا۔

پھر جب آپ کا غصہ بڑھنے لگا تو حضرت عمرؓ نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر "رضينا بالله ربا الخ" کہنا شروع کیا تو آپ خاموش ہوئے، پھر آپ نے فرمایا کہ ابھی جنت ودوزخ اس دیوار کے گوشہ میں میرے سامنے پیش کی گئی تھیں اور جنت جیسا بہتر اور جہنم جیسا بدتر منظر میں نے نہیں دیکھا۔

**علم غیب پر استدلال کی حقیقت** روایت میں "لا تسألوني عن شئي الا اخبرتكم مادمت في مقامي هذا" یعنی میں جب تک اس جگہ ہوں تمہاری ہر بات کا جواب دوں گا، مذکور ہے، اس سے علم غیب پر استدلال درست نہیں۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ آپ خود فرمارہے ہیں "مادمت في مقامي هذا" کہ جب تک کہ میں اپنی اس جگہ پر ہوں اس وقت تک ہر سوال کا جواب دوں گا، اس کا مطلب بظاہر یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس وقت خصوصی طور پر یہ کیفیت طاری فرمائی ہے اور اس کیفیت کے بعد میں باقی رہنے پر کوئی دلیل قائم نہیں، بلکہ "مادمت فی مقامی ہذا" کا تقاضہ ہے کہ اس جگہ سے ہٹنے کے بعد یہ کیفیت باقی نہ رہے، مزید یہ کہ روایت میں اس کیفیت کے وقتی ہونے اور دائمی نہ ہونے کا یہ قرینہ بھی مذکور ہے کہ جنت اور جہنم پیش کی گئی ہیں اور ظاہر ہے کہ جنت اور جہنم کا پیش کیا جانا ایک ہنگامی چیز تھی، دائمی نہ تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ روایت میں حاضرین کی طرف سے کئے گئے سوالات کے جوابات دینے کا وعدہ کیا گیا ہے اس لیے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ جہاں تک سائلین کی ذہنی پرواز ہوسکتی ہے اتنے علوم مرحمت فرمائے گئے اور ظاہر ہے کہ سائلین کا علم محدود ہے اس کا علم غیب سے کیا تعلق؟

تیسری بات یہ کہ علم غیب کے صرف باری تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہونے پر قطعی دلائل قائم ہیں۔ ارشاد فرمایا گیا: "قُلْ لَا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ" (سورۃ النمل آیت ۶۵) آپ فرمادیجئے کہ اللہ کے سوا زمین وآسمان میں کوئی بھی (مخلوق میں سے) غیب کی بات نہیں جانتا، اس لیے کسی روایت میں کسی لفظ کے

عموم یا کسی تعبیر کے اجمال سے غیر اللہ کے علم غیب پر استدلال نہیں کیا جائے گا، بلکہ ان کی مراد اس طرح متعین کی جائے گی کہ قطعیات اور مسلمات سے تعارض نہ ہو۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث دوم** دوسری روایت میں حضرت ابو برزہؓ اسلمی سے یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ فجر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ اپنے پاس بیٹھا ہوا انسان شناخت میں آجاتا تھا، ظاہر ہے کہ یہ غلس کی شان نہیں ہے، مسجد نبوی کی نیچی چھت اور کسی جانب سے روشنی آنے کا انتظام نہیں، لیکن نماز کے بعد برابر والے انسان کو پہچان لیا جاتا تھا تو ظاہر ہے کہ باہر کتنی روشنی ہو جاتی ہوگی، لیکن یہ مسئلہ بعد میں آئے گا، یہاں تو امام بخاری کا مقصد ظہر سے متعلق ہے جس کے بارے میں آیا کہ ظہر کی نماز زوال آفتاب کے بعد ہو جاتی تھی، زوال کے معنی ہیں آفتاب کا ڈھلنا، جونہی آفتاب ڈھلا، ظہر کی نماز ہوگئی، یہاں سردی اور گرمی کے موسم کا فرق بھی مذکور نہیں، لیکن بات وہی ہے، جو اوپر ذکر کی گئی کہ اوقات کا معاملہ نازک اور اہم ہے، مسجد نبوی میں عرصہ تک اول وقت میں نماز ہوتی رہی، جب اوقات ذہن نشین ہو گئے تو گرمی کے موسم میں ابراد کا حکم دیا گیا۔

پھر عصر کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایسے وقت ہوتی تھی کہ ہم میں سے کوئی بھی عصر کی نماز پڑھ کر اپنے گھر مدینہ کے آخری کنارے پر ایسے وقت میں پہنچ جاتا تھا کہ ابھی افتاب زندہ ہوتا تھا، آفتاب کی زندگی کے معنی ہیں، اس میں تغیر نہ آیا ہو یعنی اس میں تیزی اور سفیدی باقی ہو، مسجد نبوی سے اقصائے مدینہ کا فاصلہ چار میل تک بیان کیا گیا ہے اور یہ فاصلہ مثل ثالث میں نماز پڑھ کر بہ آسانی طے کیا جا سکتا ہے، مسئلہ اپنی جگہ آئے گا۔

پھر راوی نے کہا کہ مجھے یاد نہیں رہا کہ مغرب کے بارے میں کیا کہا تھا، پھر عشاء کے بارے میں بتلایا کہ اس کی پرواہ نہیں کی جاتی تھی کہ عشاء کی نماز ایک تہائی رات کے بعد پڑھی جائے، یا نصف لیل پر پڑھی جائے، یہ سب مباحث اپنی جگہ تفصیل سے آئیں گے۔

**تشریح حدیث سوم** تیسری روایت میں حضرت انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ظہر کی نماز پڑھتے تھے تو گرمی کی اتنی شدت ہوتی تھی کہ ہمیں زمین پر سجدہ کرنے کے لیے کپڑا بچھانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ اس روایت میں یہ وضاحت نہیں ہے کہ نماز ظہر زوال کے بعد ہوتی تھی، کیونکہ اس میں ظهيرة کا لفظ آیا ہے جس کے معنی نصف النہار کے ہیں، گویا اسی لفظ سے زوال کے بعد کا وقت مراد ہونا ضروری نہیں، پھر یہ کہ یہاں اس سے مراد وقت نہیں لیا گیا بلکہ ظہر کی نماز لی گئی ہے، یعنی جب ہم ظہر کی نماز پڑھتے تو گرمی کی شدت ہوتی تھی، اس لیے یہ حقیقت ہے کہ بیان وقت کے سلسلے میں روایت مبہم ہے، جب کہ امام بخاری کا مقصد اس ترجمہ سے ظہر کے اول وقت کا بیان ہے کہ وہ زوال کے فوراً بعد شروع ہو جاتا ہے، چنانچہ علامہ عینیؒ نے تو یہ فرمایا کہ اس روایت کی ترجمۃ الباب سے مطابقت اس طرح ہے کہ صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جو ظہر کی نماز پڑھتے تھے، اس میں گرمی کی

شدت ہوتی تھی، اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ نماز اوّل وقت میں ہوتی تھی، اس لیے کہ یہی وقت گرمی کی شدت کا ہوتا ہے، لیکن اس کے علاوہ امام بخاری کے ذوق کے مطابق یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے وقت کے سلسلہ میں یہ مبہم روایت ذکر کرکے یہ وضاحت کی ہے کہ اس ابہام کو بھی ترجمۃ الباب اور اس کے تحت ذکر کردہ دیگر روایات کے مطابق زوال آفتاب کے بعد پر محمول کیا جائے۔ واللہ اعلم

## [۱۲] بَابُ تَاخِيْرِ الظُّهْرِ اِلَى الْعَصْرِ

(۵۴۳) حَدَّثَنا اَبُوْ النُّعْمَان قَالَ حَدَّثَنَا حَمَّادُ بْنُ زَيْدٍ عَنْ عَمْرِوبْنِ دِيْنَارٍ عَنْ جَابِرِ بْنِ زَيْدٍ عَنْ ابنِ عَبَّاسٍ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَلّٰى بِالْمَدِيْنَةِ سَبْعاً وَثَمَانِياً الظُّهْرَ وَالْعَصْرَ وَالْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ فَقَالَ اَيُّوْبُ لَعَلَّهُ فِيْ لَيْلَةٍ مَطِيْرَةٍ قَالَ عَسىٰ. (آئندہ:۵۶۲، ۱۱۷۴)

**ترجمہ** باب، ظہر کی نماز کو عصر تک موخر کرنے کا بیان۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں رہتے ہوئے نماز کی سات رکعتیں اور آٹھ رکعتیں پڑھیں یعنی ظہر اور عصر کو ملا کر آٹھ رکعت اور مغرب اور عشاء کو ملا کر سات رکعت، ایوب سختیانی نے جابر بن زید سے پوچھا کہ شاید بارش کی رات میں ایسا کیا گیا ہوگا، تو انھوں نے فرمایا ہوسکتا ہے۔

**مقصد ترجمہ** عنوان ہے ظہر کی نماز کو عصر تک موخر کرنا، مقصد ہے ظہر کے منتہائے وقت کا بیان، پچھلے باب میں ظہر کا ابتدائی وقت بیان کیا گیا تھا کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام نے ہمیشہ ظہر کی نماز زوال آفتاب کے بعد پڑھی ہے، زوال سے پہلے کبھی نہیں پڑھی، اس لیے یہ بات ثابت ہوگئی کہ ظہر کا وقت زوال کے بعد ہے، اب سوال یہ ہے کہ ظہر کا وقت ختم کب ہوگا تو امام بخاری نے اس باب میں بتلایا کہ ختم ہوگا عصر کے وقت، یعنی ظہر کا منتہا اور عصر کا مبدا ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں، گویا امام بخاریؒ نے یہ بتلا دیا کہ ظہر اور عصر کے درمیان نہ کوئی وقت مہمل ہے اور نہ مشترک، امام مالکؒ نے ظہر اور عصر کے درمیان چار رکعت کی ادائیگی کے بقدر وقت کو مشترک قرار دیا ہے، اور امام ابو حنیفہؒ سے اسد بن عمرو کی روایت کا مطلب بعض حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ مثل ثانی کا وقت مہمل ہے، امام بخاریؒ اس ترجمہ میں ان دونوں باتوں کی تردید کررہے ہیں کہ ظہر کے آخری وقت کے فوراً بعد، عصر کا وقت شروع ہوجاتا ہے۔

**تشریح حدیث** اس مقصد کو ثابت کرنے کے لیے امام بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت ذکر کی ہے، جس میں فرمایا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ طیبہ میں رہتے ہوئے ظہر اور عصر اور مغرب وعشاء کی نمازوں کو جمع فرمایا، امام بخاری کا مدعا یہ ہے کہ جمع کرنے کا طریقہ یہ ہوا کہ ظہر کی نماز کو ظہر کے وقت کے بالکل آخر میں اور عصر کی نماز کو عصر کے بالکل ابتدائی وقت میں اس طرح پڑھا کہ دونوں نمازیں جمع ہوگئیں، اسی طرح مغرب کی نماز

کو مغرب کے آخری وقت میں اور عشاء کی نماز کو عشاء کے ابتدائی وقت میں صورۃً جمع کر دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ظہر اور عصر کے درمیان اور مغرب اور عشاء کے درمیان نہ کوئی وقت مشترک ہے نہ مہمل، امام بخاری اس روایت کا یہ مطلب اس لیے سمجھ رہے ہیں کہ یہ عمل مدینہ میں ہوا اور ایسے حالات میں ہوا کہ جمع حقیقی کی رخصت والا کوئی عذر موجود نہ تھا، نہ سفر تھا نہ خوف تھا اور نہ کوئی عذر ایسا تھا جو کسی امام کے یہاں قابل قبول ہو، حنفیہ کے یہاں تو ایام حج میں جمع کرنے کے علاوہ کسی اور موقع پر گنجائش ہی نہیں ہے، اس لیے امام بخاریؒ کا مقصد ثابت ہو گیا کہ جب جمع حقیقی نہ تھی، صرف جمع صوری کا معاملہ تھا تو ظہر بالکل آخری وقت میں ہوئی اور عصر بالکل ابتدائی وقت میں، کیونکہ بغیر عذر کے جمع حقیقی ائمہ اربعہ میں سے کسی کے یہاں درست نہیں ہے۔

**حدیث باب پر امام ترمذی کا تبصرہ** بلکہ امام ترمذیؒ نے تو حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ میری اس کتاب (ترمذی) کی تمام روایتیں معمول بہا ہیں یعنی ان کے مطابق کسی نہ کسی فقیہ کا عمل ہے، مگر پوری کتاب میں دو روایتیں ایسی ہیں جن پر کسی کا عمل نہیں ہے، ایک حضرت ابن عباسؓ کی وہ روایت جس میں یہ آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں قیام کے دوران کسی خوف، بارش اور سفر کے عذر کے بغیر ظہر اور عصر کو اور مغرب وعشاء کی نمازوں کو جمع کر کے پڑھا اور دوسری وہ روایت ہے کہ شراب پینے والوں کو کوڑوں کی سزا دی جائے اور چوتھی مرتبہ شراب پینے پر قتل کی سزا دی جائے۔ (ترمذی شریف، کتاب العلل ص:۲۳۵/ ج:۲)

مگر امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت ابن عباسؓ کی روایت پر بھی عمل ہے اور اس کا مطلب ہے محض صورۃً جمع کر کے پڑھنا، ترمذی نے چونکہ روایت کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ عذر کے بغیر جمع حقیقی کی گئی ہے، اس لیے انھیں یہ کہنا پڑا کہ اس روایت پر کسی کا عمل نہیں ہے۔

**حضرت شاہ ولی اللہ کا ارشاد** حضرت شاہ ولی اللہ قدس سرہ نے تو مقصد ترجمہ ہی یہ قرار دیا ہے کہ امام بخاری ترجمۃ الباب میں حضرت ابن عباس کی روایت کے معنی متعین کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے مدینہ میں جو دو نمازوں کو جمع کیا ہے، اس سے جمع حقیقی مراد نہیں بلکہ صرف صورۃً جمع کرنا مراد ہے کہ ظہر کو بالکل وقت کے آخر میں عصر کے قریب ادا کیا جائے اور عصر کی نماز کو عصر کے بالکل ابتدائی وقت میں پڑھا جائے۔ اس طرح دونوں نمازیں صرف ظاہر اور صورت میں جمع ہوں گی۔ (تراجم ابواب ص:۲۲)

**امام بخاری کے معین کردہ معنی کے وجوہ ترجیح** امام بخاری نے حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے جو معنی متعین کئے ہیں وہ محض ان کا ذوق نہیں ہے، بلکہ ابن عباس کے شاگرد ابو الشعثاء نے بھی یہی معنی بیان کئے ہیں، کیونکہ عمرو بن دینار نے اس روایت کے بارے میں ابو الشعثاء سے پوچھا: "اظنه اخر الظهر وعجل العصر واخر المغرب وعجل العشاء قال وانا اظنه" (فتح الباری ص:۱۶۴/ ج:۲)

میں گمان کرتا ہوں کہ ظہر کو آخری وقت میں اور عصر کو ابتدائی وقت میں اور مغرب کو آخری وقت میں اور عشاء کو ابتدائی وقت میں پڑھا، تو ابوالشعثاء نے کہا کہ میں بھی یہی سمجھتا ہوں۔

اور اس سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ نسائی شریف میں اسی روایت میں حضرت ابن عباس سے صراحت کے ساتھ یہ تعبیر موجود ہے: ''عن ابن عباس قال صلیت مع النبی ﷺ بالمدینة ثمانیا جمیعا وسبعا جمیعاً اخر الظهر وعجل العصر واخر المغرب وعجل العشاء'' (نسائی ص:۹۸/ ج:۱)

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ میں ایک ساتھ آٹھ رکعتیں اور ایک ساتھ سات رکعتیں پڑھیں، آپ نے ظہر کی نماز کو آخری وقت میں اور عصر کی نماز کو ابتدائی وقت میں، اور مغرب کی نماز کو آخری وقت میں اور عشاء کی نماز کو ابتدائی وقت میں پڑھا۔

خلاصہ یہ ہے کہ دو نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کے لئے روایات میں دو تعبیریں آتی ہیں: ایک '' جمع بینهما '' اور دوسرے '' اخر و عجل '' حنفیہ نے تو دونوں تعبیروں کے معنی ایک ہی لیے ہیں کہ صورۃً جمع کیا گیا، کیونکہ اصولی طور پر یہ بات متعین ہے کہ نمازوں کو ان کے مقررہ اوقات میں پڑھنا فرض ہے ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَاباً مَّوْقُوْتاً '' لیکن جن فقہاء کے یہاں عذر کی بنیاد پر نمازوں کو جمع کرنے کی گنجائش ہے ان کے یہاں '' جمع بینهما '' کی تعبیر سے تو جمع حقیقی مراد لیا گیا ہے، لیکن '' اخر و عجل '' کی تعبیر سب کے یہاں جمع صوری پر محمول ہے، اس لیے جب حضرت ابن عباس کی روایت میں، خود حضرت ابن عباس سے عجل واخر کے الفاظ ثابت ہیں، تو امام بخاری کا یہ فرمانا بالکل درست ہے کہ مدینہ طیبہ میں قیام کے دوران جو ظہر اور عصر کی آٹھ رکعتیں ایک ساتھ پڑھی گئیں وہاں صرف صورۃً جمع کرنا مراد ہے۔

## ابن عباسؓ کی ایک اور وضاحت

البتہ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے کہ حضرت ابن عباسؓ سے اسی روایت کے مطابق جمع کرنے کے بارے میں پوچھا گیا کہ ایسا کیوں کیا گیا؟

تو انھوں نے فرمایا ''لئلا یکون علی امته حرج'' (نسائی ص:۹۹/ ج:۱)

یہ بات ترمذی اور دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے، مطلب یہ ہوا کہ دونوں نمازوں کو ایک ساتھ پڑھنے کی اجازت اس لیے دی گئی تا کہ امت کو آسانی ہو اور وہ تنگی میں مبتلا نہ ہو، ابن عباس کی اس وضاحت کے معنی بہ ظاہر یہ ہیں کہ امت کو اس معاملہ میں توسع دیا گیا ہے کہ ضرورت ہو تو دونوں نمازوں کو جمع کر لے، لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ تنگی ختم کرنے اور آسانی دینے کے معنی جمع حقیقی کی اجازت نہیں، بلکہ ابن عباسؓ کا منشا یہ ہے کہ اگر ضرورت ہو اور مجبوری کی بنیاد پر نمازوں کو اپنے اپنے مستحب اوقات میں پڑھنے میں دشواری ہو، تو شریعت اس موقع پر یہ سہولت دیتی ہے کہ ایک نماز کو بالکل آخری وقت تک موخر کر دیں اور دوسری نماز کو بالکل ابتدائی وقت میں پڑھ لیں، تا کہ آسانی پیدا ہو جائے، گو یا دفع

حرج کے معنی مطلقاً ہر طرح کے حرج کی نفی نہیں، بلکہ خاص نوع کی نفی ہے۔

**ظہر کے آخری وقت کا مسئلہ** امام بخاریؒ کے تراجم سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ظہر کا وقت زوال آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور یہ بھی واضح ہوگیا کہ ظہر کا وقت عصر تک ممتد رہتا ہے، درمیان میں کوئی وقت مشترک یا مہمل نہیں ہے، لیکن ان ابواب سے یہ بات واضح نہیں ہوئی کہ ظہر کا آخری وقت کیا ہے؟ اسی طرح اس سے اگلا باب آ رہا ہے "باب وقت العصر "اور اس کے تحت امام بخاری نے متعدد روایتیں ذکر کی ہیں، مگر کسی روایت سے بھی ظہر کے آخری وقت اور عصر کے ابتدائی وقت کی پوری طرح وضاحت نہیں ہوتی۔

ظہر کے وقت سے متعلق ابواب ختم ہو رہے ہیں، اس لیے اختصار کے ساتھ اس سلسلہ میں یہ بیان کر دینا مناسب ہے کہ ظہر کے وقت کی ابتداء میں تو سب کا اتفاق ہے کہ وہ زوال سے شروع ہوتا ہے، البتہ اختتام کے سلسلے میں جمہور کی رائے یہ ہے کہ وہ ایک مثل تک ہے، نیز امام مالکؒ کے نزدیک مثل ثانی کی ابتداء میں چار رکعت کے بقدر وقت ظہر وعصر کے درمیان مشترک ہے، لیکن امام اعظمؒ سے ظہر کے آخری وقت کے سلسلہ میں متعدد روایتیں ہیں، مشہور روایت جس کو ارباب متون نے اختیار کیا ہے یہ ہے کہ ظہر کا وقت دو مثل تک رہتا ہے، بعض حضرات نے اس کو ظاہر الروایۃ بھی کہا ہے، لیکن حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جن کتابوں کو اصطلاح میں ظاہر الروایۃ کہا جاتا ہے ان میں سے کسی کتاب میں اس کی تصریح نہیں ہے، اس لیے اس روایت کو جن حضرات نے ظاہر الروایۃ قرار دیا ہے اس سے مراد غالباً اصطلاح نہیں بلکہ لغت ہے، یعنی ان کی مراد یہ ہے کہ امام اعظمؒ کی مشہور روایت یہ ہے۔

دوسری روایت جو فقہ حنفی کی عام کتابوں میں بھی موجود ہے جمہور کی رائے کے مطابق ہے، یہ روایت امام اعظمؒ سے حسنؒ بن زیادہ نے کی ہے کہ ظہر کا وقت مثل اول پر ختم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد ہی عصر کا وقت شروع ہو جاتا ہے، امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے اسی روایت کو اختیار کیا ہے۔

تیسری روایت اسدؒ بن عمرو نے امام اعظم سے نقل کی ہے کہ ظہر کا وقت ایک مثل تک ہے اور عصر کا وقت دو مثل کے بعد شروع ہوتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ظہر اور عصر کے درمیان یعنی مثل ثانی کا وقت مہمل ہے، موطأ امام محمدؒ میں امام صاحب کی طرف جو بات منسوب ہے وہ بھی اسی کے قریب ہے، امام محمد نے اپنے موطا میں بروایت ثقات جو پہلی روایت ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت ابورافعؓ نے حضرت ابو ہریرۃؓ سے اوقات صلوۃ کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے فرمایا: ''صلِّ الظهر اذا كان ظلك مثلك والعصر اذا كان ظلك مثليك'' (موطا امام محمد ص:۴۲) ظہر کی نماز اس وقت پڑھو جب تمہارا سایہ ایک مثل ہو جائے اور عصر اس وقت پڑھو جب تمہارا سایہ دو مثل ہو جائے۔

اس کے بعد امام محمدؒ ارشاد فرماتے ہیں: '' قال محمد :هذا قول ابی حنيفة في وقت العصر ...... فانه قال لايدخل وقت العصر حتى يصير الظل مثليه'' (موطاء امام محمد ص ۴۴) امام محمد نے فرمایا کہ عصر کے وقت کے سلسلے میں امام

اعظم کا یہی قول ہے کہ عصر کا وقت اس وقت تک داخل نہ ہوگا جب تک سایہ دو مثل نہ ہو جائے۔

## امام اعظمؒ سے متعدد روایات کی وجہ

یہ مندرجہ بالا تین روایتیں تو امام اعظم سے عام طور پر نقل کی جاتی ہیں، اس کے علاوہ بھی بعض روایات ہیں، پھر بعض کتابوں میں امام اعظم کا رجوع بھی جمہور کے قول کی طرف نقل کیا گیا ہے۔ اگر رجوع ثابت ہو جاتا تو گویا اختلاف ہی ختم ہو جاتا اور ساری امت کا اجماع ہو جاتا کہ ظہر کا وقت ایک مثل پر ختم ہو جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اگر چہ نقل کرنے والے بڑے لوگ ہیں مگر اس کا ثبوت دشوار ہے، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اتنے بڑے امام سے اس طرح کی متضاد اور متناقض روایات کس طرح چلیں اور ان میں اصل کیا ہے؟

اس سلسلے میں بنیادی بات تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ظہر کے آخری وقت کے بارے میں جو روایات ثابت ہیں ان میں ایک وقت پر اتفاق نہیں ہے، امامت جبرئیل والی روایت اور بعض دوسری روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ظہر کا وقت مثل اول پر ختم ہو جاتا ہے، جب کہ " ابردوا بالظهر "، "ساوى الظلُّ التلول" اور امتوں کی مدت عمل اور اجر والی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مثل ثانی میں بھی ظہر کا وقت باقی رہتا ہے، امام اعظمؒ نے ظہر کے آخری وقت اور عصر کے ابتدائی وقت کے سلسلے میں مندرجہ بالا دونوں روایات کے پیش نظر یہ فرمایا کہ ظہر کی نماز مثل اول میں پڑھ لی جائے اور عصر کی نماز مثل ثانی کے بعد پڑھی جائے تا کہ کسی بھی وقت صحیح بلکہ وقت مستحب میں ادا کرنے میں کوئی اشتباہ نہ رہے، امام اعظم کی طرف منسوب تینوں روایات امام اعظم کی اسی محتاط روش کی مختلف تعبیرات معلوم ہوتی ہیں، ہمارے اساتذۂ کرام اسی طرح کی وضاحت فرمایا کرتے تھے۔

## حضرت علامہ کشمیریؒ کا ارشاد

حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیری قدس سرہ فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح حضور اکرم ﷺ سے ایک سلسلے میں آنے والی متعارض روایات کے درمیان، حنفیہ کا مزاج تطبیق دینے کا ہے، اسی طرح اگر امام اعظم سے ایک مسئلہ میں مختلف روایات ثابت ہوں تو میں ان میں ترجیح کا عمل کرنے کے بجائے تطبیق دینے کی کوشش کرتا ہوں، ظہر کے مسئلے میں مختلف روایات کے درمیان میرے نزدیک تطبیق کی بہتر صورت یہ ہے کہ مثل اول کو ظہر کے ساتھ خاص کیا جائے اور مثل ثالث کو عصر کے ساتھ مخصوص سمجھا جائے، اور مثل ثانی میں یہ صلاحیت تسلیم کی جائے کہ وہ حسب ضرورت ظہر کے ساتھ بھی ملحق ہو سکتا ہے اور عصر کے ساتھ بھی، لیکن یہ ملحوظ رہے کہ دونوں نمازوں کے درمیان فاصلہ قائم رہے، مثلاً اگر ظہر کی نماز زوال کے فوراً بعد پڑھ لی گئی ہے تو عصر کی نماز ایک مثل کے بعد دوسرے مثل میں پڑھ لی جائے اور اگر ظہر مثل اول کے بعد پڑھی گئی ہے تو عصر مثل ثالث میں پڑھی جائے، پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں نمازوں کے درمیان فاصلہ اور فرق کی یہ رعایت سفر اور مرض کا عذر رکھنے والوں کے حق میں نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مثل اول ظہر کے لیے اور مثل ثالث عصر کے لیے متعین اور پسندیدہ وقت ہے اور مثل ثانی

پسندیدہ وقت تو کسی بھی نماز کے لیے نہیں، البتہ اس میں دونوں نمازوں کی گنجائش ہے، مگر دونوں نمازوں کے درمیان غیر معذورین کے لیے فاصلہ کی رعایت ضروری ہے، جب کہ معذورین کے لیے فاصلہ کی رعایت کرنا بھی ضروری نہیں ہے۔

**حضرت شیخ الہندؒ کا زرّیں ارشاد**

حضرت علامہ کشمیری قدس سرہ نے مثل ثانی کے وقت میں ظہر اور عصر دونوں کے حق میں پسندیدہ نہ ہونے کے باوجود، حسب ضرورت دونوں ہی سے ملحق کرنے کی گنجائش سمجھی، لیکن حضرت شیخ الہند قدس سرہ دونوں سے ملحق کرنے کی گنجائش نہیں سمجھتے تھے، بلکہ وہ اس وقت کو بوقتِ ضرورت صرف ظہر ہی کے ساتھ ملحق مانتے تھے۔

تفصیل اس کی یہ ہے کہ امام اعظمؒ سے صراحت کے ساتھ کہیں یہ منقول نہیں ہے کہ بحالت اختیار ظہر کی نماز کو مثل ثانی میں پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ امام اعظمؒ کی تمام روایات کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ ظہر کی نماز کو مثل اول ہی کے اندر پڑھ لیا جائے، گویا اگر عمداً ظہر کی نماز کو مثل اول میں ادا نہیں کیا اور بالقصد اس کو مثل ثانی تک موخر کر دیا تو یہ احتمال ہے کہ نماز ادا کے وقت میں نہ ہو، قضا کے وقت میں ہو جائے، البتہ عصر کے سلسلے میں اس کی تصریح ہے کہ اس کو بھی مثل ثانی میں نہ پڑھا جائے، بلکہ اس کو مثل ثانی کے بعد مثل ثالث میں پڑھا جائے، اس لیے مثل ثانی کا پورا وقت نماز کے عمل کے حق میں خالی رہے گا۔

البتہ عصر کی نماز کی تو اس وقت میں بالکل ہی گنجائش نہیں ہے، کیونکہ مختلف روایات سے تقریباً صراحت کے درجہ میں یہ سمجھ میں آتا ہے کہ یہ وقت عصر میں شامل نہیں، اس لیے اگر عصر اس وقت میں پڑھی جائے گی تو اس کا قوی اندیشہ رہے گا کہ نماز قبل از وقت ہونے کے سبب ادا نہ ہو اور ذمہ پر باقی رہ جائے، مگر ظہر کا معاملہ اس سے مختلف معلوم ہوتا ہے، بالفرض اگر ظہر کی نماز کسی عارض کی بنا پر مثل اول میں نہ پڑھی جا سکے تو اس کو مثل ثانی میں پڑھ لینا چاہئے، کیونکہ مثل ثانی کا وقت بعض روایت کی بنا پر ظہر سے ملحق معلوم ہوتا ہے، اس لیے توقع یہ ہے کہ مثل ثانی میں پڑھی گئی ظہر کی نماز ادا ہی ہوگی، اگر بالفرض ادا نہ بھی ہو تو قضا تو بالیقین ہو ہی جائے گی، حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے ''ایضاح الادلہ'' میں بھی یہی ارشاد فرمایا ہے: ''بالجملہ مطلب ظاہر الروایۃ یہ ہے کہ وقت مابین المثلین کا بوجہ معروضہ ظہر میں شمار کرنا مناسب ہے، کیونکہ وقت عصر میں داخل کرنے سے ادائے صلوۃ قبل الوقت کا احتمال باقی ہے، یہ مطلب نہیں کہ وقت مذکور بالیقین وقت ظہر میں داخل ہے اور جیسا بقائے ظہر مثل تک یقینی ہے، بعینہ ایسا ہی مثلین تک وقت ظہر باقی رہتا ہے، بلکہ وقت ظہر یقینی تو مثل تک ہے اور ابتداء عصر بالیقین مثلین سے ہوتا ہے اور درمیان کا وقت بوجہ روایات مختلفہ دونوں امر کا محتمل ہے، مگر بوجہ احتیاط مذکور، وقت مذکور کو وقت ظہر میں شامل کرنا اولی اور انسب ہے'' (ص ۱۴۷)

حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد کا خلاصہ یہ ہے کہ ظہر کے لیے پسندیدہ اور معین وقت مثل اول ہے اور عصر کے لیے مثل ثالث اور مثل ثانی کو مجبوری کی صورت میں ظہر کے ساتھ ملحق کرنا مناسب ہے اور امام اعظمؒ کی روایات کا بھی خلاصہ

یہی نکلتا ہے، خود حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا:

"اس لیے صلوۃ ظہر کا قبل مثل اور عصر کا بعد مثلین پڑھنا اولی اور انسب ہوگا تا کہ دونوں نمازوں میں کسی قسم کا خدشہ ہی باقی نہ رہے، ظاہر الروایۃ کا مطلب یہی معلوم ہوتا ہے، بلکہ بعض علماء نے بالتصریح یہ لکھ بھی دیا کہ امام صاحب کے نزدیک ظہر کا وقت مثل پر ختم ہو جاتا ہے اور عصر مثلین کے بعد سے شروع ہوتی ہے" (ایضاح الادلہ ص:۱۳۶)

ان معروضات سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ ظہر کے وقت کے سلسلے میں امام اعظمؒ سے جو تین روایات منقول ہیں وہ دراصل ایک ہی مضمون کی تین تعبیرات ہیں جنھیں الگ الگ سمجھ لیا گیا ہے، بلکہ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے، تو امام صاحب سے جو چوتھی بات یعنی مثل اول کی طرف رجوع کی روایت بیان کی گئی ہے اس کا بھی حاصل یہی ہے کہ امام اعظم نے ظہر کی نماز کو مثل اول میں پڑھ لینے کی اہمیت بیان کی تو اسے جمہور کے قول کی طرف رجوع سمجھ لیا گیا، حالانکہ منشا امام صاحبؒ کا ایک ہی ہے کہ ظہر کے لیے پسندیدہ اور معین وقت مثل اول ہے، جیسا کہ عصر کے لیے پسندیدہ اور معین وقت مثل ثالث ہے اور مثل ثانی بحق عمل مہمل ہے، لیکن اگر مجبوری لاحق ہو تو اس کو عصر کے ساتھ ملحق کرنے کے بجائے ظہر کے ساتھ ملحق کرنا اولی وانسب معلوم ہوتا ہے۔　　واللہ اعلم

## [۱۳] بَابُ وَقْتِ الْعَصْرِ

(۵۴۴) حَدَّثَنَا اِبْرَاهِيْمُ ابْنُ الْمُنْذِرِ ثَنَا اَنَسُ بْنُ عِيَاضٍ عَنْ هِشَامٍ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ لَمْ تَخْرُجْ مِنْ حُجْرَتِهَا. (گذشتہ:۵۲۲)

(۵۴۵) حَدَّثَنَا قُتَيْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ صَلَّى الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ فِيْ حُجْرَتِهَا لَمْ يَظْهَرِ الْفَيْئُ مِنْ حُجْرَتِهَا. (گذشتہ:۵۲۲)

(۵۴۶) حَدَّثَنَا اَبُوْ نُعَيْمٍ قَالَ حَدَّثَنَا ابْنُ عُيَيْنَةَ عَنِ الزُّهْرِيِّ عَنْ عُرْوَةَ عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْ صَلٰوةَ الْعَصْرِ وَالشَّمْسُ طَالِعَةٌ فِيْ حُجْرَتِيْ وَلَمْ يَظْهَرِ الْفَيْئُ بَعْدُ، قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللهِ وَقَالَ مَالِكٌ وَيَحْيىٰ بْنُ سَعِيْدٍ وَشُعَيْبٌ وَابْنُ اَبِيْ حَفْصَةَ وَالشَّمْسُ قَبْلَ اَنْ تَظْهَرَ.

(۵۴۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مُقَاتِلٍ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ اَخْبَرَنَا عَوْفٌ عَنْ سَيَّارِ بْنِ سَلَامَةَ قَالَ دَخَلْتُ اَنَا وَاَبِيْ عَلٰى اَبِيْ بَرْزَةَ الْاَسْلَمِيِّ فَقَالَ لَهُ اَبِيْ كَيْفَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي الْمَكْتُوْبَةَ فَقَالَ كَانَ يُصَلِّي الْهَجِيْرَ الَّتِيْ تَدْعُوْنَهَا الْاُوْلٰى حِيْنَ تَدْحَضُ الشَّمْسُ وَيُصَلِّي الْعَصْرَ ثُمَّ يَرْجِعُ اَحَدُنَا اِلٰى رَحْلِهِ فِيْ اَقْصَى الْمَدِيْنَةِ وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ

وَنَسِيْتُ مَا قَالَ فِي الْمَغْرِبِ وَكَانَ يَسْتَحِبُّ اَنْ يُؤَخِّرَ مِنَ الْعِشَآءِ الَّتِي تَدْعُوْنَهَا الْعَتَمَةَ وَكَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَهَا وَالْحَدِيْثَ بَعْدَهَا وَكَانَ يَنْفَتِلُ مِنْ صَلٰوةِ الْغَدَاةِ حِيْنَ يَعْرِفُ الرَّجُلُ جَلِيْسَهُ وَيَقْرَءُ بِالسِّتِّيْنَ اِلَى الْمِائَةِ . (گذشتہ:۵۴۱)

(۵۴۸) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ مَسْلَمَةَ عَنْ مَالِكٍ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِ اللهِ بْنِ اَبِيْ طَلْحَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّي الْعَصْرَ ثُمَّ يَخْرُجُ الْاِنْسَانُ اِلٰى بَنِيْ عَمْرِو بْنِ عَوْفٍ فَيَجِدُهُمْ يُصَلُّوْنَ الْعَصْرَ . (آئندہ:۵۵۰،۵۵۱،۷۳۲۹)

(۵۴۹) حَدَّثَنَا ابْنُ مُقَاتِلٍ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ اَخْبَرَنَا اَبُوْبَكْرِ بْنُ عُثْمَانَ بْنِ سَهْلِ بْنِ حُنَيْفٍ قَالَ سَمِعْتُ اَبَا اُمَامَةَ يَقُوْلُ صَلَّيْنَا مَعَ عُمَرَ بْنِ عَبْدِ الْعَزِيْزِ الظُّهْرَ ثُمَّ خَرَجْنَا حَتّٰى دَخَلْنَا عَلٰى اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ فَوَجَدْنَاهُ يُصَلِّي الْعَصْرَ فَقُلْتُ يَا عَمِّ مَا هٰذِهِ الصَّلٰوةُ الَّتِيْ صَلَّيْتَ؟ قَالَ الْعَصْرُ وَهٰذِهِ صَلٰوةُ رَسُوْلِ اللهِ ﷺ الَّتِيْ كُنَّا نُصَلِّيْ مَعَهُ .

(۵۵۰) حَدَّثَنَا عَبْدُاللهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ كُنَّا نُصَلِّي الْعَصْرَ ثُمَّ يَذْهَبُ الذَّاهِبُ مِنَّا اِلٰى قُبَاءَ فَيَاتِيْهِمْ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ.
(گذشتہ:۵۴۸)

(۵۵۱) حَدَّثَنَا اَبُو الْيَمَانِ قَالَ اَخْبَرَنَا شُعَيْبٌ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ قَالَ كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يُصَلِّي الْعَصْرَ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ حَيَّةٌ فَيَذْهَبُ الذَّاهِبُ اِلَى الْعَوَالِيْ فَيَاتِيْهِمْ وَالشَّمْسُ مُرْتَفِعَةٌ وَبَعْضُ الْعَوَالِيْ مِنَ الْمَدِيْنَةِ عَلٰى اَرْبَعَةِ اَمْيَالٍ اَوْنَحْوِهٖ
(گذشتہ:۵۴۸)

**ترجمہ** باب، عصر کے وقت کا بیان۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ سورج ابھی ان کے حجرے سے نہ نکلتا تھا، یعنی ابھی دھوپ حجرے میں ہوتی تھی۔
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھی کہ دھوپ ابھی ان کی چہار دیواری یا حجرے میں تھی، حجرے کا سایہ صحن کی دیوار پر نہیں چڑھا تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ دھوپ میرے حجرے (مسقف کمرے یا چہار دیواری) میں ہوتی تھی اور سایہ ابھی تک نہ چڑھتا تھا۔ امام بخاریؒ نے کہا کہ امام مالک اور یحییٰ بن سعید اور شعیب بن ابی حمزہ اور ابن ابی حفصہ نے اپنی روایات میں یہ کہا کہ دھوپ ابھی اوپر نہ چڑھی ہوتی تھی۔ حضرت سیار بن سلامہ راوی ہیں کہ میں اور میرے والد، حضرت ابو برزہ اسلمیؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے، میرے والد نے ان سے پوچھا کہ رسول اللہ ﷺ فرض نمازیں کن وقتوں میں

پڑھتے تھے؟ فرمایا کہ آپ دوپہر کی نماز جسے تم پہلی نماز کہتے ہو اس وقت پڑھتے تھے جب سورج ڈھل جاتا تھا، اور عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ پھر ہم میں سے کوئی مدینہ طیبہ کے کنارے پر اپنے گھر میں واپس ہوجاتا اور آفتاب ابھی زندہ ہوتا، سیار کہتے ہیں کہ مجھے یہ یاد نہیں رہا کہ حضرت ابو برزہؓ نے مغرب کے بارے میں کیا کہا تھا؟ اور حضرت ابو برزہ نے کہا کہ حضور ﷺ عشاء کی نماز میں جسے تم عتمۃ کہتے ہو، تاخیر کرنا پسند کرتے تھے اور اس سے پہلے سوجانے کو اور اس کے بعد باتیں کرنے کو ناپسند کرتے تھے، اور فجر کی نماز سے ایسے وقت میں فارغ ہوتے تھے کہ انسان اپنے برابر والے کو پہچان لیتا تھا اور ساٹھ سے لے کر سو آیتوں تک پڑھتے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ عصر کی نماز پڑھتے تھے پھر انسان بنی عمرو بن عوف میں جاتا تو انہیں عصر کی نماز پڑھتے ہوئے پاتا۔ حضرت ابوامامہؓ کہتے ہیں کہ ہم نے ظہر کی نماز حضرت عمر بن عبدالعزیز کیساتھ پڑھی، پھر ہم نکل کر حضرت انس بن مالکؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ وہ عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں، تو میں نے عرض کیا چچا! یہ کونسی نماز ہے، جو آپ نے پڑھی؟ فرمایا کہ عصر کی، اور حضور ﷺ کی یہی نماز تھی، جسے ہم آپ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھتے تھے، پھر جانے والا ہم میں سے قباء جاتا، تو وہ ایسے وقت میں وہاں پہنچ جاتا کہ آفتاب ابھی بلند ہوتا۔ حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ آفتاب اونچا اور زندہ ہوتا، پھر جانے والا عوالی جاتا تو وہ ایسے وقت میں پہنچ جاتا کہ آفتاب ابھی اونچا ہوتا اور بعض عوالی مدینہ سے چار میل یا اس کے قریب دوری پر واقع ہیں۔

**مقصد ترجمہ** پچھلے باب میں یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ عصر کا وقت وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں ظہر کا وقت ختم ہوتا ہے، اور ان دونوں کے درمیان نہ کوئی وقت مہمل ہے، نہ مشترک ہے، مگر ظہر کے آخری وقت میں چونکہ اختلاف ہوگیا کہ وہ مثل اول پر ختم ہوجاتا ہے، یا مثل ثانی تک ممتد ہے؟ اس لیے عصر کے ابتدائی وقت کے بارے میں بھی اختلاف ہوگیا کہ وہ ایک مثل کے بعد شروع ہوجاتا ہے یا مثلین کے بعد؟ اب اس باب میں یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کا معمول عصر کی نماز میں تعجیل کا تھا یا تاخیر کا؟ امام بخاری کا رجحان تعجیل کا بیان کرنا معلوم ہوتا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ امام بخاری کے پاس اپنے مقصد کو ثابت کرنے کے لیے کوئی صریح روایت نہیں ہے، اس لیے وہ ایسی روایتوں کو جمع کر کے اپنا مدعا ثابت کرنا چاہتے ہیں جن سے تعجیل پر استدلال کیا جاسکتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ ان روایات میں سے کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس سے تاخیر یعنی مثلین کے بعد عصر کے لیے استدلال کرنے والوں کو کوئی دشواری ہو، جیسا کہ روایات کی تشریح کے دوران معلوم ہوجائے گا۔

**تشریح روایت اول، دوم وسوم** اس باب کے تحت امام بخاری نے آٹھ روایات ذکر کی ہیں، جن میں سے پہلی تین روایتیں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کی گئی ہیں، جن کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ دھوپ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں ہوتی تھی

اور سایہ اوپر نہ چڑھنے پاتا تھا، پہلی روایت کے الفاظ ہیں: " **والشمس لم تخرج من حجرتها** " کہ دھوپ ان کے حجرے میں ہوتی تھی وہاں سے نکل نہ پاتی تھی اور دوسری روایت کے الفاظ ہیں: " **والشمس في حجرتها لم يظهر الفيء من حجرتها** " کہ دھوپ حجرے میں ہوتی تھی اور حجرے کا سایہ اوپر نہ چڑھنے پاتا، تیسری روایت کے الفاظ ہیں: " **والشمس طالعة في حجرتي ولم يظهر الفيء بعد** " یعنی دھوپ ابھی حجرے میں موجود ہوتی اور ابھی تک سایہ اوپر نہ چڑھتا۔

**تعجیل پر استدلال کا طریقہ** ان روایات سے تعجیل پر استدلال کا طریقہ یہ ہے کہ حجرے سے مسقّف کمرہ مراد نہیں، بلکہ مراد کمرہ کے سامنے کی چہار دیواری ہے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ بیان کر رہی ہیں کہ کمرے کی دیواروں کا جو سایہ، ان کے صحن یعنی کمرے کے سامنے کی چہار دیواری میں پڑتا تھا وہ ابھی دیوار پر نہیں چڑھنے پاتا تھا کہ عصر کی نماز پڑھ لی جاتی تھی، شارحین نے یہاں اپنے اپنے ذوق کے مطابق وضاحت کی ہے، لیکن اس روایت سے تعجیل عصر پر علامہ نوویؒ نے نہایت آسان اور صاف استدلال اس طرح کیا ہے، فرماتے ہیں: " **كانت الحجرة ضيقة العرصة قصيرة الجدار بحيث كان طول جدارها اقل من مسافة العرصة بشي يسير فاذا صار ظل الجدار مثله كانت الشمس ابعد في اواخر العرصة** " (نووی ص: ۲۲۲) حضرت عائشہ کے حجرے کا صحن تنگ اور دیواریں نیچی تھیں بایں طور کہ دیوار کی اونچائی صحن کی پیمائش سے کچھ ہی کم تھی، اس لیے جب دیوار کا سایہ ایک مثل ہوگا تو دھوپ صحن کے بالکل کنارے پر پہنچ جائے گی۔

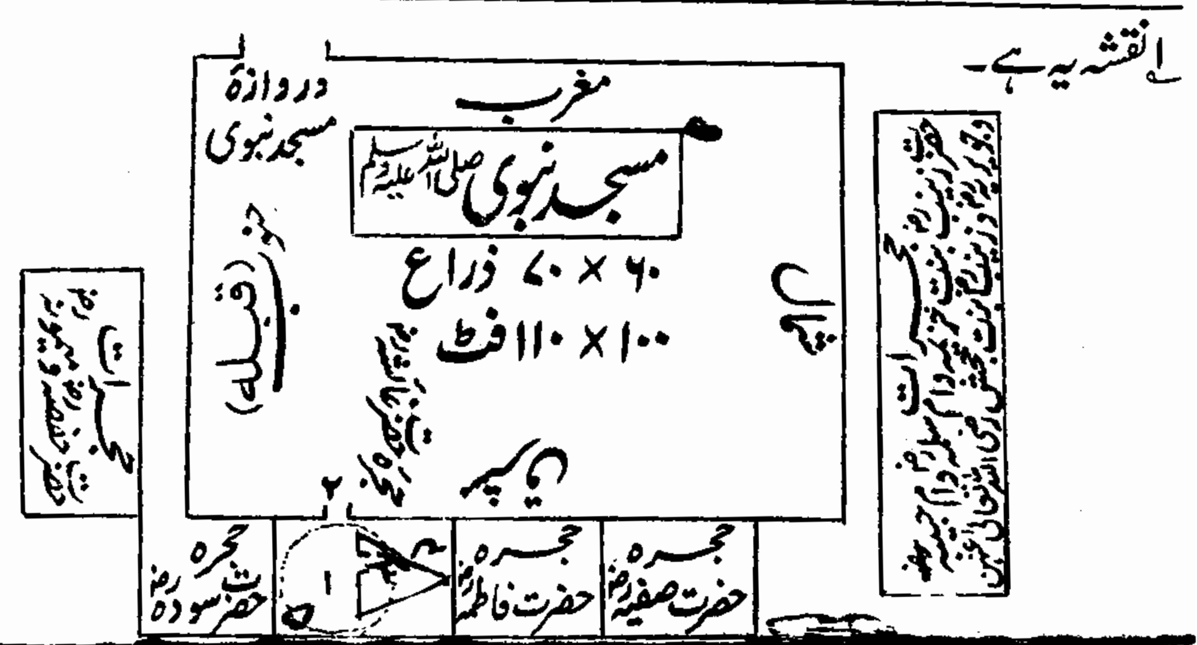
اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ حجرے سے مراد چہار دیواری ہے اور چہار دیواری کی اونچائی کتنی بھی ہو، لیکن صحن جہاں دھوپ آئے گی وہ چہار دیواری سے کچھ ہی زائد تھا، اس لیے ایک مثل تک کی دھوپ تو صحن میں رہے گی، لیکن دوسرے مثل کے شروع ہوتے ہی دیوار پر چڑھنی شروع ہو جائے گی اور چونکہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا یہ فرما رہی ہیں کہ دھوپ ابھی میرے حجرے ہی میں ہوتی تھی دیوار پر چڑھنے نہ پاتی تھی، اس لیے گویا عصر کی نماز مثل ثانی میں بلکہ مثل ثانی کے آغاز میں پڑھ لی گئی، مگر یہ واقعہ ہے کہ نوویؒ کا استدلال کتنا ہی صاف اور بے غبار سہی مگر اس کی صحت کا انحصار حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے طول وعرض، مسجد نبوی سے اس کی سمت کے تعین اور اس میں دھوپ آنے کے رخ پر ہے، اس لیے پہلے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے بارے میں تفصیلات معلوم کر لیں، پھر علامہ نوویؒ کے استدلال پر غور کریں گے۔

**حجرۂ عائشہؓ کے بارے میں کچھ معلومات** اگرچہ اس سلسلے میں پوری تفصیلات یقین کے ساتھ تو بیان نہیں کی جا سکتیں، تاہم جتنا محفوظ ہے ان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا حجرہ جس میں حضور اقدس ﷺ، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما دفن ہیں مسجد نبوی سے جانب مشرق میں واقع

ہے، مسجد نبوی کا طول وعرض ابتداءً ۷۰+۶۰ ذراع تھا، یعنی ایک جانب سے ایک سو دس فٹ سے کچھ زائد اور دوسری جانب سے ایک سو فٹ سے کچھ کم، قبلہ جانب جنوب میں تھا، ازواج مطہرات کے حجرے مسجد نبوی سے مشرق، جنوب اور شمال کی طرف واقع تھے، مغرب کی جانب کوئی حجرہ نہیں تھا، یہ چیزیں طبقات ابن سعد جلد ہشتم میں موجود ہیں، پہلے مسجد نبوی تعمیر ہوئی اور پھر اس کے بعد مشرق کی طرف جنوب کے گوشہ میں حضرت سودہؓ کا حجرہ بنایا گیا تھا، پھر اس سے متصل حضرت عائشہ کا حجرہ تھا، جس کا عرض ۱۰ یا ۱۱ فٹ کے قریب اور طول ۱۷/ یا ۱۸ فٹ کے قریب تھا، اونچائی صرف اس قدر تھی کہ حضرت حسن بصریؒ کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھاتے تو چھت سے لگ جاتا تھا، گویا زیادہ سے زیادہ اونچائی آٹھ فٹ یا اس سے کم تھی، اس کا ایک دروازہ مغرب کی طرف یعنی مسجد نبوی میں کھلتا تھا اور دوسرا دروازہ شمال کی طرف صحن میں کھلتا تھا[1]۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے مزار اقدس سے جانب شمال میں جو پانچواں گوشہ نکالا تھا وہی حضرت عائشہ کے حجرے کا صحن تھا اور یہ صحن بیس فٹ سے کم نہیں تھا، نیز اگر مسجد نبوی کے طول سو فٹ کو چار حصوں میں تقسیم کیا جائے جیسا کہ اس سمت میں چار حجرات پر ہونا چاہئے تب بھی صحن کشادہ نکلتا ہے۔

---

[1] نقشہ یہ ہے۔




طبقات ابن سعد میں ہے: "کانت ام سلمة وام حبيبة بنت ابی سفيان وزينب بنت خزيمه وجويريه بنت الحارث، وزينب بنت جحش، فی الجانب الشامی وکانت عائشة وصفية وسودة فی الشق الاخر" (طبقات ابن سعد ص ۱۱۷ ج ۸ النساء) اس عبارت میں جانب شمال میں پانچ ازواج مطہرات کے نام دئے گئے ہیں، لیکن حضرت ام سلمہؓ، حضرت زینب بنت خزیمہ (المتوفیہ ۳ھ) کے بعد ۴ھ میں عقد نکاح میں آئی تھیں اور ان کو حضرت زینبؓ والا حجرہ ملا تھا، اس لیے نقشہ میں جانب شمال میں چار حجروں کی نشاندہی کی گئی ہے، اور چار ہی حجرے جانب مشرق میں ہیں مگر ان میں ایک حجرہ حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ ﷺ کا ہے اور تین حجرے ازواج مطہرات کے ہیں، اور جانب جنوب میں حضرت حفصہ اور حضرت میمونہ کے حجرے دکھائے گئے ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں جو نمبر دئے گئے ہیں ان کی وضاحت یہ ہے۔ (۱) مسقف حصہ جس کی پیمائش تقریباً ۱۱+۱۷ فٹ اور اونچائی تقریباً آٹھ فٹ تھی (۲) حجرہ کا غربی دروازہ جو مسجد نبوی میں کھلتا تھا، اس دروازے سے حجرہ کے اندر دھوپ آنے کا امکان ہے، مگر مسجد نبوی کے غربی دروازے سے پہلے دھوپ مسجد میں آئے گی پھر غروب سے کچھ پہلے حجرہ کے اندر آئے گی (۳) حجرۂ عائشہ کا وہ دروازہ جو جانب شمال میں کھلتا تھا اور شمال ہی میں صحن تھا اس دروازے سے زوال کے بعد دھوپ کے حجرے میں آنے کا کوئی امکان نہیں (۴) حضرت عمر بن (بقیہ بر صفحہ آئندہ)

## عصر موخر کرنے والوں کی توجیہات

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کے بارے میں مندرجہ بالا حقائق کے بعد اب دھوپ کے معاملہ پر غور کرنا آسان ہے، حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ دھوپ ان کے حجرے میں ہوتی تھی، یہاں پہلی بات تو یہ ہے کہ حجرہ سے مراد مسقّف کمرہ ہے یا کمرے کے سامنے کی چہار دیواری، اگر حجرے سے مراد مسقّف کمرہ لیا جائے جیسا کہ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں "والمراد بالحجرة البيت والمراد بالشمس ضوء ها" (فتح الباری ص:۱۶۴/ ج:۲) یعنی حجرے سے مراد مسقّف کمرہ ہے اور شمس سے مراد دھوپ ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ حجرے کے اندر دھوپ مسجد نبوی کے مسقّف حصے سے گذر کر آتی تھی، کیوں کہ حجرے کا جو دروازہ جانب شمال میں کھلتا تھا، اس سے دھوپ کے کمرہ کے اندر آنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ سورج اس سمت میں نہیں ہے، دھوپ اسی دروازے سے کمرے کے اندر جاسکتی ہے، جو مسجد نبوی میں کھلتا تھا اور جو جانب مغرب میں تھا، گویا جب سورج اتنا نیچا ہوجائے کہ پہلے دھوپ مسجد نبوی میں آئے پھر مسجد نبوی کے اندرونی حصے یعنی تقریباً سوفٹ میں پھیلی ہوئی حضرت عائشہ کے دروازے تک پہنچے، تب ہی مسقّف کمرہ میں اندر جاسکتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات مثل ثانی میں ممکن نہیں، بلکہ یہ تو غروب کے قریب ہی ممکن ہے۔

تعجیل پر استدلال کرنے والوں کی جانب سے کہا جاسکتا ہے کہ مسجد نبوی کے مغربی دروازے سے آنے والی دھوپ مراد لینا نہایت بعید احتمال ہے، لیکن ہماری گذارش یہ ہے کہ احتمال بعید سہی مگر جب آپ حجرے سے مراد بیت یعنی مسقّف حجرہ لے رہے ہیں، تو آپ ہی بتلایئے کہ دھوپ کدھر سے آئے گی، پھر یہ کہ اس روایت سے تعجیل پر استدلال کرنے والے جب تک اس احتمال کی بندش نہ کردیں اس وقت تک اس روایت سے تعجیل پر استدلال کو ناتمام ہی قرار دیا جائے گا۔

اور اگر حجرے سے مسقّف کمرے کے بجائے کمرے کے سامنے کی چہار دیواری مراد ہو تو دھوپ سے مراد وہ دھوپ نہ ہوگی جو کمرے کے اندر آرہی ہے، بلکہ وہ دھوپ مراد ہوگی جو حجرے کی دیوار کے اوپر سے صحن میں آرہی ہے، اس صورت میں علامہ نوویؒ کے بیان کے مطابق استدلال اسی وقت ممکن ہے جب حجرے کا صحن حجرے کی دیوار کے بقدر یا اس سے کچھ ہی زائد ہو جیسا کہ نوویؒ نے دعویٰ بھی کیا کہ دیوار کی اونچائی، صحن کی پیمائش سے کچھ ہی کم تھی، لیکن حضرت عائشہؓ کے حجرے کے بارے میں دی گئی تفصیلات سے اس کی تائید نہیں ہوتی، کیونکہ حجرے کی دیوار زیادہ سے زیادہ آٹھ فٹ اونچی ہے اور صحن بیس فٹ کے قریب ہے، اس لیے جب دیوار کا سایہ صحن میں پڑے گا تو آٹھ فٹ تک مثل اول اور ۱۶/ فٹ تک مثل ثانی رہے گا اور یہ معلوم ہے کہ مدینہ طیبہ میں گرمی کے موسم میں سایۂ اصلی بہت معمولی ہوتا ہے، اس

---

(بقیہ صفحہ گذشتہ) عبدالعزیزؒ کا تعمیر کردہ تکون یا پنج گوشہ، ظاہر یہی ہے کہ یہ حضرت عائشہؓ کے حجرے کے صحن کی جگہ پر بنایا گیا تھا۔ (۵) نقطوں کے ذریعہ جو دائرہ بنایا گیا ہے یہ گنبد خضراء کی جگہ ہے، جس میں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ حضرت ابو بکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما آرام فرما ہیں (مرتب)

لیے یہ بات تقریباً متعین ہے کہ حضرت عائشہؓ کے حجرے کے صحن میں مثل ثانی کے بعد بھی دھوپ باقی رہے گی اور دیوار پر مثل ثانی ختم ہونے کے بعد چڑھے گی۔　　واللہ اعلم

اس موقع پر شارحین حدیث نے اپنے اپنے ذوق اور اپنے اپنے مسلک کے مطابق گفتگو کی ہے، امام طحاویؒ نے اس روایت پر بحث کرتے ہوئے فرمایا ہے: "قد يجوز ان يكون كذلك وقد اخر العصر لقصر حجرتها، فلم يكن لشمس تنقطع منها الابقرب غروبها فلا دلالة في هذا الحديث على تعجيل العصر" ۔(طحاوی ص ۱۳۲/ ج ۱)

دھوپ کے حجرے میں ہوتے ہوئے عصر میں تاخیر ہو سکتی ہے، اس لیے کہ حجرے کی دیواریں نیچی تھیں اور اس صورت میں دھوپ وہاں سے غروب کے قریب ہی ختم ہوگی، اس لیے اس روایت سے تعجیل عصر پر استدلال درست نہیں ہے۔

چہار دیواری کی دیواروں کے نیچا ہونے کے سبب تادیر دھوپ کے باقی رہنے کے امام طحاوی کے اس استدلال پر حافظ ابن حجرؒ نے کلام کیا ہے کہ دیواروں کا نیچا ہونا تو تسلیم ہے مگر سوال یہ ہے کہ صحن تنگ تھا یا وسیع ؟ مشہور یہی ہے کہ صحن تنگ تھا اور تنگ صحن میں دھوپ تادیر نہیں رہ سکتی، چنانچہ ابن حجر کی رائے کے مطابق امام طحاوی کا استدلال تام نہیں، پھر علامہ عینیؒ نے حافظ ابن حجرؒ کی گرفت کی ہے کہ دیواروں کا نیچا ہونا تسلیم ہے تو مکابرہ یعنی بلا وجہ مخالفت کی کیا ضرورت ہے؟ تجربہ اور مشاہدہ سے ثابت ہے کہ دیواریں نیچی ہوں، تو صحن کے تنگ یا کشادہ ہونے سے خاص فرق نہیں پڑتا، ہر صورت میں دھوپ تادیر صحن میں رہے گی۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ امام طحاویؒ کی بات بہت مضبوط ہے، مگر حقیقت حال حافظ ابن حجر اور علامہ عینیؒ کے سوال وجواب میں پوری طرح واضح نہیں ہوتی، اس کو سمجھنے کے لیے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے کی دیواروں اور صحن کی پیمائش کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے، کہ امہات المومنین کے متعدد حجرات تو مسجد نبوی کے شمال اور جنوب میں تھے، جانب مغرب میں کوئی حجرہ نہیں تھا، اور جانب مشرق میں سوفٹ کے طول میں صرف چار حجرے تھے، تین ازواج مطہرات کے، اور ایک حضرت فاطمہؓ کا، ترتیب یہ تھی کہ آپ ﷺ نے مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد پہلے صرف ان دو ازواج مطہرات کے حجرے بنوائے جو اس وقت تک زوجیت میں آ گئی تھیں، یعنی ایک حضرت سودہؓ کا اور دوسرا حضرت عائشہؓ کا، حضرت سودہؓ کا حجرہ جنوب مشرق میں بالکل دیوار قبلہ سے متصل تھا، اس کے برابر میں حضرت عائشہؓ کا حجرہ تھا، پھر جب ذوالحجہ ۲ھ میں حضرت فاطمہؓ کا نکاح حضرت علیؓ سے ہو گیا تو حضرت عائشہؓ کے حجرے کے برابر میں ایک حجرہ ان کو دیا گیا، نیز حضرت صفیہؓ کے حجرے کا بھی اسی سمت میں ہونا معلوم ہوتا ہے، اب غور کر لیا جائے کہ سوفٹ کے طول میں صرف چار حجرات ہیں تو صحن کا اتنا تنگ ہونا کیا ضروری ہے جتنا علامہ نوویؒ اور حافظ ابن حجرؒ بیان کرنا چاہتے ہیں؟

**تفصیل سے ہمارا مقصد** حضرت عائشہؓ کی روایت کی شرح میں دھوپ کے حجرے میں موجود ہونے اور دیوار پر نہ چڑھنے سے، عصر کی نماز میں تعجیل پر استدلال کرنے والوں نے جو بیان کیا ہے ہم نے

اس کا بھی تفصیلی ذکر کیا ہے، پھر اس سلسلے میں تاخیر کی رائے رکھنے والوں کی بات بھی بیان کی ہے اور اس سلسلے میں حجرۂ عائشہؓ کے محل وقوع کا لحاظ کر کے وضاحت کی کوشش کی ہے، اس سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ یہ روایت تاخیر کی رائے رکھنے والوں کا مستدل یا ان کے لیے نص ہے، بلکہ ہمارا مقصد صرف یہ واضح کرنا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی روایت تعجیل پر استدلال کے لیے نص نہیں ہے، بلکہ اس میں تاخیر پر استدلال کی بھی گنجائش ہے اور حنفیہ نے اس روایت کو تاخیر پر محمول کرنے کے لیے جو توجیہات کی ہیں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ اعلم

**تشریح روایت چہارم** اس سلسلے میں چوتھی روایت حضرت ابو برزہ اسلمیؓ سے دی گئی ہے، مگر یہ روایت بھی عصر کو مثل ثانی میں پڑھنے کے لیے نص نہیں ہے، فرماتے ہیں کہ دوپہر کی وہ نماز جسے لوگ صلوۃ اولیٰ کہتے ہیں اس وقت پڑھی جاتی جب آفتاب ڈھل جاتا تھا، مراد یہ ہے کہ ظہر کی نماز اول وقت میں پڑھی جاتی تھی مگر یہ بحث گذر چکی ہے کہ اس کی کیا وجہ تھی؟

ویصلی العصر الخ . اور عصر کی نماز مسجد نبوی میں معمولاً ایسے وقت میں پڑھی جاتی تھی، کہ نماز پڑھ کر ہم میں کا ایک شخص اقصائے مدینہ میں آفتاب کی زندگی میں اپنے گھر واپس ہو جاتا، اقصائے مدینہ سے مراد مدینہ کے دور ترین محلے ہیں اور آفتاب کی زندگی سے مراد یہ ہے کہ آفتاب کی روشنی یا گرمی میں تغیر آنے سے پہلے، اس لیے مطلب یہ ہوا کہ جانے والا، مسجد نبوی میں عصر کی نماز پڑھ کر، مدینہ طیبہ کے دور تر محلوں تک میں، آفتاب کی روشنی یا حرارت میں تغیر آنے سے پہلے پہنچ جاتا تھا۔

اس روایت میں بھی عصر کی نماز کے مثل ثانی میں پڑھنے کی صراحت نہیں ہے، بلکہ محض ایک علامت ایسی مبہم زبان میں بیان کی گئی ہے کہ اس کو تعجیل اور تاخیر دونوں پر منطبق کیا جا سکتا ہے، تعجیل یعنی مثل ثانی ہی میں عصر کی نماز کے لیے استدلال کرنے والوں کے خیال کے مطابق تشریح اس طرح کی جائے گی کہ مدینہ طیبہ کی آبادی عہد رسالت میں کئی میل تک پھیلی ہوئی تھی اور مسجد نبوی سے دور ترین محلوں کا فاصلہ کئی میل تھا۔ آفتاب کی زندگی سے مراد یہ ہے کہ اس کی گرمی، اور روشنی مکمل طور پر باقی رہتی تھی، اس لیے روایت سے ثابت ہوا کہ مسجد نبوی سے نماز عصر پڑھ کر جانے والا آفتاب کی گرمی اور روشنی میں کئی میل کے فاصلہ پر اپنے گھر پہنچ جاتا تھا، تو نماز مثل ثانی ہی میں ہو جاتی تھی، کیوں کہ مثل ثالث میں نماز پڑھ کر کئی میل چلنے کے بعد یہ صورت مشکل ہے۔

لیکن عصر کی نماز کو مثل ثالث تک موخر کرنے والوں کی توجیہ یہ ہے کہ ذکر کردہ علامت سے مثل ثانی کا تعین ضروری نہیں، کیوں کہ یہ بات مثل ثالث میں بھی ممکن ہے کہ ایک شخص مسجد نبوی سے عصر کی نماز پڑھ کر آفتاب کی زندگی میں دور ترین محلوں میں پہنچ جائے، کیوں کہ روایت میں یہ مذکور نہیں ہے کہ اقصائے مدینہ کا فاصلہ کیا تھا؟ نہ یہ مذکور ہے کہ یہ گرمیوں کے زمانہ کی بات ہے، یا سردیوں کی؟ نہ جانے والے کے بارے میں یہ مذکور ہے کہ وہ سوار ہوتا تھا یا پیدل؟ نہ یہ

وضاحت ہے کہ جانے والا تیز رفتار تھا یا سست رو؟ جوان تھا یا بوڑھا؟ پھر یہ کہ روایت میں " احد نا " کا لفظ ہے جس کا راجح مطلب یہ عموم نہیں کہ ہم میں سے ہر شخص یہ کام کر لیتا تھا، بلکہ اس کا اصل اور متبادر مفہوم یہ ہے کہ ہم میں کا ایک شخص جو راوی کے ذہن میں متعین ہے یہ کام کر لیتا تھا، کیوں کہ احدنا اپنے مفہوم کے اعتبار سے تعدد پر مشتمل نہیں، اس لیے جب تک اقصائے مدینہ کا فاصلہ متعین نہ ہو، جانے والا متعین نہ ہو، موسم اور دیگر تفصیلات معلوم نہ ہوں، اس وقت تک مثل ثانی میں عصر کی نماز پڑھنے پر استدلال تام نہیں۔

یہاں بھی یہ وضاحت مناسب ہے کہ اگر چہ پیش کردہ احتمالات میں کچھ قریب ہیں کچھ بعید ہیں، بلکہ کچھ بعید تر بھی ہیں، لیکن جب تک تعجیل پر استدلال کرنے والے ان کی نفی نہ کر دیں اس وقت تک ان کا استدلال ناقص ہے، احتمالات ختم کرنے کی ذمہ داری استدلال کرنے والے پر عائد ہوتی ہے۔ اس روایت میں دوسری نمازوں سے متعلق ذکر کردہ اوقات کی وضاحت اپنی اپنی جگہ آئے گی۔

**تشریح روایت پنجم** اس باب میں پانچویں روایت حضرت انسؓ سے دی گئی ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھتے تھے، مراد یہ ہے کہ مسجد نبوی میں، پھر ہم میں سے کوئی انسان بنی عمرو بن عوف میں جاتا تو انہیں نماز پڑھتے ہوئے پاتا تھا، بنی عمرو بن عوف مسجد نبوی سے دو میل دور قباء میں رہتے تھے۔ حافظ ابن حجرؒ نے نوویؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس روایت کے بارے میں اہل علم نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اہل قباء زراعت پیشہ تھے، اس لیے وہ اپنے زراعت اور کاشتکاری کے کاموں سے فارغ ہو کر نماز عصر کی تیاری کرتے تھے اور ان کو نماز میں دیر ہو جاتی تھی۔ (نووی بر مسلم ص: ۲۲۵/ج:۱)

ہم یہ وضاحت تسلیم کرتے ہیں، اس سے جہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ مسجد نبوی میں نماز ذرا پہلے ہو جاتی تھی، وہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ مسجد قباء میں تاخیر سے ہوتی تھی اور کیا یہ تاخیر پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے علم میں نہ آئی ہوگی؟ جب جانے والے نے دو میل کی مسافت طے کرنے کے بعد دیکھا کہ مسجد قباء کے نمازی صحابہ کرام عصر کی نماز پڑھ رہے ہیں، پھر ایک دو دن کا معاملہ ہوتا تو اسے اتفاق قرار دیا جا سکتا تھا، لیکن اگر معمول یہی تھا جیسا کہ کاشتکاری کے عذر کی بنیاد پر سمجھا جا سکتا ہے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ عمل بھی صحیح بلکہ مستحسن ہے، کیونکہ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی جانب سے اہل قباء کو اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی، پھر اس کے ساتھ یہ بھی ملحوظ رہنا چاہئے کہ ان دنوں میں ہوسکتا ہے کہ مسجد نبوی کی حیثیت امام المساجد کی رہی ہو اور دیگر مسجدوں میں نماز مسجد نبوی کے بعد ہوتی ہو۔ واللہ اعلم

**تشریح روایت ششم** چھٹی روایت میں بھی کوئی واضح بات اور ایسی چیز نہیں ہے جس سے مسئلہ پوری طرح نکھر جائے، حضرت ابوامامہؓ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے ظہر کی نماز حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ پڑھی، نماز سے فارغ ہو کر نکلے تو ملاقات کے لیے حضرت انس بن مالکؓ کی خدمت میں پہنچے، ان کا مکان مسجد کے

قریب ہی میں تھا، دیکھا کہ حضرت انسؓ نماز کی تیاری کررہے ہیں یا نماز پڑھ رہے ہیں، بڑی حیرت ہوئی کہ یہ کونسی نماز ہے؟ یعنی اگر ظہر کی نماز ہے، تو بڑی دیر کردی اور اگر عصر کی نماز ہے، تو ابھی تو ہم لوگ ظہر کی نماز پڑھ کر آرہے ہیں، اس لیے ابوامامہؒ نے حضرت انسؓ سے معلوم کرہی لیا، **یا عم اما هذه الصلوة** ؟ چچا جان! یہ کونسی نماز ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ عصر کی نماز ہے، اور ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اسی وقت نماز پڑھا کرتے تھے۔

روایت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ساتھ پڑھی گئی ظہر کی نماز کے فوراً بعد حضرت انسؓ نے عصر کی نماز ادا کی، معلوم ہوا کہ حضرت انسؓ نے عصر کی نماز اول وقت میں پڑھی، لیکن سوال یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ظہر کی نماز کس وقت ادا کی تھی؟

نوویؒ نے لکھا ہے کہ اس وقت تک حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ نہیں ہوئے تھے، کیوں کہ حضرت انسؓ کی وفات، حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت سے کئی سال پہلے ہوگئی تھی، اس لیے یہ واقعہ اس زمانہ کا ہے جب عمر بن عبدالعزیز کو ولید بن عبدالملک کی جانب سے مدینہ کا حاکم مقرر کیا گیا تھا (یعنی ۸۶ تا ۹۳ھ) اس لیے حضرت عمر بن عبدالعزیز کا ظہر کی نماز کو موخر کرنا کسی عذر کی بنا پر رہا ہوگا، یا ہوسکتا ہے کہ سنت کا صحیح علم ہونے سے پہلے امراء بنوامیہ کی عادت کے مطابق یہ تاخیر ہوئی ہو (نووی ص: ۲۲۵/ ج ۱) لیکن علامہ عینیؒ نے نووی کے اس تبصرہ سے اختلاف کیا ہے اور لکھا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز جیسے لوگوں کے بارے میں یہ تصور کیسے کرلیا جائے، کہ وہ امراء بنوامیہ کا طریقہ اختیار کرلیں گے اور سنت نبوی کو چھوڑ دیں گے۔ غالباً علامہ عینیؒ کی مراد یہ ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی نشو ونما اور تربیت چونکہ مدینہ طیبہ میں ہوئی ہے اور حضرت انسؓ نے ان کی نماز کے بارے میں یہ شہادت دی ہے: "**ما رأيت احداً اشبه صلاة بصلاة رسول الله** ﷺ **من هذا الفتى يعني عمر بن عبدالعزيز**" (مسند احمد ص: ۲۲۹/ ج: ۲) میں نے کوئی شخص ایسا نہیں دیکھا جس کی نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز سے بمقابلہ اس نوجوان یعنی عمر بن عبدالعزیز کے زیادہ مشابہت رکھتی ہو۔

علامہ عینیؒ کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے بارے میں نووی سنت کا صحیح علم نہ ہونے کا اندیشہ ظاہر کررہے ہیں۔ اسی زمانہ میں حضرت انسؓ ان کی نماز کو رسول اللہ ﷺ کی نماز سے مشابہ بتلارہے ہیں، تو کیسے نوویؒ کی توجیہ کو قابل قبول قرار دیا جائے؟

## حضرت انسؓ سے تفصیلی روایت

اس کے ساتھ یہ بات اور زیادہ اہم ہے کہ عصر کی نماز کے سلسلہ میں حضرت انسؓ ہی سے مسند احمد، مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور نسائی میں ایک روایت موجود ہے جس میں ظہر کی نماز کے بعد ملاقات کے لیے آنے والوں سے حضرت انسؓ نے عصر کے وقت کے سلسلے میں گفتگو فرمائی ہے اور وقت مکروہ تک موخر کرنے کی مذمت فرمائی ہے، جب کہ وقت مکروہ سے پہلے اس میں تعجیل کا کوئی مضمون نہیں ہے، اس روایت میں علاء بن عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ ہم لوگ ظہر کی نماز سے فارغ ہوکر حضرت انسؓ سے ملاقات کے لیے

ان کے گھر گئے، اس وقت حضرت انسؓ بصرہ میں مقیم تھے اور ان کا گھر مسجد کے برابر میں تھا، ہم پہنچے تو حضرت انسؓ نے فرمایا، عصر کی نماز پڑھ لی؟ ہم نے عرض کیا کہ ابھی تو ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر آئے ہیں، اس پر حضرت انسؓ نے فرمایا کہ اچھا! اب عصر کی پڑھ لو، چنانچہ ہم نے حضرت انسؓ کے ساتھ عصر کی نماز پڑھ لی، پھر حضرت انس نے فرمایا: "سمعت رسول الله ﷺ يقول : تلك صلوة المنافق يجلس يرقب الشمس حتى اذا كانت بين قرني الشيطان قام فنقرها اربعاً لا يذكر الله فيها الا قليلاً" (مسلم ص: ۲۲۵/ج:۱)۔

میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ وہ منافق کی نماز ہے جس میں وہ بیٹھا ہوا سورج کا انتظار کرتا رہتا ہے، حتی کہ جب وہ شیطان کے دونوں سینگوں کے درمیان آجائے تو اٹھے اور چار ٹھونگیں مار لے جس میں ذکر خداوندی کا حصہ برائے نام ہو۔

اس روایت میں حضرت انسؓ نے عصر کی نماز کو عجلت سے پڑھنے کی بات نہیں فرمائی، بلکہ عصر کی نماز کو وقت مکروہ میں داخل کرنے پر نکیر کی ہے، جس کو حدیث میں منافق کی نماز کہا گیا ہے اور جو سورج کے غروب کے قریب ہوتی ہے۔

اور ہماری سمجھ میں تو (واللہ اعلم) یہ بھی آتا ہے کہ حضرت انسؓ پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کے خادم خاص تھے اور انہوں نے عمر بھی طویل پائی تھی اور یہ روایت یہ بھی بتلا رہی ہے کہ حضرت انسؓ نے عصر کی یہ نماز گھر میں پڑھی جس کا سبب کبر سنی اور معذوری ہی ہو سکتا ہے، غرض یہ لوگ ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے تھے، خصوصاً عصر کے بعد حال معلوم کرنے اور حدیثیں سننے کے لیے بہت زیادہ آمدورفت رہتی تھی، اس لیے حضرت انسؓ کو جب معذوری کے سبب مسجد میں جانا نہ ہوتا تو وہ عصر کی نماز اول وقت میں یعنی ظہر کا وقت ختم ہوتے ہی پڑھ لیتے، غالباً یہ خیال فرماتے ہوں گے کہ اگر نماز اول وقت میں نہ پڑھوں گا تو اگر لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ شروع ہو گیا تو ممکن ہے کہ سلسلہ کلام طویل ہو جائے اور وقت مکروہ داخل ہو جائے، اسی لیے احتیاط کے تقاضے پر عمل کرتے ہوئے یہ صورت اختیار فرما لیتے تھے، اس لیے ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ حضرت انس کی مذکورہ بالا روایت سے عصر کی نماز کے مثل ثانی میں پڑھنے پر استدلال کرنا درست نہیں اور اس میں فریق ثانی کیلئے بہت گنجائش ہے، البتہ اگر کوئی حقائق کو تسلیم ہی نہ کرے تو دوسری بات ہے۔ واللہ اعلم

**تشریح روایت ہفتم** ساتویں روایت حضرت انسؓ سے دی گئی ہے اور اس کا مضمون تقریباً وہی ہے، جو پانچویں روایت میں آ گیا ہے کہ عصر کی نماز پڑھ کر ایک انسان بنی عمرو بنی عوف میں جاتا تو انہیں عصر کی نماز میں مشغول پاتا، بنو عمرو بن عوف قباء میں رہتے تھے اور اس روایت میں یہ آیا کہ عصر کی نماز پڑھ کر جانے والا قباء پہنچتا تو آفتاب ابھی بلند ہوتا۔

لفظ قباء پر یہ اشکال کیا گیا ہے کہ امام مالکؒ کے علاوہ اور کوئی راوی یہ لفظ نقل نہیں کرتا، چنانچہ بعض محدثین نے اس کو امام مالکؒ کا وہم قرار دیا ہے، لیکن علامہ عینیؒ اور حافظ ابن حجرؒ نے مختلف محدثین کے حوالہ سے مختلف جوابات نقل کیے ہیں

اور ثابت کیا ہے کہ امام مالک کی طرف وہم کی نسبت درست نہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ جب روایات میں عوالی کا لفظ آ رہا ہے اور قباء بھی عوالی ہی کا ایک حصہ ہے تو لفظ قباء کو وہم کہنے کے بجائے عوالی کے اجمال کی وضاحت قرار دینا زیادہ بہتر ہے۔

بہر حال اس روایت سے صرف یہ معلوم ہوا کہ عصر کی نماز کے بعد آفتاب کی بلندی میں قباء یعنی دو تین میل کی مسافت تک انسان چلا جاتا تھا، انصاف کی بات یہ ہے کہ اس سے بھی عصر کی تعجیل یعنی مثل ثانی میں پڑھنے کی صراحت نہیں ہوئی، بلکہ ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ مثل ثالث میں پڑھنے کی علامت ہے، کیوں کہ جو لوگ آنے جانے کے عادی ہوتے ہیں ان کے لیے تو عصر کے مثل ثالث میں پڑھنے کے بعد آفتاب کی بلندی میں دو تین میل چلنا بہت آسان ہے اور جو عادی نہیں ہیں وہ بھی یہ مسافت طے کر سکتے ہیں، کیوں کہ "مرتفعۃ" یعنی آفتاب کی بلندی کے معنی یہ ہیں کہ وہ افق سے اونچا ہی رہتا تھا، جیسا کہ طلوع آفتاب کے بعد ارتفاع کے معنی یہ ہیں کہ وہ افق سے اتنا اونچا ہو گیا کہ وہ صاف نظر آنے لگا، اسی طرح غروب سے پہلے بھی ارتفاع کے معنی یہی ہوں گے کہ آفتاب ابھی تک افق سے اتنا اونچا ہوتا تھا کہ صاف نظر آتا تھا۔ واللہ اعلم

**تشریح روایت ہشتم** تعجیل عصر پر استدلال کے لیے آخری اور آٹھویں روایت سے بھی حضرت انسؓ ہی کی ہے اور اس میں ساتویں روایت سے زیادہ تفصیل ہے کہ رسول اللہ ﷺ عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے جب آفتاب اونچا بھی ہوتا اور اس میں حیات بھی ہوتی، جاتے وقت بلندی اور زندگی دو باتوں کا ذکر ہے، پھر جانے والا عوالی تک چلا جاتا اور آفتاب ابھی تک اونچا ہوتا، پہنچتے وقت صرف بلندی کا ذکر ہے حیات اور زندہ ہونے کا ذکر نہیں، گویا جانے والا نماز پڑھ کر چلا ہے تو آفتاب بلند بھی تھا اور اس میں زندگی بھی تھی آفتاب کی زندگی کے ایک معنی تو یہ ہیں اس کی روشنی کا صاف ہونا، گویا اصفرار اور تغیر سے پہلے تک اس کو زندہ کہا جائے گا، اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ عصر کی نماز تو آفتاب کے اونچا اور روشن ہونے کی حالت میں ہوتی تھی، لیکن چند میل کی مسافت طے کرتے کرتے اس میں تغیر اور اصفرار آ جاتا تھا۔

ابوداؤد نے حضرت خثیمہؒ سے اس کے دوسرے معنی نقل کیے ہیں: "حیاتها ان تجد حرها" (ص۵۹/ج۱) آفتاب کی زندگی یہ ہے کہ تمہیں حرارت محسوس ہو، گویا جب تک حرارت قائم ہے وہ زندہ ہے اور جب حرارت کم یا ختم ہو گئی زندگی ختم ہو گئی، اس صورت میں مفہوم یہ ہوگا کہ عصر کی نماز کے وقت تو آفتاب میں حرارت ہوتی تھی، لیکن چند میل چلنے کے بعد وہ بے جان ہو جاتا تھا، حرارت باقی نہیں رہتی تھی۔

ان تشریحات کے بعد انصاف کی بات یہ ہے کہ اس روایت میں بھی عصر کے مثل ثانی میں پڑھنے کی کوئی صراحت یا مضبوط قرینہ نہیں ہے، بلکہ بغور دیکھا جائے تو یہ مثل ثالث میں پڑھنے کا قرینہ ہے، اس لیے کہ اگر یہ بات طے ہو جائے کہ ایک انسان ایک میل کا فاصلہ کتنی دیر میں طے کرتا ہے؟ اور دوسرے یہ کہ عصر کی نماز کے بعد جانے والا کتنے

میل جاتا تھا؟ تو مسئلہ بالکل صاف ہو جائے گا۔

ظاہر ہے کہ ایک میل کی مسافت چلنے والوں کے لیے پندرہ منٹ سے زیادہ کی نہیں، اس لیے اگر نماز پڑھنے کے بعد جانے والا ان عوالی میں جاتا تھا، جن کا فاصلہ دو میل تھا جیسا کہ ساتویں روایت میں قبا کی وضاحت ہے جس کا فاصلہ دو میل تھا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ مسجد نبوی میں عصر کی نماز ایسے وقت میں ہوتی تھی کہ اس کے تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد آفتاب میں تغیر آجاتا تھا، یا اس کی حرارت ختم ہو جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ مثل ثالث میں ہی ممکن ہے۔

اس حقیقت سے امام بخاریؒ بھی واقف ہیں، اس لیے انھوں نے آٹھویں روایت میں عوالی کے فاصلے کی وضاحت کی اور فرمایا: "وبعض العوالی من المدینة علی اربعة امیال اونحوه" کہ بعض عوالی کا فاصلہ چار میل یا اس کے قریب ہے۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جب پانچویں روایت میں بنی عمرو بن عوف کا اور ساتویں روایت میں قبا کا تعین ہو گیا تھا، پھر اس وضاحت کی کیا ضرورت ہے کہ عوالی کے بعض محلے چار میل کے فاصلے پر ہیں، یہ تو زبردستی کی بات ہوئی۔

نیز یہ کہ عوالی کی اس مسافت کا بیان اصل روایت میں نہیں ہے، یہ بیان یا تو خود امام بخاری کا ہے یا امام زہریؒ کا ہے فتح الباری اور عینی وغیرہ میں مسند عبدالرزاق وغیرہ کے حوالے سے اس وضاحت کو زہریؒ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، مگر وہاں علی اربعۃ امیال کے بجائے علی میلین اوثلاثۃ ہے، البتہ مسند احمد (ص ۱۶۱/ ج ۳) میں اس وضاحت کو زہری کی طرف منسوب کرکے اربعۃ کا ذکر بھی موجود ہے: "قال الزهری والعوالی علی میلین من المدینة اوثلاثة احسبه قال واربعة" لیکن اس طرح کی باتوں سے کیا کام چل سکتا ہے، جب یہ بات طے ہو گئی کہ قصہ بنو عمرو بن عوف کا ہے جو قبا میں رہتے تھے، تو دیگر عوالی کے فاصلے ذکر کرنے سے کیا فائدہ؟

خلاصہ یہ ہے کہ مسجد نبوی میں عصر کی نماز پڑھنے کے بعد دو میل، یا تین میل یا زہری کی وضاحت کے مطابق چار میل کی مسافت طے کرنے کے بعد آفتاب کا رنگ پھیکا پڑ جاتا تھا، یا اس کی گرمی کم یا ختم ہو جاتی تھی اور یہ بات بشرط انصاف مثل ثالث میں عصر پڑھ کر بھی ممکن ہے۔

## پیش کردہ روایات اور بخاریؒ کا مقصد

امام بخاریؒ کا مقصد عصر کی نماز میں تعجیل کا ثبوت پیش کرنا ہے، مگر انہوں نے جتنی روایات پیش کی ہیں ان میں سے کوئی روایت مثل ثانی میں یا مثل ثالث سے پہلے عصر کی نماز پڑھنے پر نص نہیں ہے، بلکہ ان میں سے ہر روایت کو آسانی کے ساتھ تعجیل کے بجائے تاخیر پر بھی محمول کیا جا سکتا ہے، کیونکہ تمام روایات میں وقت کی صراحت کے بجائے کچھ علامتیں بیان کی گئی ہیں اور ان علامتوں کی تشریح یا تطبیق میں وہ احتمالات پیدا ہوتے ہیں جو ہر روایت کی شرح میں بیان کیے گئے ہیں اور اتنے احتمالات کے ہوتے ہوئے مدعا کا ثبوت ناممکن ہے، ان احتمالات میں جہاں کچھ باتیں واقعی اور نہایت قریب کی ہیں، وہیں بعض احتمالات بعید بھی ہیں، لیکن یہ استدلال کرنے والوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ دلیل کے ساتھ پیدا ہونے والے احتمالات

کا سد باب کریں اور اپنی دلیل کو اس طرح پیش کریں کہ احتمال ناشی عن دلیل کی گنجائش نہ رہے، پھر یہ کہ امام بخاریؒ کی پیش کردہ روایات کے بارے میں جو عرض کیا گیا ہے، وہ محض احتمالات ہی نہیں بلکہ ہماری معروضات ان روایات کو تفصیلی روایات کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش ہیں، یا پھر انہی روایات کے اندر پائے جانے والے اشارات کی وضاحت کی گئی ہے مزید یہ کہ جو کہا گیا ہے وہ اگرچہ مذکورہ روایات میں تو اشارات کے درجہ میں ہو سکتے ہیں، مگر دوسری روایات میں صراحت کے ساتھ نص کے درجہ میں ثابت ہیں مثلاً:

(۱) حضرت ام سلمہؓ نے ارشاد فرمایا: "كان رسول الله ﷺ أشدُّ تعجيلاً للظهر منكم وانتم اشد تعجيلا للعصر منه" (ترمذی، مسند احمد) رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز میں تم سے زیادہ عجلت فرماتے تھے اور تم عصر میں رسول اللہ ﷺ سے زیادہ عجلت کرنے لگے ہو۔

(۲) حضرت ابو ہریرہؓ سے بروایت صحیح بحوالہ موطا امام محمد نقل کیا جا چکا ہے کہ عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھو جب تمہارا سایہ دو مثل ہو جائے۔

(۳) حضرت علیؓ سے (نسائی ص: ۱۳۹/ ج:۱، باب الصلوۃ قبل العصر میں اور ترمذی ص ۷۷/ ج۱، باب کیف کان النبی ﷺ یتطوع بالنہار میں) روایت ہے کہ ان سے رسول اللہ ﷺ کے دن کی نفلوں کے بارے میں سوال کیا گیا، تو جواب میں ارشاد فرمایا: "اذا كانت الشمس ههنا كهيئتها ههنا عند العصر صلى ركعتينِ واذا كانت الشمس ههنا كهيئتها ههنا عند الظهر صلى اربعا" (ترمذی) جب آفتاب یہاں (مشرق) میں جیسا وہاں (مغرب میں) عصر کے وقت ہوتا ہے، تو دو رکعت پڑھتے، پھر جب مشرق میں ایسا ہوتا جیسا کہ مغرب میں ظہر کے وقت ہوتا ہے تو چار رکعت پڑھتے۔

حضرت علیؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ کی اشراق کی نماز کے لیے حساب لگائیے کہ آفتاب صبح کے وقت، جانب مشرق میں اس جگہ کی محاذات میں ہوتا جہاں جانب مغرب میں عصر کی نماز کے وقت ہوتا ہے، اس وقت اشراق کی دو رکعت پڑھتے اور جب اور زیادہ بلند ہو جاتا اور جانب مشرق میں، اس جگہ کی محاذات میں آ جاتا جہاں جانب مغرب میں ظہر کے لیے ہوتا ہے تو چاشت کی چار رکعت پڑھتے، اس روایت سے بشرط انصاف عصر کی نماز کے لیے بہت ہی زیادہ تاخیر معلوم ہوتی ہے۔ پھر یہ کہ حضرت علیؓ کا عمل عصر کی نماز کو بہت زیادہ موخر کر کے پڑھنے کا روایات میں مذکور ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کوفہ کی مسجد میں تشریف فرما تھے، موذن نے آ کر عصر کی نماز کے لیے عرض کیا، تو فرمایا! بیٹھ جاؤ، کچھ دیر کے بعد اس نے پھر یاد دہانی کی تو حضرت علیؓ نے بہت سخت کلمات کہے: "هذا الكلب يعلمنا بالسنة" یعنی یہ کتا ہمیں سنت کی تعلیم دینا چاہتا ہے، پھر اس کے بعد حضرت علیؓ نے ایسے وقت میں نماز پڑھی کہ اس کے فوراً بعد آفتاب غروب ہونے لگا، یہ روایت مستدرک حاکم میں موجود ہے اور ذہبی نے بھی اس کو صحیح قرار دیا ہے۔

(۴) امام محمدؒ نے عصر کی نماز کے سلسلے میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے اصحاب کا عمل نقل کیا ہے: "عن ابی حنیفة عن حماد عن ابراهیم قال: ادرکت اصحاب ابن مسعود یوخرون العصر الی اخر الوقت، قال محمد: وبه ناخذ مالم تتغیر الشمس" (اخرجہ محمد فی الآثار، جامع مسانید الامام ص:۲۹۹) امام ابوحنیفہ حماد سے اور وہ ابراہیم نخعی سے نقل کرتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ کو دیکھا کہ وہ عصر کو وقت (مستحب) کے آخر تک موخر کرتے تھے۔ امام محمدؒ نے فرمایا اسی پر ہمارا عمل ہے جب تک آفتاب میں تغیر نہ آئے۔

پھر مصنف عبدالرزاق میں عصر کے سلسلے میں خود حضرت ابن مسعودؓ کا عمل تاخیر منقول ہے، امام طحاویؒ نے حضرت عبداللہ بن مسعود کے علاوہ اور صحابہؓ کرام کے نام بھی ذکر کیے ہیں۔

ان تمام روایات کا حاصل یہ ہے کہ عصر کی نماز میں وقت مکروہ سے پہلے تک تاخیر کرنا ہی افضل ہے، لیکن چونکہ اس نماز کا آخری وقت یعنی آفتاب میں تغیر اور اصفرار آجانے کا وقت کراہت رکھتا ہے، اس لیے جن روایات میں تعجیل کا مضمون بیان کیا گیا ہے ان کا مطلب یہی لیا جائے گا کہ نماز کو وقت مکروہ میں داخل ہونے سے بچانے کی تاکید کی گئی ہے، جیسا کہ حضرت انس کی اس باب میں مذکور چھٹی روایت کی تشریح سے واضح ہے۔ واللہ اعلم

## [۱۴] بَابُ اِثْمِ مَنْ فَاتَتْهُ الْعَصْرُ

(۵۵۲) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰهِ بْنُ یُوسُفَ قَالَ اَخْبَرَنَا مَالِكٌ عَنْ نَافِعٍ عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ اَلَّذِیْ تَفُوْتُهٗ صَلٰوةُ الْعَصْرِ فَكَاَنَّمَا وُتِرَ اَهْلُهٗ وَمَالُهٗ، قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللّٰهِ یَتِرَكُمْ وَتَرتُ الرَّجُلَ اِذَا قَتَلْتَ لَهٗ قَتِیْلًا اَوْ اَخَذْتَ مَالَهٗ.

**ترجمہ** باب، اس شخص کے گناہ کا بیان جس کی عصر کی نماز فوت ہوجائے۔ حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جس کی عصر کی نماز فوت (قضا) ہوگئی تو گویا اس کا گھر بار، مال ومتاع سب لٹ گیا، امام بخاری نے فرمایا کہ قرآن کریم میں جو "یترکم" آیا ہے، وہ "وترت الرجل" سے ہے، جب کسی کا کوئی آدمی قتل کردیا جائے یا اس کا مال چھین لیا جائے۔

**مقصد ترجمہ** امام بخاریؒ بھی کمال کرتے ہیں، برابر برابر ایک ہی طرح کے دو ترجمے رکھ دیے: ایک "اثم من فاتته العصر" نماز عصر کے فوت ہونے کے گناہ کا بیان اور دوسرے "إثمُ من ترك العصر" نماز عصر کو ترک کرنے کے گناہ کا بیان، اسی لیے بعض حضرات نے امام بخاری پر تکرار کا الزام عائد کیا ہے اور اکثر شارحین نے دونوں عنوانات میں فرق کرنے کی کوشش کی ہے، اتنا فرق تو بالکل ظاہر ہے کہ ترک اختیاری ہوتا ہے اور فوات غیر اختیاری، مگر اشکال یہ ہے کہ غیر اختیاری چیزوں پر اثم اور گناہ کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا، اسی لیے شاید امام ترمذیؒ نے روایت

باب پر جو عنوان دیا ہے اس میں غیر اختیاری ہونے کی وضاحت ہے ان کا عنوان ہے "باب ماجاء فی السھو عن وقت العصر" گویا ترمذی نے روایت کے مضمون کو سہو پر محمول کیا اور ابن حجرؒ نے اس کی یہ وضاحت کی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب آخرت میں نماز عصر کا ثواب دیا جائے گا تو سہو کرنے والے کو اپنی محرومی پر اتنا افسوس ہوگا جیسے اہل وعیال تباہ و برباد ہو گئے ہوں، گویا ترمذی کا عنوان اشارہ کر رہا ہے کہ حدیث پاک کے مضمون میں دنیوی گناہ کا ذکر نہیں ہے۔

مگر امام بخاریؒ نے اپنے ترجمہ میں اس پر اثم کا اطلاق کیا ہے، گویا انہوں نے ترجمہ کے ذریعہ حدیث کی شرح کردی کہ فوات بھی گناہ ہے اور اتنا بڑا گناہ ہے جس کی تفصیل روایت میں آرہی ہے۔

امام بخاریؒ کے غیر اختیاری فعل پر گناہ کے اطلاق کی وجہ سے شارحین نے مختلف راستے اختیار کئے ہیں، مہلب اور ان کے ہم خیال شارحین کی رائے یہ ہے کہ فوات عصر سے مراد جماعت کا فوت ہونا ہے کیونکہ یہ وقت دن اور رات کے فرشتوں کے اجتماع کا ہوتا ہے، امام اوزاعی کی رائے کچھ شارحین نے نقل کی ہے: "فواتھا ان تدخل الشمس صفرۃ" یعنی فوات عصر کے معنی یہ ہیں کہ اصفرار شمس کا وقت آجائے، علامہ عینیؒ اور حافظ ابن حجرؒ کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ فوات سے مراد، نماز عصر کو کسی عذر کے بغیر وقت جواز سے موخر کرنا ہے، کیونکہ گناہ کا ترتب اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب کوئی شرعی عذر نہ ہو، غرض یہ ہے کہ شارحین نے امام بخاریؒ کے ترجمۃ الباب میں لفظ اثم کی وجہ سے طرح طرح کی باتیں ارشاد فرمائی ہیں، مگر ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ دونوں ترجمے الگ الگ ہیں اور اپنی اپنی جگہ درست ہیں، اور فوات غیر اختیاری پر اثم کا اطلاق اس لیے کیا گیا ہے کہ فوات اگرچہ غیر اختیاری طور پر ہوا لیکن جن اسباب کی بنیاد پر یہ کوتاہی ہوئی وہ اسباب تو غیر اختیاری نہ تھے، انسان کو کاروبار کی مشغولیت، یا اہل وعیال کے لیے جدوجہد میں اتنا غفلت شعار نہیں ہونا چاہئے کہ نماز عصر جیسی اہم عبادت میں کوتاہی ہو جائے، چنانچہ جن دو اسباب کی وجہ سے انسان کوتاہی کرتا ہے، روایت میں انہیں کا ذکر ہے: "وتر اھلہ ومالہ" امام بخاری گویا ترجمۃ الباب میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ غیر اختیاری ہونے کے باوجود یہ معاملہ معمولی نہیں ہے، بلکہ اس چیز کو حدیث پاک میں بہت اہمیت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

### تشریح حدیث

حدیث پاک میں بیان کیا گیا ہے کہ جس کی عصر کی نماز فوت ہوگئی تو یہ سمجھنا چاہئے کہ گویا اس کا مال واسباب، اس کے اہل وعیال برباد ہو گئے، مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی شخص نے کسی کام میں مشغول ہو کر عصر کی نماز کی پرواہ نہ کی اور اس کی نماز وقت سے بے وقت ہوگئی، تو یہی کہا جائے گا کہ اس نے نماز کو فوت کردیا، پھر اس کا اس کی طبیعت پر کیا اثر ہونا چاہئے؟ فرماتے ہیں کہ اتنا اثر ہونا چاہئے جتنا اہل وعیال اور مال واسباب کی تباہی و بربادی کا ہوتا ہے، اس کو یہ سمجھنا چاہئے کی عصر کی نماز کیا فوت ہوئی، سب کچھ فوت ہو گیا، جب اتنا اہتمام ہوگا تو یقیناً عصر کی پابندی کرے گا۔

روایت میں مال اور اہل کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے، کیونکہ نماز کے فوت ہونے کا سبب بالعموم یہی دو چیزیں ہوتی

ہیں اور انسان یہ سوچتا ہے کہ مال حاصل کرلے، انسان کی طبیعت میں مال کی محبت بھی رکھی گئی ہے اور اہل وعیال کی خدمت کا ذریعہ بھی یہی ہے، نیز عصر کا وقت ایسا وقت ہے کہ اس میں کاری گر، تاجر اور کاشتکار، سب ہی لوگ زیادہ مشغول رہتے ہیں، کاری گر دن بھر کام کرتا ہے اور شام کے وقت مصنوعات کی فروخت کے لیے کھڑا رہتا ہے، یا چکر لگاتا ہے، تاجر کے لیے بھی تجارت کی گرم بازاری کا یہی وقت ہے اور کاشتکار بھی یہی سوچتا ہے کہ دن ڈوب رہا ہے، اس لیے بعجلت ممکنہ اپنی کاشت کی ضروریات سے فراغت حاصل کرلے۔

روایت میں یہ ذکر آیا کہ اگر مال ودولت کے حصول یا دیگر مشغولیتوں میں عصر کی نماز فوت ہوگئی تو یہ تصور کرو کہ کچھ کمایا نہیں، بلکہ سب کچھ کھودیا ہے، اب رہی یہ بات کہ اہل وعیال کی خدمت اور مال ومتاع کے حصول کے سبب نماز کے فوت کرنے کا گناہ تو سب ہی نمازوں میں ہے، پھر عصر کی کیا خصوصیت ہے؟ تو ابن عبدالبر نے تو یہ کہا کہ اس سلسلے میں سب نمازیں برابر ہیں مگر عصر کی نماز کا خصوصی ذکر اس لیے آ گیا کہ شاید کسی سائل نے عصر ہی کی نماز کے بارے میں سوال کیا ہوگا اور یہ بات آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمائی ہوگی، اس پر علامہ نوویؒ نے گرفت کی ہے کہ ابن عبدالبر کی وضاحت تو منصوص سے غیر منصوص کو ملانے کے مرادف ہے، جب کہ اس کے لیے علت کا اشتراک ضروری ہوتا ہے اور یہاں ایسا نہیں ہے، مگر ابن عبدالبرؒ کے موقف پر ان روایتوں سے استدلال کیا جاسکتا ہے جن میں کسی بھی نماز کے فوت کرنے پر وعید کے کلمات مذکور ہیں، جیسے مسند احمد میں حضرت نوفل بن معاویہ سے مرفوعاً منقول ہے: "**من فاتته الصلوة فكانما وتر اهله وماله**" جس کی نماز فوت ہوگئی تو گویا اس کا مال واہل سب تباہ ہوگئے، لیکن ابن عبدالبرؒ کی بات کا تسلیم کرنا ضروری نہیں کیوں کہ عصر کی نماز میں متعدد ایسی باتیں ہیں کہ مذکورہ وعید صرف اسی کے لیے بھی ہوسکتی ہے، نسائی اور مسند احمد وغیرہ میں روایت موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن عصر کی نماز پڑھائی اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد فرمایا: "**ان هذه الصلوة فرضت على من كان قبلكم فتوا نوافيها وتركوها فمن صلاها منكم ضعف له اجره ضعفين**" (مسند احمد ص ۳۹۷/ ج ۶)

یہ نماز عصر تم سے پچھلی امتوں پر بھی فرض کی گئی تھی، لیکن انھوں نے تن آسانی کا ثبوت دیا اور اس کو چھوڑ دیا، اس لیے تم میں سے جو اس کو پڑھے گا اس کو دوہرا اجر دیا جائے گا۔

معلوم ہوا کہ یہ نماز پچھلی امتوں پر بھی فرض کی گئی تھی اور وہ اس کی پابندی نہ کرنے کے سبب معتوب ہوئے، اس لیے مسلمانوں کو بطور خاص اس کی پابندی کا حکم دیا گیا۔

اسی طرح نماز عصر کو "**الصلوة الوسطى**" کہہ کر بھی اس کی اہمیت ظاہر کی گئی ہے، اس کے علاوہ اور بھی خصوصیات بیان کی جاسکتی ہیں اور سب سے آسان بات وہ ہے جو علامہ عینیؒ اور ابن حجرؒ نے فرمائی کہ اس بحث میں پڑنا ہی زائد ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ جس نماز کو جو خصوصی فضیلت عطا فرمائے اور پیغمبر علیہ السلام جس نماز کے سلسلے میں جو خصوصی بات ارشاد

فرمائیں وہ سب چون وچرا کے بغیر قابل قبول اور واجب التسلیم ہے۔

**قال ابو عبداللہ الخ** . اس عبارت میں امام بخاریؒ " **وتر اهله وماله** " کا اعراب بیان کرنا چاہتے ہیں، جمہور محدثین نے " **اهله وماله** " کو منصوب پڑھا ہے، قاضی عیاض نے یہی لکھا ہے کہ اس کو نصب کے ساتھ ضبط کیا گیا ہے، نوویؒ نے " **اهله وماله** " کو مرفوع پڑھا ہے اور بخاری میں مستملی کی یہی روایت ہے، بعض حضرات نے منصوب اور مرفوع دونوں احتمال بیان کئے ہیں۔

امام بخاریؒ کی اس وضاحت کے معنی عام طور پر شارحین نے یہی لیے ہیں کہ وہ دونوں احتمالات کو مدلل کر رہے ہیں "وتر" باب ضرب سے آتا ہے، اگر متعدی بیک مفعول ہو جیسے: "**وتر فلانٌ فلاناً**" تو معنی ہیں تکلیف پہنچانا، ستانا اور اگر متعدی بدو مفعول ہو جیسے: "**وتر فلانٌ فلاناً حقَّه اوماله**" تو معنی ہیں گھٹانا یا کم کر دینا، یعنی فلاں نے فلاں کا حق یا مال گھٹا دیا۔

امام بخاریؒ نے سورہ محمد سے جو آیت " **لَنْ يَتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ** " نقل کی ہے، اس سے جمہور کی روایت نصب کی تائید مقصود ہے، کیونکہ " **یتر** " یہاں متعدی بدو مفعول ہے جو " **کم** " ضمیر خطاب، مفعول اول کو اور "**اعمالکم**" مفعول دوم کو نصب دے رہا ہے، اس لیے اگر " **وتر اهله وماله**" میں اہلہ اور مالہ کو منصوب پڑھا جائے تو "وتر" کی ضمیر مستتر اس کا نائب فاعل ہو جائے گی۔

اور اگر "**وتر اهله وماله** " کو اہل اور مال کے رفع کے ساتھ پڑھا جائے، تو اس کے لیے امام بخاریؒ نے وتر کا دوسرا استعمال "**وترت الرجل**" نقل کیا یعنی اس لفظ کو متعدی بیک مفعول بھی استعمال کیا جاتا ہے، یہ اس وقت بولتے ہیں جب کسی کا کوئی عزیز قتل کر دیا جائے یا اس کا مال چھین لیا جائے اور اس میں قصاص یا انتقام یا اپنا حق وصول کرنے کی طاقت نہ ہو، ایسی صورت میں انسان کے لیے دو صدمہ جمع ہو جاتے ہیں، ایک نقصان کا رنج اور دوسرے بے کسی کا صدمہ۔

## [۱۵] بَابُ اِثْمِ مَنْ تَرَكَ الْعَصْرَ

(۵۵۳) حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ حَدَّثَنَا هِشَامٌ قَالَ اَخْبَرَنَا يَحْيٰى بْنُ اَبِىْ كَثِيْرٍ عَنْ اَبِىْ قِلَابَةَ عَنْ اَبِى الْمَلِيْحِ قَالَ كُنَّا مَعَ بُرَيْدَةَ فِىْ غَزْوَةٍ فِىْ يَوْمٍ ذِىْ غَيْمٍ فَقَالَ بَكِّرُوْا بِصَلٰوةِ الْعَصْرِ فَاِنَّ النَّبِىَّ صلى الله عليه وسلم قَالَ: مَنْ تَرَكَ صَلٰوةَ الْعَصْرِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ. (آئندہ: ۵۹۴)

**ترجمہ** | اس شخص کے گناہ کا بیان جس نے عصر کی نماز کو ترک کر دیا ہو۔ حضرت ابو الملیحؒ کہتے ہیں کہ ہم ایک غزوہ میں حضرت بریدہؓ کے ساتھ تھے، دن ابر آلود تھا، تو حضرت بریدہؓ نے فرمایا کہ عصر کی نماز کو جلدی پڑھ لو، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے عصر کی نماز کو چھوڑ دیا اس کا عمل اکارت ہو گیا۔

**مقصد ترجمہ** پچھلے باب میں فوات کی تعبیر تھی جس کا مفہوم غیر اختیاری طور پر نماز عصر سے محرومی لیا گیا تھا، اب اختیاری طور پر عصر کی نماز کو ترک کر دینے کا حکم بیان کرنا چاہتے ہیں، یعنی اگر عمداً اور دانستہ عصر کو ترک کر دیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ ظاہر ہے کہ جب فوات میں یہ فرمایا گیا ہے کہ گویا وہ اہل وعیال اور مال ومتاع کی تباہی وبربادی کے مرادف ہے، تو عمداً ترک کرنے میں اس سے کہیں زیادہ گناہ ہوگا، یہ فرق دونوں ابواب کے تحت دی گئی روایات کے الفاظ سے واضح ہے، فوات کے تحت جو مضمون دیا گیا ہے اس کی تعبیر کے لیے ”کأنّما“ لایا گیا ہے جو تشبیہ کے لیے آتا ہے، کہ گویا اس کے اہل وعیال تباہ ہوگئے، اور ترک کے تحت جو مضمون دیا گیا ہے اس پر ”قد“ داخل ہے جو تحقیق کے لیے آتا ہے، یعنی جس نے عصر کی نماز ترک کر دی تو بلا شبہ اس کا عمل اکارت اور ضائع ہوگیا، دوسرا فرق یہ ہے کہ وہاں نقصان متعلقات کا ہے اور یہاں خود اپنا نقصان ہے، جس کا انسان پر زیادہ اور براہ راست اثر ہوتا ہے۔

**تشریح حدیث** ابوالملیح عامر بن اسامہ ہذلی کہتے ہیں کہ ہم لوگ ایک غزوہ میں حضرت بریدہ اسلمیؓ کے ساتھ تھے، ابر کا دن تھا، تو حضرت بریدہؓ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا: ”بکروا بصلوة العصر“ یعنی عصر کا وقت ہوگیا ہے نماز جلدی پڑھ لو، کیونکہ ایک تو ابر کا دن ہے، ہوسکتا ہے کہ بارش شروع ہو جائے اور دشواری ہو یا اندھیرا ہو جائے، اور وقت کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے، دوسرے یہ کہ غزوہ کا موقع ہے، ہوسکتا ہے کہ دشمن سے مڈبھیڑ ہو جائے اور نماز کی صحیح طور پر ادائیگی میں پریشانی ہو، یا پھر مذکورہ بالا چیزوں کی وجہ سے وقت مکروہ داخل ہو جائے وغیرہ، اس لیے احتیاط اسی میں ہے کہ نماز عصر کو آج یوم غیم میں اول وقت میں پڑھ لیا جائے، حنفیہ کا مسلک بھی یہی ہے کہ ” مافیہ عین یوم غین “ یعنی جن نمازوں میں عین ہے مراد ہیں عصر اور عشا انہیں غیم یعنی ابر کے دن اول وقت میں پڑھا جائے، یہ ہدایت اس لیے دی گئی کہ اعتدال سے ہٹنے والے انسان دو طرح کے ہوتے ہیں: کچھ تو غلو کی حد تک احتیاط پر عمل کرنے والے ہوتے ہیں اور کچھ زیادہ متساہل ہوتے ہیں، جس کے مزاج میں پہلی چیز ہے وہ گہرائی میں جانے کی کوشش کرے گا اور اس خیال میں بیٹھا رہے گا کہ ابھی وقت ہوا ہے یا نہیں؟ اور جس کے مزاج میں تساہل ہے وہ وقت کی پرواہ نہ کرے گا اور یہ سوچتا رہے گا کہ ابھی تو وقت ہے اٹھ کر پڑھ لیں گے، گویا دونوں طرف سے خطرہ ہے، ایک تو وقت ہو جانے کے باوجود محسوس نہیں کرتا اور دوسرا بے پرواہی سے کام لیتا ہے، اس لیے تاکید کر دی گئی کہ بادل ہو تو نماز کو اول وقت میں پڑھ لیا جائے، چنانچہ موسم کے ابر آلود ہونے کی وجہ سے حضرت بریدہؓ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے نماز عصر کو ترک کر دیا اس کا عمل سوخت ہوگیا۔

**حبط عمل سے کیا مراد ہے؟** اب یہاں ایک بحث یہ ہے کہ عمل کے برباد اور سوخت ہونے سے کیا مراد ہے؟ کیونکہ حبط اعمال تو کفر وارتداد اور شرک کی سزا ہے، قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا: ”**مَنْ يَّكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهٗ**“ (سورۃ المائدہ، آیت: ۵) جو ایمان کے بجائے کفر اختیار کرے گا اس کا عمل سوخت کر دیا جائے گا، یا سورۃ البقرہ آیت: ۲۱۷/ میں فرمایا گیا: ”**وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ**

حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ " تم میں سے جو بھی اپنے دین صحیح کو چھوڑ کر ارتداد اختیار کرے گا اور پھر کفر ہی کی حالت میں انتقال کرے گا، تو یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال سوخت ہو جائیں گے، یا شرک کے بارے میں سورۃ الانعام آیت: ۸۸/ میں ارشاد فرمایا گیا: "وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ " اور اگر لوگوں نے شرک اختیار کیا تو ان کے تمام اعمال سوخت ہو جائینگے۔

خلاصہ یہ ہے کہ حبط عمل کی سزا، کفر، شرک اور ارتداد کے بارے میں ہے اور یہاں نماز عصر کے ترک پر اس سزا کو مرتب فرمایا گیا ہے، جب کہ یہ کفر و شرک نہیں ہے، چنانچہ اس روایت کے ظاہری معنی سے مرتکب کبیرہ کے کفر کا عقیدہ رکھنے والے فرقوں جیسے خوارج وغیرہ نے استدلال کیا ہے کہ "من ترك صلوة العصر فقد حبط عمله " اس آیت کی نظیر ہے جس میں فرمایا گیا ہے: "وَمَنْ يَكْفُرْ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُ "یعنی جس طرح کفر پر حبط عمل کی وعید ہے اسی طرح ترک صلوۃ پر حبط عمل کی وعید آئی ہے، اس سے معلوم ہوا ہے کہ ترک صلوۃ اور کفر ایک ہی جیسی دو چیزیں ہیں، لیکن اس استدلال کی کمزوری ظاہر ہے، جواب دینے والوں نے جواب دیا کہ آیت میں فرمایا گیا ہے کہ کفر کی سزا حبط عمل ہے اس کا مفہوم یہ ہوا کہ جو کفر اختیار نہیں کرے گا، اس کو حبط عمل کی سزا نہیں دی جائے گی، گویا آیت کا مفہوم حدیث باب کے مضمون سے متعارض ہو گیا اور ایسی صورت میں تطبیق یا کسی مضمون میں توجیہ یا تاویل کرنا متعین ہو جاتا ہے، چنانچہ حدیث باب میں مختلف توجیہات کی گئی ہیں، کسی نے ترک کے معنی میں توجیہ کی ہے یعنی اگر فرضیت کا انکار کرتے ہوئے، نماز ترک کی تو انکار فرضیت کی بنیاد پر کفر آ گیا اور سارا عمل سوخت ہو گیا، کسی نے حبط کے معنی میں توجیہ کی ہے، یعنی حبط عمل سے مراد حقیقت نہیں بلکہ تشبیہ دینا مقصود ہے کہ ایسا انسان اتنا محروم اور بدنصیب ہے جیسے وہ انسان جس کے تمام اعمال سوخت ہو جائیں، اس کے علاوہ اور توجیہات بھی کی گئی ہیں۔

ایک قابل قبول توجیہ یہ ہے کہ اس عمل کا نفع ختم ہو گیا یعنی نماز کا فائدہ تھا خدا کے تقرب کا حصول اور ایک نماز سے دوسری نماز تک کی تمام سیئات کی معافی، مگر یہ تاثیر اب کہاں؟ اب قضا کر کے اگر نماز پڑھ بھی لی تو ثواب کا وہ استحقاق نہیں رہا، یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ نماز عصر کے ترک کرنے کی نحوست یہ ہے کہ صرف اسی ایک عمل کی نہیں، سارے دن کے اعمال صالحہ کی تاثیر ختم ہو گئی اور برکت سے محروم کر دیا گیا، جیسے شراب پینے والے کے بارے میں آتا ہے کہ اس عمل بد کی نحوست سے چالیس دن کی نمازیں رد کر دی جاتی ہیں، ترمذی و ابن ماجہ وغیرہ میں روایت ہے: "من شرب الخمر وسكر لم تقبل له صلوة اربعين صباحاً " (ابن ماجہ کتاب الاشربہ) جو شراب پیئے اور نشہ کرے اس کی نماز چالیس دن تک قبول نہیں کی جائے گی۔

اور سب سے اچھی اور راجح بات یہ ہے کہ ظاہری معنی مراد نہیں، بلکہ تہدید مقصود ہے، یہ تعبیر تہدید کے معنی بیان کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ استعمال فرماتے ہیں، جیسے: "سباب المومن فسوق وقتاله كفر " کہ مومن کو

برا کہنا یا گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کرنا کفر ہے، یا ارشاد فرمایا گیا: "لایزنی الزانی حین یزنی وھو مومن" زانی جس وقت مبتلائے زنا ہوتا ہے، تو مومن ہونے کی حالت میں نہیں ہوتا۔ ایسے مقامات پر تہدید اور زجر کے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔　　واللہ اعلم

## [۱۶] بَابُ فَضْلِ صَلٰوةِ الْعَصْرِ

(۵۵۴) حَدَّثَنَا الْحُمَيْدِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا مَرْوَانُ بْنُ مُعَاوِيَةَ قَالَ حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ عَنْ قَيْسٍ عَنْ جَرِيْرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ قَالَ كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ فَنَظَرَ اِلَى الْقَمَرِ لَيْلَةً فَقَالَ اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هٰذَا الْقَمَرَ لَا تُضَامُّوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهٖ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَا تُغْلَبُوْا عَلٰى صَلٰوةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا فَافْعَلُوا ثُمَّ قَرَأَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ (ق/ آیت:۳۹) قَالَ اِسْمَاعِيْلُ اِفْعَلُوْا لَا تَفُوْتَنَّكُمْ.

(آئندہ: ۵۷۳، ۴۸۵۱، ۷۴۳۴، ۷۴۳۵، ۷۴۳۶)

(۵۵۵) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ يُوْسُفَ قَالَ حَدَّثَنَا مَالِكٌ عَنْ اَبِي الزِّنَادِ عَنِ الْاَعْرَجِ عَنْ اَبِيْ هُرَيْرَةَ اَنَّ رَسُوْلَ ﷺ قَالَ يَتَعَاقَبُوْنَ فِيْكُمْ مَلَائِكَةٌ بِاللَّيْلِ وَمَلَائِكَةٌ بِالنَّهَارِ وَيَجْتَمِعُوْنَ فِيْ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَصَلٰوةِ الْعَصْرِ ثُمَّ يَعْرُجُ الَّذِيْنَ بَاتُوْا فِيْكُمْ فَيَسْاَلُهُمْ رَبُّهُمْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِهِمْ كَيْفَ تَرَكْتُمْ عِبَادِيْ فَيَقُوْلُوْنَ تَرَكْنَا هُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ وَاَتَيْنَا هُمْ وَهُمْ يُصَلُّوْنَ.　　(آئندہ: ۳۲۲۳، ۷۴۲۹، ۷۴۸۶)

**ترجمہ** باب، نماز عصر کی فضیلت کا بیان۔ حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ نے ایک رات میں چاند کی طرف دیکھا پھر فرمایا کہ بے شک! تم لوگ اپنے پروردگار کو اسی طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو، اس کے دیکھنے میں کسی بھیڑ یا مزاحمت کی نوبت نہ آئے گی، پس اگر یہ کرسکو کہ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے کی نمازوں سے مغلوب نہ ہوجاؤ (یعنی پابندی سے ان کو ادا کرسکو) تو کرنا، پھر یہ آیت پڑھی "فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ الآية" کہ طلوع آفتاب سے پہلے اور غروب آفتاب سے پہلے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح بیان کرو یعنی نماز پڑھا کرو، اسماعیل بن ابی خالد نے کہا کہ "افعلوا" کا مطلب یہ ہے کہ یہ نمازیں تم سے فوت نہ ہوجائیں، ان کو ضرور پڑھا کرو۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے درمیان رات کے فرشتے اور دن کے فرشتے نوبت بہ نوبت آیا کرتے ہیں، اور فجر کی نماز میں اور عصر کی نماز میں اکٹھے ہوجاتے ہیں، پھر وہ فرشتے جو رات کے وقت تمہارے ساتھ رہے تھے وہ عالم

بالا کی طرف عروج کرتے ہیں، تو ان سے ان کا پروردگار سوال کرتا ہے، حالانکہ وہ ان سے زیادہ جاننے والا ہے، کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا تو فرشتے جواب دیتے ہیں کہ ہم انہیں نماز پڑھتے ہوئے چھوڑ کر آئے ہیں اور جب ہم وہاں پہنچے تھے تو اس وقت بھی وہ نماز میں مشغول تھے۔

**مقصد ترجمہ** نماز عصر کے فوات اور ترک کے نقصان وخطرات پر تنبیہ فرما کر اب ترغیب کا مضمون ذکر کر رہے ہیں، نماز عصر کی فضیلت، لیکن فضیلت تو تمام ہی نمازوں میں ہے، عصر ہی کی کیا خصوصیت ہے؟ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے فرمایا کہ بخاری کا مقصد یہ ہے کہ نماز عصر کو فجر کے علاوہ بقیہ نمازوں پر فضیلت حاصل ہے، جیسا کہ باب کے تحت ذکر کردہ روایات سے واضح ہے، اس پر علامہ عینیؒ کو اعتراض ہے کہ یہ بات تکلف سے خالی نہیں ہے، اس لیے کہ تمام نمازیں فضیلت میں مشترک ہیں، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ فجر اور عصر کی نمازوں کو بقیہ نمازوں پر فضیلت حاصل ہے، ہاں اتنی بات ہے کہ امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں صرف عصر کا ذکر کیا، فجر کا نہیں کیا جیسا کہ قرآن کریم میں "سَرَابِيلَ تَقِيكُمُ الحَرَّ" صرف گرمی سے حفاظت کا ذکر ہے، سردی سے حفاظت خود سمجھ میں آجاتی ہے، اس لیے علامہ عینی کا رجحان یہ ہے کہ ترجمہ کا مقصد، عصر اور فجر دونوں نمازوں کی یکساں فضیلت کا بیان ہے، چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ بخاریؒ نے "باب فضل صلوۃ الفجر والعصر" کا ترجمہ دیا ہوتا تو زیادہ بہتر تھا۔

**حضرت الاستاذ کا ارشاد** مگر یہ سب بڑوں کی باتیں ہیں، ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ امام بخاری کا مقصد یہاں صرف عصر کی فضیلت کا بیان ہے، کیونکہ عصر سے متعلق ابواب منعقد کئے جا رہے ہیں، جب فجر سے متعلق ابواب آئیں گے تو وہاں مستقل ترجمہ منعقد کریں گے "باب فضل صلوۃ الفجر" اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ امام بخاری نماز عصر کو تمام نمازوں سے افضل قرار دے رہے ہوں، اگرچہ پہلی روایت سے فجر اور عصر دونوں کی فضیلت یکساں معلوم ہوتی ہے کہ رویت باری کی نعمت کے حصول میں دونوں نمازیں موثر ہیں اور دوسری روایت سے بھی بہ ظاہر دونوں نمازوں کی فضیلت یکساں معلوم ہوتی ہے کہ فرشتے دونوں نمازوں میں شرکت کرتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ حقیقت یہ ہے کہ یہی دوسری روایت عصر کی خصوصی فضیلت کی طرف اشارہ کر رہی ہے، کیونکہ روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کا اجتماع فجر اور عصر میں ہوتا ہے، مگر ان دونوں میں ایک فرق ہے کہ فجر کی نماز میں جو فرشتے آتے ہیں وہ دن کے فرشتے ہیں اور ان کی آمد اپنے وقت مقرر پر ہے، کیونکہ دن صبح صادق سے شروع ہوجاتا ہے، برخلاف نماز عصر کے کہ ان فرشتوں کی ڈیوٹی رات کی ہے، اگر یہ اپنے وقت مقرر پر آتے تو انہیں مغرب میں شریک ہونا تھا، لیکن یہ فرشتے عصر ہی سے حاضر ہوگئے، معلوم ہوا کہ قبل از وقت حاضری میں نماز عصر کی فضیلت کا دخل ہے، اس سے معلوم ہوا کہ نماز عصر کو فجر سے زیادہ فضیلت حاصل ہے۔　　　واللہ اعلم

**تشریح حدیث اول** پہلی روایت میں حضرت جریر بن عبداللہؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ ﷺ نے رات کے وقت چودھویں رات کے چاند کو دیکھ کر ارشاد فرمایا کہ جس طرح تم اس چاند کو اپنی اپنی جگہ بغیر کسی مزاحمت کے دیکھ رہے ہو، اسی طرح قیامت میں کسی دشواری یا مزاحمت کے بغیر پروردگار عالم کی رویت نصیب ہوگی۔

آگے ارشاد فرمایا کہ اگر تم سے ہو سکے کہ تم طلوع سے قبل والی نماز اور غروب سے قبل والی نماز کے معاملہ میں دنیوی کاموں سے مغلوب نہ ہو تو ایسا کرنا، یعنی جو اسباب غفلت ان نمازوں کے اہتمام کے منافی ہیں، جیسے سوجانا یا دنیوی کاروبار میں مشغولیت وغیرہ، ان سے بچنے کی کوشش کرو اور ہمہ وقت ان نمازوں کی طرف متوجہ رہو، کیونکہ رویت باری جو یقینی طور پر مسلمانوں کو قیامت میں حاصل ہونے والی ہے، اس میں نماز عصر اور نماز فجر کی پابندی کا بڑا دخل ہے، اگر ان دونوں نمازوں کو پابندی سے ادا کرتے رہو گے تو قیامت کے دن خدا کو اس طرح دیکھ سکو گے جس طرح آج چودھویں رات کے، چاند کو مزاحمت کے بغیر دیکھ رہے ہو، وجہ یہ ہے کہ ان دونوں اوقات اور ان کی نمازوں میں مختلف خصوصیات ہیں، ان دونوں اوقات میں ایک وقت غفلت اور نیند کا ہے اور دوسرا مشغولیت کا اور ان نمازوں میں خاص بات یہ ہے کہ یہ ملت ابراہیمی کی نمازیں ہیں اور اسی لیے اگرچہ نماز تو لیلۃ المعراج میں فرض ہوئی ہے، لیکن پیغمبر علیہ السلام نے ان نمازوں کو فرضیت سے پہلے بھی اختیار فرما رکھا تھا وغیرہ۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایک تو یہ خصوصیات ہیں اور دوسرے یہ کہ ان نمازوں کی پابندی سے خداوند کریم کی رویت نصیب ہوگی، ترمذی میں روایت ہے کہ رویت صبح وشام ہوگی: " **واکرمهم علی اللہ من ینظر الی وجهه غدوة وعشية** "(ترمذی ص:۷۸/ج:۲) اللہ کے نزدیک اہل ایمان میں سب سے زیادہ باعزت وہ ہوگا جسے صبح وشام باری تعالیٰ کی رویت میسر ہوگی۔

اسی طرح بعض روایات میں ابن عمرؓ اور حذیفہؓ سے نقل کیا گیا ہے: " **من اهل الجنة من ینظر الی وجهه غدوة وعشية** " اہل جنت میں کچھ ایسے ہوں گے جو صبح وشام رویت باری تعالیٰ سے مشرف کیے جائیں گے:" **ثم قرأ فسبح الخ** " پھر اس مضمون کو مدلل کرنے کے لیے یہ آیت پڑھی جس میں فرمایا گیا ہے کہ طلوع آفتاب اور غروب آفتاب سے پہلے اللہ کے نام کی تسبیح یعنی نمازوں کا اہتمام کرو، یہ آیت پڑھنے والے کون ہیں؟ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والے حضور پاک ﷺ ہیں، مگر مسلم شریف کی روایت میں صراحت ہے "**ثم قرأ جرير الخ** " اس کا مطلب یہ ہوا کہ پڑھنے والے حضرت جریرؓ ہیں۔

" **وقال اسماعيل افعلوا لا يفوتنكم** " محدث اسماعیل نے جو حضرت قیسؒ کے شاگرد ہیں "افعلوا" کے معنی بیان کیے ہیں، کہ " **افعلوا** " کے معنی ہیں " **لاتفوتنكم** " بیان کی وجہ یہ ہے کہ استطاعت کا تعلق امور وجودیہ یعنی مثبت چیزوں سے ہوتا ہے اور یہاں استطاعت کو " **لا تغلبوا** " سے متعلق کیا گیا ہے، جب کہ مغلوب نہ ہونا ایک عدمی چیز ہے،

اسمعیل کی وضاحت سے معلوم ہوا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے اسباب اختیار کرو جس سے فوات کی نوبت نہ آئے، گویا استطاعت کا تعلق یا اسباب سے ہے، جو وجودی ہیں، یا مواظبت سے ہے جو امر وجودی ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان نمازوں کی مواظبت کرو گے، تو اللہ کی رویت نصیب ہوگی۔

**رؤیت باری کا مسئلہ**

آخرت میں اہل ایمان کو باری تعالیٰ کی رویت نصیب ہوگی، یہ بات قرآن کریم کی آیات، احادیث کثیرہ اور صحابہ کرام اور ان کے بعد آنے والے اہل حق کے اجماع سے ثابت ہے، احادیث رویت نقل کرنے والے صحابہ کرام کی تعداد بیس سے زائد بیان کی گئی ہے، جس میں حضرت ابوبکر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت معاذ بن جبل، حضرت ابوموسیٰ، حضرت ابن عباس، حضرت ابن عمر، حضرت حذیفہ، حضرت ابوامامہ، حضرت ابوہریرہ، حضرت جابر، حضرت انس، حضرت عمار بن یاسر، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبادہ اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہم وغیرہ شامل ہیں۔

لیکن معتزلہ، خوارج اور مرجیہ رویت باری کے منکر ہیں، ان حضرات نے اپنے موقف پر کچھ نقلی و عقلی دلائل پیش کئے ہیں، مگر وہ سب غلط فہمی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، یہاں ان کے مشہور دلائل اور ان کا جواب اختصار کے ساتھ ذکر کیا جارہا ہے، تفصیل کے لیے ''عمدۃ القاری'' کا مطالعہ مفید ہوگا۔

(۱) قرآن کریم میں ارشاد فرمایا گیا: ''لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ'' کہ نگاہیں اللہ تعالیٰ کا ادراک نہیں کرسکتیں اور اللہ تعالیٰ نگاہوں کو گھیرے ہوئے ہے، (انعام آیت ۱۰۳) منکرین کا استدلال یہ ہے کہ نگاہوں سے ادراک کی نفی سے لازم آتا ہے کہ رویت کی بھی نفی ہو جائے، لیکن یہاں ادراک سے مراد احاطہ ہے کہ نگاہوں سے اس کی ذات کا احاطہ نہیں کیا جاسکتا ہے، یہ مراد نہیں کہ نگاہیں اس کی رویت نہیں کرسکتیں، کیوں کہ آخرت میں اہل جنت کے لیے رویت کا ہونا یقینی دلائل سے ثابت ہے۔

(۲) ان حضرات کی دوسری دلیل ہے ''لَنْ تَرَانِي'' (سورۃ الاعراف آیت ۱۴۳) کہ تم مجھے ہرگز نہ دیکھ سکو گے، یہ کلمات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس دنیا میں رویت کی درخواست کے جواب میں ارشاد فرمائے گئے ہیں منکرین کا استدلال اس طرح ہے کہ ''لن'' نفی تابید (ہمیشہ کی نفی) کے لیے آتا ہے، اس لیے آیت سے اس دنیا میں بھی رویت کی نفی ہوگئی اور مستقبل میں بھی ہمیشہ کے لیے نفی ہوگئی، جس میں آخرت بھی شامل ہے اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں رویت کی نفی ہوگئی تو عام مومنین کے حق میں بدرجہ اولیٰ رؤیت کی نفی ثابت ہو جائے گی، لیکن اہل حق کا جواب یہ ہے کہ ''لن'' کا نفی موبد کے لیے ہونا تسلیم نہیں، کیوں کہ قرآن کریم میں کفار کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ''لَنْ يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا'' (البقرہ آیت ۹۵) یہ یہود و کفار ہرگز کبھی موت کی تمنا نہ کریں گے، یہاں ''لن'' کا استعمال کیا گیا ہے، حالانکہ عذاب جہنم کے ناقابل برداشت ہونے کے سبب آخرت میں کفار اور اہل جہنم کی

جانب سے موت کی تمنا سورۂ زخرف میں نقل کی گئی ہے۔

(۳) منکرین کا تیسرا استدلال یہ ہے کہ قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے: "وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحيا اَوْ مِنْ وَرَاءِ حِجَابِ الآية" (شوریٰ، آیت: ۵۱) کسی بشر کے لیے یہ ممکن نہیں کہ اللہ اس کے ساتھ ہم کلام ہو مگر وحی کی صورت میں، یا پردہ کے پیچھے یا پھر کسی فرستادہ کو بھیجے، منکرین کا استدلال اس طرح ہے کہ آیت یہ بتلا رہی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہونے کی صورت میں بھی اللہ کی رویت نہ ہوگی اور جب ہم کلامی کے وقت بھی رویت نہیں تو ہم کلام نہ ہونے کے وقت رؤیت کا نہ ہونا ثابت ہے، لیکن اہل حق کا جواب یہ ہے کہ آیت میں وحی کی صورت میں متکلم کے سامع سے محجوب ہونے یا نہ ہونے پر کوئی دلالت نہیں ہے، آیت کا منشاء یہ ہے کہ وحی جو بہت سرعت کے ساتھ سنا جانے والا کلام ہے، وہ بھی ہم کلام ہونے کی ایک صورت ہے، لیکن اس صورت میں سامع متکلم کو دیکھتا ہے، یا دیکھ سکتا ہے، یا اس کا امکان نہیں ہے، تو اس کے لیے آیت میں کوئی وضاحت یا اشارہ نہیں ہے۔

(۴) منکرین کا چوتھا استدلال یہ ہے کہ قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں کفار کی جانب سے رویت باری کا مطالبہ نقل کر کے اس کو بہت بڑا گناہ قرار دیتے ہوئے اس کی مذمت کی گئی ہے، اس مضمون پر مشتمل متعدد آیات ہیں: "وَاِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُؤمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصَّاعِقَةُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ" (البقرہ، آیت ۵۵) اور جب تم نے کہا کہ، اے موسیٰ! ہم اس وقت تک تم پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ ہم اللہ تعالیٰ کو کھلی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، چنانچہ (اس مطالبہ پر) تمہیں بجلی کے عذاب نے پکڑ لیا اور تم دیکھتے رہے، مگر اہل حق یہ کہتے ہیں کہ محض رویت کے سوال کا بڑا گناہ اور قابل مذمت ہونا ضروری نہیں، قرین قیاس یہ ہے کہ عناد، تعنت اور ہٹ دھرمی کے طور پر کئے گئے مطالبہ کو بڑا گناہ اور قابل مذمت قرار دیا گیا ہے۔

(۵) اسی طرح منکرین نے عقلی طور پر اپنے مدعا کو ثابت کرنے کے لیے یہ استدلال کیا ہے کہ کسی چیز کی رویت آٹھ شرطوں پر موقوف ہے: (۱) دیکھنے والے کی نظر (آلہ رویت) کا صحیح سالم ہونا۔ (۲) خود اس چیز کا جائز الرویۃ (دیکھنے کے لائق) ہونا۔ (۳) نظر آنے والی چیز کا دیکھنے والے کے مقابل ہونا۔ (۴) اس کا بہت دور نہ ہونا۔ (۵) بہت قریب نہ ہونا (۶) نہایت چھوٹا نہ ہونا۔ (۷) نہایت لطیف نہ ہونا۔ (۸) رائی اور مرئی کے درمیان حجاب کا نہ ہونا اور یہاں ان شرائط میں سے متعدد چیزیں موجود نہیں ہیں، مگر اہل حق کہتے ہیں کہ شرائطِ مذکورہ میں سے آخری چھ شرطیں تو صرف اجسام کی رویت کے لیے اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ عادت کے مطابق اس دنیا میں ضروری ہیں اور اللہ تعالیٰ نہ جسم ہے کہ اس کی رویت کے لیے ان چیزوں کو شرط قرار دیا جائے، نہ یہ ضروری ہے کہ آخرت میں بھی یہی اصول قائم رہیں، اللہ تعالیٰ کی رویت کے لیے تو صرف دو چیزوں کی ضرورت معلوم ہوتی ہے: ایک آلہ بصارت کا صحیح ہونا اور دوسرے رویت کا عقلاً محال اور شرعاً ممنوع نہ ہونا، اور یہ دونوں چیزیں یہاں پائی جاتی ہیں، کیونکہ اہل ایمان کے بارے میں قرآن کریم

اورحدیث پاک دونوں ہی میں نہایت صراحت کے ساتھ رویت کی بشارت دی گئی ہے،قرآن کریم میں فرمایا گیا:"وُجُوہٌ يَّوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" (سورۃ القیامہ آیت ۲۳) کتنے ہی چہرے اس دن (آخرت) میں سرسبز وشاداب ہوں گے،اپنے پروردگار کو دیکھ رہے ہوں گے۔

نیز کفار کے بارے میں فرمایا گیا ہے:"كَلَّا اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ" (سورۃ المطففین آیت ۱۵) ہرگز نہیں! یہ لوگ (کفار) اس روز اپنے رب کے دیدار سے روک دیے جائیں گے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان حجاب میں نہ ہوں گے، پھر بیسیوں صحابہ کرامؓ کی روایتیں ہیں، پھر امت کا اجماع ہے، یہ سب دلائل آخرت میں رویت باری کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

**تشریح روایت دوم** حضرت ابو ہریرہؓ ارشاد فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ نے دن اور رات پر تقسیم کر کے کچھ فرشتوں کی ڈیوٹیاں مقرر کر دی ہیں۔ یہ فرشتے نوبت بہ نوبت اس کو انجام دیتے ہیں، کچھ فرشتے دن کی ڈیوٹی بجالاتے ہیں اور کچھ فرشتے رات کی اور ان دن اور رات کے فرشتوں کا اجتماع فجر اور عصر کی نماز میں ہوتا ہے، رات کے فرشتے صبح کی نماز کے بعد عروج کرتے ہیں اور اوپر چلے جاتے ہیں، جب وہ خدا کے دربار میں حاضری دیتے ہیں، تو پروردگار ان سے پوچھتا ہے، حالانکہ وہ سب کچھ جانتا ہے، کہ تم نے میرے بندوں کو کس حال میں چھوڑا؟ فرشتے کہتے ہیں کہ ہم ان کو نماز پڑھتے ہوئے چھوڑ کر آئے ہیں اور ہم جب گئے تھے، اس وقت بھی وہ نماز پڑھ رہے تھے۔

اس روایت میں چند باتیں تشریح طلب ہیں، ایک تو یہ کہ رات کے فرشتوں کی دربار خداوندی میں حاضری اور ان سے سوال وجواب مذکور ہے، دن کے فرشتوں کا ذکر نہیں، دوسرے یہ کہ پروردگار جب تمام چیزوں کا خود علم رکھتا ہے تو فرشتوں سے پوچھنے کی کیا وجہ ہے؟ تیسرے یہ کہ فرشتوں سے پوچھا گیا ہے کہ کس حال میں چھوڑ کر آئے؟ وہ جواب میں سوال سے زیادہ عرض کرتے ہیں کہ نماز پڑھتے ہوئے چھوڑا اور جب ہم گئے تھے، اس وقت بھی وہ مصروف نماز تھے، اور چوتھی بات یہ ہے کہ فرشتے اللہ کے بندوں کے بارے میں صرف نماز پڑھنے کی شہادت دیتے ہیں، کسی اور کام کا تذکرہ نہیں کرتے، جب کہ بندوں اور ان کے اعمال میں نماز کے علاوہ بھی بہت چیزیں ہیں۔

پہلی بات کی وضاحت یہ ہے کہ دربار خداوندی میں دن اور رات دونوں کے فرشتوں کی حاضری اور شہادت ثابت ہے، صحیح ابن خزیمہ میں حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں مذکور ہے:"**تجتمع ملائكة الليل وملائكة النهار في صلاة الفجر وصلاة العصر فيجتمعون في صلاة الفجر فتصعد ملائكة الليل وتثبت ملائكة النهار ويجتمعون في صلاة العصر فتصعد ملائكة النهار وتبيت ملائكة الليل فيسألهم ربهم كيف تركتم عبادي؟**" (عمدۃ القاری ص:۴۶/ ج:۳) اس روایت میں تصریح ہے کہ دربار خداوندی میں حاضری اور اس کے بعد بندوں

کے حالات کے بارے میں سوال وجواب، دن اور رات دونوں ہی کے فرشتوں سے ہوتا ہے۔

اگرچہ بعض شارحین نے صحیح ابن خزیمہ کی روایت کے بغیر، روایت باب ہی سے دونوں وقت کے فرشتوں سے سوال وجواب کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کرمانی کہتے ہیں کہ یہ " سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ " ( کپڑے جو تمہیں گرمی سے بچاتے ہیں) کے قبیل سے ہے، جس میں ایک چیز کا ذکر کر کے اس کے مقابل کو چھوڑ دیا جاتا ہے، جیسا کہ آیت میں کپڑوں کے بارے میں صرف یہ مذکور ہے کہ وہ گرمی سے بچاتے ہیں، حالانکہ سردی سے بھی بچاتے ہیں، مگر ذکر صرف گرمی سے بچانے کا کیا، اسی طرح روایت باب میں بھی تمہید کے اندر دونوں وقت کے فرشتوں کا ذکر ہے اور دربار خداوندی میں پیشی کے سلسلے میں صرف ایک فریق کا تذکرہ ہے، دوسرے فریق کا حکم خود سمجھا جا سکتا ہے، پھر کرمانی نے اس سے بھی زیادہ اچھی بات کہی کہ اللہ کے بندوں کے بارے میں دربار خداوندی میں صرف رات کے فرشتوں کی گواہی کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ جب بندے رات کے وقت بھی مشغول عبادت تھے، جب کہ رات میں راحت وآرام کا امکان، بلکہ گناہوں کے مواقع بہت ہیں، تو ایسے بندے دن میں یقیناً غفلت کا ثبوت نہ دیں گے۔

دوسری بات یعنی اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہے، سب کچھ معلوم ہونے کے باوجود فرشتوں سے اس لیے معلوم فرماتا ہے کہ وہ فرشتوں کی زبان سے شہادت ادا کرانا اور ان سے اقرار لینا چاہتا ہے، کیوں کہ فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت کے موقع پر بارگاہ خداوندی میں عرض کیا تھا: " قَالُوْا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ " (البقرۃ آیت ۳۰) فرشتوں نے کہا کہ کیا آپ زمین میں اس کو قائم کر رہے ہیں، جو فساد کرے اور خون ریزی کرے۔

پھر اپنی قابلیت اور استحقاق کے سلسلے میں بھی کہا تھا " وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ " کہ ہم تیری حمد کی تسبیح پڑھتے ہیں اور تیری پاکی کا ذکر کرتے ہیں، اس وقت تو اللہ تعالیٰ نے فرمادیا تھا " اِنِّیْ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ " کہ میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

باری تعالیٰ کا سب کچھ جانتے ہوئے فرشتوں سے سوال کرنا اسی سلسلے کی چیز ہے، گویا بنو آدم کے بارے میں فساد وخونریزی کا خیال ظاہر کرنے والوں پر واضح کیا جا رہا ہے کہ یہی وہ بندے ہیں جو ہمہ وقت مصروف عبادت پائے گئے، مزید یہ کہ باری تعالیٰ اپنے نیک بندوں پر آخرت میں انعام فرمانے کے لیے شہادتیں جمع کر رہا ہے، تاکہ فرشتوں کے اس بیان کو بہانہ بنا کر انہیں رحمتوں سے نوازے کہ جب فرشتے خدا کے روبرو ان بندوں کے صبح وشام مصروف عبادت رہنے کی شہادت دے رہے ہیں، تو وہ خدا کے فضل واحسان اور انعام واکرام کے مستحق ہیں۔

تیسری بات یعنی فرشتوں کی جانب سے جواب میں سوال سے زیادہ عرض کرنے کی حکمت یہ ہے کہ فرشتے منشاء خداوندی کو سمجھ رہے ہیں کہ بندوں کے اعمال صالحہ پر شہادت منظور ہے، اس لیے وہ سوال سے زیادہ بیان کرتے ہیں کہ جب ہم گئے تھے، تب بھی مصروف نماز تھے۔

چوتھی بات یعنی نماز کے علاوہ کسی اور عمل کی شہادت نہ دینے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ اگر یہ فرشتے محض نمازوں میں شرکت کے لیے نازل کئے جاتے ہیں تو ہوسکتا ہے کہ ان کی نظر سے بندوں کے برے اعمال پوشیدہ رکھے جاتے ہوں، کیونکہ وہ صرف مسجد میں آتے ہیں، نمازوں میں شرکت کرتے ہیں اور عالم بالا کی طرف عروج کر جاتے ہیں، یہ وہ فرشتے ہیں جن کا کام ہی اہل ایمان کے لیے استغفار کرنا ہے، قرآن میں ہے: ''وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ آمَنُوْا'' اور وہ اہل ایمان کے لیے مغفرت طلب کرتے ہیں اور اگر ان فرشتوں سے مراد نامہ اعمال لکھنے والے فرشتے ہوں تو اگر چہ ان کی نظر میں بندوں کے اچھے اور برے سب اعمال ہیں، مگر باری تعالی کے سوال سے وہ سمجھ رہے ہیں کہ برے اعمال پیش کرنے کی اجازت نہیں ہے، مقصد تو فرشتوں سے بندوں کے اعمال صالحہ پر شہادت لینا ہے۔ ترجمۃ الباب سے روایت کا تعلق مقصد ترجمہ کے ذیل میں واضح کیا جا چکا ہے۔ واللہ اعلم

## [۱۷] بَابُ مَنْ اَدْرَكَ رَكْعَةً مِنَ الْعَصْرِ قَبْلَ الْغُرُوْبِ

(۵۵۶) حَدَّثَنَا اَبُوْنُعَيْمٍ قَالَ حَدَّثَنَا شَيْبَانُ عَنْ يَحْيٰى عَنْ اَبِىْ سَلَمَةَ عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ اِذَا اَدْرَكَ اَحَدُكُمْ سَجْدَةً مِنْ صَلٰوةِ الْعَصْرِ قَبْلَ اَنْ تَغْرُبَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهٗ وَاِذَا اَدْرَكَ سَجْدَةً مِنْ صَلٰوةِ الصُّبْحِ قَبْلَ اَنْ تَطْلُعَ الشَّمْسُ فَلْيُتِمَّ صَلَاتَهٗ. (آئندہ:۵۷۹،۵۸۰)

(۵۵۷) حَدَّثَنَا عَبْدُ الْعَزِيْزِ بْنُ عَبْدِ اللهِ قَالَ حَدَّثَنِىْ اِبْرَاهِيْمُ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ سَالِمِ بْنِ عَبْدِ اللهِ عَنْ اَبِيْهِ اَنَّهٗ اَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَقُوْلُ اِنَّمَا بَقَاءُكُمْ فِيْمَا سَلَفَ قَبْلَكُمْ مِنَ الْاُمَمِ كَمَا بَيْنَ صَلٰوةِ الْعَصْرِ اِلٰى غُرُوْبِ الشَّمْسِ، اُوْتِىَ اَهْلُ التَّوْرٰةِ التَّوْرٰةَ فَعَمِلُوْا حَتّٰى اِذَا انْتَصَفَ النَّهَارُ عَجَزُوْا فَاُعْطُوْا قِيْرَاطًا قِيْرَاطًا ثُمَّ اُوْتِىَ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ الْاِنْجِيْلَ فَعَمِلُوْا اِلٰى صَلٰوةِ الْعَصْرِ ثُمَّ عَجَزُوْا فَاُعْطُوْا قِيْرَاطًا قِيْرَاطًا ثُمَّ اُوْتِيْنَا الْقُرْآنَ فَعَمِلْنَا اِلٰى غُرُوْبِ الشَّمْسِ فَاُعْطِيْنَا قِيْرَاطَيْنِ قِيْرَاطَيْنِ فَقَالَ اَهْلُ الْكِتَابَيْنِ اَىْ رَبَّنَا اَعْطَيْتَ هٰؤُلَاءِ قِيْرَاطَيْنِ قِيْرَاطَيْنِ وَاَعْطَيْتَنَا قِيْرَاطًا قِيْرَاطًا وَنَحْنُ كُنَّا اَكْثَرَ عَمَلًا قَالَ اللهُ عَزَّوَجَلَّ هَلْ ظَلَمْتُكُمْ مِنْ اَجْرِكُمْ مِنْ شَىْءٍ قَالُوْا لَا قَالَ وَهُوَ فَضْلِىْ اُوْتِيْهِ مَنْ اَشَاءُ. (آئندہ:۲۲۶۸،۲۲۶۹،۳۴۵۹،۵۰۲۱،۷۴۶۷،۷۵۳۳)

(۵۵۸) حَدَّثَنَا اَبُوْكُرَيْبٍ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْاُسَامَةَ عَنْ بُرَيْدٍ عَنْ اَبِىْ بُرْدَةَ عَنْ اَبِىْ مُوْسٰى عَنِ النَّبِىِّ ﷺ قَالَ مَثَلُ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْيَهُوْدِ وَالنَّصَارٰى كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَاْجَرَ قَوْمًا

يَعْمَلُوْنَ لَهُ عَمَلاً اِلَى اللَّيْلِ فَعَمِلُوْا اِلَى نِصْفِ النَّهَارِ فَقَالُوْا لَاحَاجَةَ لَنَا اِلَى اَجْرِكَ فَاسْتَاجَرَ اٰخَرِيْنَ فَقَالَ اَكْمِلُوا بَقِيَّةَ يَوْمِكُمْ وَلَكُمُ الَّذِيْ شَرَطْتُ فَعَمِلُوا حَتّٰى اِذَا كَانَ حِيْنَ صَلٰوةِ الْعَصْرِ قَالُوْا لَكَ مَاعَمِلْنَا فَاسْتَاجَرَ قَوْماً فَعَمِلُوْا بَقِيَّةَ يَوْمِهِمْ حَتّٰى غَابَتِ الشَّمْسُ فَاسْتَكْمَلُوا اَجْرَ الْفَرِيْقَيْنِ. (آئندہ:۲۲۷۱)

**ترجمہ** باب، اس شخص کا حکم جس نے غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت کو پالیا ہو۔ حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ تم میں سے کوئی شخص غروب آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت پالے تو وہ اپنی نماز کو پورا کرلے اور جو شخص طلوع آفتاب سے پہلے فجر کی ایک رکعت پالے تو وہ اپنی نماز کو پورا کرلے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ امم سابقہ (یہود ونصاری) کے مقابلے میں تمہارا دنیا میں رہنا ایسا ہے جیسے عصر کی نماز سے غروب آفتاب تک، اہل توراۃ کو توارۃ دی گئی تھی، انہوں نے کام شروع کیا یہاں تک کہ جب آدھا دن گذر گیا تو وہ تھک گئے، چنانچہ انہیں ایک ایک قیراط دیدیا گیا، پھر اہل انجیل کو انجیل عطا کی گئی انہوں نے عصر کی نماز تک کام کیا اور تھک گئے تو انکو بھی ایک ایک قیراط دیدیا گیا، پھر ہم مسلمانوں کو قرآن دیا گیا اور ہم نے سورج غروب ہونے تک کام کیا اور ہم کو دودو قیراط دیئے گئے، پھر اہل توارۃ اور اہل انجیل نے عرض کیا، اے پروردگار! تو نے ان مسلمانوں کو دودو قیراط عطا کئے اور ہم کو ایک ایک قیراط دیا، جب کہ ہم نے کام ان سے زیادہ کیا ہے، تو اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں نے تمہارے اجر میں سے کچھ کم کیا ہے؟ انہوں نے کہا نہیں، پھر اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا کہ یہ تو میرا فضل ہے جس کو چاہوں عطا کروں۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ مسلمانوں کی اور یہود و نصاری کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے کسی گروہ سے صبح سے شام تک مزدوری پر کام کرنے کا معاملہ کیا اور ان لوگوں نے آدھے دن تک کام کیا اور کہنے لگے کہ ہمیں تیری مزدوری کی ضرورت نہیں، (یعنی ہم کام نہیں کریں گے) پھر اس نے دوسرے لوگوں سے معاملہ کیا اور کہا کہ تم دن کے بقیہ حصہ میں کام کرو اور تم کو وہی مزدوری ملے گی، جو میں نے طے کی تھی، چنانچہ انہوں نے کام شروع کیا یہاں تک کہ جب عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تو انہوں نے بھی کہدیا کہ ہم نے جو کام کیا ہے، ہم تیرے حق میں اس سے دستبردار ہوتے ہیں (یعنی ہم کام پورا نہ کرسکیں گے، اجرت کی ضرورت نہیں) پھر اس نے اورلوگوں سے معاملہ کیا اور وہ لوگ دن کے بقیہ حصہ میں غروب آفتاب تک کام کرتے رہے اور انہوں نے پچھلی دونوں جماعتوں کی مزدوری حاصل کرلی۔

**مقصد ترجمہ** ترجمہ کا بظاہر مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی نے غروب آفتاب سے قبل عصر کی ایک رکعت پالی تو وہ مدرک عصر ہو گیا یعنی اس کو عصر کی نماز مل گئی، گویا ترجمہ میں وہ مسئلہ مذکور ہے جس کا تعلق احکام صلوۃ سے ہے جب کہ ذکر ہو رہا ہے اوقات صلوۃ کا مواقیت صلوۃ کے درمیان، ادراک صلوۃ کا مسئلہ بے ربط معلوم ہوتا ہے، اس لیے ہماری

سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ بخاری کا مقصد یہاں ادراک صلوۃ کے مسئلہ کا بیان نہیں جیسا کہ بعض شارحین نے سمجھا ہے، بلکہ وہ اس باب میں عصر کے وقت کا منتہی بیان کرنا چاہتے ہیں، گویا جس طرح بخاری نے دیگر اوقات صلوۃ کے بارے میں مبدأ اور منتہی کا بیان کیا، اسی طرح وہ عصر کے بارے میں یہاں یہ بیان کررہے ہیں کہ عصر کا وقت جب سے شروع ہوتا ہے وہ برابر غروب تک ممتد رہتا ہے، یہ نہیں کہ عصر کا وقت اصفرار شمس پر ختم ہو جائے جیسا کہ بعض حضرات اس کے بھی قائل ہوئے ہیں، امام بخاری کے مدعا کی دلیل یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جس نے غروب آفتاب سے قبل ایک رکعت کو پالیا اس نے نماز کو پالیا، نماز کو پانا وقت کے پانے پر موقوف ہے، وقت گذرنے کے بعد نماز کہاں؟ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ امام بخاریؒ اس ترجمہ میں ان لوگوں پر رد کررہے ہیں، جو اصفرار کو وقت عصر سے خارج سمجھتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے بھی قریب قریب یہی مقصد قرار دیا ہے، کہ بخاری کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ اگر غروب سے پہلے ایک رکعت بھی مل گئی ہے خواہ بقیہ رکعتیں غروب کے بعد پڑھی گئی ہیں تو نماز ہوگئی، قضا کی ضرورت نہیں، بخاری کو یہ بات اہمیت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ شوافع نے عصر کے وقت کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، مثل اول ختم ہوتے ہی وقت مستحب ہے اور پورا مثل ثانی فضیلت والا وقت جواز ہے، پھر اصفرار سے پہلے تک جواز کا وقت ہے اور اصفرار کے بعد درجہ مجبوری کا وقت ہے، اس وقت تک موخر کرنے والا گنہ گار بھی ہوتا ہے، حضرت شاہ ولی اللہ ارشاد فرماتے ہیں کہ اس باب میں امام بخاریؒ درجہ مجبوری کے وقت کے بارے میں ارشاد فرمانا چاہتے ہیں کہ یہ بھی ایسا وقت ہے کہ نمازی نے اگر نماز کا کچھ حصہ اس میں پڑھ لیا تو اس کا فریضہ ادا ہو جائے گا اور اس وقت تک موخر کرنے کے باوجود قضا اور اعادے کی ضرورت نہ ہوگی۔

**باب سابق سے ربط** "باب فضل صلوۃ العصر" کے بعد "باب من ادرك ركعة من العصر الخ" منعقد کر کے امام بخاری یہ اشارہ کرنا چاہتے ہیں کہ عصر کی فضیلت جس طرح عصر کو صحیح وقت میں پڑھنے والوں کو نصیب ہوتی ہے، اسی طرح اندرون وقت ایک رکعت پانے والوں کو بھی اسی فضیلت میں حصہ دار سمجھنا چاہئے، اگر چہ اس میں بھی شبہ نہیں ہے کہ جس نے پوری نماز وقت میں پائی اس کی فضیلت زیادہ ہے، مگر ایک رکعت کا پانے والا بھی اس فضیلت سے محروم نہیں ہے، بلکہ امام بخاری کے ذوق کے مطابق کہا جا سکتا ہے کہ یہ باب "بابٌ فی الباب" کے قبیل سے ہے، کیونکہ باب کے ذیل میں دی گئی حضرت ابو ہریرہؓ کی پہلی روایت کا مضمون تو ایک رکعت پانے والے سے متعلق ہے، مگر حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو موسیٰ کی دوسری اور تیسری روایت کا تعلق تو مدرک کے مسئلہ سے کم اور فضل صلوۃ العصر سے زیادہ ہے، لیکن یہ بات شارحین نے لکھی نہیں، اس لیے اس کو احتمال کے درجہ میں سمجھنا چاہئے، اصل یہی ہے کہ بخاری کا مقصد منتہائے عصر کا بیان ہے۔

**تشریح روایت اول** اس باب کے تحت امام بخاری نے تین روایتیں ذکر کی ہیں، پہلی روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے ہے کہ جسے غروب آفتاب سے پہلے عصر کی نماز کا ایک سجدہ مل جائے، تو وہ اپنی نماز کو پورا کرلے، ترجمۃ الباب میں رکعت کا لفظ ہے اور روایت میں سجدہ کا۔ امام بخاریؒ ترجمۃ الباب میں گویا حدیث کی شرح کررہے ہیں کہ یہاں سجدہ سے مراد رکعت ہے، کیوں کہ سجدہ پر رکعت تمام ہوتی ہے اسلئے آخری جزبول کر کل مراد لےلیا، تراجم ابواب میں بخاری کا یہ بھی ایک طریقہ ہے، مزید یہ کہ روایت کے بعض طرق میں '' من ادرك منكم ركعة '' وارد بھی ہوا ہے۔

روایت میں ارشاد فرمایا گیا کہ غروب سے قبل کسی کو عصر کی ایک رکعت مل جائے تو وہ اس کو پورا کرلے، مطلب یہ ہے کہ اسے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ سبب وجوب تو وقت ہے، اس لیے بقدرِ سبب وجوب ہوا اور ایک ہی رکعت کا وقت ملا تھا، ایک رکعت پڑھ لی اور نمٹ گئے، فرماتے ہیں کہ ایسا سمجھنا غلط ہے، وقت کے تمام اجزاء اول سے آخر تک سببیت میں برابر ہیں، اول وقت میں ''صلّوا'' کا خطاب متوجہ ہوجاتا ہے، اگر نماز ادا کرلی تو ذمہ داری پوری ہوگئی ورنہ سببیت دوسرے حصہ میں منتقل ہوجاتی ہے اور اگر ایسا ہوگیا کہ آخری وقت آ گیا اور ابھی تک نماز نہیں پڑھی تو یہی آخری وقت سببیت کے لیے متعین ہوگیا اور فرض ہیں چار رکعتیں، اب اگر ایک رکعت بھی وقت کے اندر پڑھنے کا موقع مل گیا ہے تو بقیہ رکعتوں کو وقت کے بعد پورا کرو، حکم فرمایا گیا '' فليتم صلوته '' کہ نماز کو پورا کرنا ہوگا، یعنی شریعت نے تم کو مدرک عصر مان لیا ہے، یعنی شریعت میں ایسی صورت میں استیناف کا حکم نہیں ہے، بلکہ اسی ایک رکعت کے بعد بقیہ نماز کو ملانے کا حکم ہے، بعض روایات میں اتمام صلوۃ کے بجائے دوسری تعبیرات ہیں، جیسے ''فقد ادرك الصلوة'' (یعنی اس نے نماز کو پالیا) یا '' فلم يفته العصر '' (اس کی عصر فوت نہیں ہوئی) حاصل سب کا یہی ہے کہ عصر کی فضیلت میں وہ شریک ہوگیا، نیز یہ کہ الفاظ اور تعبیرات میں فرق ہے اور سب میں کچھ نہ کچھ معانی کا فرق بھی بیان کیا جاسکتا ہے، مگر یہ فیصلہ دشوار ہے کہ یہ سب تعبیرات پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام کی ہیں، یا اس میں راویوں کی جانب سے تنوع پیدا ہوگیا ہے، البتہ امام بخاریؒ کا یہ مقصد کہ عصر کا وقت غروب آفتاب تک ممتد ہے تمام تعبیرات سے ثابت ہے، رہا یہ مسئلہ کہ روایت میں فجر اور عصر دونوں کا ایک ہی حکم بیان کیا گیا ہے اور حنفیہ نے اس سلسلہ میں فجر اور عصر کے درمیان فرق کیا ہے، تو یہ مسئلہ چند ابواب کے بعد آرہا ہے۔

**تشریح روایت دوم** دوسری روایت حضرت ابن عمرؓ کی ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس دنیا میں امم سابقہ کے مقابلہ میں تمہاری بقاء کی مدت اتنی ہے جیسے عصر کی نماز سے غروب آفتاب تک کا مختصر وقت، یعنی تم کو بہت تھوڑا وقت دیا گیا ہے، جیسے پورے دن کے مقابلہ میں عصر سے مغرب تک کا وقت بہت کم ہے، تم سے پہلے کی امتوں نے بڑے اور زیادہ وقت کے لئے ہیں اور انھوں نے تمہارے لیے بہت کم وقت چھوڑا ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ اہل تورات کو تورات دی گئی، انہوں نے عمل شروع کیا، ابھی آدھا ہی دن ہوا تھا کہ وہ تھک

گئے اور کندھا ڈال دیا، جب وہ عاجز ہو گئے تو مالک نے ان کو ایک قیراط حوالے کر دیا، پھر اہل انجیل کی باری آئی تو انہوں نے نصف النہار سے عصر تک کام کیا، پھر انہوں نے بھی عاجزی کا اظہار کیا تو مالک نے ان کو بھی ایک ایک قیراط دے کر رخصت کیا، پھر مسلمانوں یعنی اہل قرآن کی باری آئی تو انھوں نے عصر سے لے کر غروب آفتاب تک وہ کام مکمل کر دیا جس کو اہل توارت واہل انجیل نے ناتمام چھوڑ دیا تھا تو مالک نے خوش ہو کر ان کو دو، دو قیراط عطا کئے۔ اس پر اہل تورات وانجیل نے عرض کیا کہ پروردگار! تو نے ان کو دو، دو قیراط عطا کئے اور ہمیں ایک ایک قیراط دیا گیا، یعنی کام ہمارا زیادہ ہے کہ ہم میں کا ہر ہر فرد اپنے اپنے زمانے میں زیادہ وقت تک کام کرتا رہا؟ پروردگار عالم نے ارشاد فرمایا، تم سے جو طے کیا گیا ہے، اس میں تو کمی نہیں کی گئی، جواب دیتے ہیں کہ بجا ارشاد فرمایا، پھر پروردگار نے فرمایا، باقی میرا فضل ہے جس کو چاہوں زائد عطا کروں، اس میں کسی کو مداخلت کا کیا حق ہے؟

**مقصد ترجمہ کا ثبوت** روایت میں امم سابقہ اور مسلمانوں کے تقابل کے لیے ایک تمثیل بیان کی گئی ہے اور جن لوگوں نے بخاری کے ترجمہ کا یہ مقصد قرار دیا ہے کہ ایک رکعت کے مدرک کو پوری نماز کا مدرک قرار دیا جائے، انہوں نے مقصد ترجمہ سے روایت کے مضمون کو مربوط کرنے کے لیے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا ہے، حافظ ابن حجرؒ مہلبؒ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جزوی عمل پر اجر پورے عمل کا دیدیا جائے، کیونکہ عصر سے لے کر غروب تک کے کام پر پورے دن کی اجرت عطا کی گئی ہے، یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے ایک رکعت کے مدرک کو پوری نماز کا ثواب دیا جائے، پھر ابن حجرؒ نے مہلب کی بات پر اور ذرا سا اضافہ کیا کہ حدیث میں وہ جزوی عمل جس پر پورا اجر دیا گیا ربع نہار کا عمل ہے، یعنی عصر سے لے کر غروب آفتاب تک کا وقت، دن کا ایک چوتھائی حصہ ہے اور جس طرح اس چوتھائی وقت میں کام کرنے پر پورا اجر دیا گیا اسی طرح ایک رکعت کے مدرک کو، چار رکعت پانے والے کی طرح قرار دیا گیا، گویا مثال اور ممثل لہ میں، چوتھائی عمل کو پورا عمل قرار دینے کی بات مشترک ہے، پھر حافظ ابن حجرؒ نے کچھ اعتراضات نقل کر کے ان کا جواب دیا ہے، لیکن اصل اعتراض کو انہوں نے چھیڑا ہی نہیں کہ پورے دن کی اجرت تو تین قیراط تھی، اس لیے اگر روایت میں یہ آتا کہ فریق ثالث کو تین قیراط دیئے گئے، تو یہ بات ثابت ہوتی کہ چوتھائی عمل پر پورا اجر دیا گیا، یہاں تو دو قیراط ملے، اس لیے ثابت تو اتنا ہوا کہ کم عمل پر زیادہ اجرت دی گئی۔

ان سوال وجواب کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ اگر ترجمہ کا مقصد یہی قرار دیا جائے کہ ایک رکعت کا مدرک پوری نماز کا مدرک ہے تو مہلبؒ اور حافظؒ کی بات بہت اچھی اور خوبصورت ہے، مگر اس کے باوجود ہمیں یہ کہنے دیجئے کہ مواقیت صلوۃ سے اس کا کیا ربط رہا؟ بیان ہو رہا ہے اوقات نماز کا اور درمیان میں بالکل اجنبی بحث چھڑ گئی، اس لیے ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ امام بخاریؒ کا مدعا ہے منتہائے وقتِ عصر کا بیان اور وہ اس طرح ثابت ہے کہ روایت میں دن کو تین حصوں میں تقسیم کر کے، اس کو تین فریق کے ساتھ مخصوص کیا گیا ہے، پہلا حصہ صبح سے نصف النہار تک کا یہود کے حق میں ہے اور اس میں

کوئی شریک نہیں، پھر دوسرا حصہ ظہر سے عصر تک کا نصاریٰ کے حق میں ہے اور اس میں کوئی شریک نہیں، پھر تیسرا حصہ عصر سے مغرب تک کا ہے اور اس میں کوئی تقسیم نہیں؛ معلوم ہوا کہ جس طرح ظہر سے عصر تک کا وقت اول سے آخر تک ایک ہے، اسی طرح عصر سے مغرب تک کا وقت بھی ایک رہنا چاہئے، بخاری کا مدعا ثابت ہو گیا کہ عصر کے وقت کا منتہی غروب آفتاب ہے۔

**تشریح روایت سوم** تیسری روایت حضرت ابو موسیٰ اشعری سے ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہود ونصاریٰ اور مسلمانوں کی مثال اس شخص کی طرح ہے، جس نے ایک قوم کو رات تک کام کرنے کی شرط پر اجیر رکھا، یعنی طے ہوا کہ اتنی اجرت ملے گی اور شام تک کام کرنا ہوگا، انہوں نے نصف النہار تک کام کر کے درمیان میں چھوڑ دیا اور مالک سے کہا کہ ہمیں اجرت کی بھی ضرورت نہیں، ہم سے کام نہیں ہوتا، دوسرے مزدور تلاش کرلو، مالک نے دوسرے مزدوروں سے معاملہ کیا کہ وہ دن کے بقیہ حصہ میں کام مکمل کر دیں، اور جو اجرت طے ہوئی تھی وہ مکمل لے لیں، لیکن یہ حضرات بھی عصر تک کام کر کے کہنے لگے کہ اب ہم کام نہ کریں گے اور جو کام کیا ہے اس کی اجرت کی بھی ضرورت نہیں، چنانچہ مالک نے پھر تیسرے فریق سے بات کی، اس تیسرے فریق نے غروب آفتاب تک کام کیا اور پچھلے دونوں کام سے انکار کر کے بھاگنے والوں کی اجرت بھی حاصل کرلی، اس روایت میں بھی عصر سے مغرب تک کے وقت کو ایک وقت قرار دیا گیا ہے، اس سے بھی امام بخاری کا مقصد ثابت ہے۔

**دونوں روایتوں میں وجوہِ فرق** پھر یہاں ایک اور بات بھی غور طلب ہے کہ حضرت ابن عمرؓ اور حضرت ابو موسیٰ کی روایتوں میں تمثیل کے طور پر جو واقعہ ذکر کیا گیا ہے وہ ایک ہی واقعہ ہے یا الگ الگ دو واقعے ہیں؟ بعض حضرات نے ان کو ایک کرنے کی کوشش کی ہے، مگر ہمیں تو یہ کوشش تضییع اوقات معلوم ہوتی ہے، دونوں روایتوں میں متعدد باتوں میں اختلاف بلکہ تضاد ہے، پہلی اور دوسری روایت میں اتنی بات تو مشترک ہے کہ تین تین فریق ہیں اور ہر فریق سے معاملہ الگ الگ ہے، مگر پہلی روایت میں مدت اجارہ کی صراحت نہیں، دوسری روایت میں مدت اجارہ یعنی (الی اللیل) کی تصریح ہے، پہلی رویت میں ہے کہ آدھے دن تک کام کر کے عاجز ہو گئے اور ان کو ایک ایک قیراط دیا گیا، دوسری روایت میں ہے کہ ہمیں اجرت کی ضرورت نہیں، یہ ناخوشی کے الفاظ ہیں اور یہاں یہ مذکور نہیں کہ ان کو کچھ دیا گیا ہو، اس لیے ظاہر یہی ہے کہ دونوں تمثیلات الگ الگ ہیں اور دو قسم کے لوگوں کے حالات کو ظاہر کیا گیا ہے، پہلی روایت میں یہود ونصاریٰ میں سے ان لوگوں کا حال ہے، جو اپنے زمانہ میں اپنے دین پر قائم رہے اور اس پر عمل کیا اور وفات پا گئے "عجزوا" کے معنی ہوں گے موت سے عاجز ہو گئے، مالک نے ان کو اجرت دیدی اور دوسری روایت میں ان لوگوں کا حال ہے جنھوں نے دین سے بیزاری کا اظہار کیا وغیرہ۔

**امتوں کی مدت بقایا افراد کی؟** یہاں اس کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ روایت میں یہود ونصاری کے مقابلہ میں مسلمانوں کی مدت بقاء کم ذکر کی گئی ہے، جب کہ واقعہ یہ ہے کہ اگر یہود کی مدت ڈیڑھ ہزار یا دو ہزار سال ہے بھی، مگر نصاری کی مدت تو زیادہ سے زیادہ چھ سو سال ہے، جب کہ مسلمانون کو چودہ سو سال ہو چکے ہیں اور معلوم نہیں کہ قیامت تک اور کتنا زمانہ باقی ہے، پھر یہ کہ ان امتوں کی جانب سے روایت میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہم نے زیادہ کام کیا ہے، اس لیے مسلمانوں کی مدت بقاء کا کم ہونا اور یہود ونصاری کا کام زائد ہونا کیسے صادق ہے؟

کچھ حضرات نے یہ معنی بیان کئے ہیں کہ ان تمثیلات میں گذری ہوئی ہر امت کے مقابلہ پر امت محمدی کے کم بقاء کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ پچھلی تمام امتوں کے مجموعہ سے تقابل کیا گیا ہے، یعنی تمام امتوں کی مجموعی مدت کے مقابلہ پر امت محمدیہ کی عمر کم ہے، یہ بھی ایک صورت ہے۔

لیکن اس سے زیادہ واضح اور اچھی بات یہ ہے کہ یہاں امت سے تقابل نہیں، بلکہ آحاد وافراد امت کا، آحاد سے تقابل ہے، اس امت محمدیہ کے جو افراد ہیں ان کی عمروں کا اوسط حدیث پاک کی رو سے ۶۰/۷۰ کے درمیان ہے: "اعمار امتی مابین الستین الی السبعین" (ترمذی ص:۵۶/ ج:۲، وابن ماجہ) کہ میری امت کی عمریں ۶۰ سے ۷۰ کے درمیان ہوں گی، جب کہ امم سابقہ کے افراد کی عمریں اس سے کہیں زیادہ بیان کی گئی ہیں، بلکہ عمر کی زیادتی کے ساتھ ان چیزوں کو بھی شمار کیجئے کہ ان کو افکار بھی اتنے درپیش نہ تھے، ان کو صحت بھی اس سے کہیں زیادہ اچھی دی گئی تھی، کہتے ہیں کہ فرعون کے کئی سو سال تک سر میں بھی درد نہیں ہوا، تو ہمارے لیے عمل کا وقت کم اور قوی کمزور ہیں اور پچھلی امتوں کے افراد کی عمریں زائد یعنی ان کے عمل کا وقت زائد اور قوی نہایت مضبوط تھے، اسی لیے پروردگار نے ہم پر رحم فرمایا کہ امم سابقہ کو ایک نیکی پر ایک ہی نیکی کا ثواب دیا جاتا تھا اور ہماری ایک نیکی کو دس کے برابر قرار دیا گیا ہے۔

آحاد سے آحاد کے تقابل کی دلیل یہ ہے کہ کلمہ قیراط کے تکرار کے ساتھ قیراطا، قیراطا اور قیراطین، قیراطین فرمایا گیا ہے، اگر تقابل امت کا امت سے ہوتا تو قیراطا کے تکرار کی ضرورت نہیں تھی، صرف قیراطا کافی تھا، یعنی پوری امت کو ایک قیراط نہیں بلکہ امت کے ہر ہر فرد کو ایک ایک قیراط دیا گیا ہے اور پھر اس معنی پر بھی غور کر لیجئے کہ اگر کسی امت کو ایک قیراط اور پوری امت محمدیہ کو دو قیراط ملے تو اب تقسیم کیجئے، ایک کم افراد والی امت پر ایک قیراط تقسیم ہوا اور ایک ان سے دس گنا تعداد والی امت پر دو قیراط تقسیم ہوں تو دو قیراط کم پڑ جائیں گے، اور پھر یہ شکایت مہمل ہو جائے گی کہ ان کو زائد کیوں ملا؟ اور سب سے زیادہ اہم دلیل یہ ہے کہ ایک روایت میں آحاد کا آحاد سے تقابل منقول ہے، ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ عصر کے بعد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**ما اعمار کم فی اعمار من مضی إلا کما بقی من النھار فیما مضی منه**" (مسند احمد ص:۱۱۶/ ج:۲) تمہاری عمروں کی مثال گذری ہوئی امتوں کی عمروں کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسے گذرے ہوئے دن کے مقابلہ میں دن کا بقیہ حصہ۔

یہ بات آپ ﷺ نے عصر کے بعد ارشاد فرمائی اور اس میں امت کا امت سے نہیں، بلکہ امم سابقہ کے افراد کی عمروں کی امت محمدیہ کے افراد کی عمروں سے تقابل کر کے مضمون بیان کیا گیا ہے۔ واللہ اعلم

## [۱۸] بَابُ وَقْتِ الْمَغْرِبِ

وَقَالَ عَطَاءٌ يَجْمَعُ الْمَرِيْضُ بَيْنَ الْمَغْرِبِ وَالْعِشَآءِ

(۵۵۹) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ مِهْرَانَ قَالَ حَدَّثَنَا الْوَلِيْدُ قَالَ حَدَّثَنَا الْاَوْزَاعِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُو النَّجَاشِيِّ هُوَ عَطَاءُ بْنُ صُهَيْبٍ مَوْلٰى رَافِعِ بْنِ خَدِيْجٍ قَالَ سَمِعْتُ رَافِعَ بْنَ خَدِيْجٍ يَقُوْلُ كُنَّا نُصَلِّيْ الْمَغْرِبَ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَيَنْصَرِفُ اَحَدُنَا وَاِنَّهُ لَيُبْصِرُ مَوَاقِعَ نَبْلِه .

(۵۶۰) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ بَشَّارٍ قَالَ حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ جَعْفَرٍ، قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ سَعِيْدٍ عَنْ مُحَمَّدِ بْنِ عَمْرِوبْنِ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ قَدِمَ الْحَجَّاجُ فَسَأَلْنَا جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ فَقَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْ الظُّهْرَ بِالْهَاجِرَةِ وَالْعَصْرَ وَالشَّمْسُ نَقِيَّةٌ وَالْمَغْرِبَ اِذَا وَجَبَتْ وَالْعِشَاءَ اَحْيَانًا وَاَحْيَانًا اِذَا رَآهُمْ اجْتَمَعُوْا عَجَّلَ وَاِذَا رَآهُمْ اَبْطَئُوا اَخَّرَ وَالصُّبْحَ كَانُوا اَوْ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّيْهَا بِغَلَسٍ . (آئندہ:۵۶۵)

(۵۶۱) حَدَّثَنَا الْمَكِّيُّ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ حَدَّثَنَا يَزِيْدُ بْنُ اَبِيْ عُبَيْدٍ عَنْ سَلَمَةَ قَالَ كُنَّا نُصَلِّيْ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ الْمَغْرِبَ اِذَا تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ .

(۵۶۲) حَدَّثَنَا اٰدَمُ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ قَالَ حَدَّثَنَا عَمْرُوْبْنُ دِيْنَارٍ قَالَ سَمِعْتُ جَابِرَ بْنَ زَيْدٍ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ سَبْعًا جَمِيْعًا وَثَمَانِيًا جَمِيْعًا . (گذشتہ:۵۴۳)

**ترجمہ** باب، مغرب کے وقت کا بیان۔ حضرت عطاء نے فرمایا کہ بیمار کے لیے مغرب اور عشاء کی نماز کا جمع کرنا درست ہے، حضرت رافع بن خدیج سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھتے تھے اور ہم میں سے کوئی ایسے وقت میں فارغ ہو کر لوٹتا تھا کہ وہ اپنے تیر گرنے کی جگہ کو دیکھ سکتا تھا۔ محمد بن عمروؒ کہتے ہیں کہ حجاج (مدینہ کا عامل ہو کر) آیا، تو ہم نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے (نماز کے اوقات کے بارے میں) پوچھا تو انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز دوپہر کی گرمی میں پڑھتے تھے اور عصر کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ آفتاب ابھی صاف ہوتا تھا اور مغرب کی نماز غروب آفتاب کے فوراً بعد پڑھتے تھے اور عشاء کی نماز کبھی اس وقت اور کبھی اس وقت، یعنی جب آپ یہ دیکھتے کہ صحابہ جمع ہو گئے ہیں تو جلد پڑھ لیتے اور جب دیکھتے کہ انہوں نے آنے میں دیر کی تو نماز کو موخر کر دیتے اور صبح کی نماز (صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یا رسول اللہ ﷺ) اندھیرے میں پڑھتے۔ حضرت یزید بن

ابی عبیدؒ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ مغرب کی نماز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ جب سورج چھپ جاتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سات رکعت ایک ساتھ (یعنی مغرب وعشاء) اور آٹھ رکعت ایک ساتھ (یعنی ظہر وعصر) پڑھیں۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ بیان کرنا ہے کہ مغرب کے وقت کا آغاز کب سے ہوتا ہے اور اس کا منتہی کیا ہے؟ چنانچہ امام بخاری نے واضح کردیا کہ مغرب کا وقت غروب آفتاب سے شروع ہوتا ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ مغرب کی نماز کو غروب سے متصل رکھا ہے، اگر کوئی اشتباک نجوم تک موخر کرے گا تو کراہت آجائے گی۔ البتہ اگر کوئی شخص مجبوری مرض وغیرہ کے سبب مغرب اور عشاء وغیرہ کو اس طرح جمع کرنا چاہے کہ مغرب کی نماز مغرب کے آخر وقت میں اور عشاء کی نماز عشاء کے اول وقت میں پڑھے تو مضائقہ نہیں، حضرت عطاء کا اثر اسی مقصد سے نقل کیا ہے، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مغرب کا وقت اتنا تنگ بھی نہیں ہے کہ معمولی سی تاخیر کی بھی گنجائش نہ ہو جیسا کہ بعض ائمہ سے چند رکعات کے بقدر منقول ہے۔ حضرت عطاء کے قول میں جو جمع بین المغرب والعشاء کا مضمون ہے اس سے مراد جمع صوری ہے اور امام بخاری کے یہاں جہاں بھی جمع بین الصلوتین کا ذکر ہے ان سب مقامات پر جمع صوری ہی مراد ہے، کیونکہ بخاری جمع حقیقی کے قائل نہیں ہیں، جیسا کہ امام ابوحنیفہ کے یہاں بھی عرفہ اور مزدلفہ کے علاوہ جمع حقیقی نہیں ہے۔

**تشریح روایات** اس باب کے تحت امام بخاریؒ نے چار روایتیں ذکر کی ہیں، پہلی روایت رافع بن خدیجؓ کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ مغرب کی نماز ایسے وقت میں پڑھتے تھے، کہ ہم میں سے کوئی ایک نماز پڑھ کر لوٹتا تھا تو اس کو اپنے تیر کے گرنے کی جگہ نظر آتی تھی، مراد یہ ہے کہ نماز مغرب میں عجلت پسندیدہ امر ہے، اور آپؐ غروب کے فوراً بعد نماز پڑھتے تھے، حضرت عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میری امت اس وقت تک فطرت پر برقرار رہے گی، جب تک کہ وہ مغرب کو ستاروں کے نکلنے تک موخر نہ کرے، حضرت رافع کی روایت میں آیا کہ نماز سے فراغت کے بعد روشنی برقرار رہتی تھی، علی بن بلال لیثی کہتے ہیں کہ میں نے انصار مدینہ کے ساتھ نماز پڑھی تو انہوں نے نماز کے بعد بتلایا:

| | |
|---|---|
| ”کانوا یصلون المغرب مع رسول اللہ ﷺ ثم ینطلقون یترامون لا یخفی علیھم مواقع سھامھم حتی یاتون دیارھم فی اقصی المدینۃ“ (مسند احمد ص ۳۶/ ج ۴) | وہ لوگ مغرب کی نماز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ پڑھ کر نکلتے، تیر اندازی کرتے تو ان پر تیروں کے گرنے کی جگہ پوشیدہ نہ رہتی، حتی کہ وہ اقصائے مدینہ میں اپنے گھروں تک پہنچ جاتے۔ |

یہ مطلب نہیں ہے کہ تیر اندازی کرکے گھر جاتے تھے، بلکہ گھر پہنچ کر تیر اندازی کرتے تھے۔ روایت میں ہے:

"عن رجل من اسلم انهم کانوا یصلون مع النبی ﷺ المغرب ثم یرجعون الی اھلیھم الی اقصی المدینہ ثم یرمون فیبصرون مواقع نبلھم" (نسائی، باب تعجیل المغرب ص۹۰/ج۱)

قبیلہ اسلم کے ایک صحابیؓ سے روایت ہے کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مغرب کی نماز پڑھتے، پھر اقصائے مدینہ میں اپنے گھر لوٹ جاتے، پھر تیر اندازی کرتے تو اپنے تیر گرنے کی جگہ کو دیکھ لیتے۔

گویا مغرب کے بعد فاصلہ طے کر کے بھی اتنی روشنی رہتی تھی کہ تیر گرنے کی جگہ نظر آئے، اِس روایت سے بشرط انصاف اُس روایت کے معنی سمجھنے میں مدد لی جاسکتی ہے جس میں عصر کی نماز پڑھ کر تغیر آفتاب سے پہلے اقصائے مدینہ میں واقع اپنے گھروں تک پہنچنے میں زیادہ وقت نہ لگتا تھا، حد یہ ہے کہ غروب کے بعد نماز پڑھتے اور پھر اتنی روشنی میں گھر پہنچ جاتے کہ تیر گرنے کی جگہ نظر آتی۔

دوسری روایت حضرت محمد بن عمرو کی ہے کہ جب خلیفہ عبدالملک بن مروان کی جانب سے ۷۴ھ میں حجاج ابن یوسف ثقفی مدینہ طیبہ کا عامل بن کر آیا اور نمازوں کے سلسلے میں مستحب اوقات کی رعایت نہ رہی، تو ہم نے حضرت جابر بن عبداللہ سے نمازوں کے اوقات کے سلسلے میں سوال کیا، حضرت جابر نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز دوپہر کی گرمی میں پڑھتے تھے، یہ بحث گذر چکی ہے۔ اور عصر ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ آفتاب ابھی صاف ہوتا، یہ بھی بحث گذر چکی ہے۔ اور مغرب غروب آفتاب کے فوراً بعد پڑھتے، ترجمۃ الباب اس لفظ سے متعلق ہے۔ اور عشاء میں صحابہ کے جمع ہوجانے کی صورت میں تعجیل فرماتے اور اگر ان حضرات کے جمع ہوجانے میں دیر ہوتی تو تاخیر فرمادیتے اور فجر کی نماز غلس میں ہوتی تھی، مطلب یہ ہے کہ مقتدیوں کے انتظار کے سبب تاخیر نہ ہوتی تھی۔

تیسری روایت حضرت سلمہ بن اکوع سے ہے کہ مغرب کی نماز آفتاب کے پردہ میں آتے ہی، یعنی غروب کے فوراً بعد پڑھی جاتی تھی، ان تینوں روایتوں میں بخاری کا مقصد مغرب کی نماز میں تعجیل کا بیان ہے۔ اس کے بعد چوتھی روایت حضرت ابن عباسؓ کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں قیام کے دوران مغرب اور عشاء کی سات رکعتیں ایک ساتھ اور ظہر اور عصر کی آٹھ رکعتیں ایک ساتھ ادا کیں، یہ وہی روایت ہے جس کے بارے میں امام ترمذیؒ نے کتاب العلل میں فرمایا ہے کہ اس پر کسی کا عمل نہیں ہے، ان کا مقصد یہ ہے کہ بغیر کسی عذر کے حالت قیام میں یہ روایت کسی کے نزدیک قابل عمل نہیں ہے، امام بخاری نے بتادیا کہ یہ جمع صوری پر محمول ہے اور مرض وسفر وغیرہ کے عذر میں قابل عمل ہے، نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مغرب کا وقت غروب سے عشاء تک ممتد رہتا ہے اور اس کا آخری وقت عشاء کے اول وقت سے متصل ہے، درمیان میں کوئی فاصلہ نہیں، اگر کوئی معذور جمع صوری کرنا چاہے تو گنجائش ہے۔ واللہ اعلم

## [۱۹] بَابُ مَنْ كَرِهَ اَنْ يُقَالَ لِلْمَغْرِبِ الْعِشَاءَ

(۵۶۳) حَدَّثَنَا اَبُوْ مَعْمَر .هُوَ عَبْدُ اللهِ بْنُ عَمْرٍو. قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ الْوَارِثِ عَنِ الْحُسَيْنِ قَالَ حَدَّثَنَا عَبْدُ اللهِ بْنُ بُرَيْدَةَ قَالَ حَدَّثَنِيْ عَبْدُ اللهِ الْمُزَنِيُّ اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ قَالَ لَا تَغْلِبَنَّكُمْ الْاَعْرَابُ عَلٰى اِسْمِ صَلٰوتِكُمُ الْمَغْرِبِ قَالَ وَتَقُوْلُ الْاَعْرَابُ هِيَ الْعِشَاءُ .

**ترجمہ** باب، ان لوگوں کے استدلال کا بیان جو مغرب پر عشاء کا اطلاق مکروہ قرار دیتے ہیں۔ حضرت عبداللہ مزنی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تمہاری مغرب کی نماز کے نام پر اعراب غالب نہ آجائیں، حضرت عبداللہؓ کہتے ہیں کہ یہ اعراب اس نماز کو عشاء کے نام سے یاد کرتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد یہ ہے کہ شریعت میں مختلف چیزوں کے باقاعدہ اصطلاحی نام مقرر کئے گئے ہیں، تاکہ ان ناموں کیساتھ احکام شریعت بیان کئے جائیں اور مخاطب کو سمجھنے میں سہولت رہے اور ایک حکم دوسرے حکم سے بالکل ممتاز طریقہ پر سمجھا جاسکے، مغرب اور عشاء کے الفاظ بھی شریعت کی اصطلاح میں آکر، جاہلیت کے زمانہ کے اطلاق یا لغوی مفہوم سے قدرے مختلف ہو گئے ہیں، مغرب کے لغوی معنی ہیں، غروب کا وقت اور عشاء کے لغوی معنی ہیں ''اول ظلام اللیل'' رات کی تاریکی کا ابتدائی حصہ اور اس کا آغاز غروب شفق سے ہوتا ہے جب کہ شریعت کی اصطلاح میں مغرب اور عشاء کے الفاظ، دو الگ الگ نمازوں کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔

اس لیے امام بخاریؒ کا مقصد یہ ہے کہ بول چال میں، اطلاقات میں اور احکام شرعیہ کے بیان میں ان اصطلاحات کی پابندی کی جائے، مغرب کو مغرب ہی کے نام سے یاد کیا جائے، لفظ عشاء کا اس پر اطلاق نہ کیا جائے، اگر اس کی رعایت نہ کی گئی تو اس کا نقصان ہوگا، ایک تو یہ کہ اسلامی نام کے مقابلہ پر جاہلیت کا نام فروغ پائے گا اور دوسرے یہ کہ احکام شرعیہ کے بیان میں التباس ہو جائے گا اور سننے والے کو دشواری پیش آئے گی کہ وہ کس حکم کو کس چیز سے متعلق قرار دے؟

**تشریح حدیث** حضرت عبداللہؓ مزنی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ یہ بادیہ نشین حضرات عام بول چال میں تمہارے ''مغرب'' کی نماز کے نام پر، جاہلیت کے زمانہ کے نام کو غالب نہ کردیں، اس لیے کہ یہ لوگ اس نماز کو ''عشاء'' کے نام سے یاد کرتے ہیں، اگر یہ لوگ اس سلسلے میں غالب آگئے تو دو نقصان ہوں گے، ایک تو اسلامی زبان کی حفاظت نہ ہو سکے گی اور دوسرے یہ کہ احکام میں التباس ہوگا، اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر احکام میں التباس نہ ہو اور اعراب کی زبان کے غلبہ کا بھی اندیشہ نہ ہو، جیسے مغرب اور عشاء کو تغلیباً عشائین کے نام سے یاد کرنا یعنی ''صلیتُ العشائین '' بولنا، تو اس کی اجازت دی جائے گی۔ واللہ اعلم

## [۲۰] بَابُ ذِكْرِ الْعِشَآءِ وَ الْعَتَمَةِ وَمَنْ رَآهُ وَاسِعاً

قَالَ اَبُوْهُرَيْرَةَ عَنِ النَّبِيِّ ﷺ اَثْقَلُ الصَّلَاةِ عَلَى الْمُنَافِقِيْنَ الْعِشَآءُ وَالْفَجْرُ. وَقَالَ لَوْ يَعْلَمُوْنَ مَا فِي الْعَتَمَةِ وَالْفَجْرِ. قَالَ اَبُوْعَبْدِ اللهِ وَالْاِخْتِيَارُ اَنْ يَقُوْلَ الْعِشَآءَ؛ لِقَوْلِ اللهِ تَعَالٰى وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ (نور:۵۸) وَيُذْكَرُ عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَ كُنَّا نَتَنَاوَبُ النَّبِيَّ ﷺ عِنْدَ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ فَاَعْتَمَ بِهَا. وَقَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ وَعَائِشَةُ اَعْتَمَ النَّبِيُّ ﷺ بِالْعِشَآءِ. وَقَالَ بَعْضُهُمْ عَنْ عَائِشَةَ اَعْتَمَ النَّبِيُّ ﷺ بِالْعَتَمَةِ. وَقَالَ جَابِرٌ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي الْعِشَآءَ. وَقَالَ اَبُوْ بَرْزَةَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُؤَخِّرُ الْعِشَآءَ. وَقَالَ اَنَسٌ اَخَّرَ النَّبِيُّ ﷺ الْعِشَاءَ الْاٰخِرَةَ. وَقَالَ ابْنُ عُمَرَ وَاَبُوْ اَيُّوْبَ وَابْنُ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللهُ عَنْهُمْ صَلَّى النَّبِيُّ ﷺ الْمَغْرِبَ وَالْعِشَاءَ.

(۵۶۴) حَدَّثَنَا عَبْدَانُ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ اللهِ قَالَ اَخْبَرَنَا يُوْنُسُ عَنِ الزُّهْرِيِّ قَالَ سَالِمٌ اَخْبَرَنِيْ عَبْدُ اللهِ قَالَ صَلَّى لَنَا رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَيْلَةً صَلَاةَ الْعِشَآءِ وَهِيَ الَّتِيْ يَدْعُوْ النَّاسُ الْعَتَمَةَ ثُمَّ انْصَرَفَ فَاَقْبَلَ عَلَيْنَا فَقَالَ اَرَأَيْتُمْ لَيْلَتَكُمْ هٰذِهِ فَاِنَّ رَأْسَ مِائَةِ سَنَةٍ مِنْهَا لَا يَبْقٰى مِمَّنْ هُوَ الْيَوْمَ عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ اَحَدٌ. (گذشتہ:۱۱۶)

**ترجمہ** باب، عشاء کو عشاء اور عتمہ کے نام سے ذکر کرنے کا حکم اور ان لوگوں کی رائے کی وضاحت جنھوں نے اس میں توسع اختیار کیا ہے، حضرت ابو ہریرہؓ نے حضور ﷺ سے نقل کیا کہ منافقین پر نمازوں میں سب سے بھاری نماز عشاء اور فجر ہیں، فرمایا کہ اگر لوگ عتمہ (یعنی عشاء) اور فجر کی فضیلت جان لیں تو...... ابوعبداللہ یعنی امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ پسندیدہ یہی ہے کہ لفظ عشاء استعمال کیا جائے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے " مِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ " فرمایا، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ لوگ عشاء کی نماز کے وقت رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں نوبت بہ نوبت جایا کرتے تھے تو آپ ﷺ نے (ایک دن) عتمہ یعنی تاریکی میں نماز پڑھی، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز عتمہ (تاریکی) میں پڑھی، بعض راویوں نے حضرت عائشہ سے یوں روایت کی ہے "اعتم النبی ﷺ بالعتمة" کہ رسول اللہ ﷺ نے عتمہ (عشا) کی نماز (عتمہ میں یعنی تاریکی میں تاخیر کرکے) پڑھی۔ حضرت جابرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز پڑھتے تھے۔ حضرت ابو برزہؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ عشا کی نماز کو موخر کرکے پڑھتے تھے۔

حضرت انس نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے پچھلی عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھی۔ حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابو ایوبؓ اور حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے مغرب اور عشاء کی نماز پڑھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہم کو عشاء کی نماز پڑھائی اور یہ وہ نماز ہے جسے لوگ عتمہ کے نام سے یاد کرتے ہیں پھر جب آپ فارغ ہو گئے تو روئے مبارک ہماری طرف کر کے فرمایا: اپنی اس رات کو یاد رکھنا کیونکہ اس صدی کے آخر تک ان لوگوں میں سے جو اس وقت روئے زمین پر ہیں کوئی باقی نہیں رہے گا۔

**مقصد ترجمہ** پچھلے باب میں ذکر تھا کہ شریعت نے جو اصطلاحی نام مقرر کئے ہیں ان کی پابندی کرنی چاہئے، اور اسی لیے مغرب پر عشاء کا لفظ نہ بولا جائے، اب اس باب میں پچھلے باب کے برخلاف یہ بیان کر رہے ہیں کہ عشاء کی نماز پر عشاء اور عتمہ دونوں ناموں کا اطلاق کیا گیا ہے، اس لیے اس میں گنجائش ہے، امام بخاری کی عادت ہے کہ ایسے مواقع پر وہ خود ذمہ داری قبول نہیں کرتے، بلکہ دوسروں کی طرف انتساب کر کے حکم بیان کرتے ہیں، چنانچہ ترجمۃ الباب کے الفاظ ہیں "ومن راہ واسعاً" یعنی ان لوگوں کی رائے کی وضاحت جنھوں نے گنجائش سمجھی ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ زیر بحث ترجمۃ الباب کا مضمون پچھلے باب سے بالکل مختلف ہے، کیونکہ بادیہ نشینوں کی زبان کی ترویج سے بچنے کی بات دونوں جگہ پائی جاتی ہے، وجہ فرق یہ ہے کہ اول تو مغرب پر عشاء کے اطلاق سے ممانعت میں دو باتیں تھیں: ایک اسلامی اصطلاحات کی حفاظت اور دوسرے احکام شرعیہ کے بیان میں التباس کا خطرہ اور عشاء پر عتمہ کے اطلاق میں پہلا سبب پایا جاتا ہے، احکام میں التباس کا کوئی اندیشہ یا اشتباہ کی کوئی گنجائش نہیں، کیونکہ دونوں کا مصداق ایک ہے، دوسرے یہ کہ حدیث پاک میں عشاء پر عتمہ کا اطلاق آیا بھی ہے، جیسا کہ امام بخاری مختلف تعلیقات کے ذریعہ ترجمۃ الباب میں اس کو ثابت کر رہے ہیں، بہر حال بخاری کا مقصد ترجمۃ الباب سے یہ ہے کہ عشاء پر اگر چہ عشاء ہی کا اطلاق پسندیدہ ہے، لیکن روایات میں کبھی کبھی اس پر عتمہ کا اطلاق بھی کیا گیا ہے، اس لیے اگر کبھی اس لفظ کو استعمال کر لیا جائے تو مضائقہ نہیں ہے، نیز لغت کے اعتبار سے بھی ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے، مقصد ترجمہ کی یہ وضاحت شارحین کے ذوق کے مطابق ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ اس مقصد کے ساتھ عشاء کے اول وقت کی تعیین کی طرف بھی اشارہ ہو کیونکہ عشاء کے معنی اول ظلام اللیل یعنی رات کی تاریکی کا ابتدائی حصہ ہیں، اور عتمہ بھی ازروئے لغت غیبوبت شفق کے بعد کو کہتے ہیں، اس لیے امام بخاری نے اس طرف بھی متنبہ کر دیا کہ عشاء کے وقت کی ابتداء شفق غائب ہونے کے بعد سے ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

**ترجمۃ الباب کی تعلیقات** اس ترجمہ کے ذیل میں امام بخاریؒ نے سند حذف کر کے متعدد احادیث کے وہ جملے نقل کیے ہیں جن میں عشاء پر کبھی عشاء اور کبھی عتمہ کا اطلاق کیا گیا ہے، ان تمام احادیث کو امام بخاریؒ نے اپنی کتاب میں دوسرے مقامات پر بسند صحیح نقل کیا ہے، مگر یہاں اختصار کے سبب سندیں ذکر نہیں کی ہیں، بلکہ صرف صحابی کا نام ذکر کر دیا ہے، اس طرح سند کے اول سے راویوں کے حذف کرنے کو تعلیق کہتے ہیں۔

**قال ابو ھریرہ الخ** حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ منافقین پر سب سے بھاری نمازیں فجر اور عشاء کی ہیں، یہ

الفاظ "باب فضل العشاء فی جماعة" میں بسند متصل مذکور ہیں، جن میں عشاء کی نماز کے لیے عشاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، پھر فرمایا گیا ہے کہ اگر لوگوں کو وہ فضیلت معلوم ہو جائے جو عتمہ (عشاء) اور فجر میں رکھی گئی ہے، تو لوگ گھٹنوں کے بل چل کر یعنی زیادہ سے زیادہ مشقت برداشت کر کے بھی ان میں حاضر ہونے کی کوشش کریں، یہ الفاظ "باب الاستهام فی الاذان" میں بسند صحیح مذکور ہیں جن میں عشاء پر عتمہ کا اطلاق کیا گیا ہے۔

**قال ابو عبدالله الخ** ابوعبداللہ، خود امام بخاریؒ ہیں، فرماتے ہیں کہ اگرچہ عتمہ کا اطلاق عشاء پر کیا گیا ہے اور اس کی گنجائش بھی ہے، لیکن پسندیدہ یہی ہے کہ لفظ عشاء کا استعمال کیا جائے کیونکہ قرآن کریم میں بھی اس نماز کو عشاء کے لفظ سے ذکر کیا گیا ہے، یہ مضمون حدیث پاک میں بھی آیا ہے: **لایغلبنکم الاعراب علی اسم صلوتکم العشاء فانها فی کتاب الله العشاء** "یعنی یہ بادیہ نشین اور اہل دیہات عشاء کی نماز پر کسی اور لفظ کا اطلاق میں تم پر غالب نہ آجائیں، اس لیے کہ اس نماز پر کتاب اللہ میں عشاء کا لفظ بولا گیا ہے۔ امام بخاری نے یہ لفظ بڑھا کر متنبہ کر دیا کہ اگرچہ عشاء پر عتمہ کے اطلاق کی گنجائش ہے مگر کبھی کبھی، عام طور پر پسندیدہ لفظ وہی ہوگا جسے قرآن میں ذکر کیا گیا ہے۔

**ویذکر عن ابی موسی الخ** حضرت ابوموسیٰؓ سے منقول ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں نوبت بہ نوبت جایا کرتے تھے، ہمارا یہ جانا عشا کی نماز کے وقت تھا تو آپؐ عشاء کی نماز کو عتمہ میں یعنی تاخیر فرما کر تاریکی میں پڑھتے تھے، اس تعلیق کو امام بخاریؒ نے دو باب کے بعد "باب فضل صلوة العشاء" میں مرفوعاً ذکر کیا ہے، جب کہ یہاں اس کو یذکر کہہ کر یعنی بصیغۂ مجہول اور بصیغۂ تمریض لایا گیا ہے، معلوم ہوا کہ امام بخاری تعلیقات میں صیغۂ تمریض استعمال کریں تو ان کا ضعیف ہونا ضروری نہیں، بلکہ امام بخاری کبھی روایت بالمعنی کے طور پر کوئی بات ذکر کریں، یا اپنی ضرورت کے مطابق صرف ایک جزء کے نقل پر اکتفا کریں، یا ان کے نزدیک کوئی اور مصلحت ہو تو وہ صیغۂ تمریض ذکر کر دیتے ہیں۔

دوسری بات یہ کہ یہاں عشاء پر عتمہ کا لفظ نہیں بولا گیا ہے، بلکہ عشاء کی نماز کو تاخیر سے پڑھنے کے لیے عتمہ سے باب افعال اعتم استعمال ہوا ہے، آگے بھی دیگر تعلیقات میں فعل کا استعمال ہوا ہے۔

امام بخاریؒ اس سے عشاء پر لفظ عتمہ کا اطلاق دکھا رہے ہیں، یہ امام بخاری کی شان ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اعتم وغیرہ کا اطلاق خاص لغوی استعمال ہے، عتمہ کے عشاء پر اطلاق کا اس سے ثبوت ضروری نہیں۔

**قال ابن عباسؓ و عائشهؓ الخ** - رسول اللہ ﷺ نے عتمہ یعنی عشاء کی نماز کو موخر کر کے پڑھا، اس تعلیق میں بالعتمة کے بعد بالعشاء، بالعتمة کا بدل اشتمال ہے، بخاری کا مدعا ثابت ہو گیا کہ عشاء پر عتمہ کا اطلاق ہوا۔ ابن عباسؓ کی روایت "**باب النوم قبل العشاء**" میں اور حضرت عائشہؓ کی روایت "**باب فضل العشاء**" اور "**بابُ النومِ قبل العشاء**" میں بسند متصل مذکور ہے۔

وقال بعضهم عن عائشه الخ. یہ تعلیق "باب خروج النساء الی المساجد" میں بہ سند شعیب عن الزہری عن عروۃ عن عائشۃ مذکور ہے، اس تعلیق میں اعتم بالعتمۃ کے الفاظ ہیں یعنی فعل مشتق بھی استعمال ہوا ہے اور عشاء پر عتمہ کا لفظ بھی بولا گیا ہے۔

قال جابرؓ الخ۔ متعدد صحابہ کرام سے عشاء کی نماز پر لفظ عتمۃ کے اطلاق کا ثبوت فراہم کرنے کے بعد اب امام بخاری عشاء پر لفظ عشاء کا اطلاق دکھانا چاہتے ہیں، سب سے پہلے حضرت جابر بن عبداللہ انصاریؓ کی روایت ذکر کی ہے، جو امام بخاری کے یہاں "باب وقت المغرب" اور "باب وقت العشاء" میں بسند متصل مذکور ہے، اس روایت میں عشاء کے لیے عشاء کا استعمال کیا گیا ہے۔

قال ابوبرزۃؓ الخ۔ اس تعلیق میں بھی عشاء کے لیے عشاء کا استعمال ہے، یہ تعلیق سند متصل کے ساتھ "باب العصر" میں گذر چکی ہے۔

قال انسؓ الخ۔ اس تعلیق کو امام بخاری نے "باب وقت العشاء الی نصف اللیل" میں بسند متصل ذکر کیا ہے، اس میں عشاء پر عشاء کا اطلاق کیا گیا ہے۔

قال ابن عمر و ابوایوب و ابن عباس الخ. اس تعلیق میں تین صحابہ کرام کے نام ہیں: حضرت عبداللہ بن عمرؓ، حضرت ابوایوب انصاریؓ اور حضرت ابن عباسؓ، ابن عمرؓ اور ابوایوبؓ کی روایت کتاب الحج میں بہ سند متصل مذکور ہے اور ابن عباس کی روایت "باب تاخیر الظهر الی العصر" میں گذر چکی ہے۔ ان تینوں روایتوں میں عشاء پر لفظ عشاء کا اطلاق کیا گیا ہے۔

**تشریح حدیث** اس باب کے تحت امام بخاریؒ نے جو روایت دی ہے، اس کے مضامین کی تفصیل "باب السمر فی العلم" (حدیث:۱۱۶) میں گذر گئی ہے، حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک رات ہمیں رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز پڑھائی اور یہ وہی نماز تھی جسے عام طور پر لوگ عتمۃ کے نام سے یاد کرتے ہیں، انہی الفاظ سے ترجمۃ الباب کا تعلق ہے، معلوم ہوا کہ ایک ایسا وقت بھی گذرا ہے جب عشاء کی نماز کے لیے عتمۃ کا لفظ کثیر الاستعمال تھا، لیکن چونکہ وہ جاہلیت کا زمانہ تھا اس لیے آہستہ آہستہ اس کا استعمال کم ہوتا رہا اور عشاء کی اصطلاح رواج پاتی رہی، اب حکم یہ ہے کہ عشاء کا استعمال پسندیدہ ہے، لیکن چونکہ عتمۃ کا استعمال بھی کیا گیا ہے اور التباس کا بھی اندیشہ نہیں، اس لیے گاہ بگاہ اس لفظ کے استعمال میں مضائقہ نہیں ہے۔

## [۲۱] بَابُ وَقْتِ الْعِشَآءِ إِذَا اجْتَمَعَ النَّاسُ اَوْ تَاَخَّرُوْا

(۵۶۵) حَدَّثَنَا مُسْلِمُ بْنُ اِبْرَاهِيْمَ قَالَ حَدَّثَنَا شُعْبَةُ عَنْ سَعِيْدِ بْنِ اِبْرَاهِيْمَ عَنْ مُحَمَّدٍ

بْنِ عَمْرٍو وَهُوَ ابْنُ الْحَسَنِ بْنِ عَلِيٍّ قَالَ سَأَلْنَا جَابِرَ بْنَ عَبْدِ اللهِ عَنْ صَلوٰةِ النَّبِيِّ ﷺ فَقَالَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُصَلِّي الظُّهْرَ بِالْهَاجِرَةِ وَالْعَصْرَ وَالشَّمْسُ حَيَّةٌ وَالْمَغْرِبَ إِذَا وَجَبَتْ وَالْعِشَاءَ إِذَا كَثُرَ النَّاسُ عَجَّلَ وَإِذَا قَلُّوْا أَخَّرَ وَالصُّبْحَ بِغَلَسٍ. (گذشتہ:۵۶۰)

**ترجمہ** باب، عشاء کے وقت کا بیان، جب لوگ جمع ہو جائیں یا دیر کریں۔ حضرت محمد بن عمرو (جو حضرت حسنؓ بن علیؓ کے صاحب زادے ہیں) فرماتے ہیں کہ ہم نے حضرت جابر بن عبداللہ انصاری سے رسول اللہ ﷺ کی نماز کے بارے میں سوال کیا تو فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ ظہر کی نماز سخت گرمی کے وقت پڑھتے تھے اور عصر ایسے وقت میں پڑھتے تھے کہ سورج ابھی زندہ ہوتا تھا، اور مغرب کی نماز غروبِ آفتاب کے فوراً بعد پڑھتے تھے اور عشاء میں اگر سب مقتدی آجاتے تو جلدی پڑھ لیتے اور اگر حاضرین کم ہوتے تو تاخیر فرما دیتے اور صبح کی نماز اندھیرے میں پڑھتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** ترجمہ کا مقصد کیا ہے؟ حافظ ابن حجرؒ نے بڑی عمدہ اور پاکیزہ بات بیان کی کہ مقصد ہے ان لوگوں پر رد کرنا جنھوں نے عشاء اور عتمہ کے اطلاق میں فرق کیا ہے، اور کہا ہے کہ اگر نماز کو اول وقت میں پڑھ لیا جائے تو اس کا نام عشاء ہے اور دیر سے ادا کریں تو عتمہ، حافظ کہتے ہیں کہ یہ خیال غلط ہے، کیونکہ روایت میں یہ آیا کہ نماز اول وقت میں ہو تب بھی عشاء، اور دیر سے ہو تب بھی عشاء۔

حافظؒ کا بیان کردہ مقصد باب سابق سے بھی مربوط ہے اور نہایت اچھی بات ہے، مگر علامہ عینیؒ معترض ہیں کہ "هذا كلام واهٍ" یہ بیکار بات ہے، کیونکہ ترجمۃ الباب کے مضمون میں اس مضمون کی طرف اشارہ بھی نہیں ہے، اس لیے مقصد ان کے نزدیک یہ ہے کہ بخاری اس باب میں عشاء کا پسندیدہ وقت بیان کرنا چاہتے ہیں کہ اگر نمازی جمع ہو جائیں تو اول وقت میں پڑھ لینا پسندیدہ ہے اور نمازیوں کے جمع ہونے میں تاخیر ہو جائے تو تاخیر سے پڑھنا بہتر ہے، علامہ سندھی کے نزدیک بھی مقصد ترجمہ "بيان المختار من وقت العشآء" یعنی عشاء کی نماز کے لیے پسندیدہ وقت کی وضاحت ہے۔

**حضرۃ الاستاذؒ کا ارشاد** ارشاد فرمایا کہ یہ سب بڑوں کی باتیں ہیں، ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ پچھلے ابواب میں یہ بات آگئی تھی کہ مغرب کی نماز اور ہے اور عشاء کی نماز اور، اور ان کے احکام بھی الگ الگ ہیں، اسی لیے مغرب پر عشاء کا اطلاق بھی ممنوع ہے، اب اس باب میں پیغمبر علیہ السلام کے عمل سے امام بخاری مغرب اور عشاء کے درمیان ایک فرق دکھانا چاہتے ہیں کہ مغرب کی نماز پیغمبر علیہ السلام کے زمانہ میں جمع بین الصلوتین کے موقع کے علاوہ ہمیشہ اول وقت ہی میں پڑھی گئی، اس معمول میں کبھی تغیر واقع نہیں ہوا، لیکن عشاء کی نماز کا ایک وقت نہیں رکھا گیا، یہ نماز اول وقت میں بھی پڑھی گئی، ثلث لیل پر بھی، بلکہ نصف لیل پر بھی پڑھی گئی، اس لیے عشاء کی نماز کو اول وقت میں پڑھا جائے یا موخر کر کے پڑھا جائے، دونوں باتیں درست ہیں اور اگر نمازیوں کے اول وقت میں حاضر ہونے کی صورت میں مقدم، ورنہ موخر کر دیا جائے تو اس کو درست قرار دیا جائے گا۔

**تشریح حدیث** حدیث وہی ہے جو چند ابواب پہلے "باب صلوۃ المغرب" میں گذری ہے، اس میں تمام نمازوں کے اوقات بیان کئے گئے ہیں جو اپنی اپنی جگہ آ رہے ہیں، یہاں ترجمۃ الباب سے عشاء کا وقت متعلق ہے جس کے بارے میں یہ آیا کہ لوگ جمع ہو جاتے تو نماز اول وقت میں ہوتی اور جمع ہونے میں دیر کرتے تو عشاء کو موخر کر دیا جاتا، حافظ ابن حجرؒ کے بیان کردہ مقصد کے تحت تشریح یہ کی جائے گی کہ دیکھو اول وقت میں نماز ادا کی جائے تو عشاء، آخر وقت میں پڑھی جائے تب عشاء۔ اور علامہ سندھیؒ وعلامہ عینیؒ کے بیان کے مطابق دونوں وقت عشاء کے لیے برابر اور پسندیدہ ہیں۔ اور ہمارے خیال میں بخاری نے مغرب اور عشاء کے درمیان فرق کی وضاحت کر دی کہ دیکھئے مغرب کی نماز تو ہر حال میں اول وقت میں ہے، اس کو بلا ضرورت موخر کرنا درست نہیں ہے؛ البتہ اگر کوئی طویل قراءت کرے کہ نماز مغرب شروع تو اول وقت میں ہو جائے لیکن کبھی قراءت میں طول کے سبب دیر ہو جائے تو اس میں شفق کے ڈوبنے تک کراہت نہیں اور عشاء کی نماز کے لیے اول وقت کی پابندی نہیں کی گئی، بلکہ ضرورت کے مطابق تقدیم وتاخیر کی جاتی رہی، اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسجدوں میں نمازیوں کی سہولت اور انتظام کے لیے جو اوقات مقرر کر دیے جاتے ہیں وہ درست نہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اوقات مقرر نہ ہوں اور انتظام نہ ہو تو بڑی پریشانی بڑھ جاتی ہیں، اس لیے از روئے انتظام تعیین اوقات بھی درست ہے، مگر بخاری کا مقصد تو یہ واضح کرنا ہے کہ عہد رسالت میں عشاء کی نماز کے لیے اول وقت کا انتخاب نہیں تھا، بلکہ حسب ضرورت تقدیم وتاخیر کی جاتی تھی۔　　　واللہ اعلم

## [۲۲] بَابُ فَضْلِ الْعِشَاءِ

(۵۶۶) حَدَّثَنَا يَحْيَى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ اَنَّ عَائِشَةَ اَخْبَرَتْهُ قَالَتْ اَعْتَمَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَيْلَةً بِالْعِشَاءِ وَذٰلِكَ قَبْلَ اَنْ يَفْشُوَ الْاِسْلَامُ فَلَمْ يَخْرُجْ حَتّٰى قَالَ عُمَرُ نَامَ النِّسَاءُ وَالصِّبْيَانُ فَخَرَجَ فَقَالَ لِاَهْلِ الْمَسْجِدِ مَا يَنْتَظِرُهَا اَحَدٌ مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ غَيْرُكُمْ.　(آئندہ:۵۶۹،۸۶۲،۸۶۴)

(۵۶۷) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ الْعَلَاءِ قَالَ اَخْبَرَنَا اَبُوْ اُسَامَةَ عَنْ بُرَيْدٍ عَنْ اَبِيْ بُرْدَةَ عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى قَالَتْ كُنْتُ اَنَا وَاَصْحَابِي الَّذِيْنَ قَدِمُوْا مَعِيَ فِي السَّفِيْنَةِ نُزُوْلًا فِيْ بَقِيْعِ بُطْحَانَ وَالنَّبِيُّ ﷺ بِالْمَدِيْنَةِ فَكَانَ يَتَنَاوَبُ النَّبِيَّ ﷺ عِنْدَ صَلٰوةِ الْعِشَاءِ كُلَّ لَيْلَةٍ نَفَرٌ مِنْهُمْ فَوَافَقْنَا النَّبِيَّ ﷺ اَنَا وَاَصْحَابِيْ وَلَهُ بَعْضُ الشُّغْلِ فِيْ بَعْضِ اَمْرِهٖ فَاَعْتَمَ بِالصَّلٰوةِ حَتّٰى ابْهَارَّ اللَّيْلُ ثُمَّ خَرَجَ النَّبِيُّ ﷺ فَصَلّٰى بِهِمْ فَلَمَّا قَضٰى صَلَاتَهُ قَالَ لِمَنْ حَضَرَهُ عَلٰى رِسْلِكُمْ اَبْشِرُوْا، اِنَّ مِنْ نِعْمَةِ اللهِ عَلَيْكُمْ اَنَّهُ لَيْسَ اَحَدٌ مِنَ النَّاسِ يُصَلِّيْ هٰذِهِ السَّاعَةَ

غَیْرُکُمْ اَوْقَالَ مَاصَلّٰی هٰذِهِ السَّاعَةَ اَحَدٌ غَیْرُکُمْ، لَایَدْرِیْ اَیَّ الْکَلِمَتَیْنِ قَالَ قَالَ اَبُوْمُوْسٰی فَرَجَعْنَا فَرْحٰی بِمَا سَمِعْنَا مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ .

**ترجمہ** باب، عشاء کی فضیلت کا بیان۔ حضرت عائشہؓ نے حضرت عروہ سے بیان کیا کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز میں دیر کی اور یہ اسلام کے پھیلنے سے پہلے کا واقعہ ہے، چنانچہ آپ گھر سے نہیں نکلے، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے عرض کیا کہ عورتوں اور بچوں کو نیند آ رہی ہے، پھر آپ تشریف لائے اور اہل مسجد سے فرمایا کہ روئے زمین پر تمہارے علاوہ اور کوئی اس نماز کا انتظار نہیں کر رہا ہے۔ حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ میں اور میرے وہ رفقاء جو میرے ساتھ کشتی میں آئے تھے، وادیٔ بطحان میں اترے ہوئے تھے اور رسول اللہ ﷺ مدینہ میں تھے، چنانچہ ہر رات میں ان لوگوں میں سے چند آدمی عشاء کی نماز کے لیے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں نوبت بہ نوبت آیا کرتے تھے، پھر اتفاق سے جس دن میں اور میرے چند ساتھی آئے تو اس دن رسول اللہ ﷺ کسی کام میں مشغول تھے اور آپ نے اس دن نماز میں تاخیر فرمادی، یہاں تک کہ آدھی رات ہوگئی، پھر آپ باہر تشریف لائے اور نماز پڑھائی، جب آپ نماز سے فارغ ہوگئے تو آپ نے حاضرین سے فرمایا کہ ذرا ٹھہرے رہیئے، تمہیں یہ خوشخبری دیتا ہوں کہ تم پر یہ اللہ کی نعمت ہے کہ اس وقت تمہارے علاوہ لوگوں میں سے کوئی نماز نہیں پڑھ رہا ہے، یا یہ فرمایا کہ تمہارے علاوہ کوئی ایسا نہیں ہے جس نے اس وقت نماز پڑھی ہو، فرمایا کہ یہ معلوم نہیں کہ آپ نے ان دونوں جملوں میں سے کیا جملہ ارشاد فرمایا، حضرت ابوموسیٰؓ کہتے ہیں کہ یہ بات رسول اللہ ﷺ سے سن کر ہم لوگ بہت خوش خوش واپس ہوئے۔

**مقصد ترجمہ** مقصد بالکل واضح ہے کہ نماز عشاء کی فضیلت بیان کرنا چاہتے ہیں اور باب کے تحت دی گئی روایات سے یہ مقصد ثابت ہے، لیکن حافظ ابن حجرؒ کی بات پر بڑا تعجب ہے، فرماتے ہیں کہ باب کے تحت دی گئی روایتوں سے عشاء کی تو کوئی فضیلت ظاہر نہیں ہوئی، اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بخاری کا یہ ترجمہ "مَا یَنْتَظِرُهَا اَحَدٌ مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ غَیْرُکُمْ" (تمہارے علاوہ اور کوئی روئے زمین پر اس نماز کا منتظر نہیں ہے) سے ماخوذ ہے، مگر اس صورت میں یہ کہنا ہوگا کہ یہاں حذف ہے اور اصل ترجمہ فضل العشاء نہیں باب فضل انتظار العشاء ہونا چاہئے۔

جب کہ علامہ سندھیؒ فرمارہے ہیں کہ عشاء کی فضیلت بالکل صاف ہے کہ دونوں روایتوں میں عشاء میں شرکت کرنے والوں کی مدح وثنا اور ہمت افزائی کی جاری ہے اور ان کو خوشخبری سنائی جارہی ہے وغیرہ، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ عشاء کی خصوصی فضیلت تو اس بات سے عیاں ہے کہ تمام نمازوں میں صرف اسی کے لیے انتظار اور انتظار پر بشارت سنائی جارہی ہے۔ ہمیں بھی حافظ ابن حجرؒ کی بات پر حیرت ہے، کیونکہ باب کے ذیل میں دی گئی روایات سے نماز عشاء کی خصوصی فضیلت پوری طرح ثابت ہے، کیونکہ اس کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس وقت کی نماز وہ نعمت ہے جو تمہارے علاوہ کسی کو نہیں دی گئی، وقت بھی ایسا ہے کہ انسان تمام کاموں سے فارغ ہے، نہ کاروبار، نہ آمد ورفت، نہ کوئی اور مشغلہ،

پھر وقت میں اتنی وسعت کہ جب تک جی چاہے مناجات میں مشغول رہیے، اس سے زیادہ اور کیا فضل ہوگا کہ اس عزت کے ساتھ ہزاروں امتوں سے ممتاز کر کے صرف مسلمانوں کو نوازا گیا ہے۔

**تشریح حدیث اول** پہلی روایت میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک رات عشاء کی نماز دیر سے پڑھائی اور یہ اس وقت کی بات ہے کہ اسلام پورے طور پر نہیں پھیلا تھا، یعنی اسلام کا قدم مدینہ سے باہر نہیں نکلا تھا، علامہ عینیؒ فرماتے ہیں کہ اسلام کی اشاعت فتح مکہ کے بعد ہوئی ہے، غرض یہ کہ آپ کو حجرے سے نکلنے میں دیر ہوئی تو حضرت عمرؓ کو یہ عرض کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ نماز کے لیے جو بچے اور عورتیں حاضر ہیں، انھیں نیند آنے لگی ہے، حضرت عمرؓ نے مردوں کا ذکر نہیں کیا حالانکہ نیند ان کو بھی آرہی ہوگی، صرف عورتوں اور بچوں کا ذکر کیا کہ ان کے نام پر رحم و کرم اور رعایت کی درخواست مناسب تھی، مگر مسلم شریف کی روایت (ص: ۲۲۸/ ج:۱) میں ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے زور زور سے یہ بات کہی تو حضور ﷺ کو یہ بات پسند نہیں آئی اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ "**ما کان لکم ان تنزروا رسول اللہ** ﷺ" تمہیں پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام پر اس طرح تقاضا اور اصرار نہیں کرنا چاہیے تھا، گویا تاخیر کسی مجبوری یا مصلحت کی بنا پر تھی، بہر حال آپ باہر تشریف لائے، نماز پڑھائی اور نماز کے بعد ارشاد فرمایا: "**ماینتظرھا من اھل الارض احد غیرکم**" ہوسکتا ہے مطلب یہ ہو کہ یہ نماز صرف تمہاری خصوصیت ہے، یہ شرف اور فضیلت تم سے پچھلی امتوں میں کسی کو حاصل نہیں ہوئی، بعض روایات میں یہ الفاظ آئے بھی ہیں: "**ما صلیٰ ھذہ الصلوٰۃ امۃ قبلکم**" کہ تم سے پہلے کسی امت نے یہ نماز نہیں پڑھی، اس مطلب کے مطابق عشاء کی خصوصی فضیلت بالکل واضح ہے۔

اور ہوسکتا ہے کہ یہ بات بمقابلہ اہل کتاب کہی گئی ہو، جیسا کہ مسلم شریف کی روایت میں ہے: "**تنتظرون صلوٰۃ ماینتظرھا اھل دین غیرکم**" کہ تم ایسی نماز کے منتظر ہو کہ تمہارے علاوہ اور کسی دین والے اس کے منتظر نہیں ہیں، اس اعتبار سے مراد یہ ہوگی کہ یہاں مدینہ میں رہنے والے یہود بھی ہیں، مگر وہ آرام سے اپنی قیام گاہوں میں سو رہے ہیں اور تم ہو کہ اپنے پیغمبر علیہ السلام کے ساتھ نماز میں شرکت کے منتظر ہو، اس مطلب کی رو سے عشاء کی فضیلت یہ ہوگی کہ تمہارا یہ انتظار اس فضیلت کے سبب جو اس نماز کو حاصل ہے بالکل بجا ہے، نیز یہ کہ جب یہ نماز صرف تمہاری خصوصیت اور تمہارا امتیازی نشان ہے تو تمہیں اس کے لیے خصوصی اہتمام کرنا چاہیے۔

اور ہوسکتا ہے کہ یہ بات مدینہ طیبہ کی دیگر مسجدوں کے مقابلہ میں فرمائی گئی ہو کہ دیگر تمام مسجدوں کے نمازی عبادت سے فارغ ہو چکے ہیں، مگر تم ہو کہ ابھی تک پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی معیت میں نماز کا شرف حاصل کرنے کے لیے انتظار کر رہے ہو اور یہ انتظار اسی لیے تو ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عشاء کی نماز سے مسلمانوں کو خصوصی طور پر مشرف فرمایا ہے، وقت بھی بڑا وسیع عطا کیا ہے، موقع بھی خلوت کا ہے، اس طور پر عشاء کا خصوصی شرف اور فضیلت ظاہر ہے، مگر تعجب

ہے کہ حافظ ابن حجرؒ کیوں ادھر متوجہ نہیں ہوئے؟

**تشریح حدیث دوم** دوسری روایت حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی ہے، فرماتے ہیں کہ جب میں اور میرے ساتھی کشتی سے سفر کر کے اترے تو ہمارا قیام مدینہ طیبہ کے قریب بقیع بطحان میں تھا، بقیع اس وسیع میدان کو کہتے ہیں جہاں درخت یا درختوں کی جڑیں ہوں، مدینہ طیبہ میں اس طرح کے متعدد مقامات تھے، اس لیے جگہ کو متعین کرنے کے لیے کسی نہ کسی چیز کی طرف اضافت کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں بطحان کی طرف اضافت کی گئی ہے، جو مدینہ طیبہ کی ایک وادی کا نام ہے، بہر حال ان کا قیام بطحان کی وادی میں تھا، کشتی کے جس سفر کا ذکر ہے، اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابوموسیٰ اشعری یمن کے رہنے والے ہیں اور بالکل ابتداء ہی میں مکہ مکرمہ پہنچ کر مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے، پھر اس کے بعد اس سلسلے میں اختلاف ہے کہ اپنے وطن واپس ہو گئے تھے یا حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے تھے، محمد بن اسحاق نے مہاجرین حبشہ میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کا شمار کیا ہے، لیکن واقدی اور دوسرے اہل سیر اس کے منکر ہیں، حافظ ابن حجرؒ نے (التہذیب ص: ۳۶۲/ ج: ۵) لکھا ہے کہ یہ اپنے وطن سے کشتی کے ذریعہ سوار ہوئے، لیکن ہواؤں نے ان کی کشتی کو حبشہ میں جا اتارا، پھر یہ وہاں حضرت جعفر طیارؓ کے پاس مقیم رہے اور پھر انہی کے ساتھ مدینہ طیبہ پہنچے، حافظ ابن القیم نے (زاد المعاد ص: ۴۵/ ج: ۲) میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ حضرت ابوموسیٰ یمن واپس ہو گئے تھے، مگر جب انہیں کچھ مسلمانوں کا ہجرت کر کے حبشہ پہنچنا معلوم ہوا تو چونکہ حبشہ یمن سے قریب ہے، اس لیے یہ اپنے وطن سے ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے، پھر فتح خیبر کے بعد ۷ھ میں حضرت جعفرؓ ہی کے ساتھ مدینہ طیبہ پہنچے، بہر حال یہ کشتی کے ذریعہ سفر کر کے مدینہ پہنچے تو وادیٔ بطحان میں قیام رہا۔

آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ ہم سب چونکہ روزانہ حاضر خدمت نہ ہو سکتے تھے، اس لیے یہ طریقہ اختیار کر رکھا تھا کہ پوری جماعت میں سے روزانہ چند آدمی نوبت بہ نوبت حاضری دیتے، ایک دن کا واقعہ ہے کہ ہم لوگ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ کسی کام میں مشغول تھے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مشغولیت کسی لشکر کی ترتیب سے متعلق تھی، عشاء کی نماز کے لیے اتنی تاخیر سے باہر تشریف لائے کہ رات آدھی گذر گئی تھی (**ابھارّ اللیل ای انتصف، بھرة الشئ وسطه** سے ماخوذ ہے) پہلے آپ نے نماز پڑھائی پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا، ذرا ٹھہریئے! بہت دیر سے انتظار کر رہے تھے، طبعاً یہ بات تکلیف دہ ہے، مگر کس چیز کا انتظار تھا؟ نماز عشاء کا! خوشخبری سن لیجیے خدا کا بڑا احسان ہے کہ لوگوں میں سے کوئی شخص بھی تمہارے سوا اس وقت نماز پڑھنے والا نہیں ہے، یا یہ فرمایا کہ تمہارے علاوہ کسی نے اس وقت میں نماز پڑھی ہی نہیں یعنی تمہارا انتظار اسلام کی مخصوص اور امتیازی نماز کے لیے تھا، اس لیے یہ نہ سمجھنا کہ یہ اجر و ثواب سے خالی ہے، اس میں بہت بہت اجر ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ فرماتے ہیں کہ ہم آپ کی بات سن کر اس قدر خوش ہو کر واپس ہوئے جس کی انتہا نہیں، کیونکہ ہمیں نماز عشاء کے عمل اور اس کے انتظار پر مبارک باد حاصل ہوئی تھی، اس روایت

سے بھی عشاء کی خصوصی فضیلت ظاہر ہے۔　　واللہ اعلم

## [۲۳] بَابُ مَايُكْرَهُ مِنَ النَّوْمِ قَبْلَ الْعِشَاءِ

(۵۶۸) حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ سَلَامٍ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ الْوَهَّابِ الثَّقَفِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا خَالِدُ الْحَذَّاءُ عَنْ اَبِي الْمِنْهَالِ عَنْ اَبِي بَرْزَةَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ كَانَ يَكْرَهُ النَّوْمَ قَبْلَ الْعِشَاءِ وَالْحَدِيْثَ بَعْدَهَا . (گذشتہ:۵۴۱)

**ترجمہ** اس نیند کا بیان جو عشاء سے پہلے مکروہ ہے۔ حضرت ابو برزہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عشاء سے پہلے سونے کو اور عشاء کے بعد بات چیت کرنے کو ناپسند فرماتے تھے۔

**مقصد ترجمہ** تراجم کے انعقاد میں بخاری کا کمال ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہیں کہتے ہیں کہ عشاء سے قبل سونا مکروہ ہے، بلکہ کہتے ہیں کہ "مایکرہ من النوم" یعنی نیند کی کونسی صورت ایسی ہے جس میں کراہت ہے، حافظ ابن حجر اور علامہ عینی نے امام ترمذی کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ: " کرہ اکثر اھل العلم النوم قبل العشاء ورخص فی ذلک بعضھم وقال ابن المبارک اکثر الاحادیث علی الکراھۃ ورخص بعضھم فی رمضان " (ترمذی ص۲۳/ ج۱) یعنی اکثر اہل علم نے عشاء سے پہلے سونے کو مکروہ کہا ہے، اور بعض نے رخصت دی ہے، ابن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ اکثر احادیث تو کراہت پر دلالت کرتی ہیں، مگر بعض اہل علم نے رمضان میں (عشاء سے قبل) سونے کی رخصت دی ہے۔

امام طحاویؒ نے کراہت و اجازت میں اس طرح تطبیق دی ہے کہ عشاء کا وقت داخل ہونے سے قبل سوجائے تو گنجائش ہے، وقت داخل ہونے کے بعد سونے میں کراہت ہے۔

امام بخاریؒ وضاحت تو نہیں کرتے کہ عشاء سے قبل سونے کی ممانعت اور اجازت میں تطبیق کی کیا صورت ہے؟ مگر ترجمۃ الباب کے الفاظ میں اشارہ کر دیا، اگلے باب میں یہ بات واضح ہو جائے گی، خلاصہ یہ ہے کہ نہ ہر شخص کے لیے سونا مکروہ ہے، نہ ہر حال میں مکروہ ہے، ایک شخص اضطراری طور پر سوجائے تو کوئی گناہ نہیں، یا اختیاری طور پر سو رہا ہو کہ کچھ آرام کر سکے اور عشاء کی نماز نشاط کے ساتھ ادا کرے، نیز یہ کہ اس نے وقت پر بیدار ہونے کا انتظام کر لیا تھا، یا اس کو اپنی نیند پر قابو ہے، یا ایسی جگہ سو رہا ہے جہاں لوگ خود ہی اٹھا دیں گے، تو ایسی صورت میں سونے میں کوئی حرج نہیں اور اگر نماز با جماعت کے فوت ہونے کا اندیشہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

**تشریح حدیث** اس باب کے تحت حضرت ابو برزہؓ اسلمی کی ایک ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ عشاء سے پہلے سو جانے کو پسند نہیں کرتے تھے، اسی طرح عشاء کے بعد گفتگو کو بھی پسند نہیں کرتے تھے، حدیث پاک میں دونوں باتیں بالکل عام ہیں، مگر بخاری نے ترجمہ میں حدیث کی شرح کی طرف اشارہ کر دیا کہ ہر نوم مکروہ نہیں،

جیسا کہ عرض کیا گیا، اسی طرح عشاء کے بعد کی گفتگو میں بھی تفصیل ہے کہ بے ضرورت گفتگو جس سے رات کی نماز میں یا فجر کی جماعت میں شرکت میں حرج واقع ہوتا ہے ممنوع ہے، لیکن اگر کسی دینی مصلحت کے سبب گفتگو کی جائے تو روایت میں اس کی اجازت ہے اور پیغمبر علیہ السلام کی سیرت میں اس کے متعدد واقعات ہیں۔

## [۲٤] بَابُ النَّوْمِ قَبْلَ الْعِشَاءِ لِمَنْ غُلِبَ

(۵۶۹) حَدَّثَنَا اَيُّوْبُ بْنُ سُلَيْمَانَ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَبُوْبَكْرٍ عَنْ سُلَيْمَانَ قَالَ صَالِحُ بْنُ كَيْسَانَ اَخْبَرَنِيْ ابْنُ شِهَابٍ عَنْ عُرْوَةَ اَنَّ عَائِشَةَ قَالَتْ اَعْتَمَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ بِالْعِشَاءِ حَتّٰى نَادَاهُ عُمَرُ الصَّلَاةَ نَامَ النِّسَاءُ وَالصِّبْيَانُ فَخَرَجَ فَقَالَ مَايَنْتَظِرُهَا اَحَدٌ مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ غَيْرُكُمْ قَالَ وَلَا تُصَلّٰى يَوْمَئِذٍ اِلَّا بِالْمَدِيْنَةِ قَالَ وَكَانُوا يُصَلُّوْنَ الْعِشَاءَ فِيْمَابَيْنَ اَنْ يَغِيْبَ الشَّفَقُ اِلٰى ثُلُثِ اللَّيْلِ الْاَوَّلِ . (گذشتہ:۵۶٦)

(۵۷۰) حَدَّثَنَا مَحْمُوْدٌ قَالَ اَخْبَرَنَا عَبْدُ الرَّزَّاقِ قَالَ اَخْبَرَنِيْ ابْنُ جُرَيْجٍ قَالَ اَخْبَرَنِيْ نَافِعٌ قَالَ حَدَّثَنَا عَبدُ اللهِ بْنُ عُمَرَ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ شُغِلَ عَنْهَا لَيْلَةً فَاَخَّرَهَا حَتّٰى رَقَدْنَا فِيْ الْمَسْجِدِ ثُمَّ اسْتَيْقَظْنَا ثُمَّ رَقَدْنَا ثم اسْتَيْقَظْنا ثُم خَرَجَ عَلَيْنَا النَّبِيُّ ﷺ ثُمَّ قَالَ لَيْسَ اَحَدٌ مِنْ اَهْلِ الْاَرْضِ يَنْتَظِرُ الصَّلوٰةَ غَيْرُكُمْ وكَانَ ابنُ عُمرؓ لايُبالِيْ أقدَّمها أَمْ أخَّرَها؟ إذا كَانَ لا يخْشٰى أنْ يَغْلِبَهُ النومُ عَنْ وَقتِها، وكَانَ يَرْقُدُ قَبْلَهَا .

(۵۷۱) قَالَ اِبْنُ جُرَيْجٍ قُلْتُ لِعَطَاءٍ فَقَالَ سَمِعْتُ ابْنَ عَبَّاسٍ يَقُوْلُ اَعْتَمَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ لَيْلَةً بِالْعِشَاءِ حَتّٰى رَقَدَ النَّاسُ وَاسْتَيْقَظُوْا وَرَقَدُوْا وَاسْتَيْقَظُوا فَقَامَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ فَقَالَ الصَّلَاةُ ،قَالَ عَطَاءٌ قَالَ ابْنُ عَبَّاسٍ فَخَرَجَ نَبِيُّ اللهِ ﷺ كَاَنِّيْ اَنْظُرُ اِلَيْهِ الْآنَ يَقْطُرُ رَاسُهُ مَاءً وَاضِعاً يَدَهُ عَلٰى رَاسِهٖ فَقَالَ لَوْلَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِيْ لَاَمَرْتُهُمْ اَنْ يُصَلُّوْهَا هٰكَذَا فاسْتَثْبَتُّ عَطَاءً كَيْفَ وَضَعَ النَّبِيُّ ﷺ يَدَهُ عَلٰى رَاسِهٖ كَمَا اَنْبَاَهُ اِبْنُ عَبَّاسٍ فَبَدَّدَلِيْ عَطَاءٌ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ شَيْئاً مِنْ تَبْدِيْدٍ ثُمَّ وَضَعَ اَطْرَافَ اَصَابِعِهٖ عَلٰى قَرْنِ الرَّاْسِ ثُمَّ ضَمَّهَا يُمِرُّهَا كَذٰلِكَ عَلَى الرَّاسِ حَتّٰى مَسَّتْ اِبْهَامُهٗ طَرَفَ الْاُذُنِ مِمَّايَلِيْ الْوَجْهَ عَلَى الصُّدْغِ وَنَاحِيَةِ اللِّحْيَةِ لَا يُقَصِّرُ وَلَا يَبْطُشُ اِلَّا كَذٰلِكَ وَقَالَ لَوْلَا أَنْ اَشُقَّ عَلٰى اُمَّتِيْ لَاَمَرْتُهُمْ اَنْ يُصَلُّوْا هٰكَذَا . (آئندہ:۷۲۳۹)

**ترجمہ** باب، نیند کا غلبہ ہو تو عشاء سے قبل سونے کا بیان۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز دیر سے پڑھی، یہاں تک کہ حضرت عمرؓ نے حضور پاک ﷺ کو پکار کر کہا: نماز! عورتیں اور بچے سو گئے، چنانچہ آپ حجرے سے نکلے اور فرمایا کہ اہل زمین میں سے تمہارے علاوہ کوئی اس نماز کا انتظار نہیں کر رہا ہے، راوی کہتا ہے کہ ان دنوں مدینہ کے علاوہ اور کسی جگہ نماز نہیں ہوتی تھی اور عشاء کی نماز غروب شفق کے بعد سے رات کے ایک تہائی حصہ کے درمیان پڑھی جاتی تھی۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کو ایک رات میں عشاء کی نماز کے وقت مشغولیت پیش آ گئی تو آپ نے نماز کو موخر فرما دیا، یہاں تک کہ ہم لوگ مسجد میں سو گئے، پھر بیدار ہوئے، پھر سو گئے، پھر بیدار ہوئے، پھر رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ اہل زمین میں سے کوئی ایسا نہیں ہے، جو تمہارے علاوہ نماز کا انتظار کر رہا ہو۔ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اس کی پرواہ نہیں کرتے تھے کہ عشاء کی نماز کو جلدی پڑھیں یا دیر سے پڑھیں، بشرطیکہ انہیں اس کا اندیشہ نہ ہو کہ نماز کے وقت نیند سے مغلوب ہو جائیں گے اور وہ عشاء سے پہلے سو جاتے تھے۔ ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے یہ روایت جو نافع سے سنی تھی عطاء بن ابی رباح سے بیان کی تو عطاء نے کہا کہ میں نے ابن عباسؓ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز میں تاخیر فرمائی، یہاں تک کہ لوگ سو گئے، اور بیدار ہوئے، پھر سو گئے، اور بیدار ہوئے، پھر حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر نماز کے لیے کہا، عطاء کہتے ہیں کہ ابن عباسؓ نے بیان کیا کہ پھر رسول اللہ ﷺ حجرے سے نکلے گویا میں اس وقت بھی آپ ﷺ کو دیکھ رہا ہوں کہ آپ ﷺ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا، آپ ﷺ اپنے ہاتھ کو اپنے سر پر رکھے ہوئے تھے، پھر آپ نے فرمایا کہ اگر میں اپنی امت پر اس بات کو مشقت کا سبب نہ سمجھتا تو یہ حکم دیتا کہ وہ اسی وقت یہ نماز پڑھا کریں، ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے اس سلسلے میں عطاء سے مزید تحقیق کی درخواست کی کہ جیسے ابن عباسؓ نے آپ کو بتلایا تھا آپ بھی مجھے بتلائیں کہ رسول اللہ ﷺ نے سر پر اپنے ہاتھ کو کیسے رکھا تھا؟ تو عطاء نے اپنی انگلیاں قدرے کشادہ کیں، پھر انگلیوں کے کنارے سر کے کونے پر رکھے، پھر انگلیوں کو سر پر اس طرح گذارا کہ انگوٹھے نے کانوں کے اس کنارے کو مس کیا جو کنپٹی پر داڑھی کے کونے پر چہرے کے قریب ہے، نہ آپ اس میں کمی کر رہے تھے اور نہ مضبوط پکڑ رہے تھے، بس ایسے کر رہے تھے، جیسے میں کر رہا ہوں اور پھر آپ نے فرمایا کہ اگر میں اپنی امت کے لیے باعث مشقت نہ سمجھتا تو ان کو حکم دیتا کہ عشاء کی نماز اسی وقت پڑھا کریں۔

**مقصد ترجمہ** پچھلے باب کا عنوان تھا کہ نیند کی کونسی صورت مکروہ ہے؟ اس باب میں یہ بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص نیند سے مغلوب ہو کر سو جائے یعنی اس میں اس کے اختیار کا کوئی دخل نہ ہو تو اس کی یہ نیند قابل اعتراض نہیں، گویا اس باب میں ان حالات کی طرف اشارہ مقصود ہے، جن میں نیند کی اجازت ہے، جن میں ایک بات تو صراحت سے مذکور ہے یعنی نیند سے مغلوب ہو جانا اور کچھ روایات سے بھی سمجھ میں آتا ہے، کیوں کہ مثلاً روایت میں مسجد

میں نماز کے انتظار میں سونے کا ذکر ہے، جس پر پیغمبر علیہ السلام کی جانب سے ممانعت یا نکیر نہیں ہے، اس سے سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر نمازی ایسی جگہ سوجائے جہاں اٹھا دینا یقینی ہو جیسے مسجد میں صفوں کے درمیان آنکھ لگ گئی، تو وہاں جماعت کے وقت کون سونے دے گا؟ یقیناً اٹھا دیا جائے گا، اسی پر ان لوگوں کو بھی قیاس کرلیا جائے، جو سوتے وقت بیداری کا انتظام کرلیں، کسی کو مقرر کردیں، یا ان کی نیند اتنی گہری نہ ہو کہ سونے کے بعد اٹھنے کا کوئی سوال پیدا نہ ہوتا ہو، بلکہ انہیں اپنی عادت پر پورا اعتماد ہو کہ ضرورت کے وقت آنکھ کھل جائے گی وغیرہ، خلاصہ یہ ہے کہ نیند غیر اختیاری ہو تو معذور ہے اور اختیاری ہو لیکن نماز اور جماعت کے فوات کا اندیشہ نہ ہو تو چونکہ نیند سے کوئی نقصان نہیں اس لیے اس کی اجازت ہے۔

**تشریح حدیث اول** اس باب کے ذیل میں امام بخاریؒ نے دو روایتیں ذکر کی ہیں، پہلی روایت حضرت عائشہؓ سے ہے جو ایک باب پہلے "باب فضل صلوۃ العشاء" میں گذر چکی ہے، فرماتی ہیں کہ ایک دن عشاء کی نماز میں اس قدر تاخیر ہوئی کہ حضرت عمرؓ کو "نام النِّساءُ وَالصِّبْیَانُ" کہنے کی نوبت آگئی، بخاری کا مقصد ثابت ہوگیا کہ جو لوگ نماز کے ارادے سے آئے تھے، نماز میں تاخیر کے سبب ان پر نیند غالب آگئی، وہ سو گئے اور رسول اللہ ﷺ نے اس سونے پر کوئی نکیر نہیں کی، اس لیے کہ مسجد میں یا صفوں کے درمیان سونے سے نماز یا جماعت کے فوت ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ اسی پر ان تمام صورتوں کو قیاس کرلیجیے، جن میں سونے سے کوئی نقصان لازم نہ آتا ہو۔

**قال ولا تصلیٰ یومئذٍ الخ** ۔ "باب فضل صلوۃ العشاء" میں حضرت عائشہ کی روایت میں آیا تھا" **قبل ان یفشو الاسلام**" کہ یہ بات اسلام کی عام اشاعت سے پہلے کی ہے، اس روایت میں فرما رہی ہیں کہ یہ اس زمانہ کی بات ہے، جب مدینہ طیبہ کے علاوہ اس طرح کی نماز باجماعت کا موقع نہیں تھا، اس لیے کہ اسلام صرف مکہ اور مدینہ میں تھا، مگر مکہ کے مسلمان مشرکین کے ظلم وستم کی وجہ سے جماعت سے نماز پڑھنے پر قادر نہیں تھے۔

**وکانوا یصلون الخ** ۔ مفہوم یہ ہے کہ عشاء کی نماز شفق غائب ہونے کے فوراً بعد یعنی اول وقت میں نہ ہوتی تھی، بلکہ معمول یہ تھا کہ بالعموم تورات کے ایک تہائی حصہ تک موخر کرتے تھے، ورنہ بعض روایات میں اس وقت کے بھی بعد میں عشاء کی نماز پڑھنے کی بات مذکور ہے۔

**تشریح روایت دوم** دوسری روایت حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے ہے کہ ایک رات رسول اللہ ﷺ کو کسی مشغولیت کے سبب عشاء کی نماز میں تاخیر ہوگئی، معلوم ہوا کہ اتنی تاخیر خلاف عادت ہوئی، نیز یہ تاخیر اس تاخیر کے علاوہ ہے جو حضرت جابرؓ کی روایت میں مذکور ہوئی کہ لوگ جمع ہوئے تو پہلے پڑھ لی گئی اور دیر سے جمع ہوئے تو تاخیر کردی گئی، آگے فرماتے ہیں کہ اتنی تاخیر ہوئی کہ ہم لوگ سو گئے پھر بیدار ہوگئے، پھر سو گئے پھر بیدار ہوئے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز پڑھائی، اس میں یہ صراحت آگئی کہ جو لوگ مسجد میں آگئے تھے، ان پر نیند کا اتنا غلبہ تھا کہ جاگنے کی کوشش کے باوجود نیند ان پر غالب آجاتی تھی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ اپنی اپنی جگہ صفوں کے درمیان سو رہے

ہوں گے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ جس کا نوم ناقض وضو رہا ہوگا اس نے وضو کرلیا ہوگا، نماز پڑھانے کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس وقت تمہارے علاوہ کوئی نماز کا منتظر نہیں ہے۔

بخاری کا ترجمۃ الباب اس طرح ثابت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تشریف لانے کے بعد نیند پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا، بلکہ آپ کی جانب سے انتظار کو سراہا گیا اور آپ نے فرمایا کہ جی تو یہی چاہتا ہے کہ عشاء کی نماز مؤخر کر کے اسی وقت پڑھی جائے، لیکن امت کے لیے یہ عمل باعث مشقت ہو جائے گا اور میں امت کو مشقت میں ڈالنا نہیں چاہتا، گویا آپ نے یہ فرمایا کہ عشاء میں جس قدر تاخیر ہو پسندیدہ ہے۔

وکان ابن عمر الخ درمیان میں راوی حضرت ابن عمرؓ کا معمول بھی بیان کرتا ہے کہ ابن عمرؓ کو اگر یہ اطمینان ہو کہ نیند سے عشاء کی نماز متاثر نہ ہوگی، تو وہ اس کے مقدم یا موخر ہونے کی پرواہ نہ کرتے تھے۔

قال ابن جریج الخ ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے یہ روایت جو نافع سے سنی تھی اور جسے نافع نے ابن عمرؓ سے بیان کیا تھا، عطاء بن ابی رباح سے بیان کی، تو انھوں نے بتلایا کہ میں نے ابن عباسؓ سے سنا ہے کہ ایک رات میں رسول اللہ ﷺ کو عشاء کی نماز میں دیر ہوگئی، پھر وہی روایت سنائی، ابن عباس کی روایت میں اتنا جز زائد ہے کہ جب آپ تشریف لائے تو مجھے خوب یاد ہے کہ آپ اپنے سر پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے، آپ کے سر سے پانی ٹپک رہا تھا، یعنی آپ غسل کر کے آئے تھے اور آپ نے فرمایا تھا کہ نماز کا مناسب وقت تو یہی ہے، لیکن اس وقت نماز پڑھنے میں بہت مشقت ہوگی۔

"فاستثبت عطاء الخ"۔ ابن جریج کہتے ہیں کہ میں نے عطاء سے مزید تحقیق کی کہ آپ کو ابن عباسؓ نے جس طرح سر پر ہاتھ رکھ کر بتایا تھا اسی طرح آپ مجھے بتائیں کہ پیغمبر علیہ السلام نے کس طرح سر مبارک پر ہاتھ رکھا تھا؟ حضرت عطاء نے انگلیوں کو قدرے کھولا، پھر انگلیوں کو ملا کر ان کے اطراف کو پیشانی کے بالوں کی جگہ رکھا اور انگلیوں کو سر سے گذار کر پانی سوت کر نکالنے کی صورت بتلائی، اس کھینچنے میں نہ بہت عجلت تھی نہ بہت آہستگی، کہتے ہیں کہ انگلیوں سے پانی سوت کر دکھلانے میں انگوٹھا کانوں کے اس کنارے سے مس کر گیا جو کنپٹی پر چہرے کی سمت میں ہے، یعنی ڈاڑھی کے کنارے سے انگوٹھا پانی نکالتے وقت مل گیا، خلاصہ یہ ہے کہ ابن جریج کو عطاء نے عمل کر کے صورت سمجھادی۔

## [۲۵] بَابُ وَقْتِ الْعِشَاءِ إِلٰى نِصْفِ اللَّيْلِ

وَقَالَ اَبُوبَرْزَةَ كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يَسْتَحِبُّ تَاخِيرَهَا.

(۵۷۲) حَدَّثَنَا عَبْدُ الرَّحِيْمِ الْمُحَارِبِيُّ قَالَ حَدَّثَنَا زَائِدَةُ عَنْ حُمَيْدِ الطَّوِيْلِ عَنْ اَنَسٍ قَالَ اَخَّرَ النَّبِيُّ ﷺ صَلٰوةَ الْعِشَاءِ إِلٰى نِصْفِ اللَّيْلِ ثُمَّ صَلّٰى ثُمَّ قَالَ قَدْ صَلَّى النَّاسُ وَنَامُوْا اَمَا اِنَّكُمْ فِيْ صَلٰوةٍ مَا انْتَظَرْتُمُوْهَا وَزَادَابْنُ اَبِيْ مَرْيَمَ اَخْبَرَنَا يَحْيٰى بْنُ اَيُّوْبَ

قَالَ حَدَّثَنِي حُمَيْدٌ أَنَّهُ سَمِعَ أَنَساً قَالَ كَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَى وَبِيْصِ خَاتِمِهِ لَيْلَتَئِذٍ.

(آئندہ: ۶۰۰، ۶۶۱، ۸۴۷، ۵۸۶۹)

**ترجمہ** باب، عشاء کا وقت نصف رات تک ہے۔ اور حضرت ابو برزہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ عشاء کی نماز تاخیر سے پڑھنا پسند کرتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز کو آدھی رات تک موخر فرمادیا، پھر نماز پڑھائی اور فرمایا کہ لوگوں نے نماز پڑھ لی اور سو گئے۔

خبردار! کہ تم لوگ جب تک نماز کا انتظار کررہے ہو اس وقت تک نماز ہی میں ہو، ابن ابی مریم نے اپنی سند کے ساتھ یہ اضافہ اور کیا کہ حضرت انسؓ نے فرمایا کہ گویا میں اب بھی حضور ﷺ کی اس رات میں انگوٹھی کی چمک کو دیکھ رہا ہوں، یعنی مجھے پوری باتیں مستحضر ہیں۔

**مقصد ترجمہ** ترجمہ کے الفاظ ہیں کہ عشاء کا وقت نصف لیل تک ہے، لیکن بخاری وقت مختار بیان کرنا چاہتے ہیں یا وقت جواز؟ اس سلسلے میں شارحین کے خیالات مختلف نظر آتے ہیں، علامہ کرمانیؒ کی رائے یہ ہے کہ امام بخاریؒ کا مقصد وقت جواز کا بیان ہے، یعنی ان کے نزدیک عشاء کی نماز کا وقت اداصرف نصف لیل تک ہے، اس کے بعد نماز قضاء ہوجائے گی، کرمانی کہتے ہیں کہ اسی لیے امام بخاریؒ نے ترجمۃ الباب میں، یا باب کے ذیل میں دی گئی روایتوں میں ایسی کوئی چیز ذکر نہیں کی جس سے عشاء کے وقت کا صبح صادق سے پہلے تک ممتد ہونا معلوم ہو، لیکن کرمانی کے علاوہ عام شارحین کی رائے یہ ہے کہ بخاری عشاء کی نماز کا وقت مختار بیان کرنا چاہتے ہیں، ہمارا خیال بھی یہی ہے کیوں کہ اول تو بخاری نے ترجمۃ الباب میں حضرت ابو برزہؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ حضور ﷺ عشاء کی نماز میں تاخیر کو پسند کرتے تھے اور اس میں تاخیر کا منتہٰی نقل نہیں کیا، پھر حضرت انسؓ کی روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ عشاء کی نماز نصف لیل کے کچھ بعد پڑھی گئی، اس لیے بہ ظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ امام بخاریؒ اس ترجمہ میں عشاء کا وقت مختار بیان کررہے ہیں، ورنہ وقت جواز تو فجر صادق تک ہے۔

گویا عشاء کے وقت کی تفصیل یہ ہے کہ ثلث لیل کا وقت سب سے افضل ہے اور ثلث سے نصف لیل تک بھی استحباب کا درجہ رکھتا ہے، اور نصف لیل سے فجر صادق تک وقت جواز ہے، مگر نصف لیل کے بعد تک تاخیر کو بعض اہل علم نے مکروہ قرار دیا ہے، لیکن یہ کہنا ہوگا کہ یہ کراہت نصف لیل کے فوراً بعد نہیں، بلکہ نصف لیل کے بعد بھی تھوڑا وقت گذرنے پر آتی ہے، کیونکہ روایت میں صاف طور پر بیان کیا گیا ہے کہ: "اخر النبی ﷺ صلوٰة العشاء الی نصف اللیل ثم صلّٰی" یعنی رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز کو نصف لیل تک موخر فرمایا، پھر نماز پڑھی، ثم صلّٰی سے ثابت ہوا کہ عشاء کی نماز نصف لیل کے بعد پڑھی گئی اور پچھلے باب کی روایت میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اگر مشقت کا خیال نہ ہوتا تو عشاء کی نماز کے لیے یہی وقت مقرر کیا جاتا، نیز یہ بھی ماننا ہوگا کہ نصف لیل اور کچھ وقفہ

کے بعد جو کراہت ہے وہ کراہت تنزیہہ ہے، کیونکہ مسلم شریف کی روایت میں صراحت ہے: "انما التفریط علی من لم یُصلِّ الصلوة حتی یجئی وقت الصلوة الاخری" (مسلم ص:۲۳۹/ج:۱) تفریط یعنی کوتاہی کا مرتکب صرف ان لوگوں کو قرار دیا جائے گا جو دوسری نماز کا وقت آنے تک نماز نہ پڑھیں، یہاں دوسری نماز کا وقت فجر صادق ہے، اس لیے فجر صادق سے پہلے تک کوتاہی نہیں۔ واللہ اعلم

**تشریح حدیث** حضرت انسؓ بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے عشاء کی نماز کو نصف لیل تک مؤخر فرمادیا، پھر نماز پڑھی، معلوم ہوا کہ عشاء کی نماز کا اس وقت تک مؤخر کرنا درست ہے، بخاریؒ کا مقصد اسی "ثم صلی" سے متعلق معلوم ہوتا ہے، پھر آپ نے دیر سے نماز کا انتظار کرنے والوں سے ارشاد فرمایا کہ تم یہ نہ سمجھنا کہ دیر ہوگئی اور وقت بے کار ضائع ہوا، بلکہ جب انسان نماز کا انتظار کرتا ہے، تو وہ نماز ہی کے حکم میں ہوتا ہے، یہ مضمون گذر چکا ہے۔

"وزاد ابن ابی مریم الخ"۔ یہاں اس تعلیق کو ذکر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ امام بخاریؒ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حمید الطّویل کا سماع، حضرت انسؓ سے ثابت ہے، اس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت انس نے فرمایا کہ اس رات میں حضور پاک ﷺ کی انگوٹھی کی چمک آج تک میری نظروں میں ہے، گویا حضرت انسؓ حال ماضی کا استحضار بیان کر رہے ہیں، انگوٹھی کے موضوع پر کلام اپنی جگہ آئے گا۔

## [۲۶] بَابُ فَضْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَالْحَدِيْثِ

(۵۷۳) حَدَّثَنَا مُسَدَّدٌ قَالَ حَدَّثَنَا يَحْيٰى عَنْ اِسْمَاعِيْلَ قَالَ حَدَّثَنَا قَيْسٌ قَالَ قَالَ لِيْ جَرِيْرُ بْنُ عَبْدِ اللهِ كُنَّا عِنْدَ النَّبِيِّ ﷺ اِذَا نَظَرَ اِلَى الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ فَقَالَ اَمَا اِنَّكُمْ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ هٰذَا لَا تُضَامُّوْنَ اَوْ لَا تُضَاهُوْنَ فِيْ رُؤْيَتِهٖ فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَا تُغْلَبُوْا عَلٰى صَلٰوةٍ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا فَافْعَلُوْا ثُمَّ قَالَ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا (طٰہٰ:۱۳۰) قَالَ اَبُوْ عَبْدِ اللهِ زَادَا ابْنُ شِهَابٍ عَنْ اِسْمَاعِيْلَ عَنْ جَرِيْرٍ قَالَ النَّبِيُّ ﷺ سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ عِيَانًا. (گذشتہ:۵۵۴)

(۵۷۴) حَدَّثَنَا هُدْبَةُ بْنُ خَالِدٍ قَالَ حَدَّثَنَا هَمَّامٌ قَالَ حَدَّثَنِيْ اَبُوْ جَمْرَةَ عَنْ اَبِيْ بَكْرِ بْنِ اَبِيْ مُوْسٰى عَنْ اَبِيْهِ اَنَّ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ قَالَ مَنْ صَلَّى الْبَرْدَيْنِ دَخَلَ الْجَنَّةَ وَقَالَ ابْنُ رَجَاءٍ حَدَّثَنَا هَمَّامٌ عَنْ اَبِيْ جَمْرَةَ اَنَّ اَبَا بَكْرِ بْنَ عَبْدِ اللهِ بْنِ قَيْسٍ اَخْبَرَهٗ بِهٰذَا حَدَّثَنَا اِسْحَاقُ قَالَ حَدَّثَنَا حَبَّانُ قَالَ حَدَّثَنَا هَمَّامٌ قَالَ حَدَّثَنَا اَبُوْ جَمْرَةَ عَنْ اَبِيْ بَكْرِ بْنِ عَبْدِ اللهِ

عَنْ اَبِیْہِ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ مِثْلَہٗ .

ترجمہ: باب، نماز فجر کی فضیلت کا بیان اور اس سلسلے میں وارد حدیث کی فضیلت، یا نماز فجر کی فضیلت اور عشاء کے بعد کی گفتگو کا بیان۔ حضرت جریر بن عبداللہ سے روایت ہے کہ ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے پاس تھے کہ آپ ﷺ نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا، پھر فرمایا کہ تم اپنے پروردگار کو (قیامت میں) اس طرح دیکھو گے جس طرح اس چاند کو دیکھ رہے ہو، تمہیں کوئی دشواری نہ ہوگی، یا یہ فرمایا کہ تمہیں کوئی اشتباہ نہ ہوگا، تو اگر یہ کرسکو کہ طلوع آفتاب سے پہلے کی نماز اور غروب سے پہلے کی نماز میں کسی مشغولیت سے مغلوب نہ ہو جاؤ تو ایسا کرنا، پھر یہ آیت پڑھی "فسبح الآیۃ" پس طلوع اور غروب آفتاب سے پہلے اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح بیان کرو۔ امام بخاریؒ کہتے ہیں کہ ابن شہاب نے اسماعیل عن قیس کے واسطے سے حضرت جریرؓ سے یہ نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم لوگ اپنے پروردگار کو کھلی آنکھوں سے دیکھو گے۔ حضرت ابوموسیٰ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو دو ٹھنڈے وقتوں کی نمازیں (نماز فجر اور عصر) پڑھے گا وہ جنت میں جائے گا۔ عبداللہ بن رجاء نے بیان کیا کہ ہم سے ہمام نے بواسطہ ابو جمرہ بیان کیا کہ ابوبکر بن عبداللہ بن قیس نے یہ حدیث ان سے بیان کی ہے۔ اسحاق بن منصور نے بیان کیا کہ ہم سے حبان بن ہلال نے کہا کہ ہم سے ہمام بن یحییٰ نے بیان کیا کہ ہم سے ابو جمرہ نصر بن عمران نے اور ان سے ابوبکر بن عبداللہ بن قیس نے اور انہوں نے اپنے باپ ابوموسیٰ اشعری سے روایت کی کہ حضور ﷺ نے یہ بات ارشاد فرمائی۔

مقصد ترجمہ: مقصد الفاظ سے ظاہر ہے کہ "**فضل صلوۃ الفجر**" یعنی نماز فجر کی فضیلت کا بیان، مگر اس کے ساتھ ایک لفظ اور ہے "**والحدیث**" یہ لفظ صرف ابوذر کے نسخے میں ہے، عام نسخوں میں نہیں ہے، بظاہر اس کا ربط بھی نہیں ہے، شارحین اس کی توجیہ میں پریشان ہیں، علامہ کرمانی نے فرمایا کہ لفظ 'والحدیث' کی ترجمۃ الباب سے بہ ظاہر کوئی مناسبت نہیں ہے، لیکن کہا جاسکتا ہے کہ امام بخاری نماز فجر کی فضیلت کے ساتھ، اس سلسلے کی حدیث کی فضیلت بھی بیان کرنا چاہتے ہیں ہمارے اکابر میں حضرت گنگوہیؒ کا ارشاد بھی اس کے قریب ہے، انہوں نے فرمایا کہ اس سلسلے میں جو حدیث وارد ہوئی ہے، وہ بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ یعنی چونکہ اس سلسلے کی حدیث میں قیامت کے دن رویت باری کی بشارت مذکور ہے اور مومن کے لیے یہ سب سے بڑی نعمت ہے، اس لیے امام بخاری نے "والحدیث" بڑھا کر اس کی طرف اشارہ کر دینا مناسب سمجھا، ہمارے خیال میں کرمانی کی توجیہ قابل قبول ہے کیوں کہ کسی درجہ میں بات تو بنی، لیکن حافظ ابن حجرؒ کرمانی کی اس توجیہ سے متفق نہیں، بات کو مدلل تو کرتے نہیں مگر کہتے ہیں کہ یہ بات بہت بعید ہے یعنی بعید از فہم، پھر حقیقت کیا ہے؟ فرماتے ہیں کہ چونکہ یہ الفاظ بخاری کے عام نسخوں میں نہیں ہیں اور نہ شارحین نے اس کو لیا ہے، اس لیے اس کا وہم ہونا ظاہر ہے، پھر حافظ نے احتمال کے درجہ میں یہ بات کہی کہ یہاں تحریف ہوگئی۔ اصل عبارت میں "**باب فضل الفجر والعصر**" تھا، لفظ "**والعصر**" میں تحریف ہوگئی اور کاتبوں کی غلطی سے والحدیث

بن گیا۔ حافظ کی اس بات پر علامہ عینی بہت برہم ہیں، کہتے ہیں وہم قرار دینے سے کہیں زیادہ آسان اور بہتر ہے کہ کرمانی کی توجیہ کو قبول کر لیا جائے اور جہاں تک کاتبوں کی غلطی سے " العصر" سے محرف ہو کر " الحدیث " بن جانے کی بات ہے تو وہ بہت ہی بعید ہے، ہمارے خیال میں بھی علامہ عینیؒ کا تبصرہ معقول ہے، کیونکہ محرف اور اصل میں کچھ تو مناسبت ہونی چاہئے، حافظ ابن حجرؒ نے شرح نخبہ میں ''ناموں'' میں سے کچھ ایک دوسرے سے رسم الخط میں یکسانیت رکھنے والے الفاظ دیے ہیں، جیسے: معرف اور مطرف، جبیر اور حنین وغیرہ، کاتب کی غلطی سے اس طرح کے نام میں تحریف ممکن ہے، لیکن " العصر" کا " الحدیث " کیسے ہو جائے گا؟ سمجھ میں نہیں آتا۔

**علامہ کشمیریؒ کا ارشاد** حضرت علامہ کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ والحدیث معنی لغوی پر محمول ہے اور اس سے عشاء کے بعد کی گفتگو مراد ہے، یعنی باب کا اصل مقصد تو فجر کی فضیلت ہی کا بیان ہے، لیکن امام بخاری اس کے ساتھ ہی عشاء کے بعد گفتگو کرنے کا جواز بھی بیان کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ پچھلے ابواب میں عشاء سے پہلے سونے اور عشاء کے بعد گفتگو کرنے سے ممانعت مذکور ہو چکی ہے اور روایت باب سے عشاء کے بعد گفتگو کا جواز نکلتا ہے، اس لیے بخاریؒ نے چاہا کہ اگرچہ یہ بات ترجمۃ الباب سے غیر متعلق ہے، مگر بخاری کی عادت ہے کہ اگر حدیث ترجمۃ الباب کے علاوہ کسی مزید فائدے پر مشتمل ہو تو وہ اس کے لیے مستقل باب کا انعقاد ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ درمیان ہی میں توجہ دلا دیتے ہیں، اس طرح کی بات "باب الاغتسال وربط الاسیر فی المسجد" میں گذر چکی ہے، اس طرح کے ابواب کے لیے حضرت علامہ کشمیری نے ایک اصطلاح مقرر فرمائی ہے ''انجاز'' یعنی مزید فائدہ کا قبل از وقت بیان۔

رہا یہ کہ حدیث باب میں عشاء کے بعد کی گفتگو کا ذکر کہاں ہے؟ تو یہ اگرچہ صراحت سے ثابت نہیں، مگر چونکہ روایت میں یہ بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چودھویں رات کے چاند کو دیکھ کر فرمایا، بس بخاری نے یہیں سے عشاء کے بعد کی گفتگو کا مضمون ثابت کر دیا۔ حضرت علامہ کشمیریؒ کی توجیہ، دیگر تمام توجیہات سے بہتر ہے۔　　واللہ اعلم

**تشریح احادیث** اس باب کے ذیل میں امام بخاریؒ نے دو روایتیں ذکر کی ہیں، پہلی روایت حضرت جریرؓ سے ہے جو چند ابواب پہلے گذر چکی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے چودھویں رات کے چاند کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ تم آخرت میں اپنے پروردگار کو اس طرح دیکھو گے جیسے اس وقت چاند کو دیکھ رہے ہو، اس کے بعد آپ نے "لاتضامون یالاتضاھون فی رؤیتہ" فرمایا، پچھلی روایت میں الفاظ کا یہ اختلاف مذکور نہیں تھا" لاتضامون " بہ تشدید المیم ہو تو اس کا مادہ ضمٌّ ہے یعنی تم ایک دوسرے پر بھیڑ اور ازدحام نہ کرو گے اور اگر " تضامون" بتخفیف المیم ہو تو اس کا مادہ ضیم ہے، جس کے معنی ظلم ہیں یعنی تم ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو گے، اور اگر " لا تضاھون " ہو تو یہ مضاھاۃ سے ہے جس کے معنی مشابہ ہونے کے ہیں، مطلب یہ ہے کہ ہر شخص بغیر ازدحام، بغیر پریشانی اور بغیر اشتباہ کے اپنی جگہ رہتے ہوئے پروردگار کی زیارت کر سکے گا، پھر آپ نے فرمایا کہ اس شرف کو حاصل کرنے کے لیے اگر ہو سکے تو طلوع وغروب سے

پہلے نمازوں کی پابندی کرو، بس اسی سے فجر کی فضیلت معلوم ہوگئی کہ یہ نماز اتنی اہم ہے جس کی پابندی رویت باری جیسی عظیم نعمت کے حصول میں موثر ہے، بقیہ تشریحات گذر چکی ہیں۔

دوسری روایت حضرت ابوموسی اشعری سے ہے "من صلی البردین دخل الجنة" کہ جو ٹھنڈے وقت کی دو نمازوں کی پابندی کرے گا وہ جنت میں جائے گا، ٹھنڈے وقت کی دو نمازوں سے مراد فجر اور عصر کی نمازیں ہیں، کیونکہ یہ نمازیں دن کے دونوں طرف واقع ہیں، جن اوقات میں ہوا بہت خوشگوار ہوتی ہے، نیز گرمی نہیں ہوتی، البتہ ان دونوں وقتوں میں سے ایک وقت طلب راحت کا ہے، اور دوسرا کثرت مشاغل کا، اس لیے ان دونوں اوقات کی نماز کی پابندی پر جنت کی بشارت دی گئی ہے کہ جو ان اوقات میں بھی پابندی کرے گا وہ دوسرے اوقات میں اور زیادہ آسانی سے اپنے فرائض ادا کرے گا۔

ابوداؤد اور مسند احمد میں حضرت فضالہ لیثیؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کیا تو آپ نے مجھے تعلیم دی، من جملہ تعلیمات پانچوں نمازوں کا وقت پر پڑھنا بھی تھا، میں نے عرض کیا کہ ان اوقات میں تو مجھے بڑی مشغولیت رہتی ہے، اس لیے آپ مجھے ایسی جامع باتیں بتلائیں جن پر عمل پیرا ہونا کافی ہوجائے "فمرنی بامر جامع اذا انا فعلته اجزأ عني" اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر مشغولیت ہے تو "حافظ علی العصرین" عصرین کی پابندی کرنا، چونکہ لفظ عصرین ہماری زبان میں مستعمل نہیں تھا تو میں نے پوچھا عصرین کا کیا مفہوم ہے؟ آپ نے فرمایا "صلوٰة الغداة وصلوة العصر" یعنی فجر اور عصر کی نمازیں (ابوداؤد، باب المحافظة علی الصلوات ص:۶۲/ ج:۱/ ومسند احمد ص:۳۴۴/ ج:۴)

اس کا یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ فجر اور عصر کے علاوہ بقیہ نمازوں کی ضرورت نہیں، بلکہ ایک مطلب تو یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نمازوں کے علاوہ جو دیگر چیزوں کی تعلیم دی تھی، حضرت فضالہؓ نے ان کو عمل میں لانے سے مشغولیت کی بنیاد پر عذر کیا تو آپ نے فرمایا کہ ان دو اوقات میں ان اذکار کی پابندی کرلیا کریں اور بقیہ اوقات میں ضرورت نہیں، یا پھر یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ آپ ﷺ ان کو ایسے انداز سے پابند بنانا چاہتے ہیں کہ دفعۃً بار بھی نہ ہو اور کام بھی ہوجائے اور چونکہ فجر کا وقت راحت و آرام کا ہے، بلکہ غفلت کا ہے اور عصر کا وقت کثرت اشغال کا، اس لیے آپ نے ان دونوں اوقات کی اہمیت بیان فرمادی کہ جب کوئی انسان ان دو وقتوں میں اہتمام کرلے گا تو بقیہ اوقات میں اور زیادہ آسان ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ "بردین" جنھیں حضرت فضالہ کی روایت میں عصرین کہا گیا ہے، ان کی پابندی کو جنت کے دخول میں اس طرح دخل ہے کہ ان اوقات کی پابندی دیگر اوقات کی پابندی کو مستلزم ہے، اس لیے ان کی اہمیت بیان کردی گئی۔ بخاری کا مدعا یعنی نماز فجر کی فضیلت ثابت ہوگئی، امام بخاری نے اس باب میں جو تعلیقات ذکر کی ہیں ان کو مطولات میں دیکھنا چاہیے۔　　　واللہ اعلم

## [۲۷] بَابُ وَقْتِ الْفَجْرِ

(۵۷۵) حَدَّثَنَا عَمْرُو بْنُ عَاصِمٍ قَالَ حَدَّثَنَا هَمَّامٌ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسٍ اَنَّ زَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ حَدَّثَهُ اَنَّهُمْ تَسَحَّرُوْا مَعَ النَّبِيِّ ﷺ ثُمَّ قَامُوْا اِلَى الصَّلٰوةِ قُلْتُ كَمْ بَيْنَهُمَا ؟ قَالَ قَدْرُ خَمْسِيْنَ اَوْ سِتِّيْنَ يَعْنِيْ اٰيَةً. (آئندہ:۱۹۲۱)

(۵۷۶) حَدَّثَنَا الْحَسَنُ بْنُ الصَّبَّاحِ سَمِعَ رَوْحَ بْنَ عُبَادَةَ قَالَ حَدَّثَنَا سَعِيْدٌ عَنْ قَتَادَةَ عَنْ اَنَسِ بْنِ مَالِكٍ اَنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ ﷺ وَزَيْدَ بْنَ ثَابِتٍ تَسَحَّرَا فَلَمَّا فَرَغَا مِنْ سُحُوْرِهِمَا قَامَ نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ اِلَى الصَّلٰوةِ فَصَلّٰى قُلْنَا لِاَنَسٍ كَمْ كَانَ بَيْنَ فَرَاغِهِمَا مِنْ سُحُوْرِهِمَا وَدُخُوْلِهِمَا فِي الصَّلٰوةِ ؟ قَالَ قَدْرَ مَا يَقْرَءُ الرَّجُلُ خَمْسِيْنَ اٰيَةً. (آئندہ:۱۱۳۴)

(۵۷۷) حَدَّثَنَا اِسْمَاعِيْلُ بْنُ اَبِيْ اُوَيْسٍ عَنْ اَخِيْهِ عَنْ سُلَيْمَانَ عَنْ اَبِيْ حَازِمٍ اَنَّهُ سَمِعَ سَهْلَ بْنَ سَعْدٍ يَقُوْلُ كُنْتُ اَتَسَحَّرُ فِيْ اَهْلِيْ ثُمَّ تَكُوْنُ سُرْعَةٌ بِيْ اَنْ اُدْرِكَ صَلٰوةَ الْفَجْرِ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ. (آئندہ:۱۹۲۰)

(۵۷۸) حَدَّثَنَا يَحْيٰى بْنُ بُكَيْرٍ قَالَ حَدَّثَنَا اللَّيْثُ عَنْ عُقَيْلٍ عَنِ ابْنِ شِهَابٍ قَالَ أَخْبَرَنِيْ عُرْوَةُ بْنُ الزُّبَيْرِ اَنَّ عَائِشَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهَا اَخْبَرَتْهُ قَالَتْ كُنَّ نِسَاءُ الْمُؤْمِنَاتِ يَشْهَدْنَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ صَلٰوةَ الْفَجْرِ مُتَلَفِّعَاتٍ بِمُرُوْطِهِنَّ ثُمَّ يَنْقَلِبْنَ اِلٰى بُيُوْتِهِنَّ حِيْنَ يَقْضِيْنَ الصَّلٰوةَ لَا يَعْرِفُهُنَّ اَحَدٌ مِنَ الْغَلَسِ. (گذشتہ:۳۷۲)

**ترجمہ** فجر کے وقت کا بیان ۔حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ حضرت زید بن ثابتؓ نے ان سے بیان کیا کہ انہوں نے اور صحابہؓ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سحری کھائی، پھر وہ سب فجر کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، میں نے پوچھا کہ سحری اور نماز کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟ تو انہوں نے فرمایا کہ پچاس یا ساٹھ آیتیں پڑھنے کے بقدر۔ حضرت انس بن مالک سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور زید بن ثابت نے سحری کھائی، جب سحری سے فارغ ہو گئے تو رسول اللہ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہو گئے اور نماز پڑھائی، ہم نے حضرت انسؓ سے کہا کہ سحری سے فارغ ہو کر نماز شروع کرنے تک کتنا فاصلہ تھا؟ تو فرمایا کہ جتنے وقت میں ایک انسان پچاس آیتیں پڑھ سکے۔ حضرت سہل بن سعد کہتے ہیں کہ میں اپنے اہل میں سحری کھاتا تھا، پھر مجھے جلدی ہوتی تھی کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ فجر کی نماز پڑھ لوں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ مشرف با یمان عورتیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ فجر کی نماز میں چادریں اوڑھے یا لپیٹے ہوئے حاضر ہوتی تھیں، پھر وہ اپنے گھروں کو نماز سے فراغت کے بعد ایسے وقت میں واپس ہو جاتیں کہ انہیں کوئی آخری

شب کی تاریکی میں پہچان نہ سکتا تھا۔

**مقصد ترجمہ** مقصد ہے یہ بیان کرنا کہ فجر کا وقت کب سے شروع ہوتا ہے؟ فرماتے ہیں کہ فجر کا وقت سحری کے بعد ہے، جب تک سحر کا وقت ہے اس وقت تک فجر نہیں، سحر کا وقت ختم ہو جائے تو فجر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ لہٰذا طلوع فجر کو وقت فجر کا مبدا سمجھنا چاہئے۔

**تشریح روایت اول و دوم** اس باب کے تحت امام بخاری نے چار روایات ذکر کی ہیں: پہلی اور دوسری روایت کا مضمون تقریباً ایک ہی ہے، البتہ سند میں فرق ہے، نیز یہ کہ پہلی روایت کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انسؓ سحری میں شریک نہیں تھے اور دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت انس بھی سحری میں شریک ہیں، پہلی روایت کے مطابق حضرت انس کے شریک سحری نہ ہونے کی وضاحت حافظ ابن حجر نے ابن حبان کی روایت سے کی ہے، جس میں یہ مذکور ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت انسؓ سے فرمایا کہ میں روزہ رکھنا چاہتا ہوں، کچھ کھانے کا نظم کرو، چنانچہ میں کھجور اور پانی لے کر حاضر ہوا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا، انس! کوئی آدمی تلاش کرو جو میرے ساتھ کھانے میں شریک ہو جائے، تو میں حضرت زید بن ثابت کو بلا کر لایا، چنانچہ وہ آئے اور سحری میں شریک ہو گئے، پھر آپ نے دو رکعت نماز پڑھی، پھر فجر کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے، ان دونوں روایتوں میں یہ آیا ہے کہ جب یہ پوچھا گیا کہ نماز اور سحری کے درمیان کتنا وقفہ تھا؟ تو جواب دیا کہ پچاس یا ساٹھ آیتوں کی تلاوت کے بقدر، معلوم ہوا کہ سحری اور نماز میں بہت کم فاصلہ تھا اور سحری کے فوراً بعد نماز فجر کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔

**تشریح روایت سوم** تیسری روایت حضرت سہل بن سعدؓ کی ہے کہ میں اپنے گھر سحری کھا کر بعجلت ممکنہ مسجد نبوی میں پہنچنے کی کوشش کرتا، تاکہ فجر حضور پاک ﷺ کے ساتھ پڑھ سکوں، معلوم ہوا کہ نماز فجر رمضان میں سحری سے متصل ہوتی تھی، یعنی سحری سے فارغ ہونے کے بعد جہاں فجر کا وقت شروع ہوا، نماز پڑھ لی۔ دارالعلوم دیوبند میں بھی اکابر کے زمانہ سے رمضان شریف میں اسی کا اہتمام ہے، کیونکہ اول تو رمضان کی راتیں سونے کی نہیں ہوتیں، دوسرے یہ کہ اگر کچھ دیر کے لیے انسان سو بھی جائے تو اسے سحری کے لیے بیدار ہونا ہی ہے، سحری کھانے کے بعد لیٹ جائے گا، تو نماز کے لیے اٹھنا دشوار ہوگا، اس لیے رمضان شریف میں تو یہی مناسب ہے کہ سحری کے فوراً بعد فجر کی نماز پڑھ لی جائے، نیز یہ کہ احناف کے یہاں اسفار کی وجہ تکثیر جماعت ہے اور رمضان المبارک میں سحری کے فوراً بعد نمازیوں کی کثرت متوقع ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

**تشریح روایت چہارم** چوتھی روایت حضرت عائشہؓ سے ہے کہ مسلمان عورتیں فجر کی نماز رسول پاک ﷺ کے ساتھ پڑھنے کے بعد چادروں میں لپٹی ہوئی واپس ہوتیں، تو انہیں کوئی تاریکی میں پہچان نہ سکتا تھا، یہاں چند باتیں غور طلب ہیں، حضرت عائشہؓ کا مقصد کیا ہے؟ امام بخاری کا طرز کیا بتاتا ہے؟ اور نماز فجر کے

لیے غلس اور اسفار میں کس کو ترجیح ہے وغیرہ؟

حضرت عائشہ کا مقصد اس روایت میں نماز فجر کا وقت بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ عورتوں کے پردہ کے ساتھ حاضر مسجد ہونے کی مدح مقصود ہے، یعنی ان کا مقصود اسفار اور غلس کا بیان نہیں، وہ تو یہ بیان کرنا چاہتی ہیں کہ عہد رسالت میں عورتیں پردے کا پورا اہتمام کر کے مسجد نبوی میں آتی تھیں، گویا وہ اس روایت میں باب ستر میں عورتوں کی مدح کر رہی ہیں مسئلۂ وقت بیان نہیں کر رہی ہیں۔

اسی طرح امام بخاری کا طرز عمل بھی قابل غور ہے کہ انہوں نے اس باب میں چار روایتیں ذکر کی ہیں، جن میں پہلی تین روایتیں رمضان کی نماز فجر سے متعلق ہیں، اس کے بعد یہ چوتھی روایت حضرت عائشہؓ سے ذکر کی ہے، اس لیے ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ اس چوتھی روایت کو بھی رمضان سے متعلق ماننے کا اشارہ کر رہے ہیں، امام مالکؒ سے بھی اول وقت میں نماز پڑھنے کے حکم کو رمضان سے خاص کرنا منقول ہے۔

## غلس پر استدلال کی حقیقت

یہ روایت نماز فجر کے غلس میں پڑھنے والوں کا مستدل ہے، کیونکہ اس روایت میں راوی نے بتلایا" لَا یَعْرِفُهُنَّ اَحَدٌ مِنَ الْغَلَسِ" ان الفاظ کا بظاہر ترجمہ یہ ہے کہ ان عورتوں کو کوئی انسان غلس کے سبب پہچان نہ سکتا تھا، لیکن سوال یہ ہے کہ غلس اور تاریکی کے سبب نہ پہچاننے کا مضمون حضرت عائشہ کا ہے یا کسی اور راوی کا؟

مسند احمد ص:۲۵۸/ ج:۶/ میں اسی روایت میں ہے "ما یُعرفن من الغلس او قال لایعرف بعضُهن بعضاً" یعنی راوی نے یا یہ کہا کہ عورتوں کو تاریکی کے سبب پہچانا نہ جاتا تھا یا یہ کہا کہ ایک عورت بھی دوسری عورت کو نہ پہچانتی تھی، گویا دوسری تعبیر میں غلس کا تذکرہ ہی نہیں اور نہ پہچاننے کی بنیاد غلس نہیں، بلکہ پردہ کا اہتمام ہے اور اس سے زیادہ صاف بات یہ ہے کہ ابن ماجہ میں "باب وقت صلوة الفجر" (ص۲۲۰/ ج۱) میں "ثم یرجعن الی اهلهن فلا یعرفهن احد ، تعنی من الغلس" نقل کیا گیا ہے، اس روایت کے مطابق حضرت عائشہؓ کے الفاظ تو صرف اتنے ہیں کہ عورتیں گھر واپس ہوتیں تو انہیں کوئی نہ پہچانتا تھا، البتہ نیچے کا کوئی راوی اپنے طور پر نہ پہچاننے کا سبب غلس کو بیان کرتا ہے، راویوں کی جانب سے اس طرح کے اضافہ کو "ادراج" کہتے ہیں، علامہ سندھیؒ نے اس روایت پر لکھا ہے "تعنی من الغلس صریح انه لیس من قولها وانما هو تفسیر من احد الرواة ولا حجة فیه" (حاشیہ سندھی ص ۲۳۰/ ج۱) یعنی "تعنی من الغلس" صراحت کے ساتھ بتلا رہا ہے کہ یہ حضرت عائشہ کا قول نہیں ہے، بلکہ یہ تو کسی اور راوی کی جانب سے وضاحت ہے، اس لیے اس سے غلس پر استدلال نہیں کیا جا سکتا۔

پھر اگر "من الغلس" کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عورتیں تاریکی میں اور غلس کی وجہ سے پہچان میں نہ آتی تھیں تو دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غلس سے وقت کا غلس مراد ہے یا مسجد کے اندرونی حصہ کا غلس مراد ہے، چونکہ حضرت

عائشہؓ کا مقصد وقت فجر کا بیان نہیں اس لیے وقت کا غلس مراد لینا ضروری نہیں، بلکہ مسجد کے اندورونی حصہ کا غلس بھی مراد ہوسکتا ہے، جو اسفار وقت کے منافی نہیں، چونکہ مسجد کی چھت نیچی ہے، روشنی کا کوئی انتظام نہیں ہے، اس لیے مراد یہ ہے کہ اول تو عورتیں چادروں میں لپٹی ہوئی ہوتی تھیں، دوسرے یہ کہ مسجد کے اندر روشنی دیر سے پہنچتی تھی، اس لیے ان کو پہچاننا ممکن نہ ہوتا تھا۔

## نہ پہچانے کا مطلب

روایت میں آیا کہ عورتوں کو کوئی پہچان نہ پاتا تھا، حافظؒ نے کچھ شارحین کے نام نقل کر کے اس کے متعدد معانی بیان کئے ہیں، داؤدی کہتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اتنی پہچان بھی نہ ہوتی تھی کہ عورت ہے یا مرد؟ صرف پرچھائیں معلوم ہوتی تھی، لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کی تشریح کو اپنے مسلک کے لیے سخن پروری سے زیادہ حیثیت نہیں دی جاسکتی۔

عورت اور مرد کی پہچان کے لیے تو چادروں میں لپٹا ہوا ہونا بھی کافی ہے، اس کا مطلب یقینی طور پر یہ ہے کہ عورت ہونا تو معلوم ہوتا تھا، البتہ یہ تعین نہ ہوتا تھا کہ ہندہ ہے یا زینب؟ پھر دوسرے شارح باجی، یہ تو داؤدی سے بھی آگے نکل گئے، کہتے ہیں کہ عورتیں منھ کھولے ہوئے ہوتی تھیں، دلیل یہ ہے کہ منھ چادوروں میں ہوں، تو پردے کے لیے اندھیرے کی قید کی ضرورت نہیں، مگر اس تشریح پر حافظؒ بھی مطمئن نہیں، کہتے ہیں کہ ہر عورت کا ایک انداز، چال ڈھال اور ہیئت ہوتی ہے جس سے پردے کے باوجود اس کو پہچانا جاسکتا ہے۔

## اصل مسئلہ کی وضاحت

یہ بحث تو روایت باب پر تھی، اب اصل مسئلہ کا بھی جائزہ لے لیں، بحث یہ ہے کہ نماز فجر کا غلس میں پڑھنا افضل ہے یا اسفار میں؟ حنفیہ اور مالکیہ اسفار کے قائل ہیں، شوافع اور حنابلہ غلس کے، امام محمدؒ کی طرف یہ بات منسوب ہے کہ نماز غلس میں شروع کر کے اسفار میں ختم کرے، امام طحاویؒ نے اسی کو اختیار کیا ہے، روایت زیر بحث قائلین غلس کا مستدل ہے، لیکن مندرجہ بالا گفتگو سے واضح ہوگیا کہ اس سے غلس پر استدلال تام نہیں ہے، تاہم روایات سے نماز فجر کا غلس میں پڑھنا بھی معلوم ہوتا ہے اور اسفار میں بھی، روایات دونوں طرف ہیں، مگر حنفیہ نے عام دنوں میں اسفار کو ترجیح دی ہے، کیوں کہ ترمذی، نسائی اور دوسری کتابوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے: "اسفروا بالفجر فانه اعظم للاجر" فجر کو روشنی پھیلنے کے بعد پڑھو، اس لیے کہ اس سے ثواب میں اضافہ ہوگا، یہ روایت اسفار کے لیے بالکل نص صریح ہے، لیکن قائلین غلس نے یہ تاویل کی ہے کہ اسفار سے مراد فجر کا تیقن ہے، یعنی اس کا یقین کر لینا کہ فجر طلوع ہوگئی، مگر اسفار کے لغوی یا ظاہری معنی اس تاویل کا ساتھ نہیں دیتے، نیز یہ کہ اس روایت میں مثلاً نسائی میں یہ الفاظ ہیں: "ما اسفرتم بالصبح فانه اعظم للاجر" (نسائی ص ۹۴/ج ۱) جتنا بھی صبح کو روشن ہونے دو گے اتنا ہی ثواب میں اضافہ ہوگا، اس روایت میں یہ مضمون ہے کہ درجہ بدرجہ اسفار کے اضافہ پر، درجات ثواب کا ترتب ہے۔ اور سند کے لحاظ سے بھی روایت صحیح ہے، اس روایت کا مضمون قائلین

غلس کی تاویل کے بالکل منافی ہے، کیونکہ طلوع فجر کے تیقن میں یہ درجہ بندی نہیں کی جاسکتی، جب کہ اسی روایت کے بعض طرق میں: ''کلما اصبحتم بالصبح فانه اعظم لاجورکم'' وغیرہ الفاظ آئے ہیں۔

**حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد** حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ نماز فجر میں اسفار پر ترتب ثواب کا جو مضمون بیان کیا گیا ہے، وہ اگر چہ ایک عارض ہے، مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اصل حکم پر کبھی عارض کو ترجیح دی جاتی ہے، نمازوں کے لیے اصل حکم یہ ہے کہ جب نماز کا وقت آجائے اور حکم خداوندی متوجہ ہو جائے تو تقاضائے عبدیت یہ ہے کہ فوراً تعمیل کی جائے، یہ اصلی فضیلت ہے، لیکن گرمیوں کی دوپہر میں عارض قوی کی بنیاد پر ابراد کو ترجیح دی گئی، یا عشاء میں ابھی چند ابواب پہلے گذرا کہ حضور پاک ﷺ کے نزدیک پسندیدہ وقت میں تاخیر تھی، لیکن امت کی مشقت کے عارض قوی کے سبب زیادہ تاخیر کا حکم نہیں دیا گیا، اسی طرح فجر میں بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ تکثیر جماعت کی مصلحت یعنی عارض قوی کے سبب اسفار کو ترجیح دی گئی۔

قائلین اسفار کے مستدلات میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی وہ روایت بھی ہے جو بخاری و مسلم میں ہے، جس میں انہوں نے بیان فرمایا کہ نبی کریم ﷺ نے فجر کی نماز مزدلفہ میں وقت مقررہ سے پہلے ادا فرمائی، الفاظ ہیں: ''صلی الفجر قبل میقاتھا'' ابن حجرؒ بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ قبل از وقت کے یہ معنی تو نہیں ہوسکتے کہ نماز فجر سے پہلے پڑھ لی گئی، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ مزدلفہ میں طلوع فجر کے ساتھ ہی نماز فجر پڑھ لی گئی، جب کہ بقیہ ایام میں تاخیر یسیر کی جاتی تھی، مگر ہماری سمجھ میں تو یہ آتا ہے کہ معمولی تقدیم وتاخیر پر '' قبل میقاتھا'' کا اطلاق نہیں کیا جائے گا، اس اطلاق کا تقاضہ تو یہ ہے کہ نمایاں طور پر وقت میں تقدیم کی گئی، اس لیے اس کا واضح مفہوم یہ ہے کہ مزدلفہ میں تو نماز غلس میں پڑھی گئی، جب کہ عام دنوں میں یہ صورت نہ تھی، بلکہ اسفار پر عمل کیا جاتا تھا۔

اور اگر بالفرض مسجد نبوی میں قدرے غلس مان بھی لیں تو یہ بات کئی جگہ ذکر میں آچکی ہے کہ مسجد نبوی کی حیثیت امام المساجد کی تھی، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انتظار کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نماز سے فارغ ہو جائیں، اور مسجد نبوی میں جماعت ہو جائے گی تو وہ اپنی نماز ادا کریں، پھر عورتوں کی شرکت کے سبب بھی مسجد نبوی میں غلس کی مصلحت ہے اور بھی مصلحتیں ہوسکتی ہیں، مگر جب ان تمام چیزوں کے باوجود عام طور پر مسلمانوں کو یہ حکم دیا جارہا ہے: ''اسفروا بالفجر'' تو اسی کو ترجیح دی جانی چاہئے اور اسی لیے محدثین وفقہاء کے یہاں یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ قول وعمل میں تعارض ہو تو ترجیح حدیث قولی کو دی جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیم نخعیؒ سے مرسلاً روایت ہے: ''ما اجتمع اصحاب محمد ﷺ علی شئی ما اجتمعو اعلی التنویر'' (طحاوی ص:۱۲۹/ج:۱) صحابہ کرامؓ کا کسی چیز پر اتنا اتفاق رائے نہیں ہے، جتنا اتفاق نماز فجر کے روشنی میں پڑھنے پر ہے۔

امام طحاویؒ نے اس کونقل کرنے کے بعد ارشاد فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ سے ثابت کسی حکم کے برخلاف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا اتفاق رائے اسی وقت ممکن ہے، جب ان کے نزدیک پہلے حکم کا منسوخ ہونا محقق ہو اور اس کی جگہ خود پیغمبر علیہ الصلوۃ والسلام سے دوسرا حکم ثابت ہو۔ واللہ اعلم

## [۲۸] بَابُ مَن اَدرَكَ مِنَ الْفَجرِ رَكْعَةً

(۵۷۹) حَدَّثَنَا عَبدُاللّٰهِ بنُ مَسلَمَةَ، عَن مَالِكٍ، عَن زَيدِ بْنِ اَسلَمَ، عَنْ عَطا بنِ يَسَارٍ، وَعَن بُسرِ بنِ سَعِيدٍ وَعَنِ الاَعرَجِ يُحَدِّثُونَهُ، عَن اَبِي هُرَيرَةَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: مَن اَدْرَكَ مِنَ الصُّبحِ رَكعَةً قَبلَ اَن تَطلُعَ الشَّمسُ فَقَد اَدرَكَ الصُّبحَ، وَ مَن اَدرَكَ رَكعَةً مِنَ العَصرِ قَبلَ اَن تَغرُبَ الشَّمسُ فَقَد اَدرَكَ العَصرَ۔ (گذشتہ:۵۵۶)

**ترجمہ** باب اس شخص کا حکم جس نے (طلوع آفتاب سے پہلے) فجر کی ایک رکعت کو پالیا عطا بن یسار، بسر بن سعید اوراعرج یہ تینوں حضرات، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا کہ جس نے طلوعِ آفتاب سے پہلے نمازِ صبح کی ایک رکعت کو پالیا اس نے نمازِ صبح کو پالیا اور جس نے غروبِ آفتاب سے پہلے عصر کی ایک رکعت کو پالیا اس نے نمازِ عصر کو پالیا۔

**مقصدِ ترجمہ** پچھلے باب میں بیان کیا تھا کہ نماز فجر کے وقت کی ابتداء طلوع فجر صادق سے ہوتی ہے، اس باب میں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ فجر کے وقت کی انتہا طلوعِ آفتاب پر ہوتی ہے، یعنی یہ وقت طلوعِ فجر صادق سے، طلوعِ آفتاب تک ممتد ہے، اس باب کے تحت بخاری نے جو روایت ذکر کی ہے، اس سے یہ مقصد ثابت ہے کیونکہ فجر کو پالینے کی شرط یہ ہے کہ آفتاب طلوع نہ ہوا ہو، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ طلوع آفتاب کے وقت، یا اس کے بعد کے وقت کو پانے والا، فجر کے وقت کو پانے والا نہیں ہے، معلوم ہوا کہ طلوع آفتاب پر فجر کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

**تشریح حدیث** حضرت ابو ہریرہؓ کی یہ روایت، چند ابواب پہلے بھی گزر چکی ہے مگر اس میں ایک رکعت پانے والے کے لئے فقد ادرك (اس نے نماز کو پالیا) کے الفاظ نہیں تھے، فليتم صلوٰته (وہ نماز کو پورا کرلے) کے الفاظ تھے، اس مضمون کو ادا کرنے کے لئے روایات میں اور بھی کئی الفاظ ہیں، صحابۂ کرام میں اس روایت کے دوراوی ہیں، ایک حضرت ابو ہریرہؓ اور دوسری حضرت عائشہؓ، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں الفاظ کا بڑا تنوع ہے، بعض روایات میں فقد ادرك، بعض روایات میں فليتمّ صلوته، بعض روایات میں فلم تفته (کہ اسکی نماز فوت نہیں ہوئی) بعض روایات میں فَليَصِل اِلَيهَا اُخرىٰ کہ وہ اس کے ساتھ دوسری رکعت ملائے، بعض روایات میں فَقَدْ تَمَّتْ صلوٰته کہ اسکی نماز پوری ہوگئی جبکہ حضرت عائشہؓ کی روایت میں فَقَد اَدرَكَ ہی کے الفاظ ہیں، پھر یہ کہ صحیحین

کی روایت میں حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی یہی دو تعبیرات ہیں، ایک جو پہلے گذری فَلیُتِمّ اور دوسری اس باب میں آنے والی تعبیر فَقَد اَدرَكَ جسے حضرت ابو ہریرہؓ سے ان کے تین شاگرد نقل کر رہے ہیں اس تفصیل سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ روایت کے اصل الفاظ فَقَد اَدرَكَ ہی ہیں، بقیہ الفاظ روایت بالمعنی کے طور پر رواۃ کی جانب سے نقل ہوئے ہیں۔

اگر فقد ادرك کی تعبیر اصل قرار دیں تو اس کا ظاہری، متبادر اور اولین مفہوم یہ ہے کہ جس شخص کو فجر یا عصر کی ایک رکعت بھی مل گئی اس کی نماز ہوگئی، یعنی بس یہی ایک رکعت کافی ہے، بقیہ رکعات کو پڑھنے کی ضرورت نہیں مگر اجماع ہے کہ یہ معنی مراد نہیں ہوسکتے اور یہ کسی کا مسلک نہیں ہے اسلئے اسکے کچھ اور ہی معنی مراد لئے جائیں گے، شوافع اور دیگر ائمہ نے غیر متبادر یہ معنٰی مراد لئے ہیں کہ ایسا شخص اسی وقت نماز کو پورا کرلے اور طلوع وغروب کی پرواہ نہ کرے، جبکہ رسولِ اکرم ﷺ نے طلوع وغروب کے وقت نماز پڑھنے سے منع فرمایا ہے، مگر یہ حضرات نہی کی روایات سے اس کا استثناء کرکے یہ کہتے ہیں کہ اگر بہ مجبوری ایسی صورت پیش آجائے کہ ایک شخص بھول جائے یا سو جائے اور ایسے وقت میں متنبہ ہو کہ ایک ہی رکعت کا وقت باقی ہو تو اسکو نماز پوری پڑھ لینی چاہیئے، پھر یہ کہ یہ پوری نماز ادا ہوگی یا قضا، اس سلسلے میں شوافع کے یہاں متعدد اقوال ہیں، راجح انکے یہاں یہی ہے کہ پوری نماز ادا مانی جائے گی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ وقت کی کراہت بلکہ وقت کے ختم ہوجانے کے باوجود نماز کو ادا قرار دیا جائے، اس کمزوری کے پیشِ نظر شوافع کے یہاں ایک دوسری رائے ہے کہ پوری نماز کو قضا مانا جائے، تیسری رائے یہ ہے کہ جتنی رکعتیں اندرونِ وقت ہیں وہ ادا مانی جائیں اور جتنی وقت کے بعد کی ہیں، انہیں قضا قرار دیا جائے ''ادراک'' کے ان معنی کے رجحان کے لئے شوافع اور دوسرے حضرات نے، حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں پائے جانے والے اختلاف الفاظ سے بھی فائدہ اٹھایا ہے۔

حافظ ابن حجرؒ کہتے ہیں کہ بیہقی نے دراوردی کی روایت سے حضرت زید بن اسلم سے نقل کیا ہے من ادرك من الصبح ركعةً قبل ان تطلع الشمس وركعة بعد ان تطلع الشمس فقد ادرك الصلوٰة اسی طرح چند ابواب پہلے جو اسی روایت میں فليتم صلوته کے الفاظ آئے ہیں، اس کا مفہوم بھی ابن حجر یہی سمجھ رہے ہیں کہ نماز کو فوراً پورا کرلے۔

لیکن حنفیہ طلوع وغروب کے وقت نماز سے ممانعت کی روایات کی وجہ سے ادراك کے یہ معنی مراد نہیں لیتے کہ نماز کو اسی وقت مکمّل کرلیا جائے کیونکہ جب اس وقت نماز کی ممانعت ہے اور ممانعت کی روایات بھی بہت زیادہ قابلِ اعتماد ہیں تو یقیناً ادراک کے کوئی ایسے معنی مراد لئے جائینگے، جو روایاتِ نہی سے متعارض نہ ہوں۔

**امام طحاویؒ کا ارشاد**

امام طحاویؒ ارشاد فرماتے ہیں کہ فقد ادرك کے معنی میں جس طرح یہاں یہ احتمال ہے کہ نماز کو اسی وقت پورا کرلیا جائے، اسی طرح یہ بھی احتمال ہے کہ یہ روایت ان بچوں کے بارے میں ہو جو طلوع وغروب سے قبل بالغ ہوجائیں یا وہ حائضہ ونفساء جو ایسے وقت میں پاک ہوجائیں، یا وہ غیر مسلم

جوایسے وقت میں اسلام قبول کرلیں، یا وہ مجنون جوایسے وقت میں ہوش مند یا مکلف ہوجائیں، اس صورت میں یہ حکم ہو گا کہ ایسے لوگوں پر نماز واجب ہوگئی اب کسی غیر مکروہ وقت میں اس کی قضا کرلیں، گویا امام طحاوی وغیرہ کی تشریح کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں فقد ادرك کے یہ معنی حقیقی تو مراد ہو ہی نہیں سکتے کہ ایسا شخص ایک ہی رکعت پر اکتفاء کرلے، بلکہ اسکے معنی شوافع وغیرہ کے نزدیک تو یہ ہوئے کہ وہ اسی وقت نماز کو پورا کرلے اور احناف کے یہاں معنی یہ ہوے کہ ایسے شخص پر نماز واجب ہوگئی، مگر امام طحاویؒ کہتے ہیں حنفیہ کے نزدیک مراد لئے گئے معنی پر یہ اشکال ہوسکتا ہے کہ جن روایات میں فلیتم صلوته یا تمت صلوته (کہ اس کی نماز پوری ہوگئی) یا فلیصل الیها اخری (وہ دوسری رکعت ملالے) کے الفاظ وارد ہوئے ہیں وہ انہی معانی کو ترجیح دیتے ہیں جو شوافع نے مراد لئے، مگر حنفیہ کی جانب سے جواب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جن روایات میں اوقاتِ مکروہہ میں نماز سے ممانعت فرمائی ہے وہ تواتر کے درجہ میں ہیں، اسلئے یہ کہنا چاہیئے کہ من ادرك الخ یا اسکے علاوہ دیگر الفاظ سے سمجھی جانے والی اباحت منسوخ معلوم ہوتی ہے، مگر شوافع جمع بین الروایات کے طور پر کہہ سکتے ہیں کہ نہی کی روایات کو نوافل کے ساتھ خاص کیا جائے اور فریضہ کے لئے من ادرك کی روایت کے پیشِ نظر اجازت دی جائے، یہ ایک اچھی صورت تھی مگر امام طحاوی اس پر یہ اشکال کرتے ہیں کہ فریضہ کی اجازت یوں نہیں معلوم ہوتی کہ لیلة التعریس میں رسول اللہ ﷺ نے نماز فجر کو طلوع آفتاب کے وقت نہیں پڑھا بلکہ آفتاب کے بلند ہونے کے بعد نماز پڑھی، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اوقاتِ مکروہہ میں ممانعت فرض اور نفل سب کے لئے عام ہے، خلاصہ یہ ہے کہ اوقاتِ مکروہہ میں نہی کی روایات کے پیشِ نظر فقد ادرك کے یہی معنی درست ہیں کہ نماز ایسے لوگوں پر واجب ہوگئی، اب وہ اسکو دوسرے غیر مکروہ وقت میں قضا کریں۔

**حضرت شیخ الہندؒ کا ارشاد** حضرت شیخ الہندؒ کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ ادراکِ فجر وعصر کے یہ معنی کہ ان نمازوں کو ابھی پورا کرلیا جائے روایاتِ نہی کے پیشِ نظر مراد نہیں لئے جا سکتے اسلئے اسکے کچھ اور معنی ہی مراد لئے جائیں گے، پھر وہ اس کے مختلف معانی بیان فرماتے لیکن سب سے راجح معنی ان کے نزدیک یہ تھے کہ جسکو ایک رکعت طلوع یا غروب سے پہلے مل گئی اسکو وقت کی فضیلت حاصل ہوگئی یعنی ایسے شخص کو یہ سوچ کر وقت نہ کھونا چاہئے کہ وہ نماز کو مکمل ادا نہیں کرسکتا بلکہ اسکو فضیلتِ وقت حاصل کرنے کے لئے نماز پڑھنی چاہئے، اور یہ کوشش کرنی چاہئے کہ وہ اسی ایک رکعت کے بقدر وقت میں آداب وسنن کو چھوڑ کر پوری نماز ادا کرلے جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ کے بارے میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ فجر کی نماز میں یہ صورت پیش آگئی کہ وقت بہت تنگ رہ گیا تو انہوں نے قاضی ابویوسفؒ کو امام بنایا، اور قاضی ابویوسفؒ نے اسی تنگ وقت میں فجر کی دونوں رکعتیں پڑھا دیں، اس پر امام اعظم نے قاضی ابویوسف کی ہمت افزائی کی اور فرمایا صار یعقوبنا فقیها (کہ ہمارے یعقوب (ابویوسف) فقیہ ہو گئے) ظاہر ہے کہ جلدی میں پڑھی گئی اس نماز میں اگر کچھ ایسی چیزیں ترک کرنا پڑی ہوں جن کے سبب نماز کا اعادہ

ضروری ہو تو اعادہ بھی کیا ہوگا، لیکن وقت کی فضیلت حاصل کرنے کے لئے یہ صورت اختیار کی گئی۔

پھر اگر بالفرض ایک رکعت کے وقت میں پوری نماز مکمل نہ کر سکیں تب بھی نماز پڑھ لیں اور طلوع کے باوجود تحریمہ کو باطل نہ کرتے ہوئے نماز پوری کرلیں، فقہ حنفی کی کتابوں میں یہ جزئیہ صراحت کے ساتھ موجود ہے کہ طلوع آفتاب کے سبب یہ نماز فرض نہ رہے گی نفل ہو جائے گی، پھر فرض کو دوسرے وقت قضا کرلیا جائے، مگر فضیلتِ وقت انشاء اللہ فوت نہ ہوگی، نیز یہ کہ اگر اسی رکعت کو دوسری رکعت کے ساتھ ملا کر فریضہ ادا کرنا چاہیں تو امام ابو یوسف کے اس قول پر عمل کرنا آسان ہے کہ ایک رکعت کے بعد نماز کے عمل کو موقوف کر کے وقتِ مکروہ گذرنے کا انتظار کریں اور جب وقتِ مکروہ ختم ہو جائے تو دوسری رکعت پڑھ لیں، خلاصہ یہ ہے کہ احادیثِ ممانعت سے تعارض کی بنیاد پر ادراکِ صلوٰۃ کے یہ معنی مراد نہیں ہو سکتے کہ اس کو اسی وقت مکمل کریں بلکہ فضیلتِ وقت کو حاصل کرنے کی تاکید مقصود ہے۔

## روایت میں وارد دیگر تعبیرات

امام طحاویؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کے بیان کردہ معنی پر حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت میں آنے والی مختلف تعبیرات کی بنیاد پر اشکال وارد ہوتا ہے، خصوصاً وہ روایات جن میں **فلیتم** (نماز کو پورا کرنے) کے الفاظ آئے ہیں، یا وہ روایات جن میں **رکعةً قبلَ ان تطلع الشمس ورکعةً بعد ان تطلع الشمس** (ایک رکعت طلوع آفتاب سے پہلے ایک رکعت طلوع آفتاب کے بعد) کے الفاظ آئے ہیں، اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایات میں اصل تعبیر تو **فقد ادرك** ہی ہے، بقیہ تعبیرات تو رواۃ کی نقل بالمعنی کے طور پر معلوم ہوتی ہیں، دلیل یہ ہے کہ اس روایت کی دوسری راوی حضرت عائشہؓ ہیں اور ان کی روایت میں **فقد ادرك** ہی ہے۔ اور ادراک کے مختلف معانی ہیں، ایک معنی احاطہ کے ہیں جیسے **لا تدركه الابصار وهو يدرك الابصار** (نگاہیں اس کے احاطہ پر قادر نہیں اور وہ نگاہوں کا احاطہ کر لیتا ہے) ظاہر ہے کہ یہ معنی مراد نہیں ہو سکتے، کیونکہ یہ خلافِ واقعہ ہے اس شخص نے نماز کا یا اسکے پورے وقت کا احاطہ نہیں کیا ہے، اس کو تو صرف ایک حصہ ہاتھ آیا ہے، دوسرے معنی یہ ہیں کسی چیز کو پکڑ لینا، پیچھے سے لاحق ہو جانا جیسے **لا الشمس ینبغی لها ان تدرك القمر** (سورج کی یہ مجال نہیں کہ چاند کو پکڑے) یہاں یہی معنی مراد ہیں کیونکہ اس شخص نے جاتے ہوئے وقت کو پکڑ لیا ہے۔

دوسرے یہ کہ جب **فقد ادرك** کے ایسے معنی مراد لینے کی مجبوری ہے جو اوقاتِ مکروہہ میں روایاتِ نہی سے متعارض نہ ہوں تو روایات میں آنے والی تمام تعبیرات کی توجیہ کی جاسکتی ہے مثلاً فلیتم کے معنی یہی تو ہوئے کہ وہ نماز کو مکمل کرلے، یعنی نماز کو ختم نہ کردے بلکہ جاری رکھے جیسا کہ حج کے فاسد ہونے کی صورت میں کیا جاتا ہے، اب یہ بحث کہ پوری کی گئی یہ نماز فرض ہوگی یا نفل، اس کا فیصلہ دوسری روایات کو سامنے رکھ کر کیا جائیگا، نسائی شریف میں ہے۔

**من ادرك ركعةً من صلوة من الصلوات فقد ادركها الا انه يقضي ما فاته** (نسائی، جلد: ۱/ص: ۹۵) کہ جس کو کسی بھی نماز میں ایک رکعت مل گئی تو اس کو نماز مل گئی مگر وہ فوت شدہ نماز کو قضا کریگا۔ اسی طرح جن

روایات میں رَکعۃً قبلَ ان تطلع الشمس ورکعۃً بعد ان تطلع الشمس کے الفاظ آئے ہیں ان میں بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک رکعت طلوع سے پہلے اور ایک رکعت طلوع کے بعد میں یہ صراحت نہیں ہے کہ یہ نماز فریضہ کے طور پر ادا ہوگئی، اس فیصلے کے لئے تو تمام روایات کو سامنے رکھنا ہوگا، اسی طرح جن روایات میں فلیصل الیھا اخری کے الفاظ آئے ہیں کہ اسکو دوسری رکعت ملا لینی چاہئے ان کے بارے میں بھی یہی کہا جائیگا کہ نماز کو جاری رکھنے کی ہدایت کی گئی ہے یہ صراحت نہیں ہے کہ وہ اس نماز کو فریضہ کی ادائیگی بھی سمجھے۔

## احناف کے بیان کردہ معنی کی وجوہِ ترجیح

اب اس بات پر بھی غور کرلیا جائے کہ فقد ادرک کے ظاہری معنی کو چھوڑ کر ایک مراد تو شوافع وغیرہ نے متعین کی کہ نماز کو اسی وقت مکمل کرلے اور اس کو ادا سمجھا جائے اور ایک معنی احناف نے مراد لئے کہ اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے جو وقت کے آخری حصے میں نماز کے اہل ہوگئے ہوں یا اس کا تعلق فضیلتِ وقت کے حصول سے ہے، دیکھنا یہ ہے کہ درایت سے قطع نظر کرلیں تو محض روایت پر نظر کرکے ان دونوں میں سے کونسی بات راجح ہے تو واقعہ یہ ہے کہ فقد ادرك والی روایت اگرچہ صحیح ہے، تمام کتابوں میں موجود ہے لیکن اس کو متواتر کا درجہ نہیں دیا جاسکتا ہے کیونکہ صحابۂ کرامؓ میں اس کے صرف دو راوی ہیں ایک حضرت ابو ہریرہؓ اور دوسری حضرت عائشہؓ، جبکہ روایاتِ نہی کی نوعیت یہ ہے کہ صحابۂ کرامؓ میں اس کے راویوں کی تعداد دسیوں سے متجاوز ہے اور اسکی تفصیل یہ ہے، کہ اوقاتِ مکروہہ پانچ ہیں (۱) فجر کے بعد (۲) عصر کے بعد (۳) استواء کے وقت (۴) طلوع (۵) وغروب کے وقت، ان میں سے پہلے دو اوقات کے بارے میں نہی کی روایات تمام کتابوں میں موجود ہیں، ترمذی شریف میں یہ روایت حضرت ابن عباسؓ سے سمعت غیر واحد من اصحاب النبی ﷺ کہہ کردی گئی ہے، پھر ترمذی نے وفی الباب عن علی الخ کہہ کر ۱۹ اصحابہؓ کے نام شمار کئے ہیں جن میں (۱) حضرت علی، (۲) ابن مسعود، (۳) ابوسعید خدری، (۴) عقبہ بن عامر، (۵) ابو ہریرہ، (۶) ابن عمر، (۷) سمرہ بن جندب، (۸) سلمہ بن اکوع، (۹) زید بن ثابت، (۱۰) عبداللہ بن عمر، (۱۱) معاذ بن عفراء، (۱۲) عائشہ، (۱۳) کعب بن مرہ، (۱۴) ابو امامہ، (۱۵) عمرو بن عبسہ (۱۶) صنابحی، (۱۷) یعلی بن امیہ، (۱۸) معاویہ (۱۹) عمر بن خطاب رضی اللہ عنھم اجمعین شامل ہیں، اسلئے اس روایت کے بارے میں امام طحاویؒ، ابن بطال اور ان کے متعدد علماء ومحدثین نے تواتر کا دعویٰ کیا ہے، اسی طرح طلوع وغروب کے وقت نماز سے ممانعت کی روایات بھی تمام کتابوں میں موجود ہیں اور راویوں میں (۱) ابن عمر (۲) زید بن ثابت (۳) عقبہ بن عامر، (۴) سمرہ بن جندب، (۵) حضرت عمر، (۶) عبداللہ صنابحی، (۷) عمرو بن عبسہ اور دیگر صحابہ کرامؓ ہیں، اس سلسلے کی روایات کے بارے میں امام طحاوی نے تواتر کی بات فرمائی ہے، من ادرك الخ سے سمجھی جانے والی اجازت واباحت پر گفتگو کرتے ہوئے،

طلوع وغروب کے وقت نماز سے ممانعت کی روایت کو انہوں نے اپنی اصطلاح میں تواتر سے تعبیر کیا ہے۔

ان هذا قد يجوز ان يكون كان من النبى ﷺ قبل نهيه عن الصلوٰة عند طلوع الشمس فانه قد نهىٰ عن ذالك وتواترت عنه الآثار بنهيه عن ذٰلك (طحاوی ص:۲۷۳/ج:۱) ایک رکعت پالینے پر نماز کو پالینے کا حکم ہوسکتا ہے کہ طلوع شمس کے وقت نماز کی نہی سے پہلے کا ہو اس لئے آپ نے اس وقت نماز سے منع فرمایا ہے اور اس وقت نماز سے منع کرنے پر روایات تواتر کے ساتھ موجود ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ من ادرك من الصلوٰة ركعةً الخ والی روایت اگر چہ صحیح ہے مگر اس کے راوی صحابہؓ کرامؓ میں دو حضرات ہیں جبکہ اوقات مکروہہ میں نماز سے ممانعت کی روایات اتنے صحابہؓ کرامؓ سے آرہی ہیں کہ ان کو تواتر کا درجہ دیا گیا ہے، اس لئے محض روایات پر نظر کرتے ہوئے ممانعت کو ترجیح ہونی چاہئے۔

ممانعت کی ترجیح کے لئے اصولی طور پر یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ من ادرك والی روایت اباحت سے متعلق ہے اور دوسری روایات حظر وممانعت سے متعلق ہیں اور اباحت وحظر میں تعارض ہو تو روایاتِ حظر کو ترجیح دی جائے گی۔

نیز روایاتِ ممانعت کو ترجیح اس لئے بھی حاصل ہونی چاہئے کہ اگر اباحت کو ترجیح دی گئی اور داوٴدِ ظاہری کی طرح احادیثِ نہی کو من ادرك سے منسوخ مانا گیا تو نسخ دوبار ماننا ضروری ہوگا کہ پہلے اجازت دی تھی، پھر ممانعت کی گئی، پھر اجازت دی گئی،، اور ظاہر ہے کہ یہ صورت غیر ضروری بلکہ نامناسب ہے۔

**فجر اور عصر کے درمیان فرق کی وجہ** بہر حال من ادرك الخ کے، روایاتِ نہی سے تعارض کے پیش نظر، فجر اور عصر کی نماز کو طلوع وغروب کے باوجود فوراً مکمل کر لینے کی بات ثابت نہیں ہوتی، لیکن اب یہ مسئلہ رہ جاتا ہے کہ پھر حنفیہ نے فجر اور عصر کے درمیان فرق کیوں کیا ہے، کیونکہ فقہِ حنفی میں مسئلہ یہ ہے کہ اگر فجر کی نماز کے دوران سورج طلوع ہو جائے تو نمازِ فجر کو پورا کرنے کی اجازت نہیں اور عصر کی نماز میں غروب ہو جائے تو اس کو پورا کر لیا جائے گویا حنفیہ نے من أدرك الخ والی روایت پر عصر کے سلسلے میں عمل کیا اور فجر کے سلسلے میں روایت کو ترک کیا ہے۔

بہ ظاہر یہ اشکال قوی معلوم ہوتا ہے اور بہت سے علماء نے حنفیہ پر یہاں روایات کے مقابل قیاس پر عمل کرنے کا الزام بھی عائد کیا ہے، مسئلہ کی گہرائی میں جا کر معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت یہ نہیں ہے کیونکہ ہم تو یہ سمجھ رہے ہیں کہ روایاتِ نہی کے پیش نظر من ادرك الخ کا تعلق طلوع وغروب کے وقت کی نماز سے ہے ہی نہیں، بلکہ امام طحاوی کی وضاحت کے مطابق اس کا مطلب یہ ہوا جو ان اوقات میں نماز کا اہل ہو جائے تو اس کے ذمہ نماز فرض ہو جائیگی اور حضرت شیخ الہندؒ کے ذوق کے مطابق اس روایت کا تعلق فضیلتِ وقت کو حاصل کرنے کی تاکید سے ہے، بہر صورت یہ روایت طلوع وغروب

کے وقت نماز کی تکمیل سے متعلق نہیں ہے، تو اب یہ صورت نہیں ہے کہ نص کے ہوتے ہوئے قیاس کیا جارہا ہے بلکہ ایک غیر منصوص یعنی اجتہادی مسئلہ میں قیاس کیا جارہا ہے، اور وہ قیاس یہ ہے کہ وقت نماز کے لئے سبب ہے اور سبب ظاہر ہے کہ پورے وقت کو قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ پورے وقت کو اگر سبب قرار دیں تو نماز پورا وقت گذرنے کے بعد ہونی چاہئے اور ایسی صورت میں نماز اندرون وقت نہ ہوسکے گی جسکا غلط ہونا ظاہر ہے، اسلئے ضروری ہے کہ وقت کے جزءِ اول کو نماز کا سبب قرار دیں کیونکہ اس کا کوئی مزاحم نہیں ہے، اس لئے جس نے نماز اول وقت میں ادا کر لی اسکی نماز ہوگئی اور اگر کوئی جزاول میں نماز ادا نہ کرسکا تو سببیت جزاول سے اس کے بعد والے جز میں منتقل ہوجائے گی، اگر اس میں بھی ادا نہیں کی تو اسی طرح وہ آخر تک منتقل ہوتی رہے گی، یہاں تک کہ وقت کے اس آخری حصے سے سببیت متعلق ہوجائے گی، جس کے بعد کوئی حصہ نہیں ہے، اب یہ دیکھا جائیگا کہ وقت کا جو حصہ سبب کے لئے معین ہوا ہے اسکی حالت کیا ہے؟ ناقص ہے یا کامل؟ وقت کے اس وصفِ نقصان وکمال کی رعایت سے حکم لگایا جائیگا، ہم نے دیکھا کہ فجر کا وقت طلوعِ فجر سے طلوعِ شمس تک کامل ہے اسلئے وہاں وقت کے ہر حصہ میں نماز کا وجوب بصفتِ کمال ہوگا اور ادائیگی کے لئے صفتِ کمال کا ہونا ضروری سمجھا جائیگا یعنی اگر کسی شخص نے وقت کے بالکل آخر حصہ میں فجر کی نماز شروع کی تو اسکا وجوب بھی بصفتِ کمال ہوا اور اسکی ادئیگی بھی صفتِ کمال کے ساتھ شروع ہوئی لیکن درمیان میں سورج طلوع ہوگیا تو نقصان پیدا ہوگیا، گویا نماز واجب ہوئی بصفتِ کمال اور ادا ہوئی ناقص اس لئے اسکو درست نہیں کہا جاسکتا، البتہ عصر کا معاملہ اس سے مختلف ہے کہ اسکا وقت اول سے آخر تک صفتِ کمال سے متصف نہیں ہے بلکہ جب سورج اصفرار کی حالت میں آجاتا ہے تو وقت میں نقصان آجاتا ہے اور جس قدر غروب قریب ہوتا جائیگا نقصان بڑھتا جائیگا، اب اگر ایسا ہوا کہ کسی شخص نے نماز بالکل آخری وقت میں شروع کی تو نماز کا وجوب ہی بصفتِ نقصان ہوا، ایسی نماز ادا بھی بصفتِ نقصان ہوسکتی ہے بلکہ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وقت میں نقصان اصفرار کے سبب تھا، غروب کے بعد وقت اگرچہ قضا کا ہے مگر نقصان اور کراہت سے خالی ہے اس لئے اس نماز کو تو ادا ہی ہونا چاہئے۔ خلاصہ یہ ہے کہ امامِ اعظم کا اجتہاد، نص کے ہوتے ہوئے نہیں ہے کیونکہ مـن ادرک والی روایت کا تعلق طلوع وغروب کے وقت کی نماز سے نہیں ہے، اس لئے یہاں ایک غیر منصوص اور اجتہادی مسئلہ میں قیاس سے کام لیا گیا ہے۔　　　واللہ اعلم

**علامہ کشمیریؒ کا ارشاد** حضرت علامہ کشمیریؒ کی تحقیق یہ ہے کہ اس روایت کا مقصد وقتِ فجر کا بیان نہیں، بلکہ اسکا تعلق مسبوق کے مسئلے سے ہے، حضرت علامہ قدس سرہٗ نے اس موضوع پر ایک رسالہ بھی لکھا تھا، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں، میں عصر کے بعد حضرت شیخ الہند کی خدمت میں حاضر تھا کہ علامہ کشمیریؒ تشریف لائے اور ایک تحریر پڑھ کر سنائی جو اسی مسئلہ سے متعلق تھی، حضرت شیخ الہندؒ نے تحریر سماعت فرمائے

کے بعد ارشاد فرمایا کہ آپ کا مقصد یہ ہے کہ اس روایت کا تعلق بیانِ وقت سے نہیں، جماعت اور مسبوق سے ہے حضرت علامہؒ نے فرمایا کہ یہی خیال ہے، اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا بہتر ہے اور پھر خود تقریر شروع کی جسکا خلاصہ ذکر کیا جا چکا ہے، گویا حضرت علامہؒ کی تحقیق کی ایک گونہ توثیق بھی فرمائی مگر اپنا رجحان یہ ظاہر فرمایا کہ اس روایت کا تعلق فضیلتِ وقت کے ادراک سے ہے۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کا مسلکِ مختار یہ ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت مــــن ادرك الخ میں مسبوق کا یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ جسے امام کے ساتھ فجر یا عصر کی ایک رکعت مل گئی تو اسے مزید رکعت ملا کر نماز کو پورا کر لینا چاہئے، حضرت علامہؒ کی یہ روایت الفاظ وتعبیر کے قدرے اختلاف کے ساتھ متعدد ابواب کے ساتھ آئی ہے اور اگر چہ دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا کہ روایت ایک ہی ہے اور تعدد محض راویوں کا تفنن ہے بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ نے مختلف اوقات میں رسول اللہ ﷺ سے متعدد روایات سنی ہوں مگر مقصد سب کا ایک ہی معلوم ہوتا ہے، اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ روایتِ باب کے علاوہ بقیہ تمام روایات کے بارے میں سب کا اتفاق یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مسبوق کے مسئلہ سے متعلق ہیں کیونکہ خود روایات میں یا ان کے دوسرے طرق میں اس کی تصریح ہے، صرف روایاتِ باب کے بارے میں یہ بحث ہے کہ اس کو اوقاتِ نماز کے مسئلے سے متعلق سمجھا گیا ہے، لیکن ہمارے نزدیک تو اس روایت کو بھی دیگر روایات کی طرح مسئلہ مسبوق سے متعلق ہونا چاہئے۔ اس اجمال کی قدرے تفصیل یہ ہے کہ ایک روایت بخاری ومسلم وغیرہ میں عام الفاظ میں اس طرح وارد ہوئی ہے **من ادرك ركعة من الصلاة فقد ادرك**، عموم پر دلالت کرنے والی اس روایت، اور روایاتِ باب میں بنیادی فرق یہی ہے کہ روایتِ باب صرف فجر اور عصر سے متعلق ہے اور یہ روایت تمام نمازوں کے حق میں عام ہے لیکن عموم کے باوجود اس روایت کو مسبوق سے متعلق سمجھا گیا ہے، کیونکہ مسلم شریف کی اسی روایت کی دوسری سند میں مع الامام کی صراحت ہے، فرمایا گیا **من ادرك ركعة من الصلاة مع الامام فقد ادرك الصلاة** (مسلم: ۲۲۱/ ج:۱) مع الامام کی صراحت سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس روایت کا تعلق اوقات کے مسئلہ سے نہیں ہے بلکہ یہ الفاظ روایت کے مسبوق سے متعلق ہونے کے لئے نص کا درجہ رکھتے ہیں۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ روایت نسائی شریف میں عموم پر دلالت کرنے والے ان ہی الفاظ کے ساتھ موجود ہے **من ادرك ركعة من الصلوة فقد ادركها** (نسائی شریف ص: ۹۵/ ج:۱) لیکن اس کو بھی مسبوق پر محمول کیا گیا ہے، خود امام نسائی کا بھی یہی رجحان ہے، کیونکہ انہوں نے اسی باب میں **من ادرك ركعة من الصلوة** کے تحت دوسری روایت ابن عمر سے مرفوعاً نقل کی ہے جس کے الفاظ ہیں **من ادرك ركعةً من الجمعة او غيرها فقد تمت صلاته** جبکہ یہ طے شدہ بات ہے کہ جمعہ کی نماز با جماعت ہی ہوتی ہے، نیز یہ کہ پھر نسائی نے ابن عمرؓ کی یہی روایت سالم سے مرسلاً نقل کی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں **من ادرك ركعةً من صلاة من الصلوات فقد ادركها الا انه يقضي**

مـا فـاتـه، یہ الفاظ اس روایت کے مسئلہ مسبوق سے متعلق ہونے پر صراحت کے ساتھ دلالت کررہے ہیں۔ حضرت ابوہریرہؓ کی یہی روایت ابوداؤد میں بـاب الرجل یدرك الامام ساجداً کیف یصنع (ص:۱۳۶/ ج:۱) میں موجود ہیں جس کے الفاظ یہ ہیں اذا جئتم الی الصلاۃ ونحن سجود فاسجدوا ولا تعدّوہ شیئاً ومن ادرك الرکعۃ فقد ادرك الصلاۃ، ان الفاظ میں بھی صراحت ہے کہ روایت مسئلہ مسبوق سے متعلق ہے۔

حضرت علامہ کشمیریؒ کا مقصد ان تمام روایات کے بیان سے یہ ہے کہ جب حضرت ابوہریرہؓ کی روایت کو ہر جگہ مسئلہ مسبوق سے متعلق کیا گیا ہے تو روایتِ باب جس میں فجر اور عصر کی تخصیص ہے اسکو اوقاتِ صلوۃ سے کیوں متعلق کیا جائے، اس کو بھی مسبوق کے مسئلہ سے متعلق ہونا چاہئے۔

**خلاصۂ بحث اور بخاری کا مدّعا** بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں اصل الفاظ تو فقد ادرک ہیں، اگرچہ دیگر الفاظ وتعبیرات میں بھی حنفیہ کے مسلک کے مطابق معقول توجیہ ممکن ہے، پھر یہ کہ فـقـد ادرك کے حقیقی معنی مراد لینا کہ وہ ایک ہی رکعت پر اکتفا کرلے بالاجماع درست نہیں، اس لئے اس کے متعدد دیگر معانی مراد لئے گئے ہیں، شوافع نے یہ مراد متعین کی کہ وہ اسی وقت نماز کو پورا کرلے، مگر حنفیہ روایاتِ نہی سے تعارض کی بنیاد پر ایسا نہ کرسکے، ان کے نزدیک معنی یہ ہیں کہ ایسے شخص نے وقت پالیا یا نماز کا حکم پالیا یا فضیلتِ وقت حاصل ہوگئی، یا حقیقتِ صلوۃ اس کو حاصل ہوگئی کیونکہ حقیقتِ صلوۃ تو ایک ہی رکعت ہے باقی تو اس عمل کا تکرار ہے یا پھر علامہ کشمیریؒ نے موضوع ہی بدل دیا کہ اس کا تعلق مسئلہ مسبوق سے ہے، مگر یہ کہ امام بخاری کا مدعا یعنی فجر کے منتہائے وقت کا بیان تو وہ ہر حال میں ثابت ہے کہ فجر کا وقت طلوع آفتاب تک ممتد ہے، طلوع آفتاب کے بعد فجر کا وقت نہیں ہے۔

## [۲۹] بَاب مَن ادرکَ مِن الصلوۃ رکعۃ

(۵۸۰) حَدَّثَنَا عَبْدُ اللّٰہِ بْنُ یُوسُفَ، قَالَ: حَدَّثَنَا مَالِكٌ، عَنِ ابْنِ شِھَابٍ عَنْ اَبِی سَلَمَۃَ بنِ عَبْدِالرَّحْمٰنِ، عَنْ اَبِی ھُرَیرۃَ اَنَّ رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: مَنْ اَدْرَكَ رَکْعَۃً مِنَ الصَّلٰوۃِ فَقَدْ اَدْرَكَ الصَّلٰوۃَ. (گذشتہ ۵۵۶)

**ترجمہ** باب اس شخص کا حکم جس نے نماز کی ایک رکعت کو پالیا، حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس نے نماز کی ایک رکعت کو پالیا اس نے نماز کو پالیا۔

**مقصد ترجمہ** پچھلے باب کے ذیل میں جو روایت ذکر کی گئی تھی اس میں فجر اور عصر کی قید تھی، یعنی ایک رکعت پالینے کو فجر اور عصر میں پوری نماز پالینے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن چونکہ یہ روایت فجر اور عصر کی قید کے بغیر مطلق بھی

وارد ہوئی ہے، اس لئے امام بخاری نے مطلق روایت کو مقیّد روایت کے فوراً بعد ذکر کر دینا مناسب خیال کیا اور اس کے لئے ترجمہ رکھ دیا من ادرك من الصلوٰة ركعةً گویا وہ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ ایک رکعت پالینے کا حکم عصر اور فجر کی خصوصیت نہیں، تمام نمازوں کا یہی حکم ہے، اب اگر اس روایت کا تعلق مواقیت سے مانا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ایک رکعت کے بقدر وقت پانے والے کو پوری نماز کا مدرک قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ اس کی مختلف تشریحات گذر چکی ہیں اور اگر اس کو مسبوق کے مسئلے سے متعلق مانا جائے جیسا کہ بعض شارحین کا رجحان ہے تو یہ علامہ کشمیریؒ کے بیان کردہ معنی کی تائید ہے۔

**تشریح حدیث** یہ حدیث بار بار گذر چکی ہے، چند ابواب پہلے باب من ادرك ركعة من العصر قبل الغروب میں بھی یہی روایت بہ سند ابوسلمة عن ابی هريرة دی گئی تھی مگر وہاں فجر اور عصر کی قید بھی مذکور تھی، چنانچہ متعدد شارحین نے دونوں روایتوں کو ایک قرار دیکر مطلق کو مقید کر دیا ہے، اور بہت سے حضرات کا رجحان یہ ہے کہ جب عام روایت میں عصر و فجر کی قید نہیں ہے اور سب نے اس کو صلوٰۃ مع الامام پر محمول کیا ہے تو مقید روایت کو بھی صلوٰۃ مع الامام پر محمول کرنا چاہئے۔ غرض یہ کہ دونوں رجحان ہیں اور شارحین میں سے کسی کا رجحان اپنے ذوق اور کسی کا اپنے مسلک کے تابع معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

❀❀❀❀❀❀❀

الی هنا تم الجلد الثالث من ایضاح البخاری ويتلوه الجلد الرابع انشاء الله تعالىٰ

وأوله "باب الصلوٰة بعد الفجر حتى ترتفع الشمس"



